الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

بعض اوقات ظلم کو مٹانے کے لئے اٹھنا ظلم کو مٹانا نہیں ہوتا
— ایک ظلم کو دو ظلم کرنے کے ہم معنی ہوتا ہے

شمارہ ۳۸
جنوری ۱۹۸۰

زرتعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

جنوری ۱۹۸۰ شمارہ ۳۸

فون نمبر 262331

جمعیۃ بلڈنگ ، قاسم جان اسٹریٹ ، دھلی ٦ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کچھ تذکیر القرآن کے بارے میں

قرآن کے بہت سے پہلو ہیں اور مختلف انداز سے اس کی تفسیریں لکھی گئی ہیں۔ مگر قرآن کا اصل پہلو یہ ہے کہ وہ خدا کے بندوں کے لئے ایک نصیحت نامہ ہے۔ وہ اس لئے آتارا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے رب کی یاد دلائے، ان کے اندر آخرت کی تڑپ پیدا کرے، وہ ان کی زندگی کے اوپر خدا کی نگراں بن جائے۔ "تذکیر القرآن" کا مقصد قرآن کے اسی پہلو کو کھولنا ہے۔ قرآن ایک نصیحت ہے اور تذکیر القرآن اس نصیحت کی تفسیر۔ نحوی مسائل، قانونی تفصیلات، تاریخی معلومات اور اس طرح کی دوسری بحثیں بجائے خود مفید ہیں۔ مگر ان کو تذکیر القرآن میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو اس قسم کی تفصیلات کو ایک علیحدہ کتاب (قاموس القرآن) کی صورت میں مرتب کیا جائے گا ——————

اعلان

معلوم ہوا ہے کہ کچھ لوگ الرسالہ کی طرف سے رقم وصول کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم نے کسی کو بھی الرسالہ کی طرف سے رقم وصول کرنے کا مجاز نہیں بنایا ہے۔ اگر کوئی الرسالہ کے نام کی رسید پیش کر رہا ہے تو وہ رسید فرضی ہے۔ براہ کرم الرسالہ کی رقم براہ راست دفتر الرسالہ کے نام روانہ فرمائیں۔

کائنات گواہی دیتی ہے

سورہ انعام (رکوع ۴) میں منکرین کے اس مطالبہ کا ذکر ہے کہ وہ رسول سے کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے اس وعدے میں سچے ہو کہ جو پیغام تم لائے ہو وہ خدا کی طرف سے ہے تو کوئی معجزہ دکھاؤ۔ فرمایا کہ ایمان کا مدار معجزہ نما واقعات پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ آدمی کی آنکھ کھلی ہوئی ہو اور وہ نشانیوں سے سبق لینا جانتا ہو۔ جس میں یہ صلاحیت زندہ ہو، اس کو نظر آئے گا کہ یہاں وہ "معجزہ" پہلے سے نہایت وسیع پیمانہ پر موجود ہے جس کا وہ مطالبہ کر رہا ہے۔ آخر اس سے بڑا معجزہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ساری کائنات اپنے تمام اجزا سمیت اس پیغام کی سچائی کی تصدیق کر رہی ہے جس کی طرف خدا کا رسول بلا رہا ہے۔ اور اگر آدمی نے اپنے آپ کو اندھا بنا رکھا ہو، وہ واقعات سے سبق لینے کی کوشش نہ کرتا ہو تو بڑے سے بڑا معجزہ بھی کارآمد نہیں ہو سکتا۔

اس سلسلے میں ان دیگر مخلوقات (چڑیوں اور جانوروں) کی مثال دی گئی ہے جو اس دنیا میں انسان کے سوا پائی جاتی ہیں۔ دوسری جگہ زمین و آسمان کو بھی اس مثال میں شامل کیا گیا ہے (بنی اسرائیل ۴۴) فرمایا کہ اگر تم غور کرو تو تمہارے لئے کافی سامان عبرت و نصیحت کا ان کے اندر موجود ہے۔ کیوں کہ یہ سب بھی تمہاری طرح مخلوقات ہیں۔ ان کو بھی اپنی زندگی میں ایک ڈھنگ اختیار کرنا ہے جس طرح تم کو اختیار کرنے کے لئے کہا جا رہا ہے۔ مگر تمہارے مقابلہ میں، عالم موجودات کا بے حد بڑا حصہ ہونے کے باوجود، ان کا معاملہ مکمل طور پر تم سے مختلف ہے۔ وہ ایک ہی مقررہ نقشہ پر کروروں برس سے چل رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی اپنے مقرر نقشہ سے ادنیٰ انحراف نہیں کرتا۔ یہ صرف انسان ہے جو ایک مقرر نقشہ کو قبول نہیں کرتا۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ اپنی من مانی راہوں پر دوڑتا رہے۔

رسول کا مطالبہ تم سے کیا ہے یہی تو ہے کہ اس دنیا کا ایک خالق و مالک ہے۔ تمہارے لئے صحیح رویہ یہ ہے کہ تم خودسری اور خودرائی کو چھوڑ دو اور اپنے خالق و مالک کے تابع ہو جاؤ۔ غور کرو تو اس دعوت کے حق ہونے پر تمام زمین و آسمان اور تمام حیوانات گواہی دے رہے ہیں (نور ۴۱) کیوں کہ جس دنیا میں تم ہو جب اس کا وسیع تر حصہ خودسری کے بجائے پابندی کا طریقہ اختیار کئے ہوئے ہے تو تم اس کا بے حد مختصر حصہ ہو کر اس کے خلاف رویہ اپنانے میں حق بجانب کیسے ہو سکتے ہو۔ عظیم الشان کائنات کا ہر جزء، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، وہی کر رہا ہے جو اسے کرنا چاہئے۔ سب اپنے ایک ہی متعین راستہ پر اتنی صحت کے ساتھ چلے جا رہے ہیں کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی عزیز و علیم نے ان کو بزور اس کا پابند کر رکھا ہے (یٰس ۳۸)۔ اتنی بڑی کائنات میں انسان کا الگ راستہ اختیار کرنا بتا رہا ہے کہ انحراف انسان کی طرف ہے نہ کہ بقیہ کائنات کی طرف (آل عمران ۸۳)

ساری کائنات، اپنے لاتعداد اجزا کے ساتھ انتہائی متوافق طور پر حرکت کرتی ہے، ان میں کبھی باہم ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ یہ صرف انسان ہے جو آپس میں ٹکراؤ کرتا ہے۔ تمام کائنات اپنی ناقابل قیاس سرگرمیوں کے ساتھ

ہمیشہ نفع بخش انجام کی طرف جاتی ہے۔ مگر انسان ایسی کارروائیاں کرتا ہے جو تباہی اور بربادی پیدا کرنے والی ہوں۔ دو قسم کے پانی اپنی اپنی حد مقرر کئے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کی حد کو نہیں توڑتا، حتیٰ کہ سانڈوں کا گروہ بھی اپنے اپنے حدود کو متعین کر لیتا ہے۔ ہر سانڈ اپنی حد کے اندر کھاتا پیتا ہے، دوسرے سانڈ کی حد میں نہیں گھستا۔ مگر انسان کسی حد بندی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ شہد کی مکھیاں حد درجہ نظم اور تقسیم کار کے ساتھ اپنی تعمیری سرگرمیاں انجام دیتی ہیں۔ مگر انسان نظم و ضبط کو توڑتا ہے۔ چیونٹیاں اور چڑیاں رزق کی فراہمی میں اپنی محنت پر بھروسہ کرتی ہیں۔ وہ کسی سے چھین جھپٹ نہیں کرتیں۔ مگر انسان دوسرے انسان کا استحصال کرتا ہے۔ کوئی شیر یا بھیڑیا اپنی نوع کے جانور کو نہیں پھاڑتا۔ مگر انسان انسان کا خون بہاتا ہے۔ کوئی جانور حتیٰ کہ سانپ بچھو بھی بلا وجہ کسی کے اوپر حملہ نہیں کرتے۔ وہ حملہ کرتے ہیں تو صرف اپنے بچاؤ کے لئے۔ مگر انسان دوسرے انسانوں کے اوپر یک طرفہ جارحانہ کارروائیاں کرتا ہے۔ تمام جانور بقدر ضرورت کھاتے ہیں۔ بقدر ضرورت جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں اور بقدر ضرورت گھر بناتے ہیں۔ مگر انسان ہر چیز میں اسراف اور بے راہ روی اور غیر ضروری تکلفات کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ تمام جانور صرف اپنے دائرہ کار میں اپنے کو مصروف رکھتے ہیں۔ مگر انسان اپنے دائرہ عمل کو چھوڑ کر دوسرے کے دائرہ میں مداخلت کرتا ہے۔ ایک چرواہے کی پچاس بکریاں جنگل میں چرتے ہوئے ہزاروں بھیڑ بکریوں سے مل جائیں اور اس کے بعد ان کا چرواہا ایک مقام پر کھڑے ہو کر آواز دے تو اس کی تمام بکریاں نکل نکل کر اس کے پاس آجاتی ہیں۔ مگر انسان کا یہ حال ہے کہ اس کو خدا اور رسول کی طرف بلایا جائے تو وہ سننے اور سمجھنے کے بعد بھی اس کی طرف نہیں دوڑتا۔

انسان ساری کائنات کا اس سے بھی کہیں زیادہ چھوٹا حصہ ہے جتنا پوری زمین کے مقابلہ میں سرسوں کا ایک دانہ۔ پھر انسان کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ کیسے درست ہو سکتا ہے جو وسیع تر کائنات کا راستہ ہے۔ اگر اتنی عظیم الشان دلیل کے باوجود آدمی اپنے لئے الگ راستہ کا انتخاب کرتا ہے تو موجودہ کائنات میں وہ اپنے کو بے استحقاق ثابت کر رہا ہے۔ اس کے بعد اس کا انجام صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس کو کائنات میں بے جگہ کر دیا جائے۔ کائنات کی تمام چیزیں اس کے ساتھ مساعدت کرنے سے انکار کر دیں۔ تمام کائناتی نعمتوں کو اس سے چھین کر اس کو ابدی محرومی میں ڈال دیا جائے۔ آدمی جس کائنات کا ہم سفر بننے کے لئے تیار نہیں، اس کو کیا حق ہے کہ اس کائنات کی چیزوں سے فائدہ اٹھائے۔ اس کے بعد بالکل فطری طور پر یہ انجام ہونا چاہئے کہ کائنات کو اس کی تمام نعمتوں کے ساتھ صرف ان انسانوں کو دے دیا جائے جو اس کے ہم سفر بنے، جنھوں نے اپنے خالق و مالک کی تابعداری اسی طرح کی جس طرح ساری کائنات کر رہی تھی۔ اس کے سوا وہ انسان جنھوں نے بغاوت اور خودرائی کا طریقہ اختیار کیا، ان کو نہ اس دنیا کی روشنی میں حصہ دار بننے کا حق ہے اور نہ اس کی ہوا اور پانی میں۔ وہ اس دنیا میں نہ اپنے لئے مکان بنانے کا حق رکھتے اور نہ کھانے اور آرام کرنے کا۔ انصاف کا تقاضہ ہے کہ کائنات اپنے جنتی امکانات کے ساتھ صرف پہلے گروہ کے حصہ میں آئے اور دوسرے گروہ کو یہاں کی تمام بہترین چیزوں سے محروم کر کے چھوڑ دیا جائے۔

جو خدا کو پالے اس نے سب کچھ پالیا

ایک شخص "سیب" کھائے۔ مگر سیب کے کھانے سے اس کو نہ کوئی مزہ ملے اور نہ وہ اس کے جسم میں داخل ہو کر اس کو طاقت دے تو کہا جائے گا کہ اس نے سیب نہیں کھایا، اس نے سیب کی شکل کی کوئی چیز چبائی ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ خدا کا بھی ہے۔ خدا کو پانا وہی پانا ہے جو آدمی کے لئے مزہ بن جائے۔ جب "خدا" کو پاکر بھی آدمی مزہ سے خالی رہے تو کہنا چاہئے کہ اس نے خدا کو نہیں پایا۔ اس نے کوئی اور چیز پائی ہے اور غلطی سے اس کو خدا سمجھ رہا ہے۔ وہ مٹی کا سیب چبا رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں حقیقی سیب کھا رہا ہوں۔

دنیا اپنی ابتدائی شکل میں صرف ایک قسم کا مادہ ہے۔ ساری دنیا ایٹموں کا مجموعہ ہے۔ بالفاظ دیگر ساری دنیا بے روح مادہ ہے۔ اس بے روح مادہ کو خدا بے شمار صورتوں میں جلوہ گر کر رہا ہے۔ اس بے روح مادہ سے خدا کہیں روشنی پیدا کر رہا ہے اور کہیں حرارت۔ کہیں وہ اس بے روح مادہ کو ہریالی میں تبدیل کر رہا ہے اور کہیں پانی کی روانی میں۔ کہیں وہ اس بے روح مادہ کو رنگ کی صورت میں ظاہر کر رہا ہے اور کہیں مزہ اور خوش بو کی صورت میں۔ کہیں اس بے روح مادہ سے حرکت کے کرشمے ظاہر ہو رہے ہیں اور کہیں کشش کے کرشمے۔ ایسے عجیب وغریب قدرت والے خدا کو پانا ایک خشک عقیدہ کو پانا نہیں ہو سکتا۔ ایسے خدا کو پانا تو یہ ہے کہ آدمی کی روح ایک اتھاہ روشنی سے جگمگا اٹھے۔ وہ اس کے قلب کے لئے لطف ولذت بن جائے۔ آدمی ایک عمدہ پھل کھاتا ہے تو وہ باغ باغ ہو جاتا ہے۔ ایک شخص ایک لطیف نغمہ سنتا ہے تو وہ ہمہ تن وجد میں آجاتا ہے۔ کسی کے یہاں ایک خوبصورت بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ پھر خدا جو ساری خوبیوں کا سرچشمہ ہے، اس کا پانا کیا کسی کو بے قرار نہیں کرے گا، وہ محض ایک بے کیف واقعہ بن کر رہ جائے گا۔

خدا کو پانا یہ ہے کہ وہ ایک خوشبو ہو جس سے آدمی کا شامہ معطر ہو جائے۔ وہ ایک مزہ ہو جس سے اس کا ذائقہ لطف اندوز ہو۔ وہ ایک لطافت ہو جو اس کے لامسہ کو کیف سے بھر دے۔ وہ ایک حسن ہو جو اس کی بصارت کو ایک حیرت ناک نظارہ میں محو کر دے۔ وہ ایک ترنم ہو جو اس کے سامعہ کو ایسی لذت دے جس سے وہ کبھی سیر نہ ہو۔ جس خدا نے روشنی پیدا کی، کیسے ممکن ہے کہ اس کے اندر روشنی نہ ہو۔ جس خدا نے مزہ پیدا کیا کیسے ممکن ہے کہ اس میں مزہ نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا تمام روشنیوں سے زیادہ روشن ہے۔ وہ تمام مزوں سے زیادہ مزہ والا ہے۔ کسی کو خدا کی قربت ملنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص رنگت اور خوشبو کے ابدی چمنستان میں جا بسے، جیسے وہ ایک پیکر نور کے پڑوس میں پہنچ جائے۔

خدا ساری حکمتوں کا خزانہ ہے، اس لئے خدا کو پاتا آدمی کو انتہائی باشعور بنا دیتا ہے۔ خدا سارے زمین وآسمان کا نور ہے، اس لئے خدا کو پانا آدمی کی پوری شخصیت کو ربانی نور سے جگمگا دیتا ہے۔ خدا تمام طاقتوں کا سرچشمہ ہے، اس لئے خدا کو پانا آدمی کو اتنا طاقت ور بنا دیتا ہے کہ کوئی سیلاب اس کو غرق نہ کر سکے اور کوئی طوفان اس کے درخت کو اکھاڑنے والا ثابت نہ ہو ——— لوگ خدا سے بہت دور ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کے قریب کھڑے ہوئے ہیں۔ لوگ خدا کے فیضان سے ناآشنا ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے خدا کے فیضان سے اپنا کھلیان بھر رکھا ہے۔

ہم کہاں ہیں

۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ کو ایک بڑی اسلامی شخصیت کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس شخصیت سے وابستہ اخبارات و رسائل میں مرحوم کے بارے میں کثرت سے مضامین شائع ہوئے۔ ان مضامین نے بتایا کہ مرحوم کے معتقدین مرحوم کے بارے میں کیسی غیر معمولی شیفتگی اور وارفتگی اپنے دلوں میں لئے ہوئے تھے۔ مرحوم کی موت نے ان کے دل کے پیمانہ کو چھلکا دیا اور انھوں نے مرحوم کے تذکرے انتہائی والہانہ انداز میں بیان کئے۔ ان مضامین کو دیکھ کر میں نے مرحوم کے ایک معتقد سے پوچھا کہ آپ کے یہ اخبارات و رسائل چوتھائی صدی سے بھی زیادہ مدت سے نکل رہے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان پرچوں میں کبھی خدا کا تذکرہ بھی اس جوش اور وارفتگی کے ساتھ شائع ہوا ہو۔ مومن کی تعریف یہ ہے کہ وہ خدا کے کارناموں سے سرشار ہو اور خدا کے نام سے اس کے قلب و روح میں حرکت پیدا ہو جائے۔ پھر کیا آپ کے اخبارات و رسائل کے صفحات میں کبھی خدا کے لئے ان غیر معمولی کیفیات کا مظاہرہ ہوا ہے جو آپ نے اپنے رہنما کے بارے میں ظاہر کیا ہے۔ اس کے جواب میں وہ خاموش ہو گئے۔

یہ صرف کسی ایک اسلامی تحریک کا معاملہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ہمارے تمام اداروں اور تحریکوں کا حال یہی ہے۔ ان کی مجلسیں اپنے "اکابر" کے تذکرے سے معمور ہیں۔ ہر ایک نے اپنے کچھ بڑے بنا لئے ہیں اور جب ان بڑوں کا نام آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زبان و قلم پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی ہو۔ اس کے برعکس کسی بھی حلقہ میں یہ نظر نہیں آتا کہ وہاں خدا کے چرچے میں لوگوں کو لطف ملتا ہو، خدا کا نام آنے پر لوگوں کے اندر والہانہ کیفیت پیدا ہوتی ہو۔ خدا کی حیثیت بس ایک خشک عقیدہ کی ہے۔ جب کہ ان کی اپنی محبوب شخصیتوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کا نام آتے ہی ان کی پوری ہستی جھوم جاتی ہے۔ ان کے دل و دماغ کا چمن کھل اٹھتا ہے۔ ان کے تصور سے ان کی یادوں کی دنیا میں بہار آ جاتی ہے

خدا اپنے سورج کے ذریعہ سارے عالم کو روشن کر رہا ہے مگر اس کو دیکھ کر کسی پر غیر معمولی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ البتہ دنیا کو یہ بتانے میں وہ فخر محسوس کرتے ہیں کہ ان کی محبوب شخصیت نے سارے عالم کو اپنی تقریروں سے جگمگا دیا ہے۔ ہواؤں کا نظام دیکھ کر انھیں خدا کی کاریگری پر وجد نہیں آتا۔ البتہ اپنے بزرگوں کے کارنامے بتانے کے لئے وہ یہ شان دار الفاظ پا رہے ہیں کہ انھوں نے ساری دنیا میں اپنے فیض کی ہوائیں چلا دی ہیں۔ زمین و آسمان میں خدا کی بے پایاں حکمتیں ان کی روح پر رقص طاری نہیں کرتیں۔ البتہ اپنے محبوب قائد کے فکر و تدبر کی عظمت کو بتانے کے لئے لغت کے سارے الفاظ بھی ان کو ناکافی معلوم ہوتے ہیں۔ خدا نے اپنی بے پناہ طاقت سے زمین و آسمان کو سنبھال رکھا ہے مگر اس کو دیکھ کر ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے نہیں ہوتے۔ البتہ اپنے بڑے ان کو اس طرح دکھائی دے رہے ہیں جیسے وہ تمام ملکوں اور قوموں کو تھامے ہوئے ہیں۔ پانی کا عجیب و غریب انتظام جس نے زمین کو ساری معلوم کائنات میں ایک استثنائی کرہ بنا دیا ہے ان کو حیرانی میں مبتلا نہیں کرتا۔ البتہ اپنے پیشواؤں کے کارنامے بیان کرنے کے لئے وہ پورے جوش سے کہہ اٹھتے ہیں کہ ان کے فیض کے چشمے سے ساری دنیا سیراب ہو رہی ہے —— شاید انسان کسی دکھائی دینے والی چیز کو اپنا مرکز محبت بنانا چاہتا ہے اور جب خالق اس کو دکھائی نہیں دیتا تو وہ کسی مخلوق کو اپنا مرکز محبت بنا لیتا ہے۔

مظلوم قوم کی حمایت، مظلوم فرد سے بے اعتنائی

مسلم کی ایک روایت کے مطابق آخرت میں ایسے لوگ لائے جائیں گے جنھوں نے اسلام کے نام پر جہاد کیا ہوگا۔ قرآن کے علم کو لوگوں کے درمیان پھیلایا ہوگا۔ مال و دولت کو خوب اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہوگا۔ اس کے باوجود وہ لوگ جہنم میں ڈال دئے جائیں گے۔ کیوں کہ انھوں نے یہ سب کچھ شہرت کے لئے کیا ہوگا (۴۰۲) دوسری طرف مسلم ہی کی ایک روایت ہے کہ قیامت میں اللہ تعالےٰ کچھ لوگوں سے کہے گا کہ تم نے میری عیادت نہیں کی۔ تم نے مجھ کو کھانا نہیں کھلایا، تم نے مجھ کو پانی نہیں پلایا۔ وہ لوگ کہیں گے کہ خدایا تو سارے جہان کا مالک ہے، تجھ کو ان چیزوں کی کیا ضرورت۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا فلاں شخص بیمار تھا، تم نے اس کی عیادت نہیں کی۔ فلاں شخص بھوکا تمھارے پاس آیا تم نے اس کو کھانا نہیں کھلایا۔ فلاں شخص نے تم سے پانی مانگا تم نے اس کو پانی نہیں پلایا۔ اگر تم ایسا کرتے تو مجھ کو تم وہاں پاتے (۲۴۵)

عمل کرنے کی ایک جگہ وہ ہے جہاں دیکھنے والے اس کو دیکھتے ہیں اور چرچا کرنے والے اس کا چرچا کرتے ہیں۔ جہاں وہ فوراً اخبار کی خبر بنتا ہے۔ عمل کرنے کی دوسری جگہ وہ ہے جہاں یا تو کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا یا اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہ ایسا واقعہ ہوتا جس کو لوگ چرچا کے قابل نہیں سمجھتے۔ اخبار میں اس کی شان دار سرخی نہیں بنائی جاتی۔ بالفاظ دیگر ایک عمل مجمع عام کی سطح پر کیا جاتا ہے اور دوسرا عمل فرد کی سطح پر۔ پہلے عمل کو "لوگ" دیکھتے ہیں۔ دوسرا عمل وہ ہے جس کو خدا دیکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو ہمارے اسلام کا امتحان جہاں مطلوب ہے وہ "فرد" ہے نہ کہ مجمع عام۔ فرد کی سطح پر جو شخص تقویٰ اور اسلامیت کا ثبوت دے رہا ہے وہی اللہ کی نظر میں مسلم اور متقی ہے۔ عوامی سطح پر اسلامیت کا اظہار شہرت طلبی کی بنا پر بھی ہو سکتا ہے۔ مگر آدمی کے سامنے جب ایک تنہا شخص آتا ہے اور وہ اس کی مدد کرتا ہے تو اس میں شہرت کا کوئی محرک نہیں ہوتا۔

آج مظلوم قوم کی حمایت میں ہر شخص بول رہا ہے مگر مظلوم فرد کی حمایت کرنے والا کوئی نہیں۔ وہی آدمی جو اسٹیج پر ملت کی مظلومی کے بارے میں تقریر کا دریا بہا رہا ہے جب اس کے سامنے ملت کا ایک فرد اپنی مصیبت لے کر آتا ہے تو اس کو فرد کا مسئلہ حل کرنے سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔ ملت پر کوئی افتاد پڑے تو وہ تار اور ٹیلی فون اور ہوائی جہاز کی سی تیزی کے ساتھ اس میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے دوڑ پڑتا ہے۔ مگر اسی ملت کا ایک فرد اپنے مسئلہ کے حل کے لئے اس کو پکارتا ہے تو وہ اس کے سینہ میں پتھر کا سا دل پاتا ہے۔ دور کے مقام پر اخلاق اور انسانیت یا اسلامی قانون پر سمینار ہو تو ہر آدمی چاہتا ہے کہ ہوائی جہاز میں اڑ کر جائے اور "بین اقوامی" سمینار میں ایک شاندار تقریر پیش کرے۔ مگر پڑوس کا ایک آدمی جو اس سے اسلامی سلوک کی بھیک مانگے، جو اس کے سامنے اخلاق اور انسانیت کی دہائی دے رہا ہو، اس کی درخواست کو سننے کے لئے اسے فرصت نہ ہوگی۔

دنیا کا خطرہ آدمی ہمیشہ اپنے اوپر محسوس کرتا ہے

اور آخرت کا خطرہ صرف دوسروں کے اوپر

ایک بار میں ہریانہ کے علاقہ میں بس سے سفر کر رہا تھا۔ لمبی بس تقریباً پوری بھری ہوئی تھی۔ ایک مقام پر سامنے سے آنے والے ٹرک کے لئے اس کو راستہ دینا پڑا۔ برسات کا زمانہ تھا۔ پختہ سڑک کے کنارے مٹی کا حصہ نرم ہو گیا تھا۔ بس کے پہیے ایک طرف زمین پر سڑک سے اتر گئے۔ بس ابھی الٹی نہیں تھی صرف کروٹ ہوئی تھی کہ تمام مسافروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ہر آدمی اپنی سیٹ سے اٹھ کر بھاگنے لگا۔ بس کے دونوں دروازوں پر بے تحاشا ہجوم ہو گیا۔ کچھ لوگ جلدی میں کھڑکی کی طرف سے کود پڑے۔ لوگ اس قدر بے تاب تھے جیسے ہر شخص کو یہ محسوس ہو رہا ہو کہ سارا خطرہ اسی کے لئے ہے اور صرف وہی حادثہ کا شکار ہونے والا ہے۔ میں لوگوں کی گھبراہٹ دیکھنے میں اتنا محو ہوا کہ مجھے یاد نہ رہا کہ اس نازک موقع پر مجھے بھی ان کی پیروی کرنی چاہیے۔

جب آدمی کو کسی خطرہ کا سامنا ہو تو اس کا یہی حال ہوتا ہے۔ خطرہ کا مسئلہ خواہ کروروں آدمیوں کے لئے ہو، ہر آدمی یہی سمجھتا ہے کہ سارا خطرہ بس اسی کے لئے ہے۔ اور سب سے پہلے اسی کو اس سے بچنے کی فکر کرنی چاہیے۔ اس کا ایک تجربہ اگست ۱۹۷۹ میں ۸۰ ٹن کے اسکائی لیب کے سلسلہ میں ہوا۔ امریکہ کی طرف سے اعلان ہوا کہ اسکائی لیب پر کنٹرول ختم ہو گیا ہے اور اندیشہ ہے کہ وہ زمین پر گر پڑے۔ اس خبر کو سن کر ساری دنیا میں ہر شخص اس طرح ڈر گیا جیسے کہ اسکائی لیب اسی کے سر پر گرنے والی ہو —— عجیب بات ہے کہ دنیا کے خطرہ کے بارے میں جو بات لوگوں کو اتنی اہمیت کے ساتھ معلوم ہے۔ اسی بات کو وہ آخرت کے خطرہ کے معاملہ میں بالکل بھول جاتے ہیں۔ دنیا کے خطرہ کو ہر آدمی سب سے پہلے اپنے اوپر آتا ہوا محسوس کرتا ہے اور اس سے بچاؤ کی فکر کرتا ہے۔ مگر آخرت کے خطرہ کے بارے میں وہ اس طرح مطمئن ہے گویا اس کا اندیشہ صرف دوسروں کے لئے ہے۔ اس کی اپنی ذات کے لئے اس سے کوئی اندیشہ نہیں۔

—

ایک تضاد

ایک مسلمان تاجر رات دن تجارت میں مشغول رہتا تھا۔ اسی کے ساتھ کچھ وقتی اور رسمی اعمال کر کے سمجھتا تھا کہ اس نے جنت بھی اپنے لئے رزرو کر رکھی ہے۔ ایک صاحب نے تاجر کو قرآن و حدیث سے کچھ چیزیں سنائیں اور بتایا کہ آخرت کا معاملہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے۔ تاجر نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا: "بابا کاہے کو اتنا ڈیپ میں جاتے ہو تم"۔ انھوں نے کہا: اگر آپ کا انکم ٹیکس کا مقدمہ ہو تو اس میں آپ خوب ڈیپ (گہرائی) میں جائیں گے۔ مگر آخرت کے مقدمہ کے متعلق سمجھتے ہیں کہ بس سرسری طور پر اس میں کامیاب ہو جائیں گے۔ گویا آخرت کا معاملہ اتنا سنجیدہ بھی نہیں جتنا سنجیدہ انکم ٹیکس کا معاملہ ہوتا ہے۔

یہ جنت اور جہنم کے درمیان کھڑا ہونا ہے

لوہے کے ایک ٹکڑے سے سائنسی پیمانہ بنانا ہو تو اس کو شدید ترین آزمائشی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے معیاری پیمانہ کی صورت میں ڈھل سکے جس سے سائنسی تجربوں میں چیزوں کو ناپنے اور اندازہ کرنے کا کام لیا جائے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ شاہد (حق کا گواہ) بننے کا بھی ہے۔ داعی اور شاہد بننا اس زمین پر سب سے مشکل واقعہ کو ظہور میں لاتا ہے۔ یہ خدائی منصب کسی کو اس طرح نہیں مل جاتا کہ وہ کچھ الفاظ لکھ یا بول دے، پریس اور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ کچھ آوازیں لوگوں تک پہنچا دے۔ داعی اور شاہد بننا خدا کی زمین پر خدا کا پیمانہ بننا ہے جس سے حق اور باطل کو ناپا جا سکے۔ یہ اپنے آپ کو خدا کی کوہ شکن تجلیات کی زد میں لے جانا ہے تاکہ وہ ان کو اپنے اوپر لے کر انھیں عام انسانوں کی طرف منعکس کر سکے۔ جس جنت اور جہنم کے درمیان لوگ مرنے کے بعد کھڑے ہونے والے ہیں وہاں اپنے آپ کو جیتے جی پہنچا دینا ہے۔ خدا کا گواہ بننے والا خدا کے ناقابل برداشت عذاب کی لپٹوں کو اپنے اوپر محسوس کرتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو اس سے ڈرائے، وہ خدا کے ثواب کی راحتوں میں بسیرا لیتا ہے تاکہ اس کی خوش خبری لوگوں کو سنا سکے۔ اس طوفان خیز تجربہ کے بعد وہ انسان بنتا ہے جو خدا کی طرف سے بولے اور لوگوں کے اوپر خدا کے دین کا داعی اور شاہد بنے۔

داعی اور شاہد بننا دراصل انسانوں کے درمیان ایسے انسان کو وجود میں لانا ہے کہ تمام صحیح ترین واقعات اس کی نسبت سے قائم ہو جائیں۔ عدل اور ظلم، خدا پرستی اور خدا فراموشی، قبول حق اور انکار حق غرض اخروی اہمیت کی تمام باتوں کے لیے اس کی زندگی معیاری مثال بن جائے۔ داعی اور شاہد کی زندگی میں حق اپنی کامل صورت میں متحقق ہوتا ہے اور باطل اپنی کامل صورت میں مبرہن ہو جاتا ہے۔ داعی اور شاہد کوئی آدمی اس وقت بنتا ہے جب کہ اس کے ذریعہ ایسے کلام کا ظہور ہو جس میں حق صرف حق کی صورت میں دکھائی دے اور باطل صرف باطل کی صورت میں نظر آئے۔ اس کے ذریعہ ایسے حق کو قبول کرنے والے لوگ وجود میں آئیں جنھوں نے خالصۃً اللہ کی خاطر حق کو اختیار کیا ہو۔ اس کے ذریعہ ایسے حق کا انکار کرنے والے لوگ ابھریں جو کامل اظہار حق کے باوجود اس کا انکار کرنے والے بنے ہوں۔ اس سے ایسے واقعات کا صدور ہو جس میں وہ تمام تر انصاف پر ہو اور دوسرا تمام تر بے انصافی پر۔ خدا کی زمین پر اس کی زندگی ایسی سرگزشتوں کی تاریخ ہو جس میں وہ صد فی صد مظلوم ہو اور اس کا فریق صد فی صد ظالم۔

داعی اور شاہد بننا خدا کی زمین پر خدا کی عدالت بننا ہے۔ اور خدا کی عدالت وہی بن سکتا ہے جو اپنے کلام اور لوگوں کے ساتھ اپنے معاملات میں معیار کامل کی حد تک پہنچ گیا ہو۔ وہ خدا کی زمین پر ایسا پیمانہ بن جائے جس پیمانہ سے خدا لوگوں کو ناپے۔ وہ ایسا ترازو بن جائے جس ترازو سے خدا لوگوں کو تولے۔ خدا کا گواہ بننا نہ زبان و قلم کا کمال دکھانے کا نام ہے اور نہ قیادت کا چمتکار دکھانے کا۔ یہ قول ثقیل (مزمل) کا حامل بننا ہے۔ یہ اپنے آپ کو خاشعاً متصدعاً (حشر) کے مقام پر کھڑا کرنا ہے۔ یہ سولی پر چڑھنے اور پھانسی پر لٹکنے سے بھی زیادہ سخت تجربہ ہے۔ یہ مقام اسی کو ملتا ہے جو اپنی شخصیت کی نفی کر کے خدا کی طرف بڑھا ہو، جس نے دنیا کی بربادی کی قیمت پر آخرت کو اختیار کیا ہو۔

ارتقاء تجربہ کی کسوٹی پر

انسان اور دوسرے بے شمار حیوانات کیسے بنے۔ نظریہ ارتقاء کا کہنا ہے کہ وہ ترقی کرتے کرتے اپنی موجودہ صورت میں بن گئے ہیں۔ مثلاً انسان حیوانات ہی کی ایک خاص شاخ کی اگلی ترقی یافتہ صورت ہے۔ یہ شاخ ترقی کرتے کرتے بالآخر بے دُم کے بندر (گوریلا، چمپانزی) تک پہنچی۔ بے دُم کے بندروں کی ارتقائی صورت کا نام انسان ہے۔ گویا بے دُم کے بندر ہمارے قریبی پرکھے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق یہ ممکن ہونا چاہئے کہ بے دم کے بندروں کو ضروری تربیت دے کر ان میں وہ ارتقائی اوصاف پیدا کئے جا سکیں جو آج انسان کے اندر پائے جاتے ہیں۔ اس مفروضہ کی بنا پر یہ مان لیا گیا تھا کہ اس قسم کے بندروں کو تربیت دے کر ان میں انسانی اوصاف پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ تاہم امریکہ میں اس سلسلے کی پچھلے تیرہ سال کی کوششیں مکمل طور پر ناکام ہو گئی ہیں۔ بعض پرجوش ارتقاء پسند اگرچہ اب بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ مایوس نہیں ہیں۔ تاہم حقیقی نتائج ان کی خوش گمانی کی تائید نہیں کرتے۔

ہربرٹ ٹریس (Herbert Terrace) کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے چمپانزی کا ایک بچہ لیا اور گھر کے ماحول میں رکھ کر اس کو پالنا شروع کیا۔ ان کا بنیادی مقصد اس کو بولنا سکھانا تھا۔ مگر چار سال کی مسلسل کوشش کے باوجود انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ ان کا کہنا ہے کہ چمپانزی نے جو کچھ سیکھا وہ اس کے سوا کچھ نہ تھا جو ایک کتا بھی سیکھ لیتا ہے، کتا اپنے مالک کی بعض اشاراتی آوازوں پر حرکت کرتا ہے، اسی طرح چمپانزی بھی۔ چمپانزی نے بعض الفاظ بولنا ضرور سیکھ لیا مگر اس کی کارکردگی کی حقیقت ایک خالص ڈرل سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ پروفیسر ٹریس کے الفاظ میں بولنے کی صلاحیت انسان کی خصوصی صلاحیت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "انسان حیوان ناطق ہے" کی قدیم انسانی تعریف آج کے دور کے لئے بھی صحیح ہے۔

Language still stands as animportanr
definition of the human species.

بے دُم والے بندروں کا حافظہ اچھا ہوتا ہے، اس لئے کئی ایسے گوریلا اور چمپانزی ہیں جنھوں نے مشق کے بعد انسانی زبان کے متعدد الفاظ یاد کر لئے ہیں مگر ڈاکٹر ٹریس کا کہنا ہے کہ لمبی تربیت کے باوجود وہ اس صلاحیت کا ثبوت نہ دے سکے کہ متفرق یاد کئے ہوئے الفاظ کو جوڑ کر ایک بامعنی جملہ بنا سکیں۔ ڈاکٹر ٹریس نے یہ تربیتی سلسلہ نومبر ۱۹۷۳ میں شروع کیا تھا۔ ڈاکٹر ٹریس نے تربیت یافتہ چمپانزی کا ٹیپ لوگوں کو سنایا۔ چمپانزی یاد کئے ہوئے الفاظ دہرا رہا تھا۔ مگر تمام الفاظ بے ترتیب تھے، جیسے کوئی شخص لکھے ہوئے الفاظ کا متفرق کارڈ بے ربط طور پر نکال رہا ہو۔ مثلاً چمپانزی کی ایک "گفتگو" کے الفاظ یہ تھے (ٹائمس آف انڈیا ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۹)

give orange me give eat orange me eat
orange give me eat orange give me you

انسان کا بچہ اپنے گھر میں خود بخود بولنا سیکھ لیتا ہے۔ مگر چمپانزی اسی گھر میں ماہرین کی خصوصی تربیت کے باوجود کچھ نہ سیکھ سکا۔ وہ چند رٹائے ہوئے الفاظ کو بے ربط طور پر دہراتا رہا۔ یاد کئے ہوئے الفاظ کو جوڑ کر ایک بامعنی جملہ بنانے پر وہ قادر نہ ہو سکا۔

خدا کی دنیا کتنی حسین ہے

جب آپ اپنے کمرہ میں ہوں تو آپ اس کی چھت کو ناپ کر معلوم کر سکتے ہیں کہ اس کی لمبائی کتنی ہے اور چوڑائی کتنی۔ مگر جب آپ کھلے میدان میں آسمان کے نیچے ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کی چھت کی لمبائی اور چوڑائی کو ناپنے کے لئے آپ کے تمام پیمانے ناکافی ہیں۔ یہی حال خدا کی پوری کائنات کا ہے۔ ایک بیج جس طرح بڑھ کر درخت کی ایک دنیا بناتا ہے اس کو کون بیان کر سکتا ہے۔ سورج کی روشنی، ہواؤں کا نظام، چڑیوں کے نغمے، پانی کے بہتے ہوئے چشمے اور اسی طرح کی بے شمار چیزیں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ان کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

سچائی اس سے زیادہ لطیف ہے کہ اس کو انسانی لفظوں میں بیان کیا جا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں زبان گنگ ہو جاتی ہے وہاں سے حقائق شروع ہوتے ہیں۔ جہاں الفاظ ساتھ نہیں دیتے وہاں سے معانی کا آغاز ہوتا ہے۔ خدا چپ کی زبان میں بول رہا ہے اور ہم اس کو شور کی زبان میں سننا چاہتے ہیں۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ ہم خدا کی آوازوں کو سن سکیں۔ اس دنیا کی سب سے قیمتی باتیں وہ ہیں جو چپ کے بول میں نشر ہو رہی ہیں مگر جو لوگ صرف شور وغل کی بولیاں سننا جانتے ہوں وہ ان قیمتی باتوں سے اسی طرح ناآشنا رہتے ہیں جس طرح ایک بہرا شخص کسی عمدہ موسیقی سے۔

خدا کی دنیا بے حد حسین ہے۔ اس کے حسن کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ آدمی جب اس دنیا کو دیکھتا ہے تو بے اختیار اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ خدا کی اس ابدی دنیا کا باشندہ بن جائے ——— وہ ہواؤں میں شامل ہو جائے وہ درختوں کی سرسبزیوں میں جا بسے۔ وہ آسمان کی بلندیوں میں کھو جائے۔ مگر انسان کی محدودیتیں اس کی اس خواہش کی راہ میں حائل ہیں۔ وہ اپنی محبوب دنیا کو دیکھتا ہے مگر اس میں شامل نہیں ہو پاتا۔ شاید جنت اسی کا نام ہے کہ آدمی کو اس کی محدودیتوں سے آزاد کر دیا جائے تاکہ وہ خدا کی حسین دنیا میں ابدی طور پر داخل ہو جائے۔

انسان نے جو تمدنی دنیا بنائی ہے وہ خدا کی دنیا سے کس قدر مختلف ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی سواریاں شور اور دھواں پیدا کرتی ہیں مگر خدا کی دنیا میں روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے اور نہ کہیں شور ہوتا ہے اور نہ دھواں۔ انسان انسانوں کے درمیان اس طرح رہتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے طرح طرح کی تکلیفیں پہنچتی رہتی ہیں، مگر خدا کی دنیا میں ہوا اس طرح گزرتی ہے کہ وہ کسی سے نہیں ٹکراتی۔ انسان اپنی غلاظت کو کاربن اور پسینہ اور بول و براز کی صورت میں خارج کرتا ہے مگر خدا نے اپنی دنیا میں جو درخت اگائے ہیں وہ اس کے برعکس اپنی کثافت کو آکسیجن کی صورت میں خارج کرتے ہیں اور پھول اپنی کثافت کو خوشبو کی صورت میں۔ انسان کے بنائے ہوئے تمام شہروں میں کوڑے کو ٹھکانے لگانا ایک ناقابل حل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ مگر خدا کی بنائی ہوئی وسیع تر دنیا میں ہر روز بڑے پیمانہ پر "کوڑا" نکلتا ہے مگر کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ کیوں کہ اس کو Recycle کرکے دوبارہ کائنات کے مفید اجزاء میں تبدیل کر دیا جاتا ہے ———

جو شخص حقیقت کی جھلک دیکھ لے وہ اس کے بیان سے اپنے کو عاجز محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس پر چپ طاری ہو جاتی ہے نہ یہ کہ وہ لفظوں کا سیلاب بہانے لگے۔

سچائی کو وہی پاتا ہے جو سچائی کا طالب ہو

معانی کی دنیا خدا کے جلووں کی دنیا ہے۔ کون ہے جو خدا کے جلووں کو انسانی زبان میں بیان کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں الفاظ ختم ہو جاتے ہیں وہاں سے معانی کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم جب کسی معنی کو بیان کرتے ہیں تو ہم اس کو بیان نہیں کرتے بلکہ اس کو کچھ گھٹا دیتے ہیں۔ اس کے اوپر ایک لفظی پردہ ڈال دیتے ہیں۔ کسی باطنی حقیقت کو کوئی شخص محض اس کے الفاظ سے سمجھ نہیں سکتا۔ ایک اندھا شخص کسی کے بتانے سے یہ نہیں جان سکتا کہ پھول کیا ہے۔ اسی طرح ایک شخص جس نے معنوی حقائق کو دیکھنے کی صلاحیت اپنے اندر نہ جگائی ہو وہ معنوی حقائق سے باخبر نہیں ہو سکتا۔ خواہ ڈکشنری کے تمام الفاظ اس کے سامنے دہرا دئے جائیں، خواہ قاموس المعانی کی تمام جلدوں کو اسے پڑھا دیا جائے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ مگر اس کتاب سے ہدایت اسی کو ملتی ہے جو اپنے اندر تقویٰ کی صفت رکھتا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سچائی اسی کو ملتی ہے جس کے دل میں سچائی کی کھٹک موجود ہو۔ جو شخص سچائی کی تلاش میں ہو، سچائی جس کی ضرورت بن گئی ہو، جو سچائی کو پانے کے لئے اتنا بے قرار ہو کہ وہ اسی کی یاد لے کر سوتا ہو اور اسی کی یاد لے کر جاگتا ہو۔ جو آدمی اس طرح سچائی کا طالب ہو، قرآن اسی کے لئے ہدایت بنتا ہے۔ ایسا شخص گویا ہدایت کا نصف راستہ طے کر چکا ہے۔ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے عہد الست کی خدائی آوازوں کو سن رہا ہے۔ وہ اپنے اندر اس صلاحیت کو بیدار کر چکا ہے جو معانی کی زبان کو سمجھتی ہے۔ ایسا شخص مادی دنیا سے بے رغبتی کی وجہ سے عالم حقائق سے اتنا قریب آجاتا ہے کہ وہ فرشتوں کی سرگوشیوں کو سننے لگتا ہے۔ نبوت کا علم ملنے سے پہلے یہ تمام تجربات آدمی کے اندر مبہم اور مجہول انداز میں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جب قرآن کی آواز اس کے اندر داخل ہوتی ہے تو وہ اس کی کتاب فطرت کی تفسیر بن جاتی ہے۔ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے غیر ملفوظ اشارات کو ملفوظ زبان میں پالیتا ہے۔ قرآن اور قرآن کو پڑھنے والا دونوں ایک دوسرے کا مثنیٰ بن جاتے ہیں۔ قرآن وہ بن جاتا ہے اور وہ قرآن:

تماشے کی باتوں میں

السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا (بمبئی) انگریزی کا مشہور ہفت روزہ ہے۔ وہ ۱۸۸۰ میں جاری ہوا۔ اس کی ۱۰ جون ۱۹۷۵ کی اشاعت کرکٹ نمبر تھی جس کا عنوان تھا: "ورلڈ کپ کرکٹ اسپیشل" یہ اشاعت ۵۰۰۰۰۰ کی تعداد میں چھپی۔ یہ تعداد اس کی پچھلے سو برس کی تمام اشاعتوں میں سب سے زیادہ ہے ——— آج کی دنیا میں لوگ کھیل تماشے کی باتوں کے سب سے زیادہ خریدار ہوتے ہیں۔ سنجیدہ باتوں سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ آدمی سطحی چیزوں میں اتنا زیادہ کھویا ہوا ہے کہ گہری باتوں میں دھیان دینے کا اسے خیال بھی نہیں آتا۔

تعلقات کی بنیاد

اور ابراہیم نے کہا: اللہ کے سوا جن بتوں کو تم نے پکڑ رکھا ہے وہ صرف دنیا کے باہمی تعلقات کی وجہ سے ہے۔ پھر قیامت کے دن تم میں سے ایک دوسرے کا مخالف ہوگا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور تمہارا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا۔ (عنکبوت ۲۵)

ابراہیم علیہ السلام نے قدیم عراق کے باشندوں کو دعوت دی کہ اللہ کی عبادت کرو، اللہ سے ڈرو اور شرک سے بچو۔ یہ دعوت لوگوں کو اتنی سخت معلوم ہوئی کہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ خدا کے پیغمبر کو مار ڈالیں یا اس کو زندہ جلادیں۔ قوم کی طرف سے اتنا سخت ردعمل کیوں ظاہر ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شرک ان کے لئے تعلقات دنیا کی بنیاد بنا ہوا تھا۔ شرک کو چھوڑنا اور پیغمبر کا ساتھ دینا دنیوی تعلقات کو توڑنے کے ہم معنی نظر آتا تھا۔ اپنی دنیا کو بچانے کے لئے انھوں نے طے کیا کہ پیغمبر کی تحریک کو ختم کر ڈالیں۔

آدمی ہمیشہ قوم یا گروہ کے ساتھ جیتا ہے۔ جن لوگوں کے درمیان باہمی موانست ہو جاتی ہے وہ اس انس کی بنا پر ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ لین دین کرتے ہیں ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں۔ ایک کو دوسرے سے نفسیاتی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اس قسم کی اجتماعیت یا گروہ بندی حقیقۃً دنیوی محرک کے تحت ہوتی ہے مگر اعتقادی بنیاد یا نظریاتی علامت کے طور پر کچھ چیزیں ان کے درمیان محترم ہو جاتی ہیں۔ کبھی کوئی بت، کبھی کوئی شخصیت، کبھی اور کوئی مادی یا غیر مادی تصور۔ یہ مرکز محبت جو لوگوں کو جوڑتا ہے، اس کی شدید طور پر حفاظت کی جاتی ہے۔ کیوں کہ لوگوں کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کے ٹوٹتے ہی ان کے دنیوی مفادات کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ آدمی جس نظام مودّت سے وابستہ ہو اس سے علیٰحدگی عام حالات میں بھی مشکلات کا باعث ہوتی ہے اور اگر یہ علیٰحدگی ایک ایسے شخص کا ساتھ دینے کے نتیجہ میں ہو جو مروجہ نظام مودت کا ناقد بنا ہوا ہو تو پھر مشکلات کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ پیغمبر بتاتا ہے کہ مرکز محبت بنانے کے قابل ذات صرف خدا کی ہے۔ وہی حقیقی طور پر یہ شان رکھتا ہے کہ انسان اس کو اپنا معبود بنائے اور اس کی بنیاد پر اپنے اجتماعی تعلقات کی تنظیم کرے۔ اس کے سوا ہر سہارا جھوٹا ہے۔ کسی بھی دوسری چیز کو حقیقی طور پر معبودیت کا یہ مقام حاصل نہیں۔ خدا کے سوا آدمی جس کو یہ مقام دے وہ اس کے لئے دھوکا ثابت ہوگا۔ آخرت میں جب حقیقت کھلے گی تو غیر اللہ کی بنیاد پر باہم محبت کرنے والے ایک دوسرے پر لعنت کریں گے اور ایک دوسرے سے دور بھاگیں گے۔

کتنے لوگ ہیں جو اپنے ہم قوم اور اپنے حلقہ والوں کے درمیان بہت با اخلاق دکھائی دیں گے۔ مگر جہاں مودّت کا یہ رشتہ نہ ہو وہاں ان سے کسی اخلاق کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ان کی خوش خلقی، شرافت، فیاضی، تعاون اور ایفائے عہد ان لوگوں کے لئے ہے جو ان کے "معبود بھائی" ہوں۔ جن سے اس قسم کی دوستی اور تعلق نہ ہو، ان کو وہ اخلاق کا تحفہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ان کی اخلاقیات ان کی مودّت دنیا کے نظام کے تابع ہے نہ کہ خدا کے تابع۔

آپ کا اخلاق

فرانس کے مشہور فلسفی والٹیر (۱۷۷۸ - ۱۶۹۴) نے کہا تھا کہ کوئی شخص اپنے قریبی لوگوں میں ہیرو نہیں ہوتا:

No one is A Hero To His valet

کیوں کہ قریبی لوگوں کی نظر میں آدمی کی نجی زندگی ہوتی ہے اور نجی زندگی میں کوئی بھی کامل نہیں ہوتا۔ دور والوں کو ایک شخص جتنا اچھا معلوم ہوتا ہے، قریب کے لوگوں کو وہ اتنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے قریبی لوگوں کے اندر اس کے بارے میں ہیرو کے جذبات پیدا نہیں ہوتے۔ مگر سورن اسمتھ نے لکھا ہے کہ یہ کلیہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق نہیں آتا، کیوں کہ تاریخ بتاتی ہے کہ جو شخص جتنا زیادہ آپ سے قریب تھا، اتنا ہی زیادہ وہ آپ کی خوبیوں کا شیدائی تھا۔

زید بن حارثہ رض قبیلہ کلب کے ایک شخص حارثہ بن شراحیل کے لڑکے تھے۔ ان کی ماں سُعدی بنت ثعلبہ تھیں جو قبیلہ طے کی ایک شاخ بنی معن سے تعلق رکھتی تھیں۔ زید جب آٹھ سال کے تھے، اس وقت ان کی ماں ان کو لے کر اپنے میکے گئیں۔ وہاں بنی قین بن جسر کے لوگوں نے ان کے پڑاؤ پر حملہ کیا۔ وہ جو کچھ لوٹ کر لے گئے اس میں زید بھی تھے۔ اس کے بعد انھوں نے عکاظ کے میلے میں لے جاکر ان کو بیچ دیا۔ ان کو حکیم بن حزام نے خرید یا جو حضرت خدیجہ رض کے بھتیجے تھے۔ وہ اس بچہ کو مکہ لائے اور غلام کی حیثیت سے اپنی پھوپھی کو دے دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت خدیجہ سے ہوا تو حضرت خدیجہ نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دے دیا۔ اس وقت زید کی عمر ۱۵ سال تھی۔ کچھ عرصہ بعد زید رض کے باپ اور چچا کو معلوم ہوا تو وہ مکہ آئے تاکہ اپنے بچے کو حاصل کرکے اپنے ساتھ لے جائیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور کہا کہ آپ جو فدیہ لینا چاہیں ہم دینے کے لئے تیار ہیں۔ آپ ہمارا بچہ ہم کو دے دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے کوئی فدیہ نہیں چاہئے۔ اگر لڑکا تمھارے ساتھ جانا چاہے تو تم اس کو لے جاسکتے ہو۔ آپ نے زید کو بلایا اور کہا ان کو پہچانتے ہو۔ انھوں نے کہا ہاں، یہ میرے باپ اور چچا ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ لوگ تم کو لے جانا چاہتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو ان کے ساتھ اپنے گھر جاسکتے ہو۔ زید رض نے جواب دیا: میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہ سن کر ان کے باپ اور چچا بگڑ گئے۔ انھوں نے کہا: تم آزادی کو چھوڑ کر غلامی کو پسند کرتے ہو اور اپنوں کو چھوڑ کر غیروں میں رہنا چاہتے ہو۔ زید نے کہا: میں نے محمد صلعم کے اندر جو خوبیاں دیکھی ہیں اس کے بعد اب میں کسی کو بھی ان کے اوپر ترجیح نہیں دے سکتا۔ اس کے بعد زید کے باپ اور چچا اپنے وطن کو واپس چلے گئے ـــــ یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی خصوصیت کی طرف قرآن میں ان لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے:

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولك (آل عمران ۱۵۹)

یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان کے لئے نرم ہو۔ اگر تم درشت اور سخت دل ہوتے تو وہ تمھارے پاس سے منتشر ہو جاتے

جب کرتب بازی کو کمال سمجھا جانے لگے

کہا جاتا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں ایک شخص آیا اور کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں اپنا ایک کرتب دکھاؤں۔ ہارون رشید نے اجازت دے دی۔ آدمی نے اس کے بعد اپنی جھولی سے بارہ بڑی بڑی سوئیاں نکالیں۔ اس نے ایک سوئی کو ہاتھ میں لے کر پھینکا تو وہ ایک فاصلہ پر جاکر کھڑی صورت میں زمین پر گڑ گئی۔ اب اس نے دوسری سوئی پھینکی تو وہ پہلی سوئی کے سوراخ میں جاکر اٹک گئی۔ پھر اس نے تیسری سوئی پھینکی تو وہ دوسری سوئی کے سوراخ میں پیوست ہو گئی۔ اسی طرح وہ ایک ایک سوئی پھینکتا گیا اور ہر سوئی اپنے سے پہلے والی سوئی کے سوراخ میں داخل ہوتی چلی گئی، اور بالآخر بارہ سوئیوں کا ایک جال بن گیا۔ ہارون رشید حیرت کے ساتھ یہ تماشا دیکھتا رہا۔ آخر میں اس نے دس درہم ہاتھ میں لے کر آدمی کی طرف پھینکے اور کہا خذ ھا اف لك (اس کو لے، تجھ پر افسوس ہے) کاش تو نے کسی مفید کام میں یہ مہارت پیدا کی ہوتی۔

جب مسلمان زندہ تھے تو ان کو معلوم تھا کہ کرتب بازی میں اور ایک حقیقی کام میں کیا فرق ہے — مگر آج انھیں مسلمانوں کی بے شعوری کا یہ حال ہے کہ وہ اس فرق سے بے خبر ہو کر کرتب بازی پر وہ داد دے رہے ہیں جو صرف حقیقی عمل پر دی جانی چاہئے۔ قافیہ میں قافیہ ملانے والے شاعر، الفاظ کا گلدستہ بنانے والے مقرر، سیاسی شوشوں سے قوم کا مستقبل برآمد کرنے والے قائد، سب اسی قسم کے کرتب باز ہیں جیسے ہارون رشید کے زمانہ کا مذکورہ شخص۔ مگر ہارون رشید نے اپنے زمانہ کے کرتب باز سے کہا تھا کہ تیرا برا ہو۔ جب کہ آج کے کرتب بازوں کو شان دار خطابات مل رہے ہیں اور ہر طرف ان کے استقبالیہ جلسوں کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ موجودہ زمانہ کے کرتب بازوں کی فہرست میں سب سے آگے وہ انقلابی قائدین ہیں جو تقریروں کے ذریعہ ہر روز شان دار محل کھڑے کرتے رہتے ہیں۔ ہارون کے زمانہ کے آدمی نے اگر سوئیوں کا کھیل دکھایا تھا تو یہ لفظوں کے کھیل دکھا رہے ہیں۔ ایک قائد ایک "عظیم اسلامی اجتماع" میں تقریر کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی پر جوش تقریر کو اس جملہ پر ختم کیا — "مسلم نوجوانوں کو میرا پیغام ہے کہ کفر کے چراغ کو جہاں پاؤ بجھا دو"

اس قسم کی مجاہدانہ تقریریں آج ساری مسلم دنیا میں گونج رہی ہیں۔ انھوں نے مسلم نوجوانوں کو انتہائی جذباتی بنا دیا ہے مگر "کافر اقوام" پر ان کا بس نہیں چلتا۔ کیوں کہ ان قوموں نے طاقت کے تمام اسباب جمع کر کے اپنے کو انتہائی طاقت ور بنا لیا ہے اور مسلمان ان کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے بے حد پیچھے ہیں۔ تاہم لوگوں کے بڑھے ہوئے جوش جہاد کو کوئی نشانہ درکار تھا۔ چنانچہ اب ہر ایک نے خود اپنے مسلم بھائیوں میں "کفر کے چراغ" دریافت کر لئے ہیں اور ہر ایک ان کو بجھانے میں مشغول ہے۔ کہیں یہ جہاد گولیوں کی بوچھار کے ذریعہ جاری ہے اور جہاں اس کے مواقع نہیں ہیں وہاں اس سے کمتر کسی کارروائی کی صورت میں۔ کفر کا چراغ بجھانے کا نعرہ عملاً اسلام کا چراغ بجھانے کے ہم معنی بن گیا ہے۔ کہیں فوجیں خود اپنے ملک پر چڑھائی کر کے فتح کے جھنڈے لہرا رہی ہیں۔ کہیں قائدین خود اپنے مسلمان سیاسی حریفوں کو قتل کر کے مجاہد کا لقب لے رہے ہیں۔ کہیں کوئی جماعت خود اپنے بھائی کو جارحانہ کارروائیوں کا نشانہ بنا کر باطل کو مٹانے کا کارنامہ انجام دے رہی ہے۔

آزمائش کا قانون

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی نظر میں کوئی شخص صادق الایمان (عنکبوت ۳) اور مستحق جنت (بقرہ ۲۱۴) صرف اس وقت بنتا ہے جب کہ وہ فتنہ (آزمائش) میں پورا اترا ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی نجات کا دار و مدار محض مقررہ فرائض کی ادائگی پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کا فیصلہ تمام تر اس لمحہ خاص میں انسان کے رویہ پر ہوتا ہے جب کہ اس کا رب اس کو آزماتا ہے۔ ایک شخص مقررہ اعمال (نماز، روزہ، حج وغیرہ) تو خوب اہتمام کے ساتھ ادا کر رہا ہے مگر جب خلاف مزاج صورت پیش آئے یا غیر معمولی حالات میں بندۂ خدا ہونے کا ثبوت دینا ہو تو وہ مومنانہ روش پر قائم نہ رہے۔ جو شخص ایسا کرے، گویا کہ وہ عین اس وقت ناکام ہو گیا جب کہ اس کو سب سے زیادہ کامیابی کا ثبوت دینا چاہئے تھا۔ بائبل کے الفاظ میں، آدمی رات بھر اپنے "محبوب" کے انتظار میں جاگتا رہا اور صبح کو ٹھیک اس وقت سو گیا جب کہ محبوب کی سواری اس کے پاس سے گزر رہی تھی۔

اسلام کا طریقہ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے وَمَن يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً (نساء-۱۰۰) جو کوئی وطن چھوڑے اللہ کی راہ میں، وہ پائے گا اس کے مقابلہ میں جگہ بہت اور کشائش ——— گویا جھگڑے کے مقام پر کٹ مرنا اسلام کا طریقہ نہیں۔ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ جب جھگڑے کی صورت پیدا ہو تو مقام عمل کو تبدیل کر دو۔ کوئی شخص انسانی خیر خواہی اور اعتماد علی اللہ کے جذبہ سے جب ایسا اقدام کرتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ "مقام ہجرت" پر اس سے زیادہ بڑے مواقع اس کا انتظار کر رہے تھے جو مقام وطن پر اس کے لئے تھے یا ہو سکتے تھے

مومن اور غیر مومن کا فرق

مومن وہ ہے جو غلطی کر کے پلٹ آئے۔ جو غصہ ہونے کے بعد معاف کر دے۔ عزت کا سوال جس کو اعتراف سے روکنے والا ثابت نہ ہو۔ اس کے برعکس جس کا حال یہ ہو کہ وہ غلطیوں میں لپٹا رہے۔ کسی سے ایک بار خفگی ہو جائے تو اس کو معاف کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ جو کسی حال میں اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف نہ کرے۔ وہ اللہ کی نظر میں مومن نہیں ہے، خواہ دنیا میں اس نے ایمان و اسلام کے کتنے ہی تمغے اپنے اوپر لگا رکھے ہوں ——— یہ بات آج خواہ کتنی ہی چھپی ہوئی ہو۔ آخرت کے دن وہ اس طرح کھل جائے گی کہ اندھے بھی اس کو دیکھیں اور بہرے بھی اس کو جان لیں۔ موجودہ دنیا میں آدمی اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرنا چاہے تو اس کو اپنی غلطی کی تاویل کے لئے خوبصورت الفاظ مل جاتے ہیں۔ کوئی شخص دنیوی رونق اور مقبولیت حاصل کرے تو اس کی رونق اور مقبولیت وہ پردہ بن جاتی ہے جس میں اس کی ہر نالائقی چھپ جاتی ہے۔ مگر آخرت میں اس قسم کی کوئی چیز آدمی کے کام نہ آئے گی۔

یہ گونگے شاہکاروں کا عجائب خانہ نہیں

تمام سفروں میں ٹرین کا سفر سب سے زیادہ تجربات سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ انسانی قافلوں کو لئے ہوئے تیز رفتار ایکسپرس دوڑی چلی جا رہی ہے۔ گاڑی کے دونوں طرف قدرت کے مناظر مسلسل ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس طرح ٹرین گویا زندگی کے بڑے سفر کی ایک علامت بن گئی ہے جو نشانیوں سے بھری ہوئی ایک دنیا میں انسان طے کر رہا ہے۔ مگر جس طرح ٹرین کے مسافر اطراف کے مناظر سے بے خبر ہو کر اپنی ذاتی دلچسپیوں میں گم رہتے ہیں۔ اسی طرح انسان موجودہ دنیا میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ خدا کی بکھری ہوئی نشانیوں پر غور کرے۔

سورج اپنے روشن چہرہ کے ساتھ طلوع ہوتا ہے اور انسان کے اوپر اس طرح چمکتا ہے جیسے وہ کوئی پیغام سنانا چاہتا ہو۔ مگر وہ کچھ کہنے سے پہلے غروب ہو جاتا ہے۔ درخت اپنی ہری بھری شاخیں نکالتے ہیں، دریا اپنی موجوں کے ساتھ رواں ہوتا ہے۔ یہ سب بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مگر انسان ان کے پاس سے گزر جاتا ہے بغیر اس کے کہ ان کا کوئی بول اس کے کان میں پڑا ہو۔ آسمان کی بلندیاں، زمین کی رعنائیاں سب ایک عظیم "اجتماع" کے شرکار معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک خاموش کھڑا ہوا ہے۔ وہ انسان سے ہم کلام نہیں ہوتا۔

یہ عظیم کائنات کیا گونگے شاہکاروں کا عجائب خانہ ہے۔ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس خدا کا ایک پیغام ہے اور اس کو وہ ابدی زبان میں نشر کر رہا ہے۔ مگر انسان دوسری آوازوں میں اتنا کھویا ہوا ہے کہ اس کو کائنات کا خاموش کلام سنائی نہیں دیتا۔ ایک سفر میں ہم ایک درمیانی اسٹیشن پر نماز پڑھنے کے لئے اترے۔ اسٹیشن کے آدمیوں سے پوچھا کہ "پچھم کس طرف ہے"۔ مگر کسی کے پاس اس سادہ سے سوال کا جواب نہ تھا۔ میں نے سوچا "سورج ایک روشن ترین حقیقت کی حیثیت سے روزانہ ان کے اوپر نکلتا ہے اور ڈوبتا ہے۔ مگر لوگ اپنے آپ میں اتنا گم ہیں کہ ان کو مشرق و مغرب کا پتہ نہیں۔ پھر وہ لطیف پیغام جو سورج اور اس کے کائناتی ساتھی اپنی خاموش زبان میں نشر کر رہے ہیں ان سے کیسے کوئی باخبر ہو سکتا ہے۔

ہماری ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی۔ میں باہر آ کر پلیٹ فارم پر کھڑا ہو گیا۔ سورج ابھی ابھی غروب ہوا تھا۔ ہرے بھرے درخت، ان کے پیچھے سرخی ملی ہوئی روشنی اور اس کے اوپر پھیلے ہوئے بادل، عجیب آفاقی حسن کا منظر پیدا کر رہے تھے۔ "ان میں یہ حسن ان کی بلندی نے پیدا کیا ہے" میں نے سوچا۔ "مگر انسان اس بلندی تک جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اس سطح پر نہیں جیتا جس سطح پر درخت جی رہے ہیں۔ وہ وہاں بسیرا نہیں لیتا جہاں روشنی اور بادل بسیرا لئے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس وہ سطحی مفادات میں جیتا ہے۔ وہ جھوٹی دوستی اور جھوٹی دشمنی میں سانس لیتا ہے۔ کائنات کا ہم سفر بننے کے بجائے اپنے آپ کو وہ اپنی ذات کے خول میں بند کر لیتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں جنتی فضائیں اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ وہاں وہ اپنے آپ کو دوزخ کے ماحول میں ڈال دیتا ہے۔ انسانی دنیا کے بگاڑ کی ساری وجہ یہی ہے۔ اگر وہ بلند سطح پر جینے لگے تو اس کی زندگی میں بھی وہی حسن آ جائے جو قدرت کے حسین مناظر میں دکھائی دیتا ہے۔ (۱۶ مارچ ۱۹۷۹)

اخلاق کی طاقت

۱۹۲۳ کا واقعہ ہے۔ فتح گڑھ (اترپردیش) کے علاقہ میں سکھوا نامی ڈاکو نے سنسنی پھیلا رکھی تھی۔ اس کی لوٹ مار بے پناہ ہوتی جارہی تھی۔ پولیس کے افراد تک کے لئے ممکن نہیں رہا تھا کہ اس کی گولیوں کا نشانہ بننے سے بچ سکیں۔ مگر عین اس زمانہ میں بھی ایک اعلیٰ انتظامی افسر اس کی فہرستِ انتقام سے مستثنیٰ تھا۔ یہ سید صدیق حسن آئی سی ایس (وفات ۱۹۶۳) تھے۔ صدیق حسن صاحب اس زمانہ میں فتح گڑھ میں جوائنٹ مجسٹریٹ تھے۔ سکھوا ڈاکو کے خلاف پولس کی مہم انھیں کی ماتحتی میں چلائی گئی۔ مہینوں کی جدوجہد کے بعد سکھوا ڈاکو گرفتار ہوا اور صدیق حسن صاحب نے اس کے مقدمہ کی سماعت کرکے اس کو سزا کا حکم سنایا۔ مگر عین اس زمانہ میں جب کہ صدیق حسن صاحب سکھوا ڈاکو کے خلاف مہم کی قیادت کر رہے تھے، سکھوا ڈاکو نے ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ گرفتاری کے بعد اس نے بتایا کہ وہ اکثر رات کو صدیق حسن صاحب کے بنگلہ پر آتا تھا۔ مگر ان کی شرافت کا خیال کرکے کبھی ان پر گولی نہیں چلائی۔

سید صدیق حسن صاحب کی وہ کیا بات تھی جس کی وجہ سے ایک ڈاکو بھی ان کی تعریف اور عزت کرتا تھا۔ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوتا ہے جو خود سکھوا ڈاکو نے بتایا۔ اس نے کہا کہ ایک بار پولس والے اس کو گرفتار کرکے سید صدیق حسن صاحب کے بنگلہ پر لائے۔ یہ سردی کا زمانہ تھا۔ سکھوا نے صدیق حسن صاحب سے کہا: "جنٹ صاحب آپ کا سکھوا سردی کھا رہا ہے"۔ یہ سن کر صدیق حسن صاحب فوراً اندر گئے۔ اپنی نئی ریشمی قمیص اور کمبل لائے اور اس کو ڈاکو کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "لو اس کو استعمال کرو۔ یہ تمھارے لئے ہے" (۱۷ مئی ۱۹۶۸)

کوئی شخص خواہ کتنا ہی نہتا ہو اس کے پاس ایک ایسا ہتھیار موجود رہتا ہے جس سے وہ اپنے حریف کو جیت سکے۔ یہ اخلاق کا ہتھیار ہے۔ ایک حکیم صاحب تھے۔ وہ شہر میں مطب کرتے تھے اور ہفتہ میں ایک دن اپنے گاؤں آیا کرتے تھے۔ ان سے ان کے گاؤں کے بعض لوگوں کو دشمنی ہوگئی۔ انھوں نے ایک آدمی کو چند سو روپے دئے اور کہا کہ رات کو جب حکیم صاحب واپس آرہے ہوں تو ان کو پکڑ کر مار ڈالو۔ غریب آدمی روپے کے لالچ میں تیار ہوگیا اور گاؤں کے باہر پل کے پاس چھپ کر بیٹھ گیا۔ حکیم صاحب پل کے پاس پہنچے تو وہ جھپٹ کر سامنے آگیا۔ حکیم صاحب اس کو دیکھتے ہی پہچان گئے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ وہ ان کو مار ڈالنا چاہتا ہے تو انھوں نے کہا کہ ذرا ٹھہرو۔ اس کے بعد انھوں نے کہا "کیا تم کو وہ دن یاد نہیں جب تم اپنے چھوٹے بچے کو ٹوکرے میں رکھ کر میرے پاس لائے تھے۔ بیماری نے اس کا برا حال کر دیا تھا اور تمھارے پاس علاج کے لئے پیسے نہیں تھے۔ میں نے تمھارے لڑکے کا مفت علاج کیا اور وہ اچھا ہوگیا۔ کیا میرے اس احسان کا بدلہ وہی ہے جو تم اب میرے ساتھ کرنا چاہتے ہو"۔ یہ سنتے ہی آدمی نے اپنی لاٹھی پھینک دی اور حکیم صاحب کے پاؤں پر گر پڑا۔ اس نے کہا: "آپ نے سچ کہا۔ میں روپے کے لالچ میں آپ کو مارنے کے لئے تیار ہوگیا تھا۔ مگر اب میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ آپ مجھے معاف کر دیں"۔ ایک جانور کو کسی قسم کی اخلاقی دلیل حملہ کرنے سے روک نہیں سکتی۔ مگر انسان کو جیتنے کے لئے ایک اخلاقی دلیل بھی کافی ہے بشرطیکہ وہ حقیقی معنوں میں ایک اخلاقی دلیل ہو نہ کہ محض الفاظ کا ایک مجموعہ۔

آدمی کو ایک ایسی ہستی چاہئے جو اس کی انا کو توڑ دے

محمد حاجی کٹی حسن (تلیچری - کیرلا) ایک صوفی قسم کے آدمی ہیں۔ وہ سات زبانیں جانتے ہیں۔ "آپ سات زبانوں میں گفتگو کر سکتے ہیں اور مزید کچھ زبانوں کو سیکھ رہے ہیں" ایک شخص نے ان سے کہا۔ حاجی کٹی حسن نے جواب دیا، یہ صحیح ہے مگر "میں جس زبان کو بولنا سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں وہ صرف محبت کی زبان ہے (سنڈے کلکتہ، ۱۶ اپریل ۱۹۷۸)

محمد حاجی کٹی حسن کی ملاقات محمد علی باکسر سے ہوئی۔ ۱۹۷۳ کی ایک ملاقات میں، جب کہ دونوں سنگاپور میں تھے، محمد علی نے پوچھا: "جنت کہاں ہے" صوفی حسن نے جواب دیا "وہ ہر جگہ ہے"۔ محمد علی نے دوبارہ کہا: "ہماری دنیا تین ابعاد کی دنیا ہے۔ یہاں وہ دکھائی نہیں دیتی"۔ صوفی حسن نے کہا:

Then your heaven is in
the fourth dimension.

پھر آپ کی جنت چوتھے بُعد میں ہے۔ ہلٹن ہوٹل کی ۳۰ ویں منزل پر دونوں میں اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ تیسرے دن محمد علی نے اعلان کر دیا کہ "صوفی حسن میرے ریلیجس ایڈوائزر رہیں"

محمد علی دنیا بھر میں اپنی انانیت اور گھمنڈ کے لئے مشہور ہے۔ ایسا ایک خود پسند شخص صوفی حسن کا معتقد کس طرح ہو گیا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک اخباری رپورٹر نے ایک ایسی بات لکھی ہے جو انسانی نفسیات کے مطالعہ میں مدد دیتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

This and other answers from the spiritual reservoir of India hit the cords of Ali's Hidden Genius. Perhapes, he needed some one to break his ego and for once the world champ was dealt a technical knockout from which he must have emerged a wiser man and, more importantly, a man of peace. Undoubtedly, Ali felt that he was in the presence of a holy

Onlooker (Bombay) April 15, 1978

ہندوستان کی روحانی شخصیت کی طرف سے اس قسم کے جوابات نے محمد علی کے اندرونی تاروں کو چھیڑ دیا۔ شاید انھیں کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ان کی انا کو توڑ دے۔ صوفی حسن سے غالباً ان کو اسی قسم کی ایک ضرب ملی جس نے ان کو سکون سے ہم کنار کیا۔ بلاشبہ محمد علی نے محسوس کیا کہ وہ ایک مقدس انسان کو پا گئے ہیں۔

انسانی فطرت عین اپنی ساخت کے اعتبار سے چاہتی ہے کہ کسی "بڑے" کے آگے جھک جائے۔ انسان کی انانیت حقیقۃً اسی فطرت کی آواز کو چھپانے کی ایک کوشش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان جب تک اپنے بڑے کو نہ پا لے، وہ غیر مطمئن رہتا ہے۔ وہ کائنات میں اپنے کو بے جگہ محسوس کرتا ہے۔ انسان عین اپنی اندرونی آواز کے تحت خدا کا طالب ہے۔ وہ اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے آپ کو خدا کے آگے نہ ڈال دے۔ انسان کی "انا" دراصل انسان کے پاس اس کے خالق کی قیمتی امانت ہے۔ انسان جب تک اس امانت کو اس کے حقیقی مالک کی خدمت میں نذر نہ کر دے، وہ کسی طرح مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ خدا کو نہ پائے تو وہ کسی غیر خدا کو اپنا معبود بنا کر اپنے اس جذبہ کی تسکین حاصل کرے گا۔ چاہے وہ خود اس کی اپنی ذات ہو یا اپنی ذات سے باہر کی کوئی چیز ہو۔

لوگ تم سے شراب اور جوئے کی بابت پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ ان دونوں چیزوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں۔ اور ان کا گناہ بہت زیادہ ہے ان کے فائدے سے۔ اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دو کہ جو حاجت سے زیادہ ہو۔ اس طرح اللہ تمھارے لئے احکام کو بیان کرتا ہے تاکہ تم دھیان کرو دنیا اور آخرت کے معاملات میں۔ اور وہ تم سے یتیموں کی بابت پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ جس میں ان کی بہبود ہو وہ بہتر ہے۔ اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ شامل کرلو تو وہ تمھارے بھائی ہیں۔ اور اللہ کو معلوم ہے کہ کون خرابی پیدا کرنے والا ہے اور کون درستگی پیدا کرنے والا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو مشکل میں ڈال دیتا۔ اللہ زبردست ہے، تدبیر والا ہے ۲۰-۲۱۹

چند سوالات کا جواب دیتے ہوئے یہاں کچھ بنیادی اصول بتائے گئے ہیں (۱) کسی چیز کا نقصان اگر اس کے نفع سے زیادہ ہو تو وہ قابل ترک ہے۔ (۲) اپنی واقعی ضرورت سے زیادہ جو مال ہو اس کو اللہ کی راہ میں دے دینا چاہئے۔ (۳) باہمی معاملات میں ان طریقوں سے بچنا جو کسی بگاڑ کا سبب بن سکتے ہوں اور ان طریقوں کو اختیار کرنا جو اصلاح پیدا کرنے والے ہوں۔

شراب پی کر آدمی کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ جوا کھیلنے والے کو کبھی محنت کے بغیر کافی دولت ہاتھ آجاتی ہے۔ اس اعتبار سے ان چیزوں میں نفع کا پہلو ہے۔ مگر دوسرے اعتبار سے ان کے اندر دینی اور اخلاقی نقصانات ہیں اور یہ نقصانات ان کے نفع سے بہت زیادہ ہیں۔ اس لئے ان سے منع کر دیا گیا۔ کسی چیز کو لینے یا نہ لینے کا یہی معیار زندگی کے دوسرے امور کے لئے بھی ہے۔ مثلاً وہ تمام سیاسی اور غیر سیاسی سرگرمیاں، وہ تمام تقریبات اور جلسے قابل ترک ہیں جن کے بارے میں دینی اور اقتصادی جائزہ بتائے کہ ان میں نفع کم ہے اور نقصان زیادہ۔

مسلمان وہ ہے جو آخرت کو اپنی منزل بنائے، جو اس تڑپ کے ساتھ اپنی صبح و شام کر رہا ہو کہ اس کا خدا اس سے راضی ہو جائے۔ ایسے شخص کے لئے دنیا کا ساز و سامان زندگی کی ضرورت ہے نہ کہ زندگی کا مقصد۔ وہ مال حاصل کرتا ہے، وہ دنیا کے کاموں میں مشغول ہوتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ اس کے لئے حاجت اور ضرورت کے درجہ میں ہوتا ہے نہ کہ مقصد کے درجہ میں۔ اس کے اثاثہ کی جو چیز اس کی حقیقی ضرورت سے زیادہ ہو، اس کا بہترین مصرف اس کے نزدیک یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو اپنے رب کی راہ میں دے دے، تاکہ وہ اس سے راضی ہو اور اس کو اپنی رحمتوں کے سایہ میں جگہ دے۔ اس کی ہر چیز بقدر حاجت اپنے لئے ہوتی ہے اور حاجت سے جو زیادہ ہو وہ دین کے لئے۔

باہمی معاملات اور کاروبار کے اکثر مسائل اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ان کے بارے میں صرف بنیادی ہدایات دی جا سکتی ہیں، ان کی تمام عملی تفصیلات کو قانون کے الفاظ میں متعین نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں یہ اصول مقرر کر دیا گیا کہ اپنی نیت کو درست رکھو اور جو کارروائی کرو یہ سوچ کر کرو کہ وہ کسی بگاڑ کا سبب نہ بنے بلکہ صاحب معاملہ کے حق میں بہتری پیدا کرنے والی ہو۔ اگر تم دوسرے کو اپنا بھائی سمجھتے ہوئے اس کے مصالح کی پوری رعایت رکھو گے اور تمھارا مقصود صرف اصلاح و درستگی ہوگا تو اللہ کے یہاں تمھاری پکڑ نہیں۔

اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لائیں اور مومن کنیز بہتر ہے ایک مشرک عورت سے، اگرچہ وہ تم کو اچھی معلوم ہو۔ اور اپنی عورتوں کو مشرک مردوں کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لائیں، مومن غلام بہتر ہے ایک آزاد مشرک سے، اگرچہ وہ تم کو اچھا معلوم ہو۔ یہ لوگ آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ جنت کی طرف اور اپنی بخشش کی طرف بلاتا ہے۔ وہ اپنے احکام لوگوں کے لئے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔ اور وہ تم سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ ایک گندگی ہے، اس میں عورتوں سے الگ رہو۔ اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ۔ پھر جب وہ اچھی طرح پاک ہو جائیں تو اس طریقہ سے ان کے پاس جاؤ جس کا اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔ اللہ دوست رکھتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور وہ دوست رکھتا ہے پاک رہنے والوں کو۔ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں، پس اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ اور اپنے لئے آگے بھیجو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ تمہیں ضرور اس سے ملنا ہے۔ اور ایمان والوں کو خوش خبری دے دو ۲۲۱ - ۲۲۳

مرد اور عورت جب نکاح کے ذریعہ ایک دوسرے کے ساتھی بنتے ہیں تو اس کا اصل مقصد شہوت رانی نہیں ہوتا بلکہ یہ اسی قسم کا ایک با مقصد تعلق ہے جو کسان اور کھیت کے درمیان ہوتا ہے۔ اس میں آدمی کو اتنا ہی سنجیدہ ہونا چاہئے جتنا کھیتی کا منصوبہ بنانے والا سنجیدہ ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں چند باتوں کا لحاظ ضروری ہے۔

ایک یہ کہ جوڑے کے انتخاب میں سب سے زیادہ جس چیز کو دیکھا جائے وہ ایمان ہے۔ میاں بیوی کا تعلق بے حد نازک تعلق ہے۔ اس کے بہت سے نفسیاتی، خاندانی اور سماجی پہلو ہیں۔ اس قسم کا تعلق دو شخصوں کے درمیان اگر اعتقادی موافقت کے بغیر ہو تو بالآخر وہ دو میں سے کسی ایک کی بربادی کا باعث ہوگا۔ ایک مومن اپنے غیر مومن جوڑے سے اعتقادی مصالحت کرلے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے دین کو برباد کرلیا۔ اور اگر وہ مصالحت نہ کرے تو اس کے بعد دونوں میں جو کش مکش ہوگی اس کے نتیجہ میں اس کا گھر برباد ہو جائے گا۔ دوسری چیز یہ کہ دو صنفوں کا یہ تعلق خدا کی بناوٹ کے مطابق اپنے فطری ڈھنگ پر قائم ہو۔ فطرت بھی خدا کا حکم ہے۔ قرآن کے ملفوظ احکام کی پابندی جس طرح ضروری ہے اسی طرح اس فطری نظام کی پابندی بھی ضروری ہے جو خدا نے تخلیقی طور پر ہمارے لئے بنا دیا ہے۔ تیسری چیز یہ کہ ہر مرحلہ میں آدمی کے اوپر اللہ کا خوف غالب رہے۔ وہ جو بھی رویہ اختیار کرے یہ سوچ کر کرے کہ بالآخر اس کو رب العالمین کے یہاں جانا ہے جو کھلے اور چھپے ہر چیز سے باخبر ہے ——— "اور اپنے لئے آگے بھیجو"، کا مطلب یہ ہے کہ اپنی آخرت کے لئے عمل صالح بھیجو۔ یعنی جو کچھ کرو یہ سمجھ کر کرو کہ تمہارا کوئی کام صرف دنیوی کام نہیں ہے بلکہ ہر کام کا ایک اخروی پہلو ہے۔ مرنے کے بعد تم اپنے اس اخروی پہلو سے دوچار ہونے والے ہو۔ تم کو اس معاملہ میں حد درجہ ہوشیار رہنا چاہئے کہ تمہارا عمل آخرت کے پیمانہ میں صالح عمل قرار پائے نہ کہ غیر صالح عمل۔

اور اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ کہ تم بھلائی نہ کرو اور پرہیزگاری نہ کرو اور لوگوں کے درمیان صلح نہ کرو۔ اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ اللہ تمھاری بے ارادہ قسموں پر تم کو نہیں پکڑتا مگر وہ اس کام پر پکڑتا ہے جو تمھارے دل کرتے ہیں۔ اور اللہ بخشنے والا، تحمل والا ہے۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے نہ ملنے کی قسم کھا لیں ان کے لئے چار مہینے تک کی مہلت ہے۔ پھر اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ معاف کر دینے والا، مہربان ہے۔ اور اگر وہ طلاق کا فیصلہ کریں تو یقیناً اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں، اور اگر وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اس چیز کو چھپائیں جو اللہ نے پیدا کیا ہے ان کے پیٹ میں۔ اور اس دوران میں ان کے شوہر ان کو پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں اگر وہ صلح کرنا چاہیں۔ اور ان عورتوں کے لئے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں جس طرح دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں۔ اور مردوں کا ان کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے۔ اور اللہ زبردست ہے، تدبیر والا ہے ۲۲۴ ـ ۲۸

ضد اور غصہ میں کبھی ایک آدمی قسم کھا لیتا ہے کہ میں فلاں آدمی کے ساتھ کوئی نیک سلوک نہیں کروں گا۔ قدیم زمانہ میں عربوں میں اس طرح کی قسموں کا بہت رواج تھا۔ وہ ایک بھلائی کا کام یا ایک اصلاح کا کام نہ کرنے کی قسم کھا لیتے اور جب ان کو اس نوعیت کے کام کے لئے پکارا جاتا تو کہہ دیتے کہ ہم تو اس کو نہ کرنے کی قسم کھا چکے ہیں۔ یہ کہنا کہ میں بھلائی کا کام نہ کروں گا، یوں بھی ایک غلط بات ہے اور اس کو خدا کے نام کی قسم کھا کر کہنا اور بھی زیادہ برا ہے۔ کیوں کہ خدا تو وہ ہستی ہے جو سراپا رحمت اور خیر ہے۔ پھر ایسے خدا کا نام لے کر اپنے کو رحمت اور خیر کے کاموں سے الگ کرنا کیوں کر درست ہو سکتا ہے ـــــ بگاڑ ہر حال میں برا ہے۔ لیکن اگر بگاڑ کو خدا یا اس کے دین کا نام لے کر کیا جائے تو اس کی برائی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

بعض لوگ قسم کو تکیہ کلام بنا لیتے ہیں اور غیر ارادی طور پر قسم کے الفاظ بولتے رہتے ہیں۔ یہ ایک لغو بات ہے اور ہر آدمی کو اس سے بچنا چاہئے۔ تاہم میاں بیوی کے تعلق کی نزاکت کی وجہ سے اس طرح کے معاملات میں ایسی قسم کو قانونی طور پر غیر موثر قرار دیا گیا۔ البتہ وہ کلام جو آدمی سوچ سمجھ کر منھ سے نکالے اور جس کے ساتھ قلبی ارادہ شامل ہو جائے، اس کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص ارادۃً یہ قسم کھالے کہ میں اپنی عورت کے پاس نہ جاؤں گا تو اس کو قابل لحاظ قرار دے کر اس کو ایک قانونی مسئلہ بنا دیا گیا اور اس کے احکام مقرر کئے گئے۔

خاندانی نظام میں، خواہ مرد ہو یا عورت، ہر ایک کے حقوق بھی ہیں اور ہر ایک کی ذمہ داریاں بھی۔ ہر فرد کو چاہئے کہ دوسرے سے اپنا حق لینے کے ساتھ دوسرے کو اس کا حق بھی پوری طرح ادا کرے۔ کوئی شخص اتفاقی حالات یا اپنی فطری بالادستی سے فائدہ اٹھا کر اگر دوسرے کے ساتھ ناانصافی کرے گا تو وہ خدا کی پکڑ سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا۔

طلاق دو بار ہے۔ پھر یا تو قاعدہ کے مطابق رکھ لینا ہے یا خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کر دینا۔ اور تمھارے لئے یہ بات جائز نہیں کہ تم نے جو کچھ ان عورتوں کو دیا ہے اس میں سے کچھ لے لو مگر یہ کہ دونوں کو ڈر ہو کہ وہ اللہ کی حدوں پر قائم نہ رہ سکیں گے۔ پھر اگر تم کو یہ ڈر ہو کہ دونوں اللہ کی حدوں پر قائم نہ رہ سکیں گے تو دونوں پر گناہ نہیں اس مال میں جس کو عورت فدیہ میں دے۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں تو ان سے باہر نہ نکلو۔ اور جو شخص اللہ کی حدوں سے نکل جائے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ پھر اگر وہ اس کو طلاق دیدے تو اس کے بعد وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں جب تک کہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے۔ پھر اگر وہ مرد اس کو طلاق دیدے تب گناہ نہیں ان دونوں پر کہ پھر مل جائیں بشرطیکہ انھیں اللہ کی حدوں پر قائم رہنے کی توقع ہو۔ یہ خداوندی ضابطے ہیں جن کو وہ بیان کر رہا ہے ان لوگوں کے لئے جو دانش مند ہیں۔ اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت تک پہنچ جائیں تو ان کو یا قاعدہ کے مطابق رکھ لو یا قاعدہ کے مطابق رخصت کر دو۔ اور تکلیف پہنچانے کی غرض سے نہ روکو تاکہ ان پر زیادتی کرو۔ اور جو ایسا کرے گا اس نے اپنا ہی برا کیا۔ اور اللہ کی آیتوں کو کھیل نہ بناؤ۔ اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو اور اس کتاب و حکمت کو جو اس نے تمھاری نصیحت کے لئے اتاری ہے۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ۲۲۹ - ۳۱

طلاق ایک غیر معمولی واقعہ ہے جو غیر معمولی حالات میں پیش آتا ہے۔ مگر اس انتہائی جذباتی معاملہ میں بھی تقویٰ اور احسان پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں مومن سے کس قسم کا سلوک اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔

نکاح کے رشتہ کو یکبارگی توڑنے کے بجائے اس کو تین مرحلوں میں انجام دینے کا حکم ہوا جو چند ماہ میں اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ ایک انتہائی ہیجانی معاملہ میں اس قسم کا سنجیدہ طریقہ مقرر کر کے بتایا گیا کہ اختلاف کے وقت مومن کا رویہ کیسا ہونا چاہئے۔ اپنے مخالف فریق کے ساتھ اس کا سلوک غیر جذباتی انداز میں سوچا ہوا صابرانہ فیصلہ ہو نہ کہ اشتعال کے تحت ظاہر ہونے والا اچانک فیصلہ۔ اسی طرح طلاق کے جتنے آداب مقرر کئے گئے ہیں، سب میں زندگی کا بہت گہرا سبق موجود ہے ——— علیحدگی کا ارادہ کرنے کے بعد بھی آدمی ایک مدت تک دوبارہ اتحاد کے امکان پر غور کرتا رہے۔ تعلقات کے خاتمہ کی نوبت آجائے تب بھی وہ اس کو حقوق انسانیت کے خاتمہ کے ہم معنی نہ بنائے۔ باہمی سلوک کے لئے اللہ کا جو قانون ہے اس کی مکمل پابندی کی جائے۔ شریعت کے کسی حکم کو قانونی حیلوں کے ذریعہ کالعدم نہ کیا جائے۔ قانون کی تعمیل میں صرف الفاظ قانون کو نہ دیکھا جائے بلکہ اس کی حکمت (روح قانون) کو بھی سامنے رکھا جائے۔ علیحدگی سے پہلے اپنے سابقہ ساتھی کو جو کچھ دیا تھا اس کو علیحدگی کے بعد واپس لینے کی کوشش نہ کی جائے۔ جس طرح تعلقات کے زمانہ کو خوش اسلوبی کے ساتھ گزارا تھا اسی طرح علیحدگی کے زمانہ کو بھی خوش اسلوبی کے ساتھ گزارا جائے۔

اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو ان کو نہ روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے نکاح کرلیں۔ جب کہ وہ دستور کے موافق آپس میں راضی ہو جائیں۔ یہ نصیحت کی جاتی ہے اس شخص کو جو تم میں سے اللہ پر اور آخرت کے دن پر یقین رکھتا ہو یہ تمھارے لئے زیادہ پاکیزہ اور ستھرا طریقہ ہے۔ اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں ان لوگوں کے لئے جو پوری مدت تک دودھ پلانا چاہتے ہوں۔ اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے ان ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق۔ کسی کو حکم نہیں دیا جاتا مگر اس کی برداشت کے موافق۔ نہ کسی ماں کو اس کے بچہ کے سبب سے تکلیف دی جائے۔ اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کے سبب سے۔ اور یہی ذمہ داری وارث پر بھی ہے۔ پھر اگر دونوں باہمی رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں اور اگر تم چاہو کہ اپنے بچوں کو کسی اور سے دودھ پلواؤ تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ تم قاعدہ کے مطابق وہ ادا کردو جو تم نے ان کو دینا ٹھہرایا تھا۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے ۲۳۳-۲۳۲

ایک عورت کو اس کے خاوند نے طلاق دے دی اور زمانہ عدت میں رجعت نہ کی۔ جب عدت ختم ہو چکی تو دوسرے لوگوں کے ساتھ پہلے شوہر نے بھی نکاح کا پیغام دیا۔ عورت نے اپنے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کرنا منظور کر لیا مگر عورت کا بھائی غصہ میں آ گیا اور نکاح کو روک دیا۔ اس پر یہ حکم اترا کہ جب دونوں دوبارہ ازدواجی تعلق قائم کرنے پر راضی ہیں تو تم رکاوٹ نہ ڈالو۔

طلاق کے بعد بھی اکثر بہت سے مسائل باقی رہتے ہیں۔ کبھی پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کا معاملہ ہوتا ہے۔ کبھی مطلقہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ ایسے مواقع پر مشکلات پیدا کرنا درست نہیں۔ کبھی مطلقہ عورت بچے والی ہوتی ہے اور سابقہ شوہر کے بچے کو دودھ پلانے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ایک دوسرے کو تکلیف دینے سے منع کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ معاملہ کو جذبات کا سوال نہ بناؤ، اس کو باہمی مشورہ اور رضامندی سے طے کرلو ——— اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاف اور علحدگی کے وقت معاملہ کو نمٹانے کا مومنانہ طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ طرفین کی جانب جو مسائل باقی رہ گئے ہوں ان کو ایک دوسرے کو پریشان کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ ان کو ایسے ڈھنگ سے طے کیا جائے جو دونوں جانب کے لئے بہتر اور قابل قبول ہو۔ ایمان روح کی پاکیزگی ہے پھر جس کی روح پاک ہو چکی ہو وہ اپنے معاملات میں ناپاکی کا طریقہ کیسے اختیار کر سکتا ہے۔

نصیحت کسی کے لئے صرف اس بنا پر قابل قبول نہیں ہو جاتی کہ وہ برحق ہے۔ ضروری ہے کہ سننے والا اللہ پر یقین رکھتا ہو اور اس کی پکڑ سے ڈرنے والا ہو۔ وہ سمجھے کہ نصیحت کرنے والے کی نصیحت کو رد کرنے کے لئے آج اگر میں نے کچھ الفاظ پا لئے تو اس سے اصل مسئلہ ختم نہیں ہو جاتا۔ کیوں کہ معاملہ بالآخر اللہ کی عدالت میں پیش ہونا ہے اور وہاں کسی قسم کا زور اور کوئی لفظی حجت کام آنے والی نہیں۔

اور تم میں سے جو لوگ مرجائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ بیویاں اپنے آپ کو چار مہینے دس دن تک انتظار میں رکھیں۔ پھر جب وہ اپنی مدت کو پہنچیں تو جو کچھ وہ اپنی ذات کے بارے میں قاعدہ کے موافق کریں اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اللہ تمھارے کاموں سے پوری طرح باخبر ہے۔ اور تمھارے لئے اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ ان عورتوں کو پیغام دینے میں کوئی بات اشارۃً کہو یا اپنے دل میں چھپائے رکھو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم ضرور ان کا دھیان کروگے۔ مگر چھپ کر ان سے وعدہ نہ کرو، تم ان سے صرف دستور کے مطابق کوئی بات کہہ سکتے ہو۔ اور عقد نکاح کا ارادہ اس وقت تک نہ کرو جب تک مقررہ مدت اپنی ختم کو نہ پہنچ جائے۔ اور جان لو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے۔ پس اس سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا، تحمل والا ہے۔ اگر تم عورتوں کو ایسی حالت میں طلاق دو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ ان کے لئے کچھ مہر مقرر کیا ہے تو ان کے مہر کا تم پر کچھ مواخذہ نہیں۔ البتہ ان کو دستور کے مطابق کچھ سامان دے دو، وسعت والے پر اپنی حیثیت کے مطابق ہے اور تنگی والے پر اپنی حیثیت کے مطابق، یہ نیکی کرنے والوں پر لازم ہے۔ اور اگر تم ان کو طلاق دو قبل اس کے کہ ان کو ہاتھ لگاؤ اور تم ان کے لئے کچھ مہر بھی مقرر کر چکے تھے تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہو اس کا آدھا ادا کردو۔ الا یہ کہ وہ معاف کردیں یا وہ مرد معاف کردے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ اور تمھارا معاف کردینا زیادہ قریب ہے تقویٰ سے۔ اور آپس میں احسان کرنے سے غفلت مت کرو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے ۲۳۴-۳۷

نکاح اور طلاق کے قوانین بیان کرتے ہوئے بار بار تقویٰ اور احسان کی تلقین کی جارہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی حکم کو اس کی اصلی روح کے ساتھ زیر عمل لانے کے لئے ضروری ہے کہ معاشرہ کے افراد خالص قانونی معاملہ کرنے والے نہ ہوں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کا جذبہ رکھتے ہوں۔ اسی کے ساتھ ان کو یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ دوسرے کے ساتھ بہتر سلوک نہ کرنا خود اپنے بارے میں بہتر سلوک نہ کئے جانے کا خطرہ مول لینا ہے۔ کیوں کہ بالآخر سارا معاملہ خدا کے یہاں پیش ہونا ہے اور وہاں نہ لفظی تاویلیں کسی کے کام آئیں گی اور نہ کسی کے لئے یہ ممکن ہوگا کہ وہ معاملہ سے متعلق کسی بات کو چھپا سکے۔

اگر نکاح کے وقت عورت کا مہر مقرر ہوا اور تعلق قائم ہونے سے پہلے طلاق ہوگئی تو باعتبار قانون آدھا مہر دینا لازم کیا گیا ہے۔ مگر خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ دونوں اس معاملہ میں قانونی برتاؤ کے بجائے فیاضانہ برتاؤ کرنا چاہیں۔ عورت کے اندر یہ مزاج ہو کہ جب تعلق قائم نہیں ہوا تو میں آدھا مہر بھی چھوڑ دوں۔ مرد کے اندر یہ جذبہ ابھرے کہ اگرچہ قانوناً میرے اوپر صرف آدھے کی ذمہ داری ہے مگر فیاضی کا تقاضا ہے کہ میں پورا کا پورا ادا کردوں — فیاضی اور وسعت ظرف کا یہی مزاج تمام معاملات میں مطلوب ہے۔ وہی معاشرہ مسلم معاشرہ ہے جس کے افراد کا یہ حال ہو کہ ہر ایک دوسرے کو دینا چاہے نہ یہ کہ ہر ایک دوسرے سے لینے کا حریص بنا ہوا ہو۔ مزید یہ کہ وسعت ظرف کا یہ معاملہ دشمنی کے وقت بھی ہو نہ کہ صرف دوستی کے وقت

پابندی کرو نمازوں کی اور پابندی کرو بیچ کی نماز کی۔ اور کھڑے ہو اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے۔ اگر تم کو اندیشہ ہو تو پیدل یا سواری پر پڑھ لو۔ پھر جب حالتِ امن آجائے تو اللہ کو اس طریقہ پر یاد کرو جو اس نے تم کو سکھایا ہے، جس کو تم نہیں جانتے تھے۔ اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ رہے ہوں وہ اپنی بیویوں کے بارے میں وصیت کر دیں کہ ایک سال تک ان کو گھر میں رکھ کر خرچ دیا جائے۔ پھر اگر وہ خود سے گھر چھوڑ دیں تو جو کچھ وہ اپنی ذات کے معاملہ میں دستور کے مطابق کریں اس کا تم پر کوئی الزام نہیں۔ اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ اور طلاق دی ہوئی عورتوں کو بھی دستور کے مطابق خرچ دینا ہے، یہ لازم ہے پرہیزگاروں کے لئے۔ اس طرح اللہ تمھارے لئے اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو ۲۳۸ - ۲۴۲

نماز گویا دین کا خلاصہ ہے۔ نماز مومنانہ زندگی کی وہ مختصر تصویر ہے جو پھیلتی ہے تو مکمل اسلامی زندگی بن جاتی ہے۔ یہاں ایک مختصر فقرہ میں نماز کے تین اہم ترین اجزار کو بیان کر دیا گیا ہے (۱) نماز کا پانچ وقت کے لئے فرض ہونا (۲) نماز کا ایک قابل اہتمام چیز ہونا (۳) یہ بات کہ نماز کی اصل حقیقت عجز ہے۔

"پابندی کرو نمازوں کی اور پابندی کرو بیچ کی نماز کی"۔ اس سے معلوم ہوا کہ نمازوں میں ایک بیچ کی نماز ہے اور پھر اس کے دونوں طرف نمازیں ہیں۔ اس جملہ میں اطراف کی "نمازوں" سے کم از کم چار کا عدد مراد لینا ضروری ہے کیوں کہ عربی زبان میں صلوات (نمازوں) کا اطلاق تین یا اس سے زیادہ کے عدد کے لئے ہوتا ہے۔ پہلا ممکن عدد جس میں "نمازوں" کے درمیان ایک "بیچ کی نماز" بن سکے چار ہی ہے۔ اس طرح ایک نماز بیچ کی نماز ہو کر اس کے دونوں طرف دو دو نمازیں ہو جاتی ہیں۔ "بیچ کی نماز" سے مراد عصر کی نماز ہے جیسا کہ روایات سے ثابت ہے۔ نماز کے دوسرے پہلو کو بتانے کے لئے "محافظت" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ گویا نماز اسی طرح حفاظت کی ایک چیز ہے جس طرح مال آدمی کے لئے حفاظت کی چیز ہوتا ہے۔ نماز کے اوقات کا پورا لحاظ، اس کو بتائے ہوئے طریقہ پر ادا کرنے کا اہتمام، ایسی چیزوں سے بالقصد پرہیز جو آدمی کی نماز میں کوئی خرابی پیدا کرنے والی ہوں وغیرہ، محافظت نماز میں شامل ہیں۔ نماز کا تیسرا پہلو عجز ہے۔ یہ نماز کی اصل روح ہے، نماز بندے کا اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ نماز کے وقت آدمی کے اوپر وہ کیفیت طاری ہو جو سب سے بڑے کے آگے کھڑے ہونے کی صورت میں سب سے چھوٹے کے اوپر طاری ہوتی ہے۔

معاشرت کے احکام بتاتے ہوئے یہ کہنا کہ "یہ حق ہے متقیوں کے اوپر" شریعت کے ایک اہم پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ باہمی معاملات میں کچھ حقوق وہ ہیں جن کو قانون نے متعین کر دیا ہے۔ مگر ایک آدمی پر دوسرے کے حقوق کی حد یہیں ختم نہیں ہو جاتیں۔ متعین حقوق کے علاوہ بھی کچھ حقوق ہیں۔ یہ حقوق وہ ہیں جن کو آدمی کا تقویٰ اس کو محسوس کراتا ہے۔ اور آدمی کا متقیانہ احساس جتنا شدید ہو اتنا ہی زیادہ وہ اس کو اپنے اوپر لازم سمجھتا ہے۔ اندر کا یہ زور اگر موجود نہ ہو تو آدمی کبھی صحیح طور پر دوسروں کے حقوق ادا نہیں کر سکتا۔

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے گھروں سے بھاگ کھڑے ہوئے موت کے ڈر سے، اور وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ تو اللہ نے ان سے کہا کہ مرجاؤ۔ پھر اللہ نے ان کو زندہ کیا۔ بے شک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے۔ مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اور اللہ کی راہ میں لڑو اور جان لو کہ اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے کہ اللہ اس کو بڑھا کر اس کے لئے کئی گنا کر دے۔ اور اللہ ہی تنگی بھی پیدا کرتا ہے اور کشادگی بھی۔ اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۲۴۳ - ۲۴۵

مکہ سے تنگ آکر مسلمان مدینہ چلے آئے۔ مدینہ میں اپنے دین کے مطابق رہنے کے لئے نسبتاً آزادانہ ماحول تھا۔ مگر مخالفین اسلام نے اب بھی ان کو نہ چھوڑا۔ انھوں نے فوجی حملے شروع کر دئے تاکہ مدینہ سے مسلمانوں کا خاتمہ کر دیں۔ اس وقت حکم ہوا کہ ان سے مقابلہ کرو۔ مخالفین کی نسبت سے اس وقت مسلمانوں کی طاقت بہت کم تھی۔ اس لئے کچھ لوگوں کے اندر بے ہمتی پیدا ہوئی۔ یہاں بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک واقعہ یاد دلا کر بتایا گیا کہ زندگی کے معرکہ میں شکست سے ڈرنے ہی کا نام شکست ہے۔

بنی اسرائیل کی ایک پڑوسی قوم فلستی نے ان پر حملہ کر دیا۔ بنی اسرائیل شکست کھا گئے۔ فلستیوں نے دو حملوں میں ان کے ۳۴ ہزار آدمی مار ڈالے۔ بنی اسرائیل اتنا ڈرے کہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بائبل کے الفاظ میں "حشمت بنی اسرائیل سے جاتی رہی"۔ بنی اسرائیل کا سارا گھرانا خوف میں مبتلا ہو کر نوحہ و فریاد کرنے لگا۔ اسی حال میں ان کو ۲۰ سال گزر گئے۔ پھر انھوں نے سوچا کہ فلستیوں کے سامنے ان کو شکست کیوں ہوئی۔ ان کے نبی سموئیل نے کہا کہ شکست کی وجہ خدا میں تمھارے یقین کا کمزور ہو جانا ہے۔ انھوں نے اسرائیل کے سارے گھرانے سے کہا کہ اگر تم اپنے سارے دل سے خداوند کی طرف رجوع لاتے ہو تو اجنبی دیوتاؤں کو اپنے بیچ سے دور کر دو اور خداوند کے لئے اپنے دلوں کو مستعد کر کے فقط اسی کی عبادت کرو۔ خدا فلستیوں کے ہاتھ سے تم کو رہائی دے گا۔ تب اسرائیل نے اجنبی دیوتاؤں کو اپنے سے دور کیا اور فقط خداوند کی عبادت کرنے لگے۔ اب جب دوبارہ فلستیوں اور اسرائیلیوں میں جنگ ہوئی تو بائبل کے الفاظ میں "خداوند فلستیوں کے اوپر اس دن بڑی کڑک کے ساتھ گرجا اور ان کو گھبرا دیا۔ اور انھوں نے اسرائیلیوں کے آگے شکست کھائی (۱۔ سموئیل ۷) اللہ پر اعتماد کے راستہ کو چھوڑ کر ان پر ملّی موت واقع ہوئی تھی، اللہ پر اعتماد کے راستہ کو اختیار کرنے کے بعد ان کو ملّی زندگی حاصل ہو گئی۔

قرض حسن کے معنی ہیں اچھا قرض۔ یہاں اس سے مراد وہ انفاق ہے جو خدا کے دین کی راہ میں کیا جائے۔ یہ انفاق خالص اللہ کے لئے ہوتا ہے جس میں کوئی دوسرا مفاد شامل نہیں ہوتا، اس لئے خدا نے اس کو اپنے ذمے قرض قرار دیا۔ اور چوں کہ وہ بہت زیادہ اضافہ کے ساتھ اس کو لوٹائے گا اس لئے اس کو قرض حسن فرمایا۔

مومن کی راہ میں مشکلات کا پیش آنا کوئی محرومی کی بات نہیں۔ یہ اللہ کے فضل کا نیا دروازہ کھلنا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے جان و مال کو اللہ کے لئے خرچ کر کے اللہ کی ان عنایتوں کا مستحق بنتا ہے جو عام حالات میں کسی کو نہیں ملتیں۔

کیا تم نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو نہیں دیکھا موسیٰ کے بعد، جب کہ انھوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ نبی نے جواب دیا: ایسا نہ ہو کہ تم کو لڑائی کا حکم دیا جائے تب تم نہ لڑو۔ انھوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں۔ حالاں کہ ہم کو اپنے گھروں سے نکالا گیا ہے اور اپنے بچوں سے جدا کیا گیا ہے۔ پھر جب ان کو لڑائی کا حکم ہوا تو تھوڑے لوگوں کے سوا سب پھر گئے۔ اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اور ان کے نبی نے ان سے کہا: اللہ نے طالوت کو تمھارے لئے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کو ہمارے اوپر بادشاہی کیسے مل سکتی ہے حالاں کہ اس کے مقابلہ میں ہم بادشاہی کے زیادہ حقدار ہیں۔ اور اس کو زیادہ دولت بھی حاصل نہیں۔ نبی نے کہا اللہ نے تمھارے مقابلہ میں اس کو چنا ہے اور علم اور جسم میں اس کو زیادتی دی ہے۔ اور اللہ اپنی سلطنت جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اللہ بڑی وسعت والا، جاننے والا ہے۔ اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ طالوت کے بادشاہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ تمھارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے لئے تسکین ہے اور آل موسیٰ اور آل ہارون کی چھوڑی ہوئی یادگاریں ہیں۔ اس صندوق کو فرشتے لے آئیں گے۔ اس میں تمھارے لئے بڑی نشانی ہے، اگر تم یقین رکھنے والے ہو ۲۴۶ ـ ۴۸

حضرت موسیٰ ؑ کے تقریباً تین سو سال بعد بنی اسرائیل اپنے پڑوس کی مشرک قوموں سے مغلوب ہوگئے۔ اسی حال میں تقریباً چوتھائی صدی گزارنے کے بعد ان کو احساس ہوا کہ وہ اپنے پچھلے دور کو واپس لائیں۔ اب اپنے دشمنوں سے لڑنے کے لئے ان کو ایک امیر لشکر کی ضرورت تھی۔ ان کے نبی سموئیل (۱۰۲۰ ــ ۱۱۰۰ ق م) نے ان کے لئے ایک شخص کا تقرر کیا جس کا نام قرآن میں طالوت اور بائبل میں ساؤل آیا ہے۔ ذاتی اوصاف کے اعتبار سے وہ ایک موزوں شخص تھا۔ مگر بنی اسرائیل اس کی سرداری قبول کرنے کے بجائے اس قسم کے اعتراضات نکالنے لگے کہ وہ تو چھوٹے خاندان کا آدمی ہے۔ اس کے پاس مال و دولت نہیں۔ مگر اس طرح کی اختلافی بحثیں کسی قوم کے زوال یافتہ ہونے کی علامت ہیں۔ اللہ کے فیصلے وسعت اور علم کی بنا پر ہوتے ہیں۔ اس لئے وہی بندہ اللہ کا محبوب بندہ ہے جو خود بھی وسیع النظری کا طریقہ اختیار کرے اور جو فیصلہ کرے، حقائق کی بنیاد پر کرے نہ کہ تعصبات اور مصلحتوں کی بنیاد پر۔ تاہم صندوق کو واپس لاکر اللہ نے طالوت کے تقرر کی ایک غیر معمولی تصدیق بھی فرمادی۔

بنی اسرائیل کے یہاں ایک مقدس صندوق تھا جو مصر سے خروج کے زمانہ سے ان کے یہاں چلا آرہا تھا۔ اس میں تورات کی تختیاں اور دوسری متبرک چیزیں تھیں۔ بنی اسرائیل اس کو اپنے لئے فتح و کامیابی کا نشان سمجھتے تھے۔ فلستی اس صندوق کو ان سے چھین کر اٹھا لے گئے تھے۔ مگر اس کو انھوں نے جس جس بستی میں رکھا وہاں وہاں وبائیں پھوٹ پڑیں۔ اس سے انھوں نے برا شگون لیا اور صندوق کو ایک بیل گاڑی پر رکھ کر ہانک دیا۔ وہ اس کو لے کر چلتے رہے۔ یہاں تک کہ یہودیوں کی آبادی میں پہنچ گئے ـــــ اللہ اپنے کسی بندے کی صداقت کو ظاہر کرنے کے لئے کبھی اس کے گرد ایسی غیر معمولی چیزیں جمع کر دیتا ہے جو عام انسانوں کے ساتھ جمع نہیں ہوتیں۔

پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر چلا تو اس نے کہا : اللہ تم کو ایک ندی کے ذریعہ آزمانے والا ہے۔ پس جس نے اس کا پانی پیا وہ میرا ساتھی نہیں اور جس نے اس کو نہ چکھا وہ میرا ساتھی ہے۔ مگر یہ کہ کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے۔ تو انھوں نے اس میں سے خوب پیا بجز تھوڑے آدمیوں کے۔ پھر جب طالوت اور جو اس کے ساتھ ایمان پر قائم رہے تھے دریا پار کر چکے تو وہ لوگ بولے کہ آج ہم کو جالوت اور اس کی فوجوں سے لڑنے کی طاقت نہیں۔ جو لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ اللہ سے ملنے والے ہیں انھوں نے کہا کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جب جالوت اور اس کی فوجوں سے ان کا سامنا ہوا تو انھوں نے کہا: اے ہمارے رب ہمارے اوپر صبر ڈال دے اور ہمارے قدموں کو جمادے اور ان کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔ پھر انھوں نے اللہ کے حکم سے ان کو شکست دی۔ اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا۔ اور اللہ نے داؤد کو بادشاہت اور دانائی عطا کی اور جن چیزوں کا چاہا علم بخشا۔ اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض لوگوں سے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین فساد سے بھر جائے۔ مگر اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے ۲۴۹ - ۵۱

مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ افراد کے اندر مشکلات پر جمنے اور سردار کی اطاعت کرنے کا مادہ ہو۔ طالوت کا اپنے ساتھیوں کو پانی پینے سے منع کرنا اسی استعداد کی جانچ کی ایک سادہ سی تدبیر تھی۔ بائبل کے بیان کے مطابق ان میں سے صرف ۳۰۰ آدمی ایسے نکلے جنھوں نے راستہ میں آنے والے دریا کا پانی نہیں پیا۔ جن لوگوں نے پانی پیا انھوں نے گویا اپنی اخلاقی کمزوریوں کو اور پختہ کر لیا۔ اس لئے دشمن کا بظاہر طاقت ور ہونا اب ان کو اور زیادہ محسوس ہونے لگا۔ دوسری طرف جن لوگوں نے پانی نہیں پیا تھا ان کے اس فعل سے ان کا صبر اور اطاعت کا مزاج اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ ان کو وہ حقیقت اور زیادہ واضح صورت میں دکھائی دینے لگی جس کو بائبل کے بیان کے مطابق طالوت کے ایک ساتھی نے ان لفظوں میں بیان کیا تھا : اور یہ ساری جماعت جان لے کہ خداوند تلوار اور بھالے کے ذریعہ سے نہیں بچاتا۔ اس لئے کہ جنگ تو خداوند کی ہے اور وہی تم کو ہمارے ہاتھ میں کر دے گا (۱۔ سموئیل ۱۷ : ۴۸)

اقتدار جس کے پاس ہو وہ کچھ دنوں بعد گھمنڈ میں پڑ کر ظلم کرنے لگتا ہے۔ اس لئے اقتدار اگر کسی کے پاس مستقل طور پر جمع ہو جائے تو اس کے ظلم و فساد سے زمین بھر جائے۔ اس کی تلافی کا انتظام اللہ نے اس طرح کیا ہے کہ وہ صاحبان اقتدار کو بدلتا رہتا ہے۔ وہ بے اقتدار لوگوں میں سے ایک گروہ کو اٹھاتا ہے اور اس کے ذریعہ سے صاحب اقتدار کو ہٹا کر اس کے منصب پر دوسرے کو بٹھا دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی برسر اقتدار جماعت کا ظلم بڑھ جائے تو یہ اس کے خلاف اٹھنے والے گروہ کے لئے خدائی مدد کا وقت ہوتا ہے۔ اگر وہ صبر اور اطاعت کی شرط کو پورا کرتے ہوئے اپنے آپ کو خدائی منصوبہ میں شامل کر دے تو بظاہر کم ہونے کے باوجود وہ خدا کی مدد سے زیادہ کے اوپر غالب آجائے گا ——— خدا کا خوف محض ایک منفی چیز نہیں وہ ایک علم ہے جو آدمی کے ذہن کو اس طرح روشن کر دیتا ہے کہ وہ ہر چیز کو اس کے اصلی اور حقیقی روپ میں دیکھ سکے۔

ہ کی آیتیں ہیں جو ہم تم کو سناتے ہیں ٹھیک ٹھیک۔ اور بے شک تو پیغمبروں میں سے ہے۔ ان پیغمبروں میں سے بعض
نے بعض پر فضیلت دی۔ ان میں سے بعض سے اللہ نے کلام کیا۔ اور بعض کے درجے بلند کئے۔ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم
لی نشانیاں دیں اور ہم نے اس کی مدد کی روح القدس سے۔ اللہ اگر چاہتا تو ان کے بعد والے صاف حکم آجانے کے بعد
تے۔ مگر انھوں نے اختلاف کیا۔ پھر ان میں سے کوئی ایمان لایا اور کسی نے انکار کیا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ نہ لڑتے۔
للہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے ۲۵۲-۵۳

اللہ کی طرف سے کوئی پکارنے والا جب لوگوں کو پکارتا ہے تو اس کی پکار میں ایسی نشانیاں شامل ہوتی ہیں
دگوں کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔ اس کے باوجود لوگ اس کا انکار کر دیتے ہیں اور یہ انکار
رنے والے سب سے پہلے وہ لوگ ہوتے ہیں جو رسالت کو مانتے چلے آرہے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ جس
سول کو مان رہے ہوتے ہیں اس کی بعض خصوصیات کی بنا پر وہ اس کی افضلیت کا تصور قائم کر لیتے ہیں۔ وہ
جھتے ہیں کہ جب ہمارا رسول اتنا افضل ہے اور اس کو ہم مان رہے ہیں تو اب کسی اور کو ماننے کی کیا ضرورت۔

ہر پیغمبر مختلف حالات میں آتا ہے اور اپنے مشن کی تکمیل کے لئے ہر ایک کو الگ الگ چیزوں کی ضرورت
دتی ہے۔ اس اعتبار سے کسی پیغمبر کو ایک فضیلت (خصوصی چیز) دی جاتی ہے اور کسی کو دوسری فضیلت۔ بعد کے دور
بں پیغمبر کی یہی فضیلت اس کے امتیوں کے لئے فتنہ بن جاتی ہے۔ وہ اپنے نبی کو دی جانے والی فضیلت کو تائیدی فضیلت
ے بجائے مطلق فضیلت کے معنی میں لے لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم سب سے افضل پیغمبر کو مان رہے ہیں۔ اس لئے اب
ہں کسی اور کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے ماننے والوں نے حضرت مسیح کا انکار کیا۔ کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کا
ا اتنا افضل ہے کہ خدا براہ راست اس سے ہم کلام ہوا۔ حضرت مسیح کے ماننے والوں نے نبی آخر الزماں کا انکار کیا۔ کیونکہ
نھوں نے سمجھا کہ وہ ایسی ہستی کو مان رہے ہیں جس کی فضیلت اتنی زیادہ ہے کہ خدا نے اس کو باپ کے بغیر پیدا کیا۔ اسی
رح اللہ کے وہ بندے جو امت محمدی کی اصلاح و تجدید کے لئے اٹھے ان کا بھی لوگوں نے انکار کیا۔ کیوں کہ ان کے مخاطبین
نفسیات یہ تھی کہ ہم افضل الانبیاء کے وارث ہیں، ہم مکمل سچائی کو پائے ہوئے ہیں۔ پھر ہم کو کسی اور چیز کی کیا ضرورت۔
متوں کے زوال کے زمانہ میں ایسا ہوتا ہے کہ لوگ دنیا کے راستہ پر چل پڑتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی
بنت بھی محفوظ رہے۔ اس وقت یہ عقیدہ ان کے لئے ایک نفسیاتی سہارا بن جاتا ہے۔ وہ اپنی مقدس شخصیتوں کی افضلیت
ے تصور میں یہ تسکین پا لیتے ہیں کہ دنیا میں خواہ وہ کچھ بھی کریں ان کی آخرت کبھی مشتبہ نہیں ہوگی۔

یہی غلط اعتماد ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے والے کی مخالفت پر جری بناتا ہے۔ اللہ کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ لوگوں
ی ہدایت و رہنمائی کے لئے کوئی دوسرا انتظام قائم کرتا جس میں کسی کے لئے اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔ مگر یہ دنیا امتحان کی جگہ
ہے۔ یہاں تو اسی بات کی آزمائش ہو رہی ہے کہ آدمی غیب کی حالت میں خدا کو پائے۔ انسان کی زبان سے بلند ہونے والی خدائی
آواز کو پہچانے۔ ظاہری پردوں سے گزر کر سچائی کو اس کے باطنی روپ میں دیکھ لے۔

اے ایمان والو خرچ کرو ان چیزوں سے جو ہم نے تم کو دیا ہے اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ خرید و فروخت ہے اور نہ دوستی ہے اور نہ سفارش۔ اور جو منکر ہیں وہی ہیں ظلم کرنے والے۔ اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ ہے، سب کا تھامنے والا۔ اس کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ کون ہے جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔ اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کرسکتے مگر جو وہ چاہے۔ اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے۔ وہ تھکتا نہیں ان کے تھامنے سے۔ اور وہی ہے بلند مرتبہ، بڑا۔ دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔ پس جو شخص شیطان کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ اللہ کام بنانے والا ہے ایمان والوں کا، وہ ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے، اور جن لوگوں نے انکار کیا ان کے دوست شیطان ہیں، وہ ان کو اجالے سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۲۵۴ — ۵۷

خدا کو وہی پاتا ہے جو انفاق کی قیمت دے کر خدا کو اختیار کرے۔ اور کوئی آدمی جب خدا کو پالیتا ہے تو وہ ایک ایسی روشنی کو پالیتا ہے جس میں وہ بھٹکے بغیر چلتا رہے۔ یہاں تک کہ جنت میں پہنچ جائے۔ اس کے برعکس جو شخص انفاق کی قیمت دئے بغیر خدا کو اختیار کرے وہ ہمیشہ اندھیرے میں رہتا ہے، جہاں شیطان اس کو بہکا کر ایسے راستوں پر چلاتا ہے جس کی آخری منزل جہنم کے سوا اور کچھ نہیں۔

انفاق سے مراد اپنے آپ کو اور اپنے اثاثہ کو دین کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ اپنی مصلحتوں کو قربان کرکے دین کی طرف آگے بڑھنا ہے۔ آدمی جب کسی عقیدہ کو انفاق کی قیمت پر اختیار کرے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو اختیار کرنے میں سنجیدہ (Sincere) ہے۔ یہ سنجیدہ ہونا بے حد اہم ہے۔ کسی معاملہ میں سنجیدہ ہونا ہی وہ چیز ہے جو آدمی پر اس معاملہ کے بھیدوں کو کھولتا ہے۔ سنجیدہ ہونے کے بعد ہی یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ آدمی اور اس کے مقصد کے درمیان حقیقی تعلق قائم ہو اور مقصد کے تمام پہلو اس پر واضح ہوں۔ اس کے برعکس معاملہ اس شخص کا ہے جو اپنی ہستی کی حوالگی کی قیمت پر دین کو اختیار نہ کرے۔ ایسا شخص کبھی دین کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہوگا اور اس بنا پر وہ آخرت کے معاملہ کو ایک آسان معاملہ فرض کرلے گا۔ وہ سمجھے گا کہ بزرگوں کی سفارش یا دین کے نام پر کچھ رسمی اور ظاہری کارروائیاں آخرت کی نجات کے لئے کافی ہیں۔ آخرت کے معاملہ میں سنجیدہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس راز کو نہ سمجھے گا کہ آخرت تو مالکِ کائنات کے عظمت وجلال کے ظہور کا دن ہے۔ ایسے ایک دن کے بارے میں محض سرسری چیزوں پر کامیابی کی امید کرلینا خدا کی خدائی کا کمتر اندازہ کرنا ہے جو خدا کے یہاں آدمی کے جرم کو بڑھانے والا ہے نہ کہ وہ اس کی مقبولیت کا سبب بنے — خدا کی بات آدمی کے سامنے دلیل کی زبان میں آتی ہے اور وہ کچھ الفاظ بول کر اس کو رد کردیتا ہے۔ یہی شیطانی وسوسہ ہے۔ ہدایت اس کو ملتی ہے جو شیطان کے وسوسہ سے اپنے کو بچائے اور خدائی دلیل کو پہچان کر اس کے آگے جھک جائے۔

خدا پرستی کیا ہے

قرآن میں کہا گیا ہے : "کیا لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی دین چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اسی کے فرماں بردا[ر] ...با جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ کہدو ہم ایمان لائے اللہ پا ور اس پر ...ہمارے اوپر اتارا گیا ہے اور اس پر جو اتارا گیا ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، اولاد یعقوب، موسیٰ، عیسیٰ ...ر دوسرے نبیوں پر ان کے رب کی طرف سے۔ ہم ان میں باہم فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں ۔ ...ر جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو چاہے گا وہ ہرگز اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ شخص آخرت میں گھاٹا ...ٹھانے والوں میں ہوگا۔ (آل عمران ۸۵ - ۸۳)

اس سے معلوم ہوا کہ تمام نبیوں پر ایک ہی دین اتارا گیا۔ اور وہ وہی ہے جو ساری کائنات کا دین ہے۔ ...نی اللہ کے لئے مطیع و مسخر ہو جانا۔ اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں ملا دینا۔ خدا کے تخلیقی منصوبہ میں اپنے آپ کو ...ہ تن جوڑ دینا۔ جس شاہراہ اطاعت پر ساری کائنات چل رہی ہے، اسی پر چلنے لگنا۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

"وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے، ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہم کو دوزخ کی ...گ سے بچا۔ صبر کرنے والے، راستی پر چلنے والے، عاجزی کرنے والے، خرچ کرنے والے اور سحر کے وقت گناہوں ...ی معافی مانگنے والے اللہ کی گواہی ہے کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اور فرشتوں کی اور اہل علم کی۔ وہ عدل سے انتظام کرنے والا، کوئی الٰہ نہیں بجز اس زبردست حکمت والے کے۔ یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ اور جو اختلاف کیا اس میں اہل کتاب نے، وہ آپس میں ضد کی وجہ سے کیا۔ جب کہ انھیں صحیح علم پہنچ چکا تھا۔ اور جو کوئی اللہ کی نشانیوں سے انکار کرے گا تو اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے (آل عمران ۲۰ - ۱۶)

گویا اللہ کو پانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس کو مدبر کائنات کی حیثیت سے پالے۔ جب آدمی اس حیثیت سے خدا کو پاتا ہے تو اس کو فوراً احساس ہوتا ہے کہ وہ سرتاپا عاجز اور حقیر ہے۔ وہ اللہ کو مدد کے لئے پکارنے لگتا ہے۔ وہ موت کے بعد زندگی کے تسلسل کو دیکھ لیتا ہے اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ خدایا مجھ کو ابدی ناکامی سے بچا۔ اس کی تنہائیاں خدا کی یاد میں بسر ہونے لگتی ہیں۔ ان احساسات کے قدرتی نتیجہ کے طور پر دنیا میں لوگوں کے ساتھ اس کا رویہ صبر، سچائی اور فروتنی کا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی چیز کو بھی خدا کی چیز سمجھنے لگتا ہے جس کا عملی اظہار اپنے مال کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔

آدمی جب خدا کی عظمتوں کے ساتھ اس کو پالیتا ہے تو اس کا یہ نتیجہ بھی ہوتا ہے کہ وہ نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ضد، گھمنڈ، خود پرستی جیسے پردے اس کی نگاہوں سے ہٹ جاتے ہیں اس کو صاف نظر آتا ہے کہ اصل دین یہی ہے۔ خدا کی وہ نشانیاں جو دین کی اس حقیقت کو آشکارا کر رہی ہیں، اس کو صاف دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اس کے برعکس جب آدمی خدا پرستی کے بجائے اپنی ذات کی پرستش کی سطح پر ہو تو ضد اور گھمنڈ کا ہالہ اس کو گھیر لیتا ہے۔

کھلی کھلی نشانیاں ظاہر ہونے کے باوجود وہ سچائی کو دیکھ نہیں پاتا۔ وہ اپنے خود ساختہ دین ہی کو اصل دین سمجھتا رہتا ہے۔ ایسے لوگ اس وقت سے پہلے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے جب کہ خدا خود ظاہر ہو جائے اور آدمی کے لئے جھوٹے سہاروں اور لفظی تاویلوں کی آڑ میں چھپنے کا موقع سرے سے باقی نہ رہے۔

"سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے،" کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے براہ راست اپنے زیر انتظام کائنات میں جو دین قائم کر رکھا ہے وہی دین انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان کو چاہئے کہ اپنے اختیار و ارادہ کے تحت اسی آفاقی دین پر قائم ہو جائے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کو جان لینا چاہئے کہ معاملہ بالآخر اسی کے یہاں پیش ہونا ہے جو آج تم سے اطاعت و فرماں برداری کا مطالبہ کر رہا ہے۔ پھر کیا جو خدا وسیع تر کائنات میں یہ نظام قائم کئے ہوئے ہے کہ اس کا کوئی جزء دوسرے اجزاء سے ٹکرائے بغیر اپنا فریضہ ادا کرے۔ وہی خدا انسان سے اس پر راضی ہو جائے گا کہ وہ آپس میں ٹکرائیں اور دوسرے کی بربادی پر اپنی تعمیر کا خواب دیکھیں۔ جو خدا بقیہ کائنات میں خاموش طور پر تمام سرگرمیاں انجام دے رہا ہے وہی خدا انسان کے لئے یہ پسند کرے گا کہ وہ لاؤڈ اسپیکر لگا کر چیخے اور فضا کو شور وغل سے بھر دے۔ جو خدا اتنا حکمت پسند ہے کہ شیشم اور چنار کے درخت کو سو سال میں مکمل کرتا ہے وہی خدا انسان کے معاملہ میں اس عجوبہ کو دیکھنا پسند کرے گا کہ وہ نعروں اور تقریروں کے کرتب دکھائیں اور صبح و شام میں تعمیر و ترقی کا مینار کھڑا کر دیں۔ خدا کی جس دنیا میں پانی کا دھارا بہنا چاہتا ہے تو زمین اپنے راستے اس کے لئے کھول دیتی ہے۔ اسی دنیا میں خدا انسانوں سے اس بات پر خوش ہو جائے گا کہ وہ دوسرے کا اعتراف نہ کریں اور دوسرے کے فضل و کمال کو ماننے سے انکار کر دیں۔ کائنات کا ایک فرد کہیں غلاظت ڈال دے تو کروروں بیکٹیریا وہاں جمع ہو جاتے ہیں تاکہ غلاظت کے کیمیائی اجزاء کو الگ کرکے اس کو دوبارہ کائنات کے صالح اجزاء کا حصہ بنا دیں۔ اسی کائنات میں خدا انسان کو اس بات پر انعام دے گا کہ وہ کسی بھائی کی غلطی کو دیکھے تو اس کو وہ اس لئے پکڑ لے کہ اس کے ذریعہ اس کو ذلیل کرنا ہے، غلطی کی تلافی یا درستگی سے اس کو کوئی دل چسپی نہ ہو۔

قرآن جس نظام آخرت کا لفظی تعارف ہے وہی نظام اللہ تعالیٰ نے انسان کے سوا بقیہ کائنات میں آج بھی قائم کر رکھا ہے۔ یہ خدا کی خدائی کا بہت کمتر اندازہ ہوگا اگر کوئی یہ سمجھ لے کہ قرآن میں آخرت کی کامیابی اور ناکامی کے جو اصول بتائے گئے ہیں وہ محض ترنم اور خوش الحانی کے لئے ہیں یا کائنات میں اللہ تعالیٰ اپنے جس پسندیدہ نظام کو قائم کئے ہوئے ہے، اس کے سوا بھی کسی چیز پر وہ انسان سے راضی ہو سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ قرآن میں وہ بندوں کو عدل پر قائم ہونے کا حکم دے۔ ساری کائنات کو حد درجہ عدل پر چلا رہا ہو۔ مگر جب فیصلہ کا دن آئے تو وہ غیر عادلانہ بنیادوں پر لوگوں کے لئے جنت اور جہنم کا فیصلہ کر دے۔ اللہ نے اپنی کتاب کو نہ تو بطور شاعری کے اتارا ہے اور نہ کائنات کو بطور کھیل کے پیدا کر دیا ہے۔ اللہ سراپا خیر اور عدل ہے اور اس کا فیصلہ جو انسانوں کے لئے ظاہر ہوگا وہ بھی سراپا خیر اور عدل ہوگا۔ اس کے سوا کوئی اور امید قائم کرنا ایک ایسی بے بنیاد خوش گمانی ہے جو زمین و آسمان میں کہیں اپنے لئے جگہ نہیں پا سکتی۔

بگاڑ کیسے آتا ہے

یہود کی گمراہی کیا تھی جس کی وجہ سے وہ خدا کے غضب کے مستحق ہو گئے، وہ یہ نہ تھی کہ انھوں نے دین کا نام
دینی مراسم پر عمل کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ظاہری دینداری ان کے یہاں بڑے پیمانہ پر جاری تھی۔ ان کی گمراہی قرآن کے
ۂ میں یہ تھی کہ انھوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خرید لی (بقرہ ۸۶) ان کے یہاں خدا کے نبیوں کا چرچا
در خدا کے دین کے نام پر ہنگامے جاری تھے۔ مگر یہ سب کچھ آخرت کے لئے نہیں بلکہ دنیا کے لئے تھا۔ وہ چیز
ودے کر آخرت ملتی ہے، اس کو انھوں نے دنیا حاصل کرنے کا سستا سودا بنا لیا تھا۔ وہ دین کے نمائشی کاموں
ا ہرہ کرتے تھے مگر اپنی حقیقی عملی زندگی میں دنیا کو ترجیح دئے ہوئے تھے۔

یہود کی قدیم مذہبی کتابوں میں ان کی جو تصویر ملتی ہے وہ اس قرآنی بیان کی پوری تفسیر ہے۔ تورات میں یہود کی
ترقی یا ان کی قومی تباہی تفصیل سے ملے گی۔ مگر پوری کتاب پڑھ جائیے اور آپ کو کہیں آخرت کی کامیابی اور ناکامی
ر نہیں ملے گا۔ ان کی مقدس کتابوں کا خلاصہ صرف یہ نظر آتا ہے کہ ——— مذہب کے طریقہ پر چلو تاکہ تم کو
ی کامیابی حاصل ہو، قوم کو اقتدار ملے۔ یہود ایک معزز اور سربلند قوم بن جائیں۔

یہ صرف یہود کی خرابی نہیں۔ کتاب آسمانی کی حامل کسی قوم میں جب بگاڑ آتا ہے تو اس کی حالت یہی ہو جاتی
اس کے افراد کی ذاتی زندگی اور اس کی جماعتوں کی عمومی سرگرمیاں دنیا کے رخ پر چل پڑتی ہیں۔ مگر اسی کے
نہ خدا و رسول کا چرچا اس طرح جاری رہتا ہے گویا یہ سب کچھ صرف آخرت کے لئے کیا جا رہا ہے۔

ان کے دین کا بے حقیقت ہونا اس وقت بالکل واضح ہو جاتا ہے جب کہ ان کی اپنی ذات کی سطح پر ان کی
داری کا تجربہ کیا جائے۔ وہ اگرچہ خدا کی کتاب کے حوالے سے دوسروں کو نیکی کی نصیحت کر رہے ہوتے ہیں مگر
ے افراد کی اپنی زندگیاں اس نیکی سے خالی ہوتی ہیں (بقرہ ۴۴)۔ ان کا ایک واعظ لوگوں سے کہے گا کہ خدا سے
لیکن جب اس کا معاملہ کسی ایسے شخص سے پڑ جائے گا جہاں خود اس کو خدا سے ڈرنا چاہئے تو وہ اس کے ساتھ ایسا
ہ کرے گا جیسے کہ اس کا دل بالکل اللہ کے خوف سے خالی ہے۔ اس کا ایک مقرر دوسروں کو اخلاق اور انسانیت کا
دے گا۔ لیکن اگر ایک شخص مقرر پر تنقید کر دے تو وہ فوراً بگڑ اٹھے گا اور اپنے ناقد کے خلاف ہر قسم کے غیر انسانی
ں کو اپنے لئے جائز قرار دے لے گا۔ اس کا ایک مصلح دوسروں سے کہے گا کہ خدا کے دین کے لئے جیو اور خدا کے دین کے
مرو۔ لیکن اگر کسی سے اس کو ٹھیس پہنچ جائے تو وہ بپھر کر اس کے خلاف ایسے اقدامات کرے گا گویا کہ وہ شیطان کا
ی بنا ہوا ہے اور فرضی طور پر خدا کا درس دے رہا ہے۔ ان کا قائد مظلوم ملت کے مسائل حل کرنے کے لئے پرشور تقریریں
ے گا مگر مظلوم فرد کی دادرسی سے اس کو کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔

ہدایت پر صرف وہ شخص ہے جس نے اپنے آپ کو ہدایت کی لگام دے رکھی ہے۔ جو دوسروں سے کوئی بات کہنے سے
اپنا بے لاگ محاسبہ کر کے دیکھتا ہے کہ کیا وہ خود اس پر قائم ہے۔ جس کی توجہ آخرت کی طرف ہے نہ کہ دنیا کی طرف۔

وہ ظالم تھا ، مگر کون ظالم نہیں

- لوگ کہتے ہیں کہ وہ ظالم تھا۔ مگر وہ کن لوگوں کے لئے ظالم تھا، ان لوگوں کے لئے جو اس کے سیاسی مخالف بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اور کون ہے جو اپنے مخالفوں کے لئے ظالم نہیں۔
- اس نے لوگوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ مگر اس نے کن لوگوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا، ان لوگوں کے ساتھ جن سے اس کو دشمنی ہو گئی تھی۔ اور کون ہے جو اپنے دشمن کے ساتھ انصاف کرے۔
- اس نے حق کا اعلان کرنے والوں کا اعتراف نہ کیا۔ مگر اس نے کن لوگوں کا اعتراف نہ کیا، ان لوگوں کا جن کی حق گوئی سے اس کی اپنی ذات پر زد پڑتی تھی۔ اور کون ہے جو اس حق کا اعتراف کرے جس کی زد اس کی اپنی ذات پر پڑتی ہو۔
- اس نے لوگوں کو بے گھر کیا۔ مگر اس نے کن لوگوں کو بے گھر کیا، ان کو جو اس کی انا کو چیلنج کر رہے تھے۔ اور کون ہے جو اس کو بے گھر نہ کرے جو اس کی انا کے لئے چیلنج بن گیا ہو۔
- اس نے لوگوں کے فضل و کمال کو تسلیم نہیں کیا۔ مگر اس نے کن لوگوں کے فضل و کمال کو تسلیم نہیں کیا، ان لوگوں کا جو اس کی قبائے عظمت کا تکمہ بننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور کون ہے جو اس کے فضل و کمال کو تسلیم کرے جو اس کی قبائے عظمت کا تکمہ نہ بن رہا ہو۔
- اس نے لوگوں کے روزگار چھینے۔ مگر اس نے کن لوگوں کے روزگار چھینے، ان لوگوں کے جو اس کے اوپر تنقید کرنے لگے تھے۔ اور کون ہے جو اس کا روزگار نہ چھینے جو اس کے اوپر تنقید کرتا ہو۔
- اس نے لوگوں کو ذلیل کیا۔ مگر اس نے کن لوگوں کو ذلیل کیا۔ ان لوگوں کو جو اس کی بڑائی کو ماننے سے انکار کرتے تھے۔ اور کون ہے جو اس کو ذلیل نہ کرے جو اس کی بڑائی کا انکار کرتا ہو۔
- اس نے لوگوں کے آشیانے اجاڑے۔ مگر اس نے کن لوگوں کے آشیانے اجاڑے، ان لوگوں کے جو اس کے ماتحت ہوتے ہوئے ماتحت بن کر نہیں رہتے تھے۔ اور کون ہے جو اپنے ان ماتحتوں کا آشیانہ نہ اجاڑے جو اس کے ساتھ سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوں
- اس نے لوگوں پر زندگی کے دروازے بند کئے۔ مگر اس نے کن لوگوں کے دروازے بند کئے، ان لوگوں کے جو اس کے خوشامدی بننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور کون ہے جو اس کے دروازے بند نہ کرے جو اس کا خوشامدی بننے کے لئے تیار نہ ہوتا ہو۔
- اس نے روشن گھروں کو بے نور کیا۔ مگر اس نے کن گھروں کو بے نور کیا، ان گھروں کو جو اس کی متکبرانہ نفسیات کی غذا نہیں بن رہے تھے۔ اور کون ہے جو اس کے روشن گھر کو بے نور نہ کرے جو اس کی متکبرانہ نفسیات کی غذا فراہم نہ کرتا ہو۔
- اس نے لوگوں کے اوپر جھوٹے الزامات لگائے۔ مگر اس نے کن لوگوں کے اوپر جھوٹے الزامات لگائے، ان کے اوپر جو اس کو ننگا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اور کون ہے جو اس کے اوپر جھوٹا الزام نہ لگائے جس کا وجود اس کو ننگا کرنے کی مہم بن گیا ہو۔

آج کی دنیا میں ہر ایک ظالم ہے۔ مگر ہر ایک دوسرے کو ظالم ثابت کرنے میں لگا ہوا ہے۔

انسان کی سب سے بڑی کمزوری

ایک شخص کا کہنا تھا کہ دنیا میں صرف دکھ ہے۔ یہاں سکھ نام کی کوئی چیز نہیں۔ ایک روز وہ اپنی بیوی کے ساتھ ناشتہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ گفتگو کے دوران اس نے اپنا خیال دہرایا۔ اس کے ہاتھ میں مکھن لگا ہوا ڈبل روٹی کا ٹکڑا تھا۔ اس نے کہا دنیا میں دکھ اتنا زیادہ ہے کہ یہ ٹکڑا اگر میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گرے تو وہ بھی مکھن کی طرف گرے گا۔ اس کی بیوی نے کہا کہ تمھارا خیال صحیح نہیں۔ یہاں دکھ سکھ دونوں ہیں۔ ڈبل روٹی کا ٹکڑا اگر زمین پر گرے تو ادھر بھی گر سکتا ہے جدھر مکھن لگا ہوا ہے اور ادھر بھی جس طرف مکھن لگا ہوا نہیں ہے، بحث ہوتی رہی۔ آخر بیوی نے کہا کہ چلو تجربہ کرلو۔ ڈبل روٹی کا ٹکڑا زمین پر گراؤ۔ پھر دیکھو کہ وہ دونوں رخوں میں سے کس رخ پر گرتا ہے۔ آدمی نے ٹکڑے کو فضا میں اچھالا۔ وہ زمین پر گرا تو اتفاقاً برعکس صورت حال پیش آئی۔ ٹکڑے کا مکھن لگا ہوا رخ اوپر تھا۔ تجربہ نے عورت کی بات دو اور دو چار کی طرح ثابت کردی تھی۔ مگر یہ چیز آدمی کو چپ نہ کر سکی۔ اس نے فوراً کہا: بات یہ ہے کہ میں نے غلط رخ پر مکھن لگا دیا تھا۔

یہ لطیفہ انسان کی نفسیات کو بہت خوبی کے ساتھ واضح کر رہا ہے۔ آدمی کسی بات کو اس وقت مانتا ہے جب کہ وہ خود بھی ماننا چاہے۔ اگر وہ ماننا نہ چاہے تو آپ کسی بھی طرح اس کو منوا نہیں سکتے۔ ہر دلیل کے توڑ کے لئے وہ کچھ نہ کچھ الفاظ تلاش کرے گا۔ کوئی دلیل خواہ وہ کتنی ہی مضبوط ہو، آدمی کو چپ کرنے والی ثابت نہیں ہو سکتی۔ مشین میں آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ بٹن دبا کر مطلوبہ نتیجہ حاصل کرلیں۔ مگر انسان اس قسم کی کوئی مشین نہیں ہے۔ یہاں نتیجہ تمام تر خود "مشین" کے اپنے ہاتھ میں ہے نہ کہ آپ کے ہاتھ میں۔ دلیل کو بٹن کا مقام نہیں دیا جا سکتا۔ اور یلا شبہ زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے۔

جب کوئی بات سامنے لائی جائے تو صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی خالص اصلیت کے اعتبار سے اس کو دیکھے۔ وہ کھلے ذہن کے ساتھ اس پر غور کرے۔ ماننے یا نہ ماننے کی بنیاد بات کا صحیح یا غلط ہونا ہو نہ کہ دوسرے اعتبارات۔ یہی طالب حق کا طریقہ ہے۔ مگر آج صورت حال یہ ہے کہ ہر آدمی نے اپنے ذہن کو کہیں نہ کہیں باندھ رکھا ہے۔ وہ کسی نہ کسی جگہ اپنے کو چھپائے ہوئے ہے۔ اس کے فیصلے اسی چھپی ہوئی وفاداریوں کے تحت ہوتے ہیں نہ کہ حقیقتہً بے لاگ جائزہ کے تحت۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب کوئی بات سامنے آتی ہے تو آدمی ایک قسم کے منفی ردعمل کا اظہار کرتا ہے، وہ ایجابی رویہ ظاہر نہیں کرپاتا۔ وہ بات کو اس کی اصلیت کے اعتبار سے دیکھنے کے بجائے اپنے تعصبات اور اپنی مصلحتوں کے تحت اس کو دیکھنے لگتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کا ذہن یا تو تاویل کے رخ پر چل پڑتا ہے یا تردید کے رخ پر۔ وہ تصدیق اور اعتراف کے رخ پر چلنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا۔ جو بات آدمی کی پسند کے خلاف ہو، جس میں اس کی شخصیت چھوٹی ہو رہی ہو اس کو وہ سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ وہ اس کو غیر موافقانہ ذہن کے ساتھ سنتا ہے اور فوری تاثر کے تحت ایک رائے قائم کر کے اس کو رد کر دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں نے ایک بات کو غلط پا کر اس کو رد کیا ہے۔ حالاں کہ باعتبار حقیقت وہ اپنے ایک خود ساختہ تصور کو رد کر رہا ہوتا ہے نہ کہ مخاطب کی کہی ہوئی بات کو۔

اسلام کی نئی تاریخ بنانے کے لئے

قرآن کی دو سورتوں میں اعلان کیا گیا ہے کہ اسلام کو اللہ تعالیٰ نے ابدی طور پر غلبہ کی نسبت عطا فرمائی ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (توبہ ۳۳، صف ۹)

اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ اس کو ہر دین سے اوپر کر دے خواہ شرک کرنے والوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

اس آیت میں ہدایت کی تفسیر قرآن سے کی گئی ہے اور دین حق کی اسلام سے۔ اور اظہار سے مراد حجت و بیان کے اعتبار سے اس کو سب پر فائق کر دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کی صورت میں اللہ نے اپنا جو آخری دین اتارا ہے وہ کلی صداقت کا حامل ہے۔ اس کے لئے مقدر ہے کہ وہ ہر دوسرے دین کے مقابلہ میں بالا و برتر ثابت ہو، ہر دوسرا دین اس کے سامنے بے اصل ہو کر رہ جائے۔ اظہار اسلام سے مراد تقریباً اسی قسم کا ایک نظریاتی غلبہ ہے جو موجودہ زمانہ میں جمہوری طرز فکر کو بادشاہی طرز فکر پر، اجتماعی ملکیت کے نظریہ کو انفرادی ملکیت کے نظریہ پر اور طبیعی علوم (سائنس) کو فلسفیانہ علوم پر حاصل ہوا ہے۔

قرآن کا یہ بیان دور اول میں مکمل طور پر واقعہ بن چکا ہے۔ اسلام کے ظہور نے دوسرے تمام مذاہب پر سایہ ڈال دیا۔ اس وقت جو ادیان رائج تھے —— بت پرستی، پارسیت، یہودیت، عیسائیت، سب کے سب خود اپنے پیروؤں کی نظر میں اس طرح بے وزن ہو گئے کہ ان کی بہت بڑی اکثریت اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو گئی۔ ایشیا اور افریقہ کے جن ممالک کو آج مسلم ممالک کہا جاتا ہے، وہ سب نزول قرآن کے وقت غیر مسلم قوموں کی آبادیاں تھیں۔ مگر اسلام کے برتر فکر نے ان کو اس طرح متاثر کیا کہ وہ اپنے مذاہب کو چھوڑ کر اسلام کے سایہ میں آگئیں۔

اسلام کی یہ برتری موجودہ زمانہ میں واقعہ نہ بن سکی۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ اس کو برتر بنانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ ہماری تحریکیں زیادہ تر دوسروں سے سیاسی زور آزمائی میں مصروف رہیں۔ انھوں نے دوسروں کے اوپر اسلام کے فکری اظہار کی جدوجہد نہ کی۔ یہ جدوجہد اگر آج سے ہونے لگے تو آج ہی سے اسلام کی نئی تاریخ بننا شروع ہو جائے۔

ایک شخص نماز کے لئے مسجد روانہ ہوا۔ راستہ میں کسی سے اس کا ٹکراؤ ہو گیا۔ وہ اس سے لڑنے لگا، یہاں تک کہ جماعت کی نماز ختم ہو گئی۔ موجودہ زمانہ کے مسلم مصلحین کی مثال بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ ان کو اسلام کی مثبت دعوت کے لئے اٹھنا تھا۔ مگر وہ بعض سیاسی شکایات سے متاثر ہو کر کچھ لوگوں سے قلمی اور لسانی جنگ لڑنے میں مصروف ہو گئے۔ انھیں میں کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے اسلام کی نئی تشریح کر کے سیاسی زور آزمائی ہی کو عین اسلام قرار دے دیا۔ اب ہر ایک سیاست کے کاروبار میں مشغول ہے۔ دین کے مثبت پیغام کو لے کر اٹھنے کی فرصت کسی کو نہیں۔

قربانی کیا ہے

قربانی کی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ تم دو، تاکہ جو کچھ تمہارے باہر ہے وہ تم کو مل سکے۔ قربانی اس بات کا سبق ہے کہ اگر تم کچھ پانا چاہتے ہو تو کھونے کا حوصلہ پیدا کرو۔ اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو موت کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ قربانی ایک بے روح رسم نہیں، قربانی ایک زندہ حقیقت ہے جو زندگی سے اسی طرح گہرا تعلق رکھتی ہے جس طرح قدرت کے ابدی قوانین ہماری کائنات سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ قربانی عمل کا خاتمہ نہیں، عمل کا آغاز ہے۔ کبھی ایک چھوٹی سی چیز بھی بڑی چیز ہوتی ہے کیوں کہ وہ کسی بڑی چیز کی علامت ہوتی ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ قربانی کا ہے۔ یہ بظاہر ایک معمولی جانور کو خدا کے نام پر پیش کرنا ہے۔ مگر وہ ایک عظیم چیز ہے کیوں کہ وہ ایک عظیم چیز کی علامت ہے نہ کہ محض ایک وقتی قسم کی بے روح اور بے معنی رسم۔ جانور کی قربانی آدمی کی طرف سے ایک عزم کی علامت ہے، یہ عزم کہ آدمی اپنا سب کچھ حتی کہ اپنی جان بھی اعلیٰ تر مقصد کے لئے قربان کرے گا۔

ایک چھوٹی چیز کس طرح ایک بڑی چیز کی علامت بن جاتی ہے، اس کی وضاحت کے لئے میں قریبی تاریخ کی ایک مثال دوں گا۔ نومبر ۱۹۶۲ کا واقعہ ہے۔ ہندستان کی مشرقی سرحد پر ایک پڑوسی طاقت کی جارحیت کی وجہ سے زبردست خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ سارے ملک میں سنسنی خیزی کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت قوم کی طرف سے جو مظاہرے ہوئے اس میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ احمد آباد کے ۲۵ ہزار نوجوانوں نے مشترکہ طور پر یہ عزم کیا کہ وہ ملک کے بچاؤ کے لئے لڑیں گے اور ملک کے خلاف باہر کے حملہ کا مقابلہ کریں گے، خواہ اسی راہ میں ان کو اپنی جان دے دینی پڑے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد انھوں نے یہ کیا کہ ان میں سے ہر شخص نے اپنے پاس سے ایک ایک پیسہ دیا اور اس طرح ۲۵ ہزار پیسے جمع کئے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے ان پیسوں کو اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی خدمت میں پیش کیا۔ پیسہ دیتے ہوئے انھوں نے ہندستانی وزیر اعظم سے کہا کہ یہ ۲۵ ہزار پیسے ہم ۲۵ ہزار نوجوانوں کی طرف سے اپنے آپ کو آپ کے حوالے کرنے (To give ourselves to you) کا نشان ہیں۔ ان نوجوانوں میں سے ہر ایک نے بظاہر صرف ایک پیسہ دیا تھا جس کی عام حالات میں کوئی قیمت نہیں۔ مگر ان کا پیسہ اس لئے انتہائی قیمتی ہو گیا کہ وہ ایک انتہائی بڑی حقیقت کی علامت تھا۔ ان کے ۲۵ ہزار پیسے ۲۵ ہزار زندگیوں کے نمائندہ تھے۔ پیسہ کی صورت میں گویا وہ خود اپنی زندگیاں اپنے ملک کے لئے دے رہے تھے۔ انھوں نے علامتی طور پر ایک پیسہ قربان کر کے درحقیقت اپنی زندگی کو قربان کرنے کا عزم کیا تھا۔ اسی طرح جانور کی قربانی بھی دراصل ایک عزم کی علامت ہے، اس عزم کی کہ آدمی اپنا سب کچھ حتی کہ اپنی جان بھی اعلیٰ تر خدائی مقصد کے لئے قربان کر دے گا۔

یہ دنیا خدا نے اس ڈھنگ پر بنائی ہے کہ یہاں جو اپنے کو مٹاتا ہے وہی اس دنیا سے اپنے لئے پاتا ہے۔ قربانی اسی خدائی قانون کو یاد دلانے کا ایک سالانہ عمل ہے جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں شامل کر کے ہمیں دیا جاتا ہے۔ قربانی میں آدمی جانور کو خدا کے نام پر ذبح کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کے گوشت کو خود کھاتا ہے اور دوسروں کو کھلاتا ہے۔ خدا کے

دئے ہوئے رزق سے کھانا آدمی کی روزانہ کی ضرورت ہے۔ کوئی آدمی کھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی عام ضرورت کی چیز کو ایک روز خصوصی طور پر خدا کے نام پر قربان کرکے اس کو ایک اہم سبق دینے کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ قربانی گویا اس بات کی علامت ہے کہ آدمی وہ قیمت دینے کے لئے تیار ہے جو خدا کی اس زمین میں ایک حقیقی کامیابی حاصل کرنے کے لئے اسے دینا چاہئے۔

یہ قربانی دنیا کے عمومی نظام سے الگ کوئی چیز نہیں۔ وہ قدرت کا عالم گیر قانون ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ درخت کے ایک بیج کو کولڈ اسٹوریج میں محفوظ کر دیا جائے تو وہ ہمیشہ ایک بیج کی صورت میں پڑا رہے گا۔ مگر جب اس کو مٹی میں ڈال دیا جائے تو اس کے بعد ایک حیرت انگیز واقعہ رونما ہوتا ہے۔ اب اس معمولی بیج کے اندر سے ایک ایسا درخت نکلتا ہے جو مزید بے شمار بیج پیدا کرتا ہے اور پیدا کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے ہرے بھرے وجود سے زمین کی رونق بن جاتا ہے۔ جس کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں جس سے طرح طرح کے مختلف فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ کولڈ اسٹوریج میں رکھے ہوئے بیج اور مٹی میں ڈالے ہوئے بیج کے انجام میں اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کو قربانی کہا جاتا ہے۔ مٹی کے بیج نے اپنے آپ کو فنا کر دیا۔ اس لئے وہ ایک عظیم درخت بن کر زمین پر قائم ہو گیا۔ اس کے برعکس کولڈ اسٹوریج کے بیج نے اپنے کو فنا نہیں کیا۔ اس لئے وہ غیر اہم ہو کر رہ گیا ——— ایک بیج اپنے کو مٹاتا ہے تب وہ درخت بنتا ہے۔ درخت اپنے بہترین حاصل کو لٹاتا ہے تب وہ اپنی شاخ پر ایک پھول کھلانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ پھول اپنے حسین وجود کو فنا کرتا ہے۔ تب یہ ممکن ہوتا ہے کہ اس کے اندر سے ایک قیمتی پھل نکلے۔ پھل اپنے وجود کو ختم کرنے پر راضی ہوتا ہے تب ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس انسان کا گوشت اور خون بنے جو زمین کو آباد کرے اور خلا کے فاصلوں کو ناپے۔

دنیا میں انسان کے لئے جن کامیابیوں کے امکانات رکھے گئے ہیں ان سب کا زینہ صرف ایک ہے اور وہ قربانی ہے۔ علم میں کمال پیدا کرنا، تجارت میں اعلیٰ مقام پر پہنچنا، سیاست میں اونچا عہدہ حاصل کرنا، اخلاق اور انسانیت کے اعتبار سے ترقی کے درجات طے کرنا، ایک خاندان یا ایک قوم کو اونچا اٹھانا، سب قربانی کی راہ سے حاصل ہوتا ہے اس دنیا کے بنانے والے نے اس کو اس ڈھنگ پر بنایا ہے کہ یہاں کسی قسم کی کوئی کامیابی قربانی کی حد تک کوشش کئے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ بڑے بڑے الفاظ بول کر یا محض اِدھر اُدھر کی سرسری کارروائیاں کرکے کوئی بڑی ترقی حاصل کرلے تو یہ ایک ایسی خوش خیالی ہے جو خدا کی اس دنیا میں کبھی واقعہ نہیں بنتی۔

پھر ایک ایسی دنیا میں کیوں کر ممکن ہے کہ خدا قربانیوں کے بغیر کسی سے خوش ہو جائے۔ دنیا میں کسی چیز کو پانے یا نہ پانے کا ایک اصول مقرر کرکے گویا خدا نے یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ انسان کے لئے خدا کو پانے یا نہ پانے کا اصول کیا ہے۔ وہ صرف قربانی ہے۔ دنیا میں کسی چیز کو پانے کی جو شرط ہے وہی خدا کو پانے کی شرط بھی ہے۔ آدمی اگر اپنے رب کو خوش کرنا چاہتا ہے تو اس کو اپنے رب کے لئے اپنے آپ کو قربان کرنا پڑے گا۔ خدا اسی کو اپنا سب کچھ دیتا ہے جس نے خدا کو اپنا سب کچھ دے دیا ہو۔ قربانی کی قیمت دیئے بغیر کسی کو خدا کے بنائے ہوئے اس نظام میں کچھ بھی نہیں مل سکتا۔

پھر جو اصول دنیا میں کامیابی کا ہے وہی اصول آخرت میں کامیابی کا بھی ہے۔ البتہ آخرت کی دنیا چونکہ موجودہ دنیا سے بہت زیادہ قیمتی ہے اس لئے آخرت کی خاطر جو قربانی مطلوب ہے وہ بھی بہت زیادہ بڑی قربانی ہے۔ اسلام کے نزدیک ہماری زندگی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس کا چھوٹا، بہت چھوٹا حصہ موجودہ دنیا میں ہے۔ اور اس کا بڑا، زیادہ بڑا اور مستقل حصہ آخرت میں، جو مرنے کے بعد ہمارے سامنے آئے گا۔ اگلی دنیا کی کامیابی کا سارا دارومدار بھی، موجودہ دنیا کی طرح، قربانی پر ہے۔ اگلی دنیا گویا بہترین چھنے ہوئے انسانوں کی کالونی ہے۔ آج جو لوگ اپنے فکر و عمل میں بہترین انسان ثابت ہوں گے وہ اگلی دنیا میں جنت کی کالونیوں میں بسائے جائیں گے اور جو لوگ آج اعلیٰ انسانیت کا ثبوت نہ دے سکیں وہ جہنم کے پُرعذاب ماحول میں دھکیل دئے جائیں گے۔

اچھا انسان بننا کیا ہے۔ اچھا انسان بننا یہ ہے کہ آدمی خدائی سطح پر جینے لگے۔ وہ اپنے اندر خدائی اوصاف پیدا کرے۔ اس مقصد کے لئے آدمی کو شیطان سے لڑنا پڑتا ہے۔ اپنی پوری زندگی کو شیطان کے اثرات سے پاک کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک مسلسل قربانیوں کا راستہ ہے۔ وہی شخص خدا کی جنتی دنیا میں اپنے لئے جگہ پاتا ہے جو اس قربانی کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کر سکے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ آدمی تمام بے حقیقت خیالات کو اپنے ذہن سے نکالے اور صرف صحیح اور برحق خیالات کو اپنے ذہن میں جگہ دے خواہ یہ فکری آپریشن اس کے لئے اپنے محبوب تصورات کو ذبح کرنے کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ آدمی اپنے کردار کو حق کی بنیاد پر قائم کرے خواہ اس کی خاطر دنیوی فائدوں اور مصلحتوں کو کچلنا پڑے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ آدمی سچائی کے آگے جھک جائے خواہ اس کی قیمت میں اس کو بڑائی کی گدی سے محروم ہو جانا پڑے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ آدمی حقیقت پسندی اور اصول پرستی کو اپنی زندگی کا دستور بنائے خواہ اس کی وجہ سے وہ دنیا میں بے جگہ ہو جائے۔

ہر زمانہ میں ایسا ہوتا ہے کہ دنیا میں کچھ طریقے رائج ہو جاتے ہیں۔ تعلقات کی کچھ بنیادیں قائم ہو جاتی ہیں۔ کچھ محبوب خیالات آدمی کے ذہن میں جگہ پا لیتے ہیں۔ انھیں چیزوں کے بل پر آدمی جی رہا ہوتا ہے۔ وہ خیال اور عمل کے ایک حلقہ سے اپنے کو جوڑ کر ناز کر رہا ہوتا ہے کہ میں نے بہترین حلقہ کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر لی ہے۔ اب جب اس کے سامنے حق کی دعوت آتی ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ دعوت اس کی مصلحتوں پر ضرب لگا رہی ہے۔ اس کے تعلقات کو توڑنا چاہتی ہے۔ اس کے ان خیالات کو بے قیمت ثابت کر رہی ہے جن کے سہارے وہ اپنے لئے ایک حسین مستقبل کا خواب دیکھ رہا تھا۔ ان وجوہ سے حق کی دعوت کو قبول کرنا اس کے لئے ایک عظیم قربانی کا عمل بن جاتا ہے۔ یہ اپنی پوری زندگی کو حق کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ مگر یہی وہ قربانی ہے جو آدمی کو خدا کی نظر میں محبوب بناتی ہے۔ یہی وہ قربانی ہے جس سے آدمی کے اوپر ابدی جنتوں کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ اپنے وجود کی قربانی ہی جنت کی واحد قیمت ہے۔ اس قربانی کے بغیر کسی کو خدا کی جنت نہیں ملتی۔

نوٹ: یہ تقریر یکم نومبر ۱۹۷۹ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

مال دین اور دنیا کے لئے مددگار

بیہقی نے حضرت اسلم کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ابوعبیدہ بن جراح سے کوئی سرکاری کام لیا اُس کے بعد ان کے پاس ایک ہزار دینار بھیجے۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس کو واپس کر دیا اور کہا: اے ابن خطاب! یہ کام میں نے تمھارے لئے نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کو اللہ کے لئے کیا تھا۔ اس لئے میں اس بارے میں کچھ نہ لوں گا۔" عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو کام پر بھیجا اور ہم کو عطیات دئے تو ہم کو اس کے لینے میں کراہت ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ تم لوگوں کو لینا چاہئے:

فاقبلها ایها الرجل فاستعن بها علیٰ دینك ودنیاك — پس اے آدمی اس کو قبول کر اور اس کے ذریعہ سے اپنے دین اور اپنی دنیا میں مدد حاصل کر۔

اس کے بعد ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس کو قبول کر لیا۔

قریب کے صدقہ میں زیادہ ثواب

حضرت ابوہریرہ رضؓ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے محمدؐ کی امت اس ذات کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے، اس آدمی سے اللہ کوئی صدقہ قبول نہیں کرے گا جس کے ضرورت مند رشتہ دار ہوں اور وہ ان کو دینے کے بجائے دوسروں کو دے (یا امة محمد والذی بعثنی بالحق لا یقبلُ الله صدقةً من رجل وله قرابة محتاجون الی صلته ویصرفها الی غیرهم، طبرانی) ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، قیامت کے دن اللہ اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔

محنت کی کمائی مومن کے لئے زیادہ بہتر ہے

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک انصاری مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور سوال کیا۔ آپؐ نے پوچھا: تمھارے گھر میں کچھ ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے پاس ایک معمولی چادر ہے جس کو اوڑھتا ہوں۔ ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتا ہوں۔ آپؐ نے اس سے پیالہ منگوایا۔ آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ اس پیالہ کی قیمت لگاؤ۔ ایک شخص نے ایک درہم قیمت لگائی۔ دوسرے نے قیمت میں اضافہ کرکے دو درہم بتایا اور لے لیا۔ آپؐ نے یہ دونوں درہم انصاری کو دئے اور کہا: ایک درہم کا کھانا خرید کر اپنے گھر دے دو اور ایک درہم سے کلہاڑی خرید کر میرے پاس لاؤ۔ وہ خرید کر لائے۔ آپ نے کلہاڑی میں اپنے ہاتھ سے دستہ ڈالا اور فرمایا:

اذهب فاحتطب ولا اذینك خمسة عشر یوما — جاؤ۔ جنگل سے لکڑی کاٹ کر لاؤ اور بیچو۔ پندرہ دن تک میرے پاس نہ آنا

وہ انصاری اپنے کام میں لگ گئے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور ان کو فروخت کرتے۔ دو ہفتہ بعد وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اپنی آمد و خرچ کا حساب پیش کیا۔ اس مدت میں اپنے اخراجات پورے کرنے کے بعد انھیں دس درہم بچے تھے۔ آپ خوش ہوئے اور فرمایا:

هذا خیر لك من ان تجئ المسئلة نكتة فی ... یہ تمہارے لئے اس سے بہتر ہے کہ تم سوال کرو اور وہ قیامت وجهك یوم القیامة (ابوداؤد، ابن ماجہ) کے دن تمہارے چہرے پر ایک داغ کی صورت میں ظاہر ہو

فضول خرچی کسی بہتر خرچ کی قیمت پر ہوتی ہے

ما رأیت اسرافاً الا وبجانبه حق مضیّع میں نے جب بھی کسی اسراف کو دیکھا تو میں نے پایا کہ اس کے پہلو میں ایک حق کو ضائع کر دیا گیا تھا۔ یعنی جب بھی آدمی کسی غیر ضروری مد میں اپنا پیسہ برباد کرتا ہے تو وہ ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ کسی ضروری مد میں پیسہ نہ خرچ کیا گیا ہو۔

مال کے بجائے اللہ پر بھروسہ

سلمہ بن سعید اور عبداللہ بن عمر رضؓ سے روایت ہے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں عراق سے مال آیا۔ آپ نے اس کو تقسیم کرنا شروع کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا مال تقسیم کر کے ختم کر دیں گے۔ عبدالرحمن بن عوف رضؓ کھڑے ہوئے اور کہا:

یا امیرالمومنین لو ابقیت من هذا المال لعدو ان حضر او نائبة ان نزلت (حلیۃ الاولیاء) اے امیرالمومنین! اس مال سے آپ کچھ روک لیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی دشمن سے مقابلہ پڑے یا کوئی ناگہانی مصیبت آجائے۔

عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا:

مالك، قاتلك الله، نطق بها علی لسانك شیطان والله لا اعصین الله الیوم لغد تم کو کیا ہوا۔ اللہ تم کو قتل کرے۔ یہ بات شیطان نے تمہاری زبان سے کہلائی ہے۔ خدا کی قسم میں کل کے اندیشہ سے آج کے دن اللہ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔

تعمیر دنیا سے زیادہ فکر تعمیر آخرت کی

مدینہ میں ایک مسلمان نے اپنا گھر بنایا۔ وہ دیوار کے اوپر مٹی لیپ رہے تھے۔ اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے۔ آپ نے پوچھا کیا کر رہے ہو۔ انھوں نے جواب دیا: شیئاً نطین (مٹی لگا رہے ہیں) آپ نے فرمایا: الامر اسرع من ذلك (فیصلہ کی گھڑی اس سے زیادہ قریب ہے)

شہادت سے بھی قرض معاف نہیں ہوتا

ابو قتادہ بن ربعی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعظ کے لئے کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ اللہ کے راستہ میں جہاد اور اللہ پر ایمان تمام اعمال میں سب سے افضل ہیں۔ ایک شخص اٹھا اور اس نے کہا، اے اللہ کے رسول آپ کیا فرماتے ہیں، اگر میں اللہ کے راستہ میں مارا جاؤں تو میری خطائیں مجھ سے دور ہو جائیں گی۔ آپؐ نے فرمایا: ہاں اگر تم اللہ کے راستہ میں مارے جاؤ اس حال میں کہ تم صبر کرنے والے ہو، تمہاری نیت رضائے الٰہی کو پانا ہو، تم آگے بڑھنے والے ہو، پیچھے مڑنے والے نہ ہو۔" پھر کچھ دیر میں آپؐ نے فرمایا "تم نے کیا کہا تھا" انھوں نے کہا: آپ کیا فرماتے ہیں اگر میں اللہ کے راستہ میں مارا جاؤں تو میری خطائیں مجھ سے دور ہو جائیں گی۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا: "ہاں اگر تم صبر کرنے والے ہو، تمہاری نیت رضائے الٰہی کو پانا ہو، تم آگے بڑھنے والے ہو پیچھے مڑنے والے نہ ہو۔ الا یہ کہ تمہارے اوپر قرض ہو۔ کیوں کہ جبریل نے مجھ کو اسی طرح بتایا ہے۔ (مسلم)

انفاق اپنے آپ کو آگ سے چھڑانے کے لئے

عدی بن حاتم کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: اتقوا النار ولو بشق تمرۃ فمن لم یجد فبکلمۃ طیبۃ آگ سے بچو خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو اور جو یہ بھی نہ پائے تو ایک پاکیزہ بات کے ذریعہ

مسلمان کے لئے ایک مسلمان درہم و دینار سے زیادہ محبوب ہوتا ہے

طبرانی نے حضرت عبداللہ بن عمر رض سے نقل کیا ہے۔ انھوں نے فرمایا:

اتی علینا زمان وما یری احد منا انہ احق بالدینار والدرہم من اخیہ المسلم۔ وانا فی زمان الدینار والدرہم احب الینا من اخینا المسلم

ہمارے اوپر ایسا زمانہ گزرا ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص نہ تھا جو اپنے بھائی کے مقابلہ میں اپنے آپ کو درہم و دینار کا زیادہ مستحق سمجھتا ہو۔ اور اب میں ایسے زمانہ میں ہوں کہ درہم و دینار ہمارے لئے اپنے بھائی سے زیادہ محبوب بن گئے ہیں۔

اس وقت انفاق جب کہ اسلام بے کسی کی حالت میں ہو

ہشام بن عروہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ جب ابوبکر رض ایمان لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے۔ انھوں نے یہ پورا کا پورا مال اسلام کی راہ میں خرچ کر دیا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی شخص کے مال نے مجھ کو اتنا فائدہ نہیں پہنچایا جتنا ابوبکر رض کے مال نے پہنچایا (قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین)

زیادتی کی حالت میں بھی احتیاط کے ساتھ خرچ کرنا

عبداللہ بن عمرو بن العاص رض کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد رض کے پاس سے گزرے۔ وہ بڑے برتن میں پانی لے کر بے تکلفی کے ساتھ وضو کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: ما ھذا السرف یاسعد (اے سعد! یہ کیا فضول خرچی ہے) حضرت سعد رض نے کہا: کیا وضو میں بھی فضول خرچی ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

نعم وان کنت علیٰ نھر جار (احمد)

ہاں۔ خواہ تم بہتے دریا کے کنارے کیوں نہ ہو

حقوق کی ادائگی میں عجلت

عبداللہ بن عمر رض کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ (ابن ماجہ)

مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ سوکھنے سے پہلے دو

نصیحت مال سے زیادہ قیمتی ہے

عن ابی عمیر الطوری ابان ابن سلیم قال: کلمۃ حکمۃ لک من اخیک خیر لک من مال یعطیک لان المال یطغیک والکلمۃ تھدیک (جامع بیان العلم، جزء اول، صفحہ ۵۲) تمہارا بھائی تم کو حکمت کا ایک کلمہ دے، یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ تم کو مال دے۔ کیوں کہ مال تم کو سرکش بناتا ہے اور حکمت کی بات تم کو راہ دکھاتی ہے۔

پیشہ کی بنیاد پر کسی کو حقیر سمجھنا جہالت ہے

غزوۂ بدر میں مشرکین کی فوج کی سرداری ابوجہل کے ہاتھ میں تھی۔ انصار کے دو نوجوان معوذ بن عفراء اور معاذ بن عفراء نے باہم طے کیا کہ وہ ابوجہل کو قتل کریں گے۔ دونوں بھائی مشرکین کی صفوں میں گھس گئے اور اپنی جان پر کھیل کر ابوجہل کو قتل کر ڈالا۔ عبد اللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ آخر وقت میں جب کہ ابوجہل کو معلوم ہوا کہ اس کو قتل کرنے والے مدینہ کے باشندے ہیں تو ابوجہل نے کہا:

لو غیر اکار قتلنی (بخاری و مسلم)

کاشتکار کے علاوہ کسی اور نے کاش مجھ کو قتل کیا ہوتا

مدینہ کے لوگوں کا ذریعہ معاش زیادہ تر کاشتکاری تھا۔ ابوجہل نے کاشتکاری کرنے والوں کو حقیر سمجھا۔

دولت اور اقتدار سے بغض و عداوت پیدا ہوتا ہے

مسور بن مخرمہ کہتے ہیں کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس قادسیہ کا مال غنیمت آیا وہ اس کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے اور رو رہے تھے۔ عبد الرحمٰن بن عوف رضی نے کہا: اے امیر المومنین! آپ کیوں رو رہے ہیں۔ اللہ نے آپ کو فتح دی۔ آپ کو آپ کے دشمنوں پر غالب کیا۔ ان کے اموال آپ کے قبضہ میں دے کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی کیں۔ عمر رضی نے فرمایا:

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: لا تفتح الدنیا علی احد الا القی اللہ عز وجل بینھم العداوۃ والبغضاء الی یوم القیامۃ، وانا اشفق من ذلک (احمد، بیہقی، بزار)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جب بھی کسی کے اوپر دنیا کھولی جاتی ہے تو اللہ قیامت تک کے لئے ان کے درمیان عداوت اور بغض ڈال دیتا ہے۔ اور میں اسی سے ڈر رہا ہوں۔

خوش حالی زیادہ سخت آزمائش ہے

ابویعلی اور بزار نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لانا لفتنۃ السراء اخوف علیکم من فتنۃ الضراء انکم ابتلیتم لفتنۃ الضراء فصبرتم وان الدنیا حلوۃ خضرۃ

میں تمہارے بارے میں خوش حالی کے فتنہ سے زیادہ ڈرتا ہوں بہ نسبت تنگ حالی کے فتنہ کے۔ تم تنگ دستی کے فتنہ میں بتلا کئے گئے اور تم نے صبر کیا۔ مگر دنیا بڑی شیریں اور سرسبز ہے۔

طبرانی نے عوف بن مالک کے واسطہ سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

تصب علیکم الدنیا صبا حتی لا یزیغکم بعد ان زغتم الا ھی

دنیا تمہارے اوپر بہہ پڑے گی۔ یہاں تک کہ میرے بعد تمہارے اندر کجی آئی تو دنیا کے سوا کسی اور سبب سے نہیں آئے گی۔

تین چیزیں ہر مسلمان پر حرام ہیں

کل المسلم علی المسلم حرام عرضہ ومالہ ودمہ (حدیث)

مسلمان پر مسلمان کی آبرو اس کا مال اور اس کا خون حرام ہے

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں ، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں ۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں ۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی ۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے ۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں ۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے ۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے ۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے ۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے ۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں ۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں ۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں ۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے ۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ـــــ الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے ۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے ۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں ۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں ۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے ۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا ۔

دوسری صورت ـــــ الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے ۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں ۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں ، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں ۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں ۔

عربی مطبوعات

مولانا وحید الدین خاں کی کتابوں کے بعض عربی ترجمے (مطبوعہ قاہرہ) برائے فروخت مکتبہ الرسالہ میں موجود ہیں :

کتاب	صفحات		قیمت	
۱ - الإسلام يتحدى	۲۶۳	صفحات	قیمت ۲۰	روپے
۲ - الدين في مواجهة العلم	۱۱۲	صفحات	" ۱۰	روپے
۳ - حكمة الدين	۸۷	صفحات	" ۸	روپے
۴ - الإسلام والعصر الحديث	۷۷	صفحات	" ۸	روپے
۵ - مسئوليات الدعوة	۳۹	صفحات	" ۲	روپے
۶ - نحو تدوين جديد للعلوم الإسلامية	۲۶	صفحات	" ۲	روپے
۷ - إمكانات جديدة للدعوة	۳۴	صفحات	" ۲	روپے
۸ - الشريعة الإسلامية وتحديات العصر	۳۲	صفحات	" ۲	روپے
۹ - المسلمون بين الماضي والحال والمستقبل	۷۲	صفحات	" ۵	روپے
۱۰ - نحو بعث إسلامي	۳۲	صفحات	" ۵۰	پیسے

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں
کے قلم سے

- دین کیا ہے — صفحات ۳۲ قیمت ۱/۵۰ روپے
- تجدید دین — صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- مذہب اور جدید چیلنج — صفحات ۲۲۴ قیمت ۱۳/۵۰ روپے
- تعمیر ملت — صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- الاسلام — صفحات ۱۷۶ قیمت ۱۲/- روپے
- اسلام دین فطرت — صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- ظہور اسلام — صفحات ۲۰۰ قیمت ۱۲/- روپے
- زلزلۂ قیامت — صفحات ۶۴ قیمت ۳/- روپے
- اسلامی دعوت — صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- تاریخ کا سبق — صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- عقلیات اسلام — صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- قرآن کا مطلوب انسان — صفحات ۸۰ قیمت ۴/۵۰ روپے
- مذہب اور سائنس — صفحات ۷۲ قیمت ۴/-
- پیغمبر اسلام — صفحات ۴۸ قیمت ۲/-
- سبق آموز واقعات — صفحات ۴۸ قیمت ۲/-

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

REGD. R N NO 28822/76
REGD D (D) NO 532

January 1980
Issue No. 38

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 110006 INDIA PHONE 262331

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

آپ اپنی غلطی کی قیمت دوسروں سے وصول نہیں کر سکتے۔
اور بلاشبہ یہ زندگی کی سب سے زیادہ تلخ حقیقت ہے

شمارہ ۳۹ زرتعاون سالانہ ۲۴ روپے قیمت فی پرچہ
فروری ۱۹۸۰ خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے ۲ روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

الرسالہ

فروری ۱۹۸۰
شمارہ ۳۹

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دھلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی **Al-Risala Monthly** لکھیں

نماز کے مسائل قرآن میں

"نماز کے مسائل" کا لفظ بولا جائے تو ذہن عام طور پر ان جزئی آداب کی طرف چلا جاتا ہے جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے۔ اسی لئے جب کسی کو نماز کے "مسائل" کی تلاش ہوتی ہے تو وہ فقہ کی کتاب دیکھتا ہے۔ مگر نماز کے مسائل کا تعلق صرف اس کے جزئی آداب سے نہیں ہے۔ اس سے پہلے اس کا تعلق نماز کے مقصد اور اس کے بنیادی پہلوؤں سے ہے۔ نماز کے جزئی آداب بلاشبہ فقہ کی کتابوں ہی میں ملیں گے۔ مگر جہاں تک نماز کے اساسی امور کا تعلق ہے وہ مکمل طور پر قرآن میں موجود ہیں اور قرآن کے تتبع سے واضح طور پر ان کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس ذہن کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک آدمی نماز میں جزئی آداب کا اہتمام تو خوب کرے گا۔ مگر نماز کے جو بنیادی اور مقصدی پہلو ہیں ان کی طرف سے غافل رہے گا۔ کیوں کہ وہ ان کو نماز کے "مسائل" نہیں سمجھتا ـــــ یہاں اس سے متعلق قرآن کے کچھ حوالے نقل کئے جاتے ہیں:

ہر نماز کا ایک وقت ہے اور اس کی ادائگی میں وقت کی پابندی ضروری ہے — ان الصلاۃ کانت علی المومنین کتاباً موقوتا، نساء ۱۰۳

جب نماز پڑھی جائے تو صاف پاک ہو کر پڑھی جائے ـــــ اذا قمتم الی الصلاۃ فاغسلوا — مائدہ ۶

نماز کے وقت اپنے کو ماحول سے الگ کر کے اللہ کی طرف متوجہ ہونا ـــــ واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا — مزمل ۸

نماز اس طرح پڑھی جائے کہ آدمی کا شعور اس کے ساتھ جڑا ہوا ہو ـــــ لا تقربوا الصلاۃ وانتم سکاریٰ — نساء ۴۳

نماز آدمی کے اوپر نگراں بن جائے جو اس کو برے کاموں سے روکے ـــــ ان الصلاۃ تنہیٰ عن الفحشاء والمنکر — عنکبوت ۴۵

نماز آدمی کو اللہ کی یاد کرنے والا بناتی ہے ـــــ اقم الصلاۃ لذکری — طہٰ ۱۴

نماز کے وقت آدمی کے اوپر پستی کی حالت طاری ہونا چاہئے ـــــ الذین ھم فی صلاتھم خاشعون — مومنون ۲

جب نماز کا وقت آجائے تو کام چھوڑ کر نماز کی طرف دوڑنا چاہئے ـــــ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ — جمعہ ۹

نماز نمازیوں کے لئے ایک ہو کر رہنے کی تربیت ہے ـــــ وارکعوا مع الراکعین — بقرہ ۴۳

نماز ایک واسطہ ہے جس کے ذریعہ آدمی خدا کی مدد کا طالب ہوتا ہے ـــــ استعینوا بالصبر والصلاۃ — بقرہ ۱۵۳

نماز میں مشغول ہو کر آدمی کو خدا کی نزدیکی کا تجربہ ہوتا ہے ـــــ واسجد واقترب — علق ۱۹

نماز جاہلی طریقوں کو چھوڑ دینے کا سبق دیتی ہے ـــــ اصلاتک تامرک ان نترک ما یعبد آباؤنا — ھود ۸۷

نماز آدمی کے اوپر اس طرح چھائے کہ وہ اس کی پہچان بن جائے ـــــ سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود — فتح ۲۹

نماز آدمی کے لئے اس کی تنہائیوں کی ساتھی ہے ـــــ والذین یبیتون لربھم سجدا وقیاما — فرقان ۶۴

نماز ہر آدمی پر ساری عمر کے لئے فرض ہے ـــــ ھم علیٰ صلاتھم دائمون — معارج ۲۳

نماز حفاظت کی چیز ہے جس طرح مال حفاظت کی چیز ہے ـــــ حافظوا علی الصلوات — بقرہ ۲۳۸

نماز کا مطلب خوف آخرت کی وجہ سے خدا کے سامنے گر پڑنا ہے ـــــ ساجدا وقائما یحذر الآخرۃ — زمر ۹

نماز میں آدمی کو عاجز بندہ کی طرح کھڑا ہونا چاہئے ـــــ قوموا للہ قانتین — بقرہ ۲۳۸

بھیڑ کے درمیان سناٹا

نمازیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے مگر اللہ کے خوف سے جھکنے والے نظر نہیں آتے۔ دین کی خاطر بولنے والے بہت ہیں مگر دین کی خاطر چپ ہو جانے والا کوئی نہیں۔ ملت کو بربادی سے بچانے کے لئے ہر ایک مجاہد بنا ہوا ہے مگر فرد کو بربادی سے بچانے کے لئے کوئی بے قرار نہیں ہوتا۔ اپنی حق پرستی کو جاننے کا ماہر ہر ایک ہے مگر دوسرے کی حق پرستی کو جاننے کی ضرورت کسی کو محسوس نہیں ہوتی۔ چوک پر خدا پرستی کا مظاہرہ کرنے والوں کی ہر طرف بھیڑ لگی ہوئی ہے مگر تنہائیوں میں خدا پرست بننے سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ اسلام کو مکمل نظام ثابت کرنے کے لئے ہر شخص زبان و قلم کا زور صرف کر رہا ہے مگر اسلام کے جس "جزئی نظام" کا تعلق اس کی اپنی ذات اور خاندان سے ہے اس کی اہمیت کو کوئی نہیں جانتا۔ خدا کے دین کو ساری دنیا میں غالب کرنے کے لئے ہر آدمی بے قرار ہے مگر خدا کے دین کو اپنی زندگی میں غالب کرنے کی فرصت کسی کو نہیں۔ جنت کی کنجیوں کے گچھے ہر ایک کے پاس ہیں مگر جہنم کے اندیشے سے تڑپنے کی ضرورت کوئی محسوس نہیں کرتا۔ دنیوی رونق والے اسلام کی طرف ہر شخص دوڑ رہا ہے مگر اس اسلام سے کسی کو دلچسپی نہیں جو زندگی میں آخرت کا زلزلہ پیدا کر دے ——— انسانوں کی بھیڑ میں سناٹے کا یہ عالم شاید آسمان نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

کیسی عجیب بات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب میں جو یہودی علماء تھے وہ گویا اس زمانہ میں خدائی مذہب کے وارث تھے۔ ان کا مذہبی درجہ تمام لوگوں کے نزدیک مسلّم تھا۔ انھوں نے اپنی حیثیت کو استعمال کرتے ہوئے آپ کو رد کر دیا۔ مگر ان کو معلوم نہ تھا کہ جس کو وہ رد کر رہے ہیں وہی وہ شخص ہے جس کو اللہ نے ان کی خدا پرستی کی جانچ کے لئے بھیجا ہے۔ وہ آپ کو رد کر کے بظاہر حمایت دین کا کریڈٹ لے رہے تھے۔ مگر اللہ کے یہاں وہ اس بات کے مجرم بن رہے تھے کہ اپنے آپ کو انھوں نے گروہی تعصبات کے خول میں اتنا زیادہ بند کر لیا کہ سچائی ان کو اپنے اصلی روپ میں نظر نہ آسکی۔ مکہ کے لوگ دین ابراہیمی کے محافظ بنے ہوئے تھے۔ یہودی اپنے کو انبیائے بنی اسرائیل کا وارث کہتے تھے۔ مگر دونوں نے اسی انسان کا انکار کر دیا جو حضرت ابراہیمؑ کے دین کو اور بنی اسرائیل کو دی جانے والی آسمانی کتابوں کو اس کی اصلی صورت میں ان کے سامنے پیش کر رہا تھا۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں جس طرح ہدایت کے مواقع رکھے گئے ہیں اسی طرح گمراہی کے راستے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں جو شخص حق کی آواز کو رد کرنا چاہے اس کو بآسانی ایسے خوبصورت الفاظ مل جاتے ہیں جن کو بول کر وہ اپنے آپ کو جھوٹے یقین میں مبتلا کرے۔ یہاں دین کی سچی دعوت کو نظر انداز کر کے بھی آدمی ایسے در و دیوار پا لیتا ہے جس کے سایہ میں وہ پناہ لے سکے۔ یہاں خدا کی پکار کی طرف سے اپنے کانوں کو بند کر کے بھی ایسی چٹانیں مل جاتی ہیں جو کسی کو یہ تسکین دے سکیں کہ اس نے اپنے لئے ایک مضبوط سہارا دریافت کر لیا۔ مگر جب پردہ ہٹے گا تو یہ چیزیں اتنی بے معنی ثابت ہوں گی جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

انسانوں کی تین قسمیں

ایمان کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی اللہ سے ڈرتا ہو۔ وہ اپنے معاملات میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ وہ اس طرح زندگی گزارے گویا وہ اپنے آپ پر خدا کی نگرانی قائم کئے ہوئے ہے۔ وہ خدا کو نہ دیکھتے ہوئے بھی تمام نظر آنے والی طاقتوں سے زیادہ اس کا اندیشہ رکھتا ہو۔ وہ خدا کے پاس ایسا دل لے کر پہنچے جو دنیا کی زندگی میں ہمیشہ خدا کی طرف متوجہ رہا ہو۔ یہی اللہ کے مطلوب اور محبوب بندے ہیں۔ جب اللہ کی خاطر وہ دنیا کا تعب اٹھا کر آخرت میں پہنچیں گے تو ان کا رب ان کو خوش آمدید کہے گا اور فرمائے گا کہ ہرے بھرے باغوں والے جنتی مکانات میں داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ وہاں رہو۔ یہاں تمھارے لئے وہ سب کچھ ہے جو تم چاہو۔ اور ہمارے اتھاہ انعامات اس کے علاوہ ہیں (ق ۳۵-۳۱)

دوسرے لوگ وہ ہیں جو اللہ پر ایمان لائے اور عمل صالح کیا۔ تاہم ان سے کوتاہیاں بھی ہوئیں۔ ان کے ٹھیک کام میں برا کام بھی شامل ہوتا رہا۔ مگر اس کمزوری کے باوجود وہ ڈھیٹ نہیں بنے۔ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرکے اللہ سے معافی مانگتے رہے اور بار بار اس کی طرف پلٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ امید ہے کہ اللہ ان کو بھی اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے گا۔ وہ جب خدا کی طرف لوٹے تو خدا بھی ان کی طرف لوٹے گا۔ کیوں کہ وہ بخشنے والا اور مہربان ہے (توبہ ۱۰۲)

اس کے بعد تیسرا گروہ وہ ہے جس نے نفس پرستی، دنیا طلبی اور گھمنڈ کو اپنا دین بنایا۔ ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں جہنم کی آگ کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے لئے نہیں جیے بلکہ اپنے لئے جیے۔ انھوں نے آخرت کی فکر نہیں کی، بلکہ دنیا کی فکر کی۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ وہ خدا کی اخروی دنیا میں عزت کا مقام حاصل کریں۔

یہ اپنی ہستی کا نذرانہ پیش کرنا ہے

بائبل میں اسرائیل کی ایک نیک بخت خاتون حنہ کا قصہ لکھا ہے۔ ایک بار وہ خدا سے دعا کر رہی تھی۔ وہ "دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ فقط اس کے ہونٹ ہلتے تھے۔ پر اس کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی"۔ اس وقت حنہ پر کچھ ایسی وارفتگی کی کیفیت طاری تھی کہ عیلی کاہن نے اس کو دیکھا تو اس کو "گمان ہوا کہ وہ نشہ میں ہے۔ عیلی نے اس سے کہا کہ تو کب تک نشہ میں رہے گی اپنا نشہ اتار"۔ مگر یہ نشہ کا معاملہ نہ تھا۔ "حنہ نے جواب دیا: نہیں اے میرے مالک، میں تو غمگین عورت ہوں میں نے نہ تو مے اور نہ کوئی نشہ پیا۔ پر میں نے خداوند کے آگے اپنا دل انڈیلا ہے (۱۔ سموئیل ب)

اللہ نے انسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ عبادت کی حقیقت عجز ہے۔ دنیا میں انسان سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ وہ اللہ کے سامنے عاجز بن کر رہے۔ اس کی کوئی حاجت ہو تو اس کے لئے وہ اللہ سے گڑگڑائے۔ کسی سے معاملہ پڑے تو اللہ کی خاطر صاحب معاملہ کے سامنے جھک جائے۔ کسی سے اختلاف ہو تو اللہ کے خوف سے اپنے کو انصاف کی رسی میں باندھ لے۔

کہنے اور کرنے کا فرق

قرآن میں شاعروں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جن کو وہ کرتے نہیں (شعراء ۲۲۶) شاعری کے طور پر بات کہنے کی یہ کمزوری کبھی خود اہل دین میں پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ دین وملت کے بارے میں تقریریں کرتے ہیں اور کتابیں چھاپتے ہیں، مگر دین ان کا حقیقی عملی فیصلہ نہیں ہوتا ——— "اے ایمان والو ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو تم کرو نہیں (صف ۳)

آدمی جب بولتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے منھ سے نکلے ہوئے الفاظ اس کی حقیقی عملی زندگی کا ایک اظہار ہوں، جس طرح بھاپ ایک گرم پانی کا اظہار ہوتی ہے یا دھواں کسی جلتی ہوئی چیز کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ ایسا آدمی جب بولتا ہے تو وہ اپنے اندرون کو انڈیل رہا ہوتا ہے، اس کے الفاظ عام معنوں میں صرف الفاظ نہیں ہوتے بلکہ یہ اس کی اپنی ہستی ہوتی ہے جو لفظوں کی صورت میں ڈھل رہی ہوتی ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ میں انتہائی واقعیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مصنوعی تصویر کی خرابیوں سے پاک ہوتی ہے۔ اس کے بیانات میں کیمرہ کے فوٹو کی طرح حقیقی عکاسی کی شان آجاتی ہے۔ دوسری طرف یہ ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ بولتا ہے وہ خود بھی ویسا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے جب کسی انسان کو اس کے ساتھ عملی تجربہ پیش آتا ہے تو وہ اس میں کوئی تضاد نہیں پاتا۔ بولنے والا اگر اسٹیج پر ملی ہمدردی کے الفاظ بول رہا تھا تو عملی تجربہ میں بھی وہ ملت کا ہمدرد ثابت ہوتا ہے۔ اگر وہ احتساب نفس پر وعظ کر رہا تھا تو موقع پڑنے پر وہ خود بھی اپنی ذات کا حساب لینے والا ثابت ہوتا ہے۔ اگر وہ عہد پیمان کی پختگی کی تلقین کر رہا تھا تو جب امتحان کا وقت آتا ہے تو وہ خود بھی عہد و پیمان کو پورا کرنے والا ثابت ہوتا ہے۔ اگر وہ انصاف اور انسانیت کا پرچار کر رہا تھا تو عملی تجربہ میں وہ ایک ایسا شخص ثابت ہوتا ہے جو خود بھی معاملہ کے وقت انصاف اور انسانیت پر قائم رہنے والا ہو۔

اس کے برعکس دوسرا آدمی وہ ہے جس کا اسلام پر بولنا شاعروں جیسا بولنا ہو۔ اس کی زبان الگ ہوتی ہے اور اس کی عملی زندگی الگ۔ اس کی باتوں میں وہ گہرائی نہیں ہوتی جو صرف ایک مطابق واقعہ کلام میں ہوا کرتی ہے۔ اس کا کلام ایک قسم کی شاعری ہوتا ہے نہ کہ حقیقت بیانی۔ لکھنے یا بولنے کے وقت تو وہ "اسلامی" نظر آتا ہے لیکن اگر کوئی نازک معاملہ پڑ جائے تو فوراً اس کی اصل ہستی ننگی ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ وہ شخص جس نے اسٹیج پر انسانیت کا وعظ کہا تھا، عملی تجربہ میں وہ انسان کی صورت میں بھیڑیا ثابت ہوتا ہے۔ وہ جس ملت کی ہمدردی کی باتیں کر رہا تھا، حقیقی معاملہ میں اسی ملت کے ایک فرد کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ خوف خدا اور فکر آخرت کی باتیں کر رہا تھا مگر عملی تجربہ کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سینہ میں ایک بالکل بے خوف دل ہے جس کو آخرت اور حساب کتاب کی مطلق کوئی فکر نہیں۔ شاعری والا اسلام موجودہ دنیا میں کسی کو کچھ فائدہ دے سکتا ہے۔ یہاں اسلامی مشاعرہ کی مجلسوں میں اس کو داد مل سکتی ہے۔ مگر ایسے اسلام کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہ ہوگی۔ خدا کو الفاظ سے نہیں حقیقت سے دلچسپی ہے۔ اس کو وہ شاعر مطلوب ہے جو آخرت کی پکڑ کے خوف سے اپنی شاعری بھول جائے۔ اس کو وہ ادیب مطلوب ہے جس کی بے نفسی اس کو اپنا قلم توڑنے پر مجبور کر دے۔ اس کو وہ زبان مطلوب ہے جو زبان رکھتے ہوئے خدا کی خاطر بے زبان ہو جائے۔

زندگی کا راز: باھمی اتفاق

"مملکت عربیہ سعودیہ" ابتداءً ۱۹۰۲ میں قائم ہوئی۔ عرب ممالک میں عام طور پر بہت جلد جلد حکومتیں بدلتی رہتی ہیں۔ مگر سعودی حکومت کسی انتشار کے بغیر قائم ہے۔ اس کی اس کامیابی کا راز اتحاد ہے۔ چند ماہ پہلے امریکہ کی سی آئی اے نے اپنی حکومت کو ایک رپورٹ دی۔ اس رپورٹ میں "انکشاف" کیا گیا تھا کہ سعودی عرب کے شاہی خاندان میں اندرونی اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے بعد ایک مغربی سفیر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ایک سعودی شہزادہ نے کہا:

If there is one thing this royal family is agreed on, it is its own survival. We do not survive by fighting each other.

اگر کوئی چیز ہے جس پر سعودی عرب کا شاہی خاندان متفق ہے تو یہ اس کا اپنے وجود کو باقی رکھنا ہے۔ اگر ہم آپس میں لڑیں تو ہم اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتے۔ (ٹائمس آف انڈیا ۳ نومبر ۱۹۷۹)

زندگی کا یہ راز جس کو عرب کے شاہی خاندان نے جان لیا اگر مسلم قومیں بھی اس کو جان لیں تو مسلم دنیا اچانک اتنی طاقت ور ہو جائے کہ وہ تمام مسئلے خود بخود حل ہو جائیں جن کے لئے قربانیوں پر قربانیاں دی جا رہی ہیں اور وہ کسی طرح حل ہونے میں نہیں آتے۔ کسی مفروضہ دشمن کو ہٹانے کے لئے تو مسلمان بار بار متحد ہو جاتے ہیں۔ مگر اسلام کے احیاء اور ملت کی تعمیر کے لئے ان میں اتحاد نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ وہ اتحاد جو مفروضہ دشمن کو ہٹانے کے لئے بہت بڑے پیمانہ پر وجود میں آ گیا تھا وہ دشمن کے ہٹتے ہی اچانک ختم ہو جاتا ہے۔ مثبت مقصد کے لئے جب اتحاد نہ ہو سکے تو منفی مقاصد کے لئے اتحاد کی کوئی قیمت نہیں۔ اس قسم کا اتحاد مرض کی علامت ہے نہ کہ صحت مند ہونے کی علامت۔ اگر اصل مقصد "اسلام" کو کرسی پر بٹھانا ہو تو کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوگا۔ "دشمن اسلام" کے ہٹتے ہی لوگ متفقہ طور پر اسلام کو کرسی پر بٹھا کر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں لگ جائیں گے۔ مگر جب ہر شخص اپنے کو کرسی پر بٹھانا چاہے تو اختلاف پیدا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ کرسی تو ایک ہی ہے۔ پھر سارے لوگ بیک وقت اس پر کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ جاہ طلبی اختلاف پیدا کرتی ہے اور اسلام طلبی اتحاد۔

کسی گروہ میں اتحاد نہ ہو تو اس کی وجہ ہمیشہ کسی نہ کسی قسم کی سطحیت ہوتی ہے۔ لوگ چھوٹے چھوٹے مفادات کو بچانے کی خاطر بڑی اجتماعیت کا جزء نہیں بنتے۔ دس چھوٹے حلقے ہوں تو دس آدمیوں کو صدارت حاصل ہوگی۔ اور اگر ان کو ملا کر ایک حلقہ بنا دیں تو صرف ایک شخص عہدہ حاصل کر سکے گا۔ اس لئے جاہ طلب لوگ اتحاد میں شامل ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اسی طرح کچھ افراد عرصہ تک ایک حلقہ سے جڑے رہیں تو بالآخر ان کے اندر عصبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنی ہر چیز کے حق میں وہ ایک قسم کا تقدس محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے حلقہ کو عظیم تر اجتماعیت میں ملانے کو ایسا ہی خیال کرنے لگتے ہیں جیسے مقدس کعبہ کو کوئی اپنے ذاتی مکان میں شامل کرنے کی کوشش کرے۔ پھر جو لوگ کسی حلقہ سے وابستہ نہ ہوں ان کی رکاوٹ کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اجتماعیت کو اپنی آزاد زندگی کے لئے بندھن محسوس کرتے ہیں —
اتحاد بہت بڑی طاقت ہے۔ مگر اتحاد ہمیشہ ذات کی نفی کی قیمت پر قائم ہوتا ہے۔ اور قربانی کی یہ قسم ہمیشہ انسان کے لئے سب سے زیادہ مشکل چیز رہی ہے۔

قل ھو اللہ شریف سے شہادت کا بیان

نماز ختم ہوئی تو مسجد میں ایک بزرگ نے کھڑے ہو کر اعلان کیا: "تھوڑی دیر کے لئے سبھی لوگ ٹھہر جائیں۔ میں آپ کو قل ھو اللہ شریف سے شہادت کا بیان سناؤں گا" لوگوں کو یہ بات انوکھی معلوم ہوئی اور نمازیوں کی بڑی تعداد اس انوکھی تقریر کو سننے کے لئے ٹھہر گئی۔ بزرگ موصوف نے تقریر شروع کی۔ مگر اس میں زیادہ تر اپنے مدرسہ کا تعارف اور اس کے لئے چندہ کی اپیل تھی۔ ایک شخص سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ درمیان تقریر میں بولا: حضرت آپ نے تو کہا تھا کہ قل ھو اللہ شریف سے شہادت کا بیان سنائیں گے۔ مگر وہ آپ نے نہیں سنایا۔ بزرگ موصوف بولے ——

"ارے بھائی! امام حسین جو کربلا میں شہید ہوئے، قل ھو اللہ شریف انھیں کے نانا جان پر تو اتری تھی۔"

بظاہر یہ ایک شخص کی نادانی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اسی نادانی میں آج ہماری تمام قیادت مبتلا ہے۔ ہر قائد کے پاس ایک انوکھا نسخہ ہے اور اس کو وہ ملت کے تمام مسائل کا حل بتا کر بہت سے مسلمانوں کو جمع کر لیتا ہے۔ اس کے انوکھے نسخہ سے متاثر ہو کر بہت سے لوگ اس کو چندہ دیتے ہیں۔ بہت سے اس کے جلسہ گاہ میں شریک ہو کر اس کی شان قیادت کو بڑھاتے ہیں۔ مگر سب کچھ کر لینے کے بعد جب کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو لوگ پوچھتے ہیں: حضرت! جو امید دلا کر آپ نے ہم کو دوڑایا تھا وہ تو پوری نہیں ہوئی۔ اب قائد سامنے آتا ہے اور نہایت اطمینان کے ساتھ ایک ایسے نتیجہ کی خبر دیتا ہے جس کا عوام نے کبھی تجربہ نہیں کیا۔ شہادت کا بیان قل ھو اللہ شریف سے برآمد ہو جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سمجھنے والے اب بھی اس کو سمجھنے سے عاجز رہے ہوں۔

جب شور و غل کو کام سمجھ لیا جائے

عرب کے مشرکین معروف معنوں میں لا مذہبی لوگ نہیں تھے بلکہ مذہب کو ماننے والے لوگ تھے۔ حتیٰ کہ وہ نماز بھی پڑھتے تھے۔ البتہ ان کی نماز یہ تھی کہ خدا کے گھر میں جمع ہو کر تالیاں بجاتے اور سیٹی کی آوازیں نکالتے (ما كان صلاتهم عند البيت الا مكاء وتصدية انفال ۳۵) مشرکین کی یہ سنت اب بھی مشرکانہ عبادت گھروں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ تاہم شور و غل کو عبادت سمجھنے میں نام نہاد غیر مشرکین بھی ان سے زیادہ پیچھے نہیں ہیں۔ مزاروں پر قوالیاں، شب برات کے تماشے، میلاد کے ہنگامے، تقریبات میں لاؤڈ اسپیکر پر "اسلامی گانوں" کی ریکارڈنگ، سب اسی کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔ پھر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس بدعت کے اثرات بہت دور تک ہماری زندگی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مسائل ملت کے نام پر آئے دن کانفرنسوں اور کنونشنوں کی دھوم، دینی سیاست کے نام پر توڑ پھوڑ اور ایجی ٹیشن، اسلامی حکومت کے قیام کے نام پر کوڑوں اور گولیوں کی جھنکار، سب اسی کی مختلف صورتیں ہیں۔ لوگ شور و غل کو دین سمجھے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ خدا کی دنیا خاموش سرگرمیوں کی دنیا ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اپنی آواز کو پست رکھو کیوں کہ آوازوں میں سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے (لقمان ۱۹) گدھا اللہ کی طرف سے ناپسندیدہ آواز کا ایک نمونہ ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں تمام لکھنے اور بولنے والے لوگ اس طرح چیخ و پکار میں مشغول ہیں جیسے ان کو تمام آوازوں میں یہی آواز سب سے زیادہ پسند آگئی ہو۔

صلاحیتیں اسلام کے کام نہ آسکیں

پروفیسر رشید احمد صدیقی (۱۸۹۶ــ۱۹۷۷) مولانا اقبال احمد سہیل (۱۸۸۷ــ۱۹۵۵) کے ساتھیوں میں سے تھے۔ مولانا سہیل کی علی گڑھ کی تعلیمی زندگی کے زمانہ کا ایک واقعہ وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

۱۹۱۸ یا ۱۹۱۹ کا واقعہ ہے۔ یونین میں "ام الالسنہ عربی" پر پروفیسر خواجہ کمال الدین مرحوم کی اردو میں تقریر تھی۔ مرحوم نے بڑی قابلیت اور اعتماد کے ساتھ تقریر شروع کی۔ مولانا سہیل کی آنکھوں میں تکلیف تھی۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ مولانا کو احباب اسپتال لائے تھے۔ یونین میں مجمع دیکھا تو کہا: مولانا تکلیف نہ ہو تو ذرا تقریر سنتے چلیں۔ مولانا نے کہا اچھی بات ہے، لیکن آنکھوں میں تکلیف زیادہ ہے، جلد اٹھ آئیں گے۔ سب لوگ یونین میں آئے۔ مولانا سر سے پاؤں تک بڑے وزنی لبادہ میں ملفوف تھے۔ سر پر اونی کنٹوپ تھا۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس پر ایک ہرے رنگ کا چھجا (شیڈ) لگا ہوا تھا۔ خواجہ صاحب نے کم و بیش دو گھنٹے تک تقریر کی۔ حاضرین محو حیرت تھے۔ تقریر ختم ہوئی تو پریسیڈنٹ نے اعلان کیا کہ مولانا سہیل فاضل مقرر کا طلبائے کالج کی طرف سے شکریہ ادا کریں گے۔ مولانا کے خلاف سازش کامیاب ہوئی۔ دوستوں اور ساتھیوں نے مولانا کو ہاتھوں ہاتھ ڈائس پر پہنچا دیا۔ مولانا کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میز کے پاس کھڑے کیے گئے۔ تھوڑی سی ناک، اس سے ذرا اٹری تھوڑی اور ہاتھ کی صرف انگلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ مولانا نے بےتکلف تقریر شروع کر دی۔ اس اعتماد سے گویا تمام عمر اسی مبحث پر تیاری کی تھی۔ جو لوگ یونین کے مجمع سے واقف ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ اچھے مقرر کے بعد کسی اور کی تقریر سننے کے لئے کوئی نہیں ٹھہرتا اور صدر کا شکریہ بھی اسی بدنظمی کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ مولانا سہیل نے بھی "ام الالسنہ عربی" پر تقریر شروع کی۔ پون گھنٹہ تک تقریر کی۔ نئے نئے پہلوؤں سے موضوع پر روشنی ڈالی۔ نئی نئی مثالیں پیش کیں۔ تقریر کو اس درجہ دل نشین اور کہیں کہیں اتنا شگفتہ بنا دیا کہ خواجہ کمال الدین نے بے اختیار ہو کر مولانا کو گلے سے لگا لیا اور فرمایا: "تمہارے ایسا جامع کمالات ساتھ کام کرنے والا مل جائے تو میں اسلام کا جھنڈا یورپ کی سب سے بلند چوٹی پر نصب کر دوں" (مضامین رشید، صفحہ ۴۳)

مولانا اقبال احمد سہیل ایم اے، ایل ایل بی غیر معمولی ذہین آدمی تھے۔ اردو کے علاوہ ان کو عربی، انگریزی اور فارسی پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ ان کے دو شعر یہ ہیں:

اگر کچھ مرتبہ چاہے تو اس ہستی کو باطل کر　　　　که دانہ بارور ہوتا ہے پہلے خاک میں مل کر
اے کاروانِ ملت اٹھ تو بھی گام زن ہو　　　　ہر سمت سے صدائیں آتی ہیں طرِّ قو کی

اسلامی دعوت کا کام وہ انتہائی اعلیٰ معیار کے ساتھ کر سکتے تھے۔ مگر ان کی تمام صلاحیتیں شاعری اور وکالت کی نذر ہو کر رہ گئیں۔ موجودہ زمانہ میں اس طرح کے کتنے لوگ ہیں جو فطرت سے اعلیٰ درجہ کی صلاحیت لے کر پیدا ہوئے۔ مگر ان کی اعلیٰ صلاحیتیں اسلام کے کام نہ آسکیں۔ وہ سطحی چیزوں کے پیچھے لگے رہے یہاں تک کہ اس دنیا سے چلے گئے۔

پہلے شعور پیدا کیجئے

مسجد کا موذن فجر سے کچھ پہلے اٹھا۔ وہ کسی ضرورت سے مسجد کے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ ایک شخص اپنی دکان کھول رہا ہے۔ چوں کہ ابھی فضا میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور اتنے سویرے دکان کھولنا ایک غیر معمولی بات تھی، وہ ٹھہر کر دیکھنے لگا۔ "یہ آدمی اندھیرے میں دکان کے اندر داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے کیا کام کرے گا" اچانک یہ یہ سوال اس کے ذہن میں آیا۔ ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس کے دل نے کہا کہ یہ شخص سب سے پہلے دکان کی لائٹ جلائے گا۔ کیوں کہ جب تک دکان کے اندر اندھیرا ہے وہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔" اب وہ اپنے اندازہ کی تصدیق یا تردید جاننے کے لئے وہاں ٹھہر کر دکان دار کو دیکھنے لگا۔ مؤذن کا اندازہ صحیح نکلا۔ دکان کا دروازہ کھولتے ہی دکان دار کا ہاتھ سب سے پہلے بجلی کے بٹن پر پہنچا۔ معاً بعد دکان کے اندر روشنی ہوگئی۔ اب دکان دار اس کے اندر داخل ہو کر اپنا کام کرنے لگا۔

اسی مثال سے ہم دین و ملت کے معاملہ کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ دینی یا ملّی کام کرنے کے لئے بھی سب سے پہلے "روشنی" جلانے کی ضرورت ہے یعنی شعور کی بیداری۔ اندھیرے مکان یا دکان کو اجالے میں لانے کے لئے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح ملت کے اندر کوئی حقیقی اور مفید کام وجود میں لانے کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ملت کے افراد کو ذہنی حیثیت سے باشعور بنایا جائے۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو بیدار کیا جائے۔ افراد کے اندر شعور کی روشنی جلائے بغیر کوئی حقیقی کام نہیں کیا جا سکتا۔

آغاز سے پہلے اختتام کا اندازہ کر لیجئے

حاجیوں کا ایک قافلہ غار حرا کو دیکھنے کے لئے روانہ ہوا۔ غار حرا جس پہاڑ کے اوپر واقع ہے وہاں تک سڑک جاتی ہے۔ آدمی پہاڑ تک سواری سے جاتا ہے اور پھر وہاں سے پیدل پہاڑ پر چڑھتا ہے۔ قافلہ کے لوگ جب پہاڑ پر چڑھنے لگے تو کچھ لوگوں نے احترام و تقدس کے جذبہ کے تحت سڑک کے پاس اپنے چپل اتار دئے۔ جاتے وقت صبح کا وقت تھا اس لئے ننگے پاؤں اوپر جانے میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔ مگر جب وہ لوگ واپس لوٹے تو دوپہر ہو چکی تھی۔ پہاڑی کے سرخ پتھر تپنے لگے تھے۔ بغیر چپل والے لوگ سخت تکلیف کے ساتھ اس حال میں اترے کہ ان کے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ اس کی وجہ سے وہ کئی دن تک پریشان رہے۔

سفر خواہ پہاڑ کا ہو یا زندگی کا، ہر ایک کی کامیابی کا ایک ہی اصول ہے۔ اور وہ یہ کہ سفر کے آغاز میں سفر کے اختتام کا پورا اندازہ کر لیا جائے۔ جو شخص سفر کے شروع میں سفر کے آخری حالات کا اندازہ نہ کر سکے اس کے حصہ میں اکثر ایسی مشکلات آتی ہیں جو اس کے سفر کے مقصد کو بے معنی بنا دیتی ہیں۔ خدا کا یہ قانون اتنا بے لاگ ہے کہ ایک مخلص آدمی بھی اس قسم کی غلطی کرنے کے بعد اس کے انجام سے بچ نہیں سکتا۔ اگر وہ اچھی نیت سے ایک ایسا اقدام کر بیٹھے جس کے عواقب پر اس نے غور نہ کیا ہو۔ تو اس دنیا میں اس کے برے نتائج سے وہ بھی اسی طرح دوچار ہوگا جس طرح ایک بدنیت شخص اس قسم کی غلطی کر کے دوچار ہوتا ہے۔ کسی کا اخلاص اس کی غلطی کے خلاف اس کا محافظ نہیں بن سکتا۔

اس کو اسکول سے خارج کردیا گیا تھا

پروفیسر البرٹ آئن سٹائن (۱۹۵۵–۱۸۷۹) نے ۲۰ویں صدی کی سائنس میں عظیم انقلاب برپا کیا۔ مگر اس کی زندگی کا آغاز نہایت معمولی تھا۔ تین سال کی عمر تک وہ بولنا شروع نہ کرسکا۔ بظاہر وہ ایک معمولی باپ کا معمولی بچہ تھا۔ نو سال کی عمر تک وہ بالکل عام بچہ دکھائی دیتا تھا۔ اسکول کی تعلیم کے زمانہ میں ایک بار وہ اسکول سے خارج کردیا گیا۔ کیوں کہ اس کے استادوں کا خیال تھا کہ اپنی تعلیمی نا اہلی کی وجہ سے وہ دوسرے طالب علموں پر برا اثر ڈالتا ہے۔ زیورک کے پالی ٹکنیک میں اس کو پہلی بار داخلہ نہ مل سکا کیوں کہ آزمائشی امتحان میں اس کے نمبر بہت کم تھے۔ چنانچہ اس نے مزید تیاری کرکے اگلے سال داخلہ لیا۔ اس کے ایک استاد نے اس کے بارے میں کہا:

Albert was a lazy dog.

البرٹ ایک سست کتا تھا۔ ۳۰ سال کی عمر تک البرٹ آئن سٹائن میں کوئی غیر معمولی آثار نظر نہ آتے تھے۔ مگر اس کے بعد اس نے محنت شروع کی تو وہ اس بلندی تک پہنچا جو موجودہ زمانہ میں بمشکل کسی دوسرے سائنس داں کو حاصل ہوئی۔ اسی بنا پر اس کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے:

We could take heart that it is not necessary
to be a good student to become Einstein.

ہم کو جاننا چاہئے کہ آئن سٹائن بننے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی طالب علمی کے زمانہ میں ممتاز رہا ہو۔ آئن سٹائن نے اپنی پہلی سائنسی کتاب اس وقت شائع کی جب کہ اس کی عمر ۲۶ سال تھی۔ اس کے بعد سے اس کی شہرت بڑھتی ہی چلی گئی۔ آئن سٹائن کی زندگی بالکل سادہ تھی۔ وہ نہایت سادہ غذا کھاتا تھا۔ وہ اکثر آدھی رات تک اپنے کام میں مشغول رہتا تھا۔ اس کو اسرائیل کی صدارت پیش کی گئی تھی مگر اس نے انکار کردیا۔ اس کا کہنا تھا کہ سیاست انسانیت کا کینسر ہے۔ ۱۹۳۳ میں اس نے ہٹلر کے جرمنی کو چھوڑ دیا تھا۔ ہٹلر کی حکومت نے اعلان کیا کہ جو شخص آئن سٹائن کا سر کاٹ کر لائے گا اس کو ۲۰ ہزار مارک انعام دیا جائے گا۔ اس زمانہ میں یہ رقم بہت زیادہ تھی۔ مگر آئن سٹائن کی عظمت لوگوں کے دلوں پر اتنی قائم ہوچکی تھی کہ کوئی اس انعام کو حاصل کرنے کی جرأت نہ کرسکا (۷ اکتوبر ۱۹۷۹)

تاریخ میں اس طرح کی بہت مثالیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ بڑا انسان بننے کے لئے بڑا بچہ پیدا ہونا ضروری نہیں۔ معمولی حیثیت سے آغاز کرکے آدمی بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کرسکتا ہے، بشرطیکہ وہ جدوجہد کی شرطوں کو پورا کرے۔ بلکہ وہ لوگ زیادہ خوش قسمت ہیں جن کو مشکل مواقع میں زندگی کا ثبوت دینا پڑے۔ کیونکہ مشکل حالات عمل کا محرک ہوتے ہیں۔ وہ آدمی کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کرتے ہیں۔ نیز زندگی کے بہترین سبق ہمیشہ مشکل حالات میں ملتے ہیں۔ اعلیٰ انسان راحتوں میں نہیں بلکہ مشکلوں میں تیار ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی اس دنیا میں امکانات کی کوئی حد نہیں۔ یہاں کسی کو اپنے عمل کے لئے معمولی آغاز ملے تو اس کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ معمولی حالات زندگی کا سب سے مضبوط زینہ ہیں۔ تاریخ کی اکثر اعلیٰ ترین کامیابیاں معمولی حالات کے اندر ہی سے برآمد ہوئی ہیں۔

کیا اس کا کوئی بنانے والا نہیں

آئزک نیوٹن (۱۶۴۲ـ۱۷۲۷) نے شمسی نظام کی حرکت کے اصول معلوم کئے۔ اس نے شمسی نظام (سورج اور اس کے تابع سیاروں) کا ایک ماڈل بنوایا جو اس کی میز پر رکھا ہوا تھا، کہا جاتا ہے کہ ایک روز نیوٹن کا ایک دوست اس کے کمرہ میں آیا جو خدا کے وجود کو نہیں مانتا تھا۔ میز پر رکھے ہوئے ماڈل کو دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ یہ نیوٹن کے نظریہ کے مطابق نظام شمسی کا ماڈل ہے۔ تاہم اس کے بنانے والے کا نام اس پر لکھا ہوا نہیں تھا۔ اس نے نیوٹن سے پوچھا: "یہ ماڈل کس نے بنایا ہے" نیوٹن کو یاد آگیا کہ اس کا دوست یہ کہتا ہے کہ یہ دنیا خود سے بن گئی ہے، اس کا کوئی بنانے والا نہیں ہے۔ نیوٹن نے اپنے دوست کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا: "یہ ماڈل خود بخود بن گیا ہے، اس کو کسی نے بنایا نہیں ہے" دوست بولا "مذاق مت کرو، یہ بتاؤ کہ اتنا اچھا ماڈل کس نے بنایا ہے"، نیوٹن نے دوبارہ کہا: "اس کا بنانے والا کوئی نہیں، وہ اپنے آپ بن گیا ہے" دوست نے گھبرا کر کہا: "مذاق چھوڑو، میری بات کا جواب دو کہ اس کو کس کاریگر نے بنایا ہے" آخر نیوٹن نے کہا: "تمھارے اوپر حیرت ہے۔ تم اس بات کو تو بغیر کسی بحث کے مان رہے ہو کہ شمسی نظام کا یہ معمولی سا ماڈل کسی بنانے والے کے بغیر نہیں بنا ہے۔ ضرور اس کا کوئی بنانے والا ہے۔ مگر اس معمولی ماڈل کی عظیم اصل (شمسی نظام) کے متعلق تم نے یقین کر لیا ہے کہ وہ اپنے آپ بن گیا ہے۔ اس کا کوئی بنانے والا نہیں"

تلاش کا صحیح جواب نہ پانے کی وجہ سے

ڈاکٹر جے۔ وی۔ نارلیکر (پیدائش ۱۹۳۹) سے ایک انٹرویو میں کہا گیا کہ "مذہبی توہمات" کی پرستش میں سائنس داں دوسرے لوگوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ کتنے سائنس داں دیوتاؤں تک میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس کے جواب میں عالمی شہرت کے سائنس داں ڈاکٹر نارلیکر نے جواب دیا: (ٹائمس آف انڈیا ۳۰ اپریل ۱۹۷۹)

مجھے یہ بات بے حد ناپسند ہے۔ عملاً میں دیکھتا ہوں کہ بہت سے سائنس داں، جب اپنی تجربہ گاہ میں کام کر رہے ہوتے ہیں تو وہ سائنٹفک نقطۂ نظر کو اپناتے ہیں۔ مگر جب وہ اپنے گھر جاتے ہیں تو وہ سائنٹفک طریقہ کا بالکل استعمال نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر، مغرب کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں میں جیوتش پر عقیدہ پھیل رہا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ انسان کی اس خواہش نے اس کو جنم دیا ہے کہ وہ آسان اور فوری تسکین کو پالے۔ یہ حقیقۃً ایک ذہنی سہارا ہے "

کوئی شخص خواہ جاہل ہو یا عالم، کامیاب ہو یا ناکام، زندگی میں اس کو بار بار ایسے مرحلے پیش آتے ہیں جہاں وہ اپنے عجز کا تجربہ کرتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بے بس وجود ہے۔ یہ چیز اس کو اپنے سے برتر ہستی کی تلاش کی طرف لے جاتی ہے جو اس کی کمیوں کا بدل بن سکے۔ مغرب کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ، جن کے لئے مادی مواقع کے تمام دروازے کھلے ہوتے ہیں، وہ جب اپنی "ذہنی تسکین" کے لئے مابعد الطبیعیاتی عقائد کا سہارا لیتے ہیں تو باعتبار حقیقت یہ فرضی نہیں ہوتا۔ یہ دراصل اپنی فطرت کی خاموش پکار کا جواب ہوتا ہے۔ اگرچہ اپنی تلاش کا صحیح جواب نہ پانے کی وجہ سے وہ "جیوتش" جیسی توہماتی چیزوں میں اٹک جاتے ہیں ——— خدا کا وجود نہ صرف یقینی ہے بلکہ وہ انسان کے لئے اتنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر وہ ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتا۔

مجھ پر دولت کی بجلی گری ہے

معمولی حیثیت کا ایک آدمی ترقی کرکے دولت مند بن گیا۔ جب وہ معمولی حیثیت کا تھا تو وہ زیادہ خوش رہتا تھا۔ دولت آنے کے بعد وہ پریشان رہنے لگا۔ اس کے ایک پرانے دوست نے پوچھا، یہ تمھارا کیا حال ہوگیا ہے۔ پہلے تم ہنستے بولتے تھے۔ ہم لوگوں کے ساتھ کافی وقت گزارتے تھے۔ اب تم اداس نظر آنے لگے ہو۔ اس نے جواب دیا "میرے اوپر دولت کی بجلی گری ہے" دولت نے مجھ کو نئے نئے مسائل میں الجھا دیا ہے۔ پہلے ہمارے بچے ہمارے پاس تھے، ہم ان کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آج ہر بچہ ہم سے دور ہے۔ کوئی یورپ امریکہ پڑھنے گیا ہوا ہے۔ کوئی دور کے کسی مقام پر ملازم ہے۔ جن بچوں کو پہلے ہم میاں بیوی دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آج ہم ان کے سایہ کے لئے بھی ترستے ہیں۔ بھیڑوں کا فارم ہے تو خیال لگا ہوا ہے کہ اتنی قیمتی بھیڑیں ہیں، پتہ نہیں ان کا کیا ہوا۔ ٹرک چل رہے ہیں تو اس کی فکر ہے کہ کہیں ایکسیڈنٹ نہ ہوگیا ہو۔ دکانیں ہیں تو ان کی پریشانی کہ ملازم کہیں گڑبڑ نہ کر رہے ہوں۔ غرض جتنی زیادہ دولت ہے اتنی ہی زیادہ فکر ہے۔ سیل ٹیکس، انکم ٹیکس اور طرح طرح کے قانونی جھگڑے اس کے علاوہ ہیں۔ غرض زندگی لطف سے خالی ہو کر بس مسائل اور پیچیدگیوں کا مجموعہ بن گئی ہے۔ جو دولت آدمی کو سکون نہ دے بلکہ بے چین کر دے اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ ——— وہ ایک بجلی ہے جو آدمی کے اوپر گر پڑی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خوشی کا کوئی تعلق دولت یا دنیوی اعزازات سے نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سب کچھ پا کر بھی خوشی سے محروم رہتا ہے۔ ایک امریکی مصنفہ کٹی کیلی نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس کا نام ہے : آہ جیکی۔ یہ جیکولین کینیڈی کے نجی حالات کے بارے میں ہے جو کہ کسی وقت امریکہ کی خاتون اول تھی۔ جیکولین قدرت سے ایک پُرکشش نسوانی شخصیت لے کر پیدا ہوئی۔ اس کی شادی جان کینیڈی سے ہوئی جو بعد کو امریکہ کے صدر منتخب ہوئے۔ ۲۳ نومبر ۱۹۶۳ کو جب صدر کینیڈی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تو اس وقت جیکولین کینیڈی دنیا کی سب سے زیادہ مشہور اور معزز خاتون بن چکی تھیں۔ اس کے بعد انھوں نے یونانی ارب پتی اوناسس سے شادی کی۔ یہ شادی میاں بیوی دونوں کے لئے خوش گوار ثابت نہ ہو سکی یہاں تک کہ ۱۹۶۸ میں اناسس کا انتقال اس وقت ہوگیا جب کہ جیکولین اس کے پاس موجود بھی نہ تھی۔

جیکولین کو ہر چیز ملی مگر اس کو خوشی نہ مل سکی۔ مصنفہ کے الفاظ میں، جیکولین نے خوشی حاصل کرنے کی بابت اپنی ناقابل علاج خواہش کو خرید کر حاصل کرنا چاہا خواہ اس کی قیمت تین ہزار ڈالر فی گھنٹہ دینی پڑے۔ اس کے باوجود وہ خوشی حاصل نہ کر سکی :

---AN INCURABLE DESIRE TO BUY HAPPINESS, EVEN IF IT MEANT SPENDING AS MUCH IN ONE HOUR AS 3000 DOLLARS.
Jackie Oh: An Intimate Biography,
By Kitty Kelley, Vikas, New Delhi, 1979, pp. 336

کچھ الفاظ بول دینے کا نام دلیل نہیں

حق کی دعوت آدمی کے سامنے آتی ہے۔ وہ اس کے خلاف ایک بات کہتا ہے۔ بظاہر وہ ایک دلیل دے رہا ہوتا ہے۔ مگر حقیقۃً وہ کج بحثی ہوتی ہے۔ اسی کی طرف قرآن میں ان لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے:

مَا ضَرَبُوْہُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ○ یہ بات جو انھوں نے کہی، یہ تم سے جھگڑنے کے لئے کہی ہے۔ یہ صرف جھگڑالو لوگ ہیں۔ زخرف ۵۸

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخاطبین کو یہ آیت سنائی: اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (تم اور جو کچھ تم پوجتے ہو سب جہنم کے ایندھن ہوں گے) عبد اللہ بن زبعری نے یہ سن کر کہا: جس طرح ہم بتوں کو پوجتے ہیں، اسی طرح نصاریٰ عیسیٰ بن مریم کو پوجتے ہیں اور تم خود اپنے عقیدہ کے مطابق ان کو رسول مانتے ہو۔ پھر ہمیں اس میں کوئی اعتراض نہیں اگر ہمارے بتوں کا وہی انجام ہو جو تمھارے عقیدہ کے مطابق عیسیٰ کا ہوگا"۔ اس کے بعد حاضرین نے اس ذہانت کی داد اس طرح دی کہ سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا: لیس احدٌ یُعبَد من دون اللہ فیہ خیر (اللہ کے سوا جس کو معبود بنایا جائے اس میں کوئی خیر نہیں) مخالفین نے کہا: کیا مسیح میں بھی کوئی خیر اور بھلائی نہیں۔ کیوں کہ ان کو بھی بنانے والوں نے خدا کے سوا معبود بنا لیا ہے"۔ اس قسم کی باتوں کو قرآن میں اللغو فی الکلام (حٰم سجدہ ۲۶) کہا گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ سیدھی بات سے ٹیڑھا مفہوم نکالا جائے۔ والغوا فیہ کی تفسیر میں ضحاک نے عبد اللہ بن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس کے کلام میں عیب نکالو (عیبوہ، تفسیر ابن کثیر)

حقیقت یہ ہے کہ تنقید کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ مسئلہ کا علمی تجزیہ کیا جائے۔ آسمانی علم یا مسلمہ حقائق کی روشنی میں ان کا غلط ہونا واضح کیا جائے۔ یہ صحیح تنقید ہے اور اس کی اجازت ہر ایک کو حاصل ہے۔ دوسرے یہ کہ مسئلہ کا عقلی یا نقلی تجزیہ کرنے کے بجائے اس میں عیب لگائے جائیں۔ یہ دوسرا طریقہ نہ صرف غلط ہے بلکہ گناہ بھی ہے۔ مثلاً ایک شخص اگر یہ کہتا ہے کہ اسلام میں صرف دفاعی جنگ ہے۔ اسلام کا مثبت اور مستقل کام دعوت ہے نہ کہ جدال وقتال۔ البتہ اگر مخالف طاقتیں حملہ آور ہوں تو مخصوص شرائط کے تحت اس کا دفاع میدان جنگ میں کیا جائے گا۔ کسی کو اس نقطۂ نظر سے اختلاف ہو تو دلائل کی زبان میں وہ اس کو رد کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اختلاف کرنے والا یہ کرے کہ جو شخص اس نقطۂ نظر کو پیش کر رہا ہے اس کو "قادیانی" یا "صہیونی ایجنٹ" کہنے لگے تو یہ کلام میں عیب لگانے کی مثال ہوگی جو نہ صرف علمی اعتبار سے بے معنی ہے بلکہ اللہ کے نزدیک سخت گناہ ہے۔ قرآن اور حدیث کی مذکورہ بالا مثال سے واضح ہوتا ہے کہ کوئی کلام خواہ کتنا ہی حق ہو، ایک آدمی جو بات کو سمجھنا نہ چاہتا ہو، وہ کوئی نہ کوئی ایسا شوشہ ڈھونڈے گا جس کی بنیاد پر وہ اس کلام کو بے اعتبار ظاہر کر سکے۔ کلام میں ایسا کوئی "نکتہ" پا کر آدمی کو کبھی اس غلط فہمی میں نہ پڑنا چاہئے کہ وہ اپنے حق میں کوئی مضبوط دلیل پا گیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ جس چیز کو وہ دلیل سمجھ رہا ہے وہ محض ایک جدال ہو جس کی کوئی قیمت نہ علم کی نظر میں ہو اور نہ اللہ کی نظر میں۔

یہ خوش خیال مفکرین

ڈاکٹر محمد اقبال (۱۹۳۸ — ۱۸۷۷) ایک آفاقی شاعر تھے۔ نہ صرف چین و عرب بلکہ سارا جہان ان کا وطن تھا۔ ان کا سبق تھا: زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز (زمانہ اگر تم سے موافقت نہ کرے تو اس سے لڑ کر زمانہ کو اپنے موافق بناؤ) انھوں نے مسلمانوں کو اس قسم کے نغمے دیے:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے — مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

مگر یہی اقبال تھے جنھوں نے ۱۹۳۱ میں ملک کی تقسیم کا نظریہ پیش کیا۔ شاعری کی دنیا میں اقبال سارے آفاق کو اپنے اندر گم کئے ہوئے تھے۔ مگر عمل کی دنیا میں وہ پوری زمین تو درکنار ایک ملک کو بھی اپنے اندر گم کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے۔ وہ ملک کے کنارے ایک ایسا چھوٹا ٹکڑا حاصل کرنے پر قانع ہو گئے جہاں مسلمان پہلے سے اپنی عددی اکثریت کی بنا پر غالب ہوں۔ وہ شخص جو شاعری کی سطح پر "یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ" کا ترانہ گا رہا تھا وہ عمل کی سطح پر ملک کے اکثریتی فرقہ کو بھی اپنے اندر ضم کرنے کا منصوبہ نہ بنا سکا۔ اس سے نجات کی صورت اس کی سمجھ میں صرف یہ آئی کہ بٹوارہ کر کے اپنے لئے علیحدگی کا ایک گوشہ تلاش کر لے ——— یہی موجودہ زمانہ کے اکثر مسلمان مفکرین اور مصلحین کا حال نظر آتا ہے۔ تقریر اور تحریر میں ان کی منزل چرخ نیلی فام سے بھی پرے ہوتی ہے۔ الفاظ کی دنیا میں آسمان کے ستارے بھی ان کی گرد راہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ مگر عمل کی سطح پر آتے ہی ان کا حال ایسا ہو جاتا ہے جیسے ایک پھولا ہوا غبارہ تھا جو واقعات کی چٹان سے ٹکرا کر ختم ہو گیا۔

مولانا محمد علی جوہر (۱۹۳۱ — ۱۸۷۸) عالمی اسلامی خلافت کے لئے اٹھے۔ ان کی شاندار اسلامی تقریروں سے ایک پورا براعظم گونج اٹھا۔ شعر کی فضاؤں میں وہ "یہ بندہ دو عالم سے خفا تیرے لئے ہے" کی سطح پر پرواز کر رہے تھے۔ مگر ترکی کے مصطفیٰ کمال پاشا نے ۱۹۲۱ میں خلافت کا ادارہ ختم کر دیا تو ان کی قیادت بے زمین ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد ان کے لئے کرنے کا کام اس کے سوا کچھ اور نہ رہا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے مسلمان بھائیوں کو ایک مشترک وطن کی آزادی پر قربان کر دیں۔ جو شخص عالمی اسلامی خلافت پر جان دینے کے لئے اٹھا تھا اس نے ایک ایسی وطنی آزادی پر جان دینا پسند کر لیا جو عملاً مسلم اقلیت کے اوپر غیر مسلم اکثریت کے غلبہ کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ اسلامی خلافت کا مینار گاندھیائی خلافت کی بنیاد کی ایک اینٹ بن کر رہ گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸ — ۱۸۸۸) نے اپنی زندگی کا آغاز الہلال اور البلاغ کی پرشور تحریروں اور مسلم اجتماعات میں اپنی عالی شان تقریروں سے کیا۔ اس وقت وہ قرآن سے کم کسی چیز پر راضی ہونے والے دکھائی نہ دیتے تھے۔ انھوں نے "پیغمبرانہ زبان" میں مسلمانوں کو یہ سبق دیا کہ وہ خدا کی کتاب لے کر اٹھیں اور خیر الامم کا تاج اپنے سر پر رکھ کر سارے عالم کے لئے آفتاب و ماہتاب بن جائیں۔ مگر قرآنی انقلاب کا پیغام دینے والا بالآخر ہندستانی قومیت کا پیغام دینے والا بن گیا۔ وہ شخص جس نے "حزب اللہ" کے قیام کو اپنا مقصد بنایا تھا وہ حزب الوطن کی سطح پر آکر ٹھہر گیا۔ ۱۹۴۷ میں ان کی دعوت پر سارے ملک کے مسلمان لکھنؤ کنونشن میں جمع ہو گئے۔ مگر اس نازک تاریخی موڑ پر مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس ہندستانی مسلمانوں کے لئے جو پیغام تھا وہ صرف یہ کہ ——— سارے مسلمان انڈین نیشنل کانگرس میں شامل ہو جائیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹ - ۱۹۰۳) کی مثال اور بھی زیادہ عبرت ناک ہے۔ انھوں نے اپنی تحریک کی بنیاد حاکمیت خدا پر رکھی۔ انھوں نے کہا کہ زمین پر صرف خدا کے قانون کی حکمرانی قائم ہونی چاہیے۔ اس کے سوا جتنے قانون انسان نے بنائے ہیں وہ سب باطل ہیں۔ مسلمان کے لئے ایسی زندگی حرام ہے جب کہ وہ غیر خدائی قانون پر راضی ہو جائے۔ اس کو یا تو خدا کے قانون کو نافذ کرنا ہے یا اس کے نفاذ کے لئے لڑتے ہوئے مرجانا ہے: "ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون - - - ھم الظالمون - - - ھم الفاسقون" (جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں، وہی ظالم ہیں، وہی فاسق ہیں) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا کہنا تھا کہ غیر خدائی قانون کو بنانے والا قانون ساز، اس کے تحت فیصلہ کرنے والا جج، اس کو نافذ کرنے والی حکومت، سب کے سب فعل حرام کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک شخص مسلّمہ طور پر مجرم ہو اور اس کو انسانی قانون کے تحت سزا دی جائے تب بھی وہ جرم کی سزا نہیں ہوتی بلکہ خود ایک جرم ہوتا ہے۔ کیوں کہ خدا کی زمین پر کسی کو یہ طے کرنے کا حق نہیں کہ کسی جرم پر کسی کو کیا سزا دی جائے نہ کسی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ بطور خود کسی سزا کو نافذ کرے۔ گویا کہ وہ شخص جو انسانی قانون کے تحت ایک قاتل کو قتل کرتا ہے وہ خود بھی ایک قاتل ہے۔ کیوں کہ اس نے خدا کی زمین پر خدا کی اجازت کے بغیر خدا کی پیدا کی ہوئی ایک جان کو ہلاک کیا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ساری عمر قانون اسلامی کے نفاذ کا مطالبہ کرتے رہے۔ عمر کے آخری حصہ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ کو پاکستان میں فوجی انقلاب آیا اور جنرل محمد ضیاء الحق کی سربراہی میں ایسی حکومت قائم ہوگئی جس کو نہ صرف مولانا مودودی کی مکمل تائید حاصل تھی بلکہ ان کی اپنی جماعت کے کئی افراد اس میں ذمہ دارانہ مناصب پر فائز تھے۔ اس حکومت کے تحت مسٹر ذوالفقار علی بھٹو پر مقدمہ چلایا گیا جو خود مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے مطالبہ "پہلے احتساب پھر انتخاب" کے مطابق تھا۔ ان کے لئے پورا موقع تھا کہ وہ پاکستان کے سابق وزیر اعظم کو شرعی قانون کی عدالت میں کھڑا کریں اور اسلامی احکام کے مطابق ان پر باقاعدہ مقدمہ چلائیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو وہ ساری دنیا کے سامنے اسلام کی وہ "عملی شہادت" پیش کر دیتے جس کے وہ زندگی بھر مبلغ رہے تھے اور جس کے بغیر ان کے نزدیک دعوت اسلامی کا کام مکمل نہیں ہوتا — مگر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کی پوری جماعت کی مکمل تائید و حمایت سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا مقدمہ انسان کے بنائے ہوئے قانون کے تحت چلایا گیا۔ پاکستان میں اس وقت تین قسم کی عدالتیں ہیں۔ ایک فوجی عدالت، دوسرے شرعی عدالت، تیسرے برطانوی قانون کے تحت قائم شدہ عدالت جو تقسیم کے پہلے سے چلی آرہی ہے۔ وہ مسٹر بھٹو کے مقدمہ کو شرعی عدالت میں جاری کرا سکتے تھے۔ بالفرض اگر شرعی عدالتوں کے اختیارات محدود ہوں تو صدارتی فرمان کے ذریعہ اس کے اختیار کو وسیع بنا کر اور حسب ضرورت قاضیوں کا تقرر کر کے یہ کام عمل میں آسکتا تھا۔ مگر یہ سب کچھ نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ مولانا مودودی یا ان کی جماعت کے کسی شخص نے اس کا مطالبہ تک نہیں کیا۔ مسٹر بھٹو کا مقدمہ، شرعی عدالت کو چھوڑ کر، اس عدالت کے زیر سماعت لایا گیا جو برطانوی قانون پر مبنی چلی آرہی ہے۔ مسٹر بھٹو پر قتل کا الزام تھا جس کے لئے واضح قوانین اسلامی شریعت میں موجود ہیں۔ مگر ان کا مقدمہ جانتے بوجھتے برطانی قانون تعزیرات کے تحت چلایا گیا نہ کہ اسلامی قانون تعزیرات کے تحت۔

پاکستان کا یہ مشہور ترین مقدمہ مولانا مودودی کی مکمل تائید و حمایت کے تحت چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ۴ اپریل ۱۹۷۹ کو

مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دی گئی جب کہ مولانا مودودی زندہ سلامت موجود تھے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نظریہ کے مطابق یہ ساری کارروائی تحاکم الی الطاغوت (اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے اس حاکم کے پاس جانا جو قانون الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو) کی مصداق تھی۔ وہ مکمل طور پر غیر اسلامی تھی کیوں کہ وہ انسان کے بنائے ہوئے قانون کے تحت عمل میں لائی گئی۔ مگر مولانا مودودی نے نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف احتجاج نہیں کیا بلکہ اس کی پوری تائید کرتے رہے۔ وہ شخص جس نے اس عنوان سے شہرت پائی کہ وہ اس اصول کا سب سے بڑا مبلغ ہے کہ خدا کے نازل کردہ قانون کے سوا کسی اور قانون پر فیصلہ کرنا کفر اور ظلم اور فسق ہے، یہ طاغوتی عدالت کے پاس اپنے معاملات کے فیصلہ کے لئے جانا ہے جو سراسر ایمان کے منافی ہے۔ جو اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس اصول پر سمجھوتہ کرنے کے لئے کسی طرح راضی نہ تھا۔ اس نے خود اپنے اختیار سے اس اصول کو دفن کر دیا۔ اس نے اپنی پوری تائید اور اہتمام کے ساتھ غیر خدا کے بنائے ہوئے قانون کے تحت ایک مشہور ترین "مجرم" پر مقدمہ چلوایا اور اسی غیر خدائی قانون کے مطابق اس شخص کو پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیا گیا۔ وہ شخص جو ساری عمر خدائی قانون کے نفاذ کی تحریک چلاتا رہا، پہلا موقع ملتے ہی اس نے اپنے عمل سے یہ گواہی دی کہ ملک کے لئے یا کم از کم اس کے اپنے مقصد کے لئے سب سے زیادہ کارآمد قانون وہ ہے جو انسان کا بنایا ہوا ہے ـــــ موجودہ زمانہ میں ہمارے قائدین نے بڑی بڑی اسلامی تحریکیں اٹھائیں۔ مگر وہ اپنی تحریک کی آپ تردید کرتے رہے۔ پھر جو لوگ اپنی تردید آپ کریں وہ اپنے باہر کس طرح اس کو نتیجہ خیز بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کی ایک انوکھی خصوصیت ہے۔ وہ شان دار کامیابی حاصل کرنے کے باوجود مکمل طور پر ناکام ہو جاتی ہیں۔ پاکستان میں اسلام پسند مفکرین کا کہنا تھا کہ ملک کے ۹۹ فی صد لوگ اسلامی نظام چاہتے ہیں۔ صرف بھٹو جیسے چند لوگ ہیں جو اسلامی نظام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اگر ان تھوڑے سے لوگوں کو میدان سے ہٹا دیا جائے اور اس کے بعد عوامی انتخاب ہو تو سارے لوگ اسلام کو ووٹ دیں گے اور اسلامی نظام کے سوا کوئی دوسری چیز قائم نہ ہو سکے گی۔ بے شمار ناقابل بیان قربانیوں کے بعد "بھٹوؤں" کو ختم کر دیا گیا۔ اس کے بعد اسلامی مفکرین کے پسندیدہ حکمراں جنرل محمد ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ وہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۷ کو پاکستان میں عام الکشن کرائیں گے۔ پھر اس کو ملتوی کرکے ۱۷ نومبر ۱۹۷۹ کی تاریخ الکشن کے لئے مقرر کی گئی جو دوبارہ منسوخ کر دی گئی۔ دونوں بار جنرل محمد ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ چوں کہ "مثبت نتائج" کی امید نہیں اس لئے الکشن ملتوی کئے جاتے ہیں۔ "بھٹوؤں" کے خاتمہ پر پاکستان کے اسلام پسند عام الفتح (۱۹۷۷) منا چکے تھے۔ مگر جب انتخاب کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ عوامی رائے کے ذریعہ ان کے لئے اقتدار پر پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ ابتدائی اندازہ کرنے کے لئے ملک میں بلدیاتی الیکشن (ستمبر ۱۹۷۹) کرایا گیا۔ مگر ہر قسم کی پابندیوں کے باوجود "بھٹو پارٹی" نے ۸۰ فی صد نشستوں پر قبضہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد عام انتخابات کا منصوبہ مستقل طور پر ختم کر دیا گیا۔ شاندار فتح حاصل کرنے کے باوجود صرف شان دار ناکامی اسلام پسندوں کے حصہ میں آسکی۔ اب پاکستان میں جو "اسلام پسند" حکومت قائم ہے وہ صرف جبر کے زور پر قائم ہے نہ کہ عوامی تائید کے زور پر۔

اب ایران کی مثال لیجئے۔ شاہ محمد رضا پہلوی نے جب جنوری ۱۹۷۹ میں بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ ملک کو چھوڑا اور فروری ۱۹۷۹ میں آیات اللہ روح اللہ خمینی فاتحانہ انداز سے تہران کے ہوائی اڈہ پر اترے تو اسلام پسندوں نے اس کو ایسا انقلاب قرار دیا جس کی کوئی دوسری مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مگر بے مثال کامیابی حاصل کرنے کے باوجود ایران کو نئے انقلاب نے

جو کچھ زیادہ صرف وحشت و بربریت تھی۔ ایران کے عوام کو اسلام کی برکتوں کا کوئی تجربہ نہ ہو سکا۔ اٹلی کی ایک صحافی خاتون اوریانا فلاسی (Oriana Fallaci) نے اسلامی انقلاب کے بعد ایران کا دورہ کیا اور ایران کے مطلق حکمراں آیات اللہ روح اللہ خمینی کا انٹرویو لیا۔ خاتون نے موصوف سے پوچھا "میں نے ایران کے دورہ میں دیکھا کہ یہاں اسلامی انقلاب کے نتائج سے لوگ بہت غیر مطمئن ہیں۔ ہر طرف انتشار اور بدنظمی پھیلی ہوئی ہے۔ آپ کے اسلامی انقلاب کا وہ پھل لوگوں کو نہیں ملا جس کا ان سے انقلاب سے پہلے وعدہ کیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ یہاں کچھ لوگ ہیں جو اندیشہ کر رہے ہیں کہ ایران کے لئے بہت مشکل ایام آنے والے ہیں۔ آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے" آیات اللہ خمینی جن کی عمر ۸۰ سال ہو چکی ہے، اس کے جواب میں کہتے ہیں: "ہم اس بچہ کی طرح ہیں جس کی عمر ابھی صرف چھ ماہ ہے۔ ہمارے اسلامی انقلاب کی عمر صرف چھ مہینے ہے۔ ہم اپنے سفر کے آغاز میں ہیں۔ آپ ایسے بچہ سے کیا امید کر سکتی ہیں جس کی عمر ابھی صرف چھ مہینے ہو (ٹائمس آف انڈیا ۱۸ نومبر ۱۹۷۹)

ایران کے اسلامی لیڈر کا یہ جواب صرف اس بات کا اقرار ہے کہ ان کا انقلاب شان دار کامیابی کے باوجود صرف شاندار ناکامی تک پہنچا ہے۔ کیوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ تحریک "بچہ" ہوتی ہے، انقلاب کبھی "بچہ" نہیں ہوتا۔ انقلاب تو کسی تحریک کے مکمل عمر کو پہنچنے کا نام ہے۔ پھر وہ بچہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ انقلاب جو انقلاب کے مرحلہ میں پہنچ کر بچہ ہو وہ انقلاب ہی نہیں۔ وہ صرف ایک ہڑبونگ ہے جس کو غلطی سے انقلاب کا نام دے دیا گیا ہے —— یہی وجہ ہے کہ الٰہی خلافت کے نام پر اٹھنے والے جب اقتدار پاتے ہیں تو فوراً انسانی آمریت قائم کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ ملک کے مایوس اور ناراض عوام کے درمیان اپنی زندگی کی کوئی صورت انھیں آمریت کے سوا نظر نہیں آتی۔ "اسلامی نظام" قائم کرنے کے دعوے دار بالآخر "غیر اسلامی نظام" قائم کرکے اس کے سایہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے انتہائی بڑے بڑے اسلامی مفکرین و مصلحین کا یہ عبرت ناک انجام کیوں ہوا۔ اس کے اسباب کو مختلف طریقوں سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ تاہم ایک مشترک سبب یہ ہے کہ یہ تمام مفکرین دراصل رومانی مفکرین تھے نہ کہ حقیقت پسند مفکرین، اور رومانی دنیا میں جو خیالی محل بنایا گیا ہو وہ حقیقت کی دنیا میں کوئی واقعی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ رومانویت (Romanticism) جو اٹھارویں صدی سے لے کر جنگ عظیم اول تک ایک خاص صورت میں یورپ میں پائی جاتی تھی، وہی انیسویں اور بیسویں صدی کے مسلم مفکرین پر اپنے حالات کے لحاظ سے چھائی رہی ہے۔ ہر قوم جس کا ایک شان دار ماضی ہو اور پھر وہ زوال کا شکار ہو جائے، اس کے بعد جب اس کے درمیان احیار نو کی تحریک اٹھتی ہے تو اس میں خوش خیال مفکرین کثرت سے جنم لیتے ہیں۔ وہ اپنے تصوراتی ماضی کے زیر اثر اپنے مستقبل کے بارے میں حسین خواب دیکھتے ہیں جو ہمیشہ مبالغہ آمیز حد تک خیالی ہوتا ہے۔ حقیقی دنیا میں کوئی واقعہ پیدا کرنے کے لئے لمبا وقت اور خشک عمل درکار ہوتا ہے۔ جب کہ خیالی دنیا میں شان دار قلعہ کھڑا کرنے کے لئے الفاظ بول دینے کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ اس لئے ماضی اور مستقبل کے درمیان فاصلہ کو طے کرنے کے لئے الفاظ کے بڑے بڑے پل بننے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایسے دور میں حقیقت پسندانہ بات کرنے والے کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ البتہ آنے والے مستقبل کا جو شخص جتنا زیادہ مبالغہ آمیز نقشہ دکھائے اتنا ہی زیادہ وہ عوام میں مقبول ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام مفکرین خوش خیالیوں کا محل کھڑا کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اور حسین

فرضی محل جتنا زیادہ شاندار ہو اتنا ہی زیادہ بھیڑ اس کے گرد جمع ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی بھیڑ تخریبی نوعیت کا کوئی "انقلاب" برپا کرنے میں ممکن ہے کامیاب ہو جائے۔ مگر وہ تعمیری نوعیت کا انقلاب لانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ کیوں کہ تخریبی انقلاب کے لئے تو کسی "بھٹو" یا کسی "شاہ رضا" کا گلا گھونٹ دینا کافی ہے۔ مگر تعمیری انقلاب کے لئے "مارنا" نہیں بلکہ "زندہ کرنا" پڑتا ہے۔ اس کے لئے ہوش درکار ہے نہ کہ جوش۔ اس کے لئے حقیقت پسندی درکار ہے نہ کہ خوش خیالی۔ تعمیری انقلاب کے لئے لمبی خاموش جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لئے مثبت عوامل درکار ہوتے ہیں۔ اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس کے مطابق حقائق و واقعات کی زمین فراہم کی جائے۔ مگر یہ وہ چیزیں ہیں جو خوش خیال مفکرین کے یہاں سرے سے موجود نہیں ہوتیں۔ ان کا سرمایہ ہوتا ہے — غلو، لفاظی، خیال آرائی، شاعرانہ بلند پروازی۔ اور ظاہر ہے کہ حقیقت کی دنیا میں ان چیزوں کی کوئی قیمت نہیں۔ ان کا خیالی محل اپنے لئے حقیقی زمین نہ پاکر اچانک منہدم ہو جاتا ہے۔

اوپر کی گفتگو کا یہ مطلب نہیں کہ موجودہ زمانہ کے ان اسلامی مفکرین و مصلحین نے کوئی مفید کام نہیں کیا۔ ہر تحریک میں کچھ نہ کچھ مفید پہلو ہوتے ہیں اور ان کی تحریکوں کے دوران بھی بلاشبہ کئی مفید کام انجام پائے۔ مگر یہ تحریکیں مجموعی طور پر اثمهما اکبر من نفعهما (ان کا نقصان ان کے نفع سے زیادہ ہے) کا مصداق تھیں۔ اور سب سے بڑا نقصان جو ان تحریکوں کے ذریعہ امت مسلمہ کو پہنچا وہ ذہنی بگاڑ تھا۔ یہ براہ راست طور پر انھیں تحریکوں کا نتیجہ ہے کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ جذباتی اور غیر حقیقت پسند ہو کر رہ گئے ہیں۔ کوئی تحریک جو انسانی معاشرہ میں اٹھے، ضروری نہیں کہ وہ اپنے مقررہ عملی نشانہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو۔ تاہم عملی نتیجہ نہ پیدا کرکے بھی وہ ایک نتیجہ لازماً پیدا کرتی ہے، اور وہ فکری نتیجہ ہے۔ ہر تحریک کم از کم اپنے متاثر ہونے والوں میں، سوچنے کا ایک ڈھنگ، رائے قائم کرنے کا ایک طریقہ، معاملات کے بارے میں فیصلہ کا ایک ذہن دیتی ہے۔ اس لئے کسی تحریک کی قدر و قیمت کو اس اعتبار سے متعین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ عملی طور پر اپنی مقررہ منزل تک پہنچی یا نہیں۔ بلکہ کسی تحریک کی قدر و قیمت کو جانچنے کا اصلی معیار یہ ہے کہ اس نے جن افراد کو متاثر کیا ان کے اندر اس نے کس قسم کا فکری مزاج پیدا کیا۔ اس اعتبار سے موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قوم کی قوم کے مزاج کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں ہمارے مفکرین و مصلحین کا ایک طبقہ وہ ہے جس کا تمام تر سرمایہ بڑے بڑے الفاظ تھے۔ اس نے شاعرانہ ترنگوں، جوشیلی تقریروں اور خطیبانہ تحریروں کے ذریعہ اپنی تحریکیں چلائیں۔ الفاظ کے زور پر واقعات برآمد نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ان تحریکوں نے قوم کے افراد کو صرف جذباتی بنانے میں مدد دی۔ لوگ الفاظ کو واقعہ کا بدل سمجھنے لگے۔ حقیقت پسندانہ طرز فکر ان سے رخصت ہو گیا۔ خیال آرائیوں سے وہ اس نتیجہ کی امید کرنے لگے جو اس دنیا میں صرف حقیقی عمل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ دوسری طرف وہ مفکرین تھے جو خود بھی غلو کا شکار ہوئے اور اپنے افکار سے دوسرے بہت سے لوگوں کو غلو کا شکار کیا۔ وہ سیاسی کارروائیوں کے ذریعہ ملت کا مستقبل برآمد کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کی غلو پسندی صرف سیاسی عمل پر قانع نہ ہوئی۔ انھوں نے اپنے سیاسی عمل کو جائز ثابت کرنے کے لئے پورا سیاسی فلسفہ بنایا، حتیٰ کہ خود قرآن و اسلام کو سیاسی بنا ڈالا۔ جو لوگ اس فکر سے متاثر ہوئے ان کے لئے خدا کا دین ایک قسم کا سیاسی نظریہ بن کر رہ گیا۔ وہ بطور خود یہ سمجھتے رہے کہ انھوں نے مکمل اسلام کو پا لیا ہے۔ حالانکہ انھوں نے جس اسلام کو پایا اس میں سب کچھ تھا مگر وہی چیز نہ تھی جو اسلام کا اصل مقصود ہے ——— تعلق باللہ اور خوف آخرت۔

کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں حجت کی۔ کیوں کہ اللہ نے اس کو سلطنت دی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے۔ وہ بولا کہ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تم اس کو پچھم سے نکال دو۔ تب وہ منکر حیران رہ گیا۔ اور اللہ ظالموں کو راہ نہیں دکھاتا

۲۵۸

موجودہ زمانہ میں عوامی تائید سے حکومت کا استحقاق حاصل ہوتا ہے۔ مگر جمہوریت کے دور سے پہلے اکثر بادشاہ لوگوں کو یہ یقین دلا کر ان کے اوپر حکومت کرتے تھے کہ وہ خدا کا انسانی پیکر ہیں۔ قدیم عراق کے بادشاہ نمرود کا معاملہ یہی تھا جو حضرت ابراہیم کا ہم عصر تھا۔ اس کی قوم سورج کو دیوتاؤں کا سردار مانتی تھی۔ اور اس کی پوجا کرتی تھی۔ نمرود نے کہا کہ وہ سورج دیوتا کا مظہر ہے، اس لئے وہ لوگوں کے اوپر حکومت کرنے کا خدائی حق رکھتا ہے۔ حضرت ابراہیم نے اس وقت کے عراق میں جب توحید کی آواز بلند کی تو اس کا سیاست و حکومت سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ آپ لوگوں سے صرف یہ کہہ رہے تھے کہ تمھارا خالق اور مالک صرف ایک اللہ ہے۔ کوئی نہیں جو خدائی میں اس کا شریک ہو۔ اس لئے تم اسی کی عبادت کرو۔ اسی سے ڈرو اور اسی سے امیدیں قائم کرو۔ تاہم اس غیر سیاسی دعوت میں نمرود کو اپنی سیاست پر زد پڑتی ہوئی نظر آئی۔ ایسا عقیدہ جس میں سورج کو ایک بے زور بندہ بتایا گیا ہو وہ گویا اس اعتقادی بنیاد ہی کو ڈھارہا تھا جس کے اوپر نمرود نے اپنا سیاسی تخت بچھا رکھا تھا۔ اس وجہ سے وہ آپ کا دشمن ہو گیا۔

حضرت ابراہیمؑ نے نمرود سے جو گفتگو کی اس سے انبیاء کا طریق دعوت معلوم ہوتا ہے۔ نمرود کے سوال کے جواب میں آنجناب نے فرمایا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے۔ نمرود نے مناظرانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ موت اور زندگی پر تو میں بھی اختیار رکھتا ہوں۔ جس کو چاہوں مروادوں اور جس کو چاہوں زندہ رہنے دوں۔ آنجناب نمرود کا جواب دے سکتے تھے۔ مگر آپ نے گفتگو کو مناظرہ بنانا پسند نہ کیا، اس لئے آپ نے فوراً دوسری مثال پیش کر دی جس کے جواب میں نمرود اس قسم کی بات نہ کہہ سکتا تھا جو اس نے پہلی مثال کے جواب میں کہی۔ حضرت ابراہیم کے لئے نمرود حریف نہ تھا بلکہ مدعو کی حیثیت رکھتا تھا اس لئے ان کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ استدلال کا کون سا حکیمانہ انداز ان کو اختیار کرنا چاہئے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لئے اس کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ ایک ہی چیز کو آدمی دو مختلف معنوں میں لے سکے۔ مثلاً ایک شخص کے پاس دولت اور اقتدار آ جائے تو وہ اس کو ایسے رخ سے دیکھ سکتا ہے کہ اس کی کامیابی اس کو اپنی صلاحیتوں کا نتیجہ نظر آئے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس کو ایسے رخ سے دیکھے کہ اس کو محسوس ہو کہ جو کچھ اس کو ملا ہے وہ سراسر خدا کا انعام ہے۔ پہلی صورت ظلم کی صورت ہے اور دوسری شکر کی صورت۔ جس شخص کے اندر ظالمانہ مزاج ہو اس کے لئے موجودہ دنیا صرف گمراہی کی خوراک ہوگی۔ اس کو ہر واقعہ میں گھمنڈ اور خود پسندی کی غذا ملے گی۔ اس کے برعکس جس کے اندر شکر کا مزاج ہوگا، اس کے لئے ہر واقعہ میں ہدایت کا سامان ہوگا۔ خدا کی دنیا اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ اس کے لئے رزق ایمانی کا دستر خوان بن جائے گی۔

یا جیسے وہ شخص جس کا گزر ایک بستی پر سے ہوا۔ اور وہ اپنی چھتوں پر گری ہوئی تھی۔ اس نے کہا: ہلاک ہو جانے کے بعد اللہ اس بستی کو دوبارہ کیسے زندہ کرے گا۔ پھر اللہ نے اس پر سو برس تک کے لئے موت طاری کر دی۔ پھر اس کو اٹھایا۔ اللہ نے پوچھا تم کتنی دیر اس حالت میں رہے۔ اس نے کہا ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم۔ اللہ نے کہا نہیں بلکہ تم سو برس رہے ہو۔ اب تم اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ سڑی نہیں ہیں اور اپنے گدھے کو دیکھو۔ اور تاکہ ہم تم کو لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دیں۔ اور ہڈیوں کی طرف دیکھو، کس طرح ہم ان کا ڈھانچہ کھڑا کرتے ہیں۔ پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پس جب اس پر واضح ہو گیا تو کہا میں جانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اور جب ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب، مجھ کو دکھا دے کہ تو مُردوں کو کس طرح زندہ کرے گا۔ اللہ نے کہا، کیا تم نے یقین نہیں کیا۔ ابراہیم نے کہا کیوں نہیں، مگر اس لئے کہ میرے دل کو تسکین ہو جائے۔ فرمایا تم چار پرندے لو اور ان کو اپنے سے ہلا لو۔ پھر ان میں سے ہر ایک کو الگ الگ پہاڑی پر رکھ دو، پھر ان کو بلاؤ۔ وہ تمھارے پاس دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔ اور جان لو کہ اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے　۲۵۹–۶۰

یہاں موت کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے کے جن دو تجربات کا ذکر ہے ان کا تعلق انبیاء سے ہے۔ پہلا تجربہ غالباً حضرت عزیرؑ کے ساتھ گزرا جن کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کا ہے۔ اور دوسرا تجربہ حضرت ابراہیمؑ سے تعلق رکھتا ہے جن کا زمانہ ۱۹۸۵–۲۱۶۰ ق م کے درمیان ہے۔ انبیاء خدا کی طرف سے اس لئے مقرر ہوتے ہیں کہ لوگوں کو غیبی حقائق سے باخبر کریں، اس لئے ان کو وہ غیبی چیزیں بے پردہ کر کے دکھا دی جاتی ہیں جن پر دوسروں کے لئے اسباب کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ انبیاء کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ اس لئے ہوتا ہے تاکہ وہ ان چیزوں کے ذاتی مشاہد بن کر ان کی بابت لوگوں کو باخبر کر سکیں۔ وہ لوگوں کو جن غیبی حقیقتوں کی خبر دیں ان کے متعلق کہہ سکیں کہ ہم ایک دیکھی ہوئی چیز سے تم کو خبردار کر رہے ہیں نہ کہ محض سنی ہوئی چیز سے۔

انبیاء کو چالیس سال کی عمر میں نبوت دی جاتی ہے۔ نبوت سے پہلے ان کی پوری زندگی لوگوں کے سامنے اس طرح گزرتی ہے کہ ان سے کسی شخص کو جھوٹ کا تجربہ نہیں ہوتا۔ تقریباً نصف صدی تک ماحول کے اندر اپنے سچے ہونے کا ثبوت دینے کے بعد وہ وقت آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو لوگوں کے سامنے ان غیبی حقیقتوں کے اعلان کے لئے کھڑا کرے جن کو آزمائش کی مصلحت کی بنا پر لوگوں سے چھپا دیا گیا ہے۔ ماحول کے یہ سب سے زیادہ سچے لوگ ایک طرف اپنے مشاہدہ سے لوگوں کو باخبر کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف عقل اور فطرت کے شواہد سے اس کو مدلل کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ انبیاء کو ہمیشہ شدید ترین حالات سے سابقہ پیش آتا ہے، اس کے باوجود وہ اپنے قول سے پھرتے نہیں وہ انتہائی ثابت قدمی کے ساتھ اپنی بات پر جمے رہتے ہیں۔ اس طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس میں وہ پوری طرح سنجیدہ ہیں۔ فرضی طور پر انھوں نے کوئی بات نہیں گھڑ لی ہے۔ کیوں کہ گھڑی ہوئی بات کو پیش کرنے والا کبھی اتنے سخت حالات میں اپنی بات پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور نہ اس کی بات خارجی کائنات سے اتنا زیادہ مطابق ہو سکتی ہے کہ وہ سراپا اس کی تصدیق بن جائے۔

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ ہو جس سے سات بالیں پیدا ہوں، ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے۔ اور اللہ وسعت والا، جاننے والا ہے۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان رکھتے ہیں اور نہ تکلیف پہنچاتے ہیں ان کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے۔ اور ان کے لئے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ مناسب بات کہہ دینا اور درگزر کرنا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے ستانا ہو۔ اور اللہ بے نیاز ہے، تحمل والا ہے۔ اے ایمان والو احسان رکھ کر اور ستا کر اپنے صدقہ کو ضائع نہ کرو، جس طرح وہ شخص جو اپنا مال دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے اور وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ پس اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اس پر زور کا مینھ پڑے اور اس کو بالکل صاف کر دے۔ ایسے لوگوں کو اپنی کمائی کچھ بھی ہاتھ نہ لگے گی۔ اور اللہ منکروں کو راہ نہیں دکھاتا ۲۶۱—۶۴

ہر عمل جو آدمی کرتا ہے وہ گویا ایک بیج ہے جو آدمی "زمین" میں ڈالتا ہے۔ اگر اس کا عمل اس لئے تھا کہ لوگ اسے دیکھیں تو اس نے اپنا بیج دنیا کی زمین میں ڈالا تاکہ یہاں کی زندگی میں اپنے کئے کا پھل پا سکے۔ اور اگر اس کا عمل اس لئے تھا کہ اللہ اس کو "دیکھے" تو اس نے آخرت کی زمین میں اپنا بیج ڈالا جو اگلی دنیا میں اپنے پھول اور پھل کی بہاریں دکھائے۔ دنیا میں ایک دانہ سے ہزار دانے پیدا ہوتے ہیں۔ یہی حال آخرت کے کھیت میں دانہ ڈالنے کا بھی ہے۔

دنیا کے فائدہ یا دنیا کی شہرت و عزت کے لئے خرچ کرنے والا اسی دنیا میں اپنا معاوضہ لینا چاہتا ہے۔ ایسے آدمی کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ مگر جو شخص اللہ کے لئے خرچ کرے اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی پر احسان نہیں جتاتا، اس نے حب اللہ کے لئے خرچ کیا ہے تو انسان پر اس کا کیا احسان۔ اس کی رقم خرچ ہو کر جن لوگوں تک پہنچتی ہے ان کی طرف سے اس کو اچھا جواب نہ ملے تو وہ ناراضگی کا اظہار نہیں کرتا۔ اس کو تو اچھا جواب اللہ سے لینا ہے، پھر انسانوں سے ملنے یا نہ ملنے کا اسے کیا غم۔ اگر کسی سائل کو وہ نہیں دے سکتا تو وہ اس سے برا کلمہ نہیں کہتا۔ بلکہ نرمی کے ساتھ معذرت کر دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ وہ جو کچھ بول رہا ہے خدا کے سامنے بول رہا ہے۔ خدا کا خوف اس کو انسان کے سامنے زبان روکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

پتھر کی چٹان کے اوپر کچھ مٹی جم جائے تو بظاہر وہ مٹی دکھائی دے گی۔ مگر بارش کا جھونکا آتے ہی مٹی کی اوپری تہ بہہ جائے گی اور اندر سے خالی پتھر نکل آئے گا۔ ایسا ہی حال اس انسان کا ہوتا ہے جو بس اوپری دین داری لئے ہوئے ہو۔ دین اس کے اندر تک داخل نہ ہوا ہو۔ ایسے آدمی سے اگر کوئی سائل بے ڈھنگے انداز سے سوال کر دے یا کسی کی طرف سے کوئی ایسی بات سامنے آجائے جو اس کی انا پر ضرب لگانے والی ہو تو وہ بھڑک کر انصاف کی حدوں کو توڑ دیتا ہے۔ ایسا ایک واقعہ ایک ایسا طوفان بن جاتا ہے جو اس کی اوپری "مٹی" کو بہا لے جاتا ہے اور پھر اس کا اندر کا انسان سامنے آجاتا ہے جس کو وہ دین کے ظاہری لبادہ کے پیچھے چھپائے ہوئے تھا ——— اللہ کے لئے عمل کرنا گویا دیکھے پر اَن دیکھے کو ترجیح دینا ہے۔ جو اس بلند نظری کا ثبوت دے وہی وہ شخص ہے جس پر خدا کی چھپی ہوئی معرفت کے دروازے کھلتے ہیں۔

اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال کو اللہ کی رضا چاہنے کے لئے اور اپنے نفس میں پختگی کے لئے خرچ کرتے ہیں ایک باغ کی طرح ہے جو بلندی پر ہو۔ اس پر زور کا مینھ پڑا تو وہ دونا پھل لایا۔ اور اگر زور کا مینھ نہ پڑے تو ہلکی پھوار بھی کافی ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، اس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں۔ اس میں اس کے واسطے ہر قسم کے پھل ہوں۔ اور وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے ابھی کمزور ہوں۔ تب اس باغ پر ایک بگولہ آئے جس میں آگ ہو۔ پھر وہ باغ جل جائے۔ اللہ اس طرح تمھارے لئے کھول کر نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو ۶۶ — ۲۶۵

آدمی جب کسی چیز کے لئے عمل کرتا ہے تو اسی کے ساتھ وہ اس کے حق میں اپنی قوت ارادی کو مضبوط کرتا ہے۔ اگر وہ اپنی خواہش کے تحت عمل کرے تو اس نے اپنے دل کو اپنی خواہش پر جمایا۔ اس کے برعکس آدمی اگر وہاں عمل کرے جہاں خدا چاہتا ہے کہ عمل کیا جائے تو اس نے اپنے دل کو خدا پر جمایا۔ دونوں راہوں میں ایسا ہوتا ہے کہ کبھی آسان حالات میں عمل کرنا ہوتا ہے اور کبھی مشکل حالات میں۔ تاہم مواقع جتنے شدید ہوں، آدمی کو جتنا زیادہ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا عمل کرنا پڑے اتنا ہی زیادہ وہ اپنے پیش نظر مقصد کے حق میں اپنے ارادہ کو مستحکم کرے گا۔ عام حالات میں اللہ کی راہ میں اپنے اثاثہ کو خرچ کرنا بھی باعث ثواب ہے۔ مگر جب مخالف اسباب کی وجہ سے خصوصی قوت ارادی کو استعمال کرکے آدمی اللہ کی راہ میں اپنا اثاثہ دے تو اس کا ثواب اللہ کے یہاں بہت زیادہ ہے —— جس مد میں خرچ کرنا دنیوی اعتبار سے بے فائدہ ہو اس میں اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرنا، جس کو دینے کا دل نہ چاہے اس کو اللہ کے لئے دینا، جس سے خوش معاملگی پر طبیعت آمادہ نہ ہو اس سے اللہ کی خاطر خوش معاملگی کرنا، وہ چیزیں ہیں جو آدمی کو سب سے زیادہ خدا پرستی پر جماتی ہیں اور اس کو خدا کی خصوصی رحمت و نصرت کا مستحق بناتی ہیں۔

آدمی جوانی کی عمر میں باغ لگاتا ہے تاکہ بڑھاپے کی عمر میں اس کا پھل کھائے۔ پھر وہ شخص کیسا بدنصیب ہے جس کا ہرا بھرا باغ اس کی آخر عمر میں عین اس وقت برباد ہو جائے جب کہ وہ سب سے زیادہ اس کا محتاج ہو اور اس کے لئے وہ وقت بھی ختم ہو چکا ہو جب کہ وہ دوبارہ نیا باغ لگائے اور اس کو از سر نو تیار کرے۔ ایسا ہی حال ان لوگوں کا ہے جنھوں نے دین کا کام دنیوی عزت و منفعت کے لئے کیا۔ وہ بظاہر نیکی اور بھلائی کا کام کرتے رہے۔ مگر ان کا کام صرف شکلاً ہی عام دنیا داروں سے مختلف تھا۔ باعتبار حقیقت دونوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ عام دنیا دار جس دنیوی ترقی اور ناموری کے لئے دنیوی نقشوں میں دوڑ دھوپ کر رہے تھے، اسی دنیوی ترقی اور ناموری کے لئے انھوں نے دینی نقشوں میں دوڑ دھوپ جاری کر دی۔ جو شہرت و عزت دوسرے لوگ دنیا کی عمارت میں اپنا اثاثہ خرچ کرکے حاصل کر رہے تھے، اسی شہرت و عزت کو انھوں نے دین کی عمارت میں اپنا اثاثہ خرچ کرکے حاصل کرنا چاہا۔ ایسے لوگ جب مرنے کے بعد آخرت کے عالم میں پہنچیں گے تو وہاں ان کے لئے کچھ نہ ہوگا۔ انھوں نے جو کچھ کیا اسی دنیا کے لئے کیا۔ پھر وہ اپنے کئے کا پھل اگلی دنیا میں کس طرح پا سکتے ہیں —— خدا کی نشانیاں ہمیشہ ظاہر ہوتی ہیں۔ مگر وہ خاموش زبان میں ہوتی ہیں۔ ان سے وہی سبق لے سکتا ہے جو اپنے اندر سوچنے کی صلاحیت پیدا کر چکا ہو۔

اے ایمان والو خرچ کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین میں سے پیدا کیا ہے۔ اور ردی چیز کا قصد نہ کرو کہ اس میں سے خرچ کرو۔ حالاں کہ تم کبھی اس کو لینے والے نہیں الا یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ۔ اور جان لو کہ اللہ بے نیاز ہے، خوبیوں والا ہے۔ شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے اور بری بات کی تلقین کرتا ہے اور اللہ وعدہ دیتا ہے اپنی بخشش کا اور فضل کا اور اللہ وسعت والا ہے، جاننے والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے حکمت دے دیتا ہے اور جس کو حکمت ملی اس کو بڑی دولت مل گئی۔ اور نصیحت وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں ۶۹-۲۶۷

آدمی دنیا میں جو کچھ کماتا ہے اس کو خرچ کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو شیطان کے بتائے ہوئے راستہ میں خرچ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کو اللہ کے بتائے ہوئے راستہ میں خرچ کیا جائے۔ شیطان یہ کرتا ہے کہ آدمی کے ذاتی تقاضوں کی اہمیت اس کے دل میں بٹھاتا ہے۔ وہ اس کو سکھاتا ہے کہ تم نے جو کچھ کمایا ہے اس کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اس کو اپنی ذاتی ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگاؤ۔ پھر جب شیطان دیکھتا ہے کہ آدمی کے پاس اس کی حقیقی ضرورت سے زیادہ ہے تو وہ اس کے اندر ایک اور جذبہ بھڑکا دیتا ہے۔ یہ نمود و نمائش کا جذبہ ہے۔ اب وہ اپنی دولت کو بے دریغ نمائشی کاموں میں بہانے لگتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اس نے اپنی دولت کو بہترین مصرف میں لگایا۔

آدمی کو چاہئے کہ اپنے مال کو اپنی ذاتی چیز نہ سمجھے بلکہ اللہ کی چیز سمجھے۔ وہ اپنی کمائی میں سے اپنی حقیقی ضرورت کے بقدر لے لے اور اس کے بعد جو کچھ ہے اس کو بلند تر مقاصد میں لگائے۔ وہ خدا کے کمزور بندوں کو دے اور خدا کے دین کی ضرورتوں میں خرچ کرے۔ آدمی جب اللہ کے کمزور بندوں پر اپنا مال خرچ کرتا ہے تو گویا وہ اپنے رب سے اس بات کا امیدوار بن رہا ہوتا ہے کہ آخرت میں جب وہ خالی ہاتھ خدا کے سامنے حاضر ہو تو اس کا خدا اس کو اپنی رحمتوں سے محروم نہ کرے۔ اسی طرح جب وہ دین کی ضرورتوں میں اپنا مال دیتا ہے تو وہ اپنے آپ کو خدا کے مشن میں شریک کرتا ہے۔ وہ اپنے مال کو خدا کے مال میں شامل کرتا ہے تاکہ اس کی حقیر پونجی خدا کے بڑے خزانہ میں مل کر زیادہ ہو جائے۔

جو شخص اپنے مال کو اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق خرچ کرتا ہے وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کو حکمت و دانائی میں سے حصہ ملا ہے۔ سب سے بڑی نادانی یہ ہے کہ آدمی مال کی محبت میں مبتلا ہو اور اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے سے رک جائے اور سب سے بڑی دانائی یہ ہے کہ اقتصادی مفادات آدمی کے لئے اللہ کی راہ میں بڑھنے میں رکاوٹ نہ بنیں۔ وہ اپنے آپ کو خدا میں اتنا ملا دے کہ خدا کو اپنا اور اپنے کو خدا کا سمجھنے لگے۔ جو شخص ذاتی مصلحتوں کے خول میں جیتا ہے اس کے اندر وہ نگاہ پیدا نہیں ہو سکتی جو بلند تر حقیقتوں کو دیکھے اور اعلیٰ کیفیات کا تجربہ کرے۔ اس کے برعکس جو شخص ذاتی مصلحتوں کو نظر انداز کر کے خدا کی طرف بڑھتا ہے وہ اپنے آپ کو محدودیتوں سے اوپر اٹھاتا ہے، وہ اپنے شعور کو اس خدا کے ہم سطح کر لیتا ہے جو غنی و حمید اور وسیع و علیم ہے۔ وہ چیزوں کو ان کے اصلی روپ میں دیکھنے لگتا ہے کیونکہ وہ ان حد بندیوں کے پار ہو جاتا ہے جو آدمی کے لئے کسی چیز کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے میں رکاوٹ بنتی ہیں —— کوئی بات خواہ کتنی ہی سچی ہو مگر اس کی سچائی کسی آدمی پر اسی وقت کھلتی ہے جب کہ وہ اس کو کھلے ذہن سے دیکھ سکے۔

اور تم جو خرچ کرتے ہو یا جو نذر مانتے ہو اس کو اللہ جانتا ہے۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ اگر تم اپنے صدقات ظاہر کرکے دو تب بھی اچھا ہے اور اگر تم انھیں چھپا کر محتاجوں کو دو تو یہ تمھارے لئے زیادہ بہتر ہے۔ اور اللہ تمھارے گناہوں کو دور کردے گا اور اللہ تمھارے کاموں سے واقف ہے۔ ان کو ہدایت پر لانا تمھارا ذمہ نہیں۔ بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور جو مال تم خرچ کروگے اپنے ہی لئے کروگے۔ اور تم نہ خرچ کرو مگر اللہ کی رضا چاہنے کے لئے۔ اور تم جو مال خرچ کروگے وہ تم کو پورا کردیا جائے گا اور تمھارے لئے اس میں کمی نہ کی جائے گی۔ صدقات ان حاجت مندوں کے لئے ہیں جو اللہ کی راہ میں گھر گئے ہوں، زمین میں دوڑ دھوپ نہیں کرسکتے۔ ناواقف آدمی ان کو غنی خیال کرتا ہے ان کے نہ مانگنے کی وجہ سے۔ تم ان کو ان کی صورت سے پہچان سکتے ہو۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔ اور جو مال تم خرچ کروگے وہ اللہ کو معلوم ہے۔ جو لوگ اپنے مالوں کو رات اور دن، چھپے اور کھلے خرچ کرتے ہیں، ان کے لئے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔ اور ان کے لئے نہ خوف ہے اور نہ وہ غم گین ہوں گے　۲۷۰ — ۲۷۴

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی سب سے بڑی مد یہ ہے کہ ان دینی خادموں کی مالی مدد کی جائے جو دین کی جدوجہد میں اپنے کو ہمہ تن لگا دینے کی وجہ سے بے معاش ہوگئے ہوں۔ ایک کامیاب تاجر کے پاس کسی دوسرے کام کے لئے وقت نہیں رہتا۔ ٹھیک یہی معاملہ خدمت دین کا ہے۔ جو شخص یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ کو دین کی خدمت میں لگائے اس کے پاس معاشی جدوجہد کے لئے وقت نہیں رہے گا۔ مزید یہ کہ ہر کام کی اپنی ایک فطرت ہے اور اپنی فطرت کے لحاظ سے وہ آدمی کا ذہن ایک خاص ڈھنگ پر بناتا ہے۔ جو شخص تجارت میں لگتا ہے اس کے اندر دھیرے دھیرے تجارتی مزاج پیدا ہوجاتا ہے۔ تجارت کی راہ کی باریکیاں فوراً اس کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ جب کہ وہی آدمی دین کے راستہ کی باتوں کو گہرائی کے ساتھ پکڑ نہیں پاتا۔ یہی معاملہ برعکس صورت میں خادم دین کا ہوتا ہے۔ اب اس کا حل کیا ہو۔ کیونکہ کسی معاشرہ میں دونوں قسم کے کاموں کا ہونا ضروری ہے۔ اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس معاشی وسائل جمع ہوگئے ہیں اس میں وہ ان لوگوں کا حصہ لگائیں جو دینی مصروفیت کی وجہ سے اپنی معاشیات فراہم نہ کرسکے۔ یہ گویا ایک طرح کی خاموش تقسیم کار ہے جو طرفین کے درمیان خالص رضائے الٰہی کے لئے وقوع میں آتی ہے۔ خادم دین نے اپنے آپ کو اللہ کے لئے یکسو کیا تھا، اس لئے وہ انسان سے نہیں مانگتا اور نہ پانے کا امیدوار رہتا۔ دوسری طرف صاحب معاش یہ سوچتا ہے کہ میرے پاس معاشی وسائل اس قیمت پر آئے ہیں کہ میں خدمت دین کی راہ میں وہ نہ کرسکا جو مجھ کو کرنا چاہئے تھا۔ اس لئے اس کی تلافی یہ ہے کہ میں اپنے مال میں اپنے ان بھائیوں کا حصہ لگاؤں جو گویا میری کمی کی تلافی خدا کے یہاں کر رہے ہیں۔

جب دین کی جدوجہد اس مرحلہ میں ہو کہ دین کے نام پر معاشی عہدے نہ ملتے ہوں، جب دین کی راہ میں لگنے والا آدمی بے روزگار ہوجائے، اس وقت دین کے خادموں کو اپنا مال دینا بظاہر ماحول کے ایک غیر اہم طبقہ سے اپنا رشتہ جوڑنا ہے۔ ایسے افراد پر خرچ کرنا مجلسوں میں قابل تذکرہ نہیں ہوتا۔ وہ آدمی کی حیثیت اور ناموری میں اضافہ نہیں کرتا۔ مگر یہی وہ خرچ ہے جو آدمی کو سب سے زیادہ اللہ کی رحمتوں کا مستحق بناتا ہے۔

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت میں نہ اٹھیں گے مگر اس شخص کی مانند جس کو شیطان نے چھو کر خبطی بنا دیا ہو۔ یہ اس لئے کہ انھوں نے کہا کہ تجارت کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا سود لینا۔ حالاں کہ اللہ نے تجارت کو حلال ٹھہرایا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ پھر جس شخص کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آگیا تو جو کچھ وہ لے چکا وہ اس کے لئے ہے۔ اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اور جو شخص پھر وہی کرے تو وہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ سود کو گھٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اور اللہ پسند نہیں کرتا ناشکروں کو، گنہ گاروں کو۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ ادا کی، ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس۔ ان کے لئے نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غم گین ہوں گے　　۲۷۵ ـ ۷۷

بندوں کے درمیان باہمی طور پر جو معاشی تعلقات مطلوب ہیں ان کی علامت زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے حقوق کا اعتراف یہاں تک کرتا ہے کہ وہ خود اپنی کمائی کا ایک حصہ نکال کر اپنے بھائی کو دیتا ہے۔ جو دین حقوق شناسی کا ایسا ماحول بنانا چاہتا ہو وہ سود کے زر پرستانہ طریقہ کو کسی طرح قبول نہیں کر سکتا۔ ایسے معاشرہ میں باہمی لین دین تجارت کے اصول پر ہوتا ہے نہ کہ سود کے اصول پر۔ تجارت میں بھی آدمی نفع لیتا ہے۔ مگر تجارت کا جو نفع ہے وہ آدمی کی محنت اور اس کے خطرات مول لینے کی قیمت ہوتا ہے۔ جب کہ سود کا نفع محض خود غرضی اور زر اندوزی کا نتیجہ ہے۔

سود کا کاروبار کرنے والا اپنی دولت دوسرے کو اس لئے دیتا ہے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنی دولت کو مزید بڑھائے۔ وہ یہ دیکھ کر خوش ہوتا ہے کہ اس کا سرمایہ یقینی شرح سے بڑھ رہا ہے۔ مگر اس عمل کے دوران وہ خود اپنے اندر جو انسان تیار کرتا ہے وہ ایک خود غرض اور دنیا پرست انسان ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی اپنی کمائی میں سے صدقہ کرتا ہے، جو دوسروں کی ضرورت مندی کو اپنے لئے تجارت کا سودا نہیں بناتا بلکہ اس کے ساتھ اپنے کو شریک کرتا ہے، ایسا شخص اپنے عمل کے دوران اپنے اندر جو انسان تیار کر رہا ہے وہ پہلے سے بالکل مختلف انسان ہے۔ یہ وہ انسان ہے جس کے دل میں دوسروں کی خیر خواہی ہے۔ جو ذاتی دائرہ سے اوپر اٹھ کر سوچتا ہے۔

دنیا میں آدمی اس لئے نہیں بھیجا گیا ہے کہ وہ یہاں اپنی کمائی کے ڈھیر لگائے۔ آدمی کے لئے ڈھیر لگانے کی جگہ آخرت ہے۔ دنیا میں آدمی کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ ان میں کون ہے جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ اس کو آخرت کی جنتی دنیا میں بسایا جائے۔ جو لوگ اس صلاحیت کا ثبوت دیں گے ان کو خدا جنت کا باشندہ بننے کے لئے چن لے گا۔ اور باقی تمام لوگ کوڑا کرکٹ کی طرح جہنم میں پھینک دئے جائیں گے ــــــــ صدقہ کی روح حاجت مند کو اپنا مال خدا کے لئے دینا ہے اور سود کی روح استحصال کے لئے دینا۔ صدقہ اس بات کی علامت ہے کہ آدمی آخرت میں اپنے لئے نعمتوں کا ڈھیر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں سود اس بات کی علامت ہے کہ وہ اسی دنیا میں اپنے لئے ڈھیر لگنے کا خواہش مند ہے۔ یہ دو الگ الگ انسان ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ خدا کے یہاں دونوں کا انجام یکساں قرار پائے۔ دنیا اس کو ملتی ہے جس نے دنیا کے لئے محنت کی ہو، اسی طرح آخرت اسی کو ملے گی جس نے آخرت کے لئے اپنے اثاثہ کو قربان کیا۔

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو، اگر تم مومن ہو۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑائی کے لئے خبردار ہو جاؤ۔ اور اگر تم توبہ کرلو تو اصل رقم کے تم حق دار ہو، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ اور اگر ایک شخص تنگی والا ہے تو اس کی فراخی تک مہلت دو۔ اور اگر معاف کردو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔ اور اس دن سے ڈرو جس دن تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا پورا پورا مل جائے گا۔ اور ان پر ظلم نہ ہوگا ۸۱ ـ ۲۷۸

معاشرہ کی اصلاح کا بنیادی اصول یہ ہے کہ معاشرہ کا کوئی فرد نہ کسی دوسرے کے اوپر زیادتی کرے اور نہ دوسرا کوئی اس کے اوپر زیادتی کرے۔ نہ کوئی کسی کے اوپر ظالم بنے اور نہ کوئی کسی کو مظلوم بنائے۔ سود خواری ایک کھلا ہوا معاشی ظلم ہے، اس لئے اسلام نے اس کو حرام ٹھہرایا۔ حتی کہ اسلامی اقتدار کے تحت سودی کاروبار کو فوجداری جرم قرار دیا۔ تاہم ایک سودخوار کو جس طرح دوسرے کے ساتھ ظالمانہ کاروبار کرنے کی اجازت نہیں ہے اسی طرح کسی دوسرے کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ سودخوار کو اپنے ظلم کا نشانہ بنائے۔ کسی کا مجرم ہونا اس کو اس کے دیگر حقوق سے محروم نہیں کرتا۔ سودخوار کے خلاف جب کارروائی کی جائے گی تو صرف اس کے سودی اضافہ کو ساقط کیا جائے گا۔ اپنی اصل رقم کو واپس لینے کا وہ پھر بھی حق دار ہوگا۔ تاہم عمومی قانون کے ساتھ اسلام انسانی کمزوریوں کی بھی آخری حد تک رعایت کرتا ہے۔ اس لئے حکم دیا گیا کہ کوئی قرض دار اگر وقت پر تنگ دست ہے تو اس کو اس وقت تک مہلت دی جائے جب تک وہ اپنے ذمہ کی رقم ادا کرنے کے قابل ہو جائے۔ اسی کے ساتھ یہ تلقین بھی کی گئی کہ کوئی شخص قرض کی رقم ادا کرنے کے قابل نہ رہے تو اس کے ذمہ کی رقم کو سرے سے معاف کر دینے کا حوصلہ پیدا کرو۔ معاف کرنے والا خدا کے یہاں اجر کا مستحق بنتا ہے اور دنیا میں اس کا یہ فائدہ ہے کہ معاشرہ کے اندر باہمی رعایت اور ہمدردی کی فضا پیدا ہوتی ہے جو بالآخر سب کے لئے مفید ہے۔

تاہم صرف قانون کا نفاذ معاشرہ کی صلاح وفلاح کا ضامن نہیں۔ حقیقی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ معاشرہ میں تقویٰ کی فضا موجود ہو۔ اس لئے قانونی حکم بتاتے ہوئے ایمان، تقویٰ اور آخرت کا اہتمام کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ جس طرح ایک سیکولر نظام اسی وقت کامیابی کے ساتھ چلتا ہے جب کہ شہریوں کے اندر اس کے مطابق قومی کردار موجود ہو۔ اسی طرح اسلامی نظام اسی وقت صحیح طور پر وقوع میں آتا ہے جب کہ افراد کے قابل لحاظ حصہ میں تقویٰ کی روح پائی جاتی ہو۔ قومی کردار یا تقویٰ دراصل مطلوبہ نظام کے حق میں افراد کی آمادگی کا نام ہے۔ اور افراد کے اندر جب تک ایک درجہ کی آمادگی نہ ہو، محض قانون کے زور پر اس کو نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

مزید یہ کہ اسلام کی رو سے اصلاح معاشرہ بجائے خود مطلوب چیز نہیں ہے۔ اسلام میں اصل مطلوب فرد کی اصلاح ہے۔ معاشرہ کی اصلاح صرف اس کا ایک ثانوی نتیجہ ہے۔ قرآن جس ایمان، تقویٰ اور فکر آخرت کی طرف بلاتا ہے اس کا تحقق فرد کے اندر ہوتا ہے نہ کہ کسی اجتماعی ہیئت کے اندر۔ اس لئے قرآنی دعوت کا اصل مخاطب فرد ہے، اور معاشرہ کی اصلاح افراد کی اصلاح کا اجتماعی ظہور۔

اے ایمان والو، جب تم کسی مقررہ مدت کے لئے ادھار کا لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو۔ اور اس کو لکھے تمھارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ۔ اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے، جیسا اللہ نے اس کو سکھایا اسی طرح اس کو چاہئے کہ لکھ دے۔ اور وہ شخص لکھوائے جس پر حق آتا ہے۔ اور وہ ڈرے اللہ سے جو اس کا رب ہے اور اس میں کوئی کمی نہ کرے۔ اور اگر وہ شخص جس پر حق آتا ہے بے سمجھ ہو یا کمزور ہو یا خود لکھوانے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو چاہئے کہ اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔ اور اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کو گواہ کر لو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں، ان لوگوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو، تاکہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا دے۔ اور گواہ انکار نہ کریں جب وہ بلائے جائیں۔ اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، میعاد کے تعین کے ساتھ اس کو لکھنے میں کاہلی نہ کرو۔ یہ لکھ لینا اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کا طریقہ ہے اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ قرین قیاس ہے کہ تم شبہ میں نہ پڑو۔ لیکن اگر کوئی سودا دست بدست ہو جس کا تم آپس میں لین دین کیا کرتے ہو تو تم پر کوئی الزام نہیں کہ تم اس کو نہ لکھو۔ مگر جب یہ سودا کرو تو گواہ بنا لیا کرو۔ اور کسی لکھنے والے کو یا گواہ کو تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ اور اگر ایسا کرو گے تو یہ تمھارے لئے گناہ کی بات ہوگی۔ اور اللہ سے ڈرو، اللہ تم کو سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ تو رہن رکھنے کی چیزیں قبضہ میں دے دی جائیں۔ اور اگر ایک دوسرے کا اعتبار کرتا ہو تو چاہئے کہ جس پر اعتبار کیا گیا وہ اعتبار کو پورا کرے۔ اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ اور گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو شخص چھپائے گا اس کا دل گنہ گار ہوگا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس کو جاننے والا ہے ۲۸۲ — ۸۳

دو آدمیوں کے درمیان نقد معاملہ ہو تو لین دین ہو کر اسی وقت معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ مگر ادھار معاملات کی نوعیت مختلف ہے۔ ادھار معاملہ میں اگر ساری بات زبانی ہو تو کاغذی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے بعد کو اختلاف پیدا ہونے کا امکان رہتا ہے۔ طرفین اپنے اپنے مطابق معاملہ کی تصویر پیش کرتے ہیں اور کوئی ایسی قطعی بنیاد نہیں ہوتی جس کی روشنی میں صحیح فیصلہ کیا جا سکے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادائگی کے وقت اکثر دونوں کو ایک دوسرے سے شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کا حل تحریر ہے۔ نقد معاملہ کو لکھ لیا جائے تو وہ بھی بہتر ہے۔ مگر ادھار معاملات کے لئے تو ضروری ہے کہ ان کو باقاعدہ تحریر میں لایا جائے اور اس پر گواہ بنائے جائیں۔ اختلاف کے وقت یہی تحریر فیصلہ کی بنیاد ہوگی۔ — یہ مسلمان کے لئے تقویٰ اور عدل کی ایک حفاظتی تدبیر ہے۔ کتابت شدہ شرائط کے مطابق وہ اپنے حقوق کو ادا کر کے خدا اور خلق کے سامنے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

مسلمان خدا کے دین کے گواہ ہیں۔ جس طرح اللہ کی بات کو جانتے ہوئے چھپانا جائز نہیں، اسی طرح انسانی معاملات میں کسی کے پاس کوئی گواہی ہو تو اس کو چاہئے کہ اس کو ظاہر کر دے۔ گواہی کو چھپانا اپنے اندر مجرمانہ ذہن کی پرورش کرنا ہے اور معاملہ کے منصفانہ فیصلہ میں وہ حصہ ادا نہ کرنا ہے جو وہ کر سکتا ہے۔ انسان کا ضمیر چاہتا ہے کہ جب ایک چیز حق نظر آئے تو اس کے حق ہونے کا اعتراف کیا جائے۔ اور جب ایک چیز ناحق دکھائی دے تو اس کے ناحق ہونے کا اعلان کیا جائے۔ ایسی حالت میں جو شخص اپنے وقار اور مصلحت کی خاطر اپنی زبان کو بند رکھتا ہے وہ گویا ایسا مجرم ہے جو اپنے جرم پر خود ہی گواہ بن گیا ہو۔

اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ تم اپنے دل کی باتوں کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ پھر جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ رسول ایمان لایا ہے اس پر جو اس کے رب کی طرف سے اس پر اترا ہے۔ اور مسلمان بھی اس پر ایمان لائے ہیں۔ سب ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مانا۔ ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب۔ اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اللہ کسی پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ اس کو ملے گا وہی جو اس نے کمایا اور اس پر پڑے گا وہی جو اس نے کیا۔ اے ہمارے رب ہم کو نہ پکڑ اگر ہم بھولیں یا ہم غلطی کر جائیں۔ اے ہمارے رب ہم پر بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے ڈالا تھا ہم سے اگلوں پر۔ اے ہمارے رب ہم سے وہ نہ اٹھوا جس کی طاقت ہم کو نہیں۔ اور درگزر کر ہم سے۔ اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم کر۔ تو ہمارا کارساز ہے۔ پس انکار کرنے والوں کے مقابل میں ہماری مدد کر

۲۸۴ — ۸۶

کائنات کی ہر چیز اللہ کے زیر حکم ہے۔ ذرہ سے لے کر ستاروں تک سب خدا کے مقررہ نقشہ میں بندھے ہوئے ہیں۔ وہ اسی راستہ پر چل رہے ہیں جس پر چلنے کے لئے خدا نے ان کو پابند کر دیا ہے۔ مگر انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے کو خود مختار حالت میں پاتا ہے۔ بظاہر وہ آزاد ہے کہ اپنی مرضی سے جو راستہ چاہے اختیار کرے۔ مگر انسان کی آزادی مطلق نہیں ہے بلکہ امتحان کے لئے ہے۔ انسان کو بھی کائنات کے بقیہ اجزار کی طرح خدا کی پابندی کرنی ہے۔ جس پابند زندگی کو بقیہ کائنات نے بزور اختیار کیا ہے وہی پابند زندگی انسان کو اپنے ارادہ سے اختیار کرنا ہے۔ انسان کو ظاہری صورت حال سے دھوکا کھا کر یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی ہر وقت مالک کائنات کی نظر میں ہے، وہ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات کی نگرانی کر رہا ہے خواہ وہ اس کے اندر ہو یا اس کے باہر۔

وہ کون سا انسان ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔ وہ ایمان اور اطاعت والا انسان ہے۔ ایمان سے مراد آدمی کی شعوری حوالگی ہے اور اطاعت سے مراد اس کی عملی حوالگی۔ شعور کے اعتبار سے مطلوب ہے کہ آدمی اللہ کو اپنے خالق اور مالک کی حیثیت سے اپنے اندر اتارے۔ وہ اس حقیقت کو پا گیا ہو کہ کائنات کا نظام کوئی بے روح مشینی نظام نہیں ہے بلکہ ایک زندہ نظام ہے جس کو خدا اپنے فرماں بردار کارندوں کے ذریعہ چلا رہا ہے۔ اس نے خدا کے بندوں میں سے ان بندوں کو پہچان لیا ہو جن کو خدا نے اپنا پیغام پہنچانے کے لئے چنا۔ خدا نے انسانوں کی ہدایت کے لئے جو کتاب اتاری ہے اس کو وہ حقیقی معنوں میں اپنے فکر و خیال کا جزء بنا چکا ہو۔ رسالت اور پیغمبری اس کو پوری انسانی تاریخ میں ایک مسلسل واقعہ کی صورت میں نظر آنے لگے۔ ایمانیات کو اس طرح اپنے دل و دماغ میں بٹھا لینے کے بعد وہ اپنی زندگی ہمہ تن اس کے نقشہ پر ڈھال دے۔

پھر یہ ایمان و اطاعت اس کے لئے کوئی رسمی اور ظاہری معاملہ نہ ہو بلکہ وہ اس کی روح کو اس طرح گھلا دے کہ وہ اللہ کو پکارنے لگے۔ اس کا وجود خدا کی یاد میں ڈھل جائے۔ اس کی زندگی تمام تر خدا کے اوپر منحصر ہو جائے۔

آیاتہا ۲۰۰ سورۃ آل عمران مدنیۃ ۔ ۳ رکوعاتہا ۲۰

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

الف ل م ۔ اللہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ اور سب کا تھامنے والا ۔ اس نے تم پر کتاب اتاری حق کے ساتھ، سچا کرنے والی اس چیز کو جو اس کے آگے ہے اور اس نے تورات اور انجیل اتاری اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے اور اللہ نے فرقان اتارا ۔ بے شک جن لوگوں نے اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا ان کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ زبردست ہے، بدلہ لینے والا ہے ۔ بے شک اللہ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں ۔ وہی تمھاری صورت بناتا ہے ماں کے پیٹ میں جس طرح چاہتا ہے ۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے ۱-۶

کائنات کا خالق و مالک کوئی مشینی خدا نہیں بلکہ ایک زندہ اور باشعور خدا ہے ۔ اس نے ہر زمانہ میں انسان کے لئے رہنمائی بھیجی ۔ انھیں میں سے وہ کتابیں تھیں جو تورات و انجیل کی صورت میں پچھلے انبیاء پر اتاری گئیں ۔ مگر انسان ہمیشہ یہ کرتا رہا کہ اس نے اپنی تاویل و تشریح سے خدا کی تعلیمات کو طرح طرح کے معنی پہنائے اور خدا کے ایک دین کو کئی دین بنا ڈالا ۔ آخر اللہ نے اپنے طے شدہ منصوبہ کے مطابق آخری کتاب (قرآن) اتاری جو انسانوں کے لئے صحیح ہدایت نامہ بھی ہے اور اسی کے ساتھ وہ کسوٹی بھی جس سے حق و باطل کے درمیان فیصلہ کیا جاسکے ۔ قرآن بتاتا ہے کہ اللہ کا سچا دین کیا ہے اور وہ دین کون سا ہے جو لوگوں نے اپنی خود ساختہ تشریحات کے ذریعہ بنا رکھا ہے ۔ اب جو لوگ خدا کی کتاب کو نہ مانیں یا اپنی رایوں اور تعبیروں کے تحت گھڑے ہوئے دین کو نہ چھوڑیں وہ سخت سزا کے مستحق ہیں ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے آنکھ دی مگر روشنی آجانے کے باوجود انھوں نے نہ دیکھا ۔ جن کو خدا نے عقل دی مگر دلیل آجانے کے بعد بھی انھوں نے نہ سمجھا ۔ اپنی جھوٹی بڑائی کی خاطر وہ حق کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہوئے ۔

اللہ اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے کیسا ہے، اس کا حقیقی تعارف خود وہی کر سکتا ہے ۔ اس کی ہستی کا دوسری موجودات سے کیا تعلق ہے، اس کو بھی وہ خود ہی صحیح طور پر بتا سکتا ہے ۔ خدا نے اپنی کتاب میں اس کو اتنی واضح صورت میں بتا دیا ہے کہ جو شخص جاننا چاہے وہ ضرور جان لے ۔ یہی معاملہ انسان کے لئے ہدایت نامہ مقرر کرنے کا ہے ۔ انسان کی حقیقت کیا ہے اور وہ کون سا رویہ ہے جو انسان کی کامیابی کا ضامن ہے، اس کو بتانے کے لئے پوری کائنات کا علم درکار ہے ۔ انسان کے لئے صحیح رویہ وہی ہو سکتا ہے جو بقیہ کائنات سے ہم آہنگ ہو اور دنیا کے وسیع تر نظام سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہو ۔ انسان کے لئے صحیح راہ عمل کا تعین وہی کر سکتا ہے جو نہ صرف انسان کو پیدائش سے موت تک جانتا ہو بلکہ اس کو یہ بھی معلوم ہو کہ پیدائش سے پہلے کیا ہے اور موت کے بعد کیا ۔ ایسی ہستی خدا کے سوا کوئی دوسری نہیں ہو سکتی ۔ انسان کے لئے حقیقت پسندی یہ ہے کہ اس معاملہ میں وہ خدا پر بھروسہ کرے اور اس کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کو پورے یقین کے ساتھ پکڑ لے ۔

وہی ہے جس نے تمھارے اوپر کتاب اتاری۔ اس میں بعض آیتیں محکم ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں۔ اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔ پس جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں فتنہ کی تلاش میں اور اس کے مطلب کی تلاش میں۔ حالاں کہ ان کا مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ پختہ علم والے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے۔ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ اے ہمارے رب، ہمارے دلوں کو نہ پھیر جب کہ تو ہم کو ہدایت دے چکا۔ اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت دے۔ بے شک تو ہی سب کچھ دینے والا ہے۔ اے ہمارے رب، تو جمع کرنے والا ہے لوگوں کو ایک دن جس میں کوئی شبہ نہیں۔ بے شک اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا

۹ — ۷

قرآن میں دو طرح کے مضامین ہیں۔ ایک وہ جو انسان کی معلوم دنیا سے متعلق ہیں۔ مثلاً تاریخی واقعات، کائناتی نشانیاں، دنیوی زندگی کے احکام وغیرہ۔ دوسرے وہ جن کا تعلق ان غیبی امور سے ہے جو آج کے انسان کے لئے ناقابل ادراک ہیں۔ مثلاً خدا کی صفات، جنت دوزخ کے احوال، وغیرہ۔ پہلی قسم کی باتوں کو قرآن میں محکم انداز، بالفاظ دیگر براہ راست اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسری قسم کی باتیں انسان کی نامعلوم دنیا سے متعلق ہیں، وہ انسانی زبان کی گرفت میں نہیں آتیں۔ اس لئے ان کو متشابہ انداز یعنی تمثیل و تشبیہ کے اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً انسان کا ہاتھ کہا جائے تو یہ براہ راست زبان کی مثال ہے اور اللہ کا ہاتھ تمثیلی زبان کی مثال۔ جو لوگ اس فرق کو نہیں سمجھتے وہ متشابہ آیتوں کا مفہوم بھی اسی طرح متعین کرنے لگتے ہیں جس طرح محکم آیتوں کا مفہوم متعین کیا جاتا ہے۔ یہ اپنے فطری دائرہ سے باہر نکلنے کی کوشش ہے۔ اس قسم کی کوشش کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آدمی ہمیشہ بھٹکتا رہے اور کبھی منزل پر نہ پہنچے۔ کیوں کہ "انسان کے ہاتھ" کو متعین طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر "خدا کے ہاتھ" کو موجودہ عقل کے ساتھ متعین طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔

متشابہات کے سلسلہ میں صحیح علمی و عقلی موقف یہ ہے کہ آدمی اپنی محدودیت کا اعتراف کرے۔ جن باتوں کو وہ متعین صورت میں اپنے حواس کی گرفت میں نہیں لا سکتا ان کے مجمل تصور پر قناعت کرے۔ جب حواس کی محدودیت کی وجہ سے انسان کے لئے ان حقائق کا کلی احاطہ ممکن نہیں تو حقیقت پسندی یہ ہے کہ ان امور میں تعینات کی بحث نہ چھیڑی جائے۔ اس کے بجائے اللہ سے دعا کرنا چاہئے کہ وہ آدمی کو اس قسم کی بے نتیجہ بحثوں میں الجھنے سے بچائے۔ وہ آدمی کو ایسی عقل سلیم دے جو اپنے مقام کو پہچانے اور ان حقائق کے مجمل یقین پر راضی ہو جائے۔ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب کہ یہ حقیقتیں اپنی تفصیلی صورت میں کھل کر سامنے آجائیں مگر آدمی جب تک امتحان کی دنیا میں ہے ایسا ہونا ممکن نہیں۔

جس طرح راستہ کی پھسلن ہوتی ہے اسی طرح عقل کے سفر کی بھی پھسلن ہے۔ اور عقل کی پھسلن یہ ہے کہ کسی معاملہ کو آدمی اس کے صحیح رخ سے نہ دیکھے۔ کسی چیز کی حقیقت آدمی اسی وقت سمجھتا ہے جب کہ وہ اس کو اس رخ سے دیکھے جس رخ سے اس کو دیکھنا چاہئے۔ اگر وہ کسی اور رخ سے دیکھنے لگے تو عین ممکن ہے کہ وہ صحیح رائے قائم نہ کر سکے اور غلط فہمیوں میں پڑ کر رہ جائے۔ سب سے بڑی دانائی یہ ہے کہ آدمی اس راز کو جان لے کہ کسی چیز کو دیکھنے کا صحیح ترین رخ کیا ہے۔

شکایت کے وقت حق پر قائم رہنا

قال عمر : ما عاقبتَ من عصی اللہ فیك بمثل ان تطیع اللہ فیه (تفسیر ابن کثیر جلد ثالث، صفحہ ۲۶) — عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جو شخص تمھارے بارے میں اللہ کی نافرمانی کرے، تم اس کے بارے میں اللہ کی اطاعت کرو۔ یہی اس کا سب سے بہتر بدلہ ہے۔

بے خوف انسان ایمانی جذبات کو سمجھ نہیں سکتا

بزار نے ابوسلمہ رض اور ابو ہریرہ رض سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ میں ایک لشکر بھیجنا چاہتا ہوں، تم لوگ اس کے خرچ کے لئے صدقہ دو۔ عبدالرحمٰن بن عوف رض ایک تاجر آدمی تھے انھوں نے کہا اے خدا کے رسول! میرے پاس چار ہزار ہیں۔ دو ہزار میرے گھر والوں کے لئے ہیں اور دو ہزار میں اپنے رب کو قرض دیتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

بارك اللہ لك فیما اعطیت وبارك لك فیما امسکت — اللہ تمھیں اس چیز میں برکت دے جو تم نے دیا اور اس چیز میں برکت دے جو تم نے روکا

ابوعقیل انصاری رض ایک غریب آدمی تھے۔ انھوں نے ساری رات ایک باغ والے کے یہاں بیٹھ پر پانی لاد کر سینچائی کی۔ اس کی مزدوری میں ان کو دو صاع (سات سیر) کھجوریں ملیں۔ انھوں نے ایک صاع کھجور اپنے گھر والوں کے لئے چھوڑی اور ایک صاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی۔ آپ نے ان کے لئے بھی برکت کی دعا فرمائی جس طرح عبدالرحمٰن بن عوف رض کے لئے کی تھی۔

مگر مدینہ کے منافقین نے دونوں پر طعن و طنز شروع کر دیا۔ عبدالرحمٰن بن عوف رض کے متعلق کہا: اس شخص نے محض دکھانے کے لئے دیا ہے (ما اعطی الا ریاء) دوسری طرف ابوعقیل رض کی بابت کہا: "اللہ اور رسول کیا اس کے اس صاع سے مستغنی نہ تھے۔"

انسان سے کچھ نہ مانگنا

ثوبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من یکفل لی ان لا یسئال الناس شیئًا اتکفل له بالجنة (کون مجھ سے اس بات کا کفیل بنتا ہے کہ وہ کسی سے کسی چیز کا سوال نہ کرے گا) حضرت ثوبان رض نے کہا "میں"۔ چنانچہ اس کے بعد وہ کسی شخص سے کسی بھی چیز کا سوال نہیں کرتے تھے (احمد، نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد)

کیفیات کے لئے حالات ضروری ہیں

ترمذی نے ابوامامہ رض سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس خدا کا فرشتہ آیا اور کہا اے محمد! اللہ نے آپ کو سلام کہا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر تم چاہو تو مکہ کے پتھریلے میدان کو تمھارے لئے سونے سے بدل دیا جائے۔ آپ نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا اور کہا:

لا یارب، ولکن اشبع یوما واجوع یوما۔ فاذا جعت — اے میرے رب نہیں۔ بلکہ مجھے یہ پسند ہے کہ ایک دن سیر ہو کر

تضرعت الیک وذکرتک واذا شبعت شکرتک وحمدتک
کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔ جب مجھے بھوک لگے تو میں تجھ سے گڑگڑا کر مانگوں اور جب سیری ہو تو میں تیرا شکر کروں اور تیری تعریف کروں

قلب کا سخت ہو جانا سب سے بڑی سزا

قال مالک بن دینار ماضرب عبد بعقوبۃ اعظم من قسوۃ القلب (دوم ۸)
مالک بن دینار نے کہا۔ دل کی سختی سے زیادہ بڑی سزا کبھی کسی بندے کو نہیں دی گئی

اللہ کی راہ میں جان و مال خرچ نہ کرنا ہلاکت ہے

ابو عمران رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ ہم لوگ قسطنطنیہ کے غزوہ میں تھے۔ ہمارے امیر لشکر عبدالرحمن بن خالد بن ولید تھے۔ رومیوں کی طرف سے ایک بڑی فوج نکلی۔ ہماری طرف سے ایک مہاجر نے نکل کر رومیوں پر حملہ کیا اور ان کی صفوں کو توڑ دیا۔ یہ دیکھ کر ہم میں سے کچھ لوگوں نے کہا: القی بیدہ الی التھلکۃ (اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا) ہمارے لشکر میں ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے کہا: نحن اعلم بھذہ الآیۃ انما نزلت فینا (ہم انصاری اس آیت کی بابت زیادہ جانتے ہیں۔ کیوں کہ وہ ہمارے بارے میں اتری تھی) پھر انھوں نے بتایا کہ جب اللہ نے اپنے نبی کی مدد فرمائی اور اسلام غالب ہو گیا تو ہم نے آپس میں کہا: آؤ اب اپنی جائدادوں میں رہیں اور اپنے مال کی طرف توجہ دیں۔ اس وقت اللہ نے یہ آیت اتاری: وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ (اللہ کے راستہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو):

فالالقاء بایدینا الی التھلکۃ ان نقیم فی اموالنا ونصلحھا وندع الجھاد (تفسیر ابن کثیر جلد اول)
پس اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا یہ ہے کہ ہم اپنے مالوں میں ٹھہریں اور اس کی درستی میں لگیں اور جہاد کو چھوڑ دیں

ناراضگی کے وقت کسی کی بربادی کے درپے نہ ہو جاؤ

عن اسلم عن عمرؓ قال لا یکن حبک کلفا ولا بغضک تلفا۔ فقلت کیف ذالک۔ قال اذا احببت کلفت کلف الصبی واذا ابغضت احببت لصاحبک التلف (الادب المفرد، صفحہ ۱۹۱)
عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کسی کے ساتھ محبت میں دیوانے نہ ہو جاؤ اور دشمنی کے وقت اس کو تکلیف پہنچانے نہ لگو۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا وہ کیسے۔ آپ نے کہا: اس طرح کہ جب تم محبت کرو تو بچوں کی مانند محبت کرو اور جب کسی سے ناراض ہو تو اس کی تباہی و بربادی چاہو۔

جان اور مال کی قربانی کے بغیر جنت نہیں

بشیر بن خصاصیہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیعت کے لئے آیا۔ میں نے پوچھا: اے خدا کے رسول! آپ مجھ سے کس چیز پر بیعت لیں گے۔ آپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور کہا: گواہی دو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ پانچ وقت کی نمازیں ان کے وقتوں پر ادا کرو۔ زکوٰۃ دو۔ رمضان کے

روزے رکھو، بیت اللہ کا حج کرو، اللہ کے راستہ میں جہاد کرو"۔ میں نے کہا: "اے خدا کے رسول میں سب کروں گا۔ مگر ان میں سے دو کی میرے اندر طاقت نہیں، ایک زکوٰۃ۔ خدا کی قسم میرے پاس صرف دس اونٹنیاں ہیں۔ انھیں کا دودھ میرے گھر والوں کی خوراک ہے اور یہی ان کی سواری اور بار برداری کا ذریعہ ہیں۔ دوسرے جہاد۔ میں ایک کمزور دل کا آدمی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ جس نے جہاد سے پیٹھ پھیری وہ اللہ کے غضب میں آگیا۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر جنگ میں شرکت کرنی پڑی تو مجھ پر ڈر غالب آجائے اور میں بھاگ کھڑا ہوں۔ اور اللہ کے غضب کا مستحق بن جاؤں"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا:

يا بشير لا صدقة ولاجهاد فبم اذن تدخل الجنة (کنز العمال)

اے بشیر! نہ صدقہ نہ جہاد، پھر کیسے تم جنت میں داخل ہوگے

سوال اور غیر سوال کا فرق

مالک نے عطاء بن یسار سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عطیہ بھیجا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو واپس کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا: تم نے کیوں اس کو واپس کر دیا۔ انھوں نے کہا: اے خدا کے رسول! کیا آپ نے ہم کو نہیں بتایا کہ ہم میں سے ہر ایک کی بھلائی اس میں ہے کہ وہ کسی سے کوئی چیز نہ لے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انما ذلك عن المسألة، فاما ماكان عن غير مسألة فانما هو رزق يرزقكه الله

وہ بات میں نے سوال کے بارہ میں کہی تھی۔ مگر جو چیز بغیر سوال کے آئے تو وہ رزق ہے جو اللہ نے تم کو دیا ہے۔

عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اب کسی چیز کے لئے میں کسی سے سوال نہیں کروں گا۔ مگر جو چیز بغیر سوال کے میرے پاس آئے گی اس کو ضرور لوں گا۔

شہرت سے دور بھاگنا

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بعد کے زمانہ میں بکریاں چرانے لگے تھے۔ وہ مدینہ سے دور ایک میدان میں اپنی بکریاں چرا رہے تھے کہ ایک روز ان کے لڑکے عمرو بن سعد سوار ہو کر ان کے پاس آئے اور کہا کہ کیا آپ نے اس کو پسند کیا ہے کہ بھیڑ بکریوں میں بدو بنے رہیں۔ حالاں کہ لوگ مدینہ میں حکومت و سیاست کے معاملات پر بحثیں کر رہے ہیں۔ حضرت سعد رضی نے اپنے بیٹے کے سینے پر ہاتھ مارا اور کہا: چپ رہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ اپنے اس بندے کو پسند کرتا ہے جو ڈرنے والا ہو، بے نیاز ہو اور لوگوں سے چھپا ہوا ہو (اسکت اني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ان الله يحب العبد التقي الغني الخفي، مسلم)

علم نام ہے اللہ سے خوف کا

عن عون بن عبد الله قال قال عبد الله بن مسعود ليس العلم بكثرة الرواية انما العلم خشية الله

عبد اللہ بن مسعود نے کہا، علم کثرت روایت کا نام نہیں ہے علم یہ ہے کہ آدمی اللہ رب العالمین سے ڈرنے لگے۔

مذہب کیا ہے

مذہب کا عام تصور یہ ہے کہ مذہب کسی فرد کا ایک خالصتہً نجی معاملہ ہے۔ اس کے ردعمل میں دوسرا تصور یہ پیدا ہوا کہ مذہب مکمل طور پر ایک اجتماعی معاملہ ہے۔ یہ دونوں، یکسر غلط نہ ہونے کے باوجود، اصل حقیقت کی صرف ادھوری تشریح ہیں۔ دونوں میں سے کوئی جملہ صحیح طور پر اس نوعیت کو واضح نہیں کرتا جو مذہب اور انسان کے درمیان ہے یا ہونا چاہئے۔ اصل یہ ہے کہ مذہب انسان کے لئے روحانی طور پر وہی ہے جو مادی طور پر اس کے لئے خون ہے۔ خون سارے بدن کی زندگی ہے۔ وہ پورے جسم کو متحرک کرتا ہے۔ اسی طرح مذہب ایک انسان کی زندگی ہے۔ وہ اس کے پورے وجود کے حرکت وعمل کو کنٹرول کرتا ہے۔ مذہب آدمی کا طرز فکر ہے، وہ آدمی کا شعور ہے۔ وہ ایک ایسی چیز ہے جو روح کی تڑپ بن جاتی ہے۔ مذہب جب اس طرح کسی کے اندر داخل ہو جائے تو انفرادی یا اجتماعی الفاظ اس کے لئے اضافی بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد جو واقعہ ظہور میں آتا ہے وہ یہ کہ آدمی کی زندگی اندر سے باہر تک مذہب میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ مذہب کی فکر سے سوچتا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں مذہب کے تابع ہو جاتی ہیں۔ جو عمل بھی اس سے ظاہر ہوتا ہے، مذہب کے زیر اثر ظاہر ہوتا ہے۔ مذہب اس کے لئے ایک ایسا رنگ بن جاتا ہے جس میں اس کی پوری زندگی رنگ اٹھتی ہے، اندر بھی اور باہر بھی۔ کسی آدمی کا مذہب وہ رسمی عقیدہ نہیں ہے جس کو اس نے انفرادی عقیدہ کے طور پر اختیار کیا ہو۔ اسی طرح کسی آدمی کا مذہب وہ خشک نظریہ نہیں ہے جس کو اس نے اجتماعی نظریہ کے عنوان سے اپنی تقریر وتحریر کا موضوع بنا رکھا ہو۔ آدمی کا مذہب حقیقتہً وہ فکر ہے جو آدمی پر اس طرح چھا جائے کہ اس کی پوری ہستی اس میں نہا اٹھے۔ اس اعتبار سے آدمی جس چیز کو اختیار کرے وہی اس کا مذہب ہے خواہ وہ معروف معنوں میں کوئی مذہب ہو یا مذہب کے علاوہ کوئی چیز۔

انسان اپنے وجود کے اعتبار سے ایک ہم آہنگ کل ہے۔ اسی طرح وہ ایک ایسا فکر چاہتا ہے جو ہم آہنگ کل کی حیثیت رکھتا ہو۔ انسان کی ہستی اس وقت مکمل ہوتی ہے جب کہ اس کے وجود کے مختلف حصے اور اس کی مختلف صلاحیتیں ایک "انا" کا جزو بن گئی ہوں۔ یہی حال فکر کے معاملہ کا بھی ہے۔ آدمی ایک کلی فکر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مختلف حواس کے ذریعہ وہ جو معلومات حاصل کرتا ہے ان کو جوڑ کر جب تک وہ ایک ہم آہنگ فکری مجموعہ کی حیثیت نہ دے لے وہ مطمئن نہیں ہو سکتا۔ خواہ اس کا کلی فکر حقیقت پر مبنی ہو یا اس نے فرضی طور پر اپنا ایک فکری ڈھانچہ بنا لیا ہو۔ اس اعتبار سے تاریخ میں اب تک جتنے فکری نظام سامنے آئے ہیں ان کو تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

GOD-CENTRED THINKING	یعنی خدا مرکزی فکر،	اس کا نمائندہ اسلام ہے
MAN-CENTRED THINKING	یعنی انسان مرکزی فکر،	اس کا نمائندہ ہندوازم ہے
SOCIETY-CENTRED THINKING	یعنی سماج مرکزی فکر،	اس کا نمائندہ سوشلزم ہے

اسلام خدا مرکزی دین ہے۔ مگر جب بگاڑ آتا ہے تو لوگ اسلام کی ایسی تشریح کرنے لگتے ہیں جو عام انسانی یا سماجی تصورات کی طرف جھکی ہوئی ہو۔ خدا کا دین، اسلامی اصطلاحوں میں، انسان مرکزی دین بن جاتا ہے یا سماج مرکزی دین۔

دنیا پرستی اُن کا دین بھی ہے اور اِن کا بھی

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان دنیوی چیزوں (عرض دنیا) کا حریص ہے۔ جب کہ خدا یہ چاہتا ہے کہ وہ آخرت کو اپنا مقصود بنائے (انفال ۶۷) دنیا کی چیزوں کا شوق کرنا اور ان کی طرف دوڑنا انسان کا عام مرض ہے۔ تمام خرابیوں کی اصل جڑ یہی ہے۔ خدا فراموشی اور بے انصافی کی تمام قسمیں اسی سے وجود میں آتی ہیں۔ جو لوگ خدا کے دین کو نہیں مانتے، وہ یہ کہہ کر دنیا طلبی میں مشغول ہوتے ہیں کہ "زندگی بس یہی موجودہ دنیا کی زندگی ہے۔ یہیں جینا اور یہیں مرجانا ہے۔ گردش ایام کے سوا اور کوئی چیز نہیں جو ہمارے اوپر حکمراں ہو (جاثیہ ۲۴) ان کے سوا وہ لوگ جو دین خدا کے قائل ہیں، ان کے درمیان دنیا طلبی اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ وہ دھیرے دھیرے یہ عقیدہ بنا لیتے ہیں کہ ہم خدا کے خاص بندے ہیں اور ہماری مغفرت ضرور ہو جائے گی (سیغفر لنا)۔ یہ عقیدہ ان کو خدا کی پکڑ اور آخرت کے عذاب سے بے خوف کر دیتا ہے۔ وہ اسی دنیا میں غرق ہو جاتے ہیں جس کی بابت ان کی آسمانی کتاب میں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ جو اس میں غرق ہوا اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں (بقرہ ۲۰۰) دین کے منکر جس دنیا پرستی کو آخرت کا انکار کر کے لئے ہوئے ہیں، اسی دنیا پرستی کو وہ اس احساس کے تحت اختیار کر لیتے ہیں کہ ہم آگ سے محفوظ لوگ ہیں، ہم جن نبیوں اور بزرگوں کو مانتے ہیں وہ بہرحال ہم کو خدا کے یہاں بخشوا لیں گے خواہ ہم جو کچھ کرتے رہیں۔ حتیٰ کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرے گروہ کی دنیا پرستی پہلے گروہ سے زیادہ بھیانک ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ وہ دوسروں کی طرح صرف دنیا حاصل کرنے پر نہیں رکتے بلکہ اپنی مخصوص نفسیات کے تحت یہ بھی کرتے ہیں کہ اپنی دنیا پرستانہ زندگی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اس کی دینی توجیہات شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح خود اللہ کے دین کو ایک دنیوی سودا بنا دیتے ہیں، وہ اپنی خلاف حق کارروائیوں میں اللہ کو بھی ایک فریق بنا لیتے ہیں

وہ دنیا کے مال و دولت پر فریفتہ ہو کر اس کے اوپر ٹوٹتے ہیں اور اس کے ساتھ کچھ رسمی قسم کی دین داری کر کے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ خدا کے دین پر قائم ہیں۔ وہ عہدہ اور شہرت اور لیڈری کے لئے اٹھتے ہیں اور کتاب آسمانی کے حوالے دے کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ عین خدا کے دین کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ ان کو اللہ کی طرف سے یہ مشن سپرد کیا جاتا ہے کہ وہ تمام انسانوں کو آنے والے ہولناک دن سے باخبر کریں مگر وہ سماجی امن، معاشی انصاف اور سیاسی اصلاح کے نام پر جلسوں اور جلوسوں کا طوفان مچاتے ہیں اور خدائی تعلیمات کی خودساختہ تشریح کر کے اعلان کرتے ہیں کہ وہ عین اسی کام کے لئے اٹھے ہیں جس کے لئے خدا نے اپنے نبیوں کو بھیجا تھا۔

مگر جو لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہوں، جو اپنے آپ کو اس اصلاحی نقشہ پر ڈھالنا چاہتے ہوں جو اللہ کو پسند ہے، وہ موجودہ عارضی دنیا کی چیزوں میں گم نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کی ابدی دنیا کو اپنا مقصود بنائیں گے۔ وہ نفسانی رجحانات سے آزاد ہو کر خدا کی کتاب کو پکڑیں گے۔ ان کا شعار اللہ کے آگے جھکنا ہوگا نہ کہ دنیوی مصالح کی پرستش کرنا (اعراف ۱۷۰) —— دنیا کی جن چیزوں کے پیچھے ایک گروہ دوڑ رہا ہے، انھیں کے پیچھے اگر دوسرا گروہ دوڑنے لگے تو وہ اس لئے نہیں چھوٹ جائے گا کہ اس نے دین کے نام پر ایسا کیا تھا۔

دنیا کی زندگی میں حقیقتوں سے پردہ نہیں ہٹایا گیا ہے۔ یہاں آدمی کے لئے ممکن ہے کہ وہ خوبصورت الفاظ میں اپنی اندرونی بے مائگی کو چھپا سکے۔ زرق برق سواریوں اور شان دار مجالس میں ظاہر ہو کر لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر سکے کہ جس شخص کے جلو میں اتنی عزتیں اور شوکتیں چل رہی ہیں وہ ضرور حق پر ہوگا۔ تاہم "خصام" کے وقت ایسے شخص کا بھرم کھل جاتا ہے۔ جب کسی سے اس کا جھگڑا پیش آجائے تو خوبصورت باتیں کرنے والا شخص فوراً بدکلامی پر اتر آتا ہے، وہ اپنے لبادہ کو اتار پھینکتا ہے۔ اس وقت لوگ دیکھتے ہیں کہ حسین پردہ کے اندر ایک بدہئیت انسان چھپا ہوا تھا۔ ایسے شخص کا حال یہ ہوتا ہے کہ جہاں صرف باتوں اور تقریروں کا جوہر دکھانا ہو وہاں تو وہ خوب اونچی اونچی باتیں کرتا ہے اس کی زبان سے قومی تعمیر، باہمی امن، بزرگوں کی روایات کا تحفظ اور معیاری انسانی سماج کے قیام کی باتیں نکلتی ہیں ۔ مگر تقریر کے اسٹیج سے اتر کر جب وہ اپنے عملی دائرہ میں آتا ہے جہاں اس کو خود ان اچھی باتوں کے قائم کرنے کا اختیار ہے جو اس نے اپنی تقریر میں کہی تھیں تو اچانک وہ بالکل دوسرا انسان بن جاتا ہے۔ یہاں وہ اپنی کبریائی قائم کرنے کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ خواہ اس کے نتیجہ میں خاندان برباد ہوں، کسی کی معاشیات تباہ ہو جائیں، ماحول میں اصلاح کے بجائے فساد برپا ہو۔ جب اس کو یاد دلایا جاتا ہے کہ تمھارا عمل تمھاری بات کے مطابق نہیں تو گھمنڈ کی نفسیات اس کے لئے اعتراف میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ وہ جانتے ہوئے بھی اپنے کو گڑھے میں گرا دیتا ہے۔

اللہ کے نزدیک ایسے خوش گفتاروں کی کوئی قیمت نہیں، اس کو تو وہ لوگ پسند ہیں جو اپنی زندگی کی قیمت پر حق کو اختیار کریں۔ جب حق کو قبول کرنے کے لئے اپنے کو بے عزت کرنے کا سوال ہو، جب اپنے مقابلہ میں دوسرے کی بڑائی کا اعتراف کرنا پڑے، جب دنیوی مصالح سے بے پروا ہو کر آگے بڑھنے کی ضرورت ہو تو آدمی ہچک کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی حصار کو توڑ کر آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کرتا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ یہی تو حق کی واحد قیمت ہے۔ اور جو شخص حق کی قیمت دینے کے لئے تیار نہ ہو وہ اس کا خریدار کیسے بن سکتا ہے۔

اللہ کو وہ بندے پسند ہیں جو اللہ کی طرف اس طرح بڑھیں کہ اپنی ذات اور اپنے قلب و دماغ کو انھوں نے ہمہ تن اللہ کے حوالے کر دیا ہو۔ اس کے سوا کسی اور کی وفاداری ان کے دل میں باقی نہ رہے۔ شیطان مختلف طریقوں سے آدمی کی وفاداری کو تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ کبھی مصلحتوں کو سامنے لاتا ہے، کبھی کسی فائدے کا لالچ دیتا ہے۔ کبھی کسی نقصان سے ڈراتا ہے۔ کبھی عزت کے سوال کو سامنے کھڑا کرتا ہے۔ اس قسم کے وساوس ڈال کر شیطان چاہتا ہے کہ آدمی خدا سے بس رسمی تعلق رکھے اور اپنے حقیقی معاملات اور اپنی روز و شب کی زندگی میں اپنی دل پسند راہوں پر چلتا رہے۔ "اسلام میں پورا داخل نہ ہونا" یہ ہے کہ آدمی عباداتی آداب میں خدا کے سامنے سر جھکائے مگر جب خدا کا کوئی بندہ اس کے سامنے خدا کی ایک دلیل پیش کرے تو وہ اس کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہ ہو۔ وہ نماز میں صف بندی کا اہتمام کرے مگر جب راہ خدا میں متحدہ جدوجہد کا سوال ہو تو اتحاد میں شامل نہ ہو۔ وہ قرآن کے الفاظ کو ادا کرنے میں مخارج کی درستگی پر خوب زور دے مگر قرآن میں اپنی زندگی کی رہنمائی ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرے۔ روزہ میں وہ کھانا پینا ترک کرنے میں کوتاہ نہ ہو مگر جھوٹ بولنے اور جھوٹے کام کرنے سے روزہ نہ رکھے۔

امتحان کس بات کا

قرآن میں آدم کا قصہ بتاتے ہوئے کہا گیا ہے: "اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب سجدہ میں گر پڑے۔ مگر ابلیس نے کہنا نہ مانا اور تکبر کیا اور انکار کرنے والا ہو گیا۔ اور ہم نے کہا: اے آدم تم اور تمھاری عورت جنت میں رہو اور اس میں سے بافراغت کھاؤ جہاں چاہو۔ مگر اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ تم ظالم قرار پاؤ گے۔ پھر شیطان نے دونوں کو لغزش میں مبتلا کر دیا اور ان کو اس عیش سے نکال دیا جس میں وہ تھے۔ ہم نے کہا: تم سب اترو۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تم کو زمین میں ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے ایک مدت تک (بقرہ)

اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں ابلیس نے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا۔ اس کی وجہ اس کا یہ احساس تھا کہ میں آدم سے بہتر ہوں (انا خیر منہ ص ۷۶) اس کے مقابلہ میں فرشتے ذاتی بڑائی کے احساس سے خالی تھے۔ وہ ساری بڑائی صرف اللہ کے لئے تسلیم کرتے تھے۔ اس لئے اللہ کا حکم پاتے ہی وہ ایک حقیر مخلوق کے آگے سجدے میں گر پڑے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے تخلیق کی ابتدا میں دو واضح کردار انسان کے سامنے رکھ دئے۔ ایک ابلیسی کردار۔ دوسرا ملکوتی کردار۔ ابلیس رات دن اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ وہ انسان کو اپنا ہم مسلک بنائے۔ مگر انسان کو تمام ترغیبات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو فرشتوں کا ہم مسلک بنانا ہے۔

کوئی دولت، شہرت، اقتدار میں بڑھ جائے تو آدمی جلنے لگتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے سوا کسی کو بڑا دیکھنا نہیں چاہتا غیر شخص کی زبان سے حق کا اعلان ہو تو وہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایسا کرنا دوسرے کی فکری عظمت تسلیم کرنے کے ہم معنی نظر آتا ہے۔ کسی پر تنقید کر دی جائے تو وہ بپھر اٹھتا ہے۔ کیوں کہ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ ناقد اس کی بڑائی کو چیلنج کر رہا ہے۔ خاموش تعمیری کام میں ساتھ دینے کے لئے بمشکل چند آدمی ملتے ہیں۔ اور کسی حکمراں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی تحریک چلائیے تو بھیڑ کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس قسم کی سیاست میں بڑے کی بڑائی کا انکار کرنے کے جذبہ کو تسکین مل رہی ہے۔ انسان کی اصل کمزوری ہے اپنے سوا کسی کے لئے بڑائی کو تسلیم نہ کرنا۔ اس کے مقابلہ میں انسان کی اصل خوبی اللہ کی نظر میں یہ ہے کہ آدمی ذاتی بڑائی کے احساس کو مٹا دے اور اللہ کا حکم آتے ہی فوراً جھک جائے خواہ یہ جھکنا اپنے سے کمتر کا اعتراف کرنے کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔

جو لوگ "ظالم" حکمرانوں کے خلاف اٹھتے ہیں بہت جلد ان کے گرد انسانوں کا غول جمع ہو جاتا ہے۔ ہجوم کو دیکھ کر اس قسم کے قائدین اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ ان کے ملک میں ظلم کرنے والا بس وہی ایک شخص ہے جو اقتدار کی گدی پر بیٹھا ہوا ہے۔ باقی تمام لوگ عدل و انصاف کے عاشق ہیں۔ اگر اس ظالم کو کسی طرح تخت سے ہٹا دیا جائے تو اس کے بعد ہر طرف انصاف کا سیلاب بہہ پڑے گا۔ ہر طرف امن کی ہوائیں چلنے لگیں گی۔ مگر یہ شدید ترین غلط فہمی ہے۔ "ظالم" کے اقتدار کو چیلنج کرنے والی تحریکوں کے گرد انسانوں کا غول حقیقۃً ملکوتی نفسیات کے تحت جمع نہیں ہوتا۔ یہ صرف اس غیر ملکوتی نفسیات کا نتیجہ ہوتا ہے جس کا شکار ہمیشہ تمام قومیں ہوتی رہی ہیں۔ کسی کے اقتدار کو چیلنج کرنا اس نفسیات کے لئے مرغوب ترین چیز ہے۔ جب کوئی قائد اس قسم کا منفی نعرہ

لے کر اٹھتا ہے تو یہ نفسیات مدد کرتی ہے اور لوگ بآسانی اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "ظلم" کو ہٹانے کے نام پر جتنی تیزی سے اتحاد قائم ہوتا ہے، "عدل" کو قائم کرنے کے وقت وہ اتنی ہی تیزی سے ختم ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے کو گرانے کے لئے اٹھنا غیر ملکوتی نفسیات کے تحت اٹھنا ہے۔ ایسی تحریکیں اٹھانا زمین میں فساد برپا کرنا ہے نہ کہ اصلاح اور انصاف قائم کرنا۔ بے دینی کو اگر دین کا نام دے دیا جائے تو محض نام کی وجہ سے وہ دین داری نہیں ہو جائے گی۔

ابلیس کو انسان کے اوپر کوئی اقتدار حاصل نہیں۔ اس کے بہکانے کا طریقہ تزئین (حجر ۳۹) ہے۔ یعنی غلط روش کو صحیح بنا کر دکھانا۔ اسی تدبیر کے ذریعہ وہ رات دن اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ انسان کو اپنا ہم مسلک بنائے۔ ہر وہ موقع جہاں حق کا تقاضا ہوتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کے سامنے "جھک" جائے، جہاں ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی اپنے مقابلہ میں دوسرے کی صداقت کا اعتراف کرے، بس وہیں ابلیس آجاتا ہے اور آدمی کی نفسیات میں داخل ہو کر اس کو اکسانے لگتا ہے کہ وہ فرشتوں والی روش پر نہ جائے اور اس کی اپنی روش کو اختیار کرے۔ وہ "جھکنے" کے بجائے انکار کا طریقہ اختیار کرے۔ انسانی تعلقات کی تمام برائیاں خواہ وہ خاندان کے اندر ہوں یا خاندان سے باہر، ہمیشہ کسی نہ کسی شکایت پر شروع ہوتی ہے۔ ایک خلاف مزاج بات آدمی کے سامنے آتی ہے اور اس پر وہ بپھر اٹھتا ہے۔ ہر ایسے موقع پر ایک طرف خالص حق کا تقاضا ہوتا ہے اور دوسری طرف انانیت اور بے انصافی کا۔ مگر آدمی حق کے تقاضے کو نظر انداز کر دیتا ہے اور اپنے بھائی کا عدو (دشمن) بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

موجودہ دنیا میں انسان کا اصل امتحان یہی ہے۔ اسی قسم کے معاملات میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ کون وہ تھا جو فرشتوں کی راہ پر چلا اور کون تھا جس نے ابلیس کے طریقہ کو اختیار کیا۔ کس نے ابدی جنت کا استحقاق پیدا کیا اور کون اس کا مستحق ٹھہرا کہ اس کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں دھکیل دیا جائے۔ جب بھی ایسا کوئی معاملہ پیش آتا ہے، اس وقت ایک روش وہ ہوتی ہے جو حق کے مطابق ہے۔ دوسری وہ ہوتی ہے جو ضد، نفرت، انانیت، خود غرضی اور انتقام جیسے جذبات سے ابھرتی ہے۔ دوبارہ وہ وقت آجاتا ہے جب کہ ایک شخص کی زندگی میں اس تاریخ کو دہرایا جائے جو تخلیق آدم کے وقت پیش آئی تھی۔ ایسے موقع پر خدا اپنے نبیوں کے ذریعہ بھیجی ہوئی ہدایت کی زبان میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ "اے بندے حق کے آگے جھک جا" دوسری طرف شیطان اس کو ورغلا رہا ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ انانیت والے اس طریقے کو اختیار کرے جو خود اس نے تخلیق آدم کے وقت اختیار کیا تھا۔ ساری انسانی تاریخ اسی دو طرفہ کشمکش کی داستان ہے۔ ہر شخص خواہ وہ امیر ہو یا غریب، جاہل ہو یا عالم، لیڈر ہو یا پیرو، عورت ہو یا مرد، سب اسی دو طرفہ پکار کے درمیان کھڑے ہوئے ہیں۔ کسی کے لئے یہ آزمائش روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں پیش آتی ہے اور کسی کے لئے بڑے بڑے قابل ذکر واقعات میں۔ کوئی اپنے پڑوسی، اپنے رشتہ دار، اپنے کرایہ دار، اپنے شریک تجارت کے مقابلہ میں اس امتحان میں کھڑا کیا جاتا ہے اور کوئی قوموں اور حکومتوں کے مقابلہ میں۔ ہر بار جب ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کسی معاملہ پر عداوت ابھرتی ہے تو اس امتحان کا وقت آجاتا ہے۔ اس وقت جو آدمی حق کے آگے "جھکنے" کی روش اختیار کرے، وہ فرشتوں کا ساتھی بنا اور جو شخص انانیت کے طریقہ پر چلے وہ ابلیس کی برادری میں شامل ہو گیا۔ ایک کے لئے ابدی جنت ہے اور دوسرے کے لئے ابدی جہنم۔

فطرت کی تصدیق

سیدھا رکھو اپنا رخ دین پر ایک طرف کا ہوکر۔ وہی فطرت اللہ کی جس پر پیدا کیا لوگوں کو۔ بدلنا نہیں ہے اللہ کے بنائے کو۔ یہی ہے دین سیدھا۔ مگر اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔ سب رجوع ہوکر اس کی طرف۔ اور اس سے ڈرتے رہو۔ اور قائم کرو نماز اور نہ ہو جاؤ شرک کرنے والوں میں۔ جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا اور ہوگئے فرقے فرقے۔ ہر گروہ اس پر نازاں ہے جو اس کے پاس ہے۔ اور جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کو پکارنے لگتے ہیں اس کی طرف رجوع ہوکر۔ پھر جب اللہ چکھاتا ہے ان کو اپنی طرف سے کچھ مہربانی تو ان میں سے کچھ لوگ اپنے رب کے ساتھ شریک کرنے لگتے ہیں۔ تاکہ منکر ہو جائیں ہمارے دئے ہوئے سے۔ پس چند روز فائدہ اٹھالو۔ جلد ہی تم جان لوگے (روم ۳۴-۳۰)

آدمی کیا ہے۔ امیدوں اور حوصلوں اور تمناؤں کا ایک مجموعہ۔ آدمی اپنی عین بناوٹ کے لحاظ سے ایک مرکز چاہتا ہے جس کی طرف وہ اپنی توجہات کو مرتکز کر دے، جس کی طرف وہ لپکے، جس کی یاد کو لئے ہوئے وہ سوئے اور جاگے، اپنے وجود کو ہمہ تن جس کے حوالے کر دے۔ جس طرح کسی آدمی کے بس میں نہیں کہ اپنے اندر سے کھانے اور پانی کی طلب کو ختم کر دے، اسی طرح کسی کے لئے ممکن نہیں کہ وہ ان احساسات سے اپنے آپ کو خالی کر سکے ——— آدمی جب ان پہلوؤں سے خدا کو اپنا مرکز توجہ بنائے تو یہ توحید ہے اور جب کوئی دوسری چیز اس کی توجہات کا مرکز بن جائے تو اسی کا نام شرک ہے۔

توحید یا خدا پرستی کے داخل فطرت ہونے کا یہاں ایک نہایت سادہ ثبوت دیا گیا ہے جس کا تجربہ کسی نہ کسی وقت ہر شخص کو ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ہر آدمی اپنے مشکل وقتوں میں خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ یہ فطرت انسانی کا ایسا تقاضا ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔ آدمی خواہ مشرک ہو یا منکر، جب ڈر کا لمحہ آتا ہے تو حقیقت کھل جاتی ہے اور اس کی فطرت بے اختیار اسی ایک خدا کو پکارنے لگتی ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ اسی بنا پر کسی نے کہا ہے کہ خدا اگر موجود نہ ہو تب بھی ضروری ہوگا کہ خدا کو ایجاد کیا جائے:

If God did not exist, it would be necessary to invent him

مطلب یہ کہ انسان خدا جیسی ایک ہستی کا اتنا زیادہ محتاج ہے کہ وہ اس سے کسی حال میں خالی نہیں رہ سکتا۔ حتیٰ کہ اگر خدا فی الواقع موجود نہ ہو تو وہ خود سے اپنا ایک معبود گھڑ لے گا اور اس کو خدا کی طرح پکارے گا۔ تاکہ اپنی فطرت میں چھپے ہوئے جذبات کو تسکین دے سکے۔

توحید کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ایک اللہ کو اپنا مرکز توجہ بنالے۔ مگر جب بگاڑ آتا ہے تو کچھ اشخاص لوگوں کا مرکز توجہ بن جاتے ہیں۔ ہر گروہ کسی زندہ یا مردہ شخصیت کے گرد جمع ہو جاتا ہے۔ ہر گروہ فضل و کمال کا ایک ایسا معیار بنا لیتا ہے جس میں اس کی اپنی محبوب شخصیت سب سے زیادہ اونچی دکھائی دے۔ اس طرح ہر گروہ کے گرد فرضی خوش خیالیوں کا ایک قلعہ تیار ہو جاتا ہے جس میں پناہ لے کر وہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنی دنیا و آخرت کو محفوظ کر لیا۔ اب خدا پرستی کے نام پر انسان پرستی دین میں داخل ہو جاتی ہے اور اسی کے ساتھ دوسرا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دین ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کئی دینوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

حق کا انکار کرنے والے

حق کا انکار کرنے کی وجہ عام طور پر دو ہوتی ہیں۔ ظلم اور علو (نمل ۱۴) ظالم سے مراد ہے غیر صحیح۔ یعنی وہ لوگ جو مفاد اور مصلحت کے پجاری ہوں۔ اور صحیح اور غلط کا فرق کئے بغیر زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور علو پسند وہ لوگ ہیں جو اپنے اندر کبر اور گھمنڈ کی نفسیات لئے ہوئے ہوں۔ ظلم کی پیدائش کی زمین اگر مفاد پرستی ہے تو علو کی پیدائش کی زمین خود پرستی۔

حق کی دعوت جب کھل کر سامنے آتی ہے تو وہ تمام لوگ اس سے متوحش ہو جاتے ہیں جو صحیح اور غلط کے جھنجھٹ میں پڑے بغیر دنیا سمیٹنے میں لگے ہوئے ہوں اور دل کے اندر کوئی خواہش پیدا ہوتے ہی کو اپنے لئے کافی معیار سمجھتے ہوں۔ ایسے لوگوں کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ حق کے پیغام کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بنائی ہوئی زندگی کو درہم برہم کر دیا جائے۔ ہاتھ پاؤں اور زبان پر روک، کمانے کے طریقوں میں حرام وحلال کا لحاظ، معاملات میں صحیح اور غلط کی تمیز، لوگوں کے ساتھ نمٹنے میں انصاف اور بے انصافی کا فرق، یہ چیزیں جو حق کا لازمی تقاضا ہوتی ہیں، ان کو جنجال نظر آتی ہیں۔ وہ اپنی آزاد زندگی پر روک لگانے کے لئے تیار نہیں ہوتے، اس لئے وہ حق کو قبول نہیں کرتے۔

دوسرا گروہ علو پسندوں کا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو حالات کسی اونچی گدی پر پہنچائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کو اپنے ماحول میں عزت اور شہرت کا مقام ملا ہوا ہوتا ہے۔ ان کے سامنے حق کی دعوت آتی ہے تو ان کو محسوس ہوتا ہے کہ اگر انھوں نے اس کے حق ہونے کا اقرار کر لیا تو ان کی بڑائی کا مقام ان سے چھن جائے گا۔ خاص طور پر وہ لوگ جو مذہب کی گدیوں پر بیٹھے ہوئے ہوں، وہ سب سے پہلے اس پیچیدگی کا شکار ہوتے ہیں۔ کیوں کہ وہ عوام کو یہ باور کرائے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ جس مذہب کے نمائندے ہیں وہی اصل مذہب ہے۔ ایسی حالت میں اپنے سے باہر کسی حق کو ماننا اپنے کو گدی سے اتارنے کے ہم معنی ہوتا ہے اور ملی ہوئی گدی سے اترنا آدمی کے لئے ہمیشہ مشکل ترین چیز رہا ہے۔ وہ دنیا میں اپنے وقار کو بچانے کی خاطر حق کا انکار کر دیتے ہیں، خواہ یہ انکار ان کے آخرت کے وقار کو مشتبہ بنا دے۔

ظلم اور علو میں مؤخر الذکر زیادہ شدید قسم کی رکاوٹ ہے۔ سورۂ یوسف میں مصر کی امرأۃ عزیز کا قصہ نقل ہوا ہے۔ وہ ایک وقت حضرت یوسف کی شدید مخالف بن گئی تھی۔ اس کے بعد حضرت یوسف کی براءت کا ایک چھوٹا سا واقعہ اس کے سامنے آیا یعنی خواب کے بارے میں آپ کی تعبیر کا صحیح ہو جانا۔ اس کو سن کر وہ پکار اٹھی: الآن حصحص الحق (اب حق بات ظاہر ہو گئی) دوسری طرف اسی مصر میں فرعون کے سامنے حضرت موسیٰ نے مسلسل بڑے بڑے معجزے دکھائے۔ مگر وہ آخر وقت تک آپ کی صداقت کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ عزیز مصر کی عورت کا معاملہ ظلم یعنی ذاتی مفاد یا ہوس کا معاملہ تھا۔ جب کہ فرعون مصر کا معاملہ علو یعنی کبر اور گھمنڈ کا معاملہ تھا۔ جو شخص ذاتی مفاد کی وجہ سے حق سے دور ہو وہ اگر اس کو قبول نہ کرے گا تو اس کا امکان ہے کہ وہ زبان سے اس کا اعتراف کرلے۔ مگر جو شخص اپنی برتری کے احساس کی وجہ سے حق سے دور ہو وہ نہ اس کو قبول کرے گا اور نہ اس کا اعتراف کرے گا۔ ایسا شخص اپنی متکبرانہ نفسیات کے تحت بنے ہوئے ذہنی خول میں زندگی گزارتا رہتا ہے۔ موت کے سوا کوئی چیز نہیں جو اس کے خود ساختہ ذہنی خول سے اس کو باہر لانے میں کامیاب ہو۔

دین میں الحاد

قرآن میں انسان کی جن گمراہیوں کا ذکر ہے ان میں سے ایک دین میں الحاد ہے۔ الحاد کے معنی ہیں انحراف۔ عربی میں کہتے ہیں الحد السھم الھدف یعنی تیر نشانہ کے ادھر ادھر سے نکل گیا، اصل نشانہ پر نہیں لگا۔ دین میں الحاد یہ ہے کہ دین کو اس کی اصل حیثیت میں لینے کے بجائے کسی بدلی ہوئی حیثیت میں لینا۔ مثلاً اللہ کے نام (اسمار حسنیٰ) ہم کو اس لئے بتلائے گئے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ہم اللہ کی برتری اور کمال کا تصور کریں اور اس کے مقابلہ میں اپنے عجز کا ادراک کرکے اپنے آپ کو اس کے آگے ڈال دیں۔ اسمار حسنیٰ سے اپنے لئے اس قسم کی غذا لینا دین کو اس کی اصل حیثیت میں لینا ہے۔ اس کے بجائے اسمار حسنیٰ میں الحاد یہ ہے کہ اس کو سحر اور سفلی عملیات کے لئے استعمال کیا جائے۔ یا مثلاً اللہ کو قرآن میں ملک (بادشاہ) کہا گیا ہے۔ اب دنیوی بادشاہ پہ قیاس کرتے ہوئے یہ نظریہ بنایا جائے کہ جس طرح بادشاہوں کے یہاں کچھ مصاحب اور مقرب ہوتے ہیں اسی طرح خدا کے بھی مصاحب اور مقرب ہیں اور وہ ان کی سفارش کو اسی طرح سنتا ہے جس طرح دنیوی بادشاہ اپنے مصاحب اور مقرب کی سفارش کو سنتے ہیں۔

دین میں اس قسم کا الحاد یا انحراف اس کی تمام تعلیمات میں ہوتا ہے۔ آدمی دین کی اصل شاہراہ سے ہٹ کر کسی اور سمت میں چل پڑتا ہے اور لفظی تاویلات کے ذریعہ اپنے کو سمجھاتا رہتا ہے کہ وہ دین خداوندی پر قائم ہے۔ کچھ لوگ اللہ کے نام اور کلام کو عملیاتی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس طرح "اسلامی عملیات" کے نام سے سحر و کہانت کو اسلام میں داخل کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ اسلام کے آداب اور عبادات کو مال و اولاد کی برکت کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور اس طرح اسلام کو اپنی مادہ پرستانہ زندگی کا ضمیمہ بنا لیتے ہیں۔ کچھ لوگ قومی مسائل کے لئے احتجاج اور مطالبات اور دوروں اور تقریروں میں مشغول ہوتے ہیں اور اپنی اس قوم پرستانہ مہم کو اسلام کی اصطلاحات میں بیان کرکے ظاہر کرتے ہیں کہ یہی اسلام کا اصل مدعا ہے۔ کچھ لوگ اقتدار اور لیڈری کے لئے سرگرم ہوتے ہیں اور قرآن و حدیث کی تاویل کرکے ظاہر کرتے ہیں کہ یہی اسلامی سیاست ہے اور وہ اسلام کی سیاسی سربلندی قائم کرنے کے لئے کام کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ دینی مسائل میں خود ساختہ بحثیں اور موشگافیاں نکالتے ہیں اور اس کی بنیاد پر ادارے قائم کرکے کہتے ہیں کہ وہ دینی تعلیم کا کام کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ عملیاتی مشقیں ایجاد کرتے ہیں اور اس کو اسلام کا نام دے کر کہتے ہیں کہ یہ اسلامی روحانیت ہے۔ کچھ لوگ جدال اور مناظرہ کے اکھاڑے قائم کرتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ اسلام کی تبلیغ کا کام کر رہے ہیں۔ یہ سب دین میں الحاد ہے۔ اس قسم کا الحاد آدمی کو دین سے دور کرنے والا ہے، خواہ وہ اپنے آپ کو کتنا ہی دین سے قریب سمجھتا ہو۔

دین میں الحاد یہ ہے کہ دنیا کو دنیا کے نام پر کرنے کے بجائے دنیا کو دین کے نام پر کیا جانے لگے۔ آدمی اپنی نمود و نمائش کے لئے اٹھے اور اس کو دین کا نام دے۔ وہ اپنے دنیوی حوصلوں کو پورے کرنے کے لئے سرگرم ہو اور یہ اعلان کرے کہ وہ اسلام کو زندہ کرنے کے لئے اٹھا ہے۔ وہ اپنے سیاسی ذوق کی تسکین کے لئے کام کرے اور ثابت کرے کہ یہی قرآن و سنت کا عین مدعا ہے۔ اسلام یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اسلام کے پیچھے چلائے۔ اس کے برعکس آدمی جب ایسا کرے کہ وہ اپنی پسند کے مطابق چلے اور اسلام کی تاویل کرکے اس کو اپنے مطابق ڈھال لے تو یہ الحاد ہے جو اللہ کے نزدیک سخت گناہ ہے۔

قولی ایمان اور قلبی ایمان

قرآن کے مطابق ایمان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو زبان سے ایمان کے کلمات بول دینے کے ہم معنی ہو۔ دوسرا وہ جب کہ آدمی کا ایمان اس کے قلب کے اندر داخل ہو جائے۔ (توبہ) ایک کو قولی ایمان اور دوسرے کو قلبی ایمان کہہ سکتے ہیں۔

قولی ایمان کا ابتدائی مطلب یہ ہے کہ آدمی زبان سے ایمان کا کلمہ بول دے مگر اس کا ایمان عملی اطاعت نہ بنے۔ وہ زبان سے کہے کہ "میں اللہ اور رسول پر ایمان لایا" مگر روزانہ کی زندگی میں اس کی دلچسپیاں اور مختلف معاملات میں اس کی سرگرمیاں اللہ اور رسول سے آزاد ہو کر بسر ہو رہی ہوں۔ اللہ اس کی توجہ کا مرکز نہ بنے اور رسول کو وہ اپنی زندگی کے لئے نمونہ نہ ٹھہرائے۔ اس کی زندگی بھی عملاً ویسی ہی ہو جیسی ان لوگوں کی ہوتی ہے جنھوں نے ایمان کا اقرار نہیں کیا ہے۔ اس کا قلب اللہ کی یاد سے خالی ہو اور اس کی کارروائیاں اللہ کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر نہ آئیں۔ جب کسی کا یہ حال ہو تو کہا جائے گا کہ اس نے ایمان کا کلمہ تو بول دیا ہے مگر وہ اس کے دل میں اس طرح داخل نہیں ہوا ہے کہ وہ اس کی پوری ہستی میں سما جائے اور اس کی زندگی کو بدل دے۔

جب آدمی قولی ایمان کی سطح پر ہو تو اس کا ایمان اس کو جو چیز دیتا ہے وہ بس قولی بحثیں ہیں۔ اس کو اپنی خامیوں سے زیادہ دوسروں کی خامیوں کی خبر ہوتی ہے جس کو وہ جوش کے ساتھ بیان کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے لئے ایسے مشاغل ڈھونڈ لیتا ہے جس میں تقریروں اور اخباری بیانات جیسے "قولی" کارناموں کے ذریعہ اسلام اور ملت اسلام کی خدمت کا کریڈٹ ملتا ہو۔ اس کو ایسے پروگرام حاصل ہو جاتے ہیں جس میں دوسروں کے خلاف الفاظ کا طوفان برپا کرنا یا دوسروں کے خلاف سیاسی اکھیڑ پچھاڑ کرنا وہ چیز ہو جس پر اسلامی نظام قائم کرنے کا تمغہ عطا کیا جائے۔ وہ اسلام پر بحث و مباحثہ کی بے شمار ایسی صورتیں دریافت کر لیتا ہے جس میں دنیا کی ہر چیز زیر بحث آئے مگر اس کی اپنی ذات ہمیشہ مستثنیٰ رہے۔

قلبی ایمان کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ قلبی ایمان جب کسی کو ملتا ہے تو وہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے گلاس کے پانی میں رنگ پڑ جائے۔ ایسا ایمان اس کی پوری ہستی میں تیر جاتا ہے۔ وہ اس کے قلب و دماغ میں سما جاتا ہے، وہ اس کی آنکھ بن جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے۔ وہ اس کا کان بن جاتا ہے جس سے وہ سنتا ہے۔ وہ اس کا ذہن بن جاتا ہے جس سے وہ سوچتا ہے۔ وہ اس کے دل دھڑکن اور اس کی توجہات کا مرکز ہوتا ہے۔ وہ اسی کی یاد لے کر سوتا ہے اور اسی کی یاد لے کر جاگتا ہے۔ ایسا ایمان آدمی کو فکر و خیال کی ایک ابدی دنیا دے دیتا ہے جس میں وہ جئے۔ وہ اس کو نظر آنے والی کائنات کے اندر ایک اور کائنات کا تجربہ کرا دیتا ہے جس کا وہ باسی بنے۔ ایسے آدمی کے قدم دنیا میں چلتے ہیں مگر اس کے احساسات خدا میں گم رہتے ہیں۔ وہ بظاہر دنیا کی چیزوں کو برتتا ہے مگر "حقیقۃً" وہ آخرت کے عالم میں سانس لینے لگتا ہے۔ اس کا ایمان اس کے لئے خدا سے ملنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

قلب کی سطح پر جس کو ایمان ملتا ہے تو وہ اس کی زندگی کا محض ایک رسمی ضمیمہ نہیں ہوتا بلکہ وہی اس کی کل زندگی بن جاتا ہے وہ اس کے لئے بے روح عملیات کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ وہی اس کی اصل ہستی ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ اپنی صبح و شام کرتا ہے۔ اس کے لئے ایمان خارجی دنیا پر غور و بحث کا عنوان نہیں ہوتا بلکہ خود اپنا احتساب کرنے کا عنوان ہوتا ہے۔ وہ باہر کے ظالموں کو اقتدار

سے بے دخل کرنے کے بجائے اس جدوجہد میں لگ جاتا ہے کہ اپنے دل کی سلطنت سے نفس اور شیطان کو بے دخل کرے۔ الفاظ کے کارنامے دکھانے سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس وہ خاموشی اور گم نامی کی دنیا میں اسلامی تعمیر کا محل کھڑا کرتا ہے۔ عوامی اسٹیج پر مظاہرے کرنا اس کو بے معنی معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس کے بجائے وہ اس بزم کا ہم نشین بن جاتا ہے جہاں خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کے نیک بندوں کی محفل لگی ہوئی ہے۔ اس کا عمل وہ عمل بن جاتا ہے جو خدا کو عمل نظر آئے نہ کہ وہ عمل جو انسانوں کو عمل دکھائی دیتا ہے مگر خدا کے یہاں اس کی کوئی عملی قیمت نہیں ہوتی۔

ایک لیڈر کو شہرت کے کاموں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ ان راہوں میں دوڑتا ہے جو اس کی عوامی مقبولیت کو بڑھائے، جس سے اس کے جاہ و مرتبہ میں اضافہ ہو۔ اس کے گرد و پیش کتنے ہی خشک ذمہ داریوں والے انتہائی ضروری کام موجود ہوتے ہیں مگر وہ اس کو نظر نہیں آتے۔ حتیٰ کہ توجہ دلانے پر بھی وہ ان کی اہمیت کو اور ان کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کرتا۔ البتہ اس کا ذہن ایسے کاموں کو دریافت کرنے میں بہت زرخیز ہوتا ہے جس کے عنوان پر وہ پریس کانفرنس کر سکے۔ جس کے ذریعہ وہ اخبار کی سرخیوں میں نمایاں ہو۔ جو اس کو بڑی بڑی شخصیتوں سے ملاقات کے مواقع فراہم کرتے ہوں۔ جو اس کو ٹرنک کال کرنے اور ہوائی جہاز پر ادھر سے اُدھر اُڑنے کا جواز عطا کرتے ہوں۔ جن کے نتیجہ میں اس کو یہ موقع ملے کہ وہ سجے ہوئے پنڈال میں کھڑے ہو کر الفاظ کا دریا بہائے اور لوگوں سے تالیاں اور استقبالیے وصول کرے۔ مگر اللہ کے سچے بندے کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ خدا کی طرف بھاگنے والا ہوتا ہے نہ کہ شہرت کے کاموں کی طرف بھاگنے والا۔ اس کو ان کاموں سے دلچسپی ہوتی ہے جن کو خدا دیکھ رہا ہے نہ کہ وہ کام جو انسانوں کو نظر آتے ہیں۔ سچا مومن وہ ہے جو دل ہی دل میں اپنے احتساب میں مشغول رہتا ہو جس کو اس بات کی فکر لگی رہتی ہو کہ اس سے یا اس کے اہل خاندان سے اس کے پڑوسیوں کو تکلیف نہ پہنچے۔ جو اللہ کو یاد کرے اور اہل معاملہ کے درمیان اپنی ذمہ داریوں کو خاموشی کے ساتھ ادا کرتا رہے۔ جس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہو کہ اس کو جہنم میں نہ ڈال دیا جائے اور جس کی سب سے بڑی تمنا یہ ہو کہ اس کا خدا اس کو جنت کے باغوں میں جگہ دے۔ بندۂ مومن کے عمل کا محرک اللہ کے سامنے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنا ہوتا ہے نہ کہ عوام کے سامنے شہرت و عزت حاصل کرنا۔ عوام کے درمیان اپنی "امیج" بڑھانے کے لئے کام کرنا گویا عوام کو خدا کی جگہ بٹھانا ہے۔ یہ خدا کے بجائے عوام کو اپنا مرکز توجہ بنانا ہے۔ یہ ریا ہے اور ریا کو حدیث میں شرک کہا گیا ہے۔ جو لوگ اس قسم کے عمل میں مشغول ہوں وہ اپنے لئے یہ خطرہ مول لے رہے ہیں کہ وہ خدا کے یہاں مجرموں اور فسادیوں کے زمرہ میں شامل کر دئے جائیں۔ کوئی شخص اگر اپنے اس مشغلہ کے لئے دین و ملت کا عنوان دریافت کرلے تو اس سے مسئلہ کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بے دینی کو اگر دین کے نام پر کیا جانے لگے تو محض نام بدلنے سے کوئی شخص خدا کی پکڑ سے مامون و محفوظ نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس کا جرم کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ کیوں کہ اس نے اپنے غیر خدا پرستانہ کاروبار کے لئے خدا کا نام استعمال کیا ——— موجودہ دنیا میں آدمی کے لئے ممکن ہے کہ وہ الفاظ بول کر لوگوں کو غلط فہمی میں ڈال سکے۔ ایک بے فائدہ کام کو ایسے عمدہ پیرایہ میں بیان کرے کہ وہ لوگوں کو اہم معلوم ہونے لگے اور لوگ اس کے لئے اپنی جیبیں خالی کر دیں اور جوق در جوق جمع ہو کر اس کی شان قیادت میں اضافہ کریں۔ مگر آخرت میں ایسا ممکن نہ ہوگا، کیوں کہ وہاں حقیقت کی حکمرانی ہوگی نہ کہ الفاظ کی حکمرانی۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ یک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ـــــ الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔

دوسری صورت ـــــ الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

حقیقت کی تلاش

از مولانا وحیدالدین خاں

صفحات ۶۰۔ قیمت ایک روپیہ

دین کی سیاسی تعبیر

(تعبیر کی غلطی کا خلاصہ)

از مولانا وحیدالدین خاں

صفحات ۷۰ قیمت ۲/-

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

قرآن شریف اور تمام تبلیغی و درسی کتب اور مولانا وحیدالدین خاں صاحب کی تمام مطبوعہ کتب ہر وقت مل سکتی ہیں۔ الرسالہ، الفرقان، تعمیر حیات، ندائے ملت، نقیب، رضوان ملنے کا پتہ:

رفیق احمد، مکتبہ عزیزیہ، نورانی مسجد، مالیگاؤں ناسک

اسلام کا تعارف

از مولانا وحیدالدین خاں

صفحات ۲۴، قیمت ۵۰/.

اسلام

ایک عظیم جدوجہد

از مولانا وحیدالدین خاں

صفحات ۸۰ قیمت ۲/۰۰

مکتبہ الرسالہ

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی

سوشلزم

ایک غیر اسلامی نظریہ

از مولانا وحیدالدین خاں

صفحات ۷۲۔ قیمت ۲/۰۰

مارکسزم

تاریخ جس کو رد کر چکی ہے

از مولانا وحیدالدین خاں

صفحات ۱۴۸ قیمت ۳/۰۰

عربی مطبوعات

مولانا وحید الدین خاں کی کتابوں کے بعض عربی ترجمے (مطبوعہ قاہرہ) برائے فروخت مکتبہ الرسالہ میں موجود ہیں :

۱۔ الإسلام یتحدی — ۲۶۳ صفحات قیمت ۲۰ روپے
۲۔ الدین فی مواجهة العلم — ۱۱۲ صفحات 〃 ۱۰ روپے
۳۔ حکمة الدین — ۸۷ صفحات 〃 ۸ روپے
۴۔ الإسلام والعصر الحدیث — ۷۷ صفحات 〃 ۸ روپے
۵۔ مسئولیات الدعوة — ۳۹ صفحات 〃 ۲ روپے
۶۔ نحو تدوین جدید للعلوم الإسلامیة — ۲۶ صفحات 〃 ۲ روپے
۷۔ إمكانات جدیدة للدعوة — ۳۴ صفحات 〃 ۲ روپے
۸۔ الشریعة الإسلامیة وتحدیات العصر — ۳۲ صفحات 〃 ۲ روپے
۹۔ المسلمون بین الماضی والحال والمستقبل — ۷۲ صفحات 〃 ۵ روپے
۱۰۔ نحو بعث إسلامی — ۳۲ صفحات 〃 ۵۰ پیسے

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

REGD D (D) NO. 532 **Issue No. 39**

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 110006 INDIA PHONE 262331

Pakistan International Airlines' Karachi and Lahore. It's just like coming home—there's nothing better.

For home is where welcome is. Home is a PIA flight. Where you slip into comfort, sit back and savour the warmth of familiar hospitality.

It's truly special—your PIA flight to Karachi and Lahore. As you journey to past times and places no longer out of reach. A flight to old dreams come true.

Or to any of 60 destinations in 40 countries. And all the while, with Pakistan International Airlines, you've never really left home.
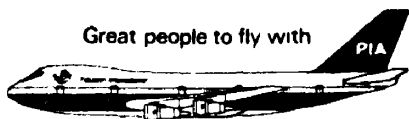
For enquiries and reservations contact your nearest travel agent or Pakistan International Airlines, Kailash Building, 26 Kasturba Gandhi Mar New Delhi 110 001. Tel 43161/43162
Oberoi Towers, Nariman Point, Bombay 400 021 Tel 231373/231455

KARACHI LAHORE

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

سب سے زیادہ غلطی پر وہ شخص ہے جس کے پاس
یہ کہنے کو نہ ہو کہ ——— میں نے غلطی کی

شمارہ ۴۰
مارچ ۱۹۸۰

زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶ (انڈیا)

ایک اپیل

اسلامی مرکز ایک خالص تعمیری اور دعوتی ادارہ ہے۔ اس کی تجویز اولاً ہفت روزہ الجمعیۃ ۲۷ نومبر ۱۹۷۰ میں پیش کی گئی تھی۔ اس کے بعد متعدد عرب جرائد نے اس پر مفصل تعارفی مضامین شائع کئے (مثلاً الاسبوع الثقافی، طرابلس ۸ اکتوبر ۱۹۷۶، المختار الاسلامی، قاہرہ نومبر ۱۹۷۹) بیروت اور قاہرہ سے "نحو بعث اسلامی" کے نام سے ۳۲ صفحات پر مشتمل عربی زبان میں ایک تعارفی کتابچہ چھپا جو اب تک سات بار شائع ہو چکا ہے اور عالم اسلام میں پھیلا ہے۔ ۱۹۷۶ میں ایک باقاعدہ رجسٹرڈ ادارہ کی حیثیت سے اسلامی مرکز کا قیام عمل میں آیا

الرسالہ اسی اسلامی مرکز کا ترجمان ہے۔ اس کا پہلا شمارہ اکتوبر ۱۹۷۶ میں نکلا تھا۔ اس مدت میں اللہ نے اس کو غیر معمولی مقبولیت عطا فرمائی۔ اب الرسالہ محض ایک پرچہ نہیں، اب وہ ایک تحریک بن چکا ہے۔ الرسالہ آج نہ صرف ہندستان کے مختلف حصوں میں مسلسل پڑھا جا رہا ہے بلکہ ہندستان کے علاوہ ڈیڑھ درجن بیرونی ملکوں میں بھی اس کی آواز پہنچ رہی ہے۔ عربی زبان میں بھی اس کے مضامین ترجمہ ہو کر شائع ہو رہے ہیں۔

اسلامی مرکز کی یہ تحریک، الرسالہ اور اس کی مختلف مطبوعات کے ذریعہ، اب ایسے مرحلہ میں پہنچ چکی ہے کہ وقت آگیا ہے کہ اس کو مزید مستحکم اور منظم بنایا جائے اور اسلامی مرکز کے بقیہ منصوبے زیر عمل لائے جائیں۔ اس نئے مرحلہ کے آغاز کے لئے ہم کو سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایک عمارت ہے۔ دہلی میں اسلامی مرکز کی اپنی عمارت ہو جائے تو یہ تحریک زیادہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہو جائے گی اور اس مشن کے تحت دوسرے عملی پروگرام شروع کرنا بھی ممکن ہو جائے گا۔

الرسالہ کے ایک ہمدرد نے دہلی میں اس مقصد کے لئے ایک زمین دینے کی پیش کش کی ہے۔ یہاں تعمیرات کرکے اسلامی مرکز کی اپنی عمارت قائم کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ایک "تعمیر فنڈ" کھول رہے ہیں اور الرسالہ کے مشن سے دلچسپی رکھنے والوں سے تعاون کی اپیل کر رہے ہیں۔ اس فنڈ میں ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق حصہ لے سکتا ہے۔

اسلامی مرکز، دفتر الرسالہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶ (انڈیا)

گرہن اللہ کی یاد کے لئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سب سے آخری ابراہیم تھے۔ وہ ماریہ قبطیہ کے بطن سے ۹ ھ میں پیدا ہوئے تقریباً ۱۸ ماہ کی عمر میں ابراہیم کی وفات ہوگئی۔ جس دن ان کی وفات ہوئی اس دن سورج گرہن تھا۔ محمود پاشا فلکی کی تحقیق کے مطابق یہ ۲۹ رشوال ۱۰ ھ کی تاریخ تھی۔ قدیم زمانہ میں گرہن کے متعلق طرح طرح کے توہماتی خیالات پھیلے ہوئے تھے۔ انھیں میں سے یہ تھا کہ جب کوئی بڑا آدمی مرتا ہے تو سورج گرہن یا چاند گرہن ہوتا ہے۔ ابراہیم کی وفات کے دن جب سورج گرہن پڑا تو لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ پیغمبر کے بیٹے کی موت کی وجہ سے یہ سورج گرہن ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے بتایا کہ موت کے واقعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ابوموسیٰ اشعری رض کی روایت کے مطابق آپ نے فرمایا:

هٰذه الآيات التي يرسل اللّٰه لا تكون لموت احدٍ ولا لحياته ولكن يخوف اللّٰه بها عباده فاذا رأيتم شيئا من ذلك فافزعوا الى ذكره ودعائه واستغفاره (متفق علیہ)

یہ نشانیاں جو اللہ بھیجتا ہے وہ نہ کسی کی موت کی وجہ سے ہوتی ہیں اور نہ کسی کی زندگی کی وجہ سے بلکہ ان کے ذریعہ اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ پس جب تم اس قسم کی چیز دیکھو تو ڈر کے ساتھ اللہ کو یاد کرو اور اس کو پکارو اور اس سے مغفرت مانگو۔

سورج گرہن یا چاند گرہن محض اتفاقاً نہیں ہوتے بلکہ متعین فلکیاتی قانون کے تحت ہوتے ہیں۔ سورج اور چاند دونوں نہایت محکم قدرتی اصول کے مطابق حرکت کر رہے ہیں۔ اس حرکت کے دوران کبھی ایسا ہوتا ہے کہ زمین، سورج اور چاند کے درمیان آجاتی ہے، اس طرح سورج کی روشنی چاند تک نہیں پہنچ پاتی اور چاند گرہن ہوجاتا ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چاند، زمین اور سورج کے درمیان آجاتا ہے، اس کے نتیجہ میں سورج کی روشنی زمین تک نہیں پہنچتی اور وہ صورت پیش آتی ہے جس کو سورج گرہن کہا جاتا ہے۔ گویا سورج گرہن کا مطلب سورج کا چاند کے اوٹ میں آجانا ہے اور چاند گرہن یہ ہے کہ زمین کے اوٹ میں آجانے کی وجہ سے سورج کی روشنی چاند تک نہ پہنچے۔ یہ جو کچھ ہوتا ہے معلوم فلکیاتی نظام کے مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً ۱۶ فروری ۱۹۸۰ کو جو سورج گرہن پڑا وہ بہت پہلے سے فلکیات دانوں کو معلوم تھا اور نہایت صحت کے ساتھ اس کے اوقات متعین کئے جا چکے تھے اور انھیں متعین اوقات کے مطابق وہ شروع اور ختم ہوا۔ اس طرح کے گرہن برابر ہوتے رہتے ہیں۔ البتہ ان کے دکھائی دینے کے علاقے الگ الگ ہوتے ہیں۔ کہیں مکمل گرہن دکھائی دیتا ہے اور کہیں جزئی گرہن۔ مکمل سورج گرہن کے وقت سورج کی روشنی تقریباً ایک ہزار گنا کم ہوجاتی ہے۔

سنت یہ ہے کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کے موقع پر نماز پڑھی جائے۔ یہ نماز اللہ کے آگے اپنے عجز اور بے بسی کا اظہار ہوتا ہے۔ سورج اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کے ذریعہ اللہ نے ہمارے لئے روشنی اور حرارت کا مستقل انتظام کیا ہے۔ سورج گرہن یہ بتانے کے لئے ہوتا ہے کہ جس خدا نے اس کو روشن کیا ہے وہی اس کو ماند بھی کرسکتا ہے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جس نعمت کو جب چاہے واپس لے لے۔ اس لئے جب گرہن ہو تو آدمی کو چاہئے کہ اللہ کو یاد کرے۔ اللہ کے مقابلہ میں اپنی محتاجی کا تصور کر کے اللہ کے آگے گر پڑے۔ وہ پکار اٹھے کہ "خدایا اگر تو سورج کو بجھا دے تو کوئی اس کو جلانے والا نہیں۔ اگر تو ہم کو روشنی

اور حرارت سے محروم کر دے تو کوئی ہم کو روشنی اور حرارت دینے والا نہیں "

"گرہن" کا یہ معاملہ صرف چاند اور سورج کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اس قسم کے واقعات اللہ کی دوسری نعمتوں کے ساتھ بھی مختلف صورتوں میں پیش آتے ہیں۔ صحت کے ساتھ بیماری گویا جسم کا گرہن ہے اور اچھے موسم کے ساتھ خراب موسم گویا فضا کا گرہن۔ اس طرح ایک ملی ہوئی نعمت کو تھوڑی دیر کے لئے روک کر اس کے نعمت ہونے کا احساس دلایا جاتا ہے تاکہ آدمی کے اندر شکر کا جذبہ ابھرے اور وہ یہ سوچے کہ اگر اللہ اس کو مستقل طور پر چھین لے تو آدمی کا کیا حال ہوگا۔ اللہ کو اپنے بندوں سے سب سے زیادہ جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ وہ اپنے رب سے ڈریں۔ انسان کو ڈرنے والا بنانے کے لئے جو اہتمام کئے گئے ہیں ان میں سے ایک قسم کا اہتمام وہ ہے جس کو "گرہن" کہا جاتا ہے۔

زمین مسلسل حرکت میں ہے۔ اس کے علاوہ زمین کے گولے کا اندرونی حصہ نہایت گرم پگھلے ہوئے مادہ کی صورت میں ہے جو ہر وقت کھولتے ہوئے پانی کی طرح جوش میں رہتا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے قدموں کے نیچے زمین کی سطح بالکل ٹھہری ہوئی حالت میں ہے۔ یہ ہمارے لئے بہت بڑی نعمت ہے۔ مگر عام حالات میں ہم کو اس کے نعمت ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے کبھی کبھی بھونچال کے ذریعہ زمین کی اوپری سطح کو ہلا دیا جاتا ہے تاکہ آدمی یہ جانے کہ خدا نے اس کے لئے تباہ کن لاوا کو کس طرح بند کر رکھا ہے۔ اگر وہ اس کو آزاد کر دے تو انسان کا کیا حال ہو۔ اسی طرح بارش ایک عجیب وغریب نعمت ہے۔ سورج کے اثر سے پانی کے بخارات کا اٹھ کر اوپر جانا، ان کا بدلیوں کی صورت میں جمع ہونا اور پھر ہوا کے ذریعہ جگہ جگہ بارانِ رحمت بن کر نازل ہونا اور پھر زمین کو سرسبز وشاداب کرنا، یہ سب رحمت خداوندی کے عجیب وغریب کرشمے ہیں جو وہ مستقل طور پر اپنے بندوں کے لئے کرتا رہتا ہے۔ مگر خود بخود ملتے رہنے کی وجہ سے آدمی اس نعمت کی قدر بھول جاتا ہے اس لئے کبھی کبھی زمین پر خشک سالی پیدا کی جاتی ہے تاکہ آدمی کا شعور جاگے اور وہ خدا کی نعمت کی قدر کر سکے۔ ہوا کیسی عجیب وغریب نعمت ہے۔ ہوا ہر آن ہم کو تازہ آکسیجن پہنچا رہی ہے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے خدائی پنکھے کی طرح ہم کو فرحت بخشتے رہتے ہیں۔ ہوا بارش کے نظام کو درست کرتی ہے۔ ہوا کے بے شمار فائدے ہیں۔ مگر جس طرح وہ ہماری آنکھوں کو نظر نہیں آتی اسی طرح اس کی اہمیت بھی ہمارے شعور سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اس لئے کبھی کبھی ہوا کو طوفان بنا دیا جاتا ہے تاکہ آدمی یہ جانے کہ ہوا کی صورت میں اللہ نے اس کی زندگی کے لئے کیسا حیران کن انتظام کر رکھا ہے۔ اسی طرح ہر چیز کا ایک "گرہن" ہے اور وہ اس لئے آتا ہے کہ آدمی کے اندر نعمت کے احساس کو جگائے۔

قرآن (واقعہ) میں ارشاد ہوا ہے: "اس چیز کو دیکھو جس کو تم بوتے ہو۔ تم اس سے کھیتی اگاتے ہو یا ہم ہیں اس کو کھیتی بنانے والے۔ اگر ہم چاہیں تو اس کو بھس بنا کر رکھ دیں پھر تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم قرضدار ہو گئے۔ بلکہ ہم تو بالکل محروم ہو گئے۔ پانی کو دیکھو جس کو تم پیتے ہو۔ کیا تم نے اس کو بادل سے اتارا ہے یا ہم ہیں اتارنے والے۔ اگر ہم چاہیں تو اس کو کھاری کر دیں پھر کیوں تم شکر نہیں کرتے۔ آگ کو دیکھو جس کو تم جلاتے ہو۔ کیا تم نے اس کا درخت پیدا کیا ہے یا ہم ہیں اس کے پیدا کرنے والے۔ ہم نے ہی اس کو بنایا یاد دلانے کے لئے اور تمہارے برتنے کے لئے۔ پس اللہ کے نام کی پاکی بیان کرو جو سب سے بڑا ہے"۔ ہماری پوری زندگی ایسی خدائی نعمتوں سے بھری ہے جو کسی بھی لمحہ واپس لی جا سکتی ہیں۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے خالق ومالک کا شکر گزار رہے تاکہ وہ اپنی نعمتوں سے اس کو محروم نہ کرے۔ یہ شکر گزاری ہی آدمی کو خدائی نعمتوں کا مستحق بناتی ہے، موجودہ دنیا میں بھی اور موت کے بعد آنے والی آخرت میں بھی۔

یہ اختلاف کیوں

مباحثہ کی میز کے چاروں طرف کمرہ میں ایک درجن آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایسے موقع پر کوئی موضوع چھیڑا جائے تو اس کے بارے میں لوگوں کی رائیں مختلف ہو جائیں گی۔ ہر آدمی کوئی نیا پہلو نکالے گا اور الگ رائیں دے گا۔ ایک سیدھی بات بھی تشریح و تعبیر کے فرق سے ایک درجن شکلیں اختیار کرے گی۔ لوگوں کو ایک متفقہ رائے پر لانے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوگی۔ اب اسی کمرہ میں حکومت وقت کا وزیر مالیات داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں مختلف رنگ کی بہت سی گولیاں ہیں۔ ان میں سے ایک گولی سفید ہے۔ وہ اعلان کرتا ہے کہ اس سفید گولی پر ایک ملین ڈالر کا انعام ہے۔ میں اس کو اچھال کر گراؤں گا۔ جو شخص سفید گولی پائے گا اس کو ایک ملین ڈالر نقد انعام دیا جائے گا۔ اس کے بعد جب وہ گولیوں کو میز پر بکھیرے گا تو تمام لوگوں کی توجہ "سفید گولی" پر لگ جائے گی۔ دیکھنے میں اگرچہ وہاں بہت سی گولیاں ہوں گی مگر حاضرین میں سے کوئی نہ ہوگا جو سفید گولی کے سوا کسی اور گولی کی طرف متوجہ ہو۔ اب فرض کیجئے کہ اسی کمرہ میں دوسرا شخص داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بکس ہے۔ وہ اپنا بکس میز پر رکھ کر اس کو کھولتا ہے اور اس کے اندر سے ایک کالا سانپ نکل کر میز پر چلنے لگتا ہے۔ اس کے بعد کمرے کے حاضرین کا جو حال ہوگا اس کا تصور ہر شخص کر سکتا ہے۔ دوبارہ ہر آدمی کی توجہ "سانپ" کے اوپر جم جائے گی۔ ہر آدمی صرف ایک چیز سوچے گا: بھاگ کر اپنے کو سانپ کی زد سے بچائے ——— شدتِ طلب یا شدتِ خوف رایوں کے فرق کو ختم کر دیتا ہے۔ ایسے وقت میں ہر آدمی اسی ایک چیز کا طالب بن جاتا ہے جو سب سے زیادہ قابلِ طلب ہے اور ہر آدمی اسی ایک چیز سے ڈرنے لگتا ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے کے قابل ہے۔ ہر آدمی کی توجہ اسی ایک چیز پر لگ جاتی ہے جس پر دوسرے آدمی کی توجہ لگی ہوئی ہے۔

اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ دین کے معاملہ میں آج اتنا زیادہ اختلاف کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دین آج لوگوں کے لئے بس ایک لکھنے اور بولنے کی چیز ہے، وہ ان کے لئے خوف اور محبت کی بنیاد نہیں بنا ہے۔ اگر وہ حقیقی معنوں میں خوف و محبت کی بنیاد بن جائے تو اچانک سارا اختلاف ختم ہو جائے گا۔ لوگ جنت اور جہنم کا نام لیتے ہیں مگر جنت لوگوں کی ضرورت نہیں بنی اور جہنم لوگوں کا مسئلہ نہیں بنی۔ یہی اختلاف کا سب سے بڑا سبب ہے۔ گویا میز کی سطح پر ایک دینی مباحثہ جاری ہے اور ہر آدمی اس کے گرد بیٹھا ہوا اپنی قابلیت کے جوہر دکھا رہا ہے۔ اگر فی الواقع ایسا ہو کہ جنت لوگوں کی طلب شدید بن جائے اور جہنم سے لوگوں پر خوفِ شدید طاری ہو جائے تو دفعتہً سب کی رائیں سمٹ کر ایک نقطہ پر جمع ہو جائیں گی۔ سب ایک ہی "انعام" کے طالب بن جائیں گے اور سب ایک ہی "خطرہ" کو سب سے بڑا مسئلہ سمجھنے لگیں گے۔ یہ شدتِ طلب اور یہ شدتِ خوف رایوں کے تعدد کو ختم کر دے گا۔ لوگ سارے اختلافات کو بھول کر اپنی توجہ ایک ہی چیز پر مرتکز کر دیں گے۔ سارے مسلمان مل کر اتحاد کی چٹان بن جائیں گے۔ وہ دین جو "۷۲ دینوں" میں تقسیم ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے وہ صرف ایک دین کی صورت میں دکھائی دینے لگے گا۔ تمام نیکیوں کی بنیاد یہ ہے کہ آدمی سنجیدہ (core) ہو۔ اور شدتِ طلب اور شدتِ خوف کے سوا کوئی چیز نہیں جو آدمی کو حقیقی معنوں میں سنجیدہ بنا سکے۔

نصیحت پکڑنے والے کے لئے ایک آیت کافی ہے

صعصعہ بن معاویہ مشہور شاعر فرزدق کے چچا تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ نے ان کو سورہ زلزال سنائی۔ یہاں تک کہ آپ اس آیت پر پہنچے: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (جس نے ایک ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا۔ جس نے ایک ذرہ برابر برائی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا) حضرت صعصعہ نے اس کو سن کر کہا: حسبی ان لا اسمع غیرھا (اس کے بعد میں کچھ اور نہ سنوں تب بھی یہ میرے لئے کافی ہے) رواہ الامام احمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ نئے اسلام لانے والوں کو کسی صحابی کے سپرد کر دیتے تاکہ وہ ان کو دین کی باتیں سکھا دیں۔ اسی طرح ایک صحابی کو آپ نے حضرت علی رض کے سپرد کیا تھا۔ وہ چند دن آئے اور اس کے بعد ان کا آنا بند ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کئی دن تک ان کو مسجد میں نماز میں نہ دیکھا تو آپ نے حضرت علی سے ان کے بارے میں دریافت کیا جن کے سپرد ان کی تعلیم ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ کئی دن سے وہ میرے پاس بھی نہیں آئے ہیں۔ آپ نے لوگوں سے کہا کہ ان کا پتہ کرکے بتائیں۔ آخر ایک روز ایک شخص کی ان سے ملاقات ہو گئی۔ وہ لکڑی کا گٹھا سر پر رکھ کر اس کو بیچنے کے لئے بازار جا رہے تھے۔ انھوں نے ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھارے بارے میں پوچھ رہے تھے، چل کر ملاقات کر لو۔ وہ تیزی سے بازار گئے اور لکڑی کا گٹھا کسی کے ہاتھ بیچ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے کہا کہ تم کئی روز سے اِدھر نہیں آئے۔ انھوں نے کہا: میں اس لئے نہیں آیا کہ میں نے سمجھا کہ میری تعلیم پوری ہو گئی۔ آپ نے فرمایا: ابھی تو چند ہی دن گزرے تھے، پھر تمھاری تعلیم پوری کیسے ہو گئی۔ انھوں نے کہا: میرے سامنے قرآن کی یہ آیت آئی: فمن یعمل مثقال ذرة خیرا یرہ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (جو ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔ جو ذرہ برابر برائی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا) اس آیت کو جاننے کے بعد اب میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ جب بھی کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو یہ خیال آجاتا ہے کہ قیامت میں اس کا انجام کس صورت سے سامنے آئے گا۔ اگر دل کہتا ہے کہ وہ اچھا کام ہے اور اس کا انجام اچھی صورت میں سامنے آئے گا تو اس کو کرتا ہوں اور اگر اس اعتبار سے کھٹک پیدا ہوتی ہے تو ترک کر جاتا ہوں۔ پھر وہ کام مجھ سے نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا: پھر تو تمھارے لئے یہی کافی ہے

تابعی اس کو کہتے ہیں جس نے صحابہ کو دیکھا ہو۔ ایک تابعی نے ایک بار اپنے شاگردوں کے سامنے صحابہ کی خصوصیات بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ صحابہ اتنا زیادہ نماز روزہ نہیں کرتے تھے جتنا تم لوگ کرتے ہو۔ ان کی فضیلت یہ تھی کہ ایک چیز ان کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی (ولکنہ شئ وقر فی قلوبھم) یہ چیز جو صحابہ کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی وہ اللہ کا خوف تھا۔ اللہ کا خوف اگر آدمی کے اندر پیدا ہو جائے تو گویا ہر چیز اس کے اندر پیدا ہو گئی اور اگر وہ پیدا نہ ہو تو کوئی چیز پیدا نہیں ہوئی۔ اللہ سے ڈرنے والا آدمی ہر معاملہ کو خدا کا معاملہ سمجھتا ہے اس لئے وہ ہر معاملہ میں تواضع اور انصاف کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ جب آدمی معاملات کو انسان کا معاملہ سمجھے تو کوئی چیز اس کو ظلم اور گھمنڈ سے روکنے والی ثابت نہیں ہو سکتی۔

ہار میں جیت

لاؤزے قدیم چین کا ایک مشہور فلسفی ہے۔ اس کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح ہے۔ اس کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "سچائی کا راستہ"۔ اس کتاب میں اس نے زندگی کے بڑے گہرے راز بتائے ہیں، لاؤزے کا ایک قول یہ ہے:

جس کو ہارنا آجائے اس کو کوئی ہرا نہیں سکتا

بظاہر یہ بات عجیب سی لگتی ہے کیونکہ عام لوگ تو جیت اس کو سمجھتے ہیں کہ آدمی کبھی اپنی ہار نہ مانے۔ یہاں تک کہ مقابلہ میں اگر وہ ہار جائے تب بھی یہی کہتا رہے کہ لوگوں نے دھاندلی کردی۔ ورنہ جیت لازماً میری ہوئی ہوتی۔ مگر لاؤزے نے جو بات کہی ہے وہ زندگی کا بڑا گہرا راز ہے اور کامیابی کا سب سے زیادہ یقینی راستہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص ہار کو مان لینے کا حوصلہ پیدا کرے وہ اپنی جیت کو یقینی بنا لیتا ہے۔ ایک شخص جب ہارتا ہے تو وہ دراصل اپنی کمزوری کی قیمت ادا کرتا ہے، خواہ وہ کمزوری طاقت کے اعتبار سے ہو یا تدبیر کے اعتبار سے۔ ایک ظالم اگر اپنے ظالمانہ منصوبہ میں کامیاب ہوتا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی پہلو سے اپنے حریف کے مقابلہ میں زیادہ بہتر پوزیشن میں تھا۔ جب ایسا ہے تو بہترین عقلمندی یہ ہے کہ آدمی اپنی ہار کو تسلیم کرلے اور اس کے بعد اپنی تمام توجہ اپنی کمی کی تلافی میں لگا دے۔ ہار مان کر وہ زیادہ بہتر طور پر اس مقصد کو حاصل کرسکتا ہے جو ہار کا انکار کرکے وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ایک شخص نے زمین خریدی اور اپنا نیا مکان بنانا شروع کیا۔ جب نیو کی کھدائی شروع ہوئی تو پڑوس کے آدمی نے ایک دیوار پر جھگڑا شروع کردیا۔ اس کا کہنا تھا کہ تمہاری نیو ایک فٹ آگے ہے۔ اس کو ایک فٹ پیچھے کرو، ورنہ ہم نہ نیو کھودنے دیں گے اور نہ گھر بنانے دیں گے۔ گھر والے نے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ نہ مانا اور تیز ہوتا چلا گیا۔ آدمی نے دیکھا کہ اس کا پڑوسی لڑائی پر تلا ہوا ہے۔ وہ کسی حال میں جھکنے پر راضی نہیں ہے۔ اب اس نے سوچا کہ اگر میں اصرار کرتا ہوں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لاٹھی ڈنڈے تک نوبت آئے گی۔ سر پھوٹیں گے۔ مقدمہ بازی ہوگی۔ بے کار مدوں میں روپیہ خرچ ہوگا۔ اور ہوسکتا ہے کہ اس لڑائی جھگڑے میں گھر بننے کا کام بھی نامعلوم مدت تک رک جائے اور اسی کے ساتھ میرا جو کاروبار ہے وہ بھی خراب ہو۔ اس نے ٹھنڈے دل سے سوچنے کے بعد لاؤزے کا طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ہار مان لی۔ اس نے اپنے مزدوروں کو حکم دیا کہ ایک فٹ پیچھے ہٹ کر نیو کھودو۔ اس نے ایک فٹ چھوڑ کر بقیہ زمین پر اپنا گھر بنایا اور اس کے بعد اپنے کاروبار میں لگ گیا۔

یہ طریق کار اس کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ کچھ دنوں بعد اس نے اتنا کما لیا کہ اپنے مکان کے اوپر ایک اور منزل بنالی۔ دو منزلہ ہو کر اس کا مکان کافی کشادہ ہوگیا۔ اس کے اس تعمیری طریقہ کا اثر اس کے بچوں پر پڑا۔ ان میں لڑائی جھگڑے کا ذہن ختم ہوگیا۔ سب تعمیری انداز میں سوچنے لگے۔ سب بچے خاموشی کے ساتھ کام کرنے کے راستہ پر لگ گئے۔ کچھ دنوں بعد باپ بیٹوں نے مل کر اتنا کافی پیسہ کما لیا کہ انھوں نے اپنے مکان سے ملا ہوا ایک پرانا بڑا مکان خرید لیا۔ اس کو گرا کر دوبارہ تعمیرات کرائیں اور کافی بڑا مکان اپنے لئے بنا لیا ——— آدمی نے ایک فٹ زمین ہاری تھی، اس کو ہزاروں فٹ زمین اس کے بدلہ میں حاصل ہوگئی۔

نہ ہونا بھی ہونا ہے

سوامی رام تیرتھ (۱۹۰۶ — ۱۸۷۳) ہندستان کے ایک بڑے مفکر گزرے ہیں۔ وہ اردو، فارسی، انگریزی ہندی، سنسکرت، پنجابی زبانوں کے علاوہ جرمن اور فرانسیسی زبانیں بھی جانتے تھے۔ انھوں نے ریاضیات میں ایم اے کیا تھا۔ ان کا ایک قول یہ ہے:

صفر ہر ہندسہ کی قیمت دس گنا بڑھا دیتا ہے، اگر اس کو ہندسہ کے دائیں طرف رکھ دیا جائے

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی کے پاس کچھ نہیں ہوتا تب بھی اس کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے، شرط صرف یہ ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو جانے اور اس کو صحیح طور پر استعمال کرے۔ سوامی رام تیرتھ انیسویں صدی کے آخر میں امریکہ گئے۔ اس وقت وہاں ان کا کوئی دوست یا جاننے والا نہ تھا۔ سوامی رام جب امریکہ کے ساحل پر خالی ہاتھ اترے تو ان کی بے سروسامانی کو دیکھ کر ایک امریکی نے پوچھا: کیا یہاں آپ کا کوئی دوست ہے۔ سوامی رام نے کہا "ہاں، ایک دوست ہے" یہ کہہ کر انھوں نے اپنے دونوں بازو سوال کرنے والے امریکی کے گلے میں ڈال دئے اور کہا "وہ دوست یہ ہے"۔ سوامی رام اگرچہ اس امریکی کے لئے اجنبی تھے مگر ان کے اس سلوک سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ وہ سچ مچ سوامی رام کا دوست بن گیا۔ امریکہ میں وہ تنہا داخل ہوئے تھے۔ مگر ڈیڑھ سال کے قیام میں اپنے اس سلوک کی وجہ سے انھوں نے وہاں اپنے بہت سے دوست اور ساتھی پیدا کرلئے۔ اپنے "صفر" کو انھوں نے اپنے "دائیں طرف" رکھ دیا تو وہ ان کے لئے بہت بڑی گنتی بن گیا۔

ایک نوجوان بے روزگاری سے پریشان تھا۔ اس کے پاس نہ روپیہ تھا کہ کوئی کاروبار کرے اور نہ کسی بڑے آدمی کی سفارش جو اس کو ملازمت دلا سکے۔ وہ ہر لحاظ سے اپنے کو "صفر" کے مقام پر پاتا تھا۔ ایک روز کسی پرچہ میں اس نے ایک قصہ پڑھا جس سے اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ دنیا میں کام کی کمی نہیں بلکہ کام کرنے والے کی کمی ہے۔ ہر بڑے کاروبار کو بہت سے کام کرنے والے آدمی چاہئیں مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کو اپنے مطلب کے آدمی نہیں ملتے۔ کوئی شخص محنتی ہے تو ایماندار نہیں۔ اور ایماندار ہے تو محنتی نہیں۔ "اگر میں یہ ثابت کردوں کہ میں محنتی بھی ہوں اور ایماندار بھی" اس نے سوچا "تو میں اپنے لئے جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

اب آدمی نے یہ کیا کہ وہ بازار میں گیا۔ ایک دکان دیکھی کہ بڑی ہے اور اس میں کافی کام ہو رہا ہے۔ وہ اس کے اندر داخل ہو گیا اور مالک سے کہا کہ میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھ کو اپنے یہاں رکھ لیں۔ اس نے کہا کہ میں ایک مہینہ تک آپ سے کوئی تنخواہ نہیں لوں گا۔ بلکہ مفت کام کروں گا۔ ایک مہینہ میرا کام دیکھنے کے بعد اگر میں آپ کو پسند آؤں تو آپ مجھ کو رکھ لیں۔ ورنہ رخصت کر دیں۔ اس طرح وہ کئی دکان داروں سے ملا۔ بالآخر ایک بڑے دکان دار نے اس کو رکھ لیا۔ آدمی نے اپنا کام اتنی محنت اور دیانت داری سے کیا کہ اس کا مالک خوش ہو گیا اور صرف دو ہفتہ دیکھنے کے بعد اس کی تنخواہ مقرر کر دی اور مہینہ ختم ہونے پر پورے مہینہ کی تنخواہ دی۔ چند ماہ بعد اس نے اس کی تنخواہ میں کافی اضافہ کر دیا۔ چند سال اور گزرے تو وہ اس کی لیاقت اور کارکردگی سے اتنا متاثر ہوا کہ اپنے کاروبار میں اس کو شریک کر لیا —— نوجوان کے پاس صفر کے سوا کچھ نہ تھا۔ مگر جب اس نے اپنے صفر کو صحیح طور پر استعمال کیا تو اس کا صفر اس کے لئے دولت کا خزانہ بن گیا۔

جلدی میں دیر

ونسٹن چرچل (۱۹۶۵-۱۸۷۴) مشہور انگریز مدبر تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے وقت وہ برطانیہ کے وزیر اعظم تھے۔ جب کہ برطانیہ کی سلطنت آج سے بہت زیادہ بڑی تھی۔ انھوں نے اپنے ملک کی زبردست خدمات انجام دی ہیں۔ چرچل کا ایک قول یہ ہے:

تم جتنی جلدی کرو گے اتنی ہی زیادہ دیر لگے گی

یہ زندگی کی بڑی گہری حقیقت ہے۔ آپ ایک مکان کی تیسری منزل پر ہیں اور آپ کو کسی ضرورت کے تحت فوراً نیچے اترنا ہے۔ تاہم آپ کو کتنی ہی جلدی ہو، آپ کو بہرحال سیڑھیوں کے ذریعہ اترنا ہوگا۔ اگر جلدی کی خاطر آپ ایسا کریں کہ تیسری منزل سے زمین کی طرف کود پڑیں تو یقیناً آپ بہت جلد نیچے پہنچ جائیں گے۔ مگر یہ جلدی عملاً بہت زیادہ دیر بن جائے گی۔ کیوں کہ آپ کا ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائے گا اور آپ نیچے اتر کر اپنی منزل کی طرف جانے کے بجائے ہسپتال لے جائے جائیں گے اور وہاں مہینوں تک علاج کے بستر پر پڑے رہیں گے۔

ایک شخص اپنے گھر کے آنگن میں آم کا درخت دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر میں آم کا چھوٹا پودا لگاؤں تو اس کو بڑھنے میں کم از کم دس سال لگ جائیں گے۔ اس کے باغ میں آم کا ایک پانچ سال کا درخت تھا۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ اس درخت کو کھود کر نکالے اور اس کو لاکر گھر کے آنگن میں لگا دے۔ وہ خوش تھا کہ اس طرح پانچ سال کا سفر ایک دن میں طے ہو جائے گا اور چند ہی سال کے بعد گھر کے اندر آم کا ایک پورا درخت کھڑا ہوا نظر آئے گا۔ اس نے پانچ سالہ درخت کی کھدائی کے لئے مزدور لگا دئے۔ کئی آدمیوں نے گھنٹوں کی محنت کے بعد اس کو کھودا اور پھر ایک بڑی چارپائی پر رکھ کر اس کو گھر کے اندر لے آئے۔ درخت آنگن میں لگا دیا گیا۔ مگر اگلے ہی دن اس کے پتے مرجھا گئے۔ اور چند ہفتوں کے بعد آدمی کے آنگن میں شاداب درخت کی جگہ صرف سوکھی لکڑی کا ایک ٹھنٹھ کھڑا ہوا تھا۔

ایک آدمی پیسہ کمانا چاہتا تھا۔ اس نے کراکری کی دکان کھولی۔ سال بھر اس میں بیٹھا۔ جب اس نے دیکھا کہ دکان زیادہ نہیں چل رہی ہے تو اس نے طے کیا کہ کسی اور چیز کی دکان کھولے۔ اب اس نے بساطہ کا کام شروع کیا۔ ایک سال کے بعد اس کو محسوس ہوا کہ اس میں بھی زیادہ فائدہ نہیں ہے۔ اب اس نے اسٹیشنری کا کام شروع کر دیا۔ ایک سال میں اس سے بھی جی بھر گیا اور اس نے جوتہ کی دکان کرلی۔ اس طرح وہ بار بار اپنی لائن بدلتا رہا اور بالآخر مایوس اور ناکام ہو کر بیٹھ گیا۔ اس آدمی کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس راز کو نہ سمجھ سکا کہ کسی کام میں کامیابی کے لئے وقت درکار ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ادھر دکان کھولی اور ادھر وہ شاندار طریقے سے چلنے لگی۔ آدمی نے کئی کاموں میں جتنا وقت لگایا وہی وقت اگر وہ ایک کام میں لگاتا تو یقیناً وہ کامیاب ہو جاتا۔ اس نے "جلدی" چاہی اس لئے اس کو دیر ہوتی چلی گئی۔ اگر وہ جلدی نہ کرتا تو اس سے کم وقت میں وہ کامیاب ہو جاتا جتنا وقت اس نے بار بار کے ناکام تجربوں میں ضائع کر دیا۔

نوٹ: یہ مضامین ۲۶-۳۰ دسمبر ۱۹۷۹ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کئے گئے

توکل کیا ہے

دنیا دارالامتحان ہے اس لئے یہاں جدوجہد کرنا ہے۔ مگر مومن اللہ کے لئے جیتا ہے اس لئے اس کا بھروسہ اللہ پر رہتا ہے۔ جدوجہد مومن کے حالت امتحان میں ہونے کا تقاضا ہے اور توکل اس کی ایمانی نفسیات کا۔

ایمان اور توکل دونوں تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: علی اللہ فتوکلوا ان کنتم مومنین (اللہ پر توکل کرو اگر تم مومن ہو) اس دنیا میں آدمی کو جس امتحان میں پورا اترنا ہے وہ یہی ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ پر بھروسہ کرنے والا ثابت ہو۔ وہ سب کچھ اللہ کی طرف سے سمجھے اور کسی بھی حال میں اللہ کے سوا کسی پر اعتماد نہ کرے۔ مگر یہ امتحان اسی وقت ہو سکتا تھا جب کہ آدمی کو مخالفانہ حالات میں رکھا جائے۔ غیر متوکلانہ حالات ہی میں توکل کا امتحان ہو سکتا ہے۔ توکل یہ ہے کہ آدمی اسباب کے ذریعہ نتیجہ نکلتا ہوا دیکھے، اس کے باوجود اس کو اللہ کی طرف منسوب کرے۔ اسباب کا سرا چھوٹنے سے ناکامی سامنے آئے پھر بھی وہ یہی سمجھے کہ خدا کا حکم شامل حال نہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہوا۔ اسباب وعلل کے درمیان اپنے کو گھرا ہوا پاکر وہ اپنی تمام کوششوں کو بروئے کار لائے۔ مگر اس کا دل اس وقت بھی سارے معاملہ کو بس اللہ کا معاملہ سمجھ رہا ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو امتحان کس بات کا ہوگا اور کیوں کر یہ معلوم ہوگا کہ آدمی حقیقی معنوں میں اللہ پر بھروسہ کرنے والا تھا یا ظاہری اسباب میں گم ہو جانے والا۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی کو توکل کے خلاف حالات میں توکل کا ثبوت دینا ہے۔ اسباب وعلل کے درمیان رہتے ہوئے یہ یقین کرنا ہے کہ صرف ایک اللہ موثر حقیقی ہے۔ آسانیوں اور مشکلوں سے گزرتے ہوئے خود آسانیوں اور مشکلوں میں نہیں الجھنا ہے بلکہ ہر حال میں صرف اللہ کی طرف اپنی نظریں جمائے رکھنا ہے۔

امتحان لازماً یہ چاہتا ہے کہ آدمی کے سامنے دو مختلف راہیں ہوں اور اس کے لئے موقع ہو کہ وہ اپنی آزادانہ رائے کے تحت دونوں میں سے کسی ایک کو چن سکے۔ اسی مصلحت کی بنا پر موجودہ دنیا کے اوپر اسباب وعلل کا پردہ ڈال دیا گیا ہے اور آدمی کے لئے ایسے حالات پیدا کئے گئے ہیں کہ جو نتیجہ سامنے آئے وہ عمل اور جدوجہد کے ذریعہ سامنے آئے۔ آدمی ایک چھوٹا سا معمولی بیج مٹی کے اندر ڈالتا ہے اور اس کے بعد حیرت انگیز طور وہ دیکھتا ہے کہ اس کے اندر سے ایک ایسا ہرا بھرا درخت نکلا چلا آرہا ہے جس میں لکڑی ہے، پتیاں ہیں، پھول ہے، پھل ہے، مزہ ہے، خوشبو ہے اور بے شمار دوسری چیزیں ہیں، یہ واقعہ سراپا ایک قدرتی معجزہ ہے۔ معجزہ کے سوا کوئی چیز ایسے حیرت ناک وجود کو پیدا نہیں کر سکتی جس کا نام درخت ہے۔ مگر اس معجزاتی واقعہ کو اسباب کے پردہ میں ظاہر کیا جاتا ہے تاکہ آدمی کے لئے یہ بھی ممکن ہو کہ وہ سمجھے کہ ظاہری اسباب نے اس کو وجود دیا ہے۔ آدمی تعلیم حاصل کرکے ایک ڈگری لیتا ہے اور اس کے بعد ایک اچھی ملازمت کے ذریعہ شاندار تنخواہ وصول کرتا ہے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ سراسر ایک خدائی کرشمہ ہے۔ آدمی کے اندر یہ انوکھی صفت ہونا کہ وہ سوچے، وہ لکھ اور بول سکے۔ وہ کتاب کی لکیروں کو معانی کی صورت میں پڑھے، وہ خیالات کو منظم کرے۔ وہ باتوں کو یاد رکھے اور ان کو دہرائے۔ وہ عزم وارادہ کے تحت اپنی قوتوں کو استعمال کرے۔ یہ اور اس طرح کی دوسری بے شمار چیزیں جن کی مساعدت سے ایک شخص تعلیم یافتہ بنتا ہے اتنا حیران کن حد تک بعید الوقوع ہے کہ معجزۂ خداوندی کے سوا کسی اور لفظ سے اس کو تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ سب کچھ بظاہر ایسے حالات کے تحت

انجام پاتا ہے کہ آدمی اگر چاہے تو بآسانی اس سارے واقعہ کو کچھ خاص اسباب کی طرف منسوب کر دے۔ اس طرح آدمی کو ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دیا گیا ہے کہ ایک ہی واقعہ کو وہ بیک وقت دو رخ سے دیکھ سکے۔ ایک رخ سے دیکھنے میں وہ اس کو خدا کا کرشمہ نظر آئے اور دوسرے رخ سے دیکھنے میں ایسا معلوم ہو گویا سب کچھ خود انسان کے فراہم کئے ہوئے معلوم و متعین اسباب کے تحت وقوع میں آیا ہے۔

امتحان کی غرض سے اگرچہ اللہ تعالیٰ نے نتائج کو اسباب کے ساتھ اس طرح وابستہ کر دیا ہے کہ اسباب کی فراہمی کے بغیر نتائج وقوع میں نہ آئیں۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو سبب اور نتیجہ میں اتنی کم نسبت ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "سبب" کی حیثیت ایک "بہانہ" سے زیادہ نہیں۔ درخت بظاہر آدمی کے عمل کے نتیجہ میں ظہور میں آتا ہے۔ مگر اس کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو درخت ایک ایسی چیز ہے جس کو وجود میں آنے کے لئے اتنے زیادہ عوامل درکار ہیں کہ اس کے لئے ایک پوری کائنات کی ضرورت ہے۔ اس پورے واقعہ میں انسان کے عمل کا حصہ اتنا کم ہے کہ اس کو "نہیں" کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح ایک آدمی کا ایک علم کا ماہر بننا بظاہر اگرچہ انسان کی کوششوں سے ظہور میں آتا ہے۔ مگر ایک شخص کا صاحب علم بننا اتنا انوکھا واقعہ ہے جس کو ظہور میں لانے کے لئے خدائی طاقتوں کی ضرورت ہے۔ یہ واقعہ اپنے تمام پہلوؤں کے اعتبار سے تمام تر اللہ کی توفیق اور اس کی مدد سے وقوع میں آتا ہے۔ اس پورے واقعہ میں بھی انسان کی اپنی کوششوں کا حصہ اتنا حقیر ہے کہ وہ بالکل ناقابل شمار ہے۔ امتحان کے مقصد سے اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کر دیا ہے کہ اسباب کی فراہمی کے بغیر کوئی واقعہ ظہور میں نہ آئے۔ مگر کائنات کے اندر کسی واقعہ کا ظہور میں آنا ایک ایسا معجزہ ہے جس کو خدا کے سوا کوئی ظہور میں لانے پر قادر نہیں ——— کفر یہ ہے کہ آدمی اسباب و علل کے ظاہری پردوں میں اٹک کر رہ جائے، وہ انہیں اسباب کو سب کچھ سمجھنے لگے۔ اس کے برعکس ایمان یہ ہے کہ آدمی ظاہری پردوں سے گزر کر اس کے پیچھے کام کرنے والی حقیقت عظمیٰ کو دیکھ لے اور اس کا اقرار کرتے ہوئے اس کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔

توکل کا دوسرا پہلو معاملات میں اللہ پر اعتماد ہے۔ یعنی جب کوئی بات اپنے خلاف پیش آئے تو آدمی سارے معاملہ کو اللہ کے اوپر ڈال کر صبر کرے۔ اللہ کے راستہ پر چلنا اور اللہ کے دین کا داعی بننا سراسر آزمائش کا معاملہ ہے۔ آدمی ایک ایسی دنیا میں رہتا ہے جہاں طرح طرح کے لوگ ہیں، ان کی طرف سے طرح طرح کے مسائل سامنے آتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی کی نازیبا حرکت پر نفرت اور شکایت کا جذبہ ابھرتا ہے۔ کبھی کسی کی ترقی اور کامیابی کو دیکھ کر حسد کی نفسیات پیدا ہوتی ہے۔ کبھی کسی کی تنقید کو سن کر کبر اور انانیت کا شیطان جاگ اٹھتا ہے۔ کبھی کسی کے ہاتھوں مادی نقصان پہنچ جاتا ہے اور آدمی چاہنے لگتا ہے کہ اس کا انتقام لے۔ کبھی لوگ ایک سچی بات کا انکار کر کے آدمی کے اندر مایوسی اور دل شکستگی کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ غرض بار بار مختلف قسم کی ناخوشگوار صورت سامنے آتی ہے اور آدمی کے اندر ردعمل کی نفسیات ابھرتی ہے۔ آدمی چاہنے لگتا ہے کہ وہ پیش آمدہ مسئلہ سے الجھ جائے اور اس کے خلاف جو کچھ کر سکتا ہے کر ڈالے۔ مگر توکل یہ ہے کہ ایسے ہر موقع پر آدمی صرف اپنی ذمہ داری کو یاد رکھے اور باقی تمام معاملات کو اللہ کے اوپر ڈال دے۔ وہ اللہ سے بہتر بدلہ کی امید کرتے ہوئے خاموش ہو جائے۔ وہ اپنا رخ انسان کے بجائے اللہ کی طرف کر دے۔

مدعو میں برتری کی نفسیات پیدا کرنا

مسز اندرا گاندھی کو ہندستان کے الکشن ۱۹۷۷ میں مکمل شکست ہوئی تھی، اس کے بعد جنتا حکومت نے پوری کوشش کی کہ ان کو سیاسی منظر سے ہٹا دے۔ مگر جنوری ۱۹۸۰ کے الکشن میں دوبارہ اندرا گاندھی کو اتنی بڑی کامیابی حاصل ہوئی کہ ہندستانی پارلیمنٹ کی دو تہائی نشستوں پر ان کی پارٹی قابض ہوگئی۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ہندستان ٹائمس (۸ جنوری) لکھتا ہے: ملک اپنی جمہوریت پر فخر کر سکتا ہے جس نے اندرا کے لئے اس حیران کن واپسی کو ممکن بنایا۔ ہندستان کا سیاسی ڈھانچہ انتخابی طریقہ کے ذریعہ پرامن سیاسی تبدیلی کے نظام کے ساتھ، ان بہت سے زیر ترقی ممالک سے ممتاز طور پر نمایاں ہے جہاں اختلاف رائے کو سختی سے دبا دیا گیا ہے، انفرادی آزادی کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اور سیاسی تبدیلی صرف تشدد ہی کے ذریعہ وجود میں آسکتی ہے:

> The country can be proud of its democracy which has enabled her to make her stunning comeback. India's political system with its mechanism of smooth political change through the ballot, stands out in striking contrast to those of most developing countries where dissent is stiffled, individual liberties smothered and change ushered in only amid violence.

اس عبارت میں واضح طور پر ایران اور پاکستان جیسے ملکوں کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اقتباس موجودہ زمانہ کے ایک بہت بڑے المیہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر جو تحریکیں اٹھیں انھوں نے اسلام کی کوئی واقعی خدمت تو نہ کی۔ البتہ اسلام کو ایک بہت بڑا نقصان پہنچایا۔ انھوں نے اپنے "بوائق" کو اسلام کا عنوان دے کر دوسری قوموں کے سامنے اسلام کی تصویر ہلکی کر دی۔ اور اس طرح مدعو اقوام میں غیر ضروری طور پر اسلام کے مقابلہ میں احساس برتری کا جذبہ پیدا کر دیا۔

یہ تحریکیں اگر اسلام کے سوا کسی اور نام پر اٹھتیں تو ان کی نادانیوں کا الزام ان کے اپنے سر جاتا۔ مگر اسلام کے نام پر اٹھنے کی وجہ سے ان کی ہر چیز اسلام کی طرف منسوب ہوگئی۔ وہ قومیں جو اسلام کے لئے مدعو کا درجہ رکھتی تھیں وہ اپنے کو افضل پاکر اس نفسیات میں مبتلا ہوگئیں کہ ان کے پاس وہ چیز زیادہ بہتر طور پر موجود ہے جس کی اسلام دعوت دیتا ہے۔ "اسلامی نظام" اور "نظام مصطفیٰ" میں انسان کی آزادی کو کچلا جاتا ہے جب کہ ہمارے اپنے نظام میں انسان کو آزادی رائے کا حق حاصل ہے۔ ان کے یہاں حرث ونسل کی ہلاکت کی قیمت پر حکومتیں بدلتی ہیں، ہمارے یہاں پرامن انتخابات سے۔ ان کے یہاں سیاسی اختلاف پر کوڑے لگتے ہیں اور ہتھکڑیاں پہنائی جاتی ہیں، ہمارے یہاں سیاسی اختلاف پر کوئی پابندی نہیں۔ ان کے یہاں کسی مجرم کو سزا دینے کے لئے نہ گواہی شہادت کی ضرورت ہے اور نہ قانون کے تقاضے پورے کرنے کی۔ جس کو چاہا پکڑا اور سرسری سماعت کے بعد گولی ماردی یا جیل میں بند کر دیا۔ ہمارے یہاں کسی کو اس وقت تک سزا نہیں دی جاسکتی جب تک اس پر باقاعدہ مقدمہ چلا کر قانونی طور پر اس کو مجرم ثابت نہ کر دیا جائے۔ ان کے یہاں اختلاف کو آپس کی مارکاٹ کے ذریعہ طے کیا جاتا ہے، ہمارے یہاں آپس کا اختلاف پرامن ذرائع سے طے ہو جاتا ہے ——— مسلمان اپنی نالائقی کی بنا پر موجودہ دنیا میں دوسرے درجہ کی قوم بن چکے تھے، اب انھوں نے اسلام کی غلط نمائندگی کر کے اسلام کو بھی قوموں کی نظر میں دوسرے درجہ کا مذہب بنا دیا ہے۔

سائنس توحید کی طرف

علم طبیعیات میں، نیوٹن کے بعد سے یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ چار قسم کے قوانین یا طاقتیں ہیں جو فطرت کے مختلف مظاہر کو کنٹرول کرتی ہیں۔ ۱۔ قوت کشش (Gravitational Force) ۲۔ برقی مقناطیسی قوت (Electromagnetic Force)
۳۔ طاقت ور نیوکلیر قوت (Strong Nuclear Force) ۴۔ کمزور نیوکلیر قوت (Weak Nuclear Force)

کشش کا قانون، ایک کہانی کے مطابق، نیوٹن نے اس وقت معلوم کیا جب کہ اس نے سیب کے درخت سے سیب کو گرتے ہوئے دیکھا۔ "سیب اوپر کی طرف کیوں نہیں گیا، نیچے زمین پر کیوں آیا" اس سوال نے اس کو اس جواب تک پہنچایا کہ زمین میں، اور اسی طرح تمام دوسرے کروں میں، جذب وکشش کی قوت کارفرما ہے۔ بعد کو آئن سٹائن نے اس نظریہ میں بعض فنی اصلاحات کیں۔ تاہم اصل نظریہ اب بھی سائنس میں ایک مسلّمہ اصول فطرت کے طور پر مانا جاتا ہے۔ برقی مقناطیسی قانون کا تجربہ پہلی بار فریڈے نے ۱۸۲۱ میں کیا۔ اس نے دکھایا کہ بجلی کی قوت اور مقناطیس کی قوت ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ مقناطیس اور حرکت کو یکجا کیا جائے تو بجلی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور مقناطیس اور بجلی کی لہر کو یکجا کریں تو حرکت وجود میں آجاتی ہے (۶ جنوری ۱۹۸۰)

ابتدائی ۵۰ سال تک تمام طبیعی واقعات کی توجیہہ کے لئے مذکورہ دو قوانین کافی سمجھے جاتے تھے۔ مگر موجودہ صدی کے آغاز میں جب ایٹم کے اندرونی ڈھانچہ کی بابت معلومات میں اضافہ ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ ایٹم سے بھی چھوٹے ذرات ہیں جو ایٹم کے اندر کام کر رہے ہیں تو طبیعی نظریات میں تبدیلی شروع ہوگئی۔ یہیں سے طاقت ور نیوکلیر فورس اور کمزور نیوکلیر فورس کے نظریات پیدا ہوئے۔ ایٹم کا اندرونی مرکز (نیوکلیس) الکٹران سے گھرا ہوا ہے جو کہ پروٹان نامی ذرات سے بہت زیادہ چھوٹے اور ہلکے ہیں۔ مگر مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر الکٹران وہی چارج رکھتا ہے جو بھاری پروٹان رکھتے ہیں۔ البتہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ الکٹران میں منفی برقی چارج ہوتا ہے اور پروٹان میں مثبت برقی چارج۔ الکٹران ایٹم کے بیرونی سمت میں اس طرح گردش کرتے ہیں کہ ان کے اور ایٹم کے مرکز (نیوکلیس) کے درمیان بہت زیادہ خلا ہوتا ہے۔ مگر منفی چارج اور مثبت چارج دونوں میں برابر برابر ہوتے ہیں، اور اس بنا پر ایٹم بحیثیت مجموعی برقی اعتبار سے نیوٹرل اور قائم (Stable) رہتا ہے۔

اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ ایٹم کا مرکز بطور خود قائم (Stable) کیوں کر رہتا ہے۔ الکٹران اور پروٹان الگ الگ ہوکر بکھر کیوں نہیں جاتے۔ قائم رہنے (Stability) کی توجیہہ طبیعیاتی طور پر یہ کی گئی ہے کہ پروٹان اور نیوٹران کے قریب ایک نئی قسم کی طاقتور قوت کشش موجود ہوتی ہے۔ یہ قوت ایک قسم کے ذرات سے نکلتی ہے جن کو میسن (Masons) کہا جاتا ہے۔ ایٹم کے اندر پروٹان اور نیوٹران کے ذرات بنیادی طور پر یکساں (Identical) سمجھے جاتے ہیں۔ مقناطیس کے دو ٹکڑوں کو لیں اور دونوں کے یکساں رخ (ساؤتھ پول کو ساؤتھ پول سے یا نارتھ پول کو نارتھ پول سے) ملائیں تو وہ ایک دوسرے کو دور پھینکیں گے۔ اس معروف طبیعی اصول کے مطابق پروٹان اور نیوٹران کو ایک دوسرے سے بھاگنا چاہئے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ پروٹان اور نیوٹران ہر لمحہ بدلتے رہتے ہیں اور اس بدلنے کے دوران میسن کی صورت میں قوت خارج کرتے ہیں جو ان کو جوڑتی ہے، اسی کا نام طاقت ور نیوکلیر فورس ہے۔ اسی طرح سائنس دانوں نے دیکھا کہ بعض ایٹم کے کچھ ذرات (نیوٹران، میسن) اچانک ٹوٹ جاتے

ہیں۔ یہ صورت حال مثلاً ریڈیم میں پیش آتی ہے۔ ایٹم کے ذرات کا اس طرح اچانک ٹوٹنا طبیعیات کے مسلمہ اصول تعلیل (Casuality) کے خلاف ہے۔ کیوں کہ پیشگی طور پر یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ ایٹم کے متعدد ذرات میں سے کون سا ذرہ پہلے ٹوٹے گا۔ اس کا مدار تمام تر اتفاق پر ہے۔ اس مظہر کی توجیہہ کے لئے ایٹم میں جو پر اسرار طاقت فرض کی گئی ہے اسی کا نام کمزور نیوکلیر فورس ہے۔

سائنس داں یہ یقین کرتے رہے ہیں کہ انھیں چار طاقتوں کے تعامل (Interactions) سے کائنات کے تمام واقعات ظہور میں آتے ہیں۔ مگر سائنس عین اپنی فطرت کے لحاظ سے ہمیشہ وحدت کی کھوج میں رہتی ہے۔ کائنات کا سائنسی مشاہدہ بتاتا ہے کہ پوری کائنات انتہائی ہم آہنگ ہو کر چل رہی ہے۔ یہ حیرت ناک ہم آہنگی اشارہ کرتی ہے کہ کوئی ایک قانون ہے جو فطرت کے پورے نظام میں کار فرما ہے۔ چنانچہ طبیعیات مستقل طور پر ایک متحدہ اصول (Unified Theory) کی تلاش میں ہے۔ سائنس کا "ضمیر" متواتر اس جدوجہد میں رہتا ہے کہ وہ قوانین فطرت کی تعداد کو کم کرے اور کوئی ایک ایسا اصول فطرت (Principle) دریافت کرے جو تمام واقعات کی توجیہہ کرنے والا ہو۔

آئن سٹائن نے مذکورہ قوانین میں سے پہلے دو قوانین کشش اور برقی مقناطیسیت کے اتحاد (Unification) کی کوشش کی اور اس میں ۲۵ سال سے زیادہ مدت تک لگا رہا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی موت سے کچھ پہلے اس نے اپنے لڑکے سے کہا تھا: میری تمنا تھی کہ میں اور زیادہ ریاضی جانتا تاکہ اس مسئلہ کو حل کر لیتا۔ ڈاکٹر عبد السلام (پیدائش ۱۹۲۶) اور دوسرے دو امریکی سائنس دانوں (گلاسگو اور وین برگ) کو ۱۹۷۹ میں طبیعیات کا جو مشترکہ نوبل انعام ملا ہے وہ ان کی اسی قسم کی ایک تحقیق پر ہے۔ انھوں نے مذکورہ قوانین فطرت میں سے آخری دو قانون (طاقتور اور کمزور نیوکلیر فورس) کو ایک واحد ریاضیاتی اسکیم میں متحد کر دیا۔ اس نظریہ کا نام جی ایس ڈبلیو نظریہ (G-S-W Theory) رکھا گیا ہے۔ اس کے ذریعہ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ دونوں قوانین اصلاً ایک ہیں۔ اس طرح انھوں نے چار کی تعداد کو گھٹا کر تین تک پہنچا دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس دریافت کا بڑا سہرا ڈاکٹر عبد السلام کے سر ہے۔ مگر ان کو تنہا انعام نہ ملنا در اصل ان کی اس پس ماندگی کی قیمت ہے کہ وہ پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں جو اس قسم کی کسی تحقیق کا ساز و سامان اپنے پاس نہیں رکھتا۔ ایسی تحقیق صرف ایسے اداروں میں ہو سکتی ہے جن کے پاس ٹنوں روپیہ ہو، انتہائی قیمتی مشینیں ہوں اور کسی تحقیق کے لئے وہ درجنوں سائنس دانوں کی خدمات حاصل کر سکتے ہوں۔ ایسے ادارے یا امریکہ میں ہیں یا جاپان میں یا مغربی یورپ میں۔

سائنس اگرچہ اپنے کو "کیا ہے" کے سوال تک محدود رکھتی ہے، وہ "کیوں ہے" کے سوال تک جانے کی کوشش نہیں کرتی۔ تاہم یہ ایک واقعہ ہے کہ سائنس نے جو دنیا دریافت کی ہے وہ اتنی پیچیدہ اور حیرت ناک ہے کہ اس کو جاننے کے بعد کوئی آدمی "کیوں ہے" کے سوال سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میکسویل (۱۸۳۱ - ۷۹) وہ شخص ہے جس نے برقی مقناطیسی تعامل (Electromagnetic Interaction) کے قوانین کو ریاضی کی مساواتوں (Equations) میں نہایت کامیابی کے ساتھ بیان کیا۔ انسان سے باہر فطرت کا جو مستقل نظام ہے اس میں کام کرنے والے ایک قانون کا انسانی ذہن کی بنائی ہوئی ریاضیاتی مساوات میں اتنی خوبی کے ساتھ ڈھل جانا اتنا عجیب تھا کہ اس کو دیکھ کر بولٹزمن بے اختیار کہہ اٹھا: وہ کون خدا تھا جس نے یہ نشانیاں لکھ دیں Who was the God who wrote these signs?

ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی نہ کیجئے

ایک شخص سرکاری ملازم تھا۔ شہر میں اس کے پاس ذاتی مکان تھا۔ زندگی آرام سے گزر رہی تھی۔ اس کے بعد اس کو اپنی لڑکی کی شادی کرنی پڑی۔ شادی میں اس نے اپنے محکمہ سے ایک بڑا قرض لے لیا۔ لڑکی کی شادی دھوم سے ہوگئی۔ مگر اس کے بعد ایک نیا مسئلہ سامنے آگیا۔ اس کی تنخواہ میں سے ہر مہینہ قرض کی قسط کٹنے لگی۔ اس کی وجہ سے اس کو ماہانہ ملنے والی رقم تقریباً آدھی ہوگئی۔ خرچ چلنا مشکل ہوگیا۔ میاں بیوی نے مشورہ کیا کہ گھر کا ایک حصہ کرایہ پر دے دیں اور کرایہ میں جو رقم آئے اس کو ملا کر گزارہ کریں۔ انھوں نے ایک بڑا کمرہ اور اس سے ملا ہوا غسل خانہ اپنے لئے رکھا اور باقی پورا مکان کرایہ پر دے دیا۔

اس طرح پانچ سال گزر گئے۔ اس کے بعد کرایہ دار کی نیت بگڑی۔ اس نے چاہا کہ پورے مکان پر قبضہ کرلے۔ اس نے شادی کا بہانہ بناکر مالک مکان سے کہا کہ آپ دو ہفتہ کے لئے اپنا کمرہ ہم کو دے دیں تاکہ ہم اپنے مہمانوں کو ٹھہرا سکیں۔ دو مہینہ کے بعد ہم آپ کا کمرہ خالی کردیں گے۔ کرایہ دار نے وقتی طور پر ان کے لئے جگہ کا بھی انتظام کردیا۔ مالک مکان اس کے کہنے میں آگئے اور کمرہ چھوڑ کر چلے گئے۔ بعد کو کرایہ دار نے ان کا تمام سامان ان کے پاس بھجوا دیا۔ دو ہفتہ گزرنے کے بعد مالک مکان نے اپنے گھر میں آنا چاہا تو کرایہ دار نے ان کو بھگا دیا اور کہا کہ یہ پورا مکان میرا ہے۔ اب اس سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔

اب مالک مکان کیا کریں۔ ان کے کچھ دوستوں نے مشورہ دیا کہ اگر تم مکان خالی کرانے کے لئے مقدمہ کرو تو اس کے فیصلہ میں دس سال لگ جائیں گے۔ تم ایسا کرو کہ کچھ آدمی جمع کرو اور مکان میں گھس کر زبردستی کرایہ دار کو نکال دو اور اس پر قبضہ کرلو۔ مالک مکان نے ایسا ہی کیا۔ مگر کرایہ دار بھی ہوشیار تھا۔ جب مالک مکان نے "حملہ" کیا تو اس نے فوراً پولیس کو رپورٹ کردی۔ پولیس موقع پر پہنچ گئی اور مالک مکان پر فوجداری مقدمہ قائم ہوگیا۔ مقدمہ تقریباً دس سال تک چلتا رہا اور ایک کے بعد ایک کئی مقدمے بنتے چلے گئے۔ مکان کا مسئلہ اپنی جگہ قائم رہا۔ اور فوجداری مقدمات کی پیروی میں مالک مکان برباد ہوکر رہ گئے۔ مزید یہ کہ فوجداری جرم کی وجہ سے ان کی سرکاری ملازمت بھی ختم ہوگئی۔

اس واقعہ میں یہ سبق ہے کہ آدمی کو اولاً اپنے اخراجات کو اتنا بڑھانا نہیں چاہئے کہ اس کو اپنا مکان "گروی" رکھ دینا پڑے۔ اور اگر بالفرض اس سے یہ غلطی ہو جائے تو اس کو ایسا نہ کرنا چاہئے کہ اس کی کسی نادانی سے اس کے "مکان" کا رہا سہا حصہ بھی اس سے چھن جائے۔ اور بالفرض اگر اس سے یہ غلطی بھی ہوجائے تو یہ تو کبھی نہ کرنا چاہئے کہ اپنے کسی اقدام سے وہ اپنے کو فوجداری مجرم بنالے۔ کیوں کہ فوجداری مقدمات میں پھنسنے کا انجام صرف بربادی ہے ——— جو کچھ آپ سے کھویا گیا ہے اس سے آپ آغاز نہیں کرسکتے۔ اس لئے جو کچھ آپ کے پاس ہے اس سے اپنے عمل کا آغاز کیجئے۔ یہی زندگی کی کامیابی کا راز ہے۔

یہ مزاج جب اجتماعی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو اور بھی زیادہ تباہی برپا کرتا ہے۔ کچھ لیڈر جو اپنے بل پر اپنا سیاسی مقصد حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوتے وہ دوسروں کے ساتھ سیاسی اتحاد کا طریقہ اختیار کرتے ہیں اور متحدہ طاقت سے اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک فریق اپنی ہوشیاری سے فائدہ اٹھاکر ملے ہوئے سیاسی فوائد پر قبضہ کرلیتا ہے۔ اب دوسرا فریق برہم ہوکر اس کے خلاف ایجی ٹیشن چلاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ خود اور پوری قوم تہس نہس ہوجاتی ہے۔

انقلابی خوش خیالیاں

شیخ مجیب الرحمٰن کو پاکستانی حکمرانوں سے شکایت تھی۔ انھوں نے بنگلہ دیش کی آزادی کی تحریک چلائی۔ مگر جب بنگلہ دیش آزاد ہو چکا اور وہ اپنے بنائے ہوئے ملک کے سربراہ اعلیٰ بن گئے تو ۱۵ اگست ۱۹۷۵ کو خود ان کے ہم وطنوں نے ان کو اور ان کے سارے خاندان کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد بنگلہ دیش میں فوجی انقلابات کا سلسلہ چل پڑا۔ آخر، نومبر ۱۹۷۵ کو کرنل ابوطاہر ایک خونین انقلاب لانے میں کامیاب ہوئے۔ موجودہ صدر ضیاء الرحمٰن اگرچہ اس وقت جیل میں تھے مگر یہ انقلاب کرنل طاہر اور ضیاء الرحمٰن کے مشترکہ منصوبہ کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ انقلاب کے بعد ضیاء الرحمٰن تخت اقتدار پر بٹھا دئے گئے۔ انقلاب سے پہلے ضیاء اور طاہر ایک دوسرے کے دوست تھے۔ مگر ضیاء الرحمٰن نے جب اقتدار حاصل کر لیا تو کرنل طاہر کا وجود ان کو اپنے اقتدار کے لئے خطرہ نظر آنے لگا۔ ضیاء الرحمٰن نے کرنل طاہر کو گرفتار کر لیا۔ ان پر خصوصی عدالت میں مقدمہ چلا اور بالآخر انھیں گولی مار دی گئی۔ ایک مصنف اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ معنی خیز سوال اٹھاتا ہے:

Was his support to Zia a good revolutionary strategy or revolutionary romanticism that was bound to misfire.

کرنل طاہر کا ضیاء الرحمٰن کی مدد کرنا ایک اچھی انقلابی تدبیر تھی یا وہ ایک انقلابی تخیل پسندی تھی جس کے لئے یہی مقدر تھا کہ اس کا نشانہ خطا کر جائے (ہندستان ٹائمس ۴ نومبر ۱۹۷۹)

اس سوالیہ جملہ کو مثبت جملہ بنا دیا جائے تو یہی موجودہ زمانہ کے اکثر مسلم انقلابیوں کے منصوبہ پر صادق آتا ہے۔ انھوں نے دوسرے عناصر کے ساتھ مل کر بڑے بڑے اقدامات کئے حتی کہ بعض اوقات پورے پورے ملک کو ہلا ڈالا۔ مگر ان کا انقلاب جب اپنے آخری نتیجہ پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس انقلاب کا سارا فائدہ دوسروں کے حصہ میں چلا گیا ہے۔ کامیابیوں کے ہجوم میں اس ناکامی کی واحد وجہ یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہ انقلابی تدبیریں نہ تھیں بلکہ انقلابی خوش خیالیاں تھیں۔ اور حقائق کی اس دنیا میں خوش خیالیوں کی کوئی قیمت نہیں، خواہ ان خوش خیالیوں کے مصنف ایسے لوگ ہوں جن کے معتقدین نے ان کو قائد اکبر اور مفکر اعظم کے خطابات دے رکھے ہوں۔

سیاست، سیاست، سیاست

روس میں اشتراکی انقلاب ۱۹۱۷ میں آیا۔ اس سے پہلے وہاں زار کی شاہی حکومت قائم تھی۔ انقلاب سے پہلے وہاں جو اشتراکی تحریک چل رہی تھی اس کا ایک لیڈر جوزف اسٹالن تھا جو لینن کے مرنے کے بعد روس کا کمیونسٹ حکمراں بنا۔ اپنی تحریک کی کامیابی سے پہلے جوزف اسٹالن نے اشتراکی کارکنوں کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "انقلاب لانے کے لئے ہم کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ اول اسلحہ، دوم اسلحہ، سوم اسلحہ، اور آخر میں پھر اسلحہ۔" موجودہ زمانہ میں ہمارے قائدین نے اس جملہ کو یوں بدل دیا: اسلام کو سربلند کرنے کے لئے ہم کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ اول سیاست، دوم سیاست، سوم سیاست، اور آخر میں پھر سیاست۔ مگر سیاسی طریق کار کے پیچھے اگر ضروری طاقت موجود نہ ہو تو وہ صرف سیاست برائے سیاست ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ کسی حقیقی نتیجہ تک پہنچانے والی ثابت نہیں ہوتی۔

اللہ سے ڈرنے والے

دنیا میں تین قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اللہ کے ڈر سے خالی ہوں۔ ایسے لوگ خواہ زبان سے اللہ کا نام لیتے ہوں، مگر ان کے سینہ میں اللہ کے ڈر کا کوئی خانہ نہیں ہوتا۔ وہ اس طرح رہتے ہیں جیسے کہ وہ آزاد ہیں کہ جو چاہیں کریں۔ ان کے سامنے سارا سوال بس دنیا کے نفع نقصان کا ہوتا ہے۔ جس کام میں نفع نظر آئے اس کی طرف دوڑنا اور جس کام میں نقصان کا اندیشہ ہو اس سے رک جانا، یہ ان کا مذہب ہوتا ہے۔ کسی چیز کا اصولی طور پر برحق ثابت ہو جانا ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ ہمیشہ "دلیل" کے بجائے "مفاد" کو اصل اہمیت دیتے ہیں۔ کوئی کام کرتے ہوئے وہ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ اس معاملہ میں اللہ کی مرضی کیا ہے یا یہ کہ وہ اللہ کے سامنے کیوں کر بری الذمہ ہو سکتے ہیں۔ وہ وہاں جھک جاتے ہیں جہاں ان کا نفس جھکنے کے لئے کہے۔ اور وہاں اکڑ جاتے ہیں جہاں ان کا نفس اکڑنے کی ترغیب دے۔ وہ اللہ سے بےخوف زندگی گزارتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس دنیا سے چلے جاتے ہیں تاکہ اللہ کی عدالت میں حساب دینے کے لئے کھڑے کر دئے جائیں۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کے دل میں حرام وحلال کا لحاظ رہتا ہے۔ ان کو یہ خیال آتا رہتا ہے کہ مرنے کے بعد اللہ کے یہاں حساب کتاب کے لئے حاضر ہونا ہے۔ عام حالات میں وہ اللہ سے ڈر کر زندگی گزارتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں کسی کو ان سے حق تلفی اور برے اخلاق کا تجربہ نہیں ہوتا۔ تاہم وہ اپنی نفسیاتی پیچیدگیوں سے اٹھے ہوئے نہیں ہوتے۔ ان کا خوفِ خدا اتنا مکمل نہیں ہوتا کہ وہ ان کے نفس کے اندر چھپے ہوئے جذبات کا احاطہ کرے۔ عام حالات میں وہ خداترس زندگی گزارتے ہیں۔ مگر جب کوئی غیر معمولی حالت پیش آئے تو اچانک وہ دوسری قسم کے انسان بن جاتے ہیں۔ کبھی کسی کی محبت کا لحاظ، کبھی کسی کے خلاف نفرت کا جذبہ، کبھی اپنی عزت کا سوال ان کے اوپر اس طرح غالب آتا ہے کہ ان کا خوف خدا اس کے نیچے دب کر رہ جاتا ہے۔ یہ عمل چونکہ اکثر غیر شعوری طور پر ہوتا ہے اس لئے بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے اوپر اپنے نفس کے اس حملہ سے آگاہ ہوں اور اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اپنے کو متقیانہ روش پر قائم رکھیں۔ معمول کے حالات میں خداترسی کی زندگی گزارنے والا غیر معمولی حالات میں وہی کچھ کر گزرتا ہے جو پہلی قسم کے لوگ اپنی عام زندگی میں کرتے رہتے ہیں۔

تیسرا انسان وہ ہے جو پورے معنوں میں اللہ سے ڈرنے والا ہو۔ جو اللہ کو پہچاننے کے ساتھ خود اپنے آپ کو بھی پوری طرح پہچان چکا ہو۔ ایسا شخص صرف عام حالات ہی میں اللہ سے نہیں ڈرتا بلکہ غیر معمولی حالات میں بھی اللہ کا خوف اس کا نگراں بنا رہتا ہے۔ کسی کی محبت جب اس کو بےخوفی کے راستہ پر لے جانا چاہتی ہے تو وہ فوراً اس کو دیکھ لیتا ہے۔ کسی سے چھپی ہوئی نفرت جب اس کے نفس میں ابھرتی ہے اور اس کو بےانصافی پر اکساتی ہے تو وہ چونک پڑتا ہے اور اس سے باخبر ہو کر اس کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے۔ ذاتی عزت ووقار کا سوال جب اس کے اندر داخل ہو کر اس کو کسی حق کے اعتراف سے روکتا ہے تو وہ بلا تاخیر اس کو جان لیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی تمام خامیوں سے آگاہ ہو کر اپنی اصلاح کرتا رہتا ہے۔ اس کا مسلسل احتساب اس کو ایسے مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں وہ اپنے آپ کو انتہائی بے لاگ نظر سے دیکھ سکے۔ بالفاظ دیگر، وہ اپنے آپ کو اس حقیقی نظر سے دیکھنے لگتا ہے جس نظر سے اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔

بے شک جن لوگوں نے انکار کیا، ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ کے مقابلہ میں ان کے کچھ کام نہ آئیں گے۔ اور یہی لوگ آگ کے ایندھن ہوں گے۔ ان کا انجام ویسا ہی ہوگا جیسا فرعون والوں کا اور ان سے پہلے والوں کا ہوا۔ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا۔ اس پر اللہ نے ان کے گناہوں کے باعث ان کو پکڑ لیا۔ اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ انکار کرنے والوں سے کہہ دو کہ اب تم مغلوب کیے جاؤ گے اور جہنم کی طرف جمع کرکے لے جائے جاؤ گے اور جہنم بہت برا ٹھکانا ہے۔ بے شک تمھارے لیے نشانی ہے ان دو گروہوں میں جن میں (بدر میں) مڈبھیڑ ہوئی۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا منکر تھا۔ یہ منکر کھلی آنکھوں سے ان کو دوگنا دیکھتے تھے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی مدد کا زور دے دیتا ہے۔ اس میں آنکھ والوں کے لیے بڑا سبق ہے　۱۳-۱۰

حق کی دعوت جب بھی اٹھتی ہے تو وہ لوگوں کو ایک غیر اہم آواز معلوم ہوتی ہے۔ ایک طرف وقت کا ماحول ہوتا ہے جس کے قبضہ میں ہر قسم کے مادی وسائل ہوتے ہیں۔ دوسری طرف حق کا قافلہ ہوتا ہے جس کو ابھی ماحول میں کوئی جماؤ حاصل نہیں ہوتا، اس کے ساتھ مادی مفادات وابستہ نہیں ہوتے۔ ان حالات میں حق کی طرف بڑھنا ماحول سے کٹنے اور مفادات سے محروم ہونے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے مفادات کو بچانے کی خاطر حق کو نہیں مانتا۔ اپنے ساتھیوں اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر ایک تنہا داعی کی صف میں آنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ مگر یہ چیزیں جو انسان کو آج اہم نظر آتی ہیں وہ فیصلہ کے دن کسی کے کچھ کام نہ آئیں گی۔ ان چیزوں کی جو کچھ اہمیت ہے صرف اس وقت تک ہے جب کہ معاملہ انسان اور انسان کے درمیان ہے۔ جب قیامت کا پردہ پھٹے گا اور معاملہ انسان اور خدا کے درمیان ہوجائے گا تو یہ چیزیں اتنی بے قیمت ہوجائیں گی جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ داعی اس دنیا میں بظاہر بے زور دکھائی دیتا ہے مگر حقیقت میں وہی زور والا ہے۔ کیوں کہ اس کے پیچھے خدا ہے۔ منکر بظاہر اس دنیا میں طاقت ور دکھائی دیتا ہے۔ مگر وہ بالکل بے طاقت ہے۔ کیوں کہ اس کی طاقت ایک وقتی فریب کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

نبوت کے چودھویں سال بدر کا معرکہ آخرت میں ہونے والے واقعہ کا ایک دنیوی نمونہ تھا۔ حق کا انکار کرنے والے تعداد اور طاقت میں بہت زیادہ تھے اور حق کو ماننے والے تعداد اور طاقت میں بہت کم تھے۔ اس کے باوجود منکرین کو غیر معمولی شکست ہوئی اور حق کے پیروؤں کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔ یہ ایک واضح ثبوت ہے کہ اللہ ہمیشہ حق کے پیروؤں کی جانب ہوتا ہے۔ اتنے غیر معمولی فرق کے باوجود اتنی غیر معمولی فتح اللہ کی مدد کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ یہ خدا کی طرف سے اس بات کا ایک مظاہرہ ہے کہ حق اس عالم میں تنہا نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ منکرین کے لیے وہ ایک ظاہری دلیل بھی ہے جس میں وہ دیکھ سکتے ہیں کہ خدا کی اس دنیا میں وہ کتنے بے جگہ ہیں ـــــ داعی حق کے کلام اور اس کی زندگی میں کھلی ہوئی علامتیں ہوتی ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ مگر جو سرکش لوگ ہیں وہ اس کو رد کرنے کے لیے الفاظ کی ایک پناہ گاہ بنا لیتے ہیں۔ وہ جھوٹی توجیہات میں جیتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ آخرت کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں، صرف یہ جاننے کے لیے کہ وہ جن الفاظ کا سہارا لیے ہوئے تھے وہ حقیقت کے اعتبار سے کس قدر بے معنی تھے۔

لوگوں کے لئے خوش نما کر دی گئی ہے محبت خواہشوں کی ـــــــ عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان لگے ہوئے گھوڑے، مویشی اور کھیتی۔ یہ دنیوی زندگی کے سامان ہیں۔ اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔ کہو، کیا میں تم کو بتاؤں اس سے بہتر چیز۔ ان لوگوں کے لئے جو ڈرتے ہیں ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور ستھری بیویاں ہوں گی اور اللہ کی رضامندی ہوگی۔ اور اللہ کی نگاہ میں ہیں اس کے بندے، جو کہتے ہیں اے ہمارے رب، ہم ایمان لے آئے۔ پس تو ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ وہ صبر کرنے والے ہیں اور سچے ہیں فرماں بردار ہیں اور خرچ کرنے والے ہیں اور پچھلی رات کو مغفرت مانگنے والے ہیں ۱۴ ــ ۱۷

دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس لئے یہاں کی چیزوں میں آدمی کے لئے ظاہری کشش رکھی گئی ہے۔ اب خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون ہے جو ظاہری کشش سے متاثر ہو کر دنیا کی چیزوں میں کھو جاتا ہے۔ اور کون ہے جو اس سے اوپر اٹھ کر آخرت کی ان دیکھی چیزوں کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے۔ آدمی کو دنیا کی چیزوں میں تسکین ملتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ماحول کے اندر ان کے ذریعہ سے وقار قائم ہوتا ہے۔ یہ چیزیں ہوں تو اس کے سب کام بنتے چلے جاتے ہیں۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہی چیزیں اصل اہمیت کی چیزیں ہیں۔ اس کی دلچسپیاں اور سرگرمیاں سمٹ کر بیوی بچوں اور مال و جائداد کے گرد جمع ہو جاتی ہیں یہی چیز آخرت کے تقاضوں کی طرف بڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ دنیا کی چیزوں کی اہمیت کا احساس آدمی کو آخرت کی چیزوں کی طرف سے غافل کر دیتا ہے۔ دنیا میں اپنے بچوں کے مستقبل کی تعمیر میں وہ اتنا مشغول ہوتا ہے کہ اس کو یاد نہیں رہتا کہ دنیا سے ماورا بھی کوئی "مستقبل" ہے جس کی تعمیر کی اس کو فکر کرنا چاہئے۔ دنیا میں اپنے گھر کو آباد کرنا اس کے لئے اتنا محبوب بن جاتا ہے کہ اس کو کبھی خیال نہیں آتا کہ اس کے سوا بھی کوئی "گھر" ہے جس کی آبادی میں اس کو لگنا چاہئے۔ دنیا میں دولت سمیٹنا اور جائداد بنانا اس کو اتنا زیادہ قیمتی معلوم ہوتے ہیں کہ وہ سوچ نہیں پاتا کہ اس کے سوا بھی کوئی "دولت" ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے وہ اپنے کو وقف کرے۔ مگر اس قسم کی تمام چیزیں صرف موجودہ عارضی زندگی کی رونق ہیں۔ اگلی طویل تر زندگی میں وہ کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں۔

جو شخص آخرت کی مستقل زندگی کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے اس کی زندگی کیسی زندگی ہوگی۔ دنیا کی رونقیں اس کی نظر میں حقیر بن جائیں گی۔ وہ اس یقین سے بھر جائے گا کہ آخرت کا معاملہ تمام تر اللہ کے اختیار میں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ سب سے زیادہ اللہ سے ڈرے گا اور سب سے زیادہ آخرت کا حریص بن جائے گا۔ معاملات میں وہ اپنی خواہش کے پیچھے نہیں چلے گا بلکہ اللہ کی عدالت کو سامنے رکھ کر اپنا رویہ متعین کرے گا۔ اس کے قول و عمل میں فرق نہیں ہوگا۔ اس کا مال اپنا مال نہ رہے گا بلکہ خدا کے لئے وقف ہو جائے گا۔ اللہ کی راہ میں چلنے میں خواہ کتنی ہی مشکلیں پیش آئیں وہ پوری استقامت کے ساتھ اس پر قائم رہے گا۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوگا کہ اللہ کو چھوڑنے کے بعد کوئی نہیں ہے جو اس کا سہارا بنے۔ اس کا دل اللہ کی یاد سے اس طرح پگھل اٹھے گا کہ وہ بے تابانہ اس کو پکارنے لگے گا۔ اس کی تنہائیاں اپنے رب کی صحبت میں بسر ہونے لگیں گی۔ اللہ کے عظمت و کمال کے آگے اس کو اپنا وجود سرتاپا غلطی نظر آئے گا۔ اس کے پاس کہنے کے لئے اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ ـــ اے میرے رب مجھے معاف کر دے۔

اللہ کی گواہی ہے اور فرشتوں کی اور اہل علم کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ قائم رکھنے والا ہے انصاف کا۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔ اور اہل کتاب نے اس میں جو اختلاف کیا وہ آپس کی ضد کی وجہ سے کیا، بعد اس کے کہ ان کو صحیح علم پہنچ چکا تھا۔ اور جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرے تو اللہ یقیناً جلد حساب لینے والا ہے۔ پھر اگر وہ تم سے اس بارے میں جھگڑیں تو ان سے کہہ دو کہ میں اپنا رخ اللہ کی طرف کر چکا اور جو میرے پیرو ہیں وہ بھی۔ اور اہل کتاب سے اور اَن پڑھوں سے پوچھو کیا تم بھی اسی طرح اسلام لاتے ہو۔ اگر وہ اسلام لائیں تو انھوں نے راہ پالی۔ اور اگر وہ پھر جائیں تو تمھارے اوپر صرف پہنچا دینا ہے۔ اور اللہ کی نگاہ میں ہیں اس کے بندے۔ جو لوگ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے ہیں اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ان لوگوں کو مار ڈالتے ہیں جو لوگوں میں سے انصاف کی دعوت لے کر اٹھتے ہیں، ان کو ایک دردناک سزا کی خوش خبری دے دو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور ان کا مددگار کوئی نہیں ۲۲-۱۸

کائنات کا خدا ایک ہی خدا ہے اور وہ عدل وقسط کو پسند کرتا ہے۔ تمام آسمانی کتابیں اپنی صحیح صورت میں اسی کا اعلان کر رہی ہیں۔ پھیلی ہوئی کائنات جو اس کا مالک اپنے غیر مرئی کارندوں (فرشتوں) کے ذریعہ چلا رہا ہے وہ کامل طور پر ویسی ہی ہے جیسا کہ اس کو ہونا چاہئے۔ ثابت شدہ علم انسانی کے مطابق کائنات ایک حد درجہ وحدانی نظام ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ کائنات کا مدبر صرف ایک ہے۔ اسی طرح کائنات کی ہر چیز کا اپنے محل مناسب میں ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا خدا عدل کو پسند کرنے والا خدا ہے نہ کہ بے انصافی کو پسند کرنے والا۔ پھر جو خدا وسیع تر کائنات میں مسلسل عدل کو قائم کئے ہوئے ہو وہ انسان کے معاملہ میں خلاف عدل باتوں پر کیسے راضی ہو جائے گا۔

کائنات کا ہر جزء کامل طور پر "مسلم" ہے۔ یعنی اپنی سرگرمیوں کو اللہ کے مقررہ نقشہ کے مطابق انجام دیتا ہے۔ ٹھیک یہی رویہ انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے رب کو پہچانے اور اس کے مطلوبہ نقشہ کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لے۔ اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا مرکز توجہ بنانا یا یہ خیال کرنا کہ اللہ کا فیصلہ عدل کے سوا کسی اور بنیاد پر ہو سکتا ہے، ایسی بے اصل بات ہے جس کے لئے موجودہ کائنات میں کوئی گنجائش نہیں۔

قرآن کی دعوت اسی سچے اسلام کی دعوت ہے۔ جو لوگ اس سے اختلاف کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کا حق ہونا ان پر واضح نہیں ہے۔ اس کی وجہ ضد ہے۔ اس کو ماننا انھیں داعیٔ قرآن کی فکری برتری تسلیم کرنے کے ہم معنی نظر آتا ہے، اور ان کی حسد اور کبر کی نفسیات اس قسم کا اعتراف کرنے پر راضی نہیں۔ سیدھی طرح حق کو مان لینے کے بجائے وہ چاہتے ہیں کہ اس زبان ہی کو بند کر دیں جو حق کا اعلان کر رہی ہے۔ تاہم خدا کی دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ داعیٔ حق کی زبان کو بند کرنے کے لئے ان کا ہر منصوبہ ناکام ہوگا اور جب خدا کے عدل کا ترازو کھڑا ہوگا تو وہ دیکھ لیں گے کہ ان کے وہ اعمال کس قدر بے قیمت تھے جن کے بل پر وہ اپنی نجات اور کامیابی کا یقین کئے ہوئے تھے ——— یہی دلیل خدا کی نشانی ہے۔ جو شخص دلیل کے سامنے نہیں جھکتا وہ گویا خدا کے سامنے نہیں جھکتا۔ ایسے لوگ قیامت میں اس طرح اٹھیں گے کہ وہ سب سے زیادہ بے سہارا ہوں گے۔

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو اللہ کی کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا۔ ان کو اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جا رہا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ پھر ان کا ایک گروہ منھ پھیر لیتا ہے بے رخی کرتے ہوئے۔ یہ اس سبب سے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو ہرگز آگ نہ چھوئے گی بجز گنے ہوئے چند دنوں کے۔ اور ان کی بنائی ہوئی باتوں نے ان کو ان کے دین کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ پھر اس وقت کیا ہوگا جب ہم ان کو جمع کریں گے ایک دن جس کے آنے میں کوئی شک نہیں اور ہر شخص کو جو کچھ اس نے کیا ہے، اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ تم کہو، اے اللہ، سلطنت کے مالک تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔ اور تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے۔ تیرے ہاتھ میں ہے سب خوبی۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ اور تو بے جان سے جان دار کو نکالتا ہے اور تو جان دار سے بے جان کو نکالتا ہے۔ اور تو جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے
۲۳ ـ ۲۷

اللہ کی ہدایت ایک ہی ہدایت ہے جو مختلف قوموں کی زبان میں ان کے پیغمبروں پر اتاری جاتی رہی ہے۔ وہی قرآن کی صورت میں پیغمبر آخرالزماں پر اتاری گئی ہے۔ اس یکسانیت کی وجہ سے آسمانی کتابوں کو جاننے اور ماننے والوں کے لئے قرآن کی دعوت کو پہچاننا مشکل نہیں۔ قرآن کی دعوت میں اور پچھلی آسمانی تعلیمات میں اگر کچھ فرق ہے تو صرف یہ کہ قرآن کی دعوت ان کی اپنی ملاوٹوں سے دین خداوندی کو پاک کر رہی ہے۔ اس کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ بہت سے لوگ قرآن کی دعوت کا انکار کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی دعوت کو وہ اپنے لئے کوئی سنجیدہ معاملہ نہیں سمجھتے۔ اپنے خودساختہ عقائد کی بنا پر انھوں نے اپنے کو جہنم کی آگ سے محفوظ فرض کر لیا ہے۔ اپنی اس نفسیات کے تحت وہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ اس حق کا اعتراف نہ کریں تو اس سے ان کی نجات خطرہ میں پڑنے والی نہیں۔ مگر جب خدا کے انصاف کا ترازو کھڑا ہوگا اس وقت ان کو معلوم ہوگا کہ وہ محض خوش خیالیوں کے اندھیرے میں پڑے ہوئے تھے۔

ہر قسم کی عزت و طاقت اللہ کے اختیار میں ہے۔ وقت کے بڑے جس کو بے حقیقت سمجھ لیں، خدا چاہے تو اسی کے حق میں عزت و سربلندی کا فیصلہ کر دے۔ علم کی گدیوں پر بیٹھنے والے جس کے جہل کا فتویٰ دیں، خدا چاہے تو اسی کے ذریعہ علم کا چشمہ جاری کر دے۔ خدا کی نظر میں اگر کوئی عزت و طاقت کا مستحق ہو سکتا ہے تو وہ جو اس کو خالص خدا کی چیز سمجھے اور خدا کی نظر میں اس کا سب سے زیادہ غیر مستحق اگر کوئی ہے تو وہ جو اس کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ لے۔ خدا وسیع تر کائنات میں روزانہ بہت بڑے پیمانہ پر یہ کرشمہ دکھا رہا ہے کہ وہ تاریکی کو روشنی کے اوپر اڑھا دیتا ہے اور روشنی کو تاریکی کے اوپر ڈال دیتا ہے۔ وہ مردہ عناصر سے زندگی وجود میں لاتا ہے اور زندہ چیزوں کو مردہ عناصر میں تبدیل کرتا ہے۔ خدا کی یہی قدرت اگر انسانی تاریخ میں ظاہر ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ جو لوگ حق کے نام پر ناحق کا کاروبار کر رہے ہوں وہ ہمیشہ سچی دعوت حق کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ ایسے داعی کو بے گھر کیا جاتا ہے۔ اس کے معاشی ذرائع برباد کئے جاتے ہیں۔ مگر ایسا شخص براہ راست اللہ کی سرپرستی میں ہوتا ہے۔ وہ اس کے لئے خصوصی رزق کا انتظام کرتا ہے۔ دوسروں کو ان کی معاشی محنت کے حساب سے رزق دیا جاتا ہے اور ایسے شخص کو بلا حساب۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں۔ اور جو شخص ایسا کرے گا تو اللہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مگر ایسی حالت میں کہ تم ان سے بچاؤ کرنا چاہو۔ اور اللہ تم کو ڈراتا ہے اپنی ذات سے۔ اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ کہہ دو کہ جو کچھ تمھارے سینوں میں ہے اس کو چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ اس کو جانتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس دن ہر شخص اپنی کی ہوئی نیکی کو اپنے سامنے موجود پائے گا، اور جو برائی کی ہوگی اس کو بھی۔ اس دن ہر آدمی یہ چاہے گا کہ کاش ابھی یہ دن اس سے بہت دور ہوتا۔ اور اللہ تم کو ڈراتا ہے اپنی ذات سے۔ اور اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ کہو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔ اور تمھارے گناہوں کو معاف کردے گا۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔ کہو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی۔ پھر اگر وہ اعراض کریں تو اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا ۲۸ — ۳۲

مومن تمام انسانوں کے ساتھ نیکی اور عدل کا سلوک کرنے والا ہوتا ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں۔ مگر جب غیر مسلموں کے ساتھ دوستی مسلمانوں کے مفاد کی قیمت پر ہو تو ایسی دوستی مسلمان کے لئے جائز نہیں۔ تاہم بچاؤ کی تدبیر کے طور پر اگر کسی وقت ایک مسلمان یا کسی مسلم گروہ کو غیر مسلموں سے وقتی تعلق قائم کرنا پڑے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اللہ نیت کو دیکھتا ہے اور جب نیت درست ہو تو وہ کسی کو اس کے عمل پر نہیں پکڑتا۔ تمام معاملات میں اصل قابل لحاظ چیز اللہ کا خوف ہے۔ آدمی کسی معاملہ میں جو رویہ اختیار کرے، اس کو اچھی طرح سوچ لینا چاہئے کہ اللہ اس کا حساب لے گا۔ اور اس کے انصاف کے ترازو میں جو غلط ٹھہرے گا وہ اس کی سزا پاکر رہے گا۔ اللہ سے کسی انسان کی کوئی بات اوجھل نہیں، خواہ وہ اس نے چھپ کر کی ہو یا علانیہ کی ہو۔ جب امتحان کا پردہ ہٹے گا اور آخرت کا عالم سامنے آئے گا تو آدمی کے اعمال کی پوری کھیتی اس کے سامنے ہوگی۔ یہ منظر اتنا ہولناک ہوگا کہ وہ چیزیں جو دنیا میں اس کے نفس کی لذت بنی ہوئی تھیں، وہ چاہے گا کہ وہ اس سے بہت دور چلی جائیں۔

اللہ کسی کے اسلام کو جہاں دیکھتا ہے وہ اس کا قلب ہے۔ مومن وہ ہے جس کا اللہ سے تعلق قلبی محبت کی حد تک قائم ہو جائے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو اللہ کی محبت و توجہ کا مستحق بنتے ہیں۔ اور جو شخص اللہ سے اس طرح تعلق قائم کرلے اس سے اگر کوتاہیاں بھی ہوتی ہیں تو اللہ اس سے درگزر فرماتا ہے۔ اللہ سرکشوں کے لئے بہت سخت ہے۔ مگر جو لوگ عاجزی کا رویہ اختیار کریں وہ ان کے لئے نرم پڑجاتا ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جس سینہ میں کسی کی محبت موجود ہو اسی سینہ میں محبوب کے دشمن کی محبت جمع نہیں ہوسکتی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محبوب اگر ایسی ہستی ہو جو آدمی کے لئے آقا و مالک کا درجہ رکھتی ہو تو اس کے ساتھ محبت صرف محبت کی حد تک نہ رہے گی بلکہ لازماً وہ اطاعت و فرماں برداری کا جذبہ پیدا کرے گی۔ خدا کی جس محبت کے بعد خدا کے دشمنوں سے قلبی تعلق ختم نہ ہو یا اس کی اطاعت و فرماں برداری کا جذبہ پیدا نہ ہو وہ جھوٹی محبت ہے۔ ایسے شخص کا شمار اللہ کے یہاں انکار کرنے والوں میں ہوگا نہ کہ ماننے والوں میں ——— رسول وہ شخص ہے جس کے کامل خدا پرست ہونے کی گواہی خود خدا نے دی ہے، اس لئے خدا پرستانہ زندگی کے لئے رسول کا نمونہ ہی موجودہ دنیا میں واحد مستند نمونہ ہے۔

بے شک اللہ نے آدم کو اور نوح کو اور آل ابراہیم کو اور آل عمران کو سارے عالم کے اوپر منتخب کیا ہے۔ یہ ایک دوسرے کی اولاد ہیں۔ اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ جب عمران کی بیوی نے کہا اے میرے رب میں نے نذر کیا تیرے لئے جو میرے پیٹ میں ہے وہ آزاد رکھا جائے گا۔ پس تو مجھ سے قبول کر بے شک تو سننے والا جاننے والا ہے۔ پھر جب اس نے جنا تو اس نے کہا اے میرے رب میں تو لڑکی جنی ہوں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ اس نے کیا جنا ہے اور لڑکا نہیں ہوتا لڑکی کی مانند۔ اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ پس اس کے رب نے اس کو اچھی طرح قبول کیا اور اس کو عمدہ طریقہ سے پروان چڑھایا اور زکریا کو اس کا سرپرست بنایا۔ جب کبھی زکریا ان کے پاس حجرہ میں آتا تو وہاں رزق پاتا۔ اس نے پوچھا اے مریم یہ چیز تمھیں کہاں سے ملتی ہے۔ مریم نے کہا یہ اللہ کے پاس سے ہے بے شک اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دے دیتا ہے۔ اس وقت زکریا نے اپنے رب کو پکارا۔ اس نے کہا اے میرے رب مجھ کو اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا کر بے شک تو دعا کا سننے والا ہے۔ پھر فرشتوں نے اس کو آواز دی جب کہ وہ حجرہ میں کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا تھا کہ اللہ تجھ کو یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے جو کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والا ہوگا اور سردار ہوگا اور اپنے نفس کو روکنے والا ہوگا اور نبی ہوگا نیکوں میں سے۔ زکریا نے کہا اے میرے رب میرے لڑکا کس طرح ہوگا حالاں کہ میں بوڑھا ہو چکا اور میری عورت بانجھ ہے۔ فرمایا اسی طرح اللہ کر دیتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ زکریا نے کہا اے میرے رب میرے لئے کوئی نشانی مقرر کر دے۔ کہا تمھارے لئے نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے بات نہ کر سکو گے مگر اشارہ سے اور اپنے رب کو کثرت سے یاد کرتے رہو اور شام اور صبح اس کی تسبیح کرو۔ اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ نے تم کو منتخب کیا اور تم کو پاک کیا اور تم کو دنیا بھر کی عورتوں کے مقابلہ میں منتخب کیا ہے۔ اے مریم اپنے رب کی فرماں برداری کرو اور سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو وحی کر رہے ہیں اور تم ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنے قرعے ڈال رہے تھے کہ کون مریم کی سرپرستی کرے اور نہ تم اس وقت ان کے پاس موجود تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے

۳۳ — ۴۴

اللہ نے حضرت زکریا کو بڑھاپے میں اولاد دی، حضرت مریم کو حجرہ میں رزق پہنچایا، حضرت مسیح کو بغیر باپ کے پیدا کیا، آل ابراہیم میں ایسے صلحاء پیدا کئے جن کو خدا کی پیغام بری کے لئے چنا جائے۔ اللہ نے اپنے ان بندوں کو یہ انعامات یوں ہی نہیں دئے بلکہ ان کو اس کا مستحق پاکر ایسا کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنی اولاد سے معاشی توقعات قائم نہیں کیں، ان کی خوشی اس میں تھی نہ ان کی اولاد اللہ کی راہ میں سرگرم ہو۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے اندر اس تمنا کی پرورش کی کہ ان کی اولاد شیطان سے بچی رہے، وہ نیک بندوں کی جماعت میں شامل ہو جائے۔ کسی کے اندر بھلائی دیکھ کر وہ حسد اور جلن میں مبتلا نہیں ہوئے۔ ان کے نیک جذبات کے اثر سے ان کی اولاد بھی ایسی ہوئی جو دنیا کی زندگی میں اپنے نفس پر قابو رکھنے والی ہو، وہ اللہ کو یاد کرے، بدی اور نیکی کے درمیان وہ نیکی کے راستہ کو اختیار کرے ـــــ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ اپنے رزق خاص سے کھلاتا پلاتا ہے اور ان کو اپنی خصوصی رحمت کے لئے قبول کر لیتا ہے۔

جب فرشتوں نے کہا اے مریم، اللہ تم کو خوش خبری دیتا ہے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ وہ دنیا اور آخرت میں مرتبہ والا ہوگا اور اللہ کے مقرب بندوں میں ہوگا۔ وہ لوگوں سے باتیں کرے گا جب ماں کی گود میں ہوگا اور جب پوری عمر کا ہوگا۔ اور وہ صالحین میں سے ہوگا۔ مریم نے کہا اے میرے رب، میرے کس طرح لڑکا ہوگا جب کہ کسی مرد نے مجھ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ فرمایا اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہوجا اور وہ ہوجاتا ہے۔ اور اللہ اس کو کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل سکھائے گا اور وہ رسول ہوگا بنی اسرائیل کی طرف کہ میں تمھارے پاس تمھارے رب کی نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمھارے لئے مٹی سے پرندہ کی مانند صورت بناتا ہوں، پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے واقعی پرندہ بن جاتی ہے۔ اور میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں۔ اور میں اللہ کے حکم سے مردے کو زندہ کرتا ہوں۔ اور میں تم کو بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں کیا ذخیرہ کرتے ہو۔ بے شک اس میں تمھارے لئے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ اور میں تصدیق کرنے والا ہوں تورات کی جو مجھ سے پہلے کی ہے اور میں اس لئے آیا ہوں کہ بعض ان چیزوں کو تمھارے لئے حلال ٹھہراؤں جو تم پر حرام کردی گئی ہیں۔ اور میں تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ بے شک اللہ میرا رب ہے اور تمھارا بھی۔ پس اس کی عبادت کرو، یہی سیدھی راہ ہے ۵۱ ــ ۴۵

یہود کی نسل کو اللہ نے اس خاص منصب کے لئے چن لیا تھا کہ ان پر اپنی ہدایت اتارے تاکہ وہ خود اللہ کے راستہ پر چلیں اور دوسروں کو اس سے آگاہ کریں۔ مگر بعد کے زمانہ میں یہود کے اندر بگاڑ آگیا۔ حتیٰ کہ اللہ کی نظر میں وہ اس قابل نہ رہے کہ آسمانی ہدایت کے امین بن سکیں۔ اب اللہ کا فیصلہ یہ ہوا کہ یہ امانت ان سے چھین کر آل ابراہیم کی دوسری شاخ (بنی اسماعیل) کو دے دی جائے۔ اس فیصلہ کے نفاذ سے پہلے یہود پر اتمام حجت ضروری تھا۔ حضرت مسیح اسی اتمام حجت کے لئے بھیجے گئے۔ آنجناب کی فوق العادت پیدائش اور آپ کو غیر معمولی معجزات کا دیا جانا اسی لئے تھا کہ یہود کو اس بارے میں کوئی شبہ نہ رہے کہ آپ خدا کے بھیجے ہوئے ہیں اور خدا کی طرف سے بول رہے ہیں۔ حضرت مسیح اپنے ساتھ نہ صرف فوق الفطری نشانیاں رکھتے تھے بلکہ وہ اتنے مؤثر اور مدلل انداز میں بولتے تھے کہ ان کے زمانہ میں کوئی اس طرح بولنے پر قادر نہ تھا۔ پہلی بار جب آپ نے یروشلم کے ہیکل میں تقریر کی تو یہودی علماء آپ کی باتوں کو سن کر دنگ رہ گئے (یوحنا ۲ : ۴۸) یہ ان کی معجزنما شخصیت اور ان کے مبہوت کردینے والے کلام ہی کا اثر تھا کہ اگرچہ آپ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے مگر آپ کے سامنے کسی کو جرأت نہ ہوسکی کہ اس پہلو سے آپ کو مطعون کرے۔ تاہم یہود اتنے بے حس اور اتنے سرکش ہوچکے تھے کہ انتہائی کھلے کھلے دلائل سامنے آجانے کے باوجود انھوں نے آپ کو ماننے سے انکار کردیا۔ "اس میں نشانی ہے ایمان والوں کے لئے" ــــ یعنی جو دلیل پیش کی جارہی ہے وہ بذات خود اگرچہ مکمل ہے۔ مگر وہ اسی شخص کے لئے دلیل بنے گی جو ماننے کا مزاج رکھتا ہو۔ جس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ اپنے خیالات کے کہر سے باہر آکر دلیل پر غور کرے۔ جس کی فطرت اس حد تک زندہ ہو کہ ذاتی وقار کا سوال اس کے لئے حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ نہ بنے۔

پھر جب عیسیٰ نے ان کا انکار دیکھا تو کہا کہ کون میرا مددگار بنتا ہے اللہ کی راہ میں۔ حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور آپ گواہ رہئے کہ ہم فرماں بردار ہیں۔ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے اتارا، اور ہم نے رسول کی پیروی کی۔ پس تو لکھ لے ہم کو گواہی دینے والوں میں۔ اور انھوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی۔ اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ جب اللہ نے کہا کہ اے عیسیٰ میں تم کو وفات دینے والا ہوں اور تم کو اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں اور جن لوگوں نے انکار کیا ہے ان سے تمھیں پاک کرنے والا ہوں اور جو تمھارے پیرو ہیں ان کو قیامت تک ان لوگوں پر غالب کرنے والا ہوں جنھوں نے تمھارا انکار کیا ہے۔ پھر میری طرف ہوگی سب کی واپسی۔ پس میں تمھارے درمیان ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ کروں گا جن میں تم جھگڑتے تھے۔ پھر جو لوگ منکر ہوئے ان کو سخت عذاب دوں گا دنیا میں اور آخرت میں اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کو اللہ ان کا پورا اجر دے گا اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ یہ ہم تم کو سناتے ہیں اپنی آیتیں اور پُرحکمت مضامین۔ بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے۔ اللہ نے اس کو مٹی سے بنایا۔ پھر اس کو کہا کہ ہوجا تو وہ ہوگیا۔ حق بات ہے تیرے رب کی طرف سے۔ پس تم نہ ہو شک کرنے والوں میں۔ پھر جو تم سے اس بارے میں حجت کرے بعد اس کے کہ تمھارے پاس علم آچکا ہے تو ان سے کہو کہ آؤ، ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو اور تمھارے بیٹوں کو، اپنی عورتوں کو اور تمھاری عورتوں کو۔ اور ہم اور تم خود بھی جمع ہوں۔ پھر ہم مل کر دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ بے شک یہ سچا بیان ہے۔ اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ ہی زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ پھر اگر وہ قبول نہ کریں تو اللہ مفسدوں کو جاننے والا ہے ۵۲-۶۳

بنی اسرائیل کے بڑوں نے حضرت مسیح کو ماننے سے انکار کردیا۔ بڑوں کے ہاتھ میں ہر قسم کے وسائل ہوتے ہیں، مزید یہ کہ مذہب کی گدیوں پر قابض ہونے کی وجہ سے عوام کی نظر میں وہی مذہب کے نمائندے ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ جس کو رد کردیں وہ نہ صرف وسائل حیات سے محروم ہوجاتا ہے بلکہ حق کی خاطر سب کچھ کھونے کے بعد بھی لوگوں کی نظر میں بد دین ہی بنا رہتا ہے۔ ایسے وقت میں داعیٔ حق کا ساتھ دینا انتہائی مشکل کام ہے۔ یہ شبہات اور مخالفتوں کی عمومی فضا میں اس کی صداقت پر گواہ بننا ہے۔ یہ حق کی جانب اس وقت کھڑا ہونا ہے جب کہ حق تنہا رہ گیا ہو۔

حق جب اپنی بے آمیز صورت میں اٹھتا ہے تو وہ تمام لوگ اپنے اوپر اس کی زد پڑتی ہوئی محسوس کرتے ہیں جو اپنی خلاف حق زندگی پر حق کا لیبل لگا کر لوگوں کے درمیان عزت کا مقام حاصل کئے ہوئے تھے۔ وہ داعی کو زیر کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ طرح طرح کے شوشے نکال کر عوام کو اس کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ اور بالآخر طاقت کے ذریعہ اس کو مٹا دینے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ مگر اللہ کی نصرت ہمیشہ داعی کے ساتھ ہوتی ہے، اس لئے کوئی مخالفت اس کی آواز کو دبانے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ مخالفتوں کے علی الرغم وہ اپنے مشن کو مکمل کرتا ہے ——— جو لوگ دعوت حق کے مخالف بنیں وہ اللہ کی نظر میں مفسد ہیں۔ کیوں کہ وہ لوگوں کو جنت کی طرف جانے سے روکتے ہیں۔ اس سے بڑا کوئی فساد نہیں ہوسکتا کہ خدا کے بندوں کو خدا کی جنت کی طرف جانے سے روکا جائے۔

کہو اے اہل کتاب، آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مسلّم ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے۔ پھر اگر وہ اس سے اعراض کریں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو، ہم فرماں بردار ہیں۔ اے اہل کتاب، تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو، حالاں کہ تورات اور انجیل تو اس کے بعد اتری ہیں۔ کیا تم اس کو نہیں سمجھتے۔ تم وہ لوگ ہو کہ تم اس بات کے بارے میں جھگڑے جس کا تمھیں کچھ علم تھا۔ اب تم ایسی بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمھیں کوئی علم نہیں۔ اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی۔ بلکہ حنیف مسلم تھا اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ لوگوں میں زیادہ مناسبت ابراہیم سے ان کو ہے جنھوں نے اس کی پیروی کی اور یہ پیغمبر اور جو اس پر ایمان لائے۔ اور اللہ ایمان والوں کا ساتھی ہے۔ اہل کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تم کو گمراہ کر دے۔ حالاں کہ وہ نہیں گمراہ کرتے مگر خود اپنے آپ کو۔ مگر وہ اس کا احساس نہیں کرتے۔ اے اہل کتاب، اللہ کی نشانیوں کا کیوں انکار کرتے ہو حالاں کہ تم گواہ ہو۔ اے اہل کتاب، تم کیوں صحیح میں غلط کو ملاتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو۔ حالاں کہ تم جانتے ہو ۷۱ - ۶۴

توحید نہ صرف پیغمبروں کی اصل تعلیم ہے بلکہ تورات اور انجیل کے موجودہ غیر مستند نسخوں میں بھی وہ ایک مسلّم حقیقت کے طور پر موجود ہے۔ اس مسلّمہ معیار پر جانچا جائے تو اسلام ہی کامل طور پر صحیح دین ثابت ہوتا ہے نہ کہ یہودیت اور نصرانیت۔ توحید کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو ایک مانا جائے۔ صرف اسی کی عبادت کی جائے۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ کسی انسان کو وہ مقام نہ دیا جائے جو مالک کائنات کے لئے خاص ہے۔ یہ توحید اپنی خالص صورت میں صرف قرآن اور اسلام میں محفوظ ہے۔ دوسرے مذاہب نے نظری طور پر توحید کا اقرار کرتے ہوئے عملی طور پر وہ سب کچھ اختیار کر لیا جو توحید کے سراسر خلاف تھا۔ زبان سے خدا کو رب کہتے ہوئے انھوں نے اپنے نبیوں اور بزرگوں کو عملاً رب کا درجہ دے دیا۔

مکہ کے مشرکین اپنے مذہب کو ابراہیمی مذہب کہتے تھے۔ یہود و نصاریٰ بھی اپنی مذہبی تاریخ کو حضرت ابراہیم کے ساتھ جوڑتے تھے۔ ہر زمانہ کے لوگ اسی طرح اپنے نبیوں اور بزرگوں کے نام کو اپنی بدعات اور تحریفات کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں۔ زمانہ گزرنے کے بعد ان کا بنایا ہوا مذہب عوام کے ذہنوں پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ وہ اسی کو اصل مذہب سمجھنے لگتے ہیں۔ ان حالات میں جب سچے اور بے آمیز دین کی دعوت اٹھتی ہے تو اس کے مخالفین اس کو بے اعتبار ثابت کرنے کے لئے سب سے آسان طریقہ یہ سمجھتے ہیں کہ عوام میں یہ مشہور کر دیں کہ وہ اسلاف کے دین کے خلاف ہے۔ وہ شخص جو "اسلاف" کے دین کا حقیقی نمائندہ ہوتا ہے اس کو خود اسلاف ہی کے نام پر رد کر دیا جاتا ہے۔ یہ گویا حق کے اوپر باطل کا پردہ ڈالنا ہے۔ یعنی ایسی باتیں کہنا جو فی نفسہ بے حقیقت ہوں مگر عوام تجزیہ نہ کر سکنے کی وجہ سے اس کو درست سمجھ لیں اور حق سے دور ہو جائیں۔ "مسلم حنیف" وہ ہے جو توحید کے راستہ پر یکسو ہو کر چلے اور غیر حنیف وہ ہے جو دائیں بائیں کی پگڈنڈیوں پر مڑ جائے۔ کوئی ایک ذیلی پہلو کو لے کر اتنا بڑھائے کہ اسی کو سب کچھ بنا دے۔ کوئی دوسرے ذیلی پہلو کو لے کر اس پر اتنے تشریحی اضافے کرے کہ وہی ساری حقیقت نظر آنے لگے۔ لوگ دین کے ذیلی پہلوؤں کو کُل دین سمجھ لیں اور توحید کی سیدھی شاہراہ کو چھوڑ کر ادھر ادھر کے راستوں میں دوڑنے لگیں۔

اور اہل کتاب کے ایک گروہ نے کہا کہ مسلمانوں پر جو چیز اتاری گئی ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس کا انکار کردو ، شاید کہ مسلمان بھی اس سے پھر جائیں ۔ اور یقین نہ کرو مگر صرف اس کا جو چلے تمھارے دین پر ۔ کہو ہدایت وہی ہے جو اللہ ہدایت کرے ۔ اور یہ اسی کی دین ہے کہ کسی کو وہی کچھ دے دیا جائے جو تم کو دیا گیا تھا ۔ یا وہ تم سے تمھارے رب کے یہاں حجت کریں ۔ کہو بڑائی اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔ وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑا وسعت والا ہے ، علم والا ہے ۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے خاص کرلیتا ہے ۔ اور اللہ بڑا فضل والا ہے ۔ اور اہل کتاب میں کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر تم اس کے پاس امانت کا ڈھیر رکھو تو وہ اس کو تمھیں ادا کردے ۔ اور ان میں کوئی ایسا ہے کہ اگر تم اس کے پاس ایک دینار امانت رکھ دو تو وہ تم کو ادا نہ کرے الا یہ کہ تم اس کے سر پر کھڑے ہو جاؤ ۔ یہ اس سبب سے کہ وہ کہتے ہیں کہ غیر اہل کتاب کے بارے میں ہم پر کوئی الزام نہیں ۔ اور وہ اللہ کے اوپر جھوٹ لگاتے ہیں حالاں کہ وہ جانتے ہیں ۔ بلکہ جو شخص اپنے عہد کو پورا کرے اور اللہ سے ڈرے تو بے شک اللہ ایسے متقیوں کو دوست رکھتا ہے　۷۲-۷۶

ایک گروہ جس میں انبیاء اور صلحاء پیدا ہوئے ہوں ، جس کے درمیان عرصہ تک دین کا چرچا رہا ہے ، اکثر وہ اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ وہ اور حق دونوں ایک ہیں ۔ وہ ہدایت کو ایک گروہی چیز سمجھ لیتا ہے نہ کہ اصولی چیز ۔ یہود کا معاملہ یہی تھا ۔ ان کا ذہن ، تاریخی روایات کے اثر سے یہ بن گیا تھا کہ جو ہمارے گروہ میں ہے وہ ہدایت پر ہے اور جو ہمارے گروہ سے باہر ہے وہ ہدایت سے خالی ہے ۔ جو لوگ حق کو اس طرح گروہی چیز سمجھ لیں وہ ایسی صداقت کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے جو ان کے گروہ کے باہر ظاہر ہوئی ہو ۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ حق وہ ہے جو اللہ کی طرف سے آئے نہ کہ وہ جو کسی شخص یا گروہ کی طرف سے ملے ۔ وہ اگرچہ دین خداوندی کا نام لیتے ہیں مگر ان کا دین حقیقۃً گروہ پرستی ہوتا ہے نہ کہ خدا پرستی ۔ ان کا یہ مزاج ان کی آنکھ پر ایسا پردہ ڈال دیتا ہے کہ اپنے گروہ سے باہر کسی کا فضل و کمال انھیں دکھائی نہیں دیتا ۔ کھلے کھلے دلائل سامنے آنے کے بعد بھی وہ اس کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ وہ اپنے حلقہ سے باہر اٹھنے والی دعوتِ حق کے شدید مخالف بن جاتے ہیں ــــ دو عملی کا طریقہ اختیار کرکے وہ اس کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ بے بنیاد باتیں مشہور کرکے لوگوں کو اس کی صداقت کے بارے میں مشتبہ کرتے ہیں ۔ شریعت خداوندی کے سراسر خلاف وہ اپنے لئے اس کو جائز کرلیتے ہیں کہ وہ اخلاق کے دو معیار بنائیں ، ایک غیروں کے لئے ، دوسرا اپنے گروہ کے لئے ۔

کسی کو اپنے دین کی نمائندگی کے لئے قبول کرنا اللہ کی خصوصی رحمت ہے ۔ اس کا فیصلہ گروہی بنیاد پر نہیں ہوتا ۔ یہ سعادت اس کو ملتی ہے جس کو اللہ اپنے علم کے مطابق پسند کرے ۔ اور اللہ اس شخص کو پسند کرتا ہے جو اللہ کے ساتھ اپنے کو اس طرح وابستہ کرے کہ وہ اس کا نگراں بن جائے جس سے وہ ڈرے ، وہ اس کا آقا بن جائے جس کے ساتھ کئے ہوئے عہدِ اطاعت کو وہ کبھی نظر انداز نہ کرسکے ــــ اللہ کے مقبول بندے وہ ہیں جو امانت کو پورا کرنے والے ہوں اور عہد کے پابند ہوں ۔ ایسے ہی لوگوں پر اللہ کی رحمتیں اترتی ہیں ۔ اس کے برعکس جو لوگ امانت کی ادائیگی کے معاملہ میں بے پروا ہوں اور عہد کو پورا کرنے میں حساس نہ رہیں وہ اللہ کے یہاں بے قیمت ہیں ۔ ایسے لوگ اللہ کی رحمتوں اور نصرتوں سے دور کردئے جاتے ہیں ۔

جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچتے ہیں ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اللہ نہ ان سے بات کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا قیامت کے دن، اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اور ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی زبانوں کو کتاب میں موڑتے ہیں تاکہ تم اس کو کتاب میں سے سمجھو حالاں کہ وہ کتاب میں سے نہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے حالاں کہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں۔ اور وہ جان کر اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں۔ کسی انسان کا یہ کام نہیں کہ اللہ اس کو کتاب اور حکمت اور نبوت دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ تو کہے گا کہ تم اللہ والے بنو، اس واسطے کہ تم دوسروں کو کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور خود بھی اس کو پڑھتے ہو۔ اور نہ وہ تمھیں یہ حکم دے گا کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو رب بناؤ۔ کیا وہ تمھیں کفر کا حکم دے گا، بعد اس کے کہ تم اسلام لا چکے ہو ۷۷ — ۸۰

ایک شخص جب ایمان لاتا ہے تو وہ اللہ سے اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ اس کی فرماں برداری کرے گا اور بندوں کے درمیان زندگی گزارتے ہوئے ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے گا جو خدا کی شریعت کی طرف سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ یہ ایک پابند زندگی ہے جس کو عہد کی زندگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس زندگی پر قائم ہونے کے لئے نفس کی آزادیوں کو ختم کرنا پڑتا ہے، بار بار اپنے فائدوں اور مصلحتوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اس لئے اس عہد کی زندگی کو وہی شخص نباہ سکتا ہے جو نفع نقصان سے بے نیاز ہو کر اس کو اختیار کرے۔ جس شخص کا حال یہ ہو کہ نفس پر چوٹ پڑے یا دنیا کا مفاد خطرہ میں نظر آئے تو وہ عہد خداوندی کو نظر انداز کر دے اور اپنے فائدوں اور مصلحتوں کی طرف جھک جائے، اس نے گویا آخرت کو دے کر دنیا خریدی۔ جب آخرت کے پہلو اور دنیا کے پہلو میں سے کسی ایک کو لینے کا سوال آیا تو اس نے دنیا کے پہلو کو ترجیح دی۔ جو شخص آخرت کو اتنی بے قیمت چیز سمجھے وہ آخرت میں اللہ کی عنایتوں کا حق دار کس طرح ہو سکتا ہے۔

جو لوگ آخرت کو اپنی دنیا کا سودا بنائیں وہ دین یا آخرت کے منکر نہیں ہو جاتے۔ بلکہ دین اور آخرت کے پورے اقرار کے ساتھ ایسا کرتے ہیں۔ پھر ان دو متضاد رویوں کو وہ کس طرح ایک دوسرے کے مطابق بناتے ہیں۔ اس کا ذریعہ تحریف ہے۔ یعنی آسمانی تعلیمات کو خود ساختہ معنی پہنانا۔ ایسے لوگ اپنی دنیا پرستانہ روش کو آخرت پسندی اور خدا پرستی ثابت کرنے کے لئے دینی تعلیمات کو اپنے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ کبھی خدا کے الفاظ کو بدل کر اور کبھی خدا کے الفاظ کی اپنے مفید مطلب تشریح کر کے۔ وہ اپنے آپ کو بدلنے کے بجائے کتاب الٰہی کو بدل دیتے ہیں تاکہ جو چیز کتاب الٰہی میں نہیں ہے اس کو عین کتاب الٰہی کی چیز بنا دیں، اپنی بے خدا زندگی کو با خدا زندگی ثابت کر دکھائیں۔ اللہ کے نزدیک یہ بدترین جرم ہے کہ آدمی اللہ کی طرف ایسی بات منسوب کرے جو اللہ نے نہ کہی ہو۔

کسی تعلیم کی صداقت کی سادہ اور یقینی پہچان یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو اللہ سے ملائے، لوگوں کے خوف و محبت کے جذبات کو بیدار کر کے اس کو اللہ کی طرف موڑ دے۔ اس کے برعکس جو تعلیم شخصیت پرستی یا اور کوئی پرستی پیدا کرے، جو انسان کے نازک جذبات کا مرکز توجہ کسی غیر خدا کو بناتی ہو، اس کے متعلق سمجھنا چاہئے کہ وہ سراسر باطل ہے خواہ بظاہر اپنے اوپر اس نے حق کا لیبل کیوں نہ لگا رکھا ہو۔

اور جب اللہ نے پیغمبروں کا عہد لیا کہ جو کچھ میں نے تم کو کتاب اور حکمت دی، پھر تمھارے پاس پیغمبر آئے جو سچا ثابت کرے ان پیشین گوئیوں کو جو تمھارے پاس ہیں تو تم اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ اللہ نے کہا کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا عہد قبول کیا۔ انھوں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں۔ فرمایا اب گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔ پس جو شخص پھر جائے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔ کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے، خوشی سے یا ناخوشی سے اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہمارے اوپر اتارا گیا اور جو اتارا گیا ابراہیم پر اسمٰعیل پر اسحاق پر اور یعقوب پر اور اولاد یعقوب پر۔ اور جو دیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔ اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو چاہے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں سے ہوگا۔ اللہ کیوں کر ایسے لوگوں کو ہدایت دے گا جو ایمان لانے کے بعد منکر ہوگئے۔ حالاں کہ وہ گواہی دے چکے کہ یہ رسول برحق ہے اور ان کے پاس روشن نشانیاں آچکی ہیں۔ اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور سارے انسانوں کی لعنت ہوگی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔ البتہ جو لوگ اس کے بعد توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ بے شک جو لوگ ایمان لانے کے بعد منکر ہوگئے پھر کفر میں بڑھتے رہے، ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی اور یہی لوگ گمراہ ہیں۔ بے شک جن لوگوں نے انکار کیا اور انکار کی حالت میں مرگئے، اگر وہ زمین بھر سونا بھی فدیہ میں دیں تو قبول نہ کیا جائے گا۔ ان کے لئے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا ۹۱ - ۸۱

اللہ کو پانا ایک ابدی حقیقت کو پانا ہے، یہ پوری کائنات کا ہم سفر بننا ہے۔ جو لوگ اس طرح اللہ کو پالیں وہ ہر قسم کے تعصبات سے اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ وہ حق کو ہر حال میں پہچان لیتے ہیں چاہے اس کا پیغام "اسرائیلی پیغمبر" کی زبان سے بلند ہو یا "اسماعیلی پیغمبر" کی زبان سے۔ مگر جو لوگ گروہ پرستی کی سطح پر جی رہے ہوں، حق ان کو حق کی صورت میں صرف اس وقت نظر آتا ہے جب کہ وہ ان کے اپنے گروہ کے کسی فرد کی طرف سے آئے۔ اللہ اگر ان کے گروہ سے باہر کسی شخص کو اپنے پیغام کی پیغام رسانی کے لئے اٹھائے تو ایسا پیغام ان کے ذہن کا جزء نہیں بنتا۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ ان کا دل اس کے حق وصداقت ہونے کی گواہی دے رہا ہو۔ ایسے لوگ خواہ اپنے کو ماننے والوں میں شمار کریں مگر اللہ کے یہاں ان کا نام نہ ماننے والوں میں لکھا جاتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے حق کو اپنے گروہ کی نسبت سے جانا نہ کہ اللہ کی نسبت سے۔ ایسے حق کا اقرار نہ کرنا جس کے حق ہونے پر آدمی کے دل نے گواہی دی ہو، اللہ کے نزدیک بدترین جرم ہے۔ ایسے لوگ آخرت میں اتنے ذلیل ہوں گے کہ اللہ اور اس کی تمام مخلوقات ان پر لعنت کریں گی۔

اپنے سے باہر ظاہر ہونے والے حق کا اعتراف نہ کرنا بظاہر اپنے ایمان کو بچانا ہے۔ مگر حقیقۃً یہ اپنے ایمان کو برباد کرنا ہے۔ اللہ کا مومن بندہ اللہ کے مسلسل فیضان پر جیتا ہے۔ پھر جو شخص اپنے کو خود پرستی اور گروہ پرستی کے خول میں بند کرلے اس کے اندر اللہ کا فیضان کس راستہ سے داخل ہوگا۔ اور اللہ کے فیضان سے محرومی کے بعد وہ کیا چیز ہوگی جو اس کے ایمان کی پرورش کرے۔

تم ہرگز نیکی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو۔ اور جو چیز بھی تم خرچ کروگے اس سے اللہ باخبر ہے۔ سب کھانے کی چیزیں بنی اسرائیل کے لئے حلال تھیں بجز اس کے جو اسرائیل نے اپنے اوپر حرام کرلیا تھا قبل اس کے کہ تورات اترے۔ کہو کہ تورات لاؤ اور اس کو پڑھو، اگر تم سچے ہو۔ اس کے بعد بھی جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھیں وہی ظالم ہیں۔ کہو اللہ نے سچ کہا۔ اب ابراہیم کے دین کی پیروی کرو جو حنیف تھا اور وہ شرک کرنے والا نہ تھا۔ بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور سارے جہان کے لئے ہدایت کا مرکز۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، مقام ابراہیم ہے، جو اس میں داخل ہوجائے وہ مامون ہے۔ اور لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے اور جو کوئی منکر ہوا تو اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔ کہو اے اہل کتاب تم کیوں اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے ہو۔ حالاں کہ اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ کہو اے اہل کتاب تم ایمان لانے والوں کو اللہ کی راہ سے کیوں روکتے ہو۔ تم اس میں عیب ڈھونڈتے ہو۔ حالاں کہ تم گواہ بنائے گئے ہو۔ اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ۹۲-۹۹

یہود کے علماء نے بطور خود جو فقہ بنا رکھی تھی اس میں اونٹ اور خرگوش کا گوشت کھانا حرام تھا جب کہ اسلام میں وہ جائز تھا۔ اب یہود یہ کہتے کہ اسلام اگر خدا کا اتارا ہوا دین ہے تو اس میں بھی حرام وحلال کے مسائل وہی کیوں نہیں جو پچھلے زمانہ میں اتارے ہوئے خدا کے دین میں تھے۔ اسی طرح وہ کہتے کہ بیت المقدس اب تک تمام انبیاء کا قبلۂ عبادت رہا ہے۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خدا ایسا دین اتارے جس میں اس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا ہو۔

حق کی دعوت جب اپنی خالص شکل میں اٹھتی ہے تو ان لوگوں پر اس کی زد پڑنے لگتی ہے جو خدا کے دین کے نام پر اپنا ایک دین عوام میں رائج کئے ہوئے ہوں۔ ایسے لوگ اس کے مخالف ہوجاتے ہیں اور لوگوں کو دعوت حق سے پھیرنے کے لئے طرح طرح کے اعتراضات نکالتے ہیں۔ ان کے خود ساختہ دین میں اساسات دین پر زور باقی نہیں رہتا۔ اس کے بجائے جزئیاتِ دین میں موشگافیوں سے دین داری کا ایک ظاہری ڈھانچہ بن جاتا ہے۔ آدمی کی حقیقی زندگی کیسی ہی ہو، نیکی اور تقویٰ کا کمال یہ سمجھا جانے لگتا ہے کہ وہ اس ظاہری ڈھانچہ کا خوب اہتمام کرے۔ وہ "خرگوش" کو یہ کہہ کر نہ کھائے کہ ہمارے اکابر اس سے پرہیز کرتے تھے۔ دوسری طرف کتنی ہی حرام چیزوں کو اپنے لئے جائز کئے ہوئے ہو۔ وہ "بیت المقدس" کی طرف رخ کرنے میں قطب نما کی سوئی کی طرح سیدھا ہوجانا ضروری سمجھتا ہو۔ مگر صبح وشام کی سرگرمیوں کو خدا رخی بنانے سے اس کو دلچسپی نہ ہو۔ مگر نیکی کا درجہ کسی کو قربانی سے ملتا ہے نہ کہ سستی ظاہرداریوں سے۔ خدا کا نیک بندہ وہ ہے جو اپنی محبت کا ہدیہ اپنے رب کو پیش کرے، جس کے لئے اللہ کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی چیز عزیز تر نہ رہے۔ حق کو ماننے کے لئے جب وقار کی قیمت دینی ہو، اللہ کے راستہ میں بڑھنے کے لئے جب مال خرچ کرنا ہو اور بچوں کے مستقبل کو خطرہ میں ڈالنا پڑے، اس وقت وہ اللہ کی خاطر سب کچھ گوارا کرلے۔ ایسے نازک مواقع پر جو شخص اپنی محبوب چیزوں کو دے کر اللہ کو لے وہی نیک اور خدا پرست بنا۔

اے ایمان والو، اگر تم اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مان لوگے تو وہ تم کو ایمان کے بعد پھر منکر بنا دیں گے۔ اور تم کس طرح انکار کروگے حالاں کہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جارہی ہیں اور تمھارے درمیان اس کا رسول موجود ہے۔ اور جو شخص اللہ کو مضبوطی سے پکڑے گا تو وہ پہنچ گیا سیدھی راہ پر۔ اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنا چاہیے۔ اور تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور پھوٹ نہ ڈالو۔ اور اللہ کا یہ انعام اپنے اوپر یاد رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی پس تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے تو اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔ اس طرح اللہ تمھارے لئے اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم راہ پاؤ۔ اور ضرور ہے کہ تم میں ایک گروہ ہو جو نیکی کی طرف بلائے، بھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہوں گے۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور باہم اختلاف کرلیا بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح احکام آچکے تھے۔ اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ جس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ چہرے کالے ہوں گے، تو جن کے چہرے کالے ہوں گے ان سے کہا جائے گا کیا تم اپنے ایمان کے بعد کافر ہوگئے، تو اب چکھو عذاب اپنے کفر کے سبب سے۔ اور جن کے چہرے روشن ہوں گے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تم کو حق کے ساتھ سنا رہے ہیں اور اللہ جہان والوں پر ظلم نہیں چاہتا۔ اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ کے لئے ہے اور سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے ۱۰۹-۱۰۰

دنیا آزمائش کی جگہ ہے۔ یہاں ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ شیطان آدمی کے ایمان کو اچک لے جائے اور فرشتے اس کی روح اس حال میں قبض کریں کہ وہ ایمان سے خالی ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ آدمی ہر وقت یا ہوش رہے، وہ اپنے آپ پر نگراں بن جائے۔ ایمان سے دور ہونے کی ایک صورت وہ ہے جب کہ دین کے اجزاء میں تبدیلی کرکے اہم کو غیر اہم اور غیر اہم کو اہم بنا دیا جائے۔ دین کی اصل رسی تقویٰ ہے۔ یعنی اللہ سے ڈرنا اور مرتے دم تک اپنے ہر معاملہ میں وہی رویہ اختیار کرنا جو اللہ کے سامنے جواب دہی کے تصور سے بنتا ہو، یہی صراط مستقیم ہے۔ اس سے انحراف یہ ہے کہ "تقویٰ" کے بجائے کسی اور چیز کو مدار دین سمجھ لیا جائے اور اس پر اس طرح زور دیا جائے جس طرح خوف خدا اور فکر آخرت پر دیا جاتا ہے۔ جب بھی دین میں اس قسم کی تبدیلی کی جاتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملت کے درمیان اختلاف پڑ جاتا ہے۔ کوئی ایک ضمنی چیز پر زور دیتا ہے کوئی دوسری ضمنی چیز پر، اور اس طرح ملت فرقے فرقے میں بٹ کر رہ جاتی ہے۔ اول الذکر سے ایک اللہ توجہ کا مرکز بنتا ہے اور ثانی الذکر سے متفرق مسائل توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ جب دین میں سارا زور و تاکید تقویٰ (اللہ سے ڈرنے) پر دیا جائے تو اس سے باہمی اتفاق وجود میں آتا ہے اور جب اس کے سوا دوسری چیزوں پر زور دیا جانے لگے تو اس سے باہمی اختلاف کی وہ برائی پیدا ہوتی ہے جو لوگوں کو جہنم کے کنارے پہنچا دیتی ہے ——— ملت کو صراطِ مستقیم پر رکھنے اور اس سے بھٹکنے سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ ملت کے کچھ افراد مسلسل اس کے لئے سرگرم رہیں۔ وہی گروہ کامیاب ہے جس کے درمیان یہ نظام ہو اور جس کے افراد اس سے تعاون و اطاعت کرتے ہوئے اس کو برابر قائم رکھیں۔

اب تم بہترین گروہ ہو جس کو لوگوں کے واسطے نکالا گیا ہے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لاتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا۔ ان میں سے کچھ ایمان والے ہیں اور ان میں اکثر نافرمان ہیں۔ وہ تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے مگر کچھ ستانا۔ اور اگر وہ تم سے مقابلہ کریں گے تو تم کو پیٹھ دکھائیں گے۔ پھر ان کو مدد بھی نہ پہنچے گی۔ اور ان پر مسلط کردی گئی ذلت خواہ وہ کہیں بھی پائے جائیں، سوا اس کے کہ اللہ کی طرف سے کوئی عہد ہو یا لوگوں کی طرف سے کوئی عہد ہو اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوگئے اور ان پر مسلط کردی گئی پستی، یہ اس واسطے کہ وہ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے رہے اور انھوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ اس سبب سے ہوا کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے نکل جاتے تھے۔ سب اہل کتاب یکساں نہیں۔ ان میں ایک گروہ عہد پر قائم ہے۔ وہ راتوں کو اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔ وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور بھلائی کا حکم دیتے ہیں۔ اور برائی سے روکتے ہیں اور نیک کاموں میں دوڑتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں جو نیکی بھی وہ کریں گے اس کی ناقدری نہ کی جائے گی اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے۔ بے شک جن لوگوں نے انکار کیا تو اللہ کے مقابلہ میں ان کے مال اور اولاد ان کے کچھ کام نہ آئیں گے۔ اور وہ لوگ دوزخ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہ اس دنیا کی زندگی میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کی مثال اس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہو اور وہ ان لوگوں کی کھیتی پر چلے جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے پھر وہ اس کو برباد کردے۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں ۱۱۰—۱۱۷

یہود دین خداوندی کے حامل بنائے گئے تھے۔ مگر وہ اس کو لے کر کھڑے نہ ہو سکے اور اس کو محفوظ رکھنے میں بھی ناکام رہے۔ اس کے بعد اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اپنا دین اس کی صحیح صورت میں بھیجا۔ اب امت مسلمہ لوگوں کے درمیان خدا کی رہنمائی کے لئے کھڑی ہوئی ہے۔ اس منصب کا تقاضا ہے کہ یہ امت اللہ کی سچی مومن بنے۔ وہ دنیا کو بھلائی کی تلقین کرے اور ان چیزوں سے باخبر کرے جو اللہ کے نزدیک برائی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ کام چونکہ خدائی کام ہے اس لئے خدا نے اس کے ساتھ اپنا تحفظاتی نظام بھی شامل کردیا ہے۔ جو لوگ اس کار خداوندی کے لئے اٹھیں گے ان کے لئے خدا کی ضمانت ہے کہ ان کے مخالفین ان کو معمولی اذیتوں کے سوا کوئی حقیقی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ تاہم یہود کے انجام کی صورت میں اس کی بھی دائمی مثال قائم کردی گئی کہ اس منصب حق پر سرفراز کئے جانے کے بعد جو لوگ بدعہدی کریں ان کی سزا اسی دنیا میں اس طرح شروع ہو جاتی ہے کہ ان کو ذاتی عزت و سرفرازی سے محروم کردیا جاتا ہے۔ خدا کی رحمتوں سے محرومی کی وجہ سے ان کی بے حسی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ ان لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں جو ان کی کوتاہیوں کی طرف متوجہ کرنے کے لئے اٹھیں۔

مال و اولاد کی محبت آدمی کو قربانی والے دین پر آنے نہیں دیتی۔ البتہ نمائشی قسم کے اعمال کا مظاہرہ کرکے وہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کے دین پر قائم ہے۔ مگر جس طرح سخت ٹھنڈی ہوا اچانک پوری کھیتی کو برباد کردیتی ہے اسی طرح قیامت کا طوفان ان کے نمائشی اعمال کو بے قیمت کرکے رکھ دے گا —— یہود میں صرف چند لوگ تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ "امت قائمہ" کی حیثیت سے ان کا مستقل ذکر کرنا ظاہر کرتا ہے کہ چند آدمی اگر اللہ سے ڈرنے والے ہوں تو وہ بھیڑ کے مقابلہ میں اللہ کی نظر میں زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔

اے ایمان والو، اپنے غیر کو اپنا راز دار نہ بناؤ، وہ تمھیں نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ ان کو خوشی ہوتی ہے تم جس قدر تکلیف پاؤ۔ ان کی عداوت ان کی زبان سے نکلی پڑتی ہے اور جو ان کے دلوں میں ہے وہ اس سے بھی سخت ہے، ہم نے تمھارے لئے نشانیاں کھول کر ظاہر کردی ہیں اگر تم عقل رکھتے ہو۔ تم ان سے محبت رکھتے ہو مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے۔ حالاں کہ تم سب آسمانی کتابوں کو مانتے ہو۔ اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب آپس میں ملتے ہیں تو تم پر غصہ سے انگلیاں کاٹتے ہیں۔ کہو تم اپنے غصہ میں مرجاؤ۔ بے شک اللہ دلوں کی بات کو جانتا ہے۔ اگر تم کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو ان کو رنج ہوتا ہے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی تدبیر تم کو نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں سب اللہ کے بس میں ہے ۱۱۸ - ۲۰

مسلمان اسی خدائی دین پر ایمان لائے تھے جو سابق اہل کتاب (یہود) کو اپنے نبیوں کے ذریعہ ملا تھا۔ دونوں کا دین اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک تھا۔ مگر یہود مسلمانوں کے اس قدر دشمن ہوگئے کہ مسلمان اپنی ساری خصوصیات کے باوجود ان کے نزدیک ایک کلمۂ خیر کے بھی حق دار نہ تھے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کو اگر کوئی تکلیف پہنچ جاتی تو وہ دل ہی دل میں خوش ہوتے۔ گویا وہ ان کو انسانی ہمدردی کا مستحق بھی نہیں سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہود نے انبیاء بنی اسرائیل کی طرف منسوب کرکے ایک خود ساختہ دین بنا رکھا تھا اور اس کے بل پر عوام میں قیادت کا مقام حاصل کئے ہوئے تھے۔ خدا کے دین میں ساری توجہ خدا کی طرف رہتی ہے۔ جب کہ خود ساختہ دین میں لوگوں کی توجہ ان افراد کی طرف لگ جاتی ہے جو اس خود ساختہ دین کے خالق اور شارح ہوں۔ ایسے لوگ سچے دین کی دعوت کو کبھی گوارا نہیں کرتے۔ کیوں کہ ان کو نظر آتا ہے کہ وہ ان کو ان کے مقام عظمت سے ہٹا رہی ہے۔ جب ایسی صورت پیش آئے تو اللہ کے سچے بندوں کا کام یہ ہے کہ وہ منفی ردعمل سے بچیں اور مکمل طور پر صبر و تقویٰ پر قائم رہیں۔ صبر کا مطلب ہے ہر حال میں اپنے کو حق کا پابند رکھنا، اور تقویٰ یہ ہے کہ فیصلہ کن طاقت صرف اللہ کو سمجھا جائے نہ کہ کسی اور کو۔ مسلمان اگر اس قسم کے مثبت رویہ کا ثبوت دیں تو کسی کی دشمنی ان کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچائے گی خواہ وہ مقدار میں کتنی ہی زیادہ ہو۔ تاہم اس کے ساتھ مسلمانوں کو حقیقت پسند بھی بننا چاہئے۔ ان کو اپنے دوست اور دشمن کے درمیان تمیز کرنا چاہیے تاکہ کوئی ان کی صاف دلی کا ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔

مسلمانوں کے دل میں یہود کے لئے محبت ہونا اور یہود کے دل میں مسلمانوں کے لئے محبت نہ ہونا ظاہر کرتا ہے کہ دونوں میں سے کون حق پر ہے اور کون ناحق پر۔ اللہ سراپا رحم اور عدل ہے۔ وہ تمام انسانوں کا خالق و مالک ہے اس لئے جو شخص حقیقی طور پر اللہ کو پالیتا ہے اس کا سینہ تمام خدا کے بندوں کے لئے کھل جاتا ہے۔ اس کے لئے تمام انسان یکساں طور پر اللہ کی عیال بن جاتے ہیں۔ وہ ہر ایک کے لئے وہی چاہنے لگتا ہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے۔ مگر جو لوگ اللہ کو حقیقی طور پر پائے ہوئے نہ ہوں، جنھوں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں نہ ملایا ہو وہ صرف اپنی ذات کی سطح پر جیتے ہیں۔ ان کا سرمایۂ حیات اپنے فائدے اور اپنے گروہی تعصبات ہوتے ہیں۔ ان کا یہ مزاج ان کو ایسے لوگوں کا دشمن بنا دیتا ہے جو ان کو اپنے مفاد کے خلاف نظر آئیں، جو ان کے اپنے گروہ میں شامل نہ ہوں۔ خدا کو مانتے ہوئے وہ بھول جاتے ہیں کہ یہ دنیا خدا کی دنیا ہے۔ یہاں کسی کی کوئی تدبیر اللہ کی مشیت کے بغیر مؤثر نہیں ہوسکتی۔

اللہ کی ایک سنت یہ بھی ہے

ایک دعوت سچے اسلام کی دعوت ہو اور آپ اس کا انکار کریں تو یہ انکار ہمیشہ جنت کی قیمت پر ہوتا ہے۔ ایسی ایک دعوت کا انکار کر کے آدمی دنیا میں اپنے کو وقتی رسوائی سے بچاتا ہے اور آخرت کی ابدی رسوائی کا خطرہ مول لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت مہنگا سودا ہے۔ اس لئے جب ایک اسلامی دعوت کے مقابلہ میں اپنے رویہ کا فیصلہ کرنا ہو تو آدمی کو بے حد سنجیدہ غور و فکر کے بعد اس کا فیصلہ کرنا چاہئے۔

اس سلسلہ میں ایک اور سنگین بات ہے جو آدمی کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ وہ اللہ کی سنت اشتباہ ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ رسول کے مخاطبین نے جب رسول کی دعوت کا انکار کیا تو انھوں نے کہا کہ خدا کو اگر اپنا پیغمبر بھیجنا تھا تو اس نے انسان کو کیوں ہمارے پاس بھیجا، فرشتہ کو کیوں نہ بھیجا۔ تاکہ ہم کو پہچاننے میں شبہ نہ ہوتا اور ہم اس کو خدا کا نمائندہ مان کر فوراً اس کے مومن بن جاتے۔ فرمایا کہ انسانی پیغمبر کے بجائے اگر ہم کوئی فرشتہ بھیجتے تو اس کو بھی فرشتہ کے طور پر نہ بھیجتے بلکہ انسان کی صورت میں بھیجتے۔ اور اس طرح دوبارہ ان کو اسی شبہ میں ڈال دیتے جس میں وہ اب پڑے ہوئے ہیں (انعام ۹) چونکہ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے اس لئے یہاں لازماً حق پر التباس کا پردہ ڈال کر لوگوں کے سامنے لایا جاتا ہے۔ یہاں "خدا کے نمائندہ" کو بھی ایک عام انسان کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کے لئے شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔

یہی جانچ کا مقام ہے۔ اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ کون ہے جو شبہ کے پردہ کو پھاڑ کر حق کو اس کی برہنہ صورت میں دیکھ لیتا ہے اور کون ہے جو شبہ میں اٹک کر رہ جاتا ہے۔ خدا کے منصوبہ کے مطابق انسان کو بہر حال اس امتحان میں کھڑا ہونا ہے کہ وہ ایک مخلوق کی صورت میں خالق کی تجلیات کو دیکھے۔ ایک انسان کی آواز میں خدا کی آواز کو سنے۔ دنیوی شان و شوکت سے خالی ایک دعوت میں آخرت کی شان و شوکت کی رونقیں پالے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو اگر حق کا انکار کرنے کے لئے ایک "دلیل" ہاتھ آگئی ہو تو اس کو ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ اپنے رویہ کے حق میں ایک مضبوط بنیاد کو پاگیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ جس چیز کو دلیل سمجھ رہا ہے وہ محض ایک فریب ہو۔ اس کے ذہن نے شبہات سے متاثر ہو کر بطور خود ایک تصویر بنا لی ہو۔ وہ اس کا ایک ذہنی سایہ ہو جس کو وہ حقیقت سمجھ بیٹھا ہو۔ "شبہ میں ڈالنے" کی سنت ہی کا یہ تقاضا ہے کہ حق اگر اپنی موافقت میں دلیلیں رکھتا ہو تو اسی کے ساتھ آدمی کو اس کی مخالفت میں بھی دلیلیں ہاتھ آجائیں۔ اگر ایسے پہلو پائے جاتے ہوں جو دعوت کو سچی دعوت ثابت کرتے ہوں تو اسی کے ساتھ یہ امکان بھی موجود ہو کہ کوئی شخص اس میں ایسے شوشے دریافت کرے جس کی بنیاد پر وہ اس کی گمراہی کا انکشاف کر سکے۔ قرآن میں ہے کہ "کون ہے جو اللہ کو قرض دے" اس کو دیکھ کر ایک شخص نے کہا۔ "خدا بھی محتاج ہو گیا ہے جو اس کو بندوں سے ادھار مانگنے کی ضرورت پڑی"۔ اگر آدمی کا ذہن صحیح نہ ہو تو وہ خدا کی کتاب میں بھی احمقانہ اعتراضات تلاش کر سکتا ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ قرآن میں "قرض" کے بجائے کوئی دوسری تعبیر اختیار کرنی چاہئے تھی تو یہ بے معنی بات ہوگی۔ کیوں کہ قرض کا لفظ اگر قرآن میں نہ ہوتا تو آدمی اپنے بے معنی اعتراضات کے لئے کوئی اور لفظ تلاش کر لیتا۔

سیاست کی دو قسمیں

سیاست دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک صبر کی سیاست، دوسری بے صبری کی سیاست۔ صبر کی سیاست
یہ ہے جب کہ حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر اپنی اور حریف کی طاقت کا بے لاگ اندازہ کیا جائے۔ اس
کے بعد خاموش منصوبہ کے تحت اپنی کمیوں کی تلافی کی جائے۔ اپنے کو طاقتور بنانے کی مسلسل جدوجہد کی جائے۔ اس
وقت تک تصادم سے پرہیز کیا جائے جب تک حریف کے مقابلہ میں فیصلہ کن اقدام کی حیثیت حاصل نہ ہو جائے۔
اس کے برعکس بے صبری کی سیاست یہ ہے کہ مخالف حالات کو دیکھ کر آدمی بھڑک اٹھے اور مشتعل نفسیات کے تحت
اپنے حریف سے ٹکرا جائے۔ بغیر اس کے کہ اس نے حریف کی نسبت سے اپنے کو تیار کرنے کی کوشش کی ہو۔

موجودہ زمانہ میں مسلم قوموں کی سیاست اس بے صبری کی نہایت عبرت ناک مثال ہے۔ ہر ملک میں یہ منظر
دکھائی دیتا ہے کہ طاقت کی فراہمی سے پہلے محض خوش فہمیوں کے تحت اقدام کر دیا گیا اور اس کے فطری نتیجہ کے طور
پر جب انجام اپنے خلاف نکلا تو ہمارے قائدین نے دوسری بے صبری یہ دکھائی کہ ناکامی کے اسباب کا بے لاگ
جائزہ لینے کے بجائے فی الفور یہ اعلان کر دیا کہ فلاں سازش نے ان کے منصوبہ کو ناکام بنا دیا ورنہ اب تک وہ
اسلام اور ملت اسلام کو عروج کے آسمان پر پہنچا چکے ہوتے (۱۸ اکتوبر ۱۹۷۹)

ھیرو بننے کا شوق

ٹی ایس ایلیٹ (۱۹۶۵ - ۱۸۸۸) نے کہا تھا کہ دنیا کی اکثر مصیبتیں ان لوگوں کی پیدا کی ہوئی ہیں جو اہم بننا چاہتے ہیں:

Most of the trouble in the world is caused
by people wanting to be important.

یہ بات آج مزید اضافہ کے ساتھ صحیح ہے۔ آج ہر نوجوان ہیرو بننا چاہتا ہے اور ہر آدمی اہم شخصیت بننے کے شوق میں مبتلا
ہے۔ اس جنون نے خدا کی زمین کو فساد سے بھر دیا ہے۔ اس کے نقصانات اتنے زیادہ ہیں جن کو لفظوں میں بیان نہیں کیا
جا سکتا۔ ان میں بھی سب سے بری مثال وہ ہے جب کہ خدا کے دین کو لیڈری کا عنوان بنا دیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں کسی چیز کو نمایاں کرنے کے بہت سے نئے طریقے رائج ہو گئے ہیں۔ ضرورت تھی کہ ان ذرائع کو خدا کی خدائی
کے اعلان و اظہار میں استعمال کیا جائے۔ مگر لوگوں نے ان کو اپنی ذات کو نمایاں کرنے کا سستا نسخہ سمجھ لیا ہے۔ اخبار اور رسالوں
کی کثرت، جلسوں اور جلوسوں کی دھوم اور اس طرح کی دوسری سرگرمیاں جو حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ہر روز بڑھ رہی ہیں وہ
ذاتی نمائش کے اسی بڑھے ہوئے شوق کا نتیجہ ہیں۔ لبید عرب کے ایک بڑے شاعر تھے۔ انھوں نے سورہ بقرہ پڑھی تو
شاعری چھوڑ دی۔ اس سے پہلے وہ اپنی شاعری دوسروں کو سناتے تھے، اب قرآن دوسروں کو سنانے لگے۔ انھوں نے کہا:
جب قرآن جیسا کلام آگیا تو اب مجھ کو شاعری کرنے کی کیا ضرورت۔ ایسے ہی لوگ اسلام کو زندہ کرتے ہیں۔ اور جب ہر
آدمی کو صرف اپنی "شاعری" سنانے کا شوق ہو جائے تو اس کا انجام ملی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

ایک کل اور آنے والا ہے

دھیان چند (۱۹۰۶ - ۱۹۷۹) ہاکی کھیلنے کے اتنے ماہر تھے کہ ان کو ہاکی کا جادوگر (Hockey Wizard) کہا جاتا
۔ وہ اوسط تعلیم یافتہ تھے اور فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوئے تھے۔ مگر ہاکی میں اپنی غیر معمولی مہارت کی
سے انھوں نے عالمی شہرت حاصل کی۔ ۱۹۳۶ء میں انھوں نے برلن کے اولمپک میں جرمن ہاکی ٹیم کو شکست دی تو ہٹلر
ان کو بلا کر پوچھا کہ "تم کیا ہو" دھیان چند نے کہا کہ ہندستانی فوج میں سپاہی ہوں۔ ہٹلر نے کہا: "اگر تم جرمن ہوتے
آج میں تم کو میجر جنرل بنا دیتا" ۱۹۵۶ میں ان کو پدم بھوشن کا خطاب ملا۔ انھوں نے اپنی سوانح عمری لکھی ہے جس کا نام
گول (The Goal) موتیابند کی وجہ سے ان کی بینائی کمزور ہو گئی تھی۔ آخر عمر میں ان کو ذیابیطس اور جگر کا کینسر
گیا اور اسی میں ان کا ۳ دسمبر کو انتقال ہو گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ تدبیر میں معمولی تبدیلی سے ہر کھیل جیتا جا سکتا ہے۔

F ry situation could be met with a slight change in tactics

وہ کہا کرتے تھے کہ کھلاڑی صرف کھلاڑی ہے۔ بڑھاپے کی عمر میں ان سے پوچھا گیا کہ نوجوان کھلاڑیوں کے لئے ان کا پیغام
کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا: بس یہ کہ وہ روز سے بہتر آج کھیلے اور آج سے بہتر کل کھیلے (ٹائمس آف انڈیا ۴ دسمبر ۱۹۷۹)

What else but to play better than yesterday and do even better tomorro

مگر دھیان چند کو اگر معلوم ہوتا کہ ایک "کل" اور ہے جس کا سامنا کھیل کے میدان میں نہیں بلکہ قیامت کے میدان میں
ہونے والا ہے تو ان کا مشورہ اپنے نوجوانوں کو شاید کچھ اور ہوتا۔

موت سے پہلے موت کو دیکھئے

پولیس کے اعداد و شمار کے مطابق دہلی کی سڑکوں پر ہر روز تقریباً دو آدمی حادثہ کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔ ایک روز میں دہلی
کی ایک سڑک پر گزر رہا تھا۔ ایک مقام پر غیر معمولی مجمع دیکھ کر ٹھہر گیا۔ دیکھا تو سڑک کے بیچ میں ایک لاش خون میں نہائی ہوئی
پڑی تھی اور اس کے پاس ایک جوان عورت بدحواسی کے عالم میں آہ و ماتم کر رہی تھی۔ ایک طرف ایک اسکوٹر اوندھا ہو کر پڑا
ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ مرنے والا آدمی اپنے اسکوٹر پر جا رہا تھا۔ اس کی بیوی اس کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ اتنے میں اسکوٹر ایک بس
سے ٹکرا گیا۔ مرد بس کے نیچے آکر کچل گیا اور فوراً مر گیا۔ بیوی بچ گئی۔

اس طرح کے واقعات ہر روز ہوتے رہتے ہیں۔ لوگ ہر روز کسی نہ کسی کو مرتے ہوئے دیکھتے ہیں مگر کیسی عجیب بات ہے
کہ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ مجھ کو بھی مرنا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر آدمی اپنے آپ کو موت سے محفوظ و مامون سمجھے ہوئے ہے۔ اگر
آدمی یہ سمجھ لے کہ اس کو بھی مرنا ہے تو وہ "موت سے پہلے مر جائے" اس کی بدحواسی اس سے بھی زیادہ بڑھ جائے جتنی مذکورہ
واقعہ میں عورت کی دکھائی دے رہی ہے (۲۲ اکتوبر ۱۹۷۹ء)

موت کے بعد کا جہنم نظر نہیں آتا

مسٹر چرن سنگھ نے کہا: اگر کوئی جہنم ہے تو وہ بھارت ہے۔ کیوں کہ یہ صرف بھارت ہے جہاں بددیانت لیڈر ملک کو چلاتے ہیں ——
(ٹائمس آف انڈیا ۲۸ دسمبر ۱۹۷۹) جو لوگ موت کے بعد کے جہنم کو نہ دیکھیں وہ ہمیشہ موت سے پہلے کی زندگی کو جہنم بنا دیتے ہیں۔

شہد کی مکھیاں پالنا

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد نہ کرو (اعراف ۸۵) اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے سوا بقیہ کائنات میں خدا نے جو نظامِ عمل قائم فرمایا ہے اسی کی پیروی تم بھی کرو۔ اس کے خلاف مت چلو۔ مثلاً شہد کی مکھیاں حد درجہ نظم اور تقسیم کار کے تحت اپنا عمل کرتی ہیں۔ وہ اپنا کام کرتے ہوئے بقیہ اجزار کائنات کے لئے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرتیں۔ ان کی سرگرمیاں اس طرح جاری ہوتی ہیں کہ ایک مقصد حاصل کرتے ہوئے کئی دوسرے فوائد بھی حاصل ہو جائیں۔ فطرت کا یہی اصول انسان کو بھی اپنی زندگی میں اختیار کرنا چاہئے تاکہ خدا کے بنائے ہوئے نظام میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ خدا کا جو نظامِ صلاح بقیہ کائنات میں قائم ہے وہی نظامِ صلاح انسانی دنیا میں بھی قائم رہے۔

قدیم زمانہ میں کھیتی یا باغبانی کا مطلب صرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ کھیت میں فصل بو دی جائے یا درخت لگا دئے جائیں۔ موجودہ زمانہ میں علم کے اضافہ نے اس میں بہت سی نئی چیزوں کا اضافہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک شہد کی مکھیاں پالنا بھی ہے۔ شہد کی مکھیاں جو مختلف پھولوں کا رس لے کر شہد بناتی ہیں، وہ اسی کے ساتھ ایک اور اہم کام انجام دیتی ہیں۔ یہ ہماری کھیتیوں اور باغوں کی زرخیزی میں اضافہ ہے۔ انسان اور حیوانات کی طرح نباتات میں بھی نر و مادہ ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان نر و مادہ کا اتصال پھولوں کے ذریعہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اسی سے دانے اور پھل بنتے ہیں۔ نر پھول اور مادہ پھول اگر باہم نہ ملیں تو کوئی فصل تیار نہیں ہو سکتی۔ شہد کی مکھیاں اس قدرتی عمل میں خصوصی مدد کرتی ہیں۔

ہوا کے جھونکے سے جب شاخیں ہلتی ہیں یا نباتاتی کیڑے ان کے درمیان نقل و حرکت کرتے ہیں تو ان کے جسم یا پیروں سے لپٹ کر نر پھول کا زیرہ مادہ پھول تک پہنچتا ہے اور اس طرح ان میں ازدواجی اتصال قائم ہوتا رہتا ہے۔ مگر یہ کافی نہیں ہوتا۔ شہد کی مکھیاں اس عمل کی تکمیل کرتی ہیں۔ کیوں کہ وہ پھولوں کے اندر کا رس لینے کے لئے، جو اکثر قطرہ سے بھی بہت کم مقدار میں ہوتا ہے، ایک ایک پھول پر بیٹھتی ہیں اور ایک سے دوسرے تک جاتی رہتی ہیں۔ اس عمل کے دوران وہ ایک کا زیرہ دوسرے تک پہنچاتی رہتی ہیں۔ اس لئے شہد کی مکھی پالنا صرف شہد حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ وہ فصلوں کو زیادہ زرخیز بنانے کا بھی خصوصی ذریعہ ہے۔ ایک ماہر زراعت نے کہا ہے:

In the modern context, the beekeeping industry has to be viewed as an integral part of agricultural development

جدید حالات میں، شہد کی مکھیاں پالنے کی صنعت کو زراعتی ترقی کا لازمی حصہ سمجھنا چاہئے (ٹائمس آف انڈیا، اکتوبر ۱۹۷۹)

امریکہ اور روس کے ماہرین نے اندازہ کیا ہے کہ شہد کی مکھیاں پالنے سے جو شہد اور موم حاصل ہوتا ہے اس کی مالیت سے دس گنا زیادہ فائدہ وہ ہے جو ان کے ذریعہ کھیتوں اور باغوں میں فصل کے اضافہ سے حاصل ہوتا ہے۔

شہد کی مکھیاں جس طرح اپنا پیچیدہ کام کرتی ہیں وہ دنیا کی تمام سلطنتوں سے زیادہ کامیاب قسم کا انتظام سلطنت ہے۔ تاہم ایک انسان کے لئے شہد کی مکھیاں پالنا انتہائی آسان کام ہے۔ شہد کی مکھیاں فطری طور پر اپنے کارکردگی کے نظام کی حد درجہ پابند ہوتی ہیں۔ ان کی سردار ایک ملکہ ہوتی ہے جس کے گرد ان کی تمام سرگرمیاں جاری ہوتی ہیں۔ انڈے دینے کا کام یہی ملکہ کرتی ہے۔ ایک ملکہ روزانہ تقریباً ایک ہزار انڈے دیتی ہے۔ نر مکھیوں کا کام چھتے کا انتظام اور حفاظت ہے اور مادہ مکھیوں کا کام پھولوں کا رس لاکر شہد بنانا۔ صبح سے شام تک لگاتار یہ عمل جاری رہتا ہے۔ ایک چھتہ میں تقریباً ۱۰ ہزار مکھیاں ہوتی ہیں۔ شہد کی مکھیوں کا بکس گویا قدرت کے اسی نظام کو اپنے لئے استعمال کرنا ہے۔ خاص طرح کا بکس جس میں تقریباً ایک درجن چھتے بنانے کا انتظام ہوتا ہے، جتنی تعداد میں چاہے حاصل کر لیجئے۔ اور ان میں ملکہ اور مکھیاں لاکر رکھ دیجئے۔ یہ سب چیزیں حکومت کی طرف سے فراہم کی جاتی ہیں۔ بس اس کے بعد بقیہ کام مکھیاں خود بخود شروع کر دیں گی۔ ایک بکس کے ذریعہ سال میں تین سے پانچ کیلوگرام تک شہد حاصل ہوتا ہے۔ شہد کتنی قیمتی چیز ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک کیلوگرام شہد کی غذائی قیمت بارہ کیلوگرام سیب یا ۲۰ کیلوگرام گاجر کے برابر ہے۔

شہد کی مکھیوں کا نظام اتنا حیرت انگیز ہے اور اس کے اتنے زیادہ پہلو ہیں کہ اس پر موٹی موٹی کتابیں لکھی گئی ہیں اور اب بھی ان کی حیرت انگیز کارکردگی کے بارے میں تحقیقات جاری ہیں۔ مثلاً تحقیق کے دوران یہ معلوم ہوا ہے کہ شہد کی مکھیاں شہد جمع کرنے کا کام صرف دن میں کر سکتی ہیں۔ روشنی کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی منزل کا رخ سورج کے زاویہ سے مقرر کرتی ہیں۔ صبح بالکل سویرے سے شہد کی مکھیوں کی اڑان شروع ہو جاتی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ پھیرا ممکن ہوسکے کچھ مکھیاں پھولوں کا رس نکال کر لاتی ہیں اور کچھ صرف رہبری کا کام انجام دیتی ہیں۔ رہبر مکھیوں کا کام صرف یہ ہے کہ وہ لمبی اڑانیں بھر کر یہ معلوم کریں کہ شہد حاصل کرنے کے لئے پھول کہاں کہاں مل سکتے ہیں۔ وہ پتہ کرنے کے بعد دوسری مکھیوں کو وہاں پہنچنے میں رہنمائی کرتی ہیں۔

صبح کے وقت جتنے کم اجالے میں شہد کی مکھیوں کا سفر شروع ہوتا ہے، اگر شام کا آخری پھیرا بھی اتنا اجالا رہنے پر شروع کیا جائے تو کئی میل کے سفر کے بعد مکھی جب شہد لے کر اپنے چھتہ کی طرف لوٹے گی تو اندھیرا ہو چکا ہوگا اور اس کے لئے چھتہ تک پہنچنا ناممکن ہو جائے گا۔ چنانچہ شہد کی مکھی صبح کو سفر کا آغاز کسی قدر اندھیرے میں کر دیتی ہے۔ مگر شام کو جب لوٹتا ہوتا ہے تو کافی اجالا رہتے ہوئے آخری واپسی کا سفر شروع کرتی ہے تاکہ اجالے اجالے میں وہ اپنے چھتہ تک پہنچ جائے —— یہ خدا کا نظام اصلاح ہے جو کائنات میں قائم ہے۔ انسان کو بھی اپنے معاملات میں اس کی پیروی کرنا ہے ورنہ وہ خدا کے یہاں مفسد قرار پائے گا۔

محمدؐ

(انگریزی سے ترجمہ)

محمدؐ کی شخصیت کے بارے میں مکمل صداقت کو جاننا بہت ہی مشکل ہے۔ میں تو صرف اس کی بعض جھلکیوں کو پاسکتا ہوں۔ کتنے خوبصورت مناظر یکے بعد دیگرے ڈرامائی طور پر سامنے آتے رہتے ہیں ——— محمدؐ پیغمبر، محمدؐ جنرل، محمدؐ حکمراں، محمدؐ غازی، محمدؐ تاجر، محمدؐ مبلغ، محمدؐ فلسفی، محمدؐ سیاست داں، محمدؐ خطیب، محمدؐ مصلح، محمدؐ یتیموں کا ملجا، غلاموں کا حامی، محمدؐ جج، محمدؐ پیشوا۔ ان تمام خوبصورت ادوار میں، انسانی اعمال کے ان تمام دائروں میں آپ ایک ہیرو معلوم ہوتے ہیں۔

یتیمی کی حالت بے چارگی کی آخری انتہا ہے اور اس دنیا میں آپ کی زندگی اسی انتہا سے شروع ہوئی — حکمرانی مادی طاقت کی انتہا ہے، اور اس دنیا میں آپ کی زندگی اسی پر ختم ہوئی۔

ایک یتیم بچے اور مظلوم مہاجر سے ابتدا کر کے آپ ایک پوری قوم کے روحانی اور مادی حاکم اعلیٰ اور اس کی تقدیر کے مالک بن گئے۔ اس عمل کے دوران پیش آنے والے امتحانات و ترغیبات، مشکلات و تغیرات، روشنیاں اور سائے، اونچ نیچ، دہشت اور عظمت کے دوران وہ دنیا کے امتحان میں کامیاب ہو کر زندگی کے ہر میدان میں ایک نمونہ بن کر ظاہر ہوئے۔ ان کی کامیابیاں زندگی کے کسی ایک میدان سے متعلق نہیں بلکہ انسانی زندگی کے تمام احوال پر حاوی ہیں۔

مثال کے طور پر عظمت اگر یہ ہے کہ بربریت اور مکمل اخلاقی تاریکی میں پڑی ہوئی قوم کو پاک کیا جائے تو جس نے اس پوری قوم کی کایا پلٹ دی، اس گری ہوئی قوم کو اتنا اونچا اٹھا دیا کہ وہ تہذیب و معرفت کی روشنی کی حامل بن گئی، اس عظیم شخصیت کو عظمت کا دعویٰ کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ اگر عظمت یہ ہے کہ کسی سوسائٹی کے متنفر عناصر کو آپس میں بھائی چارگی اور خیر خواہی کے روابط میں جوڑ دیا جائے تو صحرا میں ہونے والے نبی کو عظمت کے امتیاز کا پورا حق حاصل ہے۔ اگر عظمت ذلیل کن توہمات اور ہر قسم کی مہلک عادتوں میں مبتلا قوم کی اصلاح کرنا ہے، تو پیغمبر اسلام نے لاکھوں آدمیوں کے دل سے توہمات اور غیر معقول خوف کو نکال باہر کیا۔ اگر عظمت بلند اخلاق کا مظاہرہ ہے، تو محمدؐ کے دوستوں، دشمنوں سبھی نے ان کو "الامین" اور "الصادق" کا لقب دیا تھا۔ اگر فاتح عظیم ہوتا ہے، تو محمدؐ بھی ایک مجبور یتیم اور عام انسان کی زندگی سے بلند ہو کر جزیرہ عرب کے حاکم بن گئے جو کہ خسرو اور قیصر کا ہم پلہ منصب تھا۔ محمدؐ وہ تھے جنھوں نے ایک عظیم سلطنت قائم کی جو کہ ان گزری ہوئی چودہ صدیوں میں بھی برقرار ہے۔ اگر لیڈر کے لئے اس کے تابعین کا احترام اس کی عظمت کا معیار ہے تو پیغمبر کا نام آج بھی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کروڑوں لوگوں کے لئے جادو کی حیثیت رکھتا ہے۔

انھوں نے ایتھنز، روم، فارس، ہندوستان یا چین میں فلسفہ کی تعلیم نہیں حاصل کی تھی۔ لیکن انھوں

نے انسانیت کو لافانی حیثیت کے حامل عظیم ترین حقائق سے باخبر کیا۔ محمدؐ خود تو ان پڑھ تھے، لیکن وہ اتنی فصاحت اور جوش سے بولتے تھے کہ لوگ بے اختیار رو پڑتے تھے۔ اگرچہ محمدؐ یتیم اور دنیا کی دولتوں سے محروم پیدا ہوئے تھے، لیکن پھر بھی سب ان سے محبت کرتے تھے۔ انھوں نے کسی فوجی کالج میں تعلیم نہیں حاصل کی تھی، لیکن پھر بھی بڑی بڑی مشکلات پر قابو پا کر انھوں نے اپنی فوجوں کو منظم کیا اور اپنی ماہرانہ اخلاقی قوتوں کے بل پر جنگیں جیت لیں۔ خوبیوں سے بھرپور ایسے لوگ بہت نادر ہیں جن میں دوسروں کو بھی دعوت دینے کا ملکہ ہو۔ ڈیکارٹ نے کہا ہے کہ مکمل داعی دنیا کی سب سے نادر مخلوقات میں سے ایک ہے۔ ہٹلر نے بھی اپنی سوانح عمری "میری جدوجہد" میں اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے: ایک عظیم نظریہ ساز شاذ و نادر ہی ایک عظیم قائد ہوتا ہے۔ احتجاجی لیڈر ان خوبیوں کا اور بھی کم حامل ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایسا آدمی بہتر لیڈر ہو کیوں کہ قیادت کے لئے عوام کو حرکت میں لانے کی خصوصیت ضروری ہے۔ افکار پیدا کرنے کی صلاحیت، قائدانہ صلاحیت کے ساتھ کوئی قدر مشترک نہیں رکھتی۔ پیغمبر اسلام کی ذات میں دنیا نے اس نادر ترین منظر کو بھی حقیقی وجود کی صورت میں دیکھ لیا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات وہ ہے جس کا اظہار پروفیسر باسورتھ اسمتھ نے کیا ہے: "وہ ریاست اور چرچ (دینی تنظیم) دونوں کے سربراہ تھے، وہ ایک ساتھ پوپ اور قیصر دونوں تھے۔ لیکن وہ ایسے پوپ تھے، جو پوپ کے دعووں سے خالی تھا۔ وہ ایسے قیصر تھے جو قیصر کی فوجوں کے بغیر تھا۔ نہ ان کے پاس ہر وقت تیار کھڑی رہنے والی فوج تھی، نہ ذاتی حفاظتی کارکن نہ ہی محل، نہ ہی کوئی مقررہ ٹیکس کی آمدنی۔ اگر کسی کو کبھی یہ دعویٰ کرنے کا حق ہو کہ اس نے خدائی حق کے ذریعہ حکومت کی ہے، تو وہ محمدؐ ہی ہوں گے، کیوں کہ ان کے پاس تمام اختیارات تھے، لیکن ان تمام ذرائع و وسائل کے بغیر جن سے وہ اختیارات حاصل کئے جاتے ہیں اور باقی رکھے جاتے ہیں انھوں نے طاقت کے نمائش اور رکھ رکھاؤ کا کبھی خیال نہیں کیا۔ ان کی نجی زندگی کی سادگی ویسی ہی تھی جیسی ان کی عام زندگی۔"

مکہ فتح ہونے کے بعد ایک ملین مربع میل سے زیادہ زمین ان کے قدموں کے نیچے آگئی۔ پورے جزیرۂ عرب کا حکمراں ہونے کے باوجود وہ اپنے جوتے اور کھردرے اونی کپڑے خود ٹھیک کرتے تھے۔ بکریوں کو دوہتے تھے۔ زمین کو جھاڑو دیتے تھے۔ آگ جلاتے تھے اور خاندان کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے تھے۔ مدینہ کا پورا شہر، جہاں آپ رہتے تھے، آپ کے آخری دنوں میں بہت مال دار ہو گیا تھا۔ ہر جگہ وہاں سیم و زر کی فراوانی تھی۔ لیکن خوش حالی کے ان دنوں میں بھی کئی کئی ہفتے اس طرح گزرتے تھے کہ جزیرۂ عرب کے حکمراں کے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ ان کا سارا کھانا ان دنوں میں پانی اور کھجور ہوتی تھی۔ پورا خاندان بہت سی راتوں کو بھوکا سوتا تھا کیوں کہ شام کو انھیں کھانے کو کچھ بھی میسر نہ ہو سکا تھا۔ ایک لمبے مشغول دن کے بعد وہ کسی نرم بستر پر نہیں سوتے تھے، بلکہ کھجور کے پتے کی بنی ہوئی چٹائی پر۔ راتوں کو وہ اکثر رو رو کر اپنے خالق سے دعا کرتے تھے کہ انھیں اپنے مشن کو پورا کرنے کی طاقت عطا فرمائے۔ روایتوں میں آیا ہے کہ ان کی آواز رونے کی وجہ سے ایسی ہو جاتی تھی جیسے کہ کوئی پتیلی آگ پر ہو اور اس کا ابلنا شروع ہو گیا ہو۔ ان کی موت کے دن ان کا سارا اثاثہ چند سکے تھے، جس کا کچھ حصہ قرضہ ادا کرنے کے لئے دے دیا گیا اور باقی ایک غریب کو دے دیا گیا جو ان کے گھر خیرات مانگنے آیا تھا۔ جس کپڑے

میں ان کی زندگی تمام ہوئی اس میں بہت سے پیوند لگے ہوئے تھے۔ وہ گھر، جس سے ساری دنیا میں روشنی پھیلی، تاریک تھا کیوں کہ اس کے پاس دیا جلانے کے لئے تیل نہیں تھا۔ حالات بدل گئے، لیکن اللہ کے پیغمبر نہیں بدلے۔ جیت میں اور ہار میں، حکمرانی میں یا بدحالی میں، فراوانی میں یا محتاجی میں وہ ایک ہی آدمی تھے۔ ہر حال میں ان کا سلوک ایک ہی تھا۔ جس طرح اللہ پاک کے طریقے اور قوانین ایک ہیں اسی طرح سے اللہ کے انبیاء بھی بدلنے والے نہیں ہوتے۔

۵

ایک ضرب المثل میں کہا گیا ہے کہ امانت دار آدمی اللہ کی بہترین مخلوق ہے۔ محمدؐ امانت دار سے بھی کچھ زیادہ تھے ان کے پور پور میں انسانیت رچی بسی ہوئی تھی۔ انسانی ہمدردی، انسان دوستی ان کی روح کی موسیقی تھی۔ ان کا مشن ہی یہ تھا کہ انسان کی خدمت کی جائے۔ انسان کو بلند کیا جائے، پاک کیا جائے، تعلیم دی جائے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کو انسان بنایا جائے۔ یہی ان کی زندگی کا سارا مدعا تھا۔ ان کے خیالات، الفاظ اور اعمال سب کا مقصد انسانیت کی بہتری تھی۔

دکھاوا ان میں بالکل نہیں تھا اور وہ انتہائی حد تک بے غرض تھے۔ انھوں نے اپنے لئے کون سے ٹائیٹل چنے ؟ صرف دو: اللہ کا بندہ اور اس کا رسول۔ پہلے بندہ پھر رسول۔ وہ اسی طرح پیغمبر تھے، جس طرح دوسرے بہت سے پیغمبر تھے جو دنیا کے مختلف حصوں میں آ چکے ہیں، جن میں بعضوں کو ہم جانتے تھے اور بعض دوسرے ہمارے لئے نامعلوم ہیں۔ اگر کوئی ان حقائق پر ایمان نہیں رکھتا ہے تو وہ مسلم نہیں باقی رہتا۔ اس بات پر ایمان ہر مسلم کے عقیدہ کا جزء ہے۔ ایک یورپین مؤلف نے لکھا ہے: "ان کے زمانے کے حالات اور ان کے پیروؤں کا آپ پر انتہائی حد تک اعتقاد کو دیکھتے ہوئے سب سے بڑی معجزانہ بات یہ ہے کہ محمدؐ نے کبھی معجزات پر قادر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا"۔ محمدؐ سے معجزے بھی ہوئے، لیکن ان کا مقصد اپنے دین کا پروپیگنڈہ کرنا نہ تھا بلکہ انھوں نے ان معجزات کو صرف اللہ سے اور اللہ کے فہم و ادراک سے بالا طریقۂ کار سے منسوب کیا۔ وہ صاف کہتے تھے کہ دوسروں کی طرح وہ بھی ایک عام آدمی ہیں۔ وہ زمین و آسمان کے خزانوں کی ملکیت کا دعویٰ نہیں کرتے تھے، نہ ہی وہ غیب کو جاننے کا دعویٰ کرتے تھے۔ یہ سب اس وقت ہوا جب معجزات کو عام بات سمجھا جاتا تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ کوئی بھی مقدس شخص چٹکیوں میں معجزات لا سکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جزیرۂ عرب کے اندر اور باہر ہر جگہ مافوق الفطرت عقائد کی حکمرانی تھی۔ انھوں نے اپنے پیروؤں کی توجہ فطرت اور فطری قوانین پر غور کرنے کے لئے دلائی، تاکہ وہ اللہ کی عظمت کو صحیح طرح سے سمجھ سکیں۔ قرآن کا کہنا ہے: آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو ہم نے کھیل کے طور پر نہیں بنایا۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے (دخان ۳۹-۳۸)

دنیا کوئی واہمہ نہیں ہے، نہ ہی دنیا بلا مقصد پیدا کی گئی ہے۔ دنیا برحق پیدا کی گئی ہے۔ قرآن کی وہ آیات جو فطرت کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیتی ہیں وہ نماز، روزہ، حج وغیرہ کے بارے میں حکم دینے والی آیات کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہیں۔ قرآن کے اثر کے تحت مسلمانوں نے فطرت کا عمیق مطالعہ شروع کیا، اور اسی وجہ سے سائنسی مطالعہ اور تجربہ کا وہ مزاج پیدا ہوا جو کہ یونانیوں کے یہاں معدوم تھا۔ جبکہ مسلم ماہر نباتات ابن بیطار نے (علم نباتات) پر ساری دنیا کے پودے جمع کر کے ایک ایسی کتاب لکھی جس کو میئر (Mayer) نے اپنی کتاب (Gesch der Botanika) میں "محنت کا مینار" بتایا ہے،

جب کہ البیرونی نے چالیس سال تک سفر کر کے معدنیات کے نمونے حاصل کئے، جبکہ مسلم علمائے فلکیات بارہ بارہ سال سے زیادہ کے مطالعہ کو مدوّن کر رہے تھے، ارسطو نے فزکس پر بغیر ایک بھی تجربہ کئے ہوئے قلم اٹھایا، طبعی تاریخ پر اس نے اتنی لاپرواہی سے لکھا کہ اس نے اس بات کی بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ "انسان کے دانت جانور سے زیادہ ہوتے ہیں" کا دعویٰ کرنے سے پہلے اس کی تصدیق بھی کر لیتا جو کہ کتنا آسان کام تھا۔ جالینوس نے، جس کو قدیم علم تشریح کا سب سے بڑا استاد سمجھا جاتا ہے، لکھا ہے کہ نچلا جبڑا دو ہڈیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس بات کو صدیوں تک تسلیم کیا جاتا رہا یہاں تک کہ عبداللطیف نے انسانی ڈھانچہ کا مطالعہ کیا۔ اس قسم کے بہت سے واقعات بیان کرنے کے بعد روبرٹ بریفالٹ نے (The Making of History میں لکھا ہے: "ہماری سائنس عربوں کی صرف اس حد تک مقروض نہیں ہے کہ انھوں نے حیرت انگیز دریافتیں کیں یا انقلابی نظریات کی بنیاد ڈالی۔ ہماری سائنس عرب تہذیب کی اس سے کہیں زیادہ مقروض ہے: وہ خود اپنے وجود کے لئے عرب تہذیب کی مقروض ہے۔" اسی مؤلف نے مزید لکھا ہے: "یونانیوں نے نظاموں کی بنیاد رکھی، عمومیات کا رواج نظریات بنائے، لیکن تلاش کے صبر آزما طریقے، ایجابی معلومات کا جمع ہونا، سائنس کے دقیق طریقے، مفصل اور طویل برنات، تجرباتی مطالعہ — یہ سب چیزیں یونانی مزاج کے لئے اجنبی تھیں۔ جس چیز کو ہم یورپ میں سائنس کہتے ہیں، وہ تلاش کے نئے طریقوں، تجربات، مطالعہ، وزن کرنے اور ریاضیات کی ترقی کی وجہ سے وجود میں آئی ہے اور یہ طور وطریقے یونانیوں کو معلوم نہ تھے۔ ... عربوں نے اس مزاج اور طور طریقوں کو یورپ میں روشناس کرایا۔"

۶

پیغمبر محمدؐ کی تعلیمات کی عملی نوعیت نے ہی سائنسی اسپرٹ کو جنم دیا۔ ان کی تعلیمات نے روزمرہ کی محنت اور دنیاوی امور کو احترام و تقدس عطا کیا۔ قرآن کا کہنا ہے کہ اللہ نے انسان کو عبادت کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ لیکن یہاں عبادت کا اپنا خاص مفہوم ہے۔ اسلام میں اللہ کی عبادت صرف نماز تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہر وہ کام جو اللہ کی خوشنودی اور انسانیت کی بھلائی کے لئے کیا جائے وہ بھی عبادت ہی کا جزو ہے۔ زندگی کے تمام معاملات اسلام کی نظر میں تقدس کے حامل ہیں بشرطیکہ ان کو امانت داری، انصاف اور خالص نیت سے کیا جائے۔ اسلام نے "دینی" اور "غیر دینی" معاملات کی حدبندی کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن کا کہنا ہے کہ اگر تم پاک و طاہر غذا کھا کر اللہ کا شکر ادا کرو تو یہ بھی ایک عبادت ہے۔ پیغمبر اسلام کا کہنا ہے کہ اپنی بیوی کے منھ میں لقمہ رکھنا بھی ایک نیکی ہے جس کا بدلہ اللہ عطا کریں گے۔ پیغمبر کے ایک قول میں آیا ہے کہ "اگر کوئی اپنی دل کی خواہش کو بھی پورا کرے تو اللہ پاک اس کو اجر دے گا بشرطیکہ اس کو حاصل کرنے کے طریقے جائز رہے ہوں۔" یہ سن کر ایک صحابی نے کہا: اے اللہ کے رسول ایسا کر کے وہ انسان صرف اپنے دل کی خواہش کو پورا کر رہا ہے۔ پیغمبر نے فوراً جواب دیا: "اگر وہ اپنی خواہش پورا کرنے کے لئے کوئی غلط طریقہ اپناتا تو اس کو سزا ملتی، تو صحیح طریقہ اپنانے کی وجہ سے اسے انعام کیوں نہیں ملے گا۔"

دین کو پوری طرح سے زندگی کو بہتر بنانے کے لئے وقف ہونا چاہئے نہ کہ وہ صرف چند دنیوی زندگی سے ماورا امور سے متعلق ہو۔ دین کے اس نئے تصور نے نئی اخلاقی قدروں کو جنم دیا۔ (کے۔ ایس۔ راما کرشنا راؤ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سمندر میں برف کے بہت بڑے بڑے تودے ہوتے ہیں جن کو آئس برگ کہا جاتا ہے۔ ان برفانی پہاڑوں کا دس میں سے نو حصہ پانی میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور صرف ایک حصہ پانی کے اوپر دکھائی دیتا ہے۔ ایسی ہی کچھ مثال انسانی زندگی کی ہے۔ انسان کو اس کے پیدا کرنے والے نے دائمی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ اور پھر اس کی زندگی کے نہایت مختصر حصہ ــــ تقریباً سو سال ــ کو موجودہ دنیا میں رکھ کر بقیہ تمام عمر کو آخرت کی دنیا میں ڈال دیا۔

موت وہ دروازہ ہے جس سے ہم، اپنی موجودہ مدت حیات پوری کرنے کے بعد، دوسری دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔

یہ انسانی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے انسان کی کامیابی کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) کو اپنی زندگی بنائے اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے وسائل اور اپنی سرگرمیوں کو اس طرح منظم کرے جو اس کی زندگی کے اگلے مرحلے کو بہتر بنانے والا ہو۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کے تمام کارنامے اسی دنیا میں رہ جائیں گے اور موت کے بعد دوسری دنیا میں وہ اس حال میں پہنچے گا کہ آخرت کی طویل تر زندگی میں اپنی جگہ بنانے کے لیے اس کے پاس کچھ نہ ہوگا۔

یہی وہ نازک مسئلہ ہے جس سے انسان کو باخبر کرنے کے لیے خدا نے پیغمبروں کا سلسلہ جاری کیا۔ ہر دور میں خدا کے نمائندے آئے اور آسمانی کتابیں اتاری گئیں تاکہ موت کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے انسان کو بتا دیا جائے کہ اس کو بالآخر کہاں جانا ہے۔ اور اپنی مستقل کامیابی کے لئے اسے کیا کرنا چاہئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ تاہم جہاں تک پیغمبرانہ کام کا تعلق ہے اس کی ضرورت بدستور باقی ہے۔ آج بھی یہ مطلوب ہے کہ خدا کے بندوں کو اس اہم ترین حقیقت سے باخبر کیا جائے تاکہ آخرت میں خدا کے اوپر کسی کی حجت باقی نہ رہے۔

خدا کے اس پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچانے کے لیے اب کوئی پیغمبر آنے والا نہیں ہے۔ اب امت مسلمہ اس کی ذمہ دار ہے۔ خاتم النبیین کی امت کا اصل مشن دنیا میں یہی ہے کہ وہ اس پیغمبرانہ ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اٹھے۔ یہ اس کا ایسا ناگزیر فریضہ ہے جس سے غفلت کسی حال میں معاف نہیں ہو سکتی

اسلامی مرکز کا قیام اس لئے عمل میں آیا ہے کہ امت مسلمہ کو اس کی اس ذمہ داری کی طرف متوجہ کرے اور تمام ممکن ذرائع سے حق کا پیغام لوگوں تک پہنچائے۔

یہ ایک باقاعدہ طور پر رجسٹرڈ ادارہ ہے اور ماہنامہ الرسالہ اسی کے آرگن کے طور پر جاری کیا گیا ہے۔

اسلامی مرکز کے پروگرام کو چلانے کے لئے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ اسلامی مرکز کا مقصد پیغمبرانہ مشن کو زندہ کرنا ہے اس کے ساتھ تعاون کرنا پیغمبرانہ مشن کے ساتھ تعاون کرنا ہے۔

اسلامی مرکز

دفتر الرسالہ متصل جمعیۃ بلڈنگ۔ قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی

فارم IV

(دیکھو رول نمبر ۸)

ماہنامہ الرسالہ ۔ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ ۔ دہلی

۱۔ مقام اشاعت جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۲۔ وقفہ اشاعت ماہانہ

۳۔ نام پرنٹر (طابع) ثانی اثنین خاں

قومیت ہندوستانی

پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۴۔ نام پبلشر (ناشر) ثانی اثنین خاں

قومیت ہندوستانی

پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۵۔ نام ایڈیٹر (مدیر مسؤل) ثانی اثنین خاں

قومیت ہندوستانی

پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ ۔ دہلی ۶

۶۔ نام اور پتہ مالک رسالہ ثانی اثنین خاں

جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

میں ثانی اثنین خاں تصدیق کرتا ہوں کہ جو تفصیلات اوپر دی گئی ہیں، میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔

ثانی اثنین خاں

یکم مارچ ۱۹۸۰ء

ملی تعمیر کا کام

سب سے پہلے

ملت کے افراد میں

شعور پیدا کرنے کا کام ہے

اس کی

بہترین صورت یہ ہے کہ

الرسالہ کو

ایک ایک بستی اور

ایک ایک گھر میں

پہنچایا جائے۔

ایجنسی: ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت —— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔

دوسری صورت —— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

عربی مطبوعات

مولانا وحید الدین خاں کی کتابوں کے بعض عربی ترجمے (مطبوعہ قاہرہ) برائے فروخت مکتبہ الرسالہ میں موجود ہیں:

کتاب	صفحات		قیمت	
۱۔ الإسلام يتحدى	۲۶۴	صفحات	قیمت ۲۰	روپے
۲۔ الدين في مواجهة العلم	۱۱۲	صفحات	" ۱۰	روپے
۳۔ حكمة الدين	۸۷	صفحات	" ۸	روپے
۴۔ الإسلام والعصر الحديث	۷۷	صفحات	" ۸	روپے
۵۔ مسئوليات الدعوة	۳۹	صفحات	" ۲	روپے
۶۔ نحو تدوين جديد للعلوم الإسلامية	۲۶	صفحات	" ۲	روپے
۷۔ إمكانات جديدة للدعوة	۳۴	صفحات	" ۲	روپے
۸۔ الشريعة الإسلامية وتحديات العصر	۳۲	صفحات	" ۲	روپے
۹۔ المسلمون بين الماضي والحال والمستقبل	۷۲	صفحات	" ۵	روپے
۱۰۔ نحو بعث إسلامي	۳۲	صفحات	" ۵۰	پیسے

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

- **دین کیا ہے** — صفحات ۳۲ قیمت ۵۰/۱ روپے
- **تجدید دین** — صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- **مذہب اور جدید چیلنج** — صفحات ۲۲۴ قیمت ۵۰/۱۳ روپے
- **تعمیر ملت** — صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- **الاسلام** — صفحات ۱۷۶ قیمت ۱۲/- روپے
- **اسلام دین فطرت** — صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- **ظہور اسلام** — صفحات ۲۰۰ قیمت ۱۲/- روپے
- **زلزلۂ قیامت** — صفحات ۶۴ قیمت ۳/- روپے
- **اسلامی دعوت** — صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- **تاریخ کا سبق** — صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- **عقلیات اسلام** — صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- **قرآن کا مطلوب انسان** — صفحات ۸۰ قیمت ۵۰/۴ روپے
- **مذہب اور سائنس** — صفحات ۷۲ قیمت ۴/-
- **پیغمبر اسلام** — صفحات ۴۸ قیمت ۲/-
- **سبق آموز واقعات** — صفحات ۴۸ قیمت ۲/-

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

REGD. R N NO 28822 76
REGD D (D) NO 532

March 1980
Issue No. 40

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET, DELHI 110006 INDIA PHONE 262331

سرپرست
مولانا وحیدالدین خان

اپریل ۱۹۸۰
شمارہ ۴۱

جمعیۃ بلڈنگ ، قاسم جان اسٹریٹ ، دھلی ۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے ڈرافٹ بنام الرسالہ منتھلی Al-Risala Monthly لکھیں

He was left speechless

H. T. Correspondent

New Delhi, February, 19 — Caught by the camera!

A three-wheeler scooter-rickshaw driver was left without an excuse when a video tape-recording of his movements was shown to him a few days ago.

The sub-inspector controlling traffic with the newly-installed closed circuit television cameras spotted on his monitor a TSR driver parking his vehicle at the "No Parking" place at one of the crossings.

He made announcements over the public-address system, but the driver would not listen. The SI then sent a policeman to challan the driver. The driver, protesting that he had parked his vehicle just for a minute to drop a passenger, came over to the Central Control Room to meet the SI.

The SI after listening to his arguments, showed him the video tape-recording of what all he had been doing since the time he parked his vehicle. When the driver saw himself loitering about, talking with his friends, all picturised clearly on the screen, he was left speechless.

The Hindustan Times, February 20, 1980

زبان والے بے زبان ھوجائیں گے

نئی دہلی کی بعض سڑکوں پر سواریوں کو کنٹرول کرنے کا نیا نظام قائم کیا گیا ہے۔ یہاں سڑک کے اوپر ٹیلی وزن کیمرے نصب ہیں جو آنے جانے والی سواریوں کا مسلسل فوٹو لیتے رہتے ہیں۔ یہ فوٹو مشینی انتظام کے ذریعہ ایک علیحدہ کمرہ (کنٹرول روم) میں پہنچتے ہیں جہاں ایک سرکاری انسپکٹر لوگوں کی نظروں سے دور بیٹھا ہوا ان کی تمام حرکات کو اسکرین پر دیکھتا رہتا ہے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے آپ کسی منظر سے دور رہتے ہوئے اس کو اپنے گھر کے ٹیلی وزن سیٹ پر دیکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ سڑک پر لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے ہیں۔ بند کمرہ میں بیٹھا ہوا آدمی جب کسی مسافر کو غلط چلتے ہوئے دیکھتا ہے تو فوراً وہ لاؤڈ اسپیکر پر اس کو متنبہ کرتا ہے۔ مسافر بولنے والے کی آواز سنتا ہے، اگرچہ وہ بولنے والے کو نہیں دیکھتا۔

ایک روز ایسا ہوا کہ ایک ڈرائیور جو تین پہیہ والا اسکوٹر رکشا چلا رہا تھا، اس نے اپنا اسکوٹر ایک ایسے مقام پر کھڑا کیا جہاں گاڑی کھڑی کرنا منع تھا۔ انسپکٹر نے اپنے کمرے کی اسکرین پر اس کو دیکھا اور فوراً لاؤڈ اسپیکر پر بولتے ہوئے چیتاونی دی کہ تم نے اپنا اسکوٹر ممنوع مقام پر کھڑا کر دیا ہے، فوراً وہاں سے ہٹ جاؤ۔ اسکوٹر ڈرائیور کے کان تک آواز پہنچی مگر اس نے اس کی پروا نہ کی۔ کیوں کہ آس پاس اس کو پولیس کی وردی پہنے ہوئے کوئی شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مذکورہ مشینی نظام چوں کہ ابھی حال میں نصب کیا گیا ہے اس لئے ڈرائیور کو اس کی خبر نہ تھی۔ اعلان کے الفاظ فضا میں گونج رہے تھے مگر اس نے سنجیدگی کے ساتھ اس کو سمجھنے کی بھی کوشش نہ کی۔ دوسری طرف انسپکٹر اس کی حرکات کو برابر اپنی اسکرین پر دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ ڈرائیور اس کی ہدایت کو نظر انداز کر رہا ہے تو اس نے اپنے پاس سے ایک سپاہی کو بھیجا کہ ڈرائیور کو پکڑ واور اس کا نمبر دیکھ کر اس کا چالان کرو۔ سپاہی جب ڈرائیور کے پاس پہنچا تو اس نے اپنی غلطی ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ میں نے اپنا اسکوٹر یہاں کھڑا نہیں کیا۔ میں تو سواری اتارنے کے لئے صرف ایک منٹ رکا تھا اور اب اپنے راستہ پر آگے جا رہا ہوں۔

اس کے بعد سپاہی اس کو انسپکٹر کے پاس کنٹرول روم میں لے گیا۔ انسپکٹر کے سامنے بھی ڈرائیور نے وہی بات کہی جو اس نے سپاہی سے کہی تھی۔ انسپکٹر نے جب دیکھا کہ ڈرائیور اپنے جرم کا اقرار نہیں کر رہا ہے تو اس نے اپنی مشین کو پیچھے کی طرف گھمایا اور ڈرائیور کی فلم اس کے سامنے چلا دی۔ اچانک اسکرین پر ڈرائیور اور اس کا اسکوٹر دکھائی دینے لگا۔ اب ڈرائیور مشین کے سامنے کھڑا ہوا اپنی تمام سابقہ حرکات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنا اسکوٹر چلاتے ہوئے آیا۔ پھر اس کو نظر آیا کہ وہ اپنا اسکوٹر اس مقام پر کھڑا کر رہا ہے جہاں گاڑی کھڑا کرنا منع تھا۔ اس کے بعد وہ اسکوٹر سے باہر آیا اور دیر تک بے فکری کے ساتھ ادھر ادھر گھومتا رہا۔ وہ اطمینان کے ساتھ اپنے دوست سے باتیں کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ انسپکٹر کا بھیجا ہوا سپاہی اس کے پاس آگیا۔ اب اس نے جلدی سے اپنا اسکوٹر اسٹارٹ کر دیا اور ظاہر کیا کہ وہ تو راہ چلتے ہوئے ایک منٹ کے واسطے یہاں رکا تھا اور اب آگے جا رہا ہے۔ یہ ساری کہانی متحرک تصویروں کی صورت میں ڈرائیور نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ اس سے پہلے ڈرائیور نے انسپکٹر کی بات کا انکار کر دیا تھا۔ اس کے پاس اپنی براءت ظاہر کرنے کے لئے بے شمار الفاظ تھے۔ مگر اسکرین نے جب اس کے ماضی کی پوری داستان اس کے سامنے ہو بہو دہرا دی تو اچانک اس کی زبان بند ہو گئی۔ اس کے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر اس کا ایسا حال ہوا

جیسے وہ گونگا ہوگیا ہے اور اب اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ اس کا جرم اتنا زیادہ ثابت ہوچکا تھا کہ اب اس کو یہ کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی کہ میں مجرم ہوں۔ وہ خاموش تھا مگر اس کی خاموشی ہر گفتگو سے زیادہ یقینی صورت میں اس کے جرم کا اقرار بن گئی تھی (ہندستان ٹائمس ۲۰ فروری ۱۹۸۰)

قرآن میں ارشاد ہوا ہے، کہہ دو کہ سب تعریف اللہ کے لئے ہے۔ وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھائے گا تب تم اس کو پہچان لوگے۔ بس کی تمھیں خبر دی جارہی ہے (سیریکم آیاتہ فتعرفونہا، نمل) مذکورہ بالا قسم کے واقعات جو موجودہ زمانہ میں پیش آرہے ہیں وہ شاید اسی پیشین گوئی کی تصدیق ہیں۔ اللہ کی طرف سے پکارنے والے لوگوں کو آخرت کی چیتاونی دے رہے ہیں۔ مگر آدمی خدائی آواز پر توجہ نہیں دیتا۔ وہ اپنے کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے دلائل کا انبار لگا رہا ہے۔ داعی حق کے پیغام کو رد کرکے بھی موجودہ دنیا میں وہ اپنے کو محفوظ اور مطمئن محسوس کر رہا ہے۔ داعی حق کو ماننا اور اس کا ساتھ دینا اس کو ایسا کام نظر آتا ہے جس کی اسے کوئی ضرورت نہ ہو۔ مگر اس کی پوری زندگی حتی کہ اس کے دل کے ارادے بھی خدا کے چھپے ہوئے انتظام کے تحت ریکارڈ کئے جارہے ہیں قیامت جب آئے گی تو آدمی کے سامنے اس کی سابقہ زندگی کی یہ فلم اس طرح دہرادی جائے گی کہ وہ اپنی سوچ، اپنا قول اور اپنا عمل سب کچھ آنکھوں سے دیکھے گا اور کانوں سے سنے گا۔ اس وقت انسان کا جو حال ہوگا اس کا ایک معمولی نقشہ مذکورہ اسکوٹر ڈرائیور کے انجام میں نظر آرہا ہے۔ آدمی اس وقت اتنا بدحواس ہوگا کہ وہ اپنے الفاظ بھول جائے گا۔ اس کے دلائل اس وقت بالکل بے معنی معلوم ہوں گے۔ اس کا انکار اس وقت ایک ایسی چیز کا انکار بن جائے گا جو ساری کائنات میں اسی طرح معلوم اور ثابت شدہ بن چکا ہو جیسے ہمارے سروں پر چمکنے والے سورج اور چاند

قیامت میں اس کی زندگی کی یہ فلم ہر آدمی کو بتائے گی کہ جب وہ زبان سے حق کا انکار کرتا تھا اس وقت بھی اس کا دل حق کے دلائل کا وزن پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا کہ اسٹیج پر اچھی اچھی تقریریں کرنے کے بعد جب وہ اپنے ماحول میں لوٹتا تھا تو وہ خود اپنے بولے ہوئے الفاظ کے خلاف عمل کرتا تھا۔ اس دن وہ دیکھے گا کہ وہ بظاہر ظلم کو مٹانے اور حق کو قائم کرنے کا نعرہ لگاتا تھا مگر اس کی ان کوششوں کی حقیقت ایک قیادتی ہنگامہ کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ وہ اپنے کو حق کا حامی ظاہر کرتا تھا مگر وہ خدا کے اس بندے کا ساتھ دینے کے لئے نہ اٹھا جس کو خدا نے اس کے سامنے حق کا پیغام لے کر بھیجا تھا۔ اس دن آدمی دیکھے گا کہ کس طرح وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف دے کر فتح کے قہقہے لگاتا تھا۔ وہ کمزور کا استیانہ اجاڑتا تھا اور طاقت ور کا استقبال کرتا تھا۔ وہ بظاہر دین اور اسلام کا نام لیتا تھا مگر جب ذاتی فائدوں اور مصلحتوں کا معاملہ آتا تھا تو اپنے فائدوں اور مصلحتوں کے سوا ہر چیز کو نظر انداز کردیتا تھا۔ وہ بظاہر اخلاق اور دین داری کی بات کرتا تھا مگر اس کا وہ دین جس پر وہ حقیقۃً قائم تھا وہ صرف خود غرضی، تعصب، حسد، انتقام اور اپنے مقابلہ میں دوسرے کو جھوٹا ثابت کرنے کا جذبہ تھا۔ وہ حق کا علم بردار بنتا تھا مگر جب حق کے اعتراف کا وقت آیا تو صرف اس لئے حق کے اعتراف سے رک گیا کہ ایسا کرنے سے اس کا یا اس کی محبوب شخصیتوں کا وقار مجروح ہوجائے گا۔ وہ خدا کے قانون کے نفاذ کا نعرہ لگاتا تھا مگر جب اس کو اختیار ملا تو وہ خود ساختہ قانون چلانے لگا اور خدا کے اذن کے بغیر لوگوں کے جان اور مال اور آبرو کو اپنے لئے جائز کرلیا۔ وہ اپنی آنکھوں سے عیاناً دیکھے گا کہ وہ صرف اپنی ذات کی سطح پر جی رہا تھا مگر جھوٹے الفاظ بول کر یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ خدا اور آخرت کی سطح پر جی رہا ہے۔

اللہ کیلئے جھکنے والے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں جب حقیقت سے پردہ اٹھایا جائے گا اور لوگ سجدہ کے لئے بلائے جائیں گے تو وہ لوگ سجدہ نہ کر سکیں گے جو اللہ کے سچے بندے نہ بنے تھے۔ ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی اور ان پر ذلت چھا رہی ہوگی۔ یہ حال ان لوگوں کا ہوگا جن کو دنیا میں سجدہ کے لئے بلایا جاتا تھا مگر وہ سجدہ نہ کرتے تھے (قلم ۴۳) قیامت میں انسان کو جو رسوائی اور عذاب ہوگا اس کی سب سے بھیانک صورت وہ ہوگی جب کہ مالک کائنات اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ وہ خدا جس نے ہم کو پیدا کیا، جس کے کھلانے سے ہم کھاتے ہیں اور جس کے چلانے سے ہم چلتے ہیں۔ جس نے ہم کو وہ سب کچھ دیا ہے جو ہمارے پاس ہے۔ ایسا عظیم اور محسن خدا بے پردہ انسان کے سامنے ہوگا۔ ایک طرف انسان ہوگا جس کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ دوسری طرف خدا ہوگا جس کے پاس ساری طاقتیں ہیں۔ انسان کا عجز اور خدا کی قدرت دونوں اپنی کامل صورت میں سامنے ہوں گی۔ اس وقت انسان چاہے گا کہ خدا کی عظمت وجلال کے آگے جھک جائے مگر وہ جھک نہ سکے گا۔ وہ چاہے گا کہ اس کی خدائی کے آگے اپنی بندگی کا اظہار کرے مگر وہ اس اظہار پر قادر نہ ہوگا۔ حتی کہ اپنے آقا اور محسن کے لئے تحمد کے کلمات ادا کرنے سے بھی اس کی زبان گونگی ہو جائے گی۔ ایک طرف اللہ کے سچے بندے اپنے رب کے آگے اپنے کو ڈال کر حقیقت کا اعتراف کر رہے ہوں گے۔ دوسری طرف وہ ذلت ورسوائی کا مجسمہ بنا ہوا کھڑا ہوگا۔ یہ ایسا ہولناک لمحہ ہوگا کہ انسان چاہے گا کہ کاش زمین پھٹ پڑے اور وہ اس کے اندر دھنس جائے۔ اس سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے کہ بندہ اپنے خالق اور مالک کے سامنے ہو مگر وہ اس کے آگے اپنی بندگی کا اقرار نہ کر سکے۔ واضح ہو کہ یہ حال صرف معروف قسم کے کافروں یا بے نمازیوں کا نہ ہوگا بلکہ ان لوگوں کا بھی ہوگا جو محض ظاہری سجدہ کرتے تھے، ان کی روح اللہ کے لئے ساجد نہیں بنی تھی۔ جنھوں نے وہ سجدہ نہیں کیا جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دے۔ وہ ہمہ تن اس کے آگے جھک جائے۔ بخاری نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا:

یکشف ربنا عن ساقہ فیسجد لہ کل مومن و مومنۃ ویبقی من کان یسجد فی الدنیا ریاء وسمعۃ فیذھب لیسجد فیعود ظھرہ طبقا واحدا (تفسیر ابن کثیر)	اللہ قیامت کے دن اپنے آپ کو ظاہر کرے گا۔ اس وقت مومن مرد اور عورتیں اللہ کے لئے سجدہ میں گر جائیں گے مگر جو شخص دنیا میں دکھانے اور سنانے کے لئے سجدہ کرتا تھا وہ سجدہ میں جانا چاہے گا مگر سجدہ نہ کر سکے گا۔ اس کی پیٹھ اکڑ جائے گی۔

زندگی میں بار بار وہ لمحہ آتا ہے جب کہ ایک طرف آدمی کی انا ہوتی ہے اور دوسری طرف اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر جو شخص انانیت کا راستہ اختیار کرے اور اللہ کے حکم کے آگے نہ جھکے اس نے اللہ کو سجدہ نہیں کیا۔ اگر وہ متعین اوقات میں بظاہر سجدہ کر رہا ہو تب بھی حقیقت کے اعتبار سے وہ سجدہ نہ کرنے والوں میں شامل ہے۔ اس نے ایسا سجدہ کیا ہے جو دنیا میں دیکھنے اور سننے والوں کو تو سجدہ معلوم ہوتا ہے مگر اللہ کی نظر میں وہ سجدہ نہیں۔ ایسے تمام لوگ آخرت میں اس اصلی حالت میں نمایاں ہو جائیں گے جہاں وہ باعتبار حقیقت دنیا میں تھے۔ دنیا میں ان کے سامنے اللہ کا حکم آیا مگر انھوں نے اس کو نظر انداز کیا۔ دنیا

میں وہ وقت آیا جب کہ ان کو اللہ کے خوف سے جھک جانا چاہئے تھا مگر اس وقت انھوں نے سرکشی دکھائی۔ دنیا میں انھوں نے اس حق کا انکار کیا جو اللہ نے اپنی سنت کے تحت اپنے ایک بندے کی زبان پر جاری کیا تھا۔ وہ اپنے عزت و وقار اور اپنے دنیوی مفاد کو سنبھالنے میں مشغول رہے۔ ایسے لوگ گویا اسی دنیا میں سجدہ کے وقت سجدہ نہیں کر رہے ہیں۔ ان کی یہی حالت آخرت میں کھل کر سامنے آجائے گی۔ دنیا میں ان کے دکھانے اور سنانے والے سجدے آخرت کے حقیقی عالم میں ان کے کسی کام نہ آئیں گے۔ آخرت میں اللہ کے آگے جھکنا کسی انسان کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ اس اعلیٰ اعزاز کے حق دار وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے دنیا میں اس بات کا ثبوت دیا ہو کہ وہ اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔

عبادت خانہ میں آدمی اللہ کے سامنے جو "سجدہ" کرتا ہے وہ باعتبار ظاہر اقرارِ سجدہ ہے نہ کہ ثبوتِ سجدہ۔ آدمی عبادت کے وقت سجدہ کر کے یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کے آگے جھکنے والا ہے مگر اس اقرار کا ثبوت اس کو بندوں کے ساتھ معاملات میں دینا ہے۔ بندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں جب تک وہ "جھکنے" کا رویہ اختیار نہ کرے اس کا اقرار بے ثبوت رہتا ہے اور بے ثبوت اقرار کی کوئی قیمت اللہ کے یہاں نہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: اللہ وہ نہیں کہ مسلمانوں کو چھوڑ دے اس حالت پر جس پر کہ تم ہو جب تک وہ جدا نہ کر دے ناپاک کو پاک سے (آل عمران ۱۷۹) گویا ایمان قبول کر کے آدمی "نماز روزہ" کی جو عام زندگی اختیار کرتا ہے اسی سے اس کے لئے جنت کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ بلکہ لازماً اس کو جانچا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا نماز روزہ حقیقی نماز روزہ ہے یا "دیکھنے اور سننے والا" نماز روزہ ہے۔ یہ جانچ کہاں ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا خود سامنے نہیں آتا نہ خدا کے فرشتے کوئی قلب نما آلہ لے کر آسمان سے اترتے۔ یہ جانچ انسان اور انسان کے معاملات میں ہوتی ہے۔ آدمی نماز کے ذریعہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کے سامنے جھک جانے والا ہے۔ روزہ کے ذریعہ وہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کے ڈر سے اس کی منع کی ہوئی چیزوں کو چھوڑ دینے والا ہے۔ اس اقرار کا عملی امتحان انسانی تعلقات میں ہوتا ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک حق کا معاملہ آجاتا ہے۔ وہاں ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی حق کے آگے جھک جائے۔ خواہ یہ جھکنا بظاہر ایک کمزور انسان کے آگے جھکنے کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔ ایسے موقع پر آدمی اگر جھک جائے تو گویا وہ اللہ کے آگے عملی طور پر جھک گیا۔ اس نے نماز میں کئے ہوئے اپنے اقرارِ سجدہ کو سچا ثابت کیا۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ ایک حق کا معاملہ جو بظاہر کسی انسان کی نسبت سے پیش آیا ہے اس کو وہ محض انسان کا معاملہ سمجھ لے اور عزت و وقار کا خیال اس کو سرکشی پر آمادہ کر دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جانچ کے وقت وہ اللہ کے آگے نہیں جھکا، اس نے اپنے اقرارِ سجدہ کا عملی ثبوت نہیں دیا۔

اسی طرح انسان اور انسان کے درمیان معاملات میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ جائز اور ناجائز کے مسائل سامنے آجاتے ہیں۔ انسان سے معاملہ کرتے ہوئے اس کے لئے ایک رویہ ظلم کا رویہ ہوتا ہے اور دوسرا انصاف کا رویہ۔ ایسے موقع پر آدمی اگر خدا کے منع کئے ہوئے طریقہ سے رک جائے اور اپنے کو صحیح اور منصفانہ رویہ کا پابند بنائے تو اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ روزہ رکھ کر اس نے اطاعت الٰہی کا جو اقرار کیا تھا اس کو اس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا۔ اس نے اپنے اقرارِ روزہ کا عملی ثبوت دے دیا۔ اس کے برعکس اگر معاملہ کے وقت اس پر مفاد اور مصلحت کا خیال غالب آجائے، وہ انصاف کے طریقے کو چھوڑ کر ظلم اور بے راہ روی کا طریقہ اپنا لے تو گویا اس نے خدا کی اطاعت نہیں کی۔ اس نے اپنے اقرارِ روزہ کا عملی ثبوت نہیں دیا۔

بندہ کو اپنے رب کے سامنے جو "سجدہ" کرنا ہے اس کے تین خاص مواقع ہیں۔ ایک موقع وہ ہے جس کو اعتراف حق کہا جا سکتا ہے۔ اللہ اپنے کسی بندے کی زبان سے جب حق کا اعلان کرائے تو لوگوں کے اوپر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس پر لبیک کہیں۔ وہ اپنے رب کی آواز کو پہچانیں اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیں۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو ان کی مثال اس بد قسمت بچہ کی ہوگی جو اپنے مہربان باپ کو دیکھنے کے لئے اندھا ہو جائے اور اس کی آواز کو سننے کے لئے اپنے کان کو بہرا کرے۔ خدا کی آواز اگرچہ ایک انسان کی زبان سے بلند ہوتی ہے مگر وہ ایک ایسی آواز ہوتی ہے جس کی تصدیق سارے زمین و آسمان کر رہے ہوتے ہیں اور آدمی کی اپنی فطرت پوری طرح جس کا ساتھ دے رہی ہوتی ہے۔ ایسی آواز کے آگے نہ جھکنا اتنا بڑا انکار سجدہ ہے جس کے بعد ظاہری سجدوں کی کوئی قیمت نہیں۔ سجدہ کے جانچ کا دوسرا میدان اللہ کی راہ میں قربانی ہے۔ اللہ کو یہ مطلوب ہے کہ وقت کے تمام ذرائع اور وسائل کو استعمال کر کے اس کا دین لوگوں تک پہنچایا جائے۔ دین کی اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہر قسم کا ممکن انتظام کیا جائے۔ کچھ مخالفین اگر خدا کے دین کو دبانا چاہیں تو اللہ کے وفادار بندے کھڑے ہو کر دین کی طرف سے دفاع کریں خواہ اس راہ میں ان کو اپنا سب کچھ لٹا دینا پڑے۔ یہ دین کے لئے قربانی کے مواقع ہیں۔ جو لوگ ان مواقع پر اپنے جان و مال کو پیش کریں وہ جانچ میں پورے اترے اور جو لوگ اپنے جان و مال کو دین کی ضرورتوں میں نہ دیں وہ جانچ میں ناکام ہو گئے۔ "سجدہ" کے امتحان کا تیسرا میدان روزمرہ کے انسانی تعلقات ہیں۔ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان معاملہ کرتے ہوئے جب بھی ایسا ہو کہ دو قسم کا رویہ سامنے آجائے۔ ایک وہ ہو جس کا حکم اللہ نے دیا ہے، دوسرا وہ ہو جو اپنے جی کی خواہش کے مطابق ہے۔ اس وقت جو شخص اللہ کے حکم کے آگے جھک گیا وہ اللہ کے آگے سجدہ کرنے والا بنا اور جو شخص اپنے جی کی خواہش پر چلا اس نے گویا سجدہ سے انکار کر دیا۔

نماز میں رکوع کے لئے جھکنا اور سجدہ کے لئے گر پڑنا اگر حقیقی معنوں میں جھکنا اور گر پڑنا ہو تو مسجد کا سجدہ اور مسجد کے باہر کا سجدہ ایک دوسرے سے الگ نہیں رہتے۔ بلکہ دونوں ایک ہی واقعہ کی دو مختلف صورتیں بن جاتی ہیں۔ اسی طرح روزہ میں خدا کی منع کی ہوئی چیزوں کو چھوڑنا اگر سچے شعور اور جذبہ کے ساتھ ہو تو رمضان کے مہینے میں خدا کی ممنوعات کو چھوڑنا اور اس کے بعد زندگی کے معاملات میں خدا کی ممنوعات کو چھوڑنا دو الگ الگ چیزیں نہیں رہتیں۔ بلکہ ایک ہی تصویر کے دو رخ بن جاتے ہیں۔ جو شخص اس طرح سجدہ کرنے والا اور اس طرح روزہ رکھنے والا بن جائے وہ اللہ کی یاد میں جینے لگتا ہے۔ وہ آخرت کی فضاؤں میں سانس لینے لگتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے اللہ کے داعی کو پہچان کر اس کا اعتراف کر لینا یا اللہ کے دین کے لئے قربانی دینا ایسا ہی بن جاتا ہے جیسے کسی شخص کا اپنے محبوب بیٹے کو پہچاننا اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دینا۔

آخرت کا دن سچائی کے اعتراف کا دن ہے، اس دن وہی لوگ سچائی کے اعتراف کی توفیق پائیں گے جنھوں نے دنیا میں سچائی کے اعتراف کا ثبوت دیا ہو۔ آخرت کا دن مالک کائنات کے آگے جھکنے کا دن ہے، اس دن وہی لوگ مالک کائنات کے آگے جھکنے کے اہل ہوں گے جو دنیا کے معاملات میں اس کے آگے جھکنے والے بنے ہوں۔ آخرت کا دن اللہ کی رحمتوں میں شامل ہونے کا دن ہے۔ اس دن وہی لوگ اللہ کی نعمتوں میں شامل ہوں گے جنھوں نے اس وقت اللہ کی پکار پر لبیک کہا ہو جب کہ اللہ ابھی پردۂ غیب میں ہے۔ آخرت کا دن وہ دن ہے جب کہ اللہ اپنی تمام نعمتیں اپنے بندوں پر انڈیل دے گا، ایسے انعام میں حصہ پانے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے دنیا میں اپنے تمام اثاثہ کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیا ہو۔

اپنے اپنے شیشہ میں دیکھنا

پوڑی گڑھوال ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ ریتا سنہا اپنے شوہر کے ساتھ یہاں رہتی ہیں۔ ان کی نسبتی ماں (ساس) ان کے یہاں آئیں اور ریتا سنہا کے مکان میں اپنے لڑکے اور بہو کے ساتھ رہنے لگیں۔ بوڑھی خاتون کو جانوروں کا شوق تھا۔ ایک روز ان کو پاس کے جنگل میں بلی کے تین بچے مل گئے۔ وہ ان کو اپنی شال میں لپیٹ کر اٹھا لائیں اور ان کو پالنا شروع کیا۔ وہ اکثر ان کو اپنے ساتھ لئے رہتیں۔ کچھ دنوں کے بعد خاتون نے اپنی بہو سے کہا کہ میرے لئے ایک آتشیں شیشہ Magnifying Glass لادو۔ خاتون کی فرمائش کے مطابق ان کو شیشہ فراہم کر دیا گیا۔

بوڑی گڑھوال میں ایک نیشنل پارک ہے جس میں شیر وغیرہ پائے گئے ہیں۔ اس سے پہلے خاتون اکثر پارک میں جانے اور شیر کو دیکھنے کا شوق ظاہر کرتی تھیں۔ مگر بلیاں اور آتشیں شیشہ مل جانے کے بعد ان کا شوق ٹھنڈا پڑ گیا۔ ان کے لڑکے ایک روز دفتر سے کچھ پہلے آ گئے اور بتایا کہ آج میں نے آدھے دن کی چھٹی لے لی ہے۔ آج ماں کو لے کر پارک میں چلنا ہے تاکہ وہ شیر وغیرہ دیکھ سکیں۔ ریتا سنہا خاتون کے کمرہ میں گئیں تاکہ ان کو یہ خوش خبری سنائیں۔ مگر خاتون نے اس خبر سے کوئی دلچسپی نہ لی۔ وہ اس وقت آتشیں شیشہ کے ذریعہ اپنی بلیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا: میرے آتشیں شیشہ میں یہ بلیاں بڑی ہو کر شیر کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ دیکھو۔ سوچ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ میں خوبصورت شیروں کے درمیان ہوں۔ میں کسی پارک یا کسی چڑیا گھر یا نہیں جاتی۔ کیوں کہ وہاں میں شیر کو صرف دور سے دیکھوں گی۔ یہاں میں ان کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ (ٹائمس آف انڈیا ۳۱ دسمبر ۱۹۷۹)

یہ ایک بوڑھی معمولی تعلیم یافتہ خاتون کا قصہ ہے۔ مگر یہی ہمارے اکثر بڑے بڑے پڑھے لکھوں پر صادق آتا ہے۔ آج اکثر لوگوں کا یہ حال ہے کہ انھوں نے اپنی پسند کا ایک "آتشیں شیشہ" خرید رکھا ہے جس میں خارجی حقیقتیں ان کو ویسی ہی دکھائی دیں جیسا کہ وہ ان کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ کوئی بلی کو شیر کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے تو اس نے بڑھا کر دکھانے والا شیشہ حاصل کر لیا ہے۔ کوئی ہاتھی کو چیونٹی کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے تو اس نے ایسا شیشہ حاصل کر لیا ہے جس میں بڑی بڑی چیزیں بھی بہت چھوٹی ہو کر دکھائی دیں۔ حتی کہ لوگوں کو ایسے شیشے بھی ہاتھ آ گئے ہیں جن میں معنوی حقائق کی صورتیں بھی بدل کر دکھائی دیتی ہیں۔ کسی کے شیشہ میں اس کا اپنا وجود ہمالیہ پہاڑ کی مانند بلند اور دوسرے کا وجود راستہ میں پڑے ہوئے پتھر کی طرح بے قیمت دکھائی دیتا ہے۔ کسی کے شیشہ میں اپنی موشگافیاں طاقت ور دلائل کی صورت میں نظر آتی ہیں اور دوسرے کے دلائل محض بے معنی الفاظ کا مجموعہ بن جاتے ہیں۔ کوئی اپنے شیشہ میں اپنے کام کو دیکھتا ہے تو وہ اس کو عالمی سیلاب کی طرح دکھائی دیتا ہے اور جب وہ دوسرے کے کام کو دیکھتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ کسی کے شیشہ میں اس کی اپنی ہر بات صحیح اور دوسرے کی ہر بات غلط نظر آتی ہے۔ ہر آدمی کے "شیشہ" نے اس کے لئے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ چیزیں اس کو ویسی ہی دکھائی دیں جیسا کہ وہ ان کو دیکھنا چاہتا ہے نہ کہ ویسی جیسا کہ وہ حقیقۃً ہیں۔ کوئی چیز باعتبار اصل خواہ کچھ ہو، دیکھنے والے کو وہ اس کی اپنی پسند کے مطابق ہی نظر آتی ہے ——— خوش قسمتی کی یہ قسم بھی کیسی عجیب ہے۔

سچائی عوامی شور میں دب جاتی ہے

ٹورانٹو (کناڈا) میں ایک مکان میں آگ لگ گئی۔ ایک شخص تیسری منزل پر تھا۔ آگ بجھانے والے (فائرمین) آئے۔ انھوں نے پھنسے ہوئے آدمی کو آواز دی کہ تم کھڑکی کے چھجے پر آجاؤ۔ ہم تم کو خصوصی سیڑھی سے اتارنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ مگر فائرمین صرف چند تھے۔ دوسری طرف عمارت کے نیچے کافی مجمع اکٹھا ہوگیا۔ مجمع چلانے لگا "کود و کود و"۔ مجمع کے شور میں فائرمین کی آواز آدمی تک نہ پہنچ سکی۔ اس نے اپنے کمرہ سے چھلانگ لگادی۔ وہ نیچے گرا تو شدید طور پر زخمی ہو چکا تھا۔ اس کو نازک حالت میں اسپتال پہنچایا گیا۔ فائرمین نے کہا: آدمی اگر ۳۰ سکنڈ اور ٹھہرا ہوتا تو ہماری سیڑھی اس تک پہنچ جاتی اور وہ بحفاظت نیچے اتر آتا۔ آدمی کی عمر اکیاون سال تھی اور اس کا نام فرینک کرٹس (Frank Curtis) تھا (ٹائمس آف انڈیا ۵ جنوری ۱۹۹۰)

لوگ بولنا جانتے ہیں۔ مگر زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ لوگ چپ رہنا جانیں۔ وہی گروہ ترقی کرتا ہے جس کے افراد یہ جانتے ہوں کہ ان کو کہاں چپ رہنا چاہئے۔ جب لوگ چپ رہتے ہیں تو دراصل وہ اہل تر کو بولنے کا موقع دیتے ہیں۔ اور جب ہر شخص بولنے لگے تو اس کے بعد یہ ہوگا کہ جو شخص حقیقی معنوں میں بولنے کا اہل ہے وہ بولنے کو بے فائدہ سمجھ کر چپ ہو جائے گا یا اگر بولے گا تو عوامی شور و غل میں اس کی آواز دب کر رہ جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ حال تھا کہ جب آپ صحابہ کو اکٹھا کرتے اور ان کے سامنے مشورہ کے لئے کوئی بات رکھتے تو لوگ غور سے بات کو سن کر چپ ہو جاتے۔ کیوں کہ ہر آدمی اپنا بے لاگ محاسبہ کرنے کی وجہ سے اس بات کو جانتا تھا کہ اس کے درمیان بولنے کا سب سے زیادہ اہل، رسول خدا کے بعد، جو شخص ہے وہ ابوبکرؓ ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مکمل ہو جانے کے بعد سب سے پہلے ابوبکر رضی اللہ عنہ بولتے۔ پھر دوسرے لوگ مختصراً اپنی رائے دیتے اور اس کے بعد ہر آدمی طے شدہ عمل کے لئے تیار ہو جاتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب خلافت راشدہ کا دور شروع ہوا تو اب یہ ہوا کہ خلیفہ اول ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو مشورہ کے لئے جمع کرتے۔ آپ اپنی بات کہہ کر بیٹھ جاتے اور کہتے کہ لوگو اپنی رائے بتاؤ۔ مگر دوبارہ سب لوگ چپ رہتے۔ کیوں کہ یہ وہ لوگ تھے جو اللہ سے ڈرنے والے تھے۔ ان کے ڈر نے ان کو بتا دیا تھا کہ ان کے درمیان بولنے کے سب سے زیادہ اہل عمر بن خطابؓ ہیں۔ چنانچہ خاموشی کے ایک وقفہ کے بعد عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوتے اور اپنی بات کہتے۔ آپ کی بات مکمل ہو جاتی تو دوسرے لوگ مختصراً اپنی رائیں ظاہر کرتے اور پھر اتفاق رائے سے فیصلہ ہو جاتا۔

بعد کے زمانہ میں یہ صورت حال دھیرے دھیرے بدل گئی۔ اب ہر شخص اپنے آپ کو سب سے زیادہ بولنے اور رائے دینے کا اہل سمجھنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملت اسلامی میں ایسا خلفشار پیدا ہوا جو کبھی ختم نہ ہو سکا۔ موجودہ زمانہ میں بھی یہ صورت حال مزید شدت کے ساتھ قائم ہے۔ آج ہر آدمی لکھنے اور بولنے کے لئے بے تاب نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسائل پر رائے دینے کا سب سے زیادہ اہل وہی ہے۔ لوگوں کو اپنا وجود حقیقت سے زیادہ دکھائی دیتا ہے اور دوسرے کا وجود حقیقت سے کم نظر آتا ہے۔ کوئی اپنی نااہلی کو نہیں جانتا۔ البتہ اپنی اہلیت کو جاننے کا ماہر ہر شخص بنا ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ملت کے اختلاف اور کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

جنت اور جہنم

آخرت میں آدمی کو جو بدلہ دیا جائے گا وہ دنیا میں اس کے عمل ہی کا اخروی پہلو ہوگا۔ اس لئے عمل اور بدلہ دونوں ایک دوسرے کے انتہائی مطابق ہوں گے۔ ایک شخص سونا جمع کئے ہوئے ہے اور اللہ کا حصہ اللہ کے راستہ میں نہیں دیتا تو وہ سونا گویا آگ کا انگارہ ہے۔ موت کے بعد یہ سونا آگ کی صورت اختیار کرکے آدمی کے ساتھ چپک جائے گا (توبہ) حدیث میں اس قسم کی بہت سی مثالیں دی گئی ہیں کہ آدمی کا عمل اور اس کے اخروی نتائج کس طرح ایک دوسرے کے مطابق ہوں گے۔

معراج کے سفر سے متعلق جو روایات ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آسمانی سفر میں آپ کو جو چیزیں دکھائی گئیں ان میں وہ عالم مثال بھی تھا جہاں انسان کے دنیوی اعمال اپنی اخروی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ایک طرف آپ کو اچھے اعمال کی اخروی صورتیں دکھائی گئیں۔ مثلاً ایک جگہ آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ کھیتی کاٹ رہے ہیں۔ وہ جتنی کھیتی کاٹتے ہیں اتنی ہی ان کی کھیتی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرشتہ سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ آپ کو بتایا گیا کہ یہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے لوگ ہیں۔ اسی طرح آپ کو تفصیل کے ساتھ برے اعمال کی اخروی صورتیں بھی دکھائی گئیں۔

آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جن کے سر پتھروں سے کچلے جارہے ہیں۔ آپ نے پوچھا یہ کون ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سرگرانی ان کو نماز کے لئے اٹھنے نہ دیتی تھی۔ اسی طرح آپ نے کچھ لوگ دیکھے جن کے کپڑوں میں بہت سے پیوند لگے ہوئے تھے اور وہ جانوروں کی طرح گھاس چر رہے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ کون ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرتے تھے۔ پھر آپ نے ایک شخص کو دیکھا۔ وہ لکڑیوں کا گٹھا جمع کرکے اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ گٹھا اس سے نہیں اٹھتا تو وہ اس میں کچھ اور لکڑیاں بڑھا لیتا ہے۔ آپ نے پوچھا یہ کون ہے۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ شخص ہے جس پر ذمہ داریوں اور امانتوں کا اتنا بوجھ تھا کہ وہ اٹھا نہ سکتا تھا مگر وہ ان کو کم کرنے کے بجائے اور زیادہ ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے اوپر ڈال لیتا تھا۔ پھر آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جن کی زبانیں اور ہونٹ قینچیوں سے کاٹے جارہے ہیں۔ آپ نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ مقرر ہیں جو بے روک ٹوک زبان چلاتے تھے اور غیر ذمہ دارانہ باتیں کہہ کر فتنہ برپا کرتے تھے۔ ایک جگہ آپ نے دیکھا کہ ایک پتھر میں چھوٹا سا سوراخ ہوا اور اس میں سے ایک بڑا سا بیل نکل آیا۔ اس کے بعد وہ بیل دوبارہ اسی سوراخ میں جانے کی کوشش کرنے لگا مگر کوشش کے باوجود وہ دوبارہ اس کے اندر نہ جا سکا۔ آپ نے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ اس آدمی کی مثال ہے جو بے پروائی کے ساتھ ایک فتنہ کی بات کہہ دیتا ہے۔ اس کے بعد اس کے برے نتائج دیکھ کر اس کو واپس لینا چاہتا ہے مگر واپس نہیں لے سکتا۔ اسی طرح ایک جگہ آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جو خود اپنے جسم کا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دوسرے بھائیوں پر طعن وطنز کرتے تھے۔ کچھ اور لوگوں کو آپ نے دیکھا۔ ان کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اس سے اپنے منھ اور سینے نوچ رہے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے پیچھے ان کی برائیاں کرتے تھے اور ان کی عزت وآبرو پر حملے کرتے تھے۔ کچھ لوگوں کو آپ نے دیکھا۔ ان کے ہونٹ اونٹوں سے ملتے جلتے تھے اور وہ آگ کھا رہے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال دنیا میں کھاتے تھے۔ پھر آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جن کے پیٹ بہت بڑے ہیں اور وہ سانپوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ آنے جانے والے ان کو روندتے

ہوئے گزر جاتے ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے۔ آپ نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ سود کھانے والے لوگ ہیں۔ پھر کچھ لوگ دکھائی دئے جن کے ایک جانب اچھا گوشت رکھا ہوا تھا اور دوسری جانب سڑا ہوا گوشت جس سے سخت بدبو آرہی تھی۔ وہ اچھے گوشت کو چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ مرد اور عورتیں ہیں جنھوں نے جائز بیویوں اور شوہروں کو چھوڑ کر حرام سے اپنی خواہش پوری کی

جنت کا معاملہ بھی یہی ہے۔ قرآن میں جنت کو عطاء متشابہ کہا گیا ہے، یعنی ایسا انعام جو آدمی کے عمل سے ملتا جلتا ہو، ارشاد ہوا ہے کہ جنت میں جب کوئی پھل انھیں کھانے کے لئے دیا جائے گا تو اہل جنت کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے ہم کو دنیا میں دئے گئے تھے اور ان کو دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے پھل دئے جائیں گے (بقرہ ۲۵) اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کے انعامات دنیا کے عمل کے عین مطابق و مماثل ہوں گے۔ دنیا میں کسی بندۂ خدا کو جس عمل کی توفیق ملی ہوگی اسی سے ملتا جلتا بدلہ جنت میں اس کے حصہ میں آئے گا۔

دنیا میں آدمی کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ کسی صورت حال میں کس قسم کا جواب دیتا ہے۔ پتھر کے ساتھ کوئی صورت حال پیش آئے تو وہ اس کے جواب میں کوئی رویہ پیش نہیں کرتا۔ مگر انسان ایک احساس اور شعور رکھنے والی مخلوق ہے۔ انسان کے ساتھ جب کوئی صورت حال پیش آتی ہے تو وہ اس کے اندر ہلچل پیدا کرتی ہے۔ وہ اس کے جواب میں اپنے ہاتھ یا زبان سے کوئی ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ اسی میں آدمی کا اصل امتحان ہے۔ ہر ایسے موقع پر خدا یہ دیکھتا ہے کہ آدمی نے اپنے فکر و عمل کی آزادی کو کس رخ پر استعمال کیا۔ اس نے گالی کے جواب میں گالی دی یا گالی کے جواب میں اس کی زبان سے دعائیں نکلیں۔ ہر صورت حال جو دنیا میں آدمی کے ساتھ پیش آتی ہے اس کے جواب کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک جہنمی جواب، دوسرا جنتی جواب۔ جہنمی جواب وہ ہے جو اللہ کی مرضی کے مطابق نہیں ہے اور جنتی جواب وہ ہے جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک جواب وہ ہے جو شیطانی اخلاقیات کے مطابق ہو، ایسے لوگ جہنم کے مستحق قرار پائیں گے۔ دوسرا جواب وہ ہے جو خدائی اخلاقیات کے مطابق ہو، ایسے لوگ جنت کے لطیف ماحول میں بسائے جائیں گے۔

شیطانی اخلاقیات یہ ہے کہ جب کوئی ناخوش گوار صورت حال پیش آئے تو آدمی بے خوف ہو کر حیوانی کارروائی کرنے لگے۔ وہ نفرت کا جواب نفرت سے دے اور غصہ کے مقابلہ میں غصہ کا تحفہ پیش کرے۔ اس کے برعکس خدائی اخلاقیات یہ ہے کہ آدمی اللہ سے ڈرے۔ وہ وقتی جذبات سے اوپر اٹھ کر سوچے اور نفرت اور محبت کی نفسیات سے بلند ہو کر معاملہ کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے میرے رب نے یہ حکم دیا ہے کہ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، جو مجھ کو محروم کرے میں اس کو دوں، جو مجھ پر ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں (وان اصل من قطعنی واعطی من حرمنی واعفو من ظلمنی) اس طرح کے مختلف احکام ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن سے یہ مطلوب ہے کہ وہ لوگوں کے سلوک سے بالاتر ہو کر ان کے ساتھ معاملہ کرے۔ وہ منفی نفسیات کے مواقع پر مثبت نفسیات ظاہر کرے۔ لوگوں کے درمیان زندگی گزارتے ہوئے بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ناخوش گوار واقعات پیش آتے ہیں اور آدمی کے اندر مخالفانہ جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے مواقع پر مومن کو یہ کرنا ہے کہ مخالفانہ جذبات کو اندر ہی اندر دبا لے اور تلخی کے باوجود دوسروں کے ساتھ مثبت جذبات کے ساتھ پیش آئے۔

جنت ایک نہایت لطیف اور پاکیزہ مقام ہے جو اللہ خصوصی اہتمام کے ساتھ اپنے نیک بندوں کے لئے بنائے گا :

عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اهل الجنة یاکلون فیها ویشربون ولا یتفلون ولا یبولون ولا یتغوطون ولا یمتخطون۔ قالوا فما بال الطعام قال جشاء ورشح کرشح المسک یلهمون التسبیح والتحمید کما تلهمون النفس (مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت کے لوگ کھائیں گے اور پئیں گے مگر وہ نہ تھوکیں گے اور نہ پیشاب کریں گے اور نہ پاخانہ کریں گے۔ لوگوں نے پوچھا پھر کھانے کا کیا ہوگا۔ فرمایا: ڈکار اور پسینہ نکلے گا جو مشک کی طرح خوشبودار ہوگا۔ ان کو حمد اور تسبیح اسی طرح الہام کی جائے گی جس طرح تم سانس لیتے ہو۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ایک ایسی دنیا ہے جہاں میل اور کثافت بھی خوشبو کی صورت میں خارج ہوتی ہے۔ پھر ایسی دنیا میں وہ لوگ کیوں کر داخل ہوں گے جو اپنی کثافت کو صرف کثافت کی صورت میں خارج کرنا جانتے ہوں۔ بغض، نفرت، حسد، انتقام اور کبر و ظلم یہ سب انسان کی نفسیات کا میل کچیل ہے۔ جو لوگ اپنے میل کچیل کو صرف میل کچیل کی صورت میں ظاہر کرنا جانتے ہوں وہ جنت میں بسائے جانے کے قابل نہیں۔ جنت خدا کے ان بندوں کی کالونی ہے جو اپنے اندر کے میل کو بھی پاک کی صورت میں خارج کرتے ہیں۔ جنت میں وہ لوگ بسائے جائیں گے جو نفرت کے مواقع پر محبت کریں۔ جو انتقام کے مواقع پر معاف کردیں۔ جو حسد اور بغض کے مواقع پر خیر خواہی کا ثبوت دیں۔ جو کبر کے مواقع پر خاکساری دکھائیں اور ظلم کے مواقع پر انصاف کا رویہ اختیار کریں۔ یہ گویا اپنے میل اور کثافت کو خوشبو کی صورت میں ظاہر کرنا ہے۔ انھیں خصوصیات والے لوگ جنت کی کالونیوں میں بسائے جائیں گے۔

دنیا کو اس ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ یہاں بار بار آدمی کو ناخوش گوار صورت حال سے سابقہ پیش آئے۔ یہ موجودہ دنیا کے دار الامتحان ہونے کا تقاضا ہے۔ ان ناخوش گوار مواقع پر جو شخص مثبت ردعمل کا اظہار کرے گا وہ جنت کا مستحق بنا اور جو منفی جذبات کا شکار ہو جائے اس نے اگلی زندگی میں اپنے لئے جنت کا استحقاق کھو دیا۔ جنت کی فضاؤں میں بسنے کے قابل وہ لوگ ہیں جن کا یہ حال ہو کہ ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے تو وہ مایوس نہ ہوں بلکہ صبر کا طریقہ اختیار کریں۔ کسی سے ان کو تکلیف پہنچے تو اس کے حق میں دعائیں دیں۔ کسی سے معاملہ پڑے تو انصاف کے مطابق اس کے حقوق ادا کریں۔ کوئی تنقید کرے تو اس کو برا مانے بغیر ٹھنڈے دل سے سنیں۔ کسی سے خواہ کتنی ہی شکایت ہو اس کے بارے میں عدل کا رویہ نہ چھوڑیں۔ جب کبھی کسی سے معاملہ پڑے تو دوسرے شخص کو ان سے بہتر سلوک کا تجربہ ہو۔ حتی کہ دوسروں کے ناخوش گوار رویہ سے اپنے سینہ میں اگر نفرت و عداوت کے جذبات پیدا ہوں تب بھی اس کو پی جائیں اور اپنے مخالف کے لئے بھی خیر خواہی اور انصاف کی صورت میں ظاہر کریں۔ وہ دنیا کی زندگی میں خدا کا ایسا پھول بن جائیں جو اپنی کثافت کو بھی خوشبو کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ ایسی پاک زندگی گزارنے کی توفیق ان لوگوں کو ملتی ہے جو اللہ کو اس طرح یاد کرنے لگیں جس طرح کوئی آدمی سانس لیتا ہے۔ وہ اللہ کو اس طرح پالیں کہ وہ ان کی روح کے اندر بس جائے۔ وہ ان کی دل کی دھڑکنوں میں شامل ہو جائے۔ وہ اللہ کے خوف و محبت میں نہا اٹھیں۔

وہ مواقع جب کہ آدمی کے اندر سرکشی کی آگ بھڑکتی ہے اس وقت مومن کو تواضع کے ساتھ جھک جاتا ہے۔ جب نفرت کے جذبات امنڈتے ہیں اس وقت اس کو محبت کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ جب بدخواہی کی نفسیات بھڑکتی ہے اس وقت اس کو خیر خواہی

بت دیتا ہے۔ جب بددعا کے کلمات زبان سے نکلتے ہیں اس وقت اس کو دعا کے کلمات اپنی زبان سے ادا کرتا ہے۔ جب حقوق کو
نے کا خیال آنے لگتا ہے اس وقت حقوق کو پورے انصاف کے ساتھ لوٹاتا ہے۔ جب حق کا اعتراف کرنے میں اپنا وقار گرتا ہوا نظر
ہے اس وقت وقار کا خیال چھوڑ کر حق کا اعتراف کر لیتا ہے۔ جب کسی کے خلاف جوابی کارروائی کا ذہن ابھرتا ہے اس وقت جوابی
روائی سے اپنے کو روک کر مخالف کے ساتھ وہی کرتا ہے جو خیر خواہی اور انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہو۔

اگر آپ ٹرک پر سوار ہوں تو سڑک پر دوڑتا ہوا ٹرک آپ کو زبردست جھٹکے دے گا۔ اس کے برعکس جب آپ ایک اچھی کار پر
ہیں تو تیز دوڑتے ہوئے بھی کار آپ کو جھٹکے نہیں دیتی۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ کار کے پہیہ کے ساتھ اچھی قسم کی اسپرنگ
وئی ہوتی ہے اس کی وجہ سے کار اپنے تمام جھٹکوں کو اپنے پہیہ پر لے لیتی ہے، وہ جھٹکے کو مسافر تک پہنچنے نہیں دیتی۔ اس کے
ں ٹرک کی اسپرنگ بہت معمولی ہوتی ہے اس لئے اس کے جھٹکے مسافر تک پہنچتے رہتے ہیں۔ اللہ سے بے خوف آدمی ٹرک کی مانند ہے
اپنے اندر کے نفسیاتی جھٹکوں کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ ان کو دوسروں کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس اللہ سے
نے والا آدمی کار کی مانند ہوتا ہے، وہ تمام جھٹکوں" کو اپنے اوپر لے لیتا ہے، ان کو دوسرے انسان تک منتقل ہونے نہیں دیتا
کا نام صبر ہے۔ صبر یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے جو ناخوش گواریاں پیش آئیں ان کو آدمی اپنے اندر ہی اندر سہ لے، ان
ثرات دوسروں تک پہنچنے نہ دے۔ ناخوش گواری کے جھٹکوں کو اپنے اوپر لے کر دوسروں کی طرف خوش گواری کو منتقل کرے
وہ صلاحیت ہے جو آدمی کو جنت میں آباد کئے جانے کے قابل بناتی ہے۔ جنت وہ لطیف مقام ہے جہاں کثافت بھی بہ شکل
بو ظاہر ہوگی۔ ایسی لطیف آبادی میں رہنے کا مستحق صرف وہ شخص قرار دیا جائے گا جس نے دنیا کی زندگی میں یہ ثبوت دیا
۔ وہ اپنی نفسیاتی کثافت کو خوش بو کی صورت میں خارج کر سکتا ہے، کثافت کا خوشبو کی صورت میں ظاہر ہونا موجودہ دنیا
نفسیاتی اعتبار سے ہوتا ہے، آخرت میں یہی واقعہ اللہ کے حکم کے تحت مادی صورت میں پیش آئے گا۔

ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ آدمی کے اپنے اعمال ہیں جو آخرت میں اس کو لوٹائے جائیں گے (انما ھی اعمالکم ترد الیکم)
این آدمی کے اخلاقی اعمال آخرت میں مادی نتائج کی صورت اختیار کر لیں گے۔ ہر واقعہ جو دنیا میں پیش آتا ہے اس میں آدمی کے لئے
ے جواب کا امکان رہتا ہے۔ اسی سے فیصلہ ہوتا ہے کہ کون جنتی ہے اور کون جہنمی۔ کوئی حق بات سامنے آتی ہے، اب ایک شخص اس کا
اف کر لیتا ہے اور دوسرا شخص انکار کرتا ہے۔ کوئی معاملہ پڑتا ہے، اس میں ایک شخص انصاف پر قائم رہتا ہے اور دوسرا ظلم پر اتر
ہے۔ کوئی ناموافق صورت حال پیش آتی ہے، اب ایک شخص تواضع کا انداز اختیار کرتا ہے اور دوسرا شخص سرکشی کرنے لگتا ہے۔ کوئی
قضیہ ابھرتا ہے، اب ایک شخص محبت اور خیر خواہی کا ردعمل دیتا ہے اور دوسرا شخص نفرت اور انتقام کا۔ یہ دونوں ایک
سرے سے بالکل مختلف ردعمل ہیں اور یہی آخرت کی زندگی میں آدمی کے انجام کی تشکیل کر رہے ہیں۔ ہمارے اخلاقی اعمال جب
صورت اختیار کر لیں تو انھیں میں سے ایک صورت کا نام جنت ہوتا ہے اور دوسری صورت کا نام جہنم۔

ـ: خلاصہ تقریر بمقام نمباہیڑہ (راجستھان) یکم فروری ۱۹۸۰

تم غریب نہیں، دولت مند ہو

"بابا پیسہ دے"، فقیر نے آواز لگائی۔ سننے والے نے دیکھا تو وہ ہاتھ پاؤں کا درست معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے کہا: تم کو پیسہ کیوں دیا جائے۔ فقیر بولا کہ میں غریب ہوں۔ آدمی نے کہا: نہیں تم غریب نہیں ہو۔ تم بہت دولت مند ہو۔ فقیر نے کہا: بابو جی مذاق نہ کیجئے۔ میرے پاس دولت کہاں۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو بالکل غریب ہوں۔ آدمی نے کہا: اچھا تمھارے پاس جو کچھ ہے مجھے دے دو، میں اس کے بدلے تم کو پچاس ہزار روپے دیتا ہوں۔ فقیر نے اپنی جھولی کندھے سے اتاری اور کہا: میرے پاس تو بس یہی ہے۔ اس کو آپ لے لیجئے۔ آدمی نے کہا: نہیں تمھارے پاس اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ تمھارے پاس دو پاؤں ہیں — ایک پاؤں تم مجھ کو دے دو اور مجھ سے دس ہزار روپے لے لو۔ فقیر نے دینے سے انکار کیا۔ اب آدمی نے کہا: اچھا تمھارے پاس دو ہاتھ ہیں۔ ایک ہاتھ تم مجھ کو دے دو اور مجھ سے ۲۰ ہزار روپے لے لو۔ فقیر نے دوبارہ دینے سے انکار کیا۔ آدمی نے کہا: اچھا تمھارے پاس دو آنکھیں ہیں۔ ایک آنکھ تم مجھ کو دے دو اور مجھ سے ۲۰ ہزار روپے لے لو۔ فقیر نے اب بھی دینے سے انکار کیا۔ آدمی نے کہا: دیکھو تمھارے پاس دو پاؤں، دو ہاتھ اور دو آنکھیں ہیں۔ میں نے صرف ایک ایک کے دام لگائے تو پچاس ہزار روپے ہو گئے۔ اگر دونوں پاؤں، دونوں ہاتھ اور دونوں آنکھوں کا دام لگایا جائے تو ان کی قیمت ایک لاکھ روپے ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو تمھارے پاس جسم ہے جس میں بے شمار چیزیں ہیں اس کی صرف تین چیزوں کا دام بھی کم سے کم ایک لاکھ روپیہ ہے۔ پھر تم غریب کیسے ہو۔ تم تو بہت بڑے دولت مند ہو۔ تم بھیک مانگنا چھوڑ دو اور اپنی اس قیمتی دولت کو استعمال کرو۔ تم سے زیادہ کامیاب دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے بڑی عجیب صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ عام حالات میں اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ البتہ کوئی چیز نہ رہے تو اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسی قیمتی تھی۔ جیمز ٹامس دہلی کا ایک مشین آپریٹر ہے۔ اس کی عمر ۲۴ سال ہے۔ بیماری کی وجہ سے اس کے دونوں گردے خراب ہو گئے۔ اس نے آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کے لئے زندگی کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ کسی شخص سے ایک گردہ بطور عطیہ حاصل کرے۔ گردہ ایک خالص قدرتی پیداوار ہے۔ کسی انسانی کارخانہ میں کھرب ہا کھرب روپیہ خرچ کر کے بھی گردہ بنایا نہیں جا سکتا۔ تاہم یہ قیمتی گردہ اگر کوئی شخص بطور عطیہ دے دے تو ڈاکٹروں کی فیس اور سرجری کے اخراجات چھوڑنے کے بعد بھی جیمز ٹامس کو ۵ ہزار روپے درکار تھے تاکہ یہ گردہ اس کے جسم میں نصب کیا جا سکے (ٹائمس آف انڈیا ۱۰ جنوری ۱۹۸۰) حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے پاس کچھ نہ ہو تب بھی اس کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے۔ یہ جسم اور یہ دماغ جو ہم کو ملا ہوا ہے، یہ تمام قیمتی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ آدمی اگر اپنے جسم و دماغ کی صلاحیتوں کو بھرپور استعمال کرے تو وہ دنیا کی ہر کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ کوئی چیز اس کے لئے ناممکن نہیں۔ اگر آپ کے پاس ہاتھ ہے جس سے آپ پکڑیں اور پاؤں ہے جس سے آپ چلیں۔ آپ کے پاس آنکھ ہے جس سے آپ دیکھیں اور زبان ہے جس سے آپ بولیں تو گویا آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ کیوں کہ ان کے ذریعہ سے دنیا کی تمام چیزیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ کوئی چیز بھی ان کے دائرہ سے باہر نہیں۔

کامیابی کا راز یہاں ہے

یہ مدراس کا واقعہ ہے۔ سمندر کے ساحل پر دو نوجوان نہا رہے تھے۔ دونوں دوست تھے اور تیراکی اچھی جانتے تھے۔ وہ پانی کے اوپر اوپر بھی تیرتے تھے اور ڈبکی لگا کر پانی کے اندر اندر بھی دور تک نکل جاتے تھے۔ دونوں تیرتے ہوئے دور تک چلے گئے۔ اس کے بعد موجوں کا ایک تھپیڑا آیا۔ دونوں اس کی زد میں آ گئے۔ ایک نوجوان زیادہ ماہر تھا "میں موجوں سے لڑکر پار ہو جاؤں گا" اس نے کہا اور موجوں کے مقابلہ میں اپنی تیراکی کا کمال دکھانے لگا۔ مگر موجوں کا زور زیادہ تھا، وہ اپنے طاقت ور بازوؤں کے باوجود ان سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اور ڈوب کر مر گیا۔

دوسرا نوجوان بھی طوفان کی زد میں آیا۔ تھوڑی دیر اس نے اپنے ساتھی کی پیروی کی۔ اس کے بعد اس نے محسوس کر لیا کہ موجوں کی شدت اس سے زیادہ ہے کہ میرے بازو اس کا مقابلہ کرکے نکلنے میں کامیاب ہو سکیں۔ اچانک اس کو ایک بات یاد آئی۔ اس نے سنا تھا کہ موجیں خواہ کتنی ہی شدید ہوں ان کا زور اوپر اوپر رہتا ہے۔ پانی کی نیچے کی سطح پھر بھی ساکن رہتی ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنا طریق عمل بدل دیا۔ اوپر کی موجوں سے لڑنے کے بجائے اس نے نیچے کی طرف ڈبکی لگائی اور پانی کی نچلی سطح پر پہنچ گیا۔ یہاں پانی نسبتاً ٹھہرا ہوا تھا اور اس کے لیے ممکن تھا کہ وہ اپنے تیرنے کے فن کو کامیابی کے ساتھ استعمال کر سکے۔ اس نے ساحل کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ وہ کافی تھک چکا تھا۔ تاہم ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے بالآخر وہ سمندر کے کنارے پہنچ گیا۔ کنارے پہنچتے پہنچتے وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ سمندر کے کنارے چند ملاح اپنی کشتیاں لئے ہوئے موجود تھے۔ انھوں نے فوراً اس کو دیکھ کر اٹھایا اور خشکی پر لے گئے۔ اس کے بعد اس کو اسپتال پہنچایا گیا۔ وہاں چند دن زیر علاج رہ کر وہ اچھا ہو گیا ——— جس نے موجوں سے لڑنے کو تیراکی سمجھا تھا وہ ہلاک ہو گیا اور جس نے موجوں سے کترا کر نکلنے کا طریقہ اختیار کیا وہ کامیاب رہا۔

یہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔ زندگی میں طرح طرح کے طوفان آتے ہیں۔ مگر عقل مندی یہ نہیں ہے کہ جو تھپیڑا سامنے آئے بس آدمی اس سے لڑنا شروع کر دے۔ عقل مندی یہ ہے کہ آدمی جائزہ لے کر دیکھے کہ کامیابی کے ساتھ ساحل تک پہنچنے کا زیادہ قابل عمل راستہ کون سا ہے۔ اور جو راستہ قابل عمل ہو اسی کو اختیار کرے خواہ وہ موجوں کی سطح سے اتر کر نیچے نیچے اپنا راستہ بنانا کیوں نہ ہو۔ یہ قدرت کا انتظام ہے کہ دریاؤں اور سمندروں میں جو تیز و تند موجیں اٹھتی ہیں وہ پانی کے اوپر اوپر رہتی ہیں۔ پانی کے نیچے کی سطح ساکن رہتی ہے۔ چنانچہ بھنور کے وقت مچھلیاں نچلی سطح پر چلی جاتی ہیں۔ یہ قدرت کا سبق ہے۔ اس طرح قدرت ہم کو بتاتی ہے کہ طوفانی موجوں کے وقت ہم کو کیا طریق عمل اختیار کرنا چاہئے۔ زندگی میں کبھی طوفان سے لڑنا بھی پڑتا ہے۔ مگر اکثر اوقات کامیابی کا راز یہ ہوتا ہے کہ آدمی طوفانی سیلاب سے کترا کر نکل جائے۔ وہ طوفان کی زد سے بچتا ہوا اپنا راستہ بنائے۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو اور اللہ سے عافیت مانگو مگر جب سامنا ہو جائے تو جم کر مقابلہ کرو۔ (ایہا الناس لا تتمنوا لقاء العدو واسألوا اللہ العافیۃ فاذا لقیتموھم فاصبروا، متفق علیہ)

اتحاد کی آسان تدبیر

گاؤں کا ایک خاندان ہے۔ باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ چار بھائی اور ان کے بیوی بچوں کو ملا کر ڈیڑھ درجن افراد خاندان میں۔ مگر سب مل کر رہتے ہیں۔ آپس میں جھگڑا نہیں ہوتا۔ ان کا اتحاد و اتفاق ساری بستی میں ضرب المثل بن گیا ہے۔ میری ملاقات ان کے بڑے بھائی سے ہوئی تو میں نے پوچھا: "آپ کے یہاں جھگڑا نہیں ہوتا، یہ بہت اچھی بات ہے۔ مگر اس کا راز کیا ہے" انھوں نے جواب دیا " ایسا نہیں ہے کہ جھگڑا نہیں ہوتا۔ اتنے سب آدمی جس گھر میں ہوں وہاں کچھ نہ کچھ کھٹ پٹ ہونا ضروری ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم لوگ اس کو بڑھنے نہیں دیتے" اس کے بعد وہ اٹھے اور ایک طرف دس قدم چل کر گئے اور کہا "جب جھگڑا ہوتا ہے تو ہم اس طرح اس سے ہٹ کر دور چلے جاتے ہیں" یہ ایک معمولی پڑھا لکھا خاندان ہے۔ مگر انھوں نے زندگی کا ایک راز پا لیا ہے۔ وہ یہ کہ جھگڑا ایک وقتی چیز ہے۔ اگر اس کو کسی طرح ٹال دیا جائے تو وہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اس اصول پہ وہ لوگ شدت سے کاربند ہیں اور اس کے زبردست فوائد ان کو حاصل ہوئے ہیں۔ باپ کے انتقال کے وقت ان کی معاشی حالت بہت خراب تھی۔ مگر اپنے اتحاد و اتفاق کے ذریعہ انھوں نے گاؤں میں مثالی ترقی حاصل کر لی۔ اب انھوں نے اپنے معاملات کے چار شعبے کر دئے ہیں اور چاروں بھائی ایک ایک شعبہ پہ لگے ہوئے ہیں۔ ایک بھائی کھیتی کا ذمہ دار ہے، دوسرا بھائی دکان کا ذمہ دار ہے۔ تیسرا بھائی گھر کے امور کا ذمہ دار ہے، چوتھا بھائی باہر کے امور کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ کاموں کی تقسیم نے ان کے لئے باہمی اختلاف کے مواقع اور بھی کم کر دئے ہیں۔

اسی طرح میری ملاقات ایک بار دو ایسے آدمیوں سے ہوئی جو دو الگ الگ پارٹیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے باوجود دونوں بہت قریبی دوست تھے۔ روزانہ باہم ملتے اور ایک دوسرے کے کام میں شریک رہتے۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگوں میں سیاسی اختلاف کے باوجود اس قدر اتحاد کیسے ہے۔ ان میں سے ایک شخص نے مسکرا کر جواب دیا: "ہم نے اپنے اختلاف کو بازو میں رکھ دیا ہے" ان کی زبان سے یہ جملہ سن کر میں حیران رہ گیا۔ ایک بہت بڑے مسئلہ کا کتنا سادہ حل انھوں نے دریافت کر لیا تھا ہمارے بستر میں ایک کانٹا ہو تو ہم اس کو بستر سے نکال کر "بازو" میں ڈال دیتے ہیں۔ یہی طریقہ اختلاف کے بارے میں کیوں نہ اختیار کیا جائے۔ دو آدمیوں میں کوئی اختلاف ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے درمیان سارے معاملات میں اختلاف ہو گیا۔ اختلاف کے باوجود بہت سے دوسرے امور ہوتے ہیں جن میں دونوں کے درمیان پورا اتفاق ہوتا ہے۔ اس لئے بہترین عقلمندی یہ ہے کہ دو آدمیوں میں جب اختلاف پیدا ہو تو اختلاف کے پہلو کو "بازو" میں رکھ کر اتحاد کے پہلوؤں پر اپنا جوڑ باقی رکھا جائے۔ اسی طرح ایک بار میں ایسے دو آدمیوں سے ملا جو بالکل متضاد سیاسی خیالات رکھتے تھے۔ ایک کا تعلق ایک فرقہ وارانہ جماعت سے تھا اور دوسرے کا تعلق ایک قومی جماعت سے۔ اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے اور بے تکلفی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ نظریاتی اختلاف کے باوجود آپ لوگ اپنے ان تعلقات کو کس طرح نبھاتے ہیں۔ یہ سن کر ان میں سے ایک شخص نے جواب دیا: ہم نے اس بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ ہمارے درمیان اختلاف ہے ——

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ زندہ انسان اختلاف کے اندر بھی اتحاد کے اسباب ڈھونڈ لیتے ہیں۔

جب تم صبح کو اپنے گھر سے نکلے اور مسلمانوں کو جنگ کے مقامات پر متعین کیا اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ جب تم میں سے دو جماعتوں نے ارادہ کیا کہ ہمت ہار دیں اور اللہ ان دونوں جماعتوں کا مددگار تھا۔ اور اللہ ہی پر چاہئے کہ مسلمان بھروسہ کریں۔ اور اللہ تمھاری مدد کر چکا ہے بدر میں جب کہ تم کمزور تھے۔ پس اللہ سے ڈرو تاکہ تم شکر گزار رہو۔ جب تم مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمھارے لئے کافی نہیں کہ تمھارا رب تین ہزار فرشتے اتار کر تمھاری مدد کرے۔ اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو اور دشمن تمھارے اوپر یکدم آپہنچے تو تمھارا رب پانچ ہزار نشان کئے ہوئے فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا۔ اور یہ اللہ نے اس لئے کیا تاکہ تمھارے لئے خوش خبری ہو اور تمھارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں اور مدد صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے جو زبردست ہے، حکمت والا ہے، تاکہ اللہ کافروں کے ایک حصہ کو کاٹ دے یا ان کو ذلیل کر دے کہ وہ ناکام لوٹ جائیں۔ تم کو اس امر میں کوئی دخل نہیں۔ اللہ ان کی توبہ قبول کرے یا ان کو عذاب دے، کیوں کہ وہ ظالم ہیں۔ اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وہ جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے اور اللہ غفور و رحیم ہے ۱۲۱-۲۹

یہ آیتیں جنگ احد (۳ھ) کے بعد نازل ہوئیں۔ احد کی جنگ میں دشمنوں کی تعداد تین ہزار تھی۔ مسلمانوں کی طرف سے ایک ہزار آدمی مقابلہ کے لئے نکلے تھے۔ مگر راستہ میں عبد اللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر الگ ہو گیا۔ اس واقعہ سے کچھ انصاری مسلمانوں میں پست ہمتی پیدا ہوئی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یاد دلایا کہ ہم اپنے بھروسہ پر نہیں بلکہ اللہ کے بھروسہ پر چلے ہیں تو اللہ نے اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ان مسلمانوں کے سینے کھول دئے۔ مومن کے اندر اگر حالات کی شدت سے ذہنی کمزوری پیدا ہو جائے تو ایسے وقت میں اللہ اس کو تنہا چھوڑ نہیں دیتا بلکہ اس کا مددگار بن کر دوبارہ اس کو ایمان کی حالت پر جما دیتا ہے۔ اللہ کی یہی مدد اجتماعی سطح پر اس طرح ہوئی کہ احد کی لڑائی میں مسلمانوں کی ایک کمزوری سے فائدہ اٹھا کر دشمن ان کے اوپر غالب آ گئے۔ اب دشمن فوج کے لئے پورا موقع تھا کہ وہ شکست کے بعد مسلمانوں کی طاقت کو پوری طرح کچل ڈالے۔ مگر فوجی تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ دشمن فوج فتح کے باوجود میدان جنگ کو چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ یہ اللہ کی خصوصی مدد تھی کہ اس نے دشمن کے رخ کو "مدینہ" کے بجائے "مکہ" کی طرف موڑ دیا۔ حتی کہ جو مغلوب تھے انھیں نے غالب آنے والوں کا پیچھا کیا۔

مومن کا مزاج یہ ہونا چاہئے کہ وہ تعداد یا اسباب کی کمی سے نہ گھبرائے۔ تعداد کم ہو تو یقین کرے کہ اللہ اپنے فرشتوں کو بھیج کر تعداد کی کمی پوری کر دے گا۔ سامان کم ہو تو وہ بھروسہ رکھے کہ اللہ اپنی طرف سے ایسی صورتیں پیدا کرے گا جو اس کے لئے سامان کی کمی کی تلافی بن جائے۔ کامیابی کا دار و مدار مادی اسباب پر نہیں بلکہ صبر اور تقویٰ پر ہے۔ جو لوگ اللہ سے ڈریں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں ان کے حق میں اللہ کی مدد کی دو صورتیں ہیں۔ ایک، ان کے مخالفین کے ایک حصہ کو کاٹ دینا۔ دوسرے، مخالفین کو شکست دے کر انھیں مغلوب کرنا۔ پہلی کامیابی دعوت کی راہ سے آتی ہے۔ فریق مخالف کے جن افراد میں اللہ کچھ زندگی پاتا ہے ان کے اوپر دین کی حقانیت کو روشن کر دیتا ہے، وہ باطل کی صف کو چھوڑ کر حق کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں اور اس طرح فریق مخالف کی کمزوری اور اہل ایمان کی قوت کا باعث بنتے ہیں۔ دوسری صورت میں اللہ اہل ایمان کو قوت اور حوصلہ دیتا ہے اور ان کی خصوصی مدد کر کے ان کو فریق مخالف پر غالب کر دیتا ہے۔

اے ایمان والو سود کئی کئی حصہ بڑھا کر نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ اور ڈرو اس آگ سے جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اور دوڑو اپنے رب کی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین جیسی ہے۔ وہ تیار کی گئی ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے۔ جو لوگ کہ خرچ کرتے ہیں فراغت میں اور تنگی میں۔ وہ غصہ کو پی جانے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اور ایسے لوگ کہ جب وہ کوئی کھلی برائی کر بیٹھیں یا اپنی جان پر کوئی ظلم کر ڈالیں تو وہ اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔ اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو معاف کرے اور وہ جانتے بوجھتے اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے اور ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے کام کرنے والوں کا۔ تم سے پہلے بہت سی مثالیں گزر چکی ہیں تو زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ کیا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا۔ یہ بیان ہے لوگوں کے لئے اور ہدایت و نصیحت ہے ڈرنے والوں کے لئے　۱۳۰-۳۸

سودی کاروبار زرپرستی کی آخری بدترین شکل ہے۔ جو شخص زرپرستی میں مبتلا ہو وہ رات دن اسی فکر میں رہتا ہے کہ کس طرح اس کا مال دونا اور چوگنا ہو۔ وہ دنیا کا مال حاصل کرنے کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ حالاں کہ صحیح بات یہ ہے کہ آدمی آخرت کی جنت کی طرف دوڑے اور اللہ کی رحمت و نصرت کا زیادہ سے زیادہ حریص ہو۔ آدمی اپنا مال اس لئے بڑھانا چاہتا ہے کہ دنیا میں اس کو عزت حاصل ہو، دنیا میں اس کے لئے شان دار زندگی کی ضمانت ہو جائے۔ مگر موجودہ دنیا کی عزت و کامیابی کی کوئی حقیقت نہیں۔ اصل اہمیت کی چیز جنت ہے جس کی خوشیاں اور لذتیں بے حساب ہیں۔ عقلمند وہ ہے جو اس جنت کی طرف دوڑے۔ جنت کی طرف دوڑنا یہ ہے کہ آدمی اپنے مال کو زیادہ سے زیادہ اللہ کی راہ میں دے۔ دنیوی کامیابی کا ذریعہ مال کو "بڑھانا" ہے اور اخروی کامیابی کو حاصل کرنے کا ذریعہ مال کو "گھٹانا" ــــ پہلی قسم کے لوگوں کا سرمایہ اگر مال کی محبت ہے تو دوسرے لوگوں کا سرمایہ اللہ اور رسول کی محبت۔ پہلی قسم کے لوگوں کو اگر دنیا کے نفع کا شوق ہوتا ہے تو دوسری قسم کے لوگوں کو آخرت کے نفع کا۔ پہلی قسم کے لوگوں کو دنیا کے نقصان کا ڈر لگا رہتا ہے اور دوسری قسم کے لوگوں کو آخرت کے نقصان کا۔

جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں ان کے اندر "احسان" کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی جو کام کریں اس طرح کریں کہ وہ اللہ کی نظر میں زیادہ سے زیادہ پسندیدہ قرار پائے۔ وہ آزاد زندگی کے بجائے پابند زندگی گزارتے ہیں۔ خدا کے دین کی ضرورت کو وہ اپنی ضرورت بنا لیتے ہیں اور اس کے لئے ہر حال میں خرچ کرتے ہیں خواہ ان کے پاس کم ہو یا زیادہ۔ ان کو جب کسی پر غصہ آجائے تو وہ اس کو اندر ہی اندر برداشت کر لیتے ہیں۔ کسی سے شکایت ہو تو اس سے بدلہ لینے کے بجائے اس کو معاف کر دیتے ہیں۔ غلطیاں ان سے بھی ہوتی ہیں مگر وہ وقتی ہوتی ہیں۔ غلطی کے بعد وہ فوراً چونک پڑتے ہیں اور دوبارہ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ وہ بیتاب ہو کر اللہ کو پکارنے لگتے ہیں کہ وہ ان کو معاف کر دے اور ان پر اپنی رحمتوں کا پردہ ڈال دے۔ قرآن میں جو بات عقلی طور پر بتائی گئی ہے وہ تاریخ میں عمل کی زبان میں موجود ہے۔ مگر نصیحت وہی پکڑتے ہیں جو نصیحت کی طلب رکھتے ہوں۔

اور ہمت نہ ہارو اور غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ اگر تم کو کوئی زخم پہنچے تو دشمن کو بھی زخم پہنچا ہے۔ اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہید بنائے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو چھانٹ لے اور انکار کرنے والوں کو مٹا دے۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ حالاں کہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جانا نہیں جنھوں نے جہاد کیا اور نہ ان کو جو ثابت قدم رہنے والے ہیں۔ اور تم موت کی تمنا کر رہے تھے اس سے ملنے سے پہلے، سو اب تم نے اس کو کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا ۱۳۹ ـ ۴۳

ایمان لانا گویا اللہ کے لئے جینے اور اللہ کے لئے مرنے کا اقرار کرنا ہے۔ جو لوگ اس طرح مومن بنیں ان کے لئے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو دنیا میں غلبہ اور آخرت میں جنت دے گا اور ان کو یہ اہم ترین اعزاز عطا کرے گا کہ جن لوگوں نے دنیا میں ان کو رد کر دیا تھا ان کے اوپر ان کو اپنی عدالت میں گواہ بنائے اور ان کی گواہی کی بنیاد پر ان کے مستقل انجام کا فیصلہ کرے۔ مگر یہ مقام محض لفظی اقرار سے نہیں مل جاتا اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی صبر اور جہاد کی سطح پر اپنے سچے ہونے کا ثبوت دے۔ مومن خواہ اپنی ذاتی زندگی کو ایمان و اسلام پر قائم کرے یا وہ دوسروں کے سامنے خدا کے دین کا گواہ بن کر کھڑا ہو، ہر حال میں اس کو دوسروں کی طرف سے مشکلات اور رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ ان مشکلات اور رکاوٹوں کا مقابلہ کرنا جہاد ہے اور ہر حال میں اپنے اقرار پر جمے رہنے کا نام صبر۔ جو لوگ اس جہاد اور صبر کا ثبوت دیں وہی وہ لوگ ہیں جو جنت کی آبادکاری کے قابل ٹھہرے۔ نیز اسی سے دنیا کی سربلندی کا راستہ کھلتا ہے۔ "جہاد" ان کے مسلسل اور مکمل عمل کی ضمانت ہے اور "صبر" اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ کبھی کوئی جذباتی اقدام نہیں کریں گے۔ اور یہ دو باتیں جس گروہ میں پیدا ہو جائیں اس کے لئے خدا کی اس دنیا میں کامیابی اتنی ہی یقینی ہو جاتی ہے جتنی موافق زمین میں ایک بیج کا بارآور ہونا۔

ایک شخص اللہ کے راستہ پر چلنے کا ارادہ کرتا ہے تو دوسروں کی طرف سے طرح طرح کے مسائل پیش آتے ہیں۔ یہ مسائل کبھی اس کو بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا کرتے ہیں۔ کبھی مصلحت پرستی کا سبق دیتے ہیں۔ کبھی اس کے اندر منفی نفسیات ابھارتے ہیں۔ کبھی خدا کے خالص دین کے مقابلہ میں ایسے عوامی دین کا نسخہ بتاتے ہیں جو لوگوں کے لئے قابل قبول ہو۔ یہی موجودہ دنیا میں آدمی کا امتحان ہے۔ ان مواقع پر آدمی جو ردعمل ظاہر کرے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اقرار ایمان میں سچا تھا یا جھوٹا۔ اگر اس کا عمل اس کے دعوی ایمان کے مطابق ہو تو وہ سچا ہے اور اگر اس کے خلاف ہو تو جھوٹا۔ شہید (اللہ کا گواہ) بننا اس سفر کی آخری انتہا ہے۔ اللہ کا ایک بندہ لوگوں کے درمیان حق کا داعی بن کر کھڑا ہوا۔ اس کا حال یہ تھا کہ وہ جس چیز کی طرف بلا رہا تھا، خود اس پر پوری طرح قائم تھا۔ لوگوں نے اس کو حقیر سمجھا مگر اس نے کسی کی پروا نہ کی۔ اس پر مشکلات آئیں مگر وہ اس کو اپنے مقام سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ وہ نہ کمزور پڑا اور نہ منفی نفسیات کا شکار ہوا۔ حتیٰ کہ اس کے جان و مال کی بازی لگ گئی پھر بھی وہ اپنے دعوتی موقف سے نہ ہٹا۔ یہ امتحان حد درجہ طوفانی امتحان ہے۔ مگر اس سے گزرنے کے بعد ہی وہ انسان بنتا ہے جس کو اللہ اپنے بندوں کے اوپر اپنا گواہ قرار دے۔ آدمی جب ہر قسم کے حالات کے باوجود اپنے دعوتی عمل پر قائم رہتا ہے تو وہ اپنے پیغام کے حق میں اپنے یقین کا ثبوت دیتا ہے۔ نیز یہ کہ وہ جس بات کی خبر دے رہا ہے وہ ایک حد درجہ سنجیدہ معاملہ ہے نہ کہ کوئی سرسری معاملہ۔

محمد بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دئے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ اور جو شخص پھر جائے وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ شکرگزاروں کو بدلہ دے گا۔ اور کوئی جان مر نہیں سکتی بغیر اللہ کے حکم کے۔ اللہ کا لکھا ہوا وعدہ ہے۔ اور جو شخص دنیا کا فائدہ چاہتا ہے اس کو ہم دنیا میں سے دے دیتے ہیں اور جو آخرت کا فائدہ چاہتا ہے اس کو ہم آخرت میں سے دے دیتے ہیں۔ اور شکر کرنے والوں کو ہم ان کا بدلہ ضرور عطا کریں گے۔ اور کتنے نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے نہ وہ پست ہمت ہوئے نہ انھوں نے کمزوری دکھائی۔ اور نہ وہ دبے۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ان کی زبان سے اس کے سوا کچھ اور نہ نکلا کہ اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمارے کام میں ہم سے جو زیادتی ہوئی اس کو معاف فرما اور ہم کو ثابت قدم رکھ اور منکر قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔ پس اللہ نے ان کو دنیا کا بدلہ بھی دیا اور آخرت کا اچھا بدلہ بھی۔ اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۱۴۴ ـ ۴۸

احد کی جنگ میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے۔ اس وقت کچھ مسلمانوں میں پست ہمتی پیدا ہو گئی۔ مگر اللہ کے حقیقی بندے وہ ہیں جن کی دینداری کسی شخصیت کے اوپر قائم نہ ہو۔ اللہ کو وہ دین داری مطلوب ہے جب کہ بندہ اپنی ساری روح اور ساری جان کے ساتھ صرف ایک اللہ کے ساتھ جڑ جائے۔ مومن وہ ہے جو اسلام کو اس کی اصولی صداقت کی بنا پر پکڑے نہ کہ کسی شخصیت کے سہارے کی بنا پر۔ جو شخص اس طرح اسلام کو پاتا ہے اس کے لئے اسلام ایک ایسی نعمت بن جاتا ہے جس کے لئے اس کی روح کے اندر شکر کا دریا موجزن ہو جائے۔ وہ دنیا کے بجائے آخرت کو سب کچھ سمجھنے لگتا ہے۔ زندگی اس کے لئے ایک ایسی ناپائدار چیز بن جاتی ہے جو کسی بھی لمحہ موت سے دوچار ہونے والی ہو۔ وہ کائنات کو ایک ایسے خدائی کارخانہ کی حیثیت سے دیکھ لیتا ہے جہاں ہر واقعہ خدا کے اذن کے تحت ہو رہا ہے۔ جہاں دینے والا بھی وہی ہے اور چھیننے والا بھی وہی۔ ایسے ہی لوگ اللہ کی راہ کے سچے مسافر ہیں۔ اللہ اگر چاہتا ہے تو دنیا کا عزت و اقتدار بھی ان کو دے دیتا ہے اور آخرت کے عظیم اور ابدی انعامات تو صرف انھیں کے لئے ہیں۔ تاہم یہ درجہ کسی کو صرف اس وقت ملتا ہے جب کہ وہ ہر قسم کے امتحان میں پورا اترے۔ اس کے ظاہری سہارے کھوئے جائیں تب بھی وہ اللہ پر اپنی نظریں جمائے رہے۔ جان کا خطرہ بھی اس کو پست ہمت نہ کر سکے۔ دنیا برباد ہو رہی ہو تب بھی وہ پیچھے نہ ہٹے۔ اس کے سامنے کوئی نقصان آئے تو اس کو وہ اپنی کوتاہی کا نتیجہ سمجھ کر اللہ سے معافی مانگے۔ کوئی فائدہ ملے تو اس کو خدا کا انعام سمجھ کر شکر ادا کرے۔ مومن کا یہ امتحان جو ہر روز لیا جا رہا ہے کبھی ان ہلا دینے والے مقامات تک بھی پہنچ جاتا ہے جہاں زندگی کی بازی لگی ہوئی ہو۔ ایسے مواقع پر بھی جب آدمی بزدلی نہ دکھائے، نہ وہ بے یقینی میں مبتلا ہو اور نہ کسی حال میں دین کے دشمنوں کے سامنے ہار ماننے کے لئے تیار ہو تو گویا وہ امتحان کی آخری جانچ میں بھی پورا اترا۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے ہر قسم کی سرفرازیاں ہیں۔ تاریخ میں وہی لوگ سب سے زیادہ قیمتی ہیں جنھوں نے اس طرح اللہ کو پایا ہو اور اپنے آپ کو اس طرح اللہ کے منصوبہ میں شامل کر دیا ہو ——— نازک مواقع پر اہل ایمان کا باہم متحد رہنا اور صبر کے ساتھ حق پر جمے رہنا وہ چیزیں ہیں جو اہل ایمان کو اللہ کی نصرت کا مستحق بناتی ہیں۔

اے ایمان والو اگر تم منکروں کی بات مانو گے تو وہ تم کو الٹے پاؤں پھیر دیں گے پھر تم ناکام ہو کر رہ جاؤ گے۔ بلکہ اللہ تمھارا مددگار ہے اور وہ سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے۔ ہم منکروں کے دلوں میں تمھارا رعب ڈال دیں گے کیوں کہ انھوں نے ایسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرایا جس کے حق میں اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے ظالموں کے لئے۔ اور اللہ نے تم سے اپنے وعدہ کو سچا کر دکھایا جب کہ تم ان کو اللہ کے حکم سے قتل کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب تم خود کمزور پڑ گئے اور تم نے کام میں جھگڑا کیا اور تم کہنے پر نہ چلے جب کہ اللہ نے تم کو وہ چیز دکھا دی تھی جو کہ تم چاہتے تھے۔ تم میں سے بعض دنیا چاہتے تھے اور تم میں سے بعض آخرت چاہتے تھے۔ پھر اللہ نے تمھارا رخ ان سے پھیر دیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے اور اللہ نے تم کو معاف کر دیا اور اللہ ایمان والوں کے حق میں بڑا فضل والا ہے۔ جب تم چڑھے جا رہے تھے اور مڑ کر بھی کسی کو نہ دیکھتے تھے اور رسول تم کو تمھارے پیچھے سے پکار رہا تھا۔ پھر اللہ نے تم کو غم پر غم دیا تاکہ تم رنجیدہ نہ ہو اس چیز پر جو تمھارے ہاتھ سے چوک گئی اور نہ اس مصیبت پر جو تم پر پڑے۔ اور اللہ خبردار ہے جو کچھ تم کرتے ہو ۱۴۹ - ۵۳

جنگ احد میں وقتی شکست سے مخالفوں کو موقع ملا۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کا معاملہ کوئی خدائی معاملہ نہیں ہے۔ کچھ لوگ محض طفلانہ جوش کے تحت اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور اپنے جوش کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اگر یہ خدائی معاملہ ہوتا تو ان کو اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں شکست کیوں ہوتی۔ مگر اس طرح کے واقعات خواہ بظاہر مسلمانوں کی غلطی سے پیش آئیں، وہ ہر حال میں خدا کا امتحان ہوتے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں "احد" کا حادثہ پیش آنا ضروری ہے تاکہ یہ کھل جائے کہ کون اللہ پر اعتماد کرنے والا تھا اور کون پھسل جانے والا۔ اس قسم کے واقعات مومن کے لئے دو طرفہ آزمائش ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ لوگوں کی مخالفانہ باتوں سے متاثر نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ وقتی تکلیف سے گھبرا نہ جائے۔ اور ہر حال میں ثابت قدم رہے۔

مشکل مواقع پر اہل ایمان اگر جمے رہ جائیں تو بہت جلد ایسا ہوتا ہے کہ خدائی نصرتِ رعب نازل ہوتی ہے۔ جو شخص یا گروہ اللہ کے سچے دین کے سوا کسی اور چیز کے اوپر کھڑا ہوا ہے وہ حقیقۃً بے بنیاد زمین پر کھڑا ہوا ہے۔ کیوں کہ اللہ کی اتاری ہوئی سچائی کے سوا اس دنیا میں کوئی اور حقیقی بنیاد نہیں۔ اس لئے جب کوئی دین خداوندی کے اوپر کھڑا ہو اور جماؤ کا ثبوت دے تو جلد ہی ایسا ہوتا ہے کہ اہل باطل کی صفوں میں انتشار شروع ہو جاتا ہے۔ دلائل کے اعتبار سے ان کا بے بنیاد ہونا ان کے افراد میں بے یقینی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ اپنے کو کم اور اہل ایمان کو زیادہ دیکھنے لگتے ہیں۔ ان کی ذہنی شکست بالآخر عملی شکست تک پہنچتی ہے۔ وہ اہل حق کے مقابلہ میں ناکام و نامراد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے شکست اور کمزوری کا سبب ہمیشہ ایک ہوتا ہے۔ اور وہ ہے تنازع فی الامر یعنی رایوں کے اختلاف کی بنا پر الگ الگ ہو جانا۔ انسانوں کے درمیان اتفاق کبھی اس معنی میں نہیں ہو سکتا کہ سب کی رائیں بالکل ایک ہو جائیں۔ اس لئے کسی گروہ میں اتحاد کی صورت صرف یہ ہے کہ رایوں میں اختلاف کے باوجود عمل میں اختلاف نہ کیا جائے۔ جب تک کسی گروہ میں یہ بلند نظری پائی جائے گی وہ متحد اور نتیجۃً طاقت ور رہے گی۔ اور جب رایوں کا اختلاف کر کے لوگ الگ الگ ہونے لگیں تو اس کے بعد لازماً کمزوری اور اس کے نتیجہ میں شکست واقع ہوگی۔

پھر اللہ نے تمھارے اوپر غم کے بعد اطمینان اتارا یعنی اونگھ کہ اس کا تم میں سے ایک جماعت پر غلبہ ہو رہا تھا اور ایک جماعت وہ تھی کہ اس کو اپنی جانوں کی فکر پڑی ہوئی تھی ۔ وہ اللہ کے بارے میں خلافِ حقیقت خیالات، جاہلیت کے خیالات قائم کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کیا ہمارا بھی کچھ اختیار ہے۔ کہو سارا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے ۔ وہ اپنے دلوں میں ایسی بات چھپائے ہوئے ہیں جو تم پر ظاہر نہیں کرتے ۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس معاملہ میں کچھ ہمارا بھی دخل ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے ۔ کہو اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تب بھی جن کا قتل ہونا لکھ گیا تھا وہ اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل پڑتے ۔ یہ اس لئے ہوا کہ اللہ کو آزمانا تھا جو کچھ تمھارے سینوں میں ہے اور نکھارنا تھا جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے ۔ اور اللہ جانتا ہے سینوں والی بات کو۔ تم میں سے جو لوگ پھر گئے تھے اس دن کہ دونوں گروہوں میں مڈبھیڑ ہوئی ان کو شیطان نے ان کے بعض اعمال کے سبب سے پھسلا دیا تھا۔ اللہ نے ان کو معاف کر دیا ۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۵۵ ــ ۱۵۴

زندگی کے معرکہ میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ آدمی کا چین اس سے رخصت نہ ہو۔ وہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنا منصوبہ بنانے کے قابل رہے ۔ اللہ پر بھروسہ کی وجہ سے اہل ایمان کو یہ چیز کمال درجہ میں حاصل ہوتی ہے حتی کہ ہلا دینے والے مواقع پر جب کہ لوگوں کی نیندیں اڑ جاتی ہیں ۔ اس وقت بھی وہ اس قابل رہتے ہیں کہ ایک نیند لے کر دوبارہ تازہ دم ہو سکیں ۔ احد کے موقع پر اس کا ایک مظاہرہ اس طرح ہوا کہ شکست کے بعد سخت ترین حالات کے باوجود وہ سو سکے اور اگلے دن حمراء الاسد تک دشمن کا پیچھا کیا جو مدینہ سے ۸ میل کے فاصلہ پر ہے ۔ اس کے نتیجہ میں فاتح دشمن مرعوب ہو کر مکہ واپس چلا گیا۔ یہ سچے اہل ایمان کا حال ہے ۔ مگر جو لوگ پورے معنوں میں اللہ کو اپنا دلی دستگیر ہ بنائے ہوئے نہ ہوں ۔ ان کو ہر طرف بس اپنی جان کا خطرہ نظر آتا ہے۔ دین کی فکر سے خالی لوگ اپنی ذات کی فکر میں پڑے رہتے ہیں وہ اللہ کی نصرتِ اطمینان میں سے اپنا حصہ نہیں پاتے ۔

احد کے موقع پر عبد اللہ بن ابی کی رائے تھی کہ مدینہ میں رہ کر جنگ کی جائے ۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخلص مسلمانوں کے مشورہ پر باہر نکلے اور احد پہاڑ کے دامن میں مقابلہ کیا ۔ درہ پر متعین دستہ کی غلطی سے جب شکست ہوئی تو ان لوگوں کو موقع ملا ۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ اگر ہماری بات مانی گئی ہوتی اور مدینہ میں رہ کر لڑتے تو اس بربادی کی نوبت نہ آتی ۔ مگر موت خدا کی طرف سے ہے اور وہیں آکر رہتی ہے جہاں وہ کسی کے لئے لکھی ہوئی ہے ۔ احتیاطی تدبیر لوگوں کو موت سے بچا نہیں سکتیں ۔ اس طرح کے واقعات، خواہ بظاہر ان کا جو سبب بھی نظر آئے، وہ اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں ۔ تاکہ اللہ کے سچے بندے اللہ کی طرف رجوع کر کے مزید رحمتوں کے مستحق بنیں ۔ اور جو سچے نہیں ہیں ان کی حقیقت بھی کھل کر سامنے آجائے ۔

احد کے درہ پر جو پچاس تیر انداز متعین تھے جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کو فتح ہو گئی ہے تو ان میں سے کچھ لوگوں نے اصرار کیا کہ چل کر مال غنیمت لوٹیں ۔ مگر عبد اللہ بن جبیر اور ان کے کچھ ساتھیوں نے کہا نہیں ۔ ہم کو ہر حال میں یہیں رہنا ہے کیونکہ یہی رسول اللہ کا حکم ہے ۔ بالآخر لوگ ان کو چھوڑ کر بقیہ لوٹ پڑے گئے ۔ باہمی اختلاف کی اس کمزوری سے شیطان نے اندر داخل ہونے کا راستہ پا لیا ۔ تاہم انھوں نے جب اپنی غلطی کا اعتراف کیا تو اللہ نے ان کو معاف کر دیا اور ابتدائی نقصان کے بعد ان کی مدد اس طرح کی کہ دشمنوں کے دل میں رعب ڈال کر ان کو واپس کر دیا ۔ حالاں کہ اس وقت وہ مدینہ سے صرف چند میل کے فاصلہ پر رہ گئے تھے ۔

اے ایمان والو تم ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنھوں نے انکار کیا۔ وہ اپنے بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں، جب کہ وہ سفر یا جہاد میں نکلتے ہیں اور ان کو موت آجاتی ہے، کہ اگر وہ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے۔ تاکہ اللہ اس کو ان کے دلوں میں سبب حسرت بنا دے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی مغفرت اور رحمت اس سے بہتر ہے جس کو وہ جمع کر رہے ہیں۔ اور تم مر گئے یا مارے گئے بہرحال تم اللہ ہی کے پاس جمع کئے جاؤ گے۔ یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان کے لئے نرم ہو۔ اگر تم تندخو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمھارے پاس سے بھاگ جاتے۔ پس ان کو معاف کر دو اور ان کے لئے مغفرت مانگو اور معاملات میں ان سے مشورہ لو۔ پھر جب فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ بے شک اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو اس پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اگر اللہ تمھارا ساتھ دے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ تمھارا ساتھ چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمھاری مدد کرے۔ اور اللہ ہی کے اوپر بھروسہ کرنا چاہئے ایمان والوں کو ۱۵۶-۶۰

اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ تاہم یہاں ہر چیز پر اسباب کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ واقعات بظاہر اسباب کے تحت ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر حقیقۃً وہ اللہ کے حکم کے تحت ہو رہے ہیں۔ آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ ظاہری اسباب میں نہ اٹکے بلکہ ان کے پیچھے کام کرنے والی قدرتِ خداوندی کو دیکھ لے۔ غیر مومن وہ ہے جو اسباب میں کھو جائے اور مومن وہ ہے جو اسباب سے گزر کر اصل حقیقت کو پا لے۔ ایک شخص مومن ہونے کا مدعی ہو مگر اس کے ساتھ اس کا حال یہ ہو کہ زندگی، موت اور کامیابی، ناکامی کو وہ تدبیروں کا نتیجہ سمجھتا ہو تو اس کا ایمانی دعویٰ معتبر نہیں۔ غیر مومن کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے تو وہ اس غم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ میں نے فلاں تدبیر کی ہوتی تو میں حادثہ سے بچ جاتا۔ مگر مومن کے ساتھ جب کوئی حادثہ گزرتا ہے تو وہ یہ سوچ کر مطمئن رہتا ہے کہ اللہ کی مرضی یہی تھی۔ جو لوگ دنیوی اسباب کو اہمیت دیں وہ اپنی پوری زندگی دنیا کی چیزوں کو فراہم کرنے میں لگا دیتے ہیں۔ "مرنے" سے زیادہ "جینا" ان کو عزیز ہو جاتا ہے۔ مگر پانے کی اصل چیز وہ ہے جو آخرت میں ہے۔ یعنی اللہ کی جنت و مغفرت۔ اور جنت وہ چیز ہے جس کو صرف زندگی ہی کی قیمت پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ آدمی کا وجود ہی جنت کی واحد قیمت ہے۔ آدمی اگر اپنے وجود کو نہ دے تو وہ کسی اور چیز کے ذریعہ جنت حاصل نہیں کر سکتا۔

اہل ایمان کے ساتھ جس اجتماعی سلوک کا حکم پیغمبر کو دیا گیا ہے وہی عام مسلم سربراہ کے لئے بھی ہے۔ مسلم سربراہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ نرم دل اور نرم گفتار ہو۔ یہ نرمی صرف روزمرہ کی عام زندگی ہی میں مطلوب نہیں ہے بلکہ ایسے غیر معمولی مواقع پر بھی مطلوب ہے جب کہ اسلام اور غیر اسلام کے تصادم کے وقت لوگوں سے ایک حکم کی نافرمانی ہو اور نتیجہ میں جیتی ہوئی جنگ ہار میں بدل جائے۔ سربراہ کے اندر جب تک یہ وسعت اور بلندی نہ ہو طاقت ور اجتماعیت قائم نہیں ہو سکتی۔ غلطی خواہ کتنی ہی بڑی ہو، اگر وہ صرف ایک غلطی ہے۔ شرپسندی نہیں ہے تو وہ قابل معافی ہے۔ سربراہ کو چاہئے کہ وہ ایسے خلیق کے ساتھ وہ لوگوں سے معاملہ کرے۔ حتیٰ کہ وہ لوگوں کا اتنا خیر خواہ ہو کہ ان کے حق میں اس کے دل سے دعائیں نکلنے لگیں۔ اس کی نظر میں لوگوں کی اتنی قدر ہو کہ معاملات میں وہ ان سے مشورہ لے۔ جب آدمی کو یہ یقین ہو کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کے کئے سے ہوتا ہے تو اس کے بعد انسانی اسباب اس کی نظر میں ناقابل لحاظ ہو جائیں گے۔

اور نبی کا یہ کام نہیں کہ وہ کچھ چھپا رکھے اور جو کوئی چھپائے گا وہ اپنی چھپائی ہوئی چیز کو قیامت کے دن حاضر کرے گا۔ پھر ہر جان کو اس کے کیے ہوئے کا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر کچھ ظلم نہ ہوگا۔ کیا وہ شخص جو اللہ کی مرضی کا تابع ہے وہ اس شخص کے مانند ہو جائے گا جو اللہ کا غضب لے کر لوٹا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیسا برا ٹھکانا ہے۔ اللہ کے یہاں ان کے درجے الگ الگ ہوں گے۔ اور اللہ دیکھ رہا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انھیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ بے شک یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے ۱۶۱ - ۶۴

احد کے درہ پر متعین جن چالیس افراد نے نافرمانی کی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو معاف کر دیا تھا۔ تاہم ان لوگوں کو یہ شبہ تھا کہ آپ نے شاید صرف اوپری طور پر ہم کو معاف کیا ہے۔ دل میں آپ اب بھی خفا ہیں اور کسی وقت ہمارے اوپر خفگی نکالیں گے۔ فرمایا کہ یہ پیغمبر کا طریقہ نہیں۔ پیغمبر اندر اور باہر ایک ہوتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے سربراہ کو کیسا ہونا چاہیے۔ مسلم سربراہ کا دل ایسا ہونا چاہیے کہ اس کے اندر بغض، نفرت، کینہ اور حسد بالکل جگہ نہ پا سکے — حتی کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ اس کے ساتھیوں سے ایک بھیانک غلطی ہو گئی ہو۔ مسلم سربراہ کو چاہیے کہ بڑی سے بڑی غلطی کرنے والوں کے خلاف بھی وہ دل میں کوئی جذبہ چھپا کر نہ رکھے۔ آج کے دن ان کے ساتھ اس طرح رہے جیسے پچھلے دن ان سے کچھ نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کا کوئی گروہ جب ایک سربراہ پر اعتماد کرکے اپنے معاملات کو اس کے سپرد کر دے تو سربراہ کو ایسا کبھی نہ کرنا چاہیے کہ ان کے جان و مال کو وہ اپنے ذاتی حوصلوں اور تمناؤں کی تکمیل پر قربان کر دے۔ یہ اللہ کے غضب سے بے خوف ہونا ہے۔ جو شخص لوگوں کو یہ بتانے کے لیے اٹھا ہو کہ لوگ اللہ کی مرضی پر چلیں، وہ خود کیسے یہ اس حال میں اللہ سے ملنا پسند کرے گا کہ وہ اللہ کی مرضی کے خلاف چلا ہو

پیغمبر نے اپنی زندگی سے جو مثالی نمونہ قائم کیا ہے، قیامت تک تمام مصلحین کو اسی کے مطابق بننا ہے۔ اصلاح کے کام کے لیے ضروری ہے کہ آدمی جن لوگوں کے درمیان کام کرنے اٹھے ان کو ہر اعتبار سے وہ "اپنا" نظر آئے۔ اس کی زبان، اس کا طرز کلام، اس کا رہن سہن ہر چیز اجنبیت سے پاک ہو۔ وہ "اپنے" اور "اپنے مخاطبین" کے درمیان ایسی فضا نہ بنائے جو کسی پہلو سے ایک دوسرے کو دور کرنے والی ہو یا ایک کو دوسرے کے مقابلہ میں فریق بنا کر کھڑا کر دے۔ لوگوں کے درمیان جو کام کرنا ہے وہ سب سے پہلے یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ ان نشانیوں کو پڑھنے لگیں جو ان کی ذات میں اور باہر کی دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اللہ کی دلیلوں کو جان کر ان کو اپنے ذہن کا جزء بنائیں۔ دوسرا کام تزکیہ ہے۔ یہ مقصد زبانی گفتگو اور صحبت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ عمومی تحریر اور تقریر میں بات زیادہ تر اصولی انداز میں ہوتی ہے جب کہ انفرادی گفتگوؤں میں بات زیادہ متعین اور زیادہ مفصل صورت میں ہوتی ہے۔ نیز داعی کا اپنا وجود بھی پوری طرح اس کی تقویت پر موجود رہتا ہے۔ عمومی کلام اگر دعوت ہوتا ہے تو انفرادی ملاقاتیں مدعو کے لیے تزکیہ کے ہم معنی بن جاتی ہیں۔ تیسری چیز کتاب ہے، یعنی زندگی گزارنے کی بابت آسمانی ہدایات کو بتانا جس کا دوسرا نام شریعت ہے اور چوتھی چیز حکمت ہے، یعنی دین کے گہرے بھیدوں سے پردہ اٹھانا، بین السطور میں چھپے ہوئے حقائق کو نمایاں کرنا۔

اور جب تم کو ایسی مصیبت پہنچی جس کی دوگنی مصیبت تم پہنچا چکے تھے تو تم نے کہا کہ یہ کہاں سے آگئی۔ کہو یہ تمھارے اپنے پاس سے ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور دونوں جماعتوں کی مڈبھیڑ کے دن تم کو جو مصیبت پہنچی وہ اللہ کے حکم سے پہنچی اور اس واسطے کہ اللہ مومنین کو جان لے اور ان کو بھی جان لے جو منافق تھے جن سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں لڑو یا دشمن کو دفع کرو۔ انھوں نے کہا اگر ہم جانتے کہ جنگ ہونا ہے تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ یہ لوگ اس دن ایمان سے زیادہ کفر کے قریب تھے۔ وہ اپنے منھ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے اور اللہ اس چیز کو خوب جانتا ہے جس کو وہ چھپاتے ہیں۔ یہ لوگ جو خود بیٹھے رہے، اپنے بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو مارے نہ جاتے۔ کہو تم اپنے اوپر سے موت کو ہٹا دو اگر تم سچے ہو۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ نہ سمجھو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس، ان کو رزق مل رہا ہے۔ وہ خوش ہیں اس پر جو اللہ نے اپنے فضل میں سے ان کو دیا ہے اور خوش خبری لے رہے ہیں کہ جو لوگ ان کے پیچھے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں ان کے لئے بھی نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ خوش ہو رہے ہیں اللہ کے انعام اور فضل پر اور اس پر کہ اللہ ایمان والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ جن لوگوں نے اللہ اور رسول کے حکم کو مانا بعد اس کے کہ ان کو زخم لگ چکا تھا، ان میں سے جو نیک اور متقی ہیں ان کے لئے بڑا اجر ہے جن سے لوگوں نے کہا کہ دشمن نے تمھارے خلاف بڑی طاقت جمع کرلی ہے اس سے ڈرو۔ لیکن اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کردیا اور وہ بولے کہ اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ پس وہ اللہ کی نعمت اور اس کے فضل کے ساتھ واپس آئے۔ ان لوگوں کو کوئی برائی پیش نہ آئی۔ اور وہ اللہ کی رضامندی پر چلے اور اللہ بڑا فضل والا ہے۔ یہ شیطان ہے جو تم کو اپنے دوستوں کے ذریعہ ڈراتا ہے۔ تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔

۱۶۵ — ۷۵

حق و باطل کے مقابلہ میں آخری فتح حق کو ہوتی ہے کیونکہ اللہ ہمیشہ حق کے ساتھ ہوتا ہے۔ تاہم یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں شرپسندوں کو بھی عمل کی پوری آزادی ہے۔ اس لئے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اہل حق کی کسی کمزوری، مثلاً باہمی اختلاف، سے فائدہ اٹھا کر شرپسند ان کو وقتی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تاہم اس طرح کے واقعات کا ایک مفید پہلو بھی ہے۔ اس کے ذریعہ خود مسلمانوں کی جماعت کی جانچ ہو جاتی ہے۔ ناموافق حالات کو دیکھ کر غیر مخلص لوگ چھٹ جاتے ہیں اور جو سچے مسلمان ہیں وہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے جمے رہتے ہیں۔ اس طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ کون قابل اعتماد ہے اور کون ناقابل اعتماد۔ مزید یہ کہ اتفاقی غلطی سے نقصان اٹھانے کے بعد جب اہل ایمان دوبارہ صبر اور انابت اور توکل علی اللہ کا ثبوت دیتے ہیں تو خدا کی رحمت ان کی طرف پہلے سے بھی زیادہ متوجہ ہو جاتی ہے۔

حق و باطل کے معرکہ میں جو لوگ اس طرح شرکت کریں کہ اسی کی راہ میں اپنے کو مٹا دیں، ان کے متعلق اہل دنیا اکثر افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ انھوں نے خواہ مخواہ اپنے کو برباد کرلیا۔ مگر یہ صرف نادانی کی بات ہے۔ اللہ کی راہ میں کھونا ہی تو سب سے بڑا پانا ہے۔ کیوں کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کردیں وہی وہ لوگ ہیں جو سب سے زیادہ اللہ کے انعامات کے مستحق قرار دئے جائیں گے۔

اور وہ لوگ تمھارے لئے باعثِ غم نہ بنیں جو انکار میں سبقت کر رہے ہیں۔ وہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے۔ ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ جن لوگوں نے ایمان کے بدلے کفر کو خریدا ہے وہ اللہ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں یہ خیال نہ کریں کہ ہم جو ان کو مہلت دے رہے ہیں یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔ ہم تو بس اس لئے مہلت دے رہے ہیں کہ وہ جرم میں اور بڑھ جائیں اور ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ اللہ وہ نہیں کہ مسلمانوں کو اس حالت پر چھوڑ دے جس طرح کہ تم اب ہو جب تک کہ وہ ناپاک کو پاک سے جدا نہ کرے۔ اور اللہ یوں نہیں کہ تم کو غیب سے خبردار کر دے۔ بلکہ اللہ چھانٹ لیتا ہے اپنے رسولوں میں جس کو چاہتا ہے۔ پس تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر۔ اور اگر تم ایمان لاؤ اور پرہیزگاری اختیار کرو تو تمھارے لئے بڑا اجر ہے ۱۷۶ - ۱۷۹

زندگی کا اصل مسئلہ وہ نہیں جو دکھائی دے رہا ہے، اصل مسئلہ وہ ہے جو آنکھوں سے اوجھل ہے۔ لوگ دنیا کے جہنم سے بچنے کی فکر کرتے ہیں اور اپنی ساری توجہ دنیا کی جنت کو حاصل کرنے میں لگا دیتے ہیں۔ مگر زیادہ عقل مندی کی بات یہ ہے کہ آدمی آخرت کے جہنم سے اپنے کو بچائے اور وہاں کی جنت کی طرف دوڑے۔ دنیا میں پیسہ والا ہونا اور بے پیسہ والا ہونا، جائداد والا ہونا اور بے جائداد والا ہونا، عزت والا ہونا اور بے عزت والا ہونا، یہ سب وہ چیزیں ہیں جو ہر آدمی کو آنکھوں سے نظر آتی ہیں۔ اس لئے وہ ان پر ٹوٹ پڑتا ہے، وہ اپنی ساری کوشش اس مقصد کے لئے لگا دیتا ہے کہ وہ یہاں محروم نہ رہے۔ مگر انسان کا اصل مسئلہ آخرت کا مسئلہ ہے جس کو اللہ نے امتحان کی مصلحت سے چھپا دیا ہے اور اس سے لوگوں کو خبردار کرنے کے لئے یہ طریقہ مقرر فرمایا ہے کہ وہ اپنے کچھ بندوں کو غیب کی پیغام بری کے لئے چنے۔ ان کو موت کے اس پار کی حقیقتوں سے خبردار کرے اور پھر ان کو مقرر کرے کہ وہ دوسروں کو اس سے باخبر کردیں۔ انسان کی اصل جانچ یہ ہے کہ وہ خدا کے داعی کی آواز میں سچائی کی جھلکیوں کو پالے، وہ ایک لفظی پکار میں حقیقت کی عملی تصویر دیکھ لے۔ وہ اپنے جیسے ایک انسان کی باتوں میں خدائی بات کی گونج سن لے۔

ایمان یہ ہے کہ آدمی خود پسندی نہ کرے۔ کیوں کہ خود پسندی خدا کے بجائے اپنے آپ کو بڑائی کا مقام دینا ہے۔ وہ دنیا میں غرق نہ ہو۔ کیوں کہ دنیا میں غرق ہونا ظاہر کرتا ہے کہ آدمی آخرت کو اصل اہمیت نہیں دیتا۔ وہ کبر، بخل، ناانصافی اور غیر اللہ کی عقیدت و محبت سے اپنے کو بچائے اور اس کے بجائے خدا پرستی، تواضع، فیاضی اور انصاف پسندی کو اپنا شیوہ بنائے۔ ایسا کرنا ثابت کرتا ہے کہ آدمی اپنے ایمان میں سنجیدہ ہے۔ اس نے فی الواقع اپنے آپ کو خدا اور آخرت کی طرف لگا دیا ہے۔ اور ایسا نہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے ایمان میں سنجیدہ نہیں۔ اقرار ایمان کے باوجود عملاً وہ اسی دنیا میں جی رہا ہے جہاں دوسرے لوگ جی رہے ہیں۔ آخرت میں خبیث روحوں اور طیب روحوں کی جو تقسیم ہوگی وہ حقیقت کے اعتبار سے ہوگی نہ کہ محض ظاہری نمائش کے اعتبار سے —— دنیا میں برے لوگوں کو جو ڈھیل دی گئی ہے وہ صرف اس لئے ہے کہ وہ اپنے اندر کی برائی کو پوری طرح ظاہر کردیں۔ مگر وہ خواہ کتنی ہی کوشش کریں وہ اہلِ حق کو زیر کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ وہ اپنی آزادی کو صرف اپنے خلاف استعمال کرسکتے ہیں نہ کہ دوسروں کے خلاف۔

اور جو لوگ بخل کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ نے ان کو اپنے فضل میں سے دیا ہے وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے حق میں اچھا ہے۔ بلکہ یہ ان کے حق میں بہت برا ہے۔ جس چیز میں وہ بخل کر رہے ہیں اس کا قیامت کے دن ان کو طوق پہنایا جائے گا۔ اور اللہ ہی وارث ہے زمین و آسمان کا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ اللہ نے ان لوگوں کا قول سنا جنھوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔ ہم لکھ لیں گے ان کے اس قول کو اور ان کے پیغمبروں کو ناحق مار ڈالنے کو بھی۔ اور ہم کہیں گے کہ اب آگ کا عذاب چکھو۔ یہ تمھارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے اور اللہ اپنے بندوں کے ساتھ ناانصافی کرنے والا نہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم کسی رسول کو تسلیم نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی پیش نہ کرے جس کو آگ کھالے، ان سے کہو کہ مجھ سے پہلے تمھارے پاس رسول آئے کھلی نشانیاں لے کر اور وہ چیز لے کر جس کو تم کہہ رہے ہو۔ پھر تم نے کیوں ان کو مار ڈالا۔ اگر تم سچے ہو۔ پس اگر یہ تم کو جھٹلاتے ہیں تو تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں جو کھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے۔ ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم کو پورا اجر تو بس قیامت کے دن ملے گا۔ پس جو شخص آگ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کیا جائے وہی کامیاب رہا اور دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کا سودا ہے ۱۸۰ – ۸۵

ظاہری طور پر آدمی ایک قول دے کر مومن بن جاتا ہے مگر اللہ کی نظر میں وہ اس وقت مومن بنتا ہے جب کہ وہ اپنی جان اور اپنے مال کو اللہ کی راہ میں دے دے۔ جان و مال کی قربانی کے بغیر کسی کا ایمان اللہ کے یہاں معتبر نہیں۔ آدمی اپنے مال کو اس لئے بچاتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ اپنے دنیوی مستقبل کا تحفظ کر رہا ہے۔ مگر آدمی کا حقیقی مستقبل وہ ہے جو آخرت میں سامنے آنے والا ہے اور آخرت کی دنیا میں ایسا بچایا ہوا مال آدمی کے حق میں صرف وبال ثابت ہوگا۔ جو مال دنیا میں زینت اور فخر کا ذریعہ دکھائی دے رہا ہے وہ آخرت میں خدا کے حکم سے سانپ کی صورت اختیار کرے گا جو ابدی طور پر اس کو ڈستا رہے۔

جو لوگ قربانی والے دین کو نہیں اپناتے وہ اپنے کو صحیح ثابت کرنے کے لئے مختلف باتیں کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہ مال خدا نے ہماری ضرورت کے لئے پیدا کیا ہے پھر کیوں نہ ہم اس کو اپنی ضرورتوں میں خرچ کریں اور اس سے اپنے دنیوی آرام کا سامان کریں۔ کبھی ان کی بے حسی ان کو یہاں تک لے جاتی ہے کہ وہ خود داعیٔ حق کو مشتبہ کرنے کے لئے طرح طرح کے شوشے نکالتے ہیں تاکہ یہ ثابت کر سکیں کہ وہ شخص سچا داعی ہی نہیں جس کا ظہور یہ تقاضا کر رہا ہے کہ اپنی زندگی اور اپنے مال کو قربان کر کے اس کا ساتھ دیا جائے۔ اس قسم کے لوگ جو باتیں کہتے ہیں وہ بظاہر دلیل کے روپ میں ہوتی ہیں مگر حقیقتہً وہ ایمانی تقاضوں سے فرار کے لئے ہیں۔ اس لئے خواہ کیسی ہی دلیل پیش کی جائے وہ اس کو رد کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ الفاظ تلاش کر لیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس بات کو بھول گئے ہیں کہ ان کا آخری انجام موت ہے۔ اور موت کا مرحلہ سامنے آتے ہی صورت حال بالکل بدل جائے گی۔ موت تمام جھوٹے سہاروں کو باطل کر دے گی۔ اس کے بعد آدمی اپنے آپ کو ٹھیک اس مقام پر کھڑا ہوا پائے گا جہاں وہ حقیقتہً تھا نہ کہ اس مقام پر جہاں وہ اپنے آپ کو ظاہر کر رہا تھا — موجودہ دنیا میں کسی کا ترقی کرنا یا موجودہ دنیا میں کسی کا ناکام ہو جانا، دونوں حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی سطح کی چیزیں ہیں۔ نہ یہاں کی نعمتیں کسی کے برسرِ حق ہونے کا ثبوت ہیں اور نہ کسی کا یہاں مشکلات و مصائب میں مبتلا ہونا اس کے برسرِ باطل ہونے کا ثبوت۔ کیوں کہ دونوں ہی امتحان کے نقشے ہیں نہ کہ انجام کی علامتیں۔

یقیناً تم اپنے جان اور مال میں آزمائے جاؤ گے۔ اور تم بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے ان سے جن کو تم سے پہلے کتاب ملی اور ان سے بھی جنھوں نے شرک کیا۔ اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑے حوصلہ کا کام ہے۔ اور جب اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا کہ تم خدا کی کتاب کو پوری طرح ظاہر کرو گے اور اس کو نہیں چھپاؤ گے۔ مگر انھوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا اور اس کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالا۔ کیسی بری چیز ہے جس کو وہ خرید رہے ہیں۔ جو لوگ اپنے ان کرتوتوں پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کام انھوں نے نہیں کئے اس پر ان کی تعریف ہو، ان کو عذاب سے بری نہ سمجھو۔ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اور اللہ ہی کے لئے ہے زمین و آسمان کی بادشاہی، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے　۱۸۹ ـ ۱۸۶

ایمان کا سفر آدمی کو ایسی دنیا میں طے کرنا ہوتا ہے جہاں اپنوں اور غیروں کی طرف سے طرح طرح کے زخم لگتے ہیں۔ مگر مومن کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ردعمل کی نفسیات میں مبتلا نہ ہو، وہ ہر صورت حال کا مثبت جواب دیتے ہوئے آگے بڑھتا رہے۔ لوگوں کی طرف سے اشتعال دلانے والے مواقع پیش آتے ہیں مگر وہ پابند ہوتا ہے کہ ہر قسم کے جھٹکوں کو اپنے اوپر سہے اور جوابی ذہن کے تحت کوئی کارروائی نہ کرے۔ بار بار ایسے معاملات سامنے آتے ہیں جب کہ دل کہتا ہے کہ حدود خداوندی کو توڑ کر اپنا مدعا حاصل کیا جائے مگر اللہ کا ڈر اس کے قدموں کو روک دیتا ہے۔ اسی طرح دین کی مختلف ضرورتیں سامنے آتی ہیں اور جان و مال کی قربانی کا تقاضا کرتی ہیں، ایسے مواقع پر آسان دین کو چھوڑ کر مشکل دین کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یہ واقعہ ایمان کے سفر کو ہمت اور عالی حوصلگی کا زبردست امتحان بنا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن بننا اپنے آپ کو صبر اور تقویٰ کے امتحان میں کھڑا کرنا ہے۔ جو اس امتحان میں پورا اترا وہی وہ مومن بنا جس کے لئے آخرت میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

آسمانی کتاب کے حامل کسی گروہ پر جب زوال آتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ وہ خدا و رسول کا نام لینا چھوڑ دے یا خدا کی کتاب سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کر دے۔ دین ایسے گروہ کی نسلی روایات میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہ اس کا پُر فخر قومی اثاثہ بن جاتا ہے۔ اور جس چیز سے اس طرح کا نسلی اور قومی تعلق قائم ہو جائے اس سے علیحدگی کسی گروہ کے لئے ممکن نہیں ہوتی۔ تاہم اس کا یہ تعلق محض رسمی تعلق ہوتا ہے نہ کہ فی الواقع کوئی حقیقی تعلق۔ وہ اپنی دنیوی سرگرمیاں بھی دین کے نام پر جاری کرتے ہیں، وہ بے دین ہو کر بھی اپنے کو دین دار کہلانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہنے لگتے ہیں کہ ان کو اس کام کا کریڈٹ دیا جائے جس کو انھوں نے کیا نہیں۔ وہ نجاتِ اخروی سے بے فکر ہو کر زندگی گزارتے ہیں اور اسی کے ساتھ ایسے عقیدے بنا لیتے ہیں جس کے مطابق ان کو اپنی نجات بالکل محفوظ نظر آتی ہے۔ وہ اپنے گھڑے ہوئے دین پر چلتے ہیں مگر اپنے کو دین خداوندی کا علم بردار بتاتے ہیں۔ وہ دنیوی مقاصد کے لئے سرگرم ہوتے ہیں اور اپنی سرگرمیوں کو آخرت کا عنوان دیتے ہیں۔ وہ خود ساختہ سیاست چلاتے ہیں اور اس کو خدائی سیاست ثابت کرتے ہیں۔ وہ قومی مفادات کے لئے اٹھتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ وہ خیر الامم کا کردار ادا کرنے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ مگر کوئی شخص بے دینی کو دین کہنے لگے تو اس بنا پر وہ اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا ــــــ آدمی دنیا کی طرف دوڑے اور آخرت سے بے پروا ہو جائے تو یہ صرف گمراہی ہے اور اگر وہ اپنے دنیوی کاروبار کو خدا و رسول کے نام پر کرنے لگے تو یہ گمراہی پر ڈھٹائی کا اضافہ ہے۔ کیوں کہ یہ ایسے کام پر انعام چاہنا ہے جس کو آدمی نے انجام ہی نہیں دیا۔

آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں۔ جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں۔ وہ کہہ اٹھتے ہیں اے ہمارے رب تونے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے، پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب تونے جس کو آگ میں ڈالا اس کو تونے واقعی رسوا کر دیا۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ اے ہمارے رب ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف پکار رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ۔ پس ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ اے ہمارے رب تونے جو وعدے اپنے رسولوں کی معرفت ہم سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہم کو رسوائی میں نہ ڈال۔ بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے ۱۹۴ — ۱۹۰

کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک خاموش اعلان ہے۔ آدمی جب اپنے کان اور آنکھ سے مصنوعی پردوں کو ہٹاتا ہے تو وہ اس خاموش اعلان کو ہر طرف سننے اور دیکھنے لگتاہے۔ اس کو ناممکن نظر آتا ہے کہ ایک ایسی کائنات جس کے ستارے اور سیارے کھربوں سال تک بھی ختم نہیں ہوتے وہاں انسان اپنی تمام خواہشوں اور تمناؤں کو لئے ہوئے صرف پچاس سال اور سو سال میں ختم ہو جائے۔ ایک ایسی دنیا جہاں درختوں کا حسن اور پھولوں کی لطافت ہے۔ جہاں ہوا اور پانی اور سورج جیسی بے شمار بامعنی چیزوں کا اہتمام کیا گیا ہے وہاں انسان کے لئے حزن اور غم کے سوا کوئی انجام نہ ہو۔ پھر یہ بھی اس کو ناممکن نظر آتا ہے کہ ایک ایسی دنیا جہاں یہ اتھاہ امکان رکھا گیا ہے کہ یہاں ایک چھوٹا سا بیج زمین میں ڈالا جائے تو اس کے اندر سے ہرے بھرے درخت کی ایک پوری کائنات نکل آئے وہاں آدمی نیکی کی زندگی اختیار کر کے بھی اس کا کوئی پھل نہ پاتا ہو۔ ایک ایسی دنیا جہاں ہر روز تاریک رات کے بعد روشن دن آتا ہے وہاں صدیاں گزر جائیں اور عدل و انصاف کا اجالا اپنی چمک نہ دکھائے۔ ایک ایسی دنیا جس کی گود میں زلزلے اور طوفان سو رہے ہیں وہاں انسان ظلم پر ظلم کرتا رہے مگر کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا سامنے نہ آئے۔ جو لوگ حقیقتوں میں جیتے ہیں اور گہرائیوں میں اتر کر سوچتے ہیں ان کے لئے ناقابل یقین ہو جاتا ہے کہ ایک بامعنی کائنات بے معنی انجام پر ختم ہو جائے۔ وہ جان لیتے ہیں کہ حق کا داعی جو پیغام دے رہا ہے وہ نطق کی زبان میں اسی بات کا اعلان ہے جو خاموش زبان میں ساری کائنات میں نشر ہو رہا ہے۔ ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ بن جاتا ہے کہ جب سچائی کھلے اور جب انصاف کا سورج نکلے تو اس دن وہ ناکام و نامراد نہ ہو جائیں۔ وہ اپنے رب کو پکارتے ہوئے اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں، وہ مفاد اور مصلحت کی تمام حدوں کو توڑ کر داعیٔ حق کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ تاکہ جب کائنات کا "اجالا" اور کائنات کا "اندھیرا" ایک دوسرے سے الگ کئے جائیں تو کائنات کا مالک ان کو اجالے میں جگہ دے، وہ ان کو اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے کے لئے نہ چھوڑے۔

عقل اور بے عقلی کا حقیقی پیمانہ اس سے بالکل مختلف ہے جو انسانوں نے بطور خود بنا رکھا ہے۔ یہاں عقل والا وہ ہے جو اللہ کی یاد میں جئے، جو کائنات کے تخلیقی منصوبہ میں کام کرنے والی خدائی معنویت کو پالے۔ اس کے برعکس بے عقل وہ ہے جو اپنے دل و دماغ کو دوسری دوسری چیزوں میں اٹکائے، جو دنیا میں اس طرح زندگی گزارے جیسے کہ اس کو مالک کائنات کے تخلیقی منصوبہ کی خبر ہی نہیں۔

ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے سے ہو۔ پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور وہ لڑے اور مارے گئے ان کی خطائیں ضرور ان سے دور کردوں گا اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کا بدلہ ہے اللہ کے یہاں اور بہترین بدلہ اللہ ہی کے پاس ہے۔ اور ملک کے اندر منکروں کی سرگرمیاں تم کو دھوکے میں نہ ڈالیں یہ تھوڑا سا فائدہ ہے۔ پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیسا برا ٹھکانا ہے۔ البتہ جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں ان کے لئے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کی طرف سے ان کی میزبانی ہوگی اور جو کچھ اللہ کے پاس نیک لوگوں کے لئے ہے وہی سب سے بہتر ہے۔ اور بے شک اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کتاب کو بھی مانتے ہیں جو تمھاری طرف بھیجی گئی ہے اور اس کتاب کو بھی مانتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی طرف بھیجی گئی تھی۔ وہ اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں اور وہ اللہ کی آیتوں کو تھوڑی قیمت پر نہیں بیچ دیتے۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ اے ایمان والو، صبر کرو اور مقابلہ میں مضبوط رہو اور لگے رہو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم کامیاب ہوگے ۲۰۰ - ۱۹۵

اہل ایمان کی ذمہ دارانہ زندگی ان کو نفس کی آزادیوں سے محروم کر دیتی ہے۔ ان کے اعلان حق میں بہت سے لوگوں کو اپنے وجود کی تردید دکھائی دینے لگتی ہے اور وہ ان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ یہ صورت حال کبھی اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے وطن میں بے وطن کر دئے جاتے ہیں۔ ان کو مخالفین کی ظالمانہ کارروائیوں کے مقابلہ میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ اللہ کے دین کو انھیں جان و مال کی قربانی کی قیمت پر اختیار کرنا ہوتا ہے۔ ان امتحانات میں پورا اترنے کے لئے اہل ایمان کو جو کچھ کرنا ہے وہ یہ کہ وہ دنیا کی مصلحتوں کی خاطر آخرت کی مصلحتوں کو بھول نہ جائیں۔ وہ مشکلات اور ناخوش گواریوں پر صبر کریں۔ وہ اپنے اندر ابھرنے والے منفی جذبات کو دبائیں اور متاثر ذہن کے تحت کوئی کارروائی نہ کریں۔ پھر ان کو باہر کے حریفوں کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا ہے۔ یہ ثابت قدمی ہی وہ چیز ہے جو اللہ کی نصرت کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ تمام اہل ایمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہیں، وہ دینی جدوجہد کے لئے باہم جڑ جائیں اور ایک جان ہو کر اجتماعی قوت سے مخالف طاقتوں کا مقابلہ کریں۔ ایمان دراصل صبر کا امتحان ہے اور اس امتحان میں وہی شخص پورا اترتا ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہو۔

دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خدا سے بے خوف اور آخرت سے بے پروا لوگوں کو زور اور غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ ہر قسم کی عزتیں اور رونقیں ان کے گرد جمع ہو جاتی ہیں۔ دوسری طرف اہل ایمان اکثر حالات میں بے زور بنے رہتے ہیں۔ شان و شوکت کا کوئی حصہ ان کو نہیں ملتا۔ مگر یہ صورت حال انتہائی عارضی ہے۔ قیامت آتے ہی حالات بالکل بدل جائیں گے۔ بے خوفی کے راستہ سے دنیا کی عزتیں سمیٹنے والے رسوائی کے گڑھے میں پڑے ہوں گے اور خوف خدا کی وجہ سے بے حیثیت ہو جانے والے ہر قسم کی ابدی عزتوں اور کامیابیوں کے مالک ہوں گے۔ وہ اللہ کے مہمان ہوں گے اور اللہ کی مہمانی سے زیادہ بڑی کوئی چیز اس زمین و آسمان کے اندر نہیں۔

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔ اور اللہ سے ڈرو جس کے واسطہ سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور خبردار رہو قرابت والوں سے ۔ بے شک اللہ تمھاری نگرانی کر رہا ہے۔ اور یتیموں کا مال ان کے حوالے کرو ۔ اور برے مال کو اچھے مال سے نہ بدلو اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے ۔ اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے معاملہ میں انصاف نہ کر سکو گے تو عورتوں میں سے جو تم کو پسند ہوں ان سے دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کر لو۔ اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی نکاح کرو یا جو کنیز تمھاری ملک میں ہو۔ اس میں امید ہے کہ تم انصاف سے نہ ہٹو گے۔ اور عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرو۔ پھر اگر وہ اس میں سے کچھ تمھارے لئے چھوڑ دیں اپنی خوشی سے تو تم اس کو ہنسی خوشی سے کھاؤ ۴-۱

تمام انسان باعتبار پیدائش ایک ہیں۔ بالآخر ایک ہی عورت اور ایک ہی مرد سب کے ماں اور باپ ہیں۔ اس لحاظ سے ضروری ہے کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کو اپنا سمجھے۔ سب کے سب ایک مشترک گھرانے کے افراد کی طرح مل جل کر انصاف اور خیر خواہی کے ساتھ رہیں۔ پھر ان میں جو رحمی رشتے ہیں ان میں یہ نسلی اتحاد اور زیادہ قریبی ہو جاتا ہے اس لئے رحمی رشتوں میں حسن سلوک کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ انسانوں کے درمیان اس باہمی حسن سلوک کی اہمیت صرف اخلاقی اعتبار سے نہیں ہے بلکہ یہ خود آدمی کا اپنا ذاتی مسئلہ ہے۔ کیوں کہ تمام انسانوں کے اوپر عظیم و برتر خدا ہے۔ وہ آخر میں سب سے حساب لینے والا ہے اور دنیا میں ان کے عمل کے مطابق آخرت میں ان کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ انسان کے معاملہ کو صرف انسان کا معاملہ نہ سمجھے بلکہ اس کو اللہ کا معاملہ سمجھے۔ وہ اللہ کی پکڑ سے ڈرے اور اپنے آپ کو اس عمل کا پابند بنائے جو اس کو اللہ کے غضب سے بچانے والا ہو۔

حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص رحم کو جوڑے گا میں اس سے جڑوں گا اور جو شخص رحم کو کاٹے گا میں اس سے کٹوں گا (من وصلها وصلته ومن قطعها قطعته) اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سے تعلق کا امتحان بندوں سے تعلق کے معاملہ میں لیا جاتا ہے۔ وہی شخص اللہ سے ڈرنے والا ہے جو بندوں کے حقوق کے معاملہ میں اللہ سے ڈرے، وہی شخص اللہ سے محبت کرنے والا ہے جو بندوں کے ساتھ محبت میں اس کا ثبوت دے۔ یہ بات عام انسانی تعلقات میں بھی مطلوب ہے۔ مگر رحمی رشتوں سے حسن سلوک کے معاملہ میں اس کی اہمیت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ صرف اللہ کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔

یتیم لڑکے اور لڑکیاں کسی خاندان یا سماج کا سب سے زیادہ کمزور حصہ ہوتے ہیں اس لئے خدا سے ڈر کا سب سے زیادہ سخت امتحان یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کے بارے میں ہوتا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ یتیموں کے بارے میں وہی کرے جو انصاف اور خیر خواہی کا تقاضا ہو اور جس میں یتیموں کے حقوق زیادہ سے زیادہ محفوظ رہنے کی ضمانت ہو۔ یہ بہت گناہ کی بات ہے کہ مشترک اثاثہ کی ایسی تقسیم کی جائے جس میں اچھی چیزیں اپنے حصہ میں رکھ لی جائیں اور دوسرے کے حصہ میں خراب چیزیں ڈال کر گنتی پوری کر دی جائے۔

اور نادانوں کو اپنا وہ مال نہ دو جس کو اللہ نے تمھارے لئے قیام کا ذریعہ بنایا ہے اور اس مال میں سے ان کو کھلاؤ اور پہناؤ اور ان سے بھلائی کی بات کہو۔ اور یتیموں کو جانچتے رہو، یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں تو اگر ان میں ہوشیاری دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو۔ اور ان کا مال اسراف سے اور اس خیال سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے نہ کھا جاؤ۔ اور جس کو حاجت نہ ہو وہ یتیم کے مال سے پرہیز کرے اور جو شخص محتاج ہو وہ دستور کے موافق کھائے۔ پھر جب تم ان کا مال ان کے حوالے کرو تو ان پر گواہ ٹھہرا لو اور اللہ حساب لینے کے لئے کافی ہے۔ ماں باپ اور قرابت داروں کے ترکہ میں سے مردوں کا بھی حصہ ہے اور ماں باپ اور قرابت داروں کے ترکہ میں سے عورتوں کا بھی حصہ ہے، تھوڑا ہو یا زیادہ ہو، ایک مقرر کیا ہوا حصہ۔ اور اگر تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم اور محتاج موجود ہوں تو اس میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان سے ہمدردی کی بات کہو۔ اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ اپنے پیچھے ناتواں بچے چھوڑ جاتے تو انھیں ان کی بہت فکر رہتی۔ پس ان کو چاہئے کہ اللہ سے ڈریں اور بات پکی کہیں۔ جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور وہ عنقریب بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالے جائیں گے ۱۰-۵

مال نہ عیش کے لئے ہے اور نہ اظہار فخر کے لئے۔ وہ آدمی کے لئے زندگی کا ذریعہ ہے۔ وہ دنیا میں اس کے قیام و بقا کا سامان ہے۔ مال کا ذریعۂ زندگی ہونا ایک طرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کو بذاتِ خود مقصود بنا لینا درست نہیں۔ دوسرے یہ کہ انتہائی ضروری ہے کہ مال کو ضائع ہونے سے بچایا جائے اور اس کو اس کے حق دار تک پہنچانے کا پورا اہتمام کیا جائے۔ کسی کے مال کو ٹھیک ٹھیک ادا نہ کرنا گویا خدا کے اس انتظام میں فساد ڈالنا ہے جو خدا نے اپنے بندوں کی رزق رسانی کے لئے کیا ہے۔ یتیم کسی سماج کا سب سے کمزور حصہ ہوتا ہے اس لئے اس کے مال کی حفاظت اور اس کے معاملہ میں ہر قسم کے ظلم سے اپنے کو بچانا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ حتی کہ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی انصاف کے مطابق ان کے ساتھ جو معاملہ کرے اس کو لکھ کر اس پر گواہی لے لے تاکہ سماج کے اندر شکایت اور اختلاف کی فضا پیدا نہ ہو اور وہ لوگوں کے سامنے بری الذمہ ہو سکے۔ جب بھی آدمی کے ہاتھ میں کسی کا معاملہ ہو تو اس کو یہ سمجھ کر معاملہ کرنا چاہئے کہ اس کی ہر کوتاہی اللہ کے علم میں ہے۔ صاحب معاملہ اپنی کمزوری کی وجہ سے خواہ اس کے خلاف کچھ نہ کر سکے مگر خدا اس کو ضرور قیامت کے دن پکڑے گا اور اگر اس نے حق کے خلاف معاملہ کیا ہے تو وہ اس کو سخت سزا دے گا اور اس کے لئے کسی طرح بھی خدا کی سزا سے بچنا ممکن نہ ہوگا۔

دنیا میں کمزور کا حق دبا کر آدمی خوش ہوتا ہے۔ مگر ہر ناجائز مال جو آدمی اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے، وہ گویا اپنے پیٹ میں آگ ڈال رہا ہے۔ دنیا میں ایسے مال کا آگ ہونا بظاہر محسوس نہیں ہوتا مگر آخرت میں یہ حقیقت کھل جائے گی۔ یہاں آدمی کو عمل کی آزادی ضرور دی گئی ہے مگر نتیجہ آدمی کے اپنے اختیار میں نہیں۔ جو شخص اپنے کو برے انجام سے بچانا چاہتا ہے اس کو دوسروں کے ساتھ بھی برا نہیں کرنا چاہئے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ دوسروں کے لئے نفع بخش بنے، وہ اپنی استعداد کے مطابق دوسروں کو دے۔ اگر کوئی شخص دینے کی حیثیت میں نہیں ہے تو آخری اسلامی درجہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کا دل نہ دکھائے، وہ اپنی زبان کھولے تو سیدھی اور پکی بات کہنے کے لئے کھولے ورنہ خاموش رہے۔

عظمتِ خداوند

کائنات کا ایک خدا ہے جو اس کا خالق اور مالک ہے۔ اس خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل خود وہ کائنات ہے جو ہمارے سامنے پھیلی ہوئی ہے۔ کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ پکار رہی ہے کہ ایک عظیم خدا ہے جس نے اس کو بنایا اور جو اس کو اپنی بے پناہ طاقت سے چلا رہا ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ ہم کائنات کو مانیں اور اسی لئے ہم مجبور ہیں کہ ہم خدا کو مانیں۔ کیونکہ کائنات کو ماننا اس وقت تک بے معنی ہے جب تک اس کے خالق و مالک کو نہ مانا جائے۔ کائنات اتنی حیرت انگیز ہے کہ وہ کسی بنانے والے کے بغیر بن نہیں سکتی اور اس کا نظام اتنا عجیب ہے کہ وہ کسی چلانے والے کے بغیر چل نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننے پر آدمی اسی طرح مجبور ہے جس طرح اپنے آپ کو یا کائنات کو ماننے پر۔

آپ سائیکل کے پہیہ پر ایک کنکری رکھیں اور اس کے بعد پیڈل چلا کر پہیہ کو تیزی سے گھمائیں تو کنکری دور جا کر گرے گی۔ حالاں کہ سائیکل کے پہیہ کی رفتار مشکل سے ۲۵ میل فی گھنٹہ ہے۔ ہماری یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں وہ بھی ایک بہت بڑے پہیہ کی مانند ہے۔ زمین اپنے محور پر مسلسل ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ رہی ہے۔ یہ رفتار سواری کے عام ہوائی جہازوں سے زیادہ ہے۔ ہم اس تیز رفتار زمین پر چلتے پھرتے ہیں۔ گھر اور شہر بناتے ہیں۔ مگر ہمارا وہ حال نہیں ہوتا جو گھومتے ہوئے پہیہ پر رکھی ہوئی کنکری کا ہوتا ہے۔ کیسا عجیب ہے یہ معجزہ۔ کہا جاتا ہے کہ زمین پر ہمارے قائم رہنے کی وجہ یہ ہے کہ نیچے سے زمین بہت بڑی طاقت کے ساتھ کھینچ رہی ہے اور اوپر سے ہوا کا بھاری دباؤ ہم کو زمین کی سطح پر روکے رہتا ہے۔ یہ دو طرفہ عمل ہم کو زمین پر تھامے ہوئے ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم پہیہ کی کنکری کی طرح فضا میں اڑ نہیں جاتے۔ مگر یہ جواب صرف یہ بتاتا ہے کہ ہمارے آس پاس ایک اور اس سے بھی زیادہ بڑا معجزہ موجود ہے۔ زمین میں اتنے بڑے پیمانہ پر کھینچنے کی قوت ہونا اور اس کے چاروں طرف ہوا کا پانچ سو میل موٹا غلاف مسلسل لپٹا رہنا صرف معاملہ کی حیرت ناکی کو بڑھاتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس کو کم نہیں کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز معجزہ ہے۔ آدمی مٹی کے اندر ایک چھوٹا سا دانہ ڈالتا ہے۔ اس کے بعد حیرت انگیز طور پر وہ دیکھتا ہے کہ مٹی کے اندر سے ایک ہری اور سفید مولی نکلی چلی آرہی ہے۔ وہ دوسرا دانہ ڈالتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس کے اندر سے میٹھا گاجر نکلا چلا آرہا ہے۔ اسی طرح بے شمار دوسری چیزیں۔ کسی دانہ کو مٹی میں ڈالنے سے امرود نکل رہا ہے۔ کسی دانہ کو ڈالنے سے آم۔ کسی دانہ سے شیشم کا درخت نکلا چلا آرہا ہے اور کسی دانہ سے چنار کا۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی صورت الگ، ہر ایک کا مزہ الگ، ہر ایک کے فائدے الگ، ہر ایک کی خاصیتیں الگ۔ ایک ہی مٹی ہے اور نا قابلِ لحاظ چھوٹے چھوٹے بیج ہیں اور ان سے اتنی مختلف چیزیں اتنی مختلف صفتوں کو لئے ہوئے نکل رہی ہے جن کی گنتی نہیں کی جا سکتی۔ حیرت ناک معجزوں کی ایک پوری کائنات ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں سارے انسان مل کر ایک ذرہ کی بھی تخلیق نہیں کر سکتے وہاں ہر لمحہ بے شمار طرح طرح کی چیزیں پیدا ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اتنے بڑے معجزے ہیں کہ ان کے کمالات کو انسانی زبان میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو بتانے کے لئے ہماری لغت کے تمام الفاظ بھی

ناکافی ہیں۔ ہمارے الفاظ ان معجزوں کے اتھاہ کمالات کو صرف محدود کرتے ہیں۔ وہ کچھ بھی ان کا اظہار نہیں کرتے۔ کیا یہ معجزہ ایک خدا کے بغیر خود بخود وجود میں آسکتا ہے۔

دنیا کی ہر چیز ایٹم سے بنی ہے۔ ہر چیز اپنے آخری تجزیہ میں ایٹموں کا مجموعہ ہے۔ مگر کیسا عجیب معجزہ ہے کہ کہیں ایٹموں کی ایک مقدار جمع ہوتی ہے تو سورج جیسا روشن کرہ بن جاتا ہے۔ دوسری جگہ یہی ایٹم جمع ہوتے ہیں تو وہ بہتے ہوئے پانی کی صورت میں رواں ہو جاتے ہیں۔ تیسری جگہ ایٹموں کا یہی مجموعہ لطیف ہواؤں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کسی اور جگہ یہی ایٹم زرخیز زمین کی صورت میں ڈھل جاتے ہیں۔ اسی طرح دنیا میں ان گنت چیزیں ہیں۔ سب کی ترکیب ایٹم سے ہوئی ہے۔ مگر سب کی نوعیت اور خاصیت جدا جدا ہے۔ اس قسم کی ایک معجزاتی کائنات اپنی بے شمار سرگرمیوں کے ساتھ انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کے لئے جو کچھ درکار ہے وہ بہت بڑے پیمانہ پر دنیا میں جمع کر دیا گیا ہے اور ہر روز جمع کیا جا رہا ہے۔ دنیا کو اپنے لئے قابل استعمال بنانے کی خاطر انسان کو خود جو کچھ کرنا ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔ کائناتی انتظام کے تحت بے حساب مقدار میں قیمتی رزق پیدا کیا جاتا ہے۔ ہم اس میں صرف اتنا کرتے ہیں کہ اپنا ہاتھ اور منھ چلا کر اس کو اپنے پیٹ میں ڈال لیتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے ارادہ کے بغیر خود کار فطری نظام کے تحت غذا ہمارے اندر تحلیل ہوتی ہے اور گوشت اور خون اور ہڈی اور ناخن اور بال اور دوسری بہت سی چیزوں کی صورت اختیار کر کے ہمارے جسم کا جزء بن جاتی ہے۔ زمین و آسمان کی بے شمار گردشوں کے بعد وہ حیرت انگیز چیز پیدا ہوتی ہے جس کو تیل کہتے ہیں۔ انسان صرف یہ کرتا ہے کہ اس کو نکال کر اپنی مشینوں میں بھر لیتا ہے اور پھر یہ سیال ایندھن انسانی تہذیب کے پورے نظام کو حیرت انگیز طور پر رواں دواں کر دیتا ہے۔ اسی طرح کائنات کے نظام کے تحت وہ ساری چیزیں بے شمار تعداد اور مقدار میں پیدا کی گئی ہیں جن پر انسان صرف معمولی عمل کرتا ہے اور اس کے بعد وہ کپڑا، مکان، فرنیچر، آلات، مشینوں، سواریوں اور بے شمار تمدنی ساز و سامان کی صورت میں ڈھل جاتی ہیں۔ کیا یہ واقعات اس بات کے ثبوت کے لئے کافی نہیں کہ اس کا ایک بنانے والا اور چلانے والا ہے۔

اب ایک اور پہلو سے دیکھئے۔ قدرت اپنے طویل اور ناقابل بیان عمل کے ذریعہ ہر قسم کی چیزیں تیار کر کے ہم کو دے رہی ہے۔ انسان ان کو اپنے حق میں کارآمد بنانے کے لئے بے حد تھوڑا حصہ ادا کرتا ہے۔ وہ لوہے کو مشین کی صورت میں ڈھالتا ہے اور تیل کو صاف کر کے اس کو اپنی گاڑی کی ٹنکی میں بھرتا ہے۔ مگر اس قسم کے معمولی عمل کا یہ نتیجہ ہے کہ خشکی اور تری فساد سے بھر گئے ہیں۔ قدرت نے ہم کو ایک انتہائی حسین اور خالص دنیا دی تھی مگر ہمارے عمل نے ہم کو دھواں، شور، غلاظت، توڑ پھوڑ، لڑائی جھگڑا اور طرح طرح کے ناقابل حل مسائل سے گھیر لیا ہے۔ ہم اپنے کارخانوں یا تمدنی سرگرمیوں کی صورت میں جو تھوڑا سا عمل کرتے ہیں وہی عمل کائنات میں بے حساب گنا زیادہ بڑے پیمانہ پر رات دن ہو رہا ہے مگر یہاں کسی قسم کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ زمین مسلسل دو قسم کی دوڑ میں لگی ہوئی ہے ایک اپنے محور پر اور دوسری سورج کے گرد اپنے مدار پر، مگر وہ کوئی شور برپا نہیں کرتی۔ درخت ایک عظیم الشان کارخانہ کی صورت میں کام کرتے ہیں مگر وہ دھواں نہیں بکھیرتے۔ سمندروں میں بے شمار جانور ہر روز مرتے ہیں مگر وہ پانی کو خراب نہیں کرتے۔ کائنات کا نظام کھرب ہا کھرب سال سے چل رہا ہے مگر اس کا منصوبہ اتنا کامل ہے کہ اس کو کبھی اپنے منصوبہ پر نظر ثانی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بے شمار ستارے اور سیارے خلا میں ہر وقت دوڑ رہے ہیں۔ مگر ان کی رفتار میں

کبھی فرق نہیں آتا، وہ کبھی آگے پیچھے نہیں ہوتے۔ یہ تمام معجزوں سے بڑا معجزہ اور تمام کرشموں سے بڑا کرشمہ ہے جو ہر لمحہ ہماری دنیا میں پیش کیا جا رہا ہے۔ کیا اس کے بعد کوئی اور ثبوت چاہئے کہ آدمی اس کائنات کے پیچھے ایک عظیم خدائی طاقت کو تسلیم کرے۔

پھر زندگی کو دیکھئے۔ فطرت کا کیسا انوکھا واقعہ ہے کہ چند مادی چیزیں خود بخود ایک جسم میں یکجا ہوتی ہیں اور پھر ایک ایسی شخصیت وجود میں آجاتی ہے جو مچھلی بن کر پانی میں تیرتی ہے، جو چڑیا بن کر ہوا میں اڑتی ہے۔ طرح طرح کے جانوروں کی صورت میں زمین پر چلتی پھرتی ہے، انھیں میں وہ جان دار بھی ہے جس کو انسان کہا جاتا ہے۔ پر اسرار اسباب کے تحت ایک موزوں جسم بنتا ہے اور اس کے اندر ہڈیاں ایک انتہائی بامعنی ڈھانچہ کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، پھر اس کے اوپر گوشت چڑھایا جاتا ہے۔ اس کے اوپر کھال کی تہیں اوڑھائی جاتی ہیں، بال اور ناخن پیدا کئے جاتے ہیں۔ پھر سارے جسم میں خون کی نہریں جاری کی جاتی ہیں۔ اس طرح ایک خود کار عمل کے ذریعہ ایک عجیب و غریب انسان بنتا ہے، جو چلتا ہے، جو پکڑتا ہے، جو دیکھتا ہے، جو سنتا ہے، جو سونگھتا ہے۔ جو چکھتا ہے۔ جو سوچتا ہے، جو یاد رکھتا ہے، جو معلومات جمع کر کے ان کو مرتب کرتا ہے، جو لکھتا اور بولتا ہے۔ مردہ مادّہ سے اس قسم کے ایک حیرت ناک وجود کا بن جانا ایک ایسا انوکھا واقعہ ہے کہ معجزہ کا لفظ بھی اس کے اعجاز کو بتانے کے لئے کافی نہیں۔ اگر کوئی شخص کہے کہ میں نے مٹی کو بولتے ہوئے سنا اور پتھر کو چلتے ہوئے دیکھا تو لوگ حیران ہو کر اس کی تفصیل دریافت کریں گے۔ مگر یہ انسان جو چلتا پھرتا ہے جو بولتا اور دیکھتا ہے آخر مٹی پتھر ہی تو ہے۔ اس کے اجزا وہی ہیں جو "مٹی اور پتھر" کے ہوتے ہیں۔ مٹی اور پتھر کے بولنے اور دیکھنے کی خبر کو ہم جس طرح عجیب سمجھیں گے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ تعجب ہم کو اس مخلوق پر ہونا چاہئے جس کو انسان کہا جاتا ہے۔ بے جان مادّہ میں اس قسم کی زندگی اور شعور پیدا ہو جانا کیا اس بات کا ثبوت نہیں کہ یہاں ایک برتر ہستی ہے جس نے اپنی خصوصی قدرت سے یہ عجیب و غریب معجزہ رونما کیا ہے۔

انسان اگر اپنے اوپر غور کرے تو بہ آسانی وہ خدائی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی صورت میں ایک "میں" زمین پر موجود ہے۔ اس کی اپنی ایک مستقل ہستی ہے۔ وہ دوسری چیزوں سے الگ اپنا ایک وجود رکھتا ہے۔ یہ "میں" بلا اشتباہ یقین رکھتا ہے کہ وہ ہے۔ وہ سوچتا ہے اور رائے قائم کرتا ہے۔ وہ ارادہ کرتا ہے اور اس کو بالفعل نافذ کرتا ہے۔ وہ اپنے فیصلہ کے تحت کہیں ایک رویہ اور کہیں دوسرا رویہ اختیار کرتا ہے۔ یہی شخصیت اور قوت جس کا ایک آدمی اپنی "میں" کی سطح پر ہر وقت تجربہ کر رہا ہے یہی "میں" اگر خدائی صورت میں زیادہ بڑے پیمانہ پر موجود ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننا ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو ماننا۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ آدمی اپنے واسطے آپ دلیل ہے چاہے وہ کتنی ہی معذرت کرے (قیامہ)

لوگ خدا پر اور خدا کے پیغام پر یقین کرنے کے لئے معجزاتی دلیل مانگتے ہیں۔ آخر لوگوں کو اس کے سوا اور کون سا معجزہ درکار ہے جو ناقابل قیاس حد تک بڑے پیمانہ پر ساری کائنات میں جاری ہے۔ اگر اتنا بڑا معجزہ آدمی کو جھکانے کے لئے کافی نہ ہو تو دوسرا کوئی معجزہ دیکھ کر وہ کیسے ماننے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننے اور اس کے آگے اپنے آپ کو ڈالنے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہر وقت ہر آدمی کے سامنے موجود ہے۔ اس کے باوجود آدمی اگر خدا کو اور اس کے جلال و کمال کو نہ مانے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے نہ کہ کائنات کا۔

حج کی حقیقت

حج کیا ہے۔ یہ اللہ کے لئے سفر کرنا ہے۔ اپنا وقت اور مال خرچ کر کے ان مقامات پر پہنچنا ہے جن سے اللہ اور اس کے سچے بندوں کی یادگاریں وابستہ ہیں۔ حج کے تمام مراسم اس بات کا ایک عملی اظہار ہیں کہ آدمی اللہ کے لئے دوڑ رہا ہے۔ اس نے اپنی زندگی اللہ کے گرد گھمار کھی ہے۔ وہ اللہ کے دوستوں کا دوست اور اللہ کے دشمنوں کا دشمن ہے۔ میدان حشر میں اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کی حالت کو آج ہی اس نے اپنے اوپر طاری کر لیا ہے۔ وہ سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور سب سے زیادہ اللہ کی یاد کرنے والا ہے۔ وہ اسلام کو ایک عالمی حقیقت بنانے اور اس کو بین اقوامی سطح پر رواج دینے کے لئے بے قرار ہے۔ حج بظاہر ایک عبادت ہے مگر دراصل وہ ایک آدمی کی پوری مومنانہ زندگی کی تصویر اور آخری سانس تک کے لئے ایک اقرار نامہ ہے۔ آدمی اس لئے جیتا ہے کہ وہ خدا کے لئے حج کرے اور اس لئے حج کرتا ہے کہ وہ اپنے رب کے لئے جئے۔ حج اس کی موت کی تعبیر بھی ہے اور اس کی زندگی کی بھی۔

حج گویا حق تعالیٰ کی زیارت ہے۔ وہ دنیا کی زندگی میں اپنے رب سے قریب ہونے کی انتہائی شکل ہے۔ دوسری عبادتیں اگر اللہ کی یاد ہیں تو حج خود اللہ تعالیٰ تک پہنچ جانا ہے۔ کعبہ کے سامنے کھڑا ہو کر آدمی محسوس کرتا ہے گویا وہ خود رب کعبہ کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ طواف اس حقیقت کا مظہر ہے کہ بندہ اپنے رب کو پاکر پروانہ وار اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ جب وہ ملتزم کو پکڑ کر دعا کرتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے گویا اسے اپنے آقا کا دامن ہاتھ آگیا ہے جس سے وہ بیتابانہ لپٹ گیا ہے اور اپنی ساری بات اس سے کہہ دینا چاہتا ہے۔ حج کی یہ خصوصیت اس لئے ہے کہ اس کے ادا کرنے کی جگہ ایک ایسا مقام ہے جہاں تجلیات الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔ جس کو خدا پرستانہ زندگی کے عظیم داعی سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دعوت و عمل کا مرکز بنایا تھا۔ جہاں اسلام کی پوری تاریخ ثبت ہے۔ جس کے ہر طرف اس مثالی اسلامی قافلہ کے نشانات پھیلے ہوئے ہیں جو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں چھٹی صدی عیسوی میں ظہور میں آیا تھا۔ جہاں خدا کے دین کو پہلی بار ایک تاریخی واقعہ بنایا گیا۔ ان چیزوں نے حرم کے پورے علاقہ کو ایک خصوصی اہمیت دے دی ہے۔ وہاں اسلام کے حق میں ایک خاص طرح کا تاریخی اور نفسیاتی ماحول بن گیا ہے۔ جو شخص بھی وہاں جاتا ہے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، وہ خدا کے رزق سے ایک ایسا حصہ لے کر لوٹتا ہے جو اس کی بقیہ پوری زندگی میں اس کی دینی توانائی کا ذریعہ بنا رہے۔

حج کو اسلامی عبادات میں ہمیشہ ایک غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ایک حدیث میں اس کو افضل عبادت کہا گیا ہے۔ وہ تمام عبادات کا مجموعہ ہے اور تمام عبادات میں زندگی پیدا کرتا ہے۔ تاہم اس کی جو کچھ اہمیت ہے وہ اس کی حقیقی روح کے اعتبار سے ہے نہ کہ محض ظاہری رسوم و آداب کے اعتبار سے۔ دوسرے لفظوں میں حج صرف اس کا نام نہیں ہے کہ آدمی دیار حرم میں جائے اور کچھ مخصوص مراسم دہرا کر واپس لوٹ آئے۔ بلکہ حج ان کیفیات کے حصول کا نام ہے جن کے لئے یہ فریضہ مقرر کیا گیا ہے۔ کھانا بلاشبہ آدمی کو طاقت دیتا ہے۔ مگر کھانا اسی شخص کے لئے طاقت ہے جو اس کو قاعدہ کے مطابق اپنے پیٹ میں ڈالے۔ اگر کوئی شخص اس کو محض دیکھے یا اپنے سر پر الٹ لے تو اس کے لئے انتہائی قیمتی غذا بھی بالکل بے فائدہ ثابت ہوگی۔ اسی طرح حج کا حقیقی فائدہ بھی اس شخص کو ملے گا جو حج کو اس طرح کرے جیسا کہ اس کو کرنا چاہئے۔ حج کی حقیقت کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

الحج اشہر معلومٰت۔ فمن فرض فیھن الحج فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج۔ وما تفعلوا من خیر یعلمہ اللہ۔ وتزودوا فان خیر الزاد التقویٰ واتقون یا اولی الالباب (بقرہ ۱۹۷)

حج کے مہینے معلوم ہیں۔ جو شخص ان میں حج کو اپنے اوپر مقرر کرے تو حج میں نہ فحاشی ہے، نہ بے حکمی اور نہ جھگڑا۔ اور تم جو بھلائی کرو گے، اللہ اس کو جان لے گا۔ اور زاد راہ لے لیا کرو۔ سب سے بہتر زاد راہ تقویٰ ہے۔ اے عقل والو مجھ سے ڈرو۔

رفث کے معنی ہیں فحش کلامی کرنا۔ فسق کا لفظ تقریباً اسی مفہوم میں آتا ہے جس کے لئے اردو میں کہتے ہیں: "اس نے انسانیت کا جامہ اتار پھینکا" جدال کے معنی ہیں ایک دوسرے سے جھگڑا کرنا۔ یہ تینوں الفاظ اس برائی کے لئے استعمال ہوتے ہیں جو عام طور پر زبان سے سرزد ہوتی ہے۔ جب مختلف لوگ اکٹھا ہوتے ہیں تو کوئی ہوس پرست آدمی فحش باتیں کر کے سنجیدہ ماحول کو بگاڑ دیتا ہے۔ کبھی کوئی عام عادت کے خلاف بات پیش آتی ہے اور آدمی اپنا ظاہری لبادہ اتار کر ناحق باتیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کبھی کسی سے کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے اور آدمی برداشت نہ کرتے ہوئے اس سے جھگڑنے لگتا ہے۔ حج کا اجتماع اسی قسم کی تمام برائیوں سے بچنے کی ایک تربیت ہے۔ ایک ایسا مقام جس سے تقدس اور احترام کی یادیں وابستہ ہیں، وہاں لے جا کر آدمی کو خصوصی طور پر اس کی مشق کرائی جاتی ہے کہ وہ اجتماعی ماحول میں رہتے ہوئے ان برائیوں سے بچنے کی کوشش کرے۔ وہ اپنے آپ کو فواحش اور سطحی دلچسپیوں سے ہٹا کر سنجیدہ چیزوں کی طرف راغب کرے۔ اس کے اندر ہر حال میں حق و صلاح پر قائم رہنے کا مزاج پیدا ہو۔ اجتماعی زندگی میں ناخوش گوار تجربات پیش آنے یا دل کو ٹھیس لگنے کے باوجود اپنے بھائی سے لڑنے نہ کھڑا ہو جائے۔

جب بھی چند آدمی کہیں جمع ہوتے ہیں یا مل کر رہتے ہیں تو ایک کو دوسرے سے کوئی نہ کوئی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی صورت حال حج میں بہت بڑے پیمانہ پر پیش آتی ہے۔ کیوں کہ حج کے موقع پر مختلف قسم کے لوگ بہت بڑی تعداد میں ایک مقام پر اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حج کے دوران بار بار ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچتی ہے۔ اب اگر لوگ ذاتی شکایتوں کی بنا پر ایک دوسرے سے لڑنے لگیں تو عبادت کی فضا ختم ہو جائے اور حج کا مقصد حاصل نہ ہو سکے۔ اس لئے حج کے زمانہ میں جھگڑنے اور غصہ کرنے کو مطلق حرام قرار دے دیا گیا۔ اس طرح حج کو ایک بہت بڑی چیز کے لئے تربیت کا ذریعہ بنا دیا گیا۔ کیوں کہ لڑائی جھگڑا جس طرح حج کو باطل کر دیتا ہے اسی طرح وہ ایک مسلمان کی عام زندگی کو بھی اسلام سے دور کر دیتا ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی ظاہری چیز کو تقویٰ کی علامت سمجھ لیتا ہے اور اس کو اختیار کر کے سمجھتا ہے کہ اس نے متقیانہ زندگی حاصل کر لی۔ حالاں کہ اصل حقیقت کے اعتبار سے اس کا دل تقویٰ سے بالکل خالی ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ سمجھا کہ حج کے سفر میں زاد راہ نہ رکھنا تقویٰ کی علامت ہے۔ وہ اس کا خوب اہتمام کرنے لگے۔ مگر زاد راہ کا تعلق ضرورت سے ہے نہ کہ تقویٰ سے۔ اس قسم کی چیزوں میں آدمی کو اپنی ضرورت کے اعتبار سے تیاری کرنا چاہئے۔ مگر تقویٰ اس سے بالکل الگ چیز ہے۔ اس کا تعلق دل سے ہے۔ اللہ کے یہاں کوئی شخص محض اس لئے مقبول نہیں ہو جاتا کہ اس نے خواہ مخواہ زاد راہ کے بغیر سفر کیا اور اپنے جسم کو غیر ضروری مشقت میں ڈالا۔ اللہ کو دل کا تقویٰ مطلوب ہے۔ حج کے سفر کو تقویٰ کا زاد راہ فراہم کرنے کا ذریعہ ہونا چاہئے، کیونکہ یہی وہ زاد راہ ہے جو آخرت کے سفر میں آدمی کے کام آئے گا —— حج کے مسافر اور اسی طرح زندگی کے مسافر کے لئے بہترین عقلمندی یہ ہے کہ وہ شہوانی باتوں سے بچے، وہ اللہ کی ناپسندیدہ حرکتوں اور لڑائی جھگڑے کی چیزوں سے اپنے آپ کو دور رکھے۔

عقل کی آنکھ سے

خطیب بغدادی نے اپنی کتاب "تاریخ بغداد" میں قاضی ابو یوسف کے تذکرہ کے ذیل میں لکھا ہے۔ علی بن جعد کہتے ہیں کہ امام ابو یوسف نے مجھ کو بتایا۔ میرے باپ ابراہیم بن حبیب کا انتقال ہوگیا۔ میری ماں نے مجھے ایک دھوبی کے یہاں خدمت کے لئے رکھ دیا۔ میں اکثر دھوبی کو چھوڑ کر امام ابو حنیفہ کے حلقہ درس میں چلا جاتا اور وہاں حدیث اور فقہ کا علم حاصل کرتا۔ میری ماں کو معلوم ہوتا تو وہ آتی اور میرا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ دھوبی کے یہاں پہنچا دیتی۔ جب ایسا قصہ بار بار ہونے لگا تو میری ماں پر شاق گزرا اس نے امام ابو حنیفہ سے کہا: اس لڑکے کا بگاڑ صرف تم ہو۔ یہ ایک یتیم لڑکا ہے۔ اس کے پاس کچھ نہیں۔ میں چرخہ کات کر اس کو کھلاتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ وہ بھی کچھ کمانے لگے۔ امام ابو حنیفہ نے میری ماں سے کہا: وہ پستہ کا فالودہ کھانے والا علم حاصل کر رہا ہے۔ میری ماں یہ کہتی ہوئی واپس چلی گئی: معلوم ہوتا ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے تمھاری عقل جاتی رہی ہے۔

امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ نے میری مالی مدد کی اور میں ان کے حلقہ درس سے برابر علم حاصل کرتا رہا۔ یہاں تک کہ میں اس قابل ہوگیا کہ عباسی حکومت نے مجھ کو قاضی کے عہدہ پر مقرر کیا۔ اب میں خلیفہ ہارون رشید کی مجلس میں بیٹھنے لگا۔ میں اس کے دسترخوان پر کھانا کھاتا۔ ایک روز دسترخوان پر ہارون رشید کے لئے فالودہ آیا۔ ہارون رشید نے کہا اس کو کھاؤ۔ میں نے پوچھا: اے امیرالمومنین یہ کیا چیز ہے۔ ہارون رشید نے کہا: یہ پستہ کا فالودہ ہے۔ یہ سن کر مجھ کو ہنسی آگئی۔ ہارون رشید نے پوچھا کہ تم کیوں ہنسے۔ پھر میں نے مذکورہ قصہ شروع سے آخر تک بتایا۔ ہارون رشید یہ سن کر اچنبھے میں پڑ گیا۔ اس نے کہا: میری زندگی کی قسم، علم آدمی کو بلند کرتا ہے اور دین اور دنیا میں اس کو نفع دیتا ہے۔ اللہ ابو حنیفہ پر رحم کرے، وہ اپنی عقل کی آنکھ سے وہ چیز دیکھ لیتے تھے جس کو وہ اپنے سر کی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے تھے (کان ینظر بعین عقلہ مالا یراہ بعین راسہ)۔

انسان کے چہرہ پر اللہ نے دو خوبصورت آنکھیں دی ہیں جن سے وہ تمام چیزوں کو دیکھتا ہے۔ مگر ان آنکھوں سے جو کچھ نظر آتا ہے وہ صرف ظاہری چیزیں ہیں۔ زیادہ گہری اور زیادہ بامعنی چیزیں دیکھنے کے لئے ایک اور آنکھ کی ضرورت ہے۔ یہ بصیرت یا عقل کی آنکھ ہے۔ جو شخص صرف سر کی آنکھ رکھتا ہو اس کا دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص مشین کے اوپر کا ڈھکن دیکھے مگر اندر کے کل پرزوں سے بے خبر رہے۔ ایسا دیکھنا، نہ دیکھنے سے بس برائے نام ہی مختلف ہے۔ بڑھیا کی ظاہری آنکھ نوجوان کا مستقبل صرف دھوبی کے خدمت گار کی صورت میں دیکھتی تھی مگر اسی نوجوان کو جب ایک عقل کی آنکھ والے نے دیکھا تو وہ اس کو بادشاہ کے دسترخوان پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔

عقل کی آنکھ آدمی کو کس طرح حاصل ہوتی ہے، اس کا ایک ہی جواب ہے۔ یہ صلاحیت آدمی کے اندر اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ وہ سر کی آنکھ سے نظر آنے والی چیزوں سے اوپر اٹھ جائے۔ معنوی حقیقتیں ظاہری حقیقتوں سے پرے ہیں۔ اس لئے معنوی حقیقتوں کو وہی شخص پاتا ہے جو ظاہری حقیقتوں سے گزر جائے —— سامنے کی چیزوں سے نظر ہٹانے کے بعد ہی دور کی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح گہری باتوں کو آدمی اس وقت پاتا ہے جب کہ وہ اوپری باتوں سے بلند ہو جائے۔ چیزوں کے ظاہری روپ میں گم رہنے والا کبھی چیزوں کو ان کے اندرونی روپ میں نہیں دیکھ سکتا۔

● صلاحیتیں جو سیاست کی نذر ہو گئیں

مولانا شبلی نعمانی کی کوششوں سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی پہلی عمارت بنی تو مولانا شبلی نے ۱۹۱۲ میں ایک بڑا جلسہ کیا اور اس کی صدارت کے لئے سید رشید رضا مصری کو بلایا۔ رشید رضا نے اس موقع پر ایک مفصل تقریر کی جو ڈھائی گھنٹہ تک جاری رہی۔ تقریر کے ترجمہ کے لئے پہلے سے کسی کو تیار نہیں کیا گیا تھا۔ آخر میں مولانا شبلی نے کھڑے ہو کر کہا "کون اس تقریر کا اردو ترجمہ کرے گا" مولانا ابوالکلام آزاد اس وقت ڈائس پر موجود تھے۔ انھوں نے ہاتھ اٹھایا۔ مولانا شبلی نے یہ خدمت ان کے سپرد کی۔ مولانا آزاد نے ڈھائی گھنٹہ کی اس عربی تقریر کا ترجمہ ڈھائی گھنٹہ میں کیا۔ ان کے حافظہ نے ٹیپ ریکارڈ کی طرح پوری تقریر کو محفوظ کر لیا تھا اور انھوں نے مسلسل اس کو اپنی زبان میں بیان کر دیا۔

● آخرت کے بجائے سیاست

مولانا عبید اللہ سندھی (۱۹۴۴ – ۱۸۷۲) ضلع سیالکوٹ کے ایک سکھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک اردو مڈل اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ ان کو ایک اردو کتاب پڑھنے کو ملی۔ یہ مولانا محمد لکھنوی کی احوال الآخرت تھی۔ اس کتاب نے ان کے ذہن پر ایسا اثر ڈالا کہ انھوں نے بار بار اس کا مطالعہ کیا اور بالآخر ۱۸۸۷ میں اسلام قبول کر لیا۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ وہ شخص جس کو آخرت کے احوال نے اسلام کی طرف کھینچا تھا، وہ اپنی تمام عمر لوگوں کو سیاست کے احوال بتانے میں مشغول رہا۔ یہاں تک بہتر سال کی عمر میں اس دنیا سے چلا گیا۔

● غیر پختہ نوجوان ان کی تحریک کا سرمایہ تھے

انیسویں صدی کے ترکی میں خلافت عثمانیہ کے خلاف جن لوگوں نے سیکولر قومی تحریک چلائی، وہ بعد کو انجمن اتحاد و ترقی کی صورت میں منظم ہو گئے۔ کمال اتاترک (۱۹۳۸ – ۱۸۸۱) اس کے لیڈر تھے۔ خالدہ ادیب خانم اس انجمن کے ارکان پر تبصرہ کرتی ہوئی لکھتی ہیں:

> "اتحاد و ترقی کے نوجوان ترک چھوٹے درجہ کے سرکاری ملازم یا فوجی افسر تھے۔ ابتدا میں ان میں ایک شخص بھی نہ تھا جو اعلیٰ قابلیت رکھتا ہو اور تحلیل و تنقید سے کام لے کر پرانے اور نئے زمانہ کے فرق کو سمجھ سکے۔ مگر یہ لوگ جمہور سے زیادہ قریب تھے اور خالص دیسی پیداوار تھے۔ ان میں زیادہ تعداد مقدونیہ کے باشندوں کی تھی جو واقعیت پسندی اور بے رحمی میں مشہور ہیں اور اپنے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر گزرتے ہیں" (ترکی میں مشرق و مغرب کی کش مکش)

خالدہ ادیب خانم نے جو بات ترکی کے بارے میں لکھی ہے، وہی موجودہ زمانہ کی اکثر مسلم تحریکوں پر صادق آتی ہے۔

جب موت ہر چیز کو باطل کر دے گی

وہ وقت کیسا عجیب ہوگا جب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عمل کے نام پر دنیا میں وہ جو کچھ کرتے رہے وہ بے عملی کی بدترین شکل تھی لوگ دنیا میں اپنے آپ کو اوپر اٹھا کر فخر کرتے رہے حالاں کہ ان کے لئے قابل فخر بات یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے حکم کے آگے جھکا دیں۔ وہ اپنی غلطیوں کی توجیہہ دتادیل کو کامیابی سمجھتے رہے حالاں کہ ان کی کامیابی یہ تھی کہ وہ اپنی غلطیوں کا کھلے دل سے اعتراف کرلیں۔ ان کو الفاظ اس لئے دئے گئے تھے کہ ان کو اللہ کی تعریف میں استعمال کریں۔ مگر وہ اپنے الفاظ کے ذخیرہ کو انسان کی تعریف میں خرچ کرتے رہے۔ ان کے اندر خوف ومحبت کے نازک جذبات اس لئے رکھے گئے تھے کہ وہ ان کو خدا کے لئے وقف کردیں۔ مگر وہ دوسری چیزوں کو اپنے خوف ومحبت کے جذبات کا مرکز بناتے رہے۔ انھوں نے مال جمع کرنے کو سب سے بڑی چیز سمجھا حالاں کہ ان کے لئے سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ وہ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں دے کر بے مال ہو جائیں۔ ان کا اصل کمال یہ تھا کہ وہ کمزوروں کا لحاظ کریں مگر وہ کمزوروں کو نظر انداز کر کے طاقت وروں کا استقبال کرتے رہے۔ ان کے لئے زیادہ بہتر یہ تھا کہ معانی کے خاموش سمندر میں غوطہ لگائیں مگر وہ شور وغل کے ہنگامے کھڑے کرنے میں مشغول رہے۔ ان کی ترقی کا راز یہ تھا کہ وہ اپنی ذات کا احتساب کرنے والے بنیں مگر وہ دوسروں کا احتساب کرنے میں مصروف رہے۔ ان سے یہ مطلوب تھا کہ دنیا کا مال یا دنیا کی عزت پائیں تو اس کو بے حقیقت سمجھیں اور اس سے بے رغبتی کا ثبوت دیں مگر اسی کو وہ سب سے بڑی چیز سمجھ بیٹھے۔

آج کی دنیا میں لوگ دوسروں کے ظلم کا اعلان کرنے کے بہادر بنے ہوئے ہیں، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ اصل بہادری یہ تھی کہ وہ خود اپنے ظلم کو جاننے کے بہادر بنیں۔ لوگ کسی نہ کسی غیر خدا کا دامن تھام کر سمجھ رہے ہیں کہ انھوں نے اپنے لئے مضبوط پناہ حاصل کرلی، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ خدا کے سوا کوئی نہ تھا جو کسی کے لئے پناہ بن سکے۔ لوگ الفاظ بول کر اپنے کو بری الذمہ سمجھ رہے ہیں۔ اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ یہ صرف حقائق تھے جو کسی کو بری الذمہ کر سکتے تھے۔ لوگ دنیا کے اسباب کو اکھٹا کر کے مطمئن ہیں کہ جو کچھ ان کو پانا تھا وہ انھوں نے پالیا، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب موت ان کی ہر چیز کو باطل کر دے گی اور ان کو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کچھ بھی نہیں پایا تھا۔ لوگ دوسروں کی غلطیوں کی فہرست مرتب کر رہے ہیں، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب فرشتے خود ان کی غلطیوں کی فہرست ان کے سامنے پیش کریں گے۔ لوگ زندگی کو اصل مسئلہ سمجھے ہوئے ہیں۔ اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ ان کا اصل مسئلہ موت تھا نہ کہ دنیا کی چند روزہ زندگی۔ لوگ اپنے خود ساختہ معیار کے مطابق پاکر اپنے کو برحق سمجھ رہے ہیں، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ حق پر صرف وہ تھا جو اللہ کے مقرر کئے ہوئے معیار کے مطابق تھا۔ لوگ استقبال کرنے والوں کی بھیڑ پاکر اپنے کو خوش قسمت سمجھ رہے ہیں، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ خوش قسمت صرف وہ تھا جس کے استقبال کے لئے اللہ اور اس کے فرشتے اس کا انتظار کر رہے تھے ——— ہر آدمی نے اپنی خوش خیالیوں کی ایک دنیا بنا رکھی ہے اور اپنے آپ کو اس کے اندر پاکر مطمئن ہے۔ مگر قیامت ایسے تمام گھروندوں کو توڑ دے گی۔ اس وقت صرف وہ شخص محفوظ ہوگا جو خدا کے "گھر" میں پناہ پکڑے ہوئے تھا، جس نے اپنے لئے خدا کا سایہ حاصل کر لیا تھا۔

نماز کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ وقت وقت پر مقرر کی گئی ہے۔ دنیا میں بار بار اوقات بدلتے ہیں اور اسی کے لحاظ سے
می اپنے کاموں کا نظام بناتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی وقت کی ہر تبدیلی کے ساتھ اپنے خالق اور مالک کے آگے جھک کر اس
ت کا اقرار کرے کہ وہ یہاں سرکش بن کر نہیں رہے گا بلکہ جھکی ہوئی زندگی گزارے گا۔ صبح کو آدمی جب سو کر اٹھتا ہے اور رات کو
ب وہ سونے کے لئے بستر پر جاتا ہے۔ اسی طرح سورج جب ڈھلتا ہے اور جب وہ غروب ہوتا ہے۔ ان تمام لمحات کو پانچ وقتوں میں
نٹ دیا گیا ہے اور حکم ہے کہ اس کے مطابق رات دن میں پانچ بار اپنے رب کے سامنے مخصوص آداب کے ساتھ حاضری دو۔ یہ
زعمر بھر کے لئے فرض ہے۔ آدمی پر جب موت آئے تو اس حال میں آئے کہ وہ اپنے رب کے آگے اپنے آپ کو ڈالے ہوئے ہو۔

نماز کے لئے وضو کی شرط اس بات کا سبق ہے کہ آدمی کو اس طرح رہنا چاہئے کہ اس کی زندگی خدا کی نافرمانیوں سے پاک
۔ اس نے اپنے گناہوں کو توبہ کے آنسوؤں سے دھوڈالا ہو۔ مسجد میں نماز ادا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آدمی اپنے دنیوی مشاغل سے
ل ہو کر کچھ دیر کے لئے اپنے کو اللہ کی طرف یکسو کرے۔ وہ اپنے ماحول کو چھوڑ کر خدا کی دنیا میں داخل ہو جائے۔ نماز میں ایک ہی قبلہ
طرف تمام لوگوں کا رخ کرنا اور ایک امام کے تحت مل کر نماز ادا کرنا اتحاد کی تربیت ہے۔ نماز مسلمانوں کو یہ سکھاتی ہے کہ وہ اپنا
ب سربراہ بنالیں اور اس کی ماتحتی میں متحد اور منظم ہو کر زندگی گزاریں۔

نماز اللہ کی یاد ہے۔ اللہ کی یاد اپنے محسن اور آقا کی یاد ہے جو خوف اور محبت کے جذبات کے ساتھ برابر جاری رہتی ہے۔ آدمی
جب یہ یاد طاری ہوتی ہے تو وہ رکوع اور سجدہ کی صورت میں اللہ کے سامنے گر پڑتا ہے۔ وہ سراپا عجز بن کر اس کے سامنے کھڑا
و جاتا ہے۔ وہ ہمہ تن پستی کی تصویر بن جاتا ہے۔ جب آدمی اس طرح نماز ادا کرتا ہے تو نماز اس کے اوپر ایک قسم کی چوکیدار بن جاتی
ے۔ جب اس کا نفس برائی یا سرکشی کی طرف مائل ہوتا ہے تو اس کو فوراً خیال آجاتا ہے کہ اللہ کے سامنے میں نے اطاعت کا جو اقرار کیا
ے یہ رویہ اس کے خلاف ہے۔ نماز اس کو ہر برے کام سے روکنے والی بن جاتی ہے۔

جب آدمی کے دل میں اللہ کا ڈر سما جاتا ہے اور اس کو اللہ کی رحمت و مغفرت کا شوق لگ جاتا ہے تو اس کی نماز کوئی
می چیز نہیں رہتی بلکہ روح اور کیفیت سے بھری ہوئی ایک چیز بن جاتی ہے۔ نماز کے ذریعہ جب وہ روزانہ خدا کی یاد کے سمندر میں نہاتا
ے تو نماز کی روح اس کے وجود پر چھا جاتی ہے۔ اس کا چہرہ اللہ کے آگے جھکنے والے کا چہرہ بن جاتا ہے۔ نماز اس کی پہچان بن جاتی ہے۔
ماز اس کے چہرہ پر سنجیدگی، خاموشی، احتیاط، محبت خدا اور فکر آخرت کا رنگ پھیر دیتی ہے۔ اس کو دیکھتے ہی آدمی کہہ اٹھتا ہے کہ یہ ایک
ماز ی کا چہرہ ہے، یہ اللہ کے رنگ میں رنگ جانے والا انسان ہے۔

نماز میں جب یہ خصوصیات پیدا ہو جائیں تو وہ ایک زندہ اور پرکیف چیز بن جاتی ہے۔ وہ اللہ سے نزدیکی کے ہم معنی ہوتی ہے
ماز میں مشغول ہو کر وہ اپنے رب کی قربت کا تجربہ کرتا ہے۔ وہ اس سے عرضداشت کرتا ہے۔ اپنے کو نماز کی حالت میں لے جا کر اللہ سے
مدد طلب کرتا ہے۔ نماز اس کی زندگی کا لازمی حصہ بن جاتی ہے۔ نماز اس کے لئے سادہ معنوں میں صرف نماز نہیں ہوتی بلکہ مالک
کائنات سے ملاقات کے ہم معنی ہوتی ہے۔ نماز اس کے لئے ایسی محبوب چیز بن جاتی ہے جس کی وہ حفاظت کرے جس کو وہ اپنی تنہائیوں کا
ساتھی بنالے ـــــ نماز اگر زندگی سے الگ ہو تو وہ محض ایک بے روح رسم ہے۔ نماز اگر زندگی کے ساتھ شامل ہو تو وہ ایک غذا
ہے جس پر آدمی جیتا ہے، وہ ایک روشنی ہے جس کی رہنمائی میں آدمی اپنا سفر حیات طے کرتا ہے

لوگ لاؤڈ اسپیکر پر الفاظ کا طوفان برپا کرکے وعظ و اصلاح کا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ حالاں کہ وعظ و اصلاح کا کارنامہ انجام دینے والے وہ ہیں جن کے درد اور تڑپ نے ان سے ان کے الفاظ چھین لئے ہوں۔

لوگ "شہرت چوک" پر مظاہرہ کرکے ملت کا دردمند ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔ حالاں کہ ملت کی دردمندی ظاہر ہونے کے مقامات وہ ہیں جہاں نہ شہرت ہوتی ہے اور نہ چوک۔

لوگ اشعار اور تخیلات کی دنیا میں آسمان و زمین کو زیر و زبر کرنے میں مصروف ہیں۔ حالاں کہ یہاں کوئی نتیجہ صرف اس کے حصہ میں آتا ہے جو عمل اور حقیقت کی دنیا میں اپنی اہلیت کا ثبوت دے۔

لوگ شور و غل مچا کر اسلام کی حسین دنیا بنانا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ شور و غل سے صرف غل بستان اور حمارستان وجود میں آتے ہیں نہ کہ اسلامستان۔

لوگ خوش فہمی کی کمند کیوں سے جنت کا ٹکٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ جنت کسی کو حقیقی عمل سے ملتی ہے نہ کہ خوش فہمیوں اور خوش عقیدگیوں سے۔

لوگ منقش چھتوں کے نیچے قنوت نازلہ پڑھ کر خدا کی نصرت کو اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ خدا کی نصرت ان لوگوں کی طرف آتی ہے جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنے آپ کو چھتوں اور دیواروں سے محروم کر لیا ہو۔

لوگ عزت اور مفاد کے مواقع پر کمالات دکھا کر اپنے اسلام کا ثبوت دے رہے ہیں۔ حالاں کہ اللہ کو جہاں لوگوں کے اسلام کا ثبوت درکار ہے وہ مواقع وہ ہیں جہاں سب کچھ کرکے بھی کوئی عزت اور ترقی حاصل نہیں ہوتی۔

لوگ کچھ الفاظ پاکر مطمئن ہیں کہ انھوں نے خدا کے سامنے اپنی برأت کا سامان کر لیا ہے۔ حالاں کہ خدا کے یہاں جو چیز کسی کے کام آنے کی وہ حقائق ہیں نہ کہ الفاظ۔

لوگ اپنے پڑوسی اور اپنے صاحب معاملہ افراد کو ستاتے ہیں اور اس کے باہر باہر خدا پرستی کا مظاہرہ کرکے سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کے نیک بندے ہو گئے۔ حالاں کہ خدا کا نیک بندہ وہ ہے جو اپنے پڑوسی اور اپنے صاحب معاملہ افراد کو شکایت کا موقع نہ دیتا ہو۔

لوگ غیر خدا کے ساتھ اپنی عقیدتیں وابستہ کرتے ہیں، اپنے جیسے انسان کا دامن تھامتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے خدا سے اپنی عقیدتیں وابستہ کر رکھی ہیں، انھوں نے دونوں جہان کے مالک کا دامن تھام رکھا ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ ٹھنڈے ٹھنڈے سفر کرتے ہوئے خدا کی رحمتوں کے سایہ میں پہنچ جائیں گے۔ حالاں کہ خدا کا اعلان ہے کہ وہ اپنی رحمتوں کے سایہ میں صرف ان کو لیتا ہے جو ہلا دینے والے مواقع پر اس کی جانچ میں پورے اترے ہوں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں ان کی کامیابیاں آخرت میں بھی ان کو کامیاب کر دیں گی۔ حالاں کہ آخرت کا معاملہ بالکل الگ معاملہ ہے۔ آخرت کا فیصلہ خدا کے اٹل قانون کی بنیاد پر ہوگا نہ کہ لوگوں کے اپنے خیالات اور مزعومات کی بنیاد پر۔

لوگ سستی اور بے ضرر چیزوں میں اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ وہ آخرت سے ڈرتے ہیں۔ حالاں کہ آخرت سے ڈرنے کا ثبوت دینے کے مواقع وہ ہیں جہاں آخرت کی خاطر اپنے وقار کو مٹی میں ملا دینا ہو، جہاں اپنے مفاد کو قربان کرکے آخرت کی طرف بڑھنا ہو، جہاں اپنی تمناؤں کے محل کو خود اپنے ہاتھ سے ڈھا دینا پڑے۔

اعتراف کی اہمیت

باکسنگ کے چیمپین محمد علی اپنے کو "سب سے بڑا" کہتے رہے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ اس موقع پر ۲۵ جنوری ۱۹۸۰ کو نئی دہلی کی پریس کانفرنس میں ان سے پوچھا گیا کہ آپ اپنے کو سب سے بڑا کیوں کہتے ہیں۔ محمد علی نے نرم اور متواضع لہجہ میں جواب دیا: میں سب سے بڑا نہیں، سب سے بڑا تو صرف خدا ہے (Only God is the greatest) انھوں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس قسم کی بات میں صرف پبلسٹی مہم کے ذیل میں کہتا رہا ہوں تاکہ مقابلہ کے وقت میرا کھیل دیکھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ آدمی جمع ہوں۔ سفید فام امریکہ میں ایک کالا آدمی اس قسم کا بھڑکانے والا بیان (Provocatvie Statement) دے تو وہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مائل کرنے میں بہت کامیاب ہوتا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۲۶ جنوری ۱۹۸۰)

آدمی اکثر ایسا کرتا ہے کہ وقتی مصلحت کی خاطر وہ کسی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ تاہم ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ آدمی اپنی اس نفسیات سے باخبر ہو۔ اور اس سے بھی کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بعد کو اس کا اعتراف کرے۔ محمد علی اگر اس بات کا اعلان نہ کرتے تو ہو سکتا ہے کہ ان کے معتقدین بعد کو یہ سمجھنے لگتے کہ محمد علی فی الواقع کوئی فوق البشر تھے یا ان کے اندر خدا حلول کر آیا تھا۔ مگر اپنی زبان سے کھلا ہوا اعلان کر کے انھوں نے ہمیشہ کے لئے اپنے معتقدین کو اس فتنہ سے بچالیا۔ اسی سے ملتی جلتی صورت موجودہ زمانہ میں مسلم قائدین کے یہاں بھی پیش آئی ہے۔ مگر ہمارے قائدین میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے اس صاف گوئی کی مثال پیش کی ہو۔

مثلاً موجودہ زمانہ میں کچھ لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اسلام کو سیاسی نظام کی حیثیت سے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ دین کے معنی وہی ہیں جو اسٹیٹ کے ہیں اور خدا کے پیغمبر جو دنیا میں آئے اسی لئے آئے کہ خدائی قانون کی بنیاد پر ایک مکمل اسٹیٹ قائم کردیں۔ یہ بات ایسی ہے جس کے لئے قرآن و سنت میں کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔ تاہم ایک خاص وقت میں مسلمانوں کو ابھارنے کے لئے وہ بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ اس سے ان کے اندر انقلاب کا مزاج پیدا ہوا۔ وہ مدافعانہ نقطۂ نظر سے سوچنے کے بجائے اقدامی نقطۂ نظر سے سوچنے لگے۔ جو لوگ اس فکر سے متاثر ہوئے وہ اگرچہ سیاسی ذوق کے تحت اسلام کی طرف مائل ہوئے تاہم کچھ اندرونی فطرت کا زور اور کچھ اسلامی روایات کے اثر سے ان میں اسلام کے دوسرے اوصاف بھی کسی نہ کسی درجہ میں پیدا ہوگئے۔ مگر اسلام کی یہ تشریح مطلق طور پر درست نہ تھی۔ محفوظ ترین بات جو اس کے بارے میں کہی جا سکتی ہے وہ کہ یہ وقتی حالات کے تحت اسلام کے بعض پہلوؤں کو شدت کے ساتھ بیان کرنا تھا۔ اس نظریہ کو پیش کرنے والے لوگ اگر بعد کو اس طرح کا اعلان کر دیتے تو اس سے کوئی خاص خرابی پیدا نہ ہوتی۔ مگر انھوں نے اس قسم کا اعلان نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے معتقدین نہ صرف یہ کہ اس کو مطلق تشریح دین سمجھ بیٹھے بلکہ اس کے بعد دوسری دوسری خرابیاں ان میں پیدا ہونا شروع ہوگئیں۔ مثلاً اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان سیاسی طریقوں کو جائز سمجھ لینا جن کی کوئی گنجائش اسلام میں نہیں ہے۔ جب اسلام کا تصور ایک سیاسی نظام کا تصور ہو تو اس کو بروئے کار لانے کے لئے سیاسی طریقے اختیار کرنا کیوں ناجائز قرار پائے۔

ایک اپیل

اسلامی مرکز ایک خالص تعمیری اور دعوتی ادارہ ہے۔ اس کی تجویز اولاً ہفت روزہ الجمعیۃ ۲۷ نومبر ۱۹۷۰ میں پیش کی گئی تھی۔ اس کے بعد متعدد عرب جرائد نے اس پر مفصل تعارفی مضامین شائع کئے (مثلاً الاسبوع الثقافی، طرابلس ۸ اکتوبر ۱۹۷۶، المختار الاسلامی، قاہرہ نومبر ۱۹۷۹) بیروت اور قاہرہ سے "نحو بعث اسلامی" کے نام سے ۳۲ صفحات پر مشتمل عربی زبان میں ایک تعارفی کتابچہ چھپا جو اب تک سات بار شائع ہو چکا ہے اور عالم اسلام میں پھیلا ہے۔ ۱۹۷۶ میں ایک باقاعدہ رجسٹرڈ ادارہ کی حیثیت سے اسلامی مرکز کا قیام عمل میں آیا

الرسالہ اسی اسلامی مرکز کا ترجمان ہے۔ اس کا پہلا شمارہ اکتوبر ۱۹۷۶ میں نکلا تھا۔ اس مدت میں اللہ نے اس کو غیر معمولی مقبولیت عطا فرمائی۔ اب الرسالہ محض ایک پرچہ نہیں، اب وہ ایک تحریک بن چکا ہے۔ الرسالہ آج نہ صرف ہندستان کے مختلف حصوں میں مسلسل پڑھا جا رہا ہے بلکہ ہندستان کے علاوہ ڈیڑھ درجن بیرونی ملکوں میں بھی اس کی آواز پہنچ رہی ہے۔ عربی زبان میں بھی اس کے مضامین ترجمہ ہو کر شائع ہو رہے ہیں۔

اسلامی مرکز کی یہ تحریک، الرسالہ اور اس کی مختلف مطبوعات کے ذریعہ، اب ایسے مرحلہ میں پہنچ چکی ہے کہ وقت آگیا ہے کہ اس کو مزید مستحکم اور منظم بنایا جائے اور اسلامی مرکز کے بقیہ منصوبے زیر عمل لائے جائیں۔ اس نئے مرحلہ کے آغاز کے لئے ہم کو سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایک عمارت ہے۔ دہلی میں اسلامی مرکز کی اپنی عمارت ہو جائے تو یہ تحریک زیادہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہو جائے گی اور اس مشن کے تحت دوسرے عملی پروگرام شروع کرنا بھی ممکن ہو جائے گا۔

الرسالہ کے ایک ہمدرد نے دہلی میں اس مقصد کے لئے ایک زمین دینے کی پیش کش کی ہے۔ یہاں تعمیرات کرکے اسلامی مرکز کی اپنی عمارت قائم کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ایک "تعمیر فنڈ" کھول رہے ہیں اور الرسالہ کے مشن سے دلچسپی رکھنے والوں سے تعاون کی اپیل کر رہے ہیں۔ اس فنڈ میں ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق حصہ لے سکتا ہے۔

اسلامی مرکز، دفتر الرسالہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶ (انڈیا)

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیار اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت —— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔

دوسری صورت —— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

REGD. R. N. NO 28822/76
REGD D (D) NO. 532

April 1980
Issue No. 41

AL-RISALA MONTHLY
JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 110006 INDIA PHONE 262331

سرپرست
مولانا وحید الدین خان

مئی ۱۹۸۰
شمارہ ۴۲

[ا]ے بلڈنگ ، قاسم جان اسٹریٹ ، دھلی ٦ انڈیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ اعلانِ آخرت کا مشن ہے

[الرسا]لہ کا مقصد کیا ہے ـــــ یہ بتانا کہ اے لوگو! تم بہت جلد مرنے والے ہو۔ اس کے بعد دو انتہائی [...]وں میں سے کوئی ایک انجام تمھارے سامنے ہوگا: یا جنت یا جہنم۔ اس سنگین حقیقت کو سمجھ کر دنیا میں رہو، [او]ر یہ سمجھ کر کرو کہ تمھارا عمل تم کو یا تو آگ کی طرف لے جا رہا ہے یا باغوں والی زندگی کی طرف۔ الرسالہ [اد]ارہ نہ اعلانِ برکت کے لئے قائم کیا گیا ہے اور نہ اعلانِ سیاست کے لئے۔ اس کا مقصد نہ اعلانِ ملت ہے [نہ] اعلانِ انسانیت۔ اس کو نہ اعلانِ شخصیت سے دل چسپی ہے اور نہ اعلانِ قومیت سے۔ الرسالہ کا مقصد [...]ب ہے اور وہ آخرت کے آنے والے دن سے لوگوں کو باخبر کرنا ہے۔

آخرت کا اعلان وہ مقصد ہے جس کے لئے پیغمبر دنیا میں بھیجے گئے۔ الرسالہ کے ساتھ تعاون کرنا [پیغم]برانہ مشن کے ساتھ تعاون کرنا ہے۔ الرسالہ کے ساتھ تعاون کیجئے۔ موجودہ زمانہ میں پیغمبرانہ مشن کو زندہ کیجئے۔

الرسالہ کا ٹیلیفون نمبر بدل گیا ہے نیا نمبر یہ ہے 232231

کامیابی پندرہ سال میں

ایک صاحب ایک بیٹری کے کارخانہ میں معمولی ملازم تھے۔ وہاں انھوں نے بیٹری کے کاروبار کے تمام "گر" سیکھ لئے اور اس کے بعد اپنا الگ کام کرلیا۔ انھوں نے پانچ ہزار روپے سے اپنا کام شروع کیا تھا۔ مسلسل محنت کے تقریباً پندرہ سال گزارنے کے بعد ان کا بہت بڑا کارخانہ ہوگیا۔ ایک روز اپنے دوستوں سے اپنی کہانی بتاتے ہوئے انھوں نے کہا ——
جس طرح بچہ پندرہ سال میں جوان ہوتا ہے اسی طرح بزنس بھی پندرہ سال میں جوان ہوتا ہے۔ میں اپنی موجودہ حالت تک ایک دن میں نہیں پہنچ گیا۔ یہاں تک پہنچنے میں مجھ کو پندرہ سال لگ گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر کام "پندرہ سال" ہی میں پورا ہوتا ہے، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ خواہ وہ کوئی کاروبار ہو یا ملّی خدمت ہو۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا بھی کوئی نسخہ ہوسکتا ہے کہ جو فوراً کامیاب کردے وہ خوش خیالیوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ "ایک چھلانگ لگاؤ اور منزل تک پہنچ جاؤ" قواعد کے لحاظ سے ایک صحیح جملہ ہے۔ مگر زندگی کی حقیقتوں کے اعتبار سے یہ بے معنی الفاظ کا ایک مجموعہ ہے جس کی واقعات کی دنیا میں کوئی قیمت نہیں۔ گلائن کننگھم (Gleun Cunningham) وہ شخص ہے جو ایک میل کی دوڑ کا چیمپئن بنا۔ وہ جس اسکول میں پڑھ رہا تھا اس میں آگ لگ گئی۔ وہ آگ کی لپیٹ میں آگیا اس کا پاؤں اس طرح جھلس اٹھا کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگیا۔ ڈاکٹروں کا اتفاق تھا کہ اس کو دوبارہ چلنے اور دوڑنے کے قابل بنانے کے لئے ایک معجزہ کی ضرورت ہے۔ مگر گلائن کننگھم کی معذوری نے اس کے اندر چلنے اور دوڑنے کا ایک نیا شوق ابھار دیا۔ اس کے دل و دماغ کی ساری توجہ اس پر لگ گئی کہ وہ دوبارہ اپنے آپ کو چلنے کے قابل بنائے۔ اس نے طرح طرح کی مشقیں شروع کردیں۔ بالآخر اس کی سمجھ میں ایک تدبیر آئی۔ اس نے چلتے ہوئے ہل کے دستہ سے لٹک کر گھسٹنے کی مشق شروع کردی۔ تدبیر کامیاب رہی۔ جب اس کے پاؤں زمین پر ٹکنے کے قابل ہوگئے تو اس کی ہمت بندھی۔ اب اس نے اپنی مشق اور تیز کردی۔ بالآخر وہ معجزہ رونما ہوکر رہا جس کی ڈاکٹروں نے پیشین گوئی کی تھی۔ وہ باقاعدہ چلنے اور دوڑنے کے قابل ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے ایک مقابلہ میں حصہ لیا اور ایک میل کی دوڑ کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ کر اس کا چیمپئن بن گیا —— مگر گلائن کننگھم کو یہ کامیابی چند دن میں حاصل نہیں ہوئی۔ اس منزل تک پہنچنے میں اس کے "پندرہ سال" لگ گئے۔ پندرہ سالہ جدوجہد کے بعد ہی یہ ممکن ہوسکا کہ وہ دوڑ کا چیمپئن بنے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں "پندرہ سال" کے بغیر کوئی کامیابی ممکن نہیں۔ فی الفور نتائج نکالنے پر جو ہستی سب سے زیادہ قادر ہے وہ اللہ ہے۔ مگر اللہ نے اپنی دنیا کا نظام فی الفور نتائج کی بنیاد پر نہیں بنایا، صرف اس لئے تاکہ انسان کو عبرت ہو اور وہ لاحاصل کوششوں میں اپنا وقت ضائع نہ کرے۔ خدا کی دنیا میں رات دن بے شمار واقعات ہو رہے ہیں۔ مگر سب کچھ حد درجہ محکم قوانین کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ یہاں ایک گھاس بھی ایسی نہیں جو خوش فہمی کی زمین پر کھڑی ہو اور ایک چیونٹی بھی نہیں جو حقائق کو نظر انداز کرکے زندہ ہو، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کے لئے خدا کا قانون بدل جائے۔ کامیابی کی واحد شرط "سعی" ہے۔ یعنی وہ کوشش کرنا جو مطلوبہ مقصد کے لئے قانون الٰہی کے تحت مقدر ہے۔ یہی اصول دنیا کی کامیابی کے لئے ہے اور یہی آخرت کی کامیابی کے لئے۔

سوچنے کی باتیں

جب کوئی شخص دوسرے کو فائدہ پہنچاتا ہے تو وہ صرف اپنے آپ کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص دوسرے کو نقصان پہنچاتا ہے تو وہ صرف اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہوں۔ اور اس سے بھی کم وہ لوگ ہیں جو اس پر عمل کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر سکیں۔

فطرت کے قانون کے مطابق دنیا میں مقام اس کو ملتا ہے جو اپنے آپ کو دوسروں کے لئے نفع بخش ثابت کرے (واما ماینفع الناس فیمکث فی الارض) ایسے کسی گروہ کے لئے خدا کی اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں جس کے پاس دوسروں کے لئے صرف حقوق طلبی کے نعرے ہوں۔ دوسروں کے لئے نفع بخشی اس نے کھو دی ہو۔

اپنی ناکامی کے لئے دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانا گویا فیصلہ کا سرا دوسروں کے ہاتھ میں دینا ہے۔ اس کے برعکس جب آدمی اپنی ناکامی کی ذمہ داری خود قبول کرے تو گویا وہ فیصلہ کا سرا خود اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانے کی صورت میں آدمی کے پاس اس کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مفروضہ دشمن کے خلاف غصہ اور نفرت کا اظہار کرتا رہے جب کہ اپنے آپ کو ذمہ دار قرار دینے کی صورت میں آدمی کی دبی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں، وہ دوبارہ زیادہ صحیح منصوبہ بناتا ہے اور اپنی قوتوں کو بروئے کار لا کر کامیاب ہو جاتا ہے۔

آپ جذباتی ہنگاموں سے وقتی طور پر آسمان سر پر اٹھا سکتے ہیں۔ مگر یاد رکھئے کہ وقتی طوفانوں سے جو گرد اٹھتی ہے، وہ اپنے آغاز میں اگرچہ آسمان پر دکھائی دیتی ہے، مگر اپنے انجام میں اس کو صرف سطح زمین پر جگہ ملتی ہے جہاں انسانی قافلے اس کو اپنے قدموں کے نیچے پامال کرتے رہتے ہیں۔

انڈے کے اندر زندہ بچہ کا وجود یہ معنی رکھتا ہے کہ ایک روز اس کے اوپر کا خول ٹوٹ جائے اور جیتا جاگتا بچہ خول کے باہر آ جائے۔ اسی طرح کوئی انسانی گروہ اگر حقیقۃً زندہ ہے تو ناموافق حالات کبھی اس کا راستہ روک نہیں سکتے۔ اس کی اپنی زندگی اس کو ناموافق حالات کے خول سے نکلنے کی کافی ضمانت ہے۔

کوئی گروہ اپنے کو مظلوم بتائے اور دوسرے کو ظالم قرار دے، اور اسی حال میں اس پر نصف صدی گزر جائے تو یقیناً وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے۔ کیوں کہ خدا کی اس کائنات میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی گروہ کسی کے اوپر نصف صدی تک یک طرفہ ظلم کرتا رہے اور اس کے باوجود مظلوم گروہ کو خدا کی مدد حاصل نہ ہو۔

سورۂ نور کی روشنی میں

غزوہ بنی المصطلق ۶ھ میں ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس غزوہ سے فارغ ہو کر مدینہ واپس آرہے تھے۔ آپ کی زوجہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ساتھ تھیں۔ ان کی سواری کا اونٹ علیحدہ تھا۔ ایک مقام پر قافلہ رکا۔ رات کو کوچ سے پہلے حضرت عائشہ قضائے حاجت کے لیے جنگل کی طرف چلی گئیں۔ وہاں ان کا ہار ٹوٹ کر گر گیا جس کو تلاش کرنے میں دیر لگی، ادھر کوچ کا وقت ہوگیا۔ لوگوں نے سمجھا کہ حضرت عائشہ اپنے ہودج میں ہیں۔ چنانچہ سب اونٹوں کے ساتھ ان کا اونٹ بھی ہانک دیا گیا۔ حضرت عائشہ واپس آئیں تو وہاں کوئی نہ تھا۔ انھوں نے رائے قائم کی کہ مجھ کو یہیں ٹھہرنا چاہئے۔ آگے جا کر جب میں نہ ملوں گی تو لوگ تلاش کرتے ہوئے یہیں آئیں گے۔ اس کے بعد ان کو نیند آئی اور وہ وہیں سو گئیں۔ صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ قافلہ کی خبر گیری کے لئے پیچھے رہا کرتے تھے۔ وہ صبح کو اس مقام پر پہنچے تو دیکھا کہ کوئی سو رہا ہے۔ قریب آکر پہچانا تو گھبراہٹ میں ان کی زبان سے نکلا: انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ سن کر حضرت عائشہ کی آنکھ کھل گئی۔ انھوں نے چادر سے اپنا چہرہ ڈھانک لیا۔ حضرت صفوان نے خاموشی سے اپنا اونٹ ان کے قریب لاکر بٹھا دیا۔ حضرت عائشہ بھی خاموشی کے ساتھ اس پر سوار ہوگئیں۔ اب حضرت صفوان اونٹ کی نکیل پکڑ کر تیزی سے چلنے لگے۔ یہاں تک کہ دوپہر کے وقت قافلہ میں شامل ہوگئے۔ مدینہ میں یہ خبر پھیلی تو کچھ بد باطن لوگوں کو موقع مل گیا کہ وہ زوجۂ رسولؐ پر جھوٹی تہمت لگائیں اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دینی تحریک کو بدنام کریں۔ حتیٰ کہ بعض سیدھے سادے مسلمان بھی اس الزام میں شریک ہوگئے۔ مثلاً حضرت حسان بن ثابت، حضرت مسطح بن اثاثہ اور حضرت حمنہ بنت جحش۔ ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک یہ خبر گرم رہی۔ یہاں تک کہ قرآن میں اس کی تردید نازل ہوئی اور اس کے بارے میں واضح احکام دئے گئے۔ یہاں چند آیتیں نقل کی جاتی ہیں۔

”جو لوگ پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں، پھر اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ نہ لائیں تو ان کو ۸۰ کوڑے مارو اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو۔ یہی لوگ اصلی نافرمان ہیں۔ مگر جو لوگ اس کے بعد توبہ اور اصلاح کرلیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ جو لوگ یہ طوفان لائے ہیں وہ تمھیں میں سے ایک جماعت ہیں۔ تم اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو بلکہ وہ تمھارے لئے بہتر ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے جو گناہ کمایا وہ اس کے لئے ہے اور جس نے اس کا بڑا بوجھ اٹھایا اس کے لئے بڑا عذاب ہے۔ ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ بات سنی تو مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کی بابت نیک گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ ایک کھلا ہوا بہتان ہے۔ وہ اپنے الزام کو ثابت کرنے کے لئے چار گواہ کیوں نہ لائے۔ پھر جب وہ گواہ نہ لائے تو اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ جب تم اپنی زبانوں سے وہ بات نقل کر رہے تھے اور اپنے منھ سے وہ بات کہہ رہے تھے جس کی بابت تم کو کوئی علم نہ تھا۔ اور تم اس کو معمولی بات سمجھ رہے تھے۔ حالاں کہ اللہ کے نزدیک وہ بہت بڑی بات ہے۔ ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کو سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ہمیں کیا حق ہے کہ ہم ایسی بات زبان پر لائیں۔ اللہ پاک ہے، یہ ایک بہت بڑا بہتان ہے۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں فحش کاری کا چرچا ہو ان کے لئے دردناک عذاب ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور

اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے (النور)

ایک مسلمان کے لئے دوسرے مسلمان کی عزت پر حملہ کرنا حرام ہے۔ اور جب معاملہ مسلمان عورت کا ہو تو اس کی شناعت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ طبرانی کی ایک روایت میں ہے کہ پاک باز مسلم خاتون پر تہمت لگانا سو برس کے عمل کو ڈھا دیتا ہے (قذف المحصنة يهدم عمل مأة سنة) بخاری و مسلم کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات ہلاک کر دینے والی چیزوں سے بچو۔ لوگوں نے پوچھا اے خدا کے رسول وہ کیا ہیں۔ آپ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو، اللہ کی حرام کی ہوئی جان کو حق کے بغیر قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، میدان جنگ سے بھاگنا اور بھولی بھالی پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا (وقذف المحصنات المومنات الغافلات)

اس میں ہمارے لئے بہت سے سبق ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں چند اشارے درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ ایک سادہ سے واقعہ کو بہانہ بنا کر جن لوگوں نے مذکورہ مہم چلائی ان کا مقصد رسول یا زوجۂ رسول کو بدنام کرنے سے زیادہ دعوت اسلامی کو بدنام کرنا تھا۔ رسول کو اخلاقی حیثیت سے مشتبہ ثابت کر کے وہ دراصل رسول کی دعوت کو مشتبہ ثابت کرنا چاہتے تھے۔ یہی ہر زمانہ میں شیطان کا طریقہ ہے۔ مگر اس قسم کی کوشش خواہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر کی جائے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ کیوں کہ حق کی دعوت جب بھی اٹھتی ہے وہ براہ راست خدا کی حمایت کے تحت اٹھتی ہے۔ اس کو مشتبہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا گویا خدا کے منصوبہ سے ٹکرانا ہے اور کون ہے جو خدا کے منصوبہ سے ٹکرا کر کامیاب ہو — حق کی دعوت کے لئے مقدر ہے کہ وہ لازماً قائم رہے، یہاں تک کہ وہ حق کو ناحق سے جدا کرنے میں آخری حد تک کامیاب ہو جائے۔

۲۔ امتحان کی اس دنیا میں ایک معصوم اور بے قصور آدمی کے ساتھ بھی کوئی ایسا واقعہ پیش آ سکتا ہے جس کو غلط معنی پہنایا جا سکے اور اس طرح خدا سے بے خوف لوگوں کو موقع مل جائے کہ وہ اس کے ذریعہ اس کو بدنام کر سکیں۔ مگر جو اللہ سے ڈرنے والے لوگ ہیں ان کو ایسے موقع پر ہمیشہ خوش گمانی کے تحت رائے قائم کرنا چاہئے۔ ان کو ایسا نہ چاہئے کہ محض سن کر بلا تحقیق اس کو صحیح مان لیں اور اس کو شہرت دینے میں لگ جائیں۔

۳۔ ایسے کسی الزام کو درست ماننے کے لئے ضروری ہے کہ چار معتبر آدمی اس کے حق میں گواہی دیں۔ اگر الزام لگانے والا چار گواہ نہ پیش کر سکے تو یقین کیا جائے گا کہ وہ جھوٹا ہے۔ اور اس جرم میں اس کو ۸۰ کوڑے مارے جائیں گے۔ اس کے بعد اگر وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور اپنی اصلاح کر لے تو امید ہے کہ اللہ اس کو معاف کر دے گا۔ مگر مسلمانوں کے معاملات میں گواہ بننے کے لئے پھر بھی وہ نااہل رہے گا۔ اس کے بعد اس کی گواہی کبھی قبول نہیں کی جائے گی۔

۴۔ کسی پاک دامن خاتون پر جھوٹی تہمت لگانا ایسا سنگین جرم ہے جس کی سخت ترین سزا نہ صرف آخرت میں ملے گی بلکہ دنیا میں بھی ایسے آدمی کو اس کی سزا مل کر رہتی ہے۔ کسی کی عزت پر حملہ کرنا کمینہ پن کی بات ہے اور ایسا جرم جس کے کمینہ پن شامل ہو وہ آدمی کو اللہ کی رحمت سے آخری حد تک محروم کر دیتا ہے۔ ایسے شخص سے جہنم اتنی قریب آ جاتی ہے کہ دنیا ہی میں اس کی آنچ سے جلنا شروع ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے پر حملہ سب سے پہلے اپنے آپ پر حملہ

آدمی پہلے اپنے آپ کو قتل کرتا ہے، اس کے بعد ہی وہ دوسرے کے قتل کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے۔

۵۔ اسلامی ماحول خدا پرستی کا ماحول ہوتا ہے۔ اسلامی ماحول وہ ہے جہاں ہر آدمی اس احساس کے ساتھ اپنی زبان کھولے کہ اس کو اپنے بولے ہوئے الفاظ کا حساب اللہ کو دینا ہے۔ ایسے ماحول میں آدمی کو حد درجہ محتاط ہو کر رہنا چاہئے۔ ایسے ماحول میں جو لوگ غیر ذمہ دارانہ باتوں کو پھیلائیں وہ گویا اسلامی ماحول کی خدا پرستانہ فضا کو خراب کر رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں زہر گھول رہے ہیں۔ ایسے لوگ اللہ کے نزدیک سخت ترین مجرم ہیں۔ دنیا میں اگر وہ اپنی برأت کے لئے الفاظ پالیں تو اس بنا پر ان کو ہرگز دھوکے میں نہ رہنا چاہئے کہ وہ خدا کے یہاں بھی اپنی برأت کے لئے الفاظ پالیں گے۔ آخرت حقیقتوں کے کھل جانے کا مقام ہے۔ وہاں صرف وہ شخص بری الذمہ ٹھہرے گا جو حقیقت کی سطح پر جیئے۔ جو حقیقت سے انحراف کرے وہ آخرت میں اس طرح پہنچے گا کہ وہاں اس کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔

۶۔ اس قسم کے کسی واقعہ کا پیش آنا بظاہر ایک ناپسندیدہ بات ہے۔ مگر اس میں خیر کا پہلو بھی چھپا ہوا ہے۔ اس قسم کے ایک واقعہ کے درمیان یہ ثابت ہوتا ہے کہ کون ذمہ دار ہے اور کون غیر ذمہ دار۔ کون اپنے سینہ میں دوسرے بھائیوں کی خیر خواہی لئے ہوئے ہے اور کون ہے جس کے دل میں دوسروں کے لئے حسد اور بغض بھرا ہوا ہے۔ کون اللہ کی جواب دہی کے احساس کے تحت بولتا ہے اور کون جواب دہی کے احساس سے خالی ہو کر کلام کرتا ہے۔ اس طرح ایک طرف یہ ہوتا ہے کہ ان واقعات کے ذریعہ بد باطن لوگوں کا بد باطن ہونا کھل جاتا ہے۔ دوسری طرف اہل حق کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ خدا کی توفیق سے صبر کی روش پر قائم رہیں اور اللہ کی مزید عنایتوں کے مستحق بنیں

۷۔ اس واقعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حق کی دعوت جب بے آمیز شکل میں پیش کی جائے تو وہ لوگ کتنے زیادہ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں جن پر اس دعوت کی زد پڑتی ہو۔ ان مخالفین میں ایک تو عام دنیا دار ہوتے ہیں۔ وہ بھی اگرچہ ایسی تحریک کے مخالف ہوتے ہیں۔ مگر ان کی مخالفت ایک دائرہ کے اندر رہتی ہے۔ وہ داعی کو ناکام بنانے کے لئے زور لگاتے ہیں مگر اس کو بے عزت کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ غزوہ احد کے واقعات میں آتا ہے کہ مکہ سے کافروں کا جو لشکر مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لئے روانہ ہوا تھا، وہ راستہ میں ابواء کے مقام پر پہنچا جہاں پیغمبر اسلام کی والدہ آمنہ بنت وہب کی قبر تھی۔ قریش کے کچھ پُر جوش لوگوں نے چاہا کہ قبر کو کھود دیں اور پیغمبر کی ماں کی بے حرمتی کریں۔ مگر خود قریش کے لوگوں نے ان کو برا بھلا کہا اور ان کو اس ارادہ سے روکا۔ وہ پیغمبر سے لڑنے جا رہے تھے مگر ان کی بے حرمتی کے لئے کوئی پست طریقہ اختیار کرنا ان کو گوارہ نہ ہوا۔ مگر یہود جو اپنے کو حق کا اجارہ دار سمجھتے تھے ان کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ انھوں نے بعض چیزوں کو بہانہ بنا کر آپ پر رکیک حملے کئے اور آپ کو اخلاقی حیثیت سے گرانے کی کوشش کی۔ مذکورہ تہمت طرازی کے اصل ذمہ دار یہی لوگ تھے۔ جو لوگ اپنے کو حق کا واحد نمائندہ سمجھتے ہوں، جب وہ اپنی حیثیت پر زد پڑتی ہوئی محسوس کرتے ہیں تو ان کا ردعمل بے حد شدید ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف ایسی تحریک کا زور توڑنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اس کے داعی کو بے عزت کرنے کی مہم بھی چلاتے ہیں۔ وہ اپنی مذہبی قیادت کو بچانے کے لئے ہر چیز کو اپنے لئے جائز کر لیتے ہیں خواہ وہ کوئی ذلیل حرکت یا کوئی پست کارروائی کیوں نہ ہو۔ (۱۹ مارچ ۱۹۸۰)

جب الفاظ دل کے ٹکڑے بن جائیں

آگ کا انگارہ کسی اعلان کے بغیر بتا رہا ہوتا ہے کہ وہ گرم ہے۔ یہی حال سچے مبلغ کا ہے۔ آدمی جس دین کی تبلیغ کرنا چاہتا ہے اگر وہ اس کو اپنے اندر اتار چکا ہو تو اس کا وجود سراپا تبلیغ بن جاتا ہے۔ وہ بولنے سے پہلے بول رہا ہوتا ہے اور اعلان کے بغیر اس کی ہستی اعلان میں ڈھل جاتی ہے۔ اللہ کے وہ بندے جو واقعی طور پر اللہ کی اطاعت کو اپنی زندگی میں شامل کر لیتے ہیں، ان کا عمل ایسے ایسے پہلوؤں سے اپنے تبلیغی نقش چھوڑتا ہے اور ایسے ایسے مقامات سے اس کے دعوتی اثرات ظاہر ہو کر سامنے آتے ہیں جن کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں میں ہندوستان کی ریاست اترپردیش کی ایک مسلم خاتون کا واقعہ نقل کروں گا۔ یہ واقعہ ۱۳۸۳ھ کا ہے اور ذاتی طور پر میرے علم میں آیا ہے۔ مذکورہ خاتون ایک ڈاکٹر سے اپنا علاج کرا رہی تھیں۔ ڈاکٹر چوں کہ ان کے وطن سے پانچ سو کیلو میٹر کے فاصلہ پر رہتے ہیں، اس لئے اپنے احوال ان کو بذریعہ خط لکھ کر بھیجتی تھیں۔ یہ ایک ہومیوپیتھ ڈاکٹر ہیں اور اپنے مخصوص طریق علاج کے مطابق ان کی تاکید تھی کہ حالات بتانے میں یہ بات خاص طور پر لکھی جائے کہ مرض کیسے پیدا ہوا۔ کب بڑھتا ہے اور کب گھٹتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ خاتون کو جوڑوں کا درد تھا۔ جب وہ اچھا ہوا تو سر کا درد شروع ہو گیا۔ کسی علاج سے فائدہ نہیں ہوتا تھا، بالآخر انھوں نے ڈاکٹر کو لکھا:

"اپنے حالات کے سلسلے میں آپ کو کچھ لکھنا تھا تاکہ آپ مرض کی نوعیت سمجھ کر صحیح دوا تشخیص کر سکیں۔ مگر کئی دن سے سوچ سوچ کر رہ جاتی تھی۔ اب چوں کہ یہ علاج کا معاملہ ہے اور طویل علالت کی وجہ سے وہ میرے لئے سخت تکلیف دہ ہو چکا ہے، اس لئے مجبوراً لکھتی ہوں۔ کہنا یہ ہے کہ جوڑوں کا درد جو مجھے پہلے ہو گیا تھا، وہ بفضلہ تعالیٰ آپ کے علاج سے بالکل ٹھیک ہے، مگر اس کے بعد درد سر کی مستقل پریشانی شروع ہو گئی ہے۔ یہ درد کیسے اٹھتا ہے، یہ لکھنے یا کہنے کی بات نہیں تھی، مگر مجبوراً لکھ رہی ہوں کہ اس کے بغیر شاید ہومیوپیتھک طریق علاج میں صحیح دوا تجویز نہیں کی جا سکتی۔ بات یہ ہے کہ اگر میں رات کو ساری رات آرام سے بستر پر پڑی رہوں تو سر میں قطعاً درد نہیں ہوگا اور دن بھی خیریت سے گزر جائے گا، مگر مجھ کو راتوں کی تنہائی میں اٹھ کر نماز پڑھنا بہت پسند ہے، انھیں رات کی نمازوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آخرت کا منظر یا قبر وغیرہ کی یاد شدت سے دماغ میں آتی ہے اور اس وقت بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں بس انھیں آنسوؤں کا نکلنا مضر ہوتا ہے۔ جیسے ہی آنکھ سے آنسو نکلے، سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے بار بار اندازہ کیا ہے کہ آنسوؤں ہی کے نکلنے سے سر میں درد شروع ہوتا ہے۔ یہ بات کسی سے کہنے کی نہیں تھی، محض علاج کی خاطر میں نے اپنے دل پر جبر کر کے آپ کو لکھ دیا ہے، براہ کرم خط کو پڑھنے کے بعد اسے پھاڑ کر ضائع کر دیں۔"

یہ سادہ سے چند الفاظ جو ایک معمولی پڑھی لکھی خاتون کے قلم سے محض ضرورت شدید کی بنا پر نکل گئے تھے۔ جب وہ تعلیم یافتہ ڈاکٹر کے پاس پہنچے تو انھوں نے حیرت انگیز کام کیا۔ ڈاکٹر نے جواب میں لکھا:

"گرامی نامہ ملا۔ آپ نے درد سر کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ میرے لئے تشخیص کے سلسلے میں بہت معاون ثابت

ہوئی۔ چناں چہ میں نے دوا تجویز کرلی ہے۔ آپ نیٹرم میور ۳۰ بازار سے منگوا کر کھا لیجئے۔ انشاء اللہ ایک ہی خوراک میں فائدہ محسوس ہوگا۔ مگر میں یہ کہنے کے لئے آپ سے معذرت چاہتا ہوں کہ آپ کے حکم کے بموجب میں آپ کے خط کو پھاڑ نہ سکا۔ کیوں کہ اس کا تعلق صرف آپ کے علاج سے نہیں ہے بلکہ خود اپنے روحانی علاج کے سلسلے میں میں نے اس کو اس قدر مؤثر پایا کہ کسی تحریر یا نصیحت کا اتنا گہرا اور فوری اثر نہ ہوا تھا۔ آپ نے خط کو پھاڑنے کی بات اس خیال سے لکھی ہوگی کہ اس کے اظہار سے آپ کے اجر میں کمی ہوگی۔ لیکن اگر مجھ جیسے کھوئے ہوئے شخص کو کوئی تحریر حرکت میں لاسکے تو وہ بلاشبہ میرے لئے آخری دم تک محبوب ہوگی۔ کاش میرے اندر بھی ایسی ہی کیفیت پیدا ہوجاتی اور رات کی تاریکی میں آخرت کی بازپرس کا ہولناک منظر دیکھنے کی توفیق ہوتی۔ اس لئے یہ اظہار محض آپ کی اجازت کے لئے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس لحاظ سے اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت پایا کہ اپنے ایک مریض کے جسمانی علاج سے مجھے روحانی غذا ملی۔"

یہ خاتون جن کا خط میں نے اوپر نقل کیا، وہ ایک خاموش طبیعت کی خاتون ہیں اور ان کو اپنے بارے میں اس کمی کا شدید احساس ہے کہ وہ تبلیغ و دعوت کا کام نہیں کرسکتیں، مگر آپ نے دیکھا کہ ان کے ایک خاموش عمل نے کس طرح ایک ایسی تبلیغ کا کام انجام دیا جو تقریروں پہ بھی بھاری ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کے اوپر تبلیغ و دعوت کا کام کرنے کا مسئلہ سب سے پہلے خود اپنے آپ کو بدلنے کا مسئلہ ہے۔ تبلیغ و دعوت کا کام ذاتی عمل سے نہایت گہرا رشتہ رکھتا ہے۔ جس اسلام کے ہم مبلغ ہیں، اگر وہ خود ہماری زندگیوں میں اترا ہوا ہے تو وہ بے شمار پہلوؤں سے دعوتی کام میں مؤثر ہوگا۔ اور اگر ہماری زندگی اس سے خالی ہو تو تقریر و تحریر کی شکل میں ممکن ہے کچھ الفاظ وجود میں آجائیں، مگر اس چیز کا وجود نہیں ہوسکتا جس کو حقیقی معنوں میں تبلیغ یا دعوت کہا جاتا ہے۔ دعوت و تبلیغ اور ذاتی عمل کے درمیان یہ رشتہ ان معنوں میں نہیں ہے جیسے کوئی شخص ریاضیات کا لکچرر بننا چاہتا ہو تو وہ پہلے ریاضی کی تعلیم حاصل کرکے اسے خود سیکھتا ہے تاکہ وہ ریاضی کے طلبہ کو اس کا درس دے سکے۔ ذاتی عمل اور تبلیغ کے درمیان اس قسم کا ارادی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ایک فطری تعلق ہے۔ ذاتی عمل کا محرک اصلاً یہ نہیں ہے کہ آدمی کامیاب مبلغ بن جائے، ایسا ذاتی عمل کبھی وجود میں نہیں آسکتا اور اسی لئے اس قسم کا ذہن رکھنے والا شخص کبھی اچھا مبلغ بھی نہیں بن سکتا، مومن کے اندر عمل کا داعیہ اس لئے نہیں ابھرتا کہ وہ اس کے ذریعہ سے عمدہ قسم کا مبلغ بن جائے گا، بلکہ جب خدا کا خوف اور آخرت کی بازپرس کا احساس اسے باعمل بنا دیتا ہے تو اس وقت عین اس کے نتیجہ کے طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کی تبلیغ میں اس کی زندگی کے شرارے جھلکنے لگتے ہیں۔ وہ خود بہ خود ایک کامیاب مبلغ بن جاتا ہے۔ تبلیغ و دعوت میں ذاتی زندگی کے یہ اثرات مختلف پہلوؤں سے داخل ہوتے ہیں جن میں یہاں صرف دو چیزوں کا ذکر کروں گا۔

۱۔ سب سے پہلا اثر تو وہ ہے جس کو میں بالواسطہ تبلیغ کہوں گا۔ یہ وہ اثر ہے جو تبلیغ میں نکلنے سے پہلے بلا ارادہ اپنے تبلیغی اثرات دکھانا شروع کردیتا ہے۔ جب ایک بندۂ خدا کے دل میں اپنے رب کے سامنے حاضری کا خوف سماتا ہے تو وہ فوراً اپنی زندگی پر نظر ثانی شروع کردیتا ہے۔ اندر سے باہر تک اس کی زندگی بدلنے لگتی ہے۔ یہ تبدیلی اگرچہ اپنی

تہائی اور مکمل شکل میں کسی انسان کے لئے ناقابل مشاہدہ ہے مگر اس کے باوجود اس کی کچھ جھلکیاں مختلف شکلوں میں
لوں کے سامنے آتی رہتی ہیں اور دیکھنے اور سننے والوں کو متاثر کرتی ہیں۔
جب اس کو یہ احساس ستاتا ہے کہ پچھلی غفلت کی زندگی میں اس نے فلاں شخص کے ساتھ ایک ایسی زیادتی کی تھی
اس کے لئے آخرت میں بازپرس کا سبب بن سکتی ہے اور وہ اس کے سامنے معافی مانگنے کے لئے حاضر ہوتا ہے تو اس
کپکپاتے ہوئے ہونٹ سننے والے کو بھی ہلا دیتے ہیں اور غلطی کا اظہار کرتے وقت نکل پڑنے والے آنسو کتنے سیاہ اور
غبار آلود دلوں کو دھو کر صاف کر دیتے ہیں۔ جب وہ غلط طریقے سے حاصل کئے ہوئے ایک مال کو اس اندیشے کی بنا پر
واپس کرنے جاتا ہے کہ آخرت میں اس کے اصل مالک کو یہ اختیار دیا جائے گا کہ وہ اس کے بدلے غاصب کا سارا عمل
لے لے اور اسے بالکل خالی چھوڑ دے، تو وہ ایک شخص کو صرف اس کا مال ہی نہیں لوٹاتا، بلکہ اسی کے ساتھ اس کو ایمان
کی وہ دولت بھی واپس دلاتا ہے جو غفلت میں شیطان اس سے اچک لے گیا تھا۔ جب ایک واقعی نمازی سجدے میں
ہمہ تن پڑا ہوا خدا سے اس طرح سرگوشی کر رہا ہوتا ہے کہ بقیہ دنیا کی اسے خبر بھی نہیں ہوتی، عین اس وقت اس کی
اس ہیئت و فنائیت کو دیکھ کر کسی بندۂ خدا کا دل اندر ہی اندر اپنے رب کے آگے جھک جاتا ہے۔ وہ بے اختیار چاہنے
لگتا ہے کہ وہ بھی اسی طرح اپنے خدا کو پا کر اس سے لپٹ جائے۔ جب زندگی کے عملی معاملات میں لوگوں کو اس سے سابقہ
پیش آتا ہے اور لوگ اس کی سچائی، پاکیزگی، دیانت داری اور ایفائے عہد کا تجربہ کرتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو بالکل مجبور
پاتے ہیں کہ اس دین کی قدر کریں جس کے اندر یہ طاقت ہے کہ ایسے عمدہ انسان تیار کرے، حتیٰ کہ کتنے غیر مسلموں کو اس
طرح کے تجربات سے اسلام کی توفیق ملتی ہے اور کتنی غافل روحوں کو دوبارہ اسلام کا شعور نصیب ہوتا ہے۔

دو پتھر باہم ملیں تو کوئی خاص بات نہیں ہوگی۔ لیکن بجلی کا ایک تار جب دوسرے تار سے مس کرتا ہے تو فوراً
سادہ تار میں برقی رو دوڑنے لگتی ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ ایک اچھے انسان کی خصوصیات دوسرے انسان کے
لئے برقی رو کی حیثیت رکھتی ہیں، انسان کے اندر فطری طور پر یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اچھی چیز سے اثر قبول کرتا
ہے اور خدا پرستی کی چیزیں اس کے دل کی آواز بن کر اس کی نفسیات میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ جب ایک شخص کوئی عمدہ
عمل کرتا ہے یا اس کی زندگی سے خدا پرستی کا کوئی نور چھن کر لوگوں کے سامنے آجاتا ہے تو اس وقت دیکھنے والی آنکھیں اور
سننے والے کان اسی طرح اس کو قبول کرتے ہیں جیسے بجلی کے تار سے کوئی دوسرا تار برقی رو قبول کرتا ہے۔ اس وقت فطرت
کے ایک اَن دیکھے تار پر ایک طرف کے جذبات دوسری طرف منتقل ہونے لگتے ہیں، ایک کی ہلچل دوسرے کو لرزہ براندام
کر دیتی ہے، ایک کی روشنی سے دوسرے کا باطن چمکنے لگتا ہے۔ یہ ایک بالکل فطری عمل ہے جو لازمی طور پر اس وقت
وجود میں آتا ہے جب کسی کے اندر ایمان و اسلام کا شعلہ بھڑکے اور اس کے گرد و پیش ایسے لوگ موجود ہوں جن کی فطرت مسخ
نہ ہو گئی ہو اور انسانی اوصاف ابھی باقی ہوں۔

۲۔ دوسری چیز وہ ہے جو براہ راست تبلیغ میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ الفاظ جن کے ذریعہ سے ہم اپنی بات
دوسرے تک پہنچاتے ہیں وہ کسی مفہوم کا مجرد اظہار نہیں ہیں۔ جیسے پانچ اور دس کسی چیز کے عدد کا مجرد اظہار ہیں

اسی کے ساتھ ان کے اندر مختلف قسم کی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ اور مفہوم کے اعتبار سے دو بالکل
ساں کلام اپنی کیفیت اور اثر کے اعتبار سے بے حد مختلف ہو جاتے ہیں۔ اس فرق کو واضح کرنے کے لئے میں یہاں دو شعر
ل کرتا ہوں :۔

خرابات عالم میں ہر چار جانب چھلکتے ہوئے جام و مینا دھرے ہیں
ضرورت اسی کی ہے اے اہل محفل کوئی ہاتھ اس کو بڑھا کر اٹھالے

یہ مے خانہ ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی   جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

دونوں اشعار مفہوم کے اعتبار سے بالکل ہم معنی ہیں، مگر الفاظ اور دروبست کے فرق نے دونوں میں زمین آسمان
فرق پیدا کر دیا۔ یہ فرق کی ابتدائی قسم ہے جس کو ہم ادبی فرق کہہ سکتے ہیں۔ اور وہ قدرتِ کلام اور فنی ذوق کا نتیجہ
ہوتا ہے۔ دوسرا فرق وہ ہے جو صاحب کلام کی اپنی اندرونی کیفیات کے اعتبار سے وجود میں آتا ہے۔ اگر آپ ایک واقعہ
ے متاثر ہوں تو اس کا ذکر کرتے ہوئے نہ صرف آپ کا لب ولہجہ بدل جائے گا۔ بلکہ آپ کی زبان سے ایسے ایسے الفاظ
لیں گے جو آپ کی اندرونی کیفیات کی ترجمانی کر رہے ہوں۔ جن میں آپ کا تاثر اسی طرح بھرا ہوا ہو جیسے کسی تازہ پھل
ں اس کا رس بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ متاثر نہ ہوں تو آپ کا بیان واقعہ محض اخباری رپورٹ معلوم ہوگا۔

ذاتی طور پر ایمان و اسلام کی زندگی کو پالینا آدمی کے تبلیغی کام میں یہی دوسری خصوصیت پیدا کرتا ہے۔ وہ اس
ے کلام کو مجرد کلام کے مقام سے اٹھا کر موثر کلام بنا دیتا ہے۔ وہ اس میں شدت جذبات کا رس بھرتا ہے، وہ ننگے الفاظ
و کیفیات کا لباس اڑھاتا ہے۔ وہ حروف کے مجموعوں کو دل کے ٹکڑے بنا دیتا ہے وہ کلام کو خوشبو فروش کا معطر
شتہار بنا دیتا ہے جو صرف پڑھا نہیں جاتا، بلکہ اپنی خوشبو بھی مخاطب تک پہنچا دیتا ہے۔

جس کے اپنے اندر اسلام اترا ہوا نہ ہو، اس کے کلام میں بظاہر تمام شرعی باتیں موجود ہوں گی مگر وہ بس الفاظ
کا ایک مجموعہ ہوگا جس میں دل کی بو بسی ہوئی نہیں ہوگی۔ وہ ایک سپاٹ کلام ہوگا جو خود اپنی حقیقتوں سے خالی ہوتا ہے۔ اس
ے برعکس جب ایک ایسا شخص بولتا ہے جس نے فی الواقع دین کو پالیا ہو تو اس کی زبان اور اس کے الفاظ میں حیرت انگیز
خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ جب لوگوں کو آخرت سے ڈراتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ اپنی آنکھوں سے
دیکھ رہا ہے کہ اسرافیل صور لئے کھڑے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ کس وقت حکم ہو اور پھونک مار کر دنیا کو تہ و بالا کر دیں۔
اس کے بے قرار جملے صاف بتاتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ محض کچھ الفاظ کی تکرار نہیں ہے بلکہ وہ ان ہیجان خیز واقعات
سے براہ راست آشنا ہو کر بول رہا ہے۔ اس کی تحریروں میں دل کا سوز گھلا ہوا ہوتا ہے، اس کے الفاظ اندرونی تپش کی آنچ
سے جل رہے ہوتے ہیں، اس کے ہر بول میں حقیقت کی خوشبو لپٹی ہوئی ہوتی ہے، اس کی سطروں کے درمیان جگہ جگہ نظر آتا
ہے کہ آنسوؤں نے ٹپک کر لکھی ہوئی سیاہی کا رنگ بدل دیا ہے۔ یہ چیزیں اس کے کلام کو حقیقت بیانی کے ایک ایسے مقام پر
پہنچا دیتی ہیں جہاں دیکھنے والوں کو نظر آتا ہے گویا حقیقت خود مجسم بے نقاب ہو کر سامنے آگئی ہے حقیقت یہ ہے کہ تبلیغ و
دعوت کے کام کو موثر بنانے کے لئے خارج میں کوئی ہتھیار موجود نہیں ہے اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہے —— اپنے اندرون
کو مسلمان بناؤ، اسی وقت تم اپنے بیرون کو مسلمان بنا سکو گے (الفرقان محرم ۱۳۸۴ھ)

ایمان کی برکتیں کس کو ملتی ہیں

ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربا و بمحمد رسولا وبالاسلام دینا

ثلاث من کن فیہ وجد حلاوۃ الایمان ، من کان اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما و من احب عبدا لا یحبہ الا للہ ومن یکرہ ان یعود فی الکفر بعد اذ انقذہ اللہ کما یکرہ ان یلقی فی النار (بخاری)

ایمان کا مزہ چکھا اس شخص نے جو راضی ہوگیا اللہ کو رب بنانے پر، محمد کو اپنا رسول بنانے پر اور اسلام کو اپنا دین بنانے پر۔
ایمان کی مٹھاس پائی اس شخص نے جس کے اندر تین باتیں ہوں، جس کے لئے اللہ اور رسول تمام دوسری چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں۔ جو کسی شخص سے صرف اللہ کے لئے محبت کرے۔ جو کفر سے نکلنے کے بعد دوبارہ اس کی طرف لوٹنے کو اسی طرح ناپسند کرے جس طرح وہ آگ میں گرنے کو ناپسند کرے گا۔

مومن بنا گیا ہے یہ دنیا میں رہ کر آخرت پسندانہ زندگی اختیار کرنا ہے، یہ نفس اور شیطان کے ماحول میں رہتے ہوئے خدا والا بن کر رہنا ہے، یہ دکھائی دینے والی چیزوں میں گھر کر نہ دکھائی دینے والی چیزوں کا چاہنے والا بننا ہے۔ یہ ایک مشکل فیصلہ ہے اور کسی شخص کو اس مشکل فیصلہ پر قائم رکھنے کی ضامن صرف دو چیزیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ایمان اس کے لئے ذائقہ (مزہ) کی چیز بن گیا ہو جس طرح ایک لذیذ کھانا آدمی کے لئے ذائقہ کی چیز ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایمان اس کے لئے ایک محبت کا معاملہ بن جائے جس طرح عزیز بیٹے سے تعلق کسی باپ کے لئے محبت کا معاملہ ہوتا ہے۔

کوئی چیز جب آدمی کے لئے مزہ کی چیز بن جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ اس کا تعلق ذاتی مفاد کی حد تک وابستہ ہوگیا ہے۔ جس چیز میں آدمی مزہ پانے لگے اس کو وہ کبھی نہیں چھوڑتا، وہ ہر قیمت پر اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ چیز جس سے آدمی کی روح کو غذا ملے، جس سے اس کے دل کو تسکین حاصل ہوتی ہو، جو اس کے دماغ کو فکری یکسوئی عطا کرتی ہو، جس کے کھونے سے آدمی خالی ہو جائے اور جس کے پانے سے وہ اپنے آپ کو بھرپور محسوس کرے۔ ایسی چیز آدمی کے لئے اسی طرح ضروری ہو جاتی ہے جیسے اس کا اپنا وجود۔ ایمان کی برکتیں آدمی کو اسی وقت ملتی ہیں جب ایمان اس کے لئے اس قسم کا ذائقہ والا ایمان بن جائے۔

باہر کے کسی آدمی سے آپ کو تکلیف پہنچ جائے تو آپ کے دل میں اس کے خلاف مستقل نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر اپنے بیٹے یا بیٹی سے تکلیف پہنچتی ہے تو وقتی احساس کے بعد آپ اس کو بھول جاتے ہیں۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ باہر کے کسی آدمی سے آپ کا تعلق محض رسمی تعلق ہے جب کہ بیٹے اور بیٹی سے آپ کا تعلق محبت کا تعلق ہے۔ رسمی تعلق ہو تو شکایت اور اختلاف پیدا ہوتے ہی تعلق میں فرق آجاتا ہے۔ مگر کسی کے ساتھ محبت کا تعلق پیدا ہو جائے تو شکایت اور اختلاف کے باوجود تعلق میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ محبت کا جذبہ کسی تعلق کو ایسی سطح پر پہنچا دیتا ہے جہاں تمام مخالف اسباب حذف ہو جاتے ہیں اور صرف موافق اسباب باقی رہتے ہیں۔ اللہ اور رسول سے اسی قسم کا محبت کا تعلق مطلوب ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو آدمی امتحان کے کٹھن حالات میں خدا پرستی پر قائم نہیں رہ سکتا۔

دعوت اور اقدام کا فرق

"میں نے لوگوں کو حق کی طرف پکارا مگر سننے والوں نے نہ مانا تو میرا اس میں کیا قصور"

"میں نے حق کی خاطر عملی اقدام کیا مگر لوگوں کی نااہلی کی وجہ سے اقدام کامیاب نہ ہو سکا تو میرا اس میں کیا قصور"

قواعد کی رو سے دونوں جملے یکساں طور پر درست ہیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے پہلا جملہ سراسر صحیح اور دوسرا جملہ سراسر غلط ہے۔ دعوت کا مقصود سنانا ہوتا ہے اور عملی اقدام کا مقصود نتیجہ پیدا کرنا۔ اس لئے دونوں کو جانچنے کا معیار ایک نہیں ہو سکتا۔ دعوت کو صرف دعوت کے پیمانہ پر دیکھا جائے گا اور اقدام کو عمل کے پیمانہ پر۔ داعی صرف پکارنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس سے جس بات کا تقاضا کیا جائے گا وہ صرف یہ ہے کہ وہ صحیح بات کی طرف پکارے اور پکارنے میں صحیح انداز اختیار کرے۔ نہ اس کے نشانۂ دعوت میں غلطی ہو اور نہ طریق دعوت میں۔ اس کے بعد جہاں تک نتیجہ کا تعلق ہے، اس کی کوئی ذمہ داری داعی پر نہیں۔ اگر اس نے صحیح بات کی طرف لوگوں کو بلایا ہو اور بلانے کے لئے وہی انداز اختیار کیا ہو جو خدا اور رسول کے مطابق صحیح انداز ہے تو وہ صد فی صد کامیاب ہے، خواہ کسی ایک آدمی نے بھی اس کی بات کو نہ مانا ہو۔

مگر عملی اقدام کرنے والے کا معاملہ مکمل طور پر اس سے مختلف ہے۔ عملی اقدام اس لئے ہوتا ہے کہ ایک سماجی ڈھانچہ کو اکھاڑ کر دوسرا سماجی ڈھانچہ قائم کیا جائے۔ اس میں ایک طرف کچھ موجود لوگوں کو اختیار کے مقام سے ہٹانا اور کچھ دوسرے لوگوں کو اختیار کے مقام پر بٹھانا ہوتا ہے۔ دعوتی کام میں منصوبہ کی تکمیل کا دار و مدار صرف ایک شخص (داعی) کی کارکردگی پر ہوتا ہے۔ جب کہ عملی اقدام میں لازمی طور پر ضروری ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ متحدہ طور پر کارکردگی کا ثبوت دیں، ورنہ عملی اقدام کامیاب نہیں ہوگا بلکہ الٹا نقصان دہ ثابت ہوگا۔

اگر آپ کسی سے یہ کہنے جا رہے ہوں کہ تم محنت کر کے اپنی خود کفیل معاش پیدا کرو تو اس کے لئے آپ کا مخلص ہونا کافی ہے۔ لیکن اگر آپ کسی کو یہ مشورہ دیں کہ تم اپنا گھر بار بیچ کر بمبئی چلے جاؤ، وہاں تمھارے لئے بہترین گھر بھی ہے اور کاروبار بھی، تو ایسے مشورہ کے لئے آدمی کا مخلص ہونا کافی نہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اس مشورہ کے عملی نتائج کو جانے۔ جو شخص اس مشورہ کے عملی نتائج سے بے خبر ہو اس کے اوپر فرض ہے کہ وہ اپنی زبان بند رکھے۔ کیوں کہ اس قسم کا مشورہ بے خبری کے ساتھ دینا جرم کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک شخص فن تعمیر سے ناواقف ہے۔ وہ گھر بنانے کے لئے دیواریں اٹھاتا ہے اور اس کے اوپر مٹی کے گارے سے لنٹر اور سلیب جوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد جب سانچہ ہٹایا جاتا ہے تو چھت گر پڑتی ہے۔ اب ایسا شخص اگر یہ کہے تو کوئی اس کے کہنے کو نہیں سنے گا کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ مٹی کا گارا لنٹر کو نہیں سنبھالے گا۔ میں نے تو نیک نیتی کے ساتھ ایک صحیح کام کیا تھا۔ اب اگر چھت گر پڑی تو اس میں میرا کیا قصور۔ ہر آدمی یہ کہے گا کہ مکان کھڑا کرنا کوئی کھیل تماشا نہیں ہے۔ اگر تم فن تعمیر سے واقف نہ تھے تو تم اپنے گھر میں بیٹھتے، تم کو معمار بننے کی ضرورت کیا تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ عملی اقدام کا معاملہ حد درجہ نازک معاملہ ہے۔ عملی اقدام میں صرف نیک نیتی یا مقصد کی درستگی کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ دیکھنا بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ جو شخص عملی اقدام کے لئے اٹھا ہے کیا اس کے پاس اتنی طاقت

ہے کہ وہ موجود لوگوں کو ہٹانے میں کامیاب ہو جائے۔ مزید یہ کہ اگر وہ اکھیڑ پچھاڑ کے ذریعہ موجود لوگوں کو ہٹانے میں کامیاب ہو جائے تو کیا خود اقدام کرنے والے کے پاس ایسے افراد موجود ہیں جن کو وہاں بٹھایا جائے تو وہ پچھلے نظام سے زیادہ بہتر نظام قائم کر کے اس کو چلا سکیں۔ دونوں میں سے کوئی ایک چیز بھی اگر موجود نہ ہو تو عملی اقدام محض ایک جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنا بنا بنایا پختہ گھر گرانا شروع کر دے۔ حالاں کہ اس کے پاس وہ ضروری سامان موجود نہ ہو جس کے ذریعہ وہ دوسرا بہتر گھر بنا سکے۔

اگر اپنا ذاتی معاملہ ہو تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ جو شخص مٹی اور سمنٹ یا کچی اور پکی اینٹوں کا فرق نہ جانے اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ گھر کا معمار بن کر کھڑا ہو جائے۔ اس قسم کی بے خبری کے ساتھ کوئی شخص معمار بننے کی ہمت نہیں کرے گا۔ اور اگر کوئی نادان شخص ایسی جرأت کرے تو لوگ کبھی اس کو نہیں بخشیں گے۔ اس کا عمل اس کو الٹا مجرم ثابت کرنے والا بن جائے گا نہ کہ وہ لوگوں کی نظر میں کسی انعام کا مستحق قرار پائے۔ مگر قومی و ملی معاملات میں اس قسم کے معمار بہت بڑی تعداد میں میدان عمل میں کودتے ہیں۔ وہ مٹی کے گارے سے چھت جوڑتے ہیں مگر عوام کی طرف سے ان کو بڑے بڑے خطابات اور شان دار اعزازات سے نوازا جاتا ہے۔ ذاتی معاملہ میں اقدام کے بعد آدمی نتیجہ کو بھی ضرور دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر ملی معاملہ میں اقدام کرنا ہو تو نتیجہ دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف ایک پر شور اقدام کرنا کافی ہے خواہ اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے یا الٹا نتیجہ برآمد ہو۔

دردِ سر اور دردِ گھر دونوں بہت ملتے جلتے الفاظ ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ سر کے درد کا علاج اگر طبی گولی سے ہو جاتا ہے تو گھر کا درد بھی ایک گولی سے ختم ہو جائے گا۔ دونوں لفظوں کا ملتا جلتا ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ دونوں کا معاملہ ایک ہے اور دونوں کو ایک ڈھنگ سے حل کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہمارے مصلحین اکثر اپنے اصلاحی منصوبہ میں یہی غلطی کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ منصوبہ اپنی تکمیل کے مرحلہ میں پہنچ کر بھی کوئی حقیقی نتیجہ پیدا نہیں کرتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ "قولی اقدام" جس طرح ہر حال میں ایک درست کام ہے اسی طرح "عملی اقدام" بھی ہر حال میں کیا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ قولی اقدام اور عملی اقدام ایک دوسرے سے بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ لفظی اشتراک کے سوا ان میں کوئی نسبت نہیں۔

ایک درخت کہیں رکاوٹ ڈال رہا ہو اور آپ کی تجویز یہ ہو کہ اس کو کاٹ دیا جائے تو صرف یہ کہنا کافی ہے کہ اس کو کاٹ دو۔ لیکن اگر آپ اس کو بالفعل کاٹنے لگیں تو بہت سے اور پہلوؤں کا اہتمام کرنا بھی ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ درخت جب کٹ کر گرے تو وہ آپ کے سر پر نہ گرے بلکہ خالی زمین میں گرے۔ اگر آپ اس قسم کا اہتمام کئے بغیر درخت کاٹنا شروع کر دیں اور وہ کٹ کر آپ کے سر پر گر پڑے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ایک مسئلہ ختم کرنے کے نام پر دوسرا زیادہ بڑا مسئلہ پیدا کر لیا۔ اسی طرح ملت کے معاملات میں اقدام سے پہلے اس سے متعلق تمام پہلوؤں کو سمجھنا اور ان کے بارے میں اہتمام کرنا ضروری ہے۔ ورنہ ملت کی تعمیر کے نام پر ایک "درخت" گرایا جائے گا اور عملاً صرف یہ ہوگا کہ ملت کی تعمیر تو نہ ہوگی البتہ بہت سے لوگوں کے سر ٹوٹ جائیں گے۔ آپ کا اقدام صرف نئے نئے مسئلے پیدا کرے گا۔ مزید اس قیمت پر کہ اصل مسئلہ بدستور باقی رہے۔

قرآن کو سمجھنے کے لئے

قرآن ایک فکری کتاب ہے اور فکری کتاب میں ہمیشہ ایک سے زیادہ تعبیر کی گنجائش رہتی ہے۔ اس لئے قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پڑھنے والا خالی الذہن ہو۔ اگر پڑھنے والے کا ذہن خالی نہ ہو تو وہ قرآن میں خود اپنی بات پڑھے گا۔ اس کو سمجھنے کے لئے قرآن کی ایک آیت کی مثال لیجئے :

ومن الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً یحبونھم کحب اللہ والذین آمنوا اشد حبا للہ (بقرہ ۱۶۵)

کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا مدمقابل بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ کے ساتھ ہونا چاہئے۔ حالاں کہ ایمان رکھنے والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

ایک شخص جو سیاسی ذوق رکھتا ہو اور سیاسی اکھیڑ پچھاڑ کو کام سمجھتا ہو وہ جب اس آیت کو پڑھے گا تو اس کا ذہن پوری آیت میں بس انداد (مدمقابل) پر رک جائے گا۔ وہ قرآن سے "مدمقابل" کا لفظ لے لے گا اور بقیہ مفہوم کو اپنے ذہن سے جوڑ کر کہے گا کہ اس سے مراد سیاسی مدمقابل ٹھہرانا ہے، اس آیت میں کہا گیا ہے کہ آدمی کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی کو خدا کا سیاسی مدمقابل بنائے۔ اس تشریح کے مطابق یہ آیت اس کے لئے اس بات کا اجازت نامہ بن جائے گی کہ جس کو وہ خدا کا "سیاسی مدمقابل" بنا ہوا دیکھے اس سے ٹکراؤ شروع کر دے۔ اس کے برعکس جو آدمی سادہ ذہن کے ساتھ اس کو پڑھے گا وہ "انداد" کے لفظ پر نہیں رکے گا بلکہ پوری آیت کی روشنی میں اس کا مفہوم متعین کرے گا۔ ایسے شخص کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ یہاں مدمقابل ٹھہرانے کی جس صورت کا ذکر ہے وہ باعتبار محبت ہے نہ کہ باعتبار سیاست۔ یعنی آیت یہ کہہ رہی ہے کہ آدمی کو سب سے زیادہ محبت صرف خدا سے کرنا چاہئے۔ "حب شدید" کے معاملہ میں کسی دوسرے کو خدا کا ہمسر نہیں بنانا چاہئے۔

قرآن کا ایک عمومی مفہوم ہے اور اس کو سمجھنے کی شرط یہ ہے کہ آدمی خالی الذہن ہو کر قرآن کو پڑھے۔ مگر جو شخص قرآن کے گہرے معانی تک پہنچنا چاہے اس کو ایک اور شرط پوری کرنی پڑتی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ اس راہ کا مسافر بنے جس کا مسافر اس کو قرآن بنانا چاہتا ہے۔ قرآن آدمی کی عملی زندگی کی رہنما کتاب ہے اور کسی عملی کتاب کو اس کی گہرائیوں کے ساتھ سمجھنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی عملاً ان تجربات سے گزرے جن کی طرف اس کتاب میں رہنمائی کی گئی ہے۔

یہ عمل کوئی سیاسی یا سماجی عمل نہیں ہے بلکہ مکمل طور پر ایک نفسیاتی عمل ہے۔ اس عمل میں آدمی کو خود اپنے نفس کے مقابلہ میں کھڑا ہونا پڑتا ہے نہ کہ حقیقۃً کسی خارج کے مقابلہ میں۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی ظاہری دنیا کی سطح پر نہ جئے بلکہ غیب کی دنیا کی سطح پر جئے۔ اس سلسلے میں جن مراحل کی نشان دہی قرآن میں کی گئی ہے ان کو وہ شخص کیسے سمجھ سکتا ہے جو ان مراحل سے آشنا نہ ہوا ہو۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی صرف اللہ سے ڈرے اور صرف اللہ سے محبت کرے۔ اب جس کا دل اللہ کی محبت میں نہ تڑپا ہو، جس کے بدن کے رونگٹے اللہ کے خوف سے نہ کھڑے ہوئے ہوں وہ کیسے جان سکتا ہے کہ

اللہ سے ڈرنا کیا ہے اور اللہ سے محبت کرنا کیا۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی خدائی مشن میں اپنے آپ کو اس طرح شامل کرے کہ وہ اس کو اپنا ذاتی مسئلہ بنا لے۔ اب جس شخص نے خدا کے کام کو اپنا ذاتی کام نہ بنایا ہو وہ کیوں کر جانے گا کہ خدا کے ساتھ اپنے کو شامل کرنے کا مطلب کیا ہے۔ قرآن یہ چاہتا ہے کہ آدمی انسانوں کے چھیڑے ہوئے مسائل میں گم نہ ہو بلکہ خدا کی طرف سے برسنے والے فیضان میں اپنے کو گم کرے۔ اب جس شخص پر ایسے صبح و شام ہی نہ گزرے ہوں جب کہ خدا کے فیضان میں وہ نہا اٹھے وہ کیسے سمجھ سکتا ہے کہ خدائی فیضان میں نہانے کا مطلب کیا ہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی جہنم سے بھاگے اور جنت کی طرف دوڑے۔ اب جو شخص اس طرح زندگی گزارے کہ جہنم کو اس نے اپنا مسئلہ نہ بنایا ہو اور جنت اس کی ضرورت نہ بنی ہو اس کو کیا معلوم کہ جہنم سے بھاگنا کیا ہوتا ہے اور جنت کی طرف دوڑنا کیا معنی رکھتا ہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی اللہ کی عظمت و کبریائی کے احساس سے سرشار ہو۔ اب جو شخص اپنی عظمت و کبریائی کے مینار میں لذت لے رہا ہو اس کو اس کیفیت کا ادراک کہاں ہو سکتا ہے جب کہ آدمی خدا کی کبریائی کو اس طرح پاتا ہے کہ اپنی طرف اس کو عجز کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

قرآنی عمل اصلاً نفس یا انسان کے اندرونی وجود کی سطح پر ہوتا ہے۔ مگر انسان کسی خلا میں زندگی نہیں گزارتا بلکہ دوسرے بہت سے انسانوں کے درمیان رہتا ہے۔ اس لئے قرآنی عمل باعتبار حقیقت ذاتی عمل ہونے کے باوجود، دو پہلوؤں سے دوسرے انسانوں سے بھی متعلق ہو جاتا ہے۔ ایک اس اعتبار سے کہ آدمی جس قرآنی راستہ کو خود اپناتا ہے اسی راستہ کو اختیار کرنے کی وہ دوسروں کو بھی دعوت دیتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایک آدمی اور دوسرے آدمی کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ یہ رشتہ آدمی کو بے شمار تجربات سے گزارتا ہے جو مختلف صورتوں میں آخر وقت تک جاری رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مختلف قسم کے انسانوں کے درمیان زندگی گزارتے ہوئے طرح طرح کے تعلقات و معاملات پیش آتے ہیں۔ کسی سے لینا ہوتا ہے اور کسی کو دینا، کسی سے اتفاق ہوتا ہے اور کسی سے اختلاف، کسی سے دوری ہوتی ہے اور کسی سے قربت۔ ان مواقع پر آدمی کیا رویہ اختیار کرے اور کس قسم کا ردعمل پیش کرے، قرآن ان امور میں اس کی مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ اگر آدمی اپنی خواہش پر چلنا چاہے تو قرآن کا یہ باب اس پر بند رہے گا اور اگر وہ اپنے کو قرآن کی ماتحتی میں دیدے تو اس پر قرآنی تعلیمات کے ایسے بھید کھلیں گے جو کسی اور طرح اس پر کھل نہیں سکتے۔

قرآن آدمی کو جو مشن دیتا ہے وہ حقیقۃً کوئی "نظام" قائم کرنے کا مشن نہیں ہے۔ بلکہ اپنے آپ کو قرآنی کردار کی صورت میں ڈھالنے کا مشن ہے۔ قرآن کا اصل مخاطب فرد ہے نہ کہ سماج۔ اس لئے قرآن کا مشن فرد پر جاری ہوتا ہے نہ کہ سماج پر۔ تاہم افراد کی قابل لحاظ تعداد جب اپنے آپ کو قرآن کے مطابق ڈھالتی ہے تو اس کے سماجی نتائج بھی لازماً نکلنا شروع ہوتے ہیں۔ یہ نتائج ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے بلکہ حالات کے اعتبار سے ان کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ قرآن میں مختلف انبیاء کے واقعات انھیں سماجی نتائج یا سماجی ردعمل کے مختلف نمونے ہیں اور اگر عملی تجربات نے آدمی کی آنکھ کھول دی ہو تو وہ ہر صورت حال کی بابت قرآن میں رہنمائی پاتا چلا جاتا ہے —— قرآن فطرت انسانی کی کتاب ہے۔ قرآن کو وہی شخص بخوبی طور پر سمجھ سکتا ہے جس کے لئے قرآن اس کی فطرت کا متن بن جائے۔

حکومت کا تصور

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا حکومت پانا اور کسی کا حکومت سے محروم ہوجانا تمام تر اللہ کے اختیار کی چیز ہے "کہو، خدایا ملک کے مالک، تو جس کو چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے حکومت چھین لے۔ جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے (آل عمران ۲۶) اس کے بعد دوسری چیز جو قرآن سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ حکومت مسلمانوں کے لئے ایک امر موعود ہے، وہ ان کو اللہ کے انعام کے طور پر ملتی ہے "اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو زمین میں اقتدار دے گا جس طرح پچھلوں کو اقتدار دیا تھا، اور ان کے لئے ان کے دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کردے گا جس کو اللہ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری بندگی کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔ اور جو اس کے بعد انکار کرے تو وہی لوگ فاسق ہیں (نور ۵۵) پھر حکومت ملنے کے بعد مسلمان کیا کرتے ہیں، اس کا جواب قرآن کے ان لفظوں میں ملتا ہے "وہ لوگ جن کو ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ ادا کریں گے بھلائیوں کا حکم دیں گے اور برائیوں سے روکیں گے اور تمام معاملات کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے (حج ۴۱)

اوپر کی آیات سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ حکومت کا تعلق اللہ کی ان مصلحتوں سے ہے جن کے تحت وہ دنیا کا انتظام کر رہا ہے، اپنی انتظامی مصالح کے تحت اللہ کسی سے اقتدار چھینتا ہے اور اس کو کسی کے حوالے کرتا ہے۔ کسی کے پاس حکومت آگئی ہو تو اس کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ حکومت ہمیشہ کے لئے اس کی موروثی چیز بن گئی۔ اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ حکومت کو نشانہ بنا کر کوئی جدوجہد چلائی جائے۔ کیوں کہ حکومت کسی کو اپنی جدوجہد کی بنا پر نہیں ملتی۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو خدا کی طرف سے کسی کو دی جاتی ہے اور کسی کو نہیں دی جاتی۔

حکومت کی تقسیم میں اللہ کے یہاں سب سے پہلے جو گروہ قابل ترجیح ہے وہ اہل ایمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے وفادار بندوں کو حکومت و اقتدار عطا کرے گا مگر اس وعدہ کا تعلق کسی نسلی گروہ سے نہیں ہے بلکہ ان اہل ایمان سے ہے جو حقیقی معنوں میں اللہ کے مومن ہوں اور حقیقی معنوں میں عمل صالح کا ثبوت دیں۔ یہ وہ نیک بندے ہیں جو اپنے پورے وجود کے ساتھ اللہ کو اپنا مرکز توجہ بنا لیتے ہیں وہ اپنی محبتوں اور عقیدتوں میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے۔ وہ صرف اللہ سے ڈرتے ہیں اور اپنی زندگی کو اسی کی مرضی کے مطابق ڈھالتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کے نزدیک اس کے مستحق قرار پاتے ہیں کہ وہ ان کو حکومت و اقتدار عطا کرے۔ یہ حکومت مسلمانوں کے لئے کوئی "عہدہ" کی چیز نہیں ہوتی بلکہ "ذمہ داری" کی چیز ہوتی ہے۔ وہ اقتدار پاکر اور زیادہ جھک جاتے ہیں۔ وہ لوگوں کا استحصال کرنے کے بجائے لوگوں کے لئے نافع بنتے ہیں۔ وہ حکومت کی طاقت کو ذاتی مفادات کی تکمیل میں نہیں لگاتے بلکہ ان اصولوں کے قائم کرنے میں لگاتے ہیں جو اللہ نے تعلیم فرمایا ہے۔ ان کے سامنے جب کوئی معاملہ آتا ہے تو وہ خواہشوں اور مصلحتوں کے تحت اس کا فیصلہ نہیں کرتے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ انصاف کا تقاضا کیا ہے اور جو انصاف کا تقاضا ہو اس کے مطابق اپنا فیصلہ دے دیتے ہیں۔

اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں حاکم بنایا ہے۔ پس تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرو کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کے راستہ سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے، اس وجہ سے کہ انھوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا۔ اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے عبث نہیں پیدا کیا، یہ ان لوگوں کا گمان ہے جنھوں نے انکار کیا۔ پس جن لوگوں نے انکار کیا ان کے لئے آگ کی خرابی ہے۔ کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک کام کئے اور ان لوگوں کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں یکساں کر دیں گے۔ کیا ہم ڈرنے والوں کو ڈھیٹ لوگوں کے برابر کر دیں گے۔ یہ ایک برکت والی کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں اور عقل والے اس سے نصیحت لیں ۲۹ - ۲۶

ہر آدمی کو کہیں نہ کہیں اختیار حاصل ہوتا ہے۔ کسی کے اختیار کا دائرہ چھوٹا ہے اور کسی کا دائرہ بڑا۔ کوئی چھوٹے چھوٹے انفرادی معاملات میں اپنے اختیار کو استعمال کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور کوئی اداروں اور حکومتوں کے بڑے معاملات میں۔ اس طرح ہر شخص کی زندگی میں یہ صورت حال پیش آتی ہے کہ اس کے سامنے ایک معاملہ آتا ہے اور اس میں اس کو فیصلہ دینا ہوتا ہے۔ اس فیصلہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اس کو خالص حق کے معیار پر دیکھے اور بے لاگ جائزہ میں جو چیز انصاف نظر آئے اس کے مطابق اپنا فیصلہ دے دے، خواہ وہ اس کی مصلحتوں کے مطابق ہو یا اس کے خلاف۔ وہ صرف حق کے پہلو کو سامنے رکھے نہ کہ دوسرے دوسرے پہلوؤں کو۔ یہ حق کے ساتھ فیصلہ کرنا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جب معاملہ سامنے آئے تو آدمی کا ذہن دوسرے دوسرے پہلوؤں سے کام کرنے لگے۔ وہ یہ دیکھے کہ صاحب معاملہ اس کا دوست ہے یا دشمن۔ وہ کمزور اور ناقابل لحاظ ہے یا طاقتور اور قابل لحاظ۔ اس سے تلخ یادیں وابستہ ہیں یا اس سے اچھے تعلقات ہیں۔ اس نے اپنے مقدمہ کو نرم الفاظ میں پیش کیا ہے یا کڑے الفاظ میں۔ اس کا ساتھ دینا مصلحتوں کے مطابق ہے یا مصلحتوں کے خلاف۔ معاملہ سامنے آنے کے بعد آدمی کا ذہن ان پہلوؤں کے زیر اثر کام کرنے لگے۔ وہ انصاف کے پہلو کو چھوڑ کر دوسرے پہلوؤں کی بنیاد پر فیصلہ کرے۔ اسی دوسری صورت کا نام خواہش کی پیروی ہے اور یہی زمین میں فساد برپا کرنا ہے، کیوں کہ ایسا کرنا خدا کے اس نقشہ کو بگاڑنے کے ہم معنی ہے جس کے مطابق خدا نے اس دنیا کو بنایا ہے۔

جو شخص اللہ سے ڈرتا ہو وہ کبھی حق و انصاف سے ہٹنا گوارا نہیں کرے گا۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ سارا معاملہ بالآخر اللہ کے یہاں پیش ہونے والا ہے۔ خدا کی عدالت سامنے آتے ہی ہر دوسری چیز باطل ہو جائے گی اور وہی چیز حق ہوگی جس کو اللہ حق بتائے۔ ایسی حالت میں جو شخص یہ ڈھٹائی دکھائے کہ وہ اپنی خواہشوں اور مصلحتوں کی پیروی کرے وہ حساب کے دن کو بھولا ہوا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اللہ سے ڈرنا اور اللہ سے بے خوف ہو کر زندگی گزارنا دونوں یکساں حالتیں ہیں۔ وہ دنیا کو ایک ایسا بے معنی ہنگامہ خیال کرتا ہے جس کا کوئی نتیجہ آگے نکلنے والا نہ ہو۔ مگر یہ سب سے بڑی بھول ہے اور قرآن اسی لئے اتارا گیا ہے کہ وہ انسان کو اس خطرناک بھول سے نکالے۔

اللہ تم کو تمھاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ اگر عورتیں دو سے زائد ہیں تو ان کے لئے دو تہائی ہے اس مال سے جو مورث چھوڑ گیا ہے اور اگر وہ اکیلی ہے تو اس کے لئے آدھا ہے۔ اور میت کے ماں باپ کو دونوں میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ ہے اس مال کا جو وہ چھوڑ گیا ہے بشرطیکہ مورث کے اولاد ہو۔ اور اگر مورث کے اولاد نہ ہو اور اس کے ماں باپ اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا تہائی ہے اور اگر اس کے بھائی بہن ہوں تو اس کی ماں کے لئے چھٹا حصہ ہے۔ یہ حصے وصیت نکالنے کے بعد یا ادائے قرض کے بعد ہیں جو وہ کر جاتا ہے۔ تمھارے باپ ہوں کہ تمھار[illegible] بیٹے ہوں، تم نہیں جانتے کہ ان میں تمھارے لئے سب سے زیادہ نافع کون ہے۔ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا فریضہ ہے۔ بے شک اللہ علم والا حکمت والا ہے۔ اور تمھارے لئے اس مال کا آدھا حصہ ہے جو تمھاری بیویاں چھوڑیں۔ بشرطیکہ ان کے اولاد نہ ہو۔ [illegible] اگر ان کے اولاد ہو تو تمھارے لئے بیویوں کے ترکہ کا چوتھائی ہے وصیت نکالنے کے بعد جس کی وہ وصیت کر جائیں یا ادا[illegible] قرض کے بعد۔ اور ان بیویوں کے لئے چوتھائی ہے تمھارے ترکہ کا اگر تمھارے اولاد نہیں ہے، اور اگر تمھارے اولاد ہے تو ا[illegible] کے لئے آٹھواں حصہ ہے تمھارے ترکہ کا بعد وصیت نکالنے کے جس کی تم وصیت کر جاؤ یا ادائے قرض کے بعد۔ اور اگر کوئی مور[illegible] مرد یا عورت ایسا ہو جس کے نہ اصول ہوں اور نہ فروع، اور اس کے ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو دونوں میں سے ہر ایک کے لئے چ[illegible] حصہ ہے۔ اور اگر وہ اس سے زائد ہوں تو وہ ایک تہائی میں شریک ہوں گے بعد وصیت نکالنے کے جس کی وصیت کی گئی ہو ادائے قرض کے بعد، بغیر کسی کو نقصان پہنچائے۔ یہ حکم اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ علیم و حلیم ہے۔ یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدیں [illegible] اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اس کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کے مقرر[illegible] ہوئے ضابطوں سے باہر نکل جائے گا اس کو وہ آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے ذلت والا عذا[illegible] ہے ۱۱-۱۴

آدمی جو قانون بناتا ہے اس میں کسی نہ کسی پہلو کی طرف جھکاؤ ہو جاتا ہے۔ قدیم قبائلی دور میں لڑکا بہت اہمیت رکھتا کیوں کہ وہ قبیلہ کے لئے طاقت کا ذریعہ تھا، اس لئے وراثت میں لڑکی کو محروم کر کے سارا حق لڑکے کو دے دیا گیا۔ موجودہ زمانہ میں کا ردعمل ہوا تو لڑکا اور لڑکی دونوں برابر کر دئے گئے۔ لیکن پچھلا اصول اگر غیر منصفانہ تھا تو موجودہ اصول غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ صرف اللہ ہے جس کا علم و حکمت اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ جو قانون دے وہ ہر قسم کی بے اعتدالی سے پاک ہو۔ اللہ نے ا[illegible] سلسلہ میں جو ضابطے مقرر کئے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ سماجی انصاف کا حقیقی ذریعہ ہیں بلکہ آخرت کی زندگی سے بھی ان کا گہرا تعلق ہے [illegible] کے حقوق ادا کرنا، وصیت کی تعمیل کرنا، وراثت کو اس کے وارثوں تک پہنچانا ان امور میں سے ہیں جن پر آدمی کی دوزخ اور جنت [illegible] انحصار ہے۔ ⅓ حصہ میں وصیت کرنا شرعاً جائز ہے۔ لیکن کوئی شخص ایسی وصیت کرے جس کا مقصد حق دار کو وراثت محروم کرنا ہو تو یہ ایسا گناہ ہے جو اس کو جہنم کا مستحق بنا سکتا ہے (من ضار فی وصیتہ القاہ اللہ فی وادی جھنم حدیث) اس معاملہ میں آدمی کو خدا کے مقرر کئے ہوئے ضابطہ پر چلنا ہے نہ کہ ذاتی خواہشوں اور خاندانی مصلحتوں کے اوپر۔

اور تمھاری عورتوں میں سے جو کوئی بدکاری کرے تو ان پر اپنوں میں سے چار مرد گواہ کرو۔ پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو گھروں کے اندر بند رکھو، یہاں تک کہ ان کو موت اٹھالے یا اللہ ان کے لئے کوئی راہ نکال دے۔ اور تم میں سے دو مرد جو وہی بدکاری کریں تو ان کو اذیت پہنچاؤ۔ پھر اگر وہ دونوں توبہ کریں اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان کا خیال چھوڑ دو۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ توبہ جس کی قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے وہ ان لوگوں کی ہے جو بری حرکت نادانی سے کر بیٹھتے ہیں، پھر جلد ہی توبہ کرلیتے ہیں۔ وہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور ایسے لوگوں کی توبہ نہیں ہے جو برابر گناہ کرتے رہیں، یہاں تک کہ جب موت ان میں سے کسی کے سامنے آجائے تب وہ کہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ان لوگوں کی توبہ ہے جو اس حال میں مرتے ہیں کہ وہ کافر ہیں، ان کے لئے تو ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے

۱۵ — ۱۸

کوئی مرد یا عورت اگر ایسا فعل کر بیٹھے جو شریعت کے نزدیک گناہ ہو تب بھی اس کے ساتھ جو معاملہ کیا جائے گا وہ قانون کے مطابق کیا جائے گا نہ کہ قانون سے آزاد ہو کر۔ قانون کے تقاضے پورا کئے بغیر کسی کو مجرم قرار دینا درست نہیں، کسی کا مجرم ہونا دوسرے کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس کے خلاف ظالمانہ کارروائی کرنے لگے۔ سزا کا مقصد عدل کا قیام ہے اور عدل کا قیام ظلم اور بے انصافی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر گناہ کرنے والا تائب ہو اور اپنی اصلاح کرلے تو اس کے بعد تو لازم ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ شفقت اور درگزر کا معاملہ کیا جائے۔ کسی کے ماضی کی بنیاد پر اس کو مطعون کرنا درست نہیں۔ جب اللہ توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور اپنی اصلاح کرلینے والوں کی طرف دوبارہ مہربانی کے ساتھ پلٹ آتا ہے تو انسانوں کا کیا حق ہے کہ ایسے کسی شخص کو طنز و ملامت کا نشانہ بنائیں۔ ایسے کسی شخص کو طنز و ملامت کا نشانہ بنا کر آدمی خود اپنے آپ کو مجرم ثابت کر رہا ہے نہ کہ کسی دوسرے آدمی کو۔

توبہ زبان سے "توبہ" کا لفظ بولنے کا نام نہیں۔ یہ اپنی گنہ گاری کے شدید احساس کا نام ہے۔ اور آدمی اگر اپنی توبہ میں سنجیدہ ہو اور واقعی شدت کے ساتھ اس نے اپنی گنہ گاری کو محسوس کیا ہو تو وہ آدمی کے لئے اتنا سخت معاملہ ہوتا ہے کہ توبہ آدمی کے لئے اپنی سزا آپ دینے کے ہم معنی بن جاتی ہے۔ یہ کیفیت آدمی کے اندر اگر اللہ کے ڈر سے پیدا ہوئی ہو تو اللہ ضرور اس کو معاف کر دیتا ہے۔ مگر ان لوگوں کے توبہ کی اللہ کے نزدیک کوئی قیمت نہیں جو اتنے جری ہوں کہ جان بوجھ کر اللہ کی نافرمانی کرتے رہیں۔ اور تنبیہ کے باوجود اس پر قائم رہیں، البتہ جب دنیا سے جانے کا وقت آجائے تو کہیں کہ "میں نے توبہ کی" اسی طرح ان لوگوں کی توبہ بھی بے فائدہ ہے جو آخرت میں عذاب کو سامنے دیکھ کر اپنے جرم کا اقرار کریں گے

توبہ کی حقیقت بندے کا اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے تاکہ اس کا رب بھی اس کی طرف پلٹے۔ توبہ اس شخص کے لئے ہے جو وقتی جذبہ سے مغلوب ہو کر بری حرکت کر بیٹھے، پھر اس کا احتساب نفس جلد ہی اس کو اپنی غلطی کا احساس کرا دے وہ برائی کو چھوڑ کر دوبارہ نیکی کی روش اختیار کرے اور شریعت کے مطابق اپنی زندگی کی اصلاح کرلے۔ ایسا ہی آدمی توبہ کرنے والا ہے اور جو شخص اس

[illegible]

اے ایمان والو تمھارے لئے جائز نہیں کہ تم عورتوں کو زبردستی اپنی میراث میں لے لو اور نہ ان کو اس غرض سے روکے رکھو کہ تم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس کا کچھ حصہ ان سے لے لو مگر اس صورت میں کہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی کریں۔ اور ان کے ساتھ اچھی طرح گزر بسر کرو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمھارے لئے بہت بڑی بھلائی رکھ دی ہو۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم اس کو بہت سا مال دے چکے ہو تو تم اس میں سے کچھ واپس نہ لو کیا تم اس کو بہتان لگا کر اور صریح ظلم کرکے واپس لوگے۔ اور تم کس طرح اس کو لوگے جب کہ ایک دوسرے سے خلوت کر چکا ہے اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔ اور ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمھارے باپ نکاح کر چکے ہیں، مگر جو پہلے ہو چکا۔ بے شک یہ بے حیائی ہے اور نفرت کی بات ہے اور بہت برا طریقہ ہے ۲۲-۱۹

مرنے والے کے مال میں یقیناً بعد والوں کو وراثت کا حق ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ مرنے والے کی بیوی کو بھی بعد کے لوگ اپنی میراث سمجھ لیں اور جس طرح چاہیں اس کو استعمال کریں۔ مال ایک بے حس اور محکوم چیز ہے اور اس میں وراثت چلتی ہے۔ مگر انسان ایک زندہ اور آزاد ہستی ہے۔ اس کو اختیار ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرے ــــ عورت میں اگر کوئی جسمانی یا مزاجی کمی ہے تو اس کو برداشت کرتے ہوئے عورت کو موقع دینا چاہئے کہ وہ اللہ کی دی ہوئی دوسری خصوصیتوں کو بروئے کار لاکر گھر کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کرے۔ آدمی کو چاہئے کہ ظاہری ناپسندیدگی کو بھول کر باہمی تعلق کو نبھائے۔ کسی خاندان اور اسی طرح کسی معاشرہ کی ترقی و استحکام کا راز یہ ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کی کمیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی خوبیوں کو بروئے کار آنے کا موقع دیں۔ جو لوگ اللہ کی خاطر موجودہ دنیا میں صبر و برداشت کا طریقہ اختیار کریں وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت کی جنتوں میں داخل کئے جائیں گے۔

جب آدمی کو اپنا شریک حیات ناپسند ہو اور وہ صبر کا طریقہ اختیار نہ کرکے علیحدگی کا فیصلہ کرے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس علیحدگی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے وہ دوسرے فریق کی خامیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ وہ اس پر جھوٹے الزام لگاتا ہے۔ وہ اس کے خلاف ظالمانہ کارروائی کرتا ہے تاکہ وہ گھبرا کر خود ہی بھاگ جائے۔ اسی طرح جب آدمی کسی سے تعلق توڑتا ہے تو ضد میں آکر فریق ثانی کو دی ہوئی چیزیں اس سے واپس چھیننے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر یہ سب عہد کی خلاف ورزی ہے اور عہد اللہ کی نظر میں ایسی مقدس چیز ہے کہ اگر وہ غیر تحریری شکل میں ہو تب بھی اس کی پابندی اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ تحریری عہد کی۔

"جو ہوچکا سو ہوچکا" کا اصول صرف نکاح سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک عام اصول ہے۔ زندگی کے نظام میں جب بھی کوئی تبدیلی آتی ہے، خواہ وہ گھریلو زندگی میں ہو یا قومی زندگی میں، تو ماضی کے بہت سے امور ایسے ہوتے ہیں جو نئے انقلاب کے معیار پر غلط نظر آتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ماضی کو کریدنا اور گزری ہوئی غلطیوں پر احکام صادر کرنا بے شمار نئے مسائل پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ ماضی کو بھلا دیا جائے اور صرف حال اور مستقبل کی اصلاح پر اپنی کوششوں کو لگا دیا جائے،

تمہارے اوپر حرام کی گئیں تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں، تمہاری بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنھوں نے تم کو دودھ پلایا، تمہاری دودھ شریک بہنیں، تمہاری عورتوں کی مائیں اور ان کی بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں ہیں جو تمہاری ان بیویوں سے ہوں جن سے تم نے صحبت کی ہے، لیکن اگر ابھی تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اور تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں اور یہ کہ تم اکٹھا کرو دو بہنوں کو مگر جو پہلے ہو چکا۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور وہ عورتیں بھی حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں مگر یہ کہ وہ جنگ میں تمہارے ہاتھ آئیں۔ یہ اللہ کا حکم ہے تمہارے اوپر۔ ان کے علاوہ جو عورتیں ہیں وہ سب تمہارے لئے حلال ہیں بشرطیکہ تم اپنے مال کے ذریعہ سے ان کے طالب بنو، ان کو قید نکاح میں لے کر نہ کہ بدکاری کے طور پر۔ پھر ان عورتوں میں سے جن کو تم کام میں لائے ان کو ان کا طے شدہ مہر دے دو۔ اور مہر کے ٹھہرانے کے بعد جو تم نے آپس میں راضی نامہ کیا ہو تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور تم میں سے جو شخص مقدرت نہ رکھتا ہو کہ آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکے تو اس کو چاہئے کہ وہ تمہاری ان کنیزوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کر لے جو تمہارے قبضہ میں ہوں اور مومنہ ہوں۔ اللہ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے، تم آپس میں ایک ہو۔ پس ان کے مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کر لو اور معروف طریقہ سے ان کے مہر ادا کر دو، اس طرح کہ وہ قید نکاح میں لائی جائیں نہ کہ آزاد شہوت رانی کریں اور چوری چھپے آشنائیاں کریں۔ پھر جب وہ قید نکاح میں آجائیں اور اس کے بعد وہ بدکاری کی مرتکب ہوں تو آزاد عورتوں کے لئے جو سزا ہے اس کی نصف سزا ان پر ہے۔ یہ اس کے لئے ہے جو تم میں سے بدکاری کا اندیشہ رکھتا ہو۔ اور اگر تم ضبط سے کام لو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۲۳ - ۲۵

انسان کے اندر بہت سی فطری خواہشیں ہیں۔ انھیں میں سے ایک شہوانی خواہش ہے جو عورت اور مرد کے درمیان پائی جاتی ہے۔ شریعت تمام انسانی جذبات کی حد بندی کرتی ہے۔ اسی طرح اس نے شہوانی جذبات کے لئے بھی حدود اور ضابطے مقرر کئے ہیں۔ شریعت الٰہی کے مطابق عورت اور مرد کے درمیان صرف وہی شہوانی تعلق صحیح ہے جو نکاح کی صورت میں ایک سنجیدہ معاشرتی معاہدہ کی حیثیت سے قائم ہو۔ پھر یہ کہ جس طرح فطری جذبات کی تسکین ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ خاندانی زندگی میں تقدس کی فضا موجود رہے۔ اس مقصد کے لئے نسب یا رضاعت یا مصاہرت کے تحت قائم ہونے والے کچھ رشتوں کو حرام قرار دے دیا گیا تاکہ بالکل قریبی رشتوں کے درمیان تعلق شہوانی جذبات سے بالا رہے۔

انسان کی عزت وبڑائی کا معیار وہ دکھائی دینے والی چیزیں نہیں ہیں جن پر لوگ ایک دوسرے کی عزت وبڑائی کو ناپتے ہیں۔ بلکہ بڑائی کا معیار وہ نہ دکھائی دینے والا ایمان ہے جو صرف اللہ کے علم میں ہوتا ہے۔ گویا کسی کا عزت والا ہونا یا بے عزت والا ہونا ایسی چیز نہیں جو آدمی کو معلوم ہو۔ یہ تمام تر نامعلوم چیز ہے اور اس کا فیصلہ آخرت میں اللہ کی عدالت میں ہونے والا ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جو آدمی سے برتری کا احساس چھین لیتا ہے۔ اور برتری کا احساس ہی وہ چیز ہے جو بیشتر معاشرتی خرابیوں کی اصل جڑ ہے۔

اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے واسطے بیان کرے اور تمھیں ان لوگوں کے طریقوں کی ہدایت دے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور تم پر توجہ کرے، اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے اوپر توجہ کرے اور جو لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ راست سے بہت دور نکل جاؤ۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ کو ہلکا کرے اور انسان کمزور بنایا گیا ہے ۲۶ - ۲۸

زندگی کے طریقے جو قرآن میں بتائے گئے ہیں وہ کوئی نئے نہیں ہیں۔ ہر دور میں اللہ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ ان کا اعلان کراتا رہا ہے۔ ہر زمانہ کے خدا پرست لوگوں کا اسی پر عمل تھا۔ مگر قدیم آسمانی کتابوں کے محفوظ نہ رہنے کی وجہ سے یہ طریقے گم ہوگئے۔ اب اللہ نے اپنے آخری رسول کے ذریعہ ان کو عربی زبان میں اتارا اور ان کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ آج جب کوئی گروہ ان طریقوں پر اپنی زندگی کو ڈھالتا ہے تو گویا وہ صالحین کے اس ابدی قافلہ میں شامل ہو جاتا ہے جن کو اللہ کی رحمتوں میں حصہ ملا، جو ہر زمانہ میں اللہ کے اس راستہ پر چلے جس کو اللہ نے اپنے وفادار بندوں کے لئے کھولا تھا۔

ہر انسانی گروہ میں ایسا ہوتا ہے کہ کچھ چیزیں صدیوں کے رواج سے جڑ جما لیتی ہیں۔ وہ لوگوں کے ذہنوں پر اس طرح چھا جاتی ہیں کہ ان کے خلاف سوچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جب اللہ کا کوئی بندہ معاشرتی اصلاح کا کام شروع کرتا ہے تو اس قسم کے لوگ چیخ اٹھتے ہیں۔ اپنے مانوس طریقوں کو چھوڑ کر نامانوس طریقوں کو اختیار کرنا ان کے لئے سخت دشوار ہو جاتا ہے۔ وہ ایسی اصلاحی تحریک کے دشمن بن جاتے ہیں جو ان کو ان کے باپ دادا کے طریقوں سے ہٹانا چاہتی ہو۔ اس سلسلے میں طبقہ کا ردعمل اور بھی زیادہ شدید ہوتا ہے۔ جب دین کا اندرونی پہلو کمزور ہوتا ہے تو خارجی موشگافیاں جنم لیتی ہیں۔ اب آداب و قواعد کا ایک ظاہری ڈھانچہ بنا لیا جاتا ہے۔ لوگ دین کی اصل کیفیات سے خالی ہوتے ہیں اور ظاہری آداب و قواعد کی پابندی کر کے سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کے دین پر قائم ہیں۔ یہ خود ساختہ دین اسلاف سے منسوب ہو کر دھیرے دھیرے مقدس بن جاتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ خدا کا سادہ اور فطری دین ان کو اجنبی معلوم ہوتا ہے اور اپنا جکڑ بندیوں والا دین عین برحق نظر آتا ہے۔ ایسی حالت میں جو تحریک اصلی اور ابتدائی دین کو زندہ کرنے کے لئے اٹھے وہ اس کے شدید مخالف ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں ان کو اپنی دین داری کی نفی ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مثلاً خدا کی شریعت میں حیض کے زمانہ میں عورت کے ساتھ مباشرت ناجائز ہے، اس کے علاوہ دوسرے تعلقات اسی طرح رکھے جا سکتے ہیں جس طرح عام دنوں میں ہوتے ہیں۔ یہودیوں نے اس سادہ حکم پر اضافہ کر کے یہ مسئلہ بنایا کہ ایام ماہواری میں عورت کی پکائی ہوئی چیز کو کھانا، اس کے ہاتھ کا پانی پینا، اس کے ساتھ ایک جگہ بیٹھنا، اس کو اپنے ہاتھ سے چھونا، سب ناجائز یا کم از کم تقویٰ کے خلاف ہیں۔ اس طرح حائضہ عورت سے مکمل دوری گویا پارسائی کی علامت بن گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں جب خدا کی اصلی شریعت کو زندہ کیا تو یہودی بگڑ گئے۔ وہ چیز جس پر انھوں نے اپنی پارسائی کی عمارت کھڑی کی تھی دفعتہً گرتی ہوئی نظر آئی ـــــــ خدا کے سادہ دین کو جب بھی زندہ کیا جائے تو وہ لوگ اس کے سخت مخالف ہو جاتے ہیں جو بناوٹی دین کے اوپر اپنی دین داری کی عمارت کھڑی کئے ہوئے ہوں۔ یہ ان سے سرداری چھیننے کے ہم معنی ہوتا ہے اور سرداری کا چھننا کوئی برداشت نہیں کرتا۔

اے ایمان والو، آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے۔ اور خون نہ کرو آپس میں۔ بے شک اللہ تمھارے اوپر بڑا مہربان ہے۔ اور جو شخص سرکشی اور ظلم سے ایسا کرے گا اس کو ہم ضرور آگ میں ڈالیں گے اور یہ اللہ کے لئے آسان ہے۔ اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچتے رہے جن سے تمھیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمھاری چھوٹی برائیوں کو معاف کر دیں گے اور تم کو عزت کی جگہ داخل کریں گے۔ اور تم ایسی چیز کی تمنا نہ کرو جس میں اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے۔ مردوں کے لئے حصہ ہے اپنی کمائی کا اور عورتوں کے لئے حصہ ہے اپنی کمائی کا۔ اور اللہ سے اس کا فضل مانگو۔ بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اور ہم نے والدین اور قرابت مندوں کے چھوڑے ہوئے میں سے ہر ایک کے لئے وارث ٹھہرا دئے ہیں اور جن سے تم نے عہد باندھ رکھا ہو تو ان کو ان کا حصہ دے دو، بے شک اللہ کے روبرو ہے ہر چیز ۲۹ - ۳۳

ایک کا مال دوسرے تک پہنچنے کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے کی ضرورت فراہم کرے اور اس سے اپنی محنت کا معاوضہ لے۔ یہ تجارت ہے اور شریعت کے مطابق یہی کسب معاش کا صحیح طریقہ ہے۔ اس کے بجائے چوری، دھوکا، جھوٹ، رشوت، سود، جوا وغیرہ سے جو مال کمایا جاتا ہے وہ خدا کی نظر میں ناجائز طریقہ سے کمایا ہوا مال ہے۔ یہ لوٹ کی مختلف قسمیں ہیں اور جو لوگ تجارت کے بجائے لوٹ کو اپنا ذریعہ معاش بنائیں وہ دنیا میں خواہ کامیاب رہیں مگر آخرت میں ان کے لئے آگ کا عذاب ہے۔ آدمی کی جان کا معاملہ بھی یہی ہے۔ آدمی کو مارنے کا حق صرف ایک قائم شدہ حکومت کو ہے جو خدا کے قانون کے تحت باقاعدہ الزام ثابت ہونے کے بعد اس کے خلاف کارروائی کرے۔ اس کے سوا جو شخص کسی کو اس کی زندگی سے محروم کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ فعل حرام کا ارتکاب کرتا ہے جس کے لئے اللہ کے یہاں سخت سزا ہے۔ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا جرم عدوان اور سرکشی ہے یعنی حد سے نکلنا اور ناحق کسی کو ستانا۔ جو لوگ عدوان اور ظلم سے اپنے کو بچائیں ان کے ساتھ اللہ یہ خصوصی معاملہ فرمائے گا کہ وہ آخرت کی دنیا میں اس طرح داخل ہوں گے کہ ان کی معمولی کوتاہیاں اور لغزشیں ان سے دور کی جا چکی ہوں گی۔

دنیا میں ایک آدمی اور دوسرے آدمی کے درمیان فرق رکھا گیا ہے۔ کسی کو جسمانی اور ذہنی قوتوں میں کم حصہ ملا ہے اور کسی کو زیادہ۔ کوئی اچھے حالات میں پیدا ہوتا ہے اور کوئی برے حالات میں۔ کسی کے پاس بڑے بڑے ذرائع ہیں اور کسی کے پاس معمولی ذرائع۔ آدمی جب کسی دوسرے کو اپنے سے بڑھا ہوا دیکھتا ہے تو اس کے اندر فوراً اس کے خلاف جلن پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے اجتماعی زندگی میں حسد، عداوت اور باہمی کش مکش پیدا ہوتی ہے۔ مگر ان چیزوں کے اعتبار سے اپنے یا دوسرے کو تولنا نادانی ہے۔ یہ سب دنیوی اہمیت کی چیزیں ہیں۔ یہ دنیا میں ملی ہیں اور دنیا ہی میں رہ جانے والی ہیں۔ اصل اہمیت آخرت کی کامیابی کی ہے اور آخرت کی کامیابی میں ان چیزوں کا کچھ بھی دخل نہیں۔ آخرت کی کامیابی کا انحصار اس عمل پر ہے جو آدمی ارادہ و اختیار سے اللہ کے لئے کرتا ہے۔ اس لئے بہترین عقل مندی یہ ہے کہ آدمی حسد سے اپنے آپ کو بچائے اور اللہ سے توفیق کی دعا کرتے ہوئے اپنے آپ کو آخرت کے لئے عمل کرنے میں لگا دے۔

مرد عورتوں کے اوپر قوام ہیں۔ اس بنا پر کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد نے اپنے مال خرچ کئے۔ پس جو نیک عورتیں ہیں وہ فرماں برداری کرنے والی، پیٹھ پیچھے نگہبانی کرتی ہیں اللہ کی حفاظت سے۔ اور جن عورتوں سے تم کو سرکشی کا اندیشہ ہو ان کو سمجھاؤ اور ان کو ان کے بستروں میں تنہا چھوڑ دو اور ان کو سزا دو۔ پس اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف الزام کی راہ نہ تلاش کرو۔ بے شک اللہ سب سے اوپر ہے، بہت بڑا ہے۔ اور اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان تعلقات بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایک منصف مرد کے رشتہ داروں میں سے کھڑا کرو اور ایک منصف عورت کے رشتہ داروں میں سے کھڑا کرو۔ اگر دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کر دے گا۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے ۳۵-۳۴

جہاں بھی آدمیوں کا کوئی مجموعہ ہو، خواہ وہ خاندان کی صورت میں ہو یا مملکت کی صورت میں، ضروری ہے کہ اس کے اوپر سردار اور سربراہ ہو، اور یہ سربراہ لازماً ایک ہی ہو سکتا ہے۔ دنیا کے بارے میں اللہ کا بنایا ہوا جو منصوبہ ہے اس میں خاندان کی سربراہی کے لئے مرد کو متعین کیا گیا ہے اور اسی کے لحاظ سے اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ مرد کی بناوٹ اور عورت کی بناوٹ میں جو حیاتیاتی اور نفسیاتی فرق ہے وہ اللہ کے اسی تخلیقی منصوبہ کی مطابقت میں ہے۔ اب اگر کچھ لوگ اللہ کے منصوبہ کے خلاف چلیں تو وہ صرف بگاڑ پیدا کرنے کا سبب بنیں گے۔ کیوں کہ خدا کا کارخانہ تو مرد اور عورت کو بدستور اپنے منصوبہ کے مطابق بناتا رہے گا جس میں "قوامیت" کی صلاحیتیں مرد کو دی گئی ہوں گی اور "اطاعت" کی صلاحیتیں عورت کو۔ جب کہ ان کے معاشرتی استعمال میں خدائی تخلیق کی رعایت نہ ہو رہی ہوگی۔ ایسے ہر تضاد کا نتیجہ اس دنیا میں صرف بگاڑ ہے۔

بہترین عورت وہ ہے جو اللہ کے تخلیقی منصوبہ میں اپنے کو شامل کرتے ہوئے مرد کی برتری تسلیم کرلے۔ اسی طرح بہترین مرد وہ ہے جو اپنی برتر حیثیت کی بنا پر اس حقیقت کو بھول نہ جائے کہ خدا اس سے بھی زیادہ برتر ہے۔ خدا کی عدالت میں عورت مرد کا کوئی فرق نہیں، یہ فرق تمام تر صرف انتظام دنیا کے اعتبار سے ہے نہ کہ آخرت میں تقسیم انعامات کے اعتبار سے۔ مرد کو چاہئے کہ وہ عورت کے حق میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا پورا اہتمام کرے۔ کوئی عورت اگر ایسی ہو جو مرد کی انتظامی بڑائی کو نہ مانے تو ایسا ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ مرد کے اندر انتقام کا جذبہ ابھر آئے یا وہ الزامات لگا کر عورت کو بدنام کرے۔ کوئی بھی برتری کسی کو انصاف کی پابندی سے بری الذمہ نہیں کرتی۔ البتہ خصوصی حالات میں مرد کو یہ حق ہے کہ کسی عورت کے اندر اگر وہ سرتابی دیکھے تو اس کی اصلاح کی کوشش کرے۔ یہ اصلاح اولاً سمجھانے بجھانے سے شروع ہوگی۔ پھر دباؤ ڈالنے کے لئے ترک کلام اور ترک تعلق کیا جا سکتا ہے۔ آخری درجہ میں مرد اس کو ہلکی سزا دے سکتا ہے، جیسے مسواک سے مارنا۔

دو آدمیوں میں جب باہمی اختلاف ہو تو دونوں کا ذہن ایک دوسرے کے بارے میں متاثر ذہن بن جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں خالص واقعاتی انداز سے سوچ نہیں پاتے۔ ایسی حالت میں معاملہ کو طے کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ دونوں اپنے سوا کسی دوسرے کو حکم بنانے پر راضی ہو جائیں۔ دوسرا شخص معاملہ سے ذاتی طور پر وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے غیر متاثر ذہن کے تحت سوچے گا اور ایسے فیصلہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا جو حقیقت واقعہ کے مطابق ہو۔

اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ بناؤ۔ اور اچھا سلوک کرو ماں باپ کے ساتھ اور قرابت داروں کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں اور قرابت دار پڑوسی اور اجنبی پڑوسی اور پاس بیٹھنے والے اور مسافر کے ساتھ اور مملوک کے ساتھ۔ بے شک اللہ پسند نہیں کرتا اترانے والے بڑائی کرنے والے کو جو کہ بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل سکھاتے ہیں اور جو کچھ انھیں اللہ نے اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس کو چھپاتے ہیں۔ اور ہم نے منکروں کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے، اور جس کا ساتھی شیطان بن جائے تو وہ بہت برا ساتھی ہے۔ ان کا کیا نقصان تھا اگر وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے اور اللہ نے جو کچھ انھیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے۔ اور اللہ ان سے اچھی طرح باخبر ہے۔ بے شک اللہ ذرا بھی کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا۔ اگر نیکی ہو تو وہ اس کو دگنا بڑھا دیتا ہے اور اپنے پاس سے بہت بڑا ثواب دیتا ہے ۳۶ — ۴۰

انسان کے پاس جو کچھ ہے سب اللہ کا دیا ہوا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے، وہ اس کا عبادت گزار بن جائے۔ جب آدمی اس طرح اللہ والا بنتا ہے تو اس کے اندر فطری طور پر تواضع کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ مزاج ان انسانوں سے تعلقات میں ظاہر ہوتا ہے جن کے درمیان وہ زندگی گزار رہا ہو۔ اس کا یہ مزاج ماں باپ کے معاملہ میں حسن سلوک کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ہر شخص جس سے اس کا واسطہ پڑتا ہے وہ اس کو ایسا انسان پاتا ہے جیسے وہ اللہ کو اپنے اوپر کھڑا ہوا دیکھ رہا ہو۔ وہ ہر ایک کا حق اس کے تعلق کے موافق اور اس کی حاجت مندی کے مناسب ادا کرنے والا بن جاتا ہے۔ جو شخص بھی کسی حیثیت سے اس کے ربط میں آتا ہے اس کو نظر انداز کرنا اس کو ایسا لگتا ہے جیسے وہ خود اپنے کو اللہ کے یہاں نظر انداز کئے جانے کا خطرہ مول لے رہا ہے۔

جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے نہ کرے اس کے اندر فخر کی نفسیات ابھرتی ہے۔ اس کے پاس جو کچھ ہے اس کو وہ اپنی محنت و قابلیت کا کرشمہ سمجھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی کمائی کو صرف اپنا حق سمجھتا ہے۔ کمزور رشتہ داروں یا محتاجوں سے تعلق جوڑنا اس کو اپنے مقام سے نیچے درجہ کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنی مصلحتوں یا خواہشوں کی تسکین میں خوب مال خرچ کرتا ہے مگر وہ مدیں جن میں خرچ کرنا اس کی انا کو غذا دینے والا نہ ہو وہاں خرچ کرنے میں دل تنگ ہوتا ہے۔ نمائش کے مواقع پر خرچ کرنے میں وہ فیاض ہوتا ہے اور خاموش دینی مواقع پر خرچ کرنے میں بخیل۔ جو لوگ خدا کی نعمت سے تواضع کے بجائے فخر کی غذا لیں، جو خدا کے دئے ہوئے مال کو خدا کی بتائی ہوئی مدوں میں نہ خرچ کریں، البتہ اپنے نفس کے تقاضوں پر خرچ کرنے کے لئے فیاض ہوں، ایسے لوگ شیطان کے ساتھی ہیں۔ شیطان نے ان کو کچھ سامنے کا نفع دکھایا تو وہ اس کی طرف دوڑ پڑے اور خدا جس ابدی نفع کا وعدہ کر رہا تھا اس سے ان کو دلچسپی نہ ہو سکی۔ ان کے لئے خدا کے یہاں سخت عذاب کے سوا اور کچھ نہیں۔ آدمی خود جو کام نہ کرے اس کو وہ غیر اہم بتاتا ہے۔ یہ اپنے معاملہ کو نظریاتی معاملہ بناتا ہے، یہ اپنے کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش ہے۔ مگر اس قسم کی کوئی بھی کوشش اللہ کے یہاں کسی کے کام آنے والی نہیں۔

پھر اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور تم کو ان لوگوں کے اوپر گواہ بنا کر کھڑا کریں گے۔ وہ لوگ جنھوں نے انکار کیا اور پیغمبر کی نافرمانی کی اس روز تمنا کریں گے کہ کاش زمین ان پر برابر کر دی جائے، اور وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔ اے ایمان والو، نزدیک نہ جاؤ نماز کے جس وقت کہ تم نشہ میں ہو یہاں تک کہ سمجھنے لگو جو تم کہتے ہو، اور نہ اس وقت کہ غسل کی حاجت ہو مگر راہ چلتے ہوئے، یہاں تک کہ غسل کرلو۔ اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے یا تم عورتوں کے پاس گئے ہو پھر تم کو پانی نہ ملے تو تم پاک مٹی سے تیمم کرلو اور اپنے چہرہ اور ہاتھوں کا مسح کرلو، بے شک اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے ۴۳ — ۴۱

حق کا داعی جب آتا ہے تو وہ ایک معمولی انسان کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کے گرد ظاہری بڑائیاں اور رونقیں جمع نہیں ہوتیں۔ اس لئے وقت کے بڑے اس کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کو یقین نہیں آتا کہ ایک ایسا شخص بھی ان سے زیادہ حق و صداقت والا ہو سکتا ہے جو دنیوی شان و شوکت میں ان سے کم ہو۔ مگر جب قیامت آئے گی اور خدا کی عدالت قائم ہوگی تو وہ حیرت کے ساتھ دیکھیں گے کہ وہی شخص جس کو انھوں نے بے قیمت سمجھ کر ٹھکرا دیا تھا وہ آخرت کی عدالت میں خدائی گواہ بنا دیا گیا ہے۔ وہی وہ شخص ہے جس کے بیان پر لوگوں کے لئے جنت اور جہنم کے فیصلے ہوں۔ یہ وہاں مجرم کے مقام پر کھڑے ہوں گے اور وہ خدا کی طرف سے بولنے والے کے مقام پر۔ یہ ایسا سخت اور ہولناک لمحہ ہوگا کہ لوگ چاہیں گے کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس کے اندر سما جائیں۔ مگر ان کی یہ شرمندگی ان کے کام نہ آئے گی۔ خدا کے یہاں ان کے قول و عمل سے لے کر ان کی سوچ تک کا ریکارڈ موجود ہوگا اور خدا انھیں دکھا دے گا کہ حق کے داعی کا انکار جو انھوں نے کیا وہ ناواقفیت کے سبب سے نہ تھا بلکہ گھمنڈ کی وجہ سے تھا۔ انھوں نے اپنے کو بڑا سمجھا اور داعی حق کو چھوٹا جانا۔ حقیقت کو اس کی برہنہ صورت میں دیکھنے اور جاننے کے باوجود وہ محض اس لئے اس کے منکر ہو گئے کہ اس کو ماننے میں ان کی اپنی بڑائی ختم ہوتی ہوئی نظر آتی تھی۔

شریعت میں غیر معمولی حالات میں غیر معمولی رخصت دی گئی ہے۔ مرض یا سفر یا پانی کا نہ ہونا یہ تینوں آدمی کے لئے غیر معمولی حالتیں ہیں۔ اس لئے ان مواقع پر یہ رخصت دی گئی کہ اگر نقصان کا اندیشہ ہو تو وضو یا غسل کے بجائے تیمم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ عام وضو پانی سے ہوتا ہے۔ تیمم گویا مٹی سے وضو کرنا ہے۔ وضو کا مقصد آدمی کے اندر پاکی کی نفسیات پیدا کرنا ہے اور تیمم، وضو نہ کر سکنے کی صورت میں، اس پاکی کی نفسیات کو باقی رکھنے کی ایک مادی تدبیر ہے۔

"نماز اس وقت پڑھو جب کہ تم جانو کہ تم کیا کہہ رہے ہو" ———— یہاں یہ آیت شراب کا ابتدائی حکم بتانے کے لئے آئی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ نماز کے بارے میں ایک اہم حقیقت کو بھی بتا رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز ایک ایسی عبادت ہے جو فہم و شعور کے تحت ادا کی جاتی ہے۔ نماز محض اس کا نام نہیں ہے کہ کچھ الفاظ اور کچھ حرکات کو صحتِ ادا کے ساتھ دہرا دیا جائے۔ اسی کے ساتھ نماز میں آدمی کے ذہن کا حاضر رہنا بھی ضروری ہے۔ وہ نماز کو جان کر نماز پڑھے، اپنی زبان اور اپنے جسم سے وہ جس خدا کے سامنے جھکنے کا اظہار کر رہا ہے، اسی خدا کے سامنے اس کی سوچ اور اس کا ارادہ بھی جھک گیا ہو۔ اس کا جسم جس خدا کی عبادت کر رہا ہے، اس کا شعور بھی اسی خدا کا عبادت گزار بن جائے۔

اتم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب سے حصہ ملا تھا۔ وہ گمراہی کو مول لے رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ سے
لک جاؤ۔ اللہ تمھارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے۔ اور اللہ کافی ہے حمایت کے لئے اور اللہ کافی ہے مدد کے لئے۔ یہود
ں سے ایک گروہ بات کو اس کے ٹھکانے سے ہٹا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم نے سنا اور نہ مانا اور کہتے ہیں کہ سنو اور تمھیں
نوایا نہ جائے۔ وہ اپنی زبان کو موڑ کر کہتے ہیں راعِنا، دین میں عیب لگانے کے لئے۔ اور اگر وہ کہتے کہ ہم نے سنا اور مانا،
ر سنو اور ہم پر نظر کرو تو یہ ان کے حق میں زیادہ بہتر اور درست ہوتا۔ مگر اللہ نے ان کے انکار کے سبب سے ان پر لعنت
ردی ہے۔ پس وہ ایمان نہ لائیں گے مگر بہت کم۔ اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی اس پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتارا ہے،
سدیق کرنے والی اس کتاب کی جو تمھارے پاس ہے، اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو مٹا دیں پھر ان کو الٹ دیں پیٹھ کی طرف یا
ن پر لعنت کریں جیسے ہم نے لعنت کی سبت والوں پر۔ اور اللہ کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے۔ بے شک اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس
ے ساتھ شرک کیا جائے۔ لیکن اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کو جس کے لئے چاہے گا بخش دے گا۔ اور جس نے اللہ کا شریک ٹھیرایا
س نے بڑا طوفان باندھا۔ کیا تم نے دیکھا ان کو جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں۔ بلکہ اللہ ہی پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور ان
پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ دیکھو، یہ اللہ پر کیسا جھوٹ باندھ رہے ہیں اور صریح گناہ ہونے کے لئے یہی کافی ہے ۵۰-۴۴

اللہ کی کتاب کسی گروہ کو اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ اس سے اپنی سوچ اور اپنے عمل کو درست کرے۔ مگر جب آسمانی
کتاب کی حامل کوئی قوم زوال کا شکار ہوتی ہے، جیسا کہ یہود ہوئے، تو خدا کی کتاب سے وہ ہدایت کے بجائے گمراہی کی غذا
لینے لگتی ہے۔ خدا کے احکام اس کے لئے خشک جزئیاتی بحثوں کا موضوع بن جاتے ہیں۔ اب اس کے یہاں اعتقادیات کے نام
پر فلسفیانہ قسم کی موشگافیاں جنم لیتی ہیں۔ وہ اس کے لئے ایسی سرگرمیوں کی تعلیم دینے والی کتاب بن جاتی ہے جس کا آخرت
کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ایسے لوگ اپنی روایتی نفسیات کی وجہ سے ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی ہر بات کو خدا کی بات ثابت کریں۔
وہ اپنے عمل کا دینی جواز فراہم کرنے کے لئے خدا کی کتاب کو بدل دیتے ہیں۔ خدا کے کلمات کو اس کے موقع و محل سے ہٹا کر وہ اس کی
خود ساختہ تشریح کرتے ہیں۔ وہ الفاظ میں الٹ پھیر کر کے اس سے ایسا مفہوم نکالتے ہیں جس کا اصل کتاب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔
کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک بات کو سنتا ہے مگر وہ حقیقۃً نہیں سنتا۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ آدمی اس بات کو
سمجھنے کے معاملہ میں سنجیدہ نہ ہو اور اس پر عمل کرنے سے اس کو کوئی دلچسپی نہ ہو۔ یہ مزاج جب اپنے آخری درجہ میں پہنچتا ہے تو آدمی
کی ناسمجھی کا حال ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس کے چہرے کے نشانات مٹا دئے گئے ہوں اور اب وہ چیزوں کو اس طرح دیکھ اور سن رہا
ہو جیسے کوئی شخص سر کے پچھلے حصہ کی طرف سے چیزوں کو دیکھے اور سنے جہاں نہ دیکھنے کے لئے آنکھ ہے اور نہ سننے کے لئے کان۔
حق بات کو سمجھنے کے لئے آدمی کا اس طرح اندھا بہرا ہو جانا اس بات کی علامت ہے کہ حق کے ساتھ مسلسل بے پروائی کی بنا پر
خدا نے اس کو اپنی توفیق سے محروم کر دیا ہے۔ خدا نے اس کو کان دیا مگر اس نے نہیں سنا، خدا نے اس کو آنکھ دی مگر اس نے
نہیں دیکھا تو اب خدا نے بھی اس کو ویسا ہی بنا دیا جیسا اس نے خود سے اپنے کو بنا رکھا تھا ——— بے حسی جب اپنے آخری
درجہ میں پہنچتی ہے تو وہ مسخ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب سے حصہ ملا تھا، وہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کرے تم اس کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔ کیا خدا کے اقتدار میں کچھ ان کا بھی دخل ہے۔ پھر تو یہ لوگوں کو ایک تل برابر بھی نہ دیں۔ کیا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں، اس بنا پر جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا ہے۔ پس ہم نے آل ابراہیم کو کتاب اور حکمت دی ہے اور ہم نے ان کو ایک بڑی سلطنت بھی دے دی۔ ان میں سے کسی نے اس کو مانا اور کوئی اس سے رکا رہا اور ایسوں کے لئے جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کافی ہے۔ بے شک جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کا انکار کیا ان کو ہم سخت آگ میں ڈالیں گے۔ جب ان کے جسم کی کھال جل جائے گی تو ہم ان کی کھال کو بدل کر دوسری کر دیں گے تاکہ وہ عذاب چکھتے رہیں۔ بے شک اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کو ہم باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہاں ان کے لئے ستھری بیویاں ہوں گی اور ان کو ہم گھنی چھاؤں میں رکھیں گے۔

۵۷ - ۵۱

آسمانی کتاب کی حامل کسی قوم پر جب زوال آتا ہے تو وہ عمل کے بجائے خوش عقیدگی کی سطح پر جینے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے درمیان توہمات خوب پھیلتے ہیں۔ جو چیز حقیقی عمل کے ذریعہ ملتی ہے اس کو وہ عملیات اور فرضی عقیدوں اور سفلی اعمال کے راستے سے پانے کی کوشش شروع کر دیتی ہے۔ ایسے لوگ دین کے معاملہ کو "پاک کلمات" اور "بابرکت نسبتوں"، کا معاملہ سمجھ لیتے ہیں جس کے محض زبانی تلفظ یا رسمی تعلق سے معجزاتی واقعات ظاہر ہوتے ہوں۔ اسی کے ساتھ ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ زبان سے دین کا نام لیتے ہوئے اپنی عملی زندگی کو شیطان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ حقیقی زندگی میں نفس کی خواہشات اور شیطان کی ترغیبات پر چل پڑتے ہیں مگر اسی کے ساتھ اپنے اوپر دین کا لیبل لگا کر سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ کرنے لگیں وہی خدا کا دین ہے۔ ایسی حالت میں جب ان کے درمیان بے آمیز حق کی دعوت اٹھتی ہے تو وہ سب سے زیادہ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کی دینی حیثیت کی نفی کر رہی ہے۔ کافروں کا وجود ان کے لئے اس قسم کا چیلنج نہیں ہوتا اس لئے کافروں کے معاملہ میں وہ نرم ہوتے ہیں مگر حق کے داعی کے لئے ان کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں ہوتا۔ ان کے اندر یہ حاسدانہ آگ بھڑک اٹھتی ہے کہ جب دین کے اجارہ دار ہم تھے تو دوسرے کسی شخص کو دین کی نمائندگی کا درجہ کیسے مل گیا۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ خدا آدمی کی قلبی استعداد کی بنیاد پر کسی کو اپنے دین کا نمائندہ چنتا ہے نہ کہ نمائشی چیزوں کی بنیاد پر۔

لعنت یہ ہے کہ آدمی اللہ کی رحمتوں اور نصرتوں سے بالکل دور کر دیا جائے۔ کھانا اور پانی بند ہونے سے جس طرح آدمی کی مادی زندگی ختم ہو جاتی ہے اسی طرح خدا کی نصرت سے محرومی کے بعد آدمی کی ایمانی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لعنت زدہ آدمی لطیف احساسات کے اعتبار سے اس طرح ایک ختم شدہ انسان ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر حق اور ناحق کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ کھلی کھلی نشانیاں سامنے آنے کے بعد بھی اس کو اعتراف کی توفیق نہیں ہوتی۔ وہ لا یعنی شوشوں اور واقعی دلائل کے درمیان فرق نہیں کرتا۔

اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو پہنچا دو۔ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ اللہ اچھی نصیحت کرتا ہے تم کو، بے شک اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔ اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں اہل اختیار کی اطاعت کرو۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بات اچھی ہے اور اس کا انجام بہتر ہے۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں اس پر جو اتارا گیا ہے تمہاری طرف اور جو اتارا گیا ہے تم سے پہلے، وہ چاہتے ہیں کہ قضیہ لے جائیں شیطان کی طرف، حالاں کہ ان کو حکم ہو چکا ہے کہ اس کو نہ مانیں اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر بہت دور ڈال دے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کی طرف اور رسول کی طرف تو تم دیکھو گے کہ منافقین تم سے کترا جاتے ہیں۔ پھر اس وقت کیا ہوگا جب ان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ان پر پہنچے گی، اس وقت یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے کہ خدا کی قسم ہم کو تو صرف بھلائی اور ملاپ سے غرض تھی۔ ان کے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ اس سے خوب واقف ہے۔ پس تم ان سے اعراض کرو اور ان کو نصیحت کرو اور ان سے ایسی بات کہو جو ان کے دلوں میں اتر جائے ۵۸ — ۶۳

ہر ذمہ داری ایک امانت ہے اور اس کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح جب کسی سے معاملہ پڑے تو آدمی کو چاہئے کہ وہ کرے جو انصاف کا تقاضا ہو، خواہ معاملہ دوست کا ہو یا دشمن کا۔ اگر امانت داری اور انصاف کا طریقہ بظاہر اپنے فائدوں اور مصلحتوں کے خلاف نظر آئے تب بھی اس کو انصاف اور سچائی ہی کے طریقے پر قائم رہنا ہے۔ کیوں کہ بہتری اس میں ہے جو اللہ بتائے نہ کہ اس میں جو ہمارے نفس کو پسند ہو۔ اگر حکومتی نظام کے مواقع ہوں تو مسلمانوں کو چاہئے کہ باقاعدہ اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لائیں۔ اور اگر حکومت کے مواقع نہ ہوں تو اپنے اندر کے قابل اعتماد افراد کو اپنا سربراہ بنالیں اور ان کی ہدایات لیتے ہوئے دینی زندگی گزاریں۔ جب کسی معاملہ میں اختلاف ہو تو ہر فریق پر لازم ہے کہ وہ اس بات کو مان لے جو اللہ اور رسول کی طرف سے آرہی ہو۔ ہر آدمی کو اختلاف رائے کی آزادی ہے مگر اجتماعی فیصلہ کو نہ ماننے کی آزادی کسی کو بھی حاصل نہیں۔ اجتماعی نظام مسلم معاشرہ کی اجتماعی ضرورت ہے۔

مدینہ کے ابتدائی زمانہ میں اختلافی معاملات میں فیصلہ لینے کے لئے بیک وقت دو عدالتیں پائی جاتی تھیں۔ ایک یہودی سرداروں کی جو پہلے سے چلی آرہی تھی۔ دوسری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو ہجرت کے بعد قائم ہوئی۔ مسلمانوں میں جو لوگ اپنے مفاد کی قربانی کی قیمت پر دیندار بننے کے لئے تیار نہ تھے وہ ایسا کرتے کہ جب ان کو اندیشہ ہوتا کہ ان کا مقدمہ کمزور ہے اور وہ رسول خدا کی عدالت سے اپنے موافق فیصلہ نہ لے سکیں گے تو وہ کعب بن اشرف یہودی کی عدالت میں چلے جاتے۔ یہ بات سراسر ایمان کے خلاف ہے۔ آدمی اگر اللہ کے فیصلہ پر راضی نہ ہو بلکہ اپنی پسند کا فیصلہ لینا چاہے تو اس کا ایمان کا دعویٰ جھوٹا ہے، خواہ وہ اپنے رویہ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے کتنے ہی خوبصورت الفاظ اپنے پاس رکھتا ہو۔ تاہم ایسے لوگوں سے نہ الجھتے ہوئے ان کو مؤثر انداز میں نصیحت کرنے کا کام پھر بھی جاری رہنا چاہئے۔

اور ہم نے جو رسول بھیجا اسی لئے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اور اگر وہ جب کہ انھوں نے اپنا برا کیا تھا
تمھارے پاس آتے اور اللہ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کے لئے معافی چاہتا تو یقیناً وہ اللہ کو بخشنے والا رحم کرنے ا
پاتے۔ پس تیرے رب کی قسم وہ کبھی ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے باہمی جھگڑے میں تم کو فیصلہ کرنے والا نہ
لیں۔ پھر جو فیصلہ تم کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور اس کو خوشی سے قبول کر لیں۔ اور اگر ہم ان کو حکم دیتے کہ ا
آپ کو ہلاک کرو یا اپنے گھروں سے نکلو تو ان میں سے تھوڑے ہی اس پر عمل کرتے۔ اور اگر یہ لوگ وہ کرتے جس کی انھیں نصیحت
جاتی ہے تو ان کے لئے یہ بات بہتر اور ایمان پر ثابت رکھنے والی ہوتی۔ اور اس وقت ہم ان کو اپنے پاس سے بڑا اجر
اور ان کو سیدھا راستہ دکھاتے۔ اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ ۔
انعام کیا، یعنی پیغمبر اور صدیق اور شہید اور صالح۔ کیسی اچھی ہے ان کی رفاقت۔ یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ
علم کافی ہے ۷۰ — ۶۴

رسول اس لئے نہیں آتا کہ لوگ بس اس کے عقیدت مند ہو جائیں اور اس کی بارگاہ میں الفاظ کے گلدستے پیش
کرتے رہیں۔ رسول اس لئے آتا ہے کہ آدمی اس سے اپنی زندگی کا طریقہ معلوم کرے اور اس پر عملاً کاربند ہو۔ اس معا
میں آدمی کو اتنا زیادہ شدید ہونا چاہئے کہ نازک مواقع پر بھی وہ رسول کی اطاعت سے نہ ہٹے۔ جب دو آدمیوں کا مفاد ایک
دوسرے سے ٹکرا جائے اور دو آدمیوں کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف تلخی ابھر آئے اس وقت بھی آدمی کو ا
نفس کو دبانا ہے اور بالارادہ اپنے کو رسول والے طریقہ کا پابند بنانا ہے۔ نزاع کے موقع پر جو شخص رسول کی رہنمائی کو قب
کرے وہی رسول کو ماننے والا ہے۔ حتیٰ کہ رسول کا طریقہ اپنے ذوق اور اپنی مصلحت کے خلاف ہو تب بھی وہ دل کی رضا
کے ساتھ اس کو قبول کرے۔ وہ اپنے احساس کو اتنا زندہ رکھے کہ اگر وقتی طور پر کبھی اس سے غلطی ہو جائے تو وہ جلد ہی چو
اٹھے۔ وہ جان لے کہ رسول کو چھوڑ کر وہ شیطان کے پیچھے چل پڑا تھا۔ وہ فوراً پلٹے اور معافی کا طالب ہو۔ جو شخص نف
جھٹکوں کے مواقع پر دین پر قائم نہ رہ سکے اس سے کیا امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ان شدید تر مواقع پر ثابت قدم رہے گا ج
وطن کو چھوڑ کر اور جان و مال کی قربانی دے کر آدمی کو اپنے ایمان کا ثبوت دینا پڑتا ہے ۔
نفس پرستی اور مصلحت پسندی کی زندگی اختیار کرنے کے نتیجہ میں آدمی جو سب سے بڑی چیز کھوتا ہے وہ صراط مستقیم
یعنی وہ راستہ جس کو پکڑ کر آدمی چلتا رہے یہاں تک کہ اپنے رب تک پہنچ جائے۔ یہ راستہ خدا کی کتاب اور رسول کی سنت
طور پر موجود ہے۔ مگر آدمی جب اپنی سوچ کو تحفظات کا پابند کر لیتا ہے تو وضاحت کے باوجود وہ صراط مستقیم کو دیکھ نہیں
وہ دین کا مطالعہ اپنی خواہشوں اور مصلحتوں کے زیر اثر کرتا ہے نہ کہ اس کی بے آمیز صورت میں۔ اس کے ذہن میں اپنے حسب حا
کا ایک خود ساختہ تصور قائم ہو جاتا ہے۔ وہ ایمان کا مدعی ہو کر بھی ایمان سے محروم رہتا ہے۔ ایسے لوگ اس جنت کے مستحق
ہو سکتے ہیں جہاں وہ لوگ بسائے جائیں گے جنھوں نے ہر قسم کی مصلحتوں سے اوپر اٹھ کر دین کو اختیار کیا تھا۔ وہ لوگ جو خدا
کو پورا کرنے والے ہیں، جو حق کی گواہی آخری حد تک دینے والے ہیں اور جن کی زندگیاں حد درجہ پاکیزہ ہیں۔

اے ایمان والو اپنی احتیاط کر لو پھر نکلو جدا جدا یا اکھٹے ہو کر۔ اور تم میں کوئی ایسا بھی ہے جو دیر لگا دیتا ہے۔ پھر اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچے تو وہ کہتا ہے کہ اللہ نے مجھ پر انعام کیا کہ میں ان کے ساتھ نہ تھا۔ اور اگر تم کو اللہ کا کوئی فضل حاصل ہو تو کہتا ہے۔ گویا تمھارے اور اس کے درمیان کوئی رشتۂ محبت ہی نہیں — کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑی کامیابی حاصل کرتا۔ بس چاہئے کہ لڑیں اللہ کی راہ میں وہ لوگ جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو بیچ دیتے ہیں۔ اور جو شخص اللہ کی راہ میں لڑے، پھر مارا جائے یا غالب ہو تو ہم اس کو بڑا اجر دیں گے۔ اور تم کو کیا ہوا کہ تم نہیں لڑتے اللہ کی راہ میں اور ان کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کے لئے جو کہتے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنے پاس سے کوئی حمایتی پیدا کر دے اور ہمارے لئے اپنے پاس سے کوئی مددگار کھڑا کر دے۔ جو لوگ ایمان والے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو منکر ہیں وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پس تم شیطان کے ساتھیوں سے لڑو۔ بے شک شیطان کی چال بہت کمزور ہے۔　۷۱ — ۷۶

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے، اس لئے یہاں ہر ایک کو عمل کی آزادی ہے۔ یہاں شریر لوگوں کو بھی موقع ہے کہ وہ خدا کے بندوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنائیں اور اسی کے ساتھ خدا کے نیک بندوں کو اپنے اقرار ایمان کا ثبوت اس طرح دینا ہے کہ وہ شریر لوگوں کی طرف سے ڈالی جانے والی مصیبتوں کے باوجود ثابت قدم رہیں۔ اہل ایمان کو خدا کے دشمنوں کے مقابلہ میں ہر وقت چوکنا رہنا ہے۔ پر امن تدبیروں اور جنگی تیاریوں سے ان کو پوری طرح اپنے بچاؤ کا انتظام کرنا ہے۔ ان کو متفرق طور پر بھی اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنا ہے اور مل کر بھی۔ اسی کے ساتھ خود مسلمانوں کی صف میں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں، جیسا کہ غزوۂ احد میں ظاہر ہوا، جو دنیا کے نقصان کا خطرہ مول لئے بغیر آخرت کا سودا کرنا چاہتے ہوں۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کاموں میں تو خوب حصہ لیتے ہیں جن میں دنیوی فائدہ کا کوئی پہلو ہو۔ مگر ایسا دینی کام جس میں دنیوی اعتبار سے نقصان کا اندیشہ ہو اس سے علیحدگی کے لئے خوبصورت عذر تلاش کر لیتے ہیں۔ ان کی یہ ذہنیت اس لئے ہے کہ اسلام قبول کرنے کے باوجود عملاً وہ اسی موجودہ دنیا کی سطح پر جی رہے ہیں۔ اگر ان کو یقین ہو کہ اصل اہمیت کی چیز آخرت ہے تو دنیا کی کامیابی و ناکامی ان کے لئے ناقابل لحاظ بن جائے۔ اللہ کی راہ کا مجاہد حقیقۃً وہ ہے جو صرف آخرت کا طالب ہو، جو دنیا کے فائدوں اور مصلحتوں کو قربان کر کے اللہ کی راہ میں بڑھے۔ نہ کہ وہ جو ایسے جہاد کا غازی بننا پسند کریں جس میں کوئی زخم لگے بغیر بڑے بڑے کریڈٹ ملتے ہوں، جس میں الفاظ بول کر شہرت دعوت کا مقام حاصل ہوتا ہو۔

خدا کی راہ کی لڑائی وہ ہے جو اس بندۂ خدا کو پیش آئے جو صرف خدا کے لئے اٹھا ہو۔ وہ لوگوں کو جہنم سے ڈرائے اور لوگوں کو جنت کی طرف بلائے۔ کسی سے وہ مادی یا سیاسی جھگڑا نہ چھیڑے۔ پھر بھی شریر لوگ اس سے لڑنے کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ اور شیطان کی راہ میں لڑنے والے وہ لوگ ہیں جو کسی بندۂ خدا سے اس بنا پر لڑ پڑیں کہ اس کی باتوں سے ان کی انانیت پر ضرب پڑتی ہے۔ اس کے پیغام کے پھیلاؤ میں ان کو اپنا معاشی یا سیاسی خطرہ دکھائی دیتا ہے۔ اس کے دلائل کو توڑنے کے لئے وہ جارحیت کے سوا اور کوئی دلیل اپنے پاس نہیں پاتے۔

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ پھر جب ان کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ انسانوں سے ایسا ڈرنے لگا جیسے اللہ سے ڈرنا چاہئے یا اس سے بھی زیادہ۔ وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب، تو نے ہم پر لڑائی کیوں فرض کر دی۔ کیوں نہ چھوڑے رکھا ہم کو تھوڑی مدت تک۔ کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور آخرت بہتر ہے اس کے لئے جو پرہیزگاری کرے، اور تمہارے ساتھ ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ اور تم جہاں بھی ہوگے موت تم کو پالے گی اگرچہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔ اگر ان کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر ان کو کوئی برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تمہارے سبب سے ہے۔ کہہ دو کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ ان ان لوگوں کا کیا حال ہے کہ لگتا ہے کہ کوئی بات ہی نہیں سمجھتے۔ تم کو جو بھلائی بھی پہنچتی ہے خدا کی طرف سے پہنچتی ہے اور تم کو جو برائی پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہی سبب سے ہے۔ اور ہم نے تم کو انسانوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کی گواہی کافی ہے ۷۷ – ۷۹

ہجرت سے پہلے مکہ میں اسلام کے مخالفین مسلمانوں کو بہت ستاتے تھے۔ مارنا پیٹنا، ان کی معاشیات کو تباہ کرنا، ان کو مسجد حرام میں عبادت سے روکنا، ان کو تبلیغ کی اجازت نہ دینا، ان کو گھر بار چھوڑنے پر مجبور کرنا، سب انھوں نے مسلمانوں کے لئے جائز کر لیا تھا۔ جو شخص اسلام قبول کرتا اس پر وہ ہر قسم کا دباؤ ڈالتے تاکہ وہ اسلام کو چھوڑ کر اپنے آبائی مذہب کی طرف لوٹ جائے۔ مخالفین اسلام کی اس جارحیت نے مسلمانوں کے لئے اصولاً جائز کر دیا تھا کہ وہ ان کے خلاف تلوار اٹھائیں۔ چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار جنگ کی اجازت مانگتے۔ مگر آپ ہمیشہ یہ کہتے کہ مجھ کو جنگ کا حکم نہیں دیا گیا۔ تم صبر کرو اور نماز اور زکوٰۃ کی ادائگی کرتے رہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قبل از وقت کوئی اقدام کرنا اسلام کا طریقہ نہیں۔ مکہ میں مسلمانوں کی اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اپنے دشمنوں کے خلاف فیصلہ کن اقدام کر سکتے۔ اس وقت مکہ والوں کے مقابلہ میں تلوار اٹھانا اپنی مصیبتوں کو اور بڑھانے کے ہم معنی تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ طاقت ور دشمن جو ابھی تک صرف انفرادی ظلم کر رہا ہے اس کو اپنی طرف سے مکمل جنگی کارروائی کرنے کا جواز فراہم کر دیا جائے۔ عملی اقدام ہمیشہ اس وقت کیا جاتا ہے جب کہ اس کے لئے ضروری تیاری کر لی گئی ہو۔ اس سے پہلے اہل ایمان سے صرف انفرادی احکام کا تقاضا کیا جاتا ہے جو ہر حال میں آدمی کے لئے ضروری ہیں یعنی اللہ سے تعلق جوڑنا۔ بندوں کے حقوق ادا کرنا اور دین کی راہ میں جو مشکلیں پیش آئیں ان کو برداشت کرنا۔

قرآن میں قربانی کے احکام آئے تو مصلحت پرست لوگوں کو اپنی زندگی کا نقشہ بکھرتا ہوا نظر آیا۔ وہ اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ احد میں شکست ہوئی تو اس کو وہ رسول کی بے تدبیری کا نتیجہ بتا کر رسول کی رہنمائی کے بارے میں لوگوں کو بدظن کرنے لگے۔ فائدہ والی باتوں کو اللہ کا فضل بتا کر وہ اپنی اسلامیت کا مظاہرہ کرتے اور عملی اسلام سے گریز کے لئے رسول کو غلط ثابت کرتے ——— خدا کو ماں کر آدمی کے لئے ممکن رہتا ہے کہ وہ اپنے نفس پر چلتا رہے۔ مگر خدا کے داعی کو ماننے کے بعد اس کا ساتھ دینا بھی ضروری ہو جاتا ہے جو آدمی کے لئے مشکل ترین کام ہے۔

اسلامی سماج کیسا ہوتا ہے

سماج کیا ہے۔ بہت سے آدمیوں کا مل جل کر رہنا۔ جب بہت سے آدمی مل کر ایک ساتھ رہیں تو ان کے درمیان طرح طرح کے تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کا رشتہ دار ہوتا ہے کوئی کسی کا پڑوسی۔ کوئی کسی کا ہم قوم ہوتا ہے کوئی کسی کا ہم وطن۔ کوئی تاجر ہوتا ہے اور کوئی گاہک۔ کوئی مالک مکان ہوتا ہے اور کوئی کرایہ دار۔ اس طرح کے مختلف تعلقات کی بنا پر لوگوں کے درمیان بار بار معاملات پیش آتے ہیں۔ ان معاملات کے دوران کبھی کسی سے نفرت کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں اور کسی سے محبت کے۔ کسی سے کچھ لینا ہوتا ہے اور کسی کو کچھ دینا۔ کسی سے اختلاف ہوتا ہے اور کسی سے اتفاق۔ کوئی اپنا بن جاتا ہے اور کوئی غیر دکھائی دیتا ہے۔ یہی چیز ہے جو لوگوں کے درمیان سماجی تعلقات پیدا کرتی ہے اور یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے۔ بہت سے پتھر ایک ساتھ پڑے ہوں تو ان میں باہمی تعلقات قائم نہیں ہوتے، اس لئے ان کے درمیان مذکورہ قسم کے مسائل بھی پیدا نہیں ہوتے مگر جب بہت سے انسان ایک ساتھ مل کر رہیں تو ان میں باہمی تعلقات قائم ہوتے ہیں اور اس بنا پر ان کے درمیان طرح طرح کے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے مواقع پر اسلام کی تعلیم کیا ہے۔ مسلمان جب ایک سماج کی صورت میں مل کر رہیں تو وہ آپس میں کس طرح رہیں اور معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ کس قسم کا سلوک کریں۔ اس کی وضاحت کے لئے چند حدیثیں ملاحظہ فرمائیں۔

عن انس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یؤمن احدکم حتی یحبّ لاخیہ ما یحبُّ لنفسہ (متفق علیہ) ۸۴

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرے جو وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: کلُّ المسلم علی المسلم حرام دمُہ ومالُہ وعرضُہ (مسلم) ۸۴

ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی تین چیزیں حرام ہیں اس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: المسلم من سَلِم المسلمون من لسانہ ویدہ (متفق علیہ)

مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں

عن النعمانِ بنِ بشیر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مثل المومنینَ فی توادِّھم وتراحُمِھم وتعاطُفِھم مثل الجسدِ اذا اشتکیٰ منہ عُضوٌ تداعیٰ لہ سائرُ الجسدِ بالسّھَر والحمّی (متفق علیہ)

مسلمانوں کی مثال آپس کی محبت اور آپس کی رحم دلی اور آپس کی مہربانی کے معاملہ میں ایسی ہے جیسے ایک جسم۔ جب جسم کے کسی عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم مل کر جاگتا ہے اور سارا جسم بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

عن ابنِ عُمَر رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا

ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اس پر ظلم کرتا اور نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑتا۔ جو شخص اپنے بھائی کی

يُسْلِمُه، من كان فى حاجة اخيه كانَ اللّٰه فى حاجته ومن فرَّج عن مسلم كُربةً فرَّج اللّٰه عنه بها كُربةً من كُربِ يوم القيامةِ ومن سَتَرَ مسلماً ستره اللّٰه يوم القيامة (متفق عليه)

حاجت پوری کرے گا تو اللہ اس کی حاجت پوری کرے گا۔ جو شخص کسی مسلمان کی تکلیف دور کرے گا تو اللہ قیامت کے دن اس کی تکلیف دور کرے گا۔ جو شخص کسی مسلمان کو ڈھانکے گا تو اللہ قیامت کے دن اس کو ڈھانکے گا۔

عن عِياضِ بنِ حِمارٍ رضى اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: ان اللّٰه تعالىٰ اوحىٰ الىّٰ ان تواضَعوا حتى لا يبغىَ احد على احدٍ ولا يَفْخُرَ احدٌ على احدٍ (مسلم)

اللہ نے میری طرف وحی کی ہے کہ تم لوگ تواضع اختیار کرو۔ کوئی شخص کسی کے اوپر زیادتی نہ کرے۔ کوئی شخص کسی کے اوپر فخر نہ کرے۔

عن ابى موسىٰ رضى اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: المومنُ للمومن كالبُنيانِ يَشُدُّ بعضُهُ بعضاً وشبّكَ بين اصابعه (متفق عليه)

ایک مومن کی مثال دوسرے مومن کے لئے ایسی ہے جیسے عمارت۔ عمارت کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کو مضبوط کرتی ہے اسی طرح سب مسلمان باہم جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کی روشنی میں اسلامی سماج کی جو تصویر بنتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان دوسرے مسلمانوں کے درمیان اس طرح رہتا ہے کہ وہ ان کو غیر نہیں سمجھتا بلکہ اپنا ہی ایک حصہ سمجھتا ہے۔ دوسروں کے کسی رویہ سے جب اس کو خوشی محسوس ہوتی ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ دوسرے کس بات سے خوش ہوں گے۔ اس لئے وہ خود بھی دوسروں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح جب کسی ایک کا رویہ اس کے لئے تکلیف کا باعث ہوتا ہے تو اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ دوسرے کس چیز سے تکلیف محسوس کریں گے اور وہ اس کا سخت اہتمام کرتا ہے کہ دوسروں کو اس کی ذات سے اس قسم کے سلوک کا تجربہ نہ ہونے پائے۔ حتیٰ کہ ایک مسلم آبادی ایک واحد جسم کی مانند ہو جاتی ہے۔ جسم کے ایک حصہ میں تکلیف ہو تو ناممکن ہے کہ بقیہ جسم اس کے لئے تڑپ نہ اٹھے۔ اسی طرح ایک مسلمان کی تکلیف سارے مسلمانوں کی تکلیف بن جاتی ہے اور لوگوں کو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک وہ اپنے بھائی کی تکلیف دور نہ کر دیں۔ مسلمان کا سماج ایک ایسا سماج ہے کہ جب بھی ایک شخص کا دوسرے سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ اس کے اندر محبت اور رحم دلی اور مہربانی پاتا ہے۔ ہر ایک دوسرے کی حاجت برآری کے لئے اس طرح تیار رہتا ہے جیسے کہ وہ اس کا اپنا مسئلہ ہو۔ کوئی دوسرے مسلمان کو ننگا یا بے گھر دیکھتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود ننگا اور بے گھر ہو گیا ہو۔ کسی کو برداشت نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے بھائی کو بے سہارا چھوڑ دے۔ ایک کو دوسرے سے ظلم اور گھمنڈ کے بجائے تواضع اور انصاف ملتا ہے۔ کوئی کسی کے اوپر فخر نہیں کرتا، کوئی کسی کے اوپر حسد نہیں کرتا۔ بلکہ ہر ایک دوسرے کا خیر خواہ ہوتا ہے، ہر ایک دوسرے کا ساتھی بن جاتا ہے۔ مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح رہتے ہیں کہ ان کے لئے ناقابل تصور ہوتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کے خون کو اپنے لئے جائز کر لیں خواہ اس سے کتنی ہی زیادہ تکلیف ان کو پہنچی ہو۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا مال لے لینے سے اسی طرح بچتا ہے جیسے کوئی شخص آگ کو ہاتھ میں لینے سے بچتا ہے۔ ایک مسلمان کے لئے دوسرے مسلمان کی آبرو پر حملہ کرنا اسی طرح ناممکن ہو جاتا ہے جیسے اپنے آپ کو سر بازار ننگا کرنا۔

اسلامی سماج میں اس قسم کی فضا کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک حد درجہ متحد سماج بن جاتا ہے جس سماج میں ہر ایک

دوسرے کے ساتھ انصاف کرے، ہر ایک دوسرے کا خیر خواہ ہو۔ اس سماج میں اتحاد کے سوا اور کیا چیز جگہ پائے گی۔ ایک مسلم آبادی اپنے تمام افراد کے ساتھ گویا ایک بہت بڑی عمارت ہوتی ہے۔ اس کا ہر فرد اس عظیم عمارت کی ایک اینٹ ہوتا ہے۔ ہر اینٹ دوسری اینٹ سے جڑی ہوتی ہے۔ ہر اینٹ دوسری اینٹ کو مضبوط کر رہی ہوتی ہے۔ ایک اینٹ اور دوسری اینٹ کے درمیان جو تعلق ہوتا ہے وہ دوری اور ٹکراؤ کا نہیں ہوتا بلکہ جوڑ اور پیوستگی کا ہوتا ہے۔ ہر اینٹ اگرچہ ایک دوسرے سے الگ ہوتی ہے مگر الگ ہونے کے باوجود وہ سماجی اعتبار سے پوری عمارت کا ایک اٹوٹ حصہ ہوتی ہے۔ اس سے عمارت کو طاقت ملتی ہے نہ کہ کمزوری۔ وہ اپنے اوپر عمارت کو تھامے ہوئے ہوتی ہے نہ کہ خود عمارت کو اپنے اوپر کھڑا کرنے کی کوشش کرے۔ ایک مومن جس خدا کا طالب ہوتا ہے دوسرا مومن بھی اسی خدا کا طالب ہوتا ہے۔ ایک مومن کی منزل مقصود جس طرح آخرت ہوتی ہے دوسرے مومن کی منزل مقصود بھی اسی طرح آخرت ہوتی ہے ایسی حالت میں کیوں کر ممکن ہے کہ وہ ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ مزید یہ کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ دنیا بھلائی اور برائی کی کشمکش کی جگہ ہے۔ یہاں شیطان کے ساتھی اپنے عمل کے لئے آزاد ہیں۔ جو شخص بھی بھلائی کے راستہ پر چلنا چاہے اس کو برائی کی طاقتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا راستہ بنانا ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ سب مسلمان مل کر رہیں۔ باہم ملنے سے ان کی طاقت بہت بڑھ جائے گی اور وہ زیادہ کامیابی کے ساتھ برائی کی طاقتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے رب کی طرف بڑھ سکیں گے

اس قسم کا اسلامی سماج کس طرح بنتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ خوف خدا کے ذریعہ۔ دنیا کی تمام بھلائیوں کا راز یہ ہے کہ آدمی اللہ سے ڈرے۔ اور دنیا کی تمام برائیوں کی جڑ یہ ہے کہ آدمی کا سینہ اللہ کے ڈر سے خالی ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی شخص دوسروں کے ساتھ سب سے بہتر سلوک کر سکتا ہے جو دوسروں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتا ہو۔ حضرت عمر تابعی کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جن اصحاب سے میں ملا ان کو میں نے یہ کہتے ہوئے پایا کہ لوگوں میں تمہارا سب سے زیادہ خیر خواہ وہ ہے جو تمہارے معاملہ میں اللہ سے ڈرتا ہو (انصح الناس لك من خاف الله فيك، جامع العلوم والحکم ۱۷) یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ کی پکڑ کے اندیشہ کے سوا کوئی چیز آدمی کو روک نہیں سکتی۔ جب آدمی پر ایک حیوانی جذبہ کا غلبہ ہوتا ہے، جب کسی معاملہ میں اس کا کوئی مفاد وابستہ ہو جاتا ہے، جب کوئی چیز اس کے لئے عزت ووقار کا مسئلہ بن جاتی ہے تو اس وقت انسان وہ سب کچھ کر ڈالنا چاہتا ہے جو اس کے بس میں ہے۔ ایسے موقع پر صرف ایک ہی چیز ہے جو آدمی کو قابو میں رکھے اور اس کو انصاف کے راستہ سے ہٹنے نہ دے۔ اور وہ یہ احساس کہ ہر آدمی کا معاملہ اللہ کے یہاں پیش ہونا ہے اور ہر ایک کو اس کے کئے کا پورا بدلہ ملنا ضروری ہے۔ دنیا میں اگر کوئی شخص اپنے کو بچا بھی لے تو آخرت میں وہ اپنے آپ کو خدا کی پکڑ سے نہیں بچا سکتا۔

مسلمانوں کا سماج خیر خواہی اور انصاف کا سماج ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر شخص اللہ سے ڈرنے والا ہوتا ہے ایک مسلمان کا معاملہ جب دوسرے مسلمان سے پیش آتا ہے تو اس کو وہ محض ایک انسانی معاملہ نہیں سمجھتا بلکہ ایک خدائی معاملہ سمجھتا ہے۔ اس کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ میں ایک انسان سے نہیں بلکہ خدا سے معاملہ کر رہا ہوں جو تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ ہر آدمی کے پیچھے اس کو خدا کھڑا ہوا نظر آتا ہے۔ ہر معاملہ اس کو ایک ایسا معاملہ دکھائی دیتا ہے جو آخرت کی عدالت میں پیش ہوگا اور تمام کھلے اور چھپے کا جاننے والا مالک اس کے بارہ میں بے لاگ فیصلہ فرمائے گا۔ مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ اس کو لازماً مرنا ہے اور مرنے کے بعد اللہ کے یہاں حساب کتاب کے لئے حاضر ہونا ہے۔ وہ اللہ سے اس بات کی دعائیں کر رہا ہوتا ہے کہ آخرت کی پیشی کے دن وہ اس کے ساتھ

نرمی کا معاملہ فرمائے۔ اس کی یہ نفسیات اس کو دوسرے انسانوں کے معاملہ میں نرم کر دیتی ہے۔ وہ اپنے ساتھ دوسروں کی زیادتیوں کو معاف کر دیتا ہے تاکہ اس کا خدا قیامت کے دن اس کی زیادتیوں کو معاف کر دے۔ وہ خدا کے بندوں کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کرتا ہے تاکہ خدا بھی اس کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کرے۔ بندوں کی طرف سے اس کو جتنا ملتا ہے اس سے زیادہ وہ ان کو لوٹاتا ہے تاکہ خدا اس کے حقیر عمل کے بدلے اپنے بڑے بڑے انعامات اس کے حصہ میں لکھ دے۔

اسلامی سماج میں آدمی اپنے حقوق سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں کو دیکھتا ہے اور اختلاف و شکایت کے مواقع پر خود اپنے کو قصوروار مان لیتا ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ایک شخص کا قرض تھا۔ وہ آیا اور آپ سے بہت بھدے انداز میں تقاضا کرنے لگا۔ آپ کے اصحاب جو اس وقت آپ کے ساتھ تھے، اس کی سخت باتوں کو سن کر بگڑ گئے اور اس کو مارنا چاہا۔ آپ نے منع فرمایا۔ آپ نے اس کے قصور کو اپنے آپ پر لیتے ہوئے فرمایا: اس کو چھوڑ دو۔ کیونکہ ایک حق دار کو کہنے سننے کا حق ہے (دَعُوہ فانّ لصاحب الحقّ مقالاً، متفق علیہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی ذات سے نمونہ قائم کر کے حق دار کو کہنے سننے کا موقع دیا اور اس طرح ہر قسم کے سماجی فساد کی جڑ کاٹ دی۔

اسلامی سماج میں یہ مزاج ہوتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ حد درجہ رعایت کی جائے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک اعرابی آیا اور مدینہ کی مسجد نبوی میں پیشاب کرنے لگا۔ لوگ اس کو پکڑنے اور مارنے کے لئے دوڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو آپ نے لوگوں کو منع فرمایا اور اس کو پیشاب کرنے سے نہ اٹھایا۔ آپ نے کہا: اس اعرابی کو چھوڑ دو اور اس نے جہاں پیشاب کیا ہے وہاں ایک ڈول پانی کا ڈال دو۔ کیوں کہ تم آسانی پیدا کرنے کے لئے بھیجے گئے ہو، تم مشکل پیدا کرنے کے لئے نہیں بھیجے گئے (بخاری) عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نرم ہے اور سارے معاملات میں نرمی کو پسند کرتا ہے (ان اللہ رفیق یحب الرفق فی الامر کلہ، متفق علیہ) یہ نرمی اور رعایت اسلامی سماج کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ اسلامی سماج ایک بااصول سماج ہے مگر اسی کے ساتھ وہ حد درجہ نرمی اور رعایت کا سماج ہے۔ مومن وہ ہے جو اپنے لئے شدت اور دوسرے کے لئے رعایت کو پسند کرے۔

اسلامی سماج میں کم بولنے اور زیادہ عمل کرنے کا ماحول ہوتا ہے۔ انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مسلمان کا انتقال ہوا۔ وہ ایک جہاد میں لڑ کر مرا تھا۔ ایک شخص نے کہا: اس کو جنت کی خوش خبری ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا: تم کو کیا معلوم شاید وہ شخص بے فائدہ باتیں کرتا رہا ہو اور ایسے خرچ میں بخل کرتا رہا ہو جس میں اس کا نقصان نہ تھا (لعلہ تکلم بما لا یعنیہ او بخل بما لا یغنیہ، ترمذی) اسی طرح ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا — اللہ تمھاری صورتوں کو نہیں دیکھتا وہ تمھارے عمل کو دیکھتا ہے (ان اللہ لا ینظر الی صورکم ولکن ینظر الیٰ اعمالکم) اسلامی سماج بے حد سنجیدہ سماج ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں کوئی شخص غیر ضروری کلام نہیں کرتا۔ ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ضروری کاموں میں مشغول رکھے۔

اسلامی سماج میں اپنی محنت پر بھروسہ کرنے کا ماحول ہوتا ہے۔ آدمی مانگ کر حاصل کرنے کے بجائے کر کے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ آدمی یہ نہیں سوچتا کہ جو کچھ دوسروں کے پاس ہے وہ میں چھین کر یا مطالبہ کر کے حاصل کر لوں بلکہ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ نے مجھ

کو ہاتھ پاؤں اور دل و دماغ کی جو صلاحیت دی ہے اس کو بروئے کار لا کر اپنی زندگی اپنے آپ بناؤں۔ ابو عبدالرحمٰن عوف بن مالک اشجعی رضی کہتے ہیں۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، اور ہم تقریباً نو آدمی تھے۔ آپ نے فرمایا: کیا تم رسول خدا سے بیعت نہیں کرتے۔ چوں کہ ہم جلد ہی بیعت کر چکے تھے، ہم نے کہا اے خدا کے رسول ہم بیعت کر چکے ہیں۔ آپ نے دوبارہ فرمایا: کیا تم رسول خدا سے بیعت نہیں کرتے، ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دئے اور کہا: اے خدا کے رسول ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں۔ پھر ہم کس چیز پر بیعت کریں۔ آپ نے فرمایا: یہ کہ تم اللہ کی عبادت کروگے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کروگے۔ اور پانچ وقت کی نماز اور اطاعت۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: ولا تسألوا الناس شیئا (اور تم لوگوں سے کوئی چیز نہ مانگو گے) راوی کہتے ہیں کہ ان میں سے بعض کو میں نے دیکھا کہ وہ گھوڑے پر سوار ہے اور اس کا کوڑا اگر گیا ہے تو وہ کسی سے مانگتا نہیں، بلکہ اتر کر خود کوڑے کو اٹھاتا ہے (مسلم) اس کا مطلب ہے کہ اسلامی سماج میں مانگنے اور مطالبہ کرنے کا ماحول نہیں ہوتا۔ ہر شخص اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتا ہے اور اپنی ذاتی محنت پر بھروسہ کرتا ہے۔

ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور اللہ پر ایمان لانا سب سے افضل اعمال ہیں۔ ایک شخص اٹھا اور اس نے کہا: اے خدا کے رسول کیا اگر میں اللہ کے راستہ میں مارا جاؤں تو میری خطائیں بخش دی جائیں گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ہاں، اگر تم اللہ کے راستہ میں مارے جاؤ، اس حال میں کہ تم صبر کرنے والے اور خالص اللہ کے لئے لڑنے والے ہو، آگے بڑھنے والے ہو پیچھے ہٹنے والے نہیں ہو تو تم بخش دئے جاؤگے۔ کچھ دیر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ پوچھا: تم نے کس طرح کہا تھا۔ اس نے اپنے سوال کو دہرایا۔ آپ نے دوبارہ اپنے جواب کو دہراتے ہوئے کہا: ہاں، اگر تم اللہ کے راستہ میں مارے جاؤ، اس حال میں کہ تم صبر کرنے والے اور خالص اللہ کے لئے لڑنے والے ہو، آگے بڑھنے والے ہو پیچھے ہٹنے والے نہیں ہو تو تم بخش دئے جاؤگے۔ لیکن اگر تمھارے اوپر قرض ہے تو اس کی بخشش نہ ہوگی۔ کیوں کہ ابھی جبریل نے مجھ کو بتایا ہے (الا الدین فان جبریل قال لی ذالک، مسلم) اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی سماج میں ہر آدمی بے حد محتاط ہوتا ہے کہ اس کے ذمہ کسی کا قرض یا حقوق باقی نہ رہ جائیں۔ ایک مسلمان کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ دین کی راہ میں خواہ میں کتنی ہی بڑی قربانی کر دوں مگر اللہ کی نظر میں میری قیمت اسی وقت ہوگی جب کہ میں اللہ سے اس طرح ملوں کہ میں نے کسی کا حق نہ دبایا ہو، میرے ذمہ لوگوں کے مطالبات نہ ہوں۔ اگر میرے ذمہ کسی انسان کا حق ہے اور میں اس کو ادا نہیں کرتا تو دین کی راہ میں میرا جان دے دینا بھی مجھ کو آخرت میں نجات نہ دے سکے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگو صدقہ کرو۔ ایک شخص نے پوچھا: اے خدا کے رسول اگر آدمی کے پاس مال نہ ہو۔ آپ نے فرمایا کہ پھر وہ لوگوں سے بھلی بات کہے۔ کیوں کہ وہ بھی صدقہ ہے۔ آدمی نے دوبارہ پوچھا: اے خدا کے رسول اگر اس کے پاس بھلی بات بھی نہ ہو۔ آپ نے فرمایا: پھر وہ دوسروں کو اپنے شر سے بچائے (یدع الناس من شرہ) اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی سماج میں سب سے بہتر آدمی وہ ہے جو لوگوں کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہو۔ اللہ نے اس کو جو کچھ دیا ہے اس میں سے وہ دوسروں کو دیتا رہے۔ اس کے قول اور عمل سے دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ اس کے بعد کم سے کم درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات سے کسی کو نقصان نہ پہنچنے دے۔ اگر وہ دوسروں کو کچھ نہ دے سکے تو وہ دوسروں کو محروم بھی نہ کرے۔ اگر وہ دوسروں کے کام نہ آئے تو دوسروں کے

کام بگاڑنے کی کوشش بھی نہ کرے۔ اگر دوسروں کے لئے اس کے پاس میٹھے بول نہ ہوں تو وہ ان کو کڑوا بول بھی نہ دے۔

امام مالک نے موطا میں روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: مجھے ایسی بات بتائیے جس کے ساتھ میں جیوں (یا رسول اللہ علمنی کلمات اعیش بھن) آپ نے فرمایا غصہ نہ کر (لا تغضب) اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی سماج مثبت نفسیات رکھنے والوں کا سماج ہے۔ اس کے افراد ہر قسم کی منفی نفسیات سے پاک ہوتے ہیں۔ غصہ ہر قسم کی منفی نفسیات کی جڑ ہے۔ "غصہ نہ کر" کا مطلب یہ ہے کہ منفی نفسیات میں نہ جیو بلکہ مثبت نفسیات میں جیو۔ دوسروں کی طرف سے اشتعال انگیزی ہو یا دوسروں سے تم کو تکلیف پہنچے تو اس کا جواب تم غصہ، نفرت، انتقام، حسد اور حقارت جیسے جذبات سے نہ دو بلکہ محبت، انصاف، خیر خواہی اور عفو و درگزر کا طریقہ اختیار کرو۔ جب بھی کوئی معاملہ پیش آئے تو ٹھنڈے دل سے سوچو اور صرف وہ کرو جو اللہ کی رضا کے اعتبار سے سب سے بہتر ہو نہ کہ وہ جس سے تمھارے بھڑکتے ہوئے جذبات کو تسکین مل رہی ہو۔ کسی کے خلاف تمھاری کارروائی جوابی کارروائی نہ ہو بلکہ اللہ کی جواب دہی کو سامنے رکھتے ہوئے ایک سوچی سمجھی کارروائی ہو۔ تمھاری غذا غصہ اور نفرت اور انتقام نہ ہو، بلکہ برداشت کرنا اور معاف کر دینا ہو۔ تم غصہ نہ کرنے میں جیو، نفرت نہ کرنے میں جیو، انتقام نہ لینے میں جیو، حسد نہ کرنے میں جیو۔

اسلامی معاشرہ میں جب ایک شخص دوسروں سے انصاف کرتا ہے اور ان کے حقوق ادا کرتا ہے تو یہ اس کے لئے عام معنوں میں محض ایک اخلاقی یا انسانی معاملہ نہیں ہوتا۔ یہ اس کے لئے ایسا مسئلہ ہوتا ہے جس پر آخرت میں اس کی نجات کا انحصار ہو۔ جو شخص بندوں کے ساتھ بہتر سلوک کرے وہی آخرت میں اس قابل ٹھہرے گا کہ خدا اس کے ساتھ بہتر سلوک کرے۔ اور جو شخص دوسرے انسانوں کے ساتھ بہتر سلوک نہ کرے اس کے لئے آخرت میں خدا کی رحمتوں میں کوئی حصہ نہیں۔ یہی دنیا کی زندگی میں آدمی کا امتحان ہے اور یہ امتحان خاص طور پر کمزور اور بے سہارا انسانوں کے بارے میں لیا جاتا ہے کیوں کہ ایسے افراد کے ساتھ بہتر سلوک کے لئے خدا کی رضا کے سوا اور کوئی محرک نہیں ہوتا۔ آدمی جب طاقتور کے ساتھ بہتر سلوک کرے تو اس میں یہ امید شامل رہتی ہے کہ دوسرے شخص کی طرف سے کسی نہ کسی صورت میں اس کا بدلہ ملے گا۔ اسی طرح جب کسی عوامی موقع پر آدمی انسانیت دوستی کا ثبوت دیتا ہے تو اس میں بھی یہ امید ہوتی ہے کہ اس سے آدمی کی شہرت و عزت میں اضافہ ہوگا۔ مگر جب ایک تنہا اور بے زور آدمی اس کے سامنے ہو اور اس سے مدد کی درخواست کرے تو وہاں اس قسم کی کوئی کشش موجود نہیں ہوتی۔ اور اگر یہ بے زور شخص ایک ایسا شخص ہو جس سے آدمی کو تکلیف اور شکایت پہنچی ہے تو ایسے موقع پر یہ عدم جاذبیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس وقت جو آدمی بے غرض ہو کر اور شکایات سے اوپر اٹھ کر اس کی مدد کرتا ہے تو وہ خالص خدا کے لئے ایسا کر رہا ہے، کیونکہ خدا کی رضا کے سوا کوئی دوسری کھینچنے والی چیز وہاں موجود نہیں۔ جہاں ہر قسم کی دوسری کشش ختم ہو جائے وہاں خدا کی کشش موجود ہوتی ہے۔ اور جو شخص خالص خدا کے لئے دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کرے وہ خدا کا محبوب ترین بندہ ہوتا ہے۔ وہ عین اس مقام پر خدا کو پالیتا ہے جہاں اس نے خالص خدا کی خاطر کسی بندے کا آنسو پونچھا تھا۔

خلاصہ تقریر بمقام تیجہ (مدھیہ پردیش) ۲۹ جنوری ۱۹۸۰

جہاں دلیل کام نہیں کرتی

ایک سوامی جی تھے۔ انھوں نے دو مضامین میں ایم اے کیا تھا۔ ایک شخص نے سوامی جی سے پوچھا: یہ بتائیے کہ پُن اور پاپ کی تعریف کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں تم کو ایک جامع تعریف بتاتا ہوں۔ اس پر اپنے کو اور سب کو تول لو۔ وہ تعریف ان کے الفاظ میں یہ تھی:
Killing of a sensation is a sin & Vice versa

احساس کو مارنا گناہ ہے اور اسی طرح اس کے برعکس (احساس کو نہ مارنا نیکی ہے) پوچھنے والے نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جانور کو ذبح کر کے کھاتے ہیں وہ کھلا ہوا پاپ کرتے ہیں۔ سوامی جی نے کہا اس میں کیا شک ہے۔ آدمی نے کہا: مگر وہ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ایک جانور کو کاٹ کر ہم چالیس آدمی کھاتے ہیں اور تم لوگ چالیس سبزیوں کو کاٹتے ہو تو صرف ایک آدمی کھاتا ہے۔ اس لئے سبزی خوروں کا پاپ پھر بھی گوشت خوروں سے بڑھا ہوا ہے۔ سوامی جی نے کہا: ایسا نہیں۔ میں تم کو ایک مثال سے سمجھاتا ہوں۔ تمھارے سر پر ہزاروں بال ہیں۔ تم ان کو قینچی سے کاٹتے ہو تو کیا تکلیف ہوتی ہے۔ آدمی نے کہا نہیں۔ سوامی جی نے کہا: قینچی اگر سر کی کھال میں لگ جائے تو کیسا معلوم ہوگا۔ آدمی نے کہا: پھر تو بہت تکلیف ہوگی۔ سوامی جی نے کہا: اسی سے سمجھ لو۔ بال تمھارے زندہ جسم کا حصہ ہیں۔ مگر ان میں حساسیت صفر کے درجہ میں ہے اس لئے تم کو تکلیف نہیں ہوتی۔ جب کہ جسم کی کھال میں حساسیت پوری ہے اس لئے کھال میں قینچی لگنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ جانور میں اسی طرح احساس ہوتا ہے جس طرح تمھارے اندر احساس ہے۔ مگر پودوں میں احساس اسی طرح بدرجہ صفر ہے جس طرح تمھارے بال میں ہے، اس لئے سبزی کھانا پاپ نہیں ہے۔ جب کہ جانور کھانا پاپ ہے۔ کیونکہ جانور کو کھانے کے لئے ایک حسّاس وجود کو مارنا پڑتا ہے۔

آدمی نے کہا: گویا اس معاملہ میں آپ کے نزدیک اصل معیار احساس ہے۔ احساس ہو تو کاٹنا پاپ ہے اور احساس نہ ہو تو کاٹنا پاپ نہیں۔ سوامی جی نے کہا ہاں۔ آدمی نے کہا: آپ کو معلوم ہے کہ آج کل ایسے انجکشن تیار ہو گئے ہیں جن کو لگا دیا جائے تو احساس بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جانور کو اگر اس قسم کا انجکشن لگا دیا جائے اور اس کے بعد اس کو کاٹا جائے تو آپ کے معیار کے مطابق اس کو کاٹنا پاپ نہ ہوگا۔ سوامی جی کا چہرہ جو اس سے پہلے روشن تھا، اچانک پھیکا پڑ گیا۔ "اصل بات یہ ہے ۔۔۔" انھوں نے کہا اور دوسری دوسری بحثیں شروع کر دیں۔ آدمی نے کہا کہ آپ اپنا موقف نہ بدلئے۔ یا تو میری بات کا جواب دیجئے یا اعتراف کیجئے کہ نیکی اور بدی کے لئے آپ کا معیار درست نہیں۔ مگر سوامی جی نے دونوں میں سے کوئی بات نہ کی۔ بلکہ دوسری دوسری بحثیں چھیڑ کر ظاہر کرتے رہے کہ ان کی بات رد نہیں ہوئی ہے۔

آدمی کسی بات کو صحیح سمجھ لے اور اس پر اس کو ایک مدت گزر جائے تو وہ اس سے اتنا زیادہ مانوس ہو جاتا ہے کہ اس کی صداقت پر یقین کرنے کے لئے اس کو دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر ایسے دلائل سامنے آئیں جو اس کی بات کو غلط ثابت کر دیں تب بھی مذکورہ عقیدہ کے ساتھ اپنی نفسیاتی وابستگی کی بنا پر اس کا یقین باقی رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دلیل کی کاٹ خواہ اس کے پاس موجود نہ ہو مگر اس کے عقیدہ کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ــــ دلیل اس کے لئے ہے جو دلیل پر کھلے ذہن سے غور کرے۔ جو شخص دلیل پر غور نہ کرے اس کے لئے کوئی دلیل دلیل نہیں۔

■ آپس کی لڑائی اسلام کے خلاف ہے

من حمل علینا السلاح فلیس منا (حدیث) جس نے ہمارے اوپر ہتھیار اٹھایا وہ ہم میں سے نہیں۔

متحد رہنا اور اقدام میں پہل نہ کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ہجرت کے دسویں سال نجران (یمن) بھیجا۔ انھوں نے وہاں اسلام کی تبلیغ کی۔ خالد بن ولید رض واپس ہوئے تو ان کے ساتھ بنو حارث بن کعب کے لوگ مسلمان ہو کر مدینہ آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: جاہلیت کی جنگوں میں تم کس طرح ہمیشہ غالب رہتے تھے۔ انھوں نے کہا: ہم کسی پر غلبہ حاصل نہیں کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا ہاں، مگر جو تم سے جنگ کرتا تھا، تم اس کے اوپر غالب رہتے تھے۔ انھوں نے کہا: اے خدا کے رسول جو ہم سے جنگ کرتا تھا ہم اس پر غالب رہتے تھے۔ ہم متحد رہتے تھے، کبھی متفرق نہیں ہوتے تھے۔ اور کسی کے اوپر ظلم سے آغاز نہیں کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا تم نے سچ کہا (کنا نغلب من قاتلنا یا رسول اللہ، انا کنا نجتمع ولا نفترق ولا نبدأ احدا بظلم، قال صدقتم، ابن ہشام، جزء ثانی، ۱۳۴)

■ بحث و جدال نیکی کو مٹا دیتا ہے

عوام بن حوشب نے کہا: لوگو دین میں جھگڑا کرنے سے بچو۔ کیوں کہ دین میں جھگڑا کرنے سے آدمی کے اعمال حبط ہو جاتے ہیں (عن العوام بن حوشب قال ایاکم والخصومات فی الدین فانها تحبط الاعمال، ابن عبد البر جامع بیان العلم وفضلہ، جزء ثانی، صفحہ ۹۳)

■ بغض آدمی کے دین کو کھا جاتا ہے

البغضاء ھی الحالقۃ، لا اقول تحلق الشعر ولکن تحلق الدین۔ والذی نفس محمد بیدہ۔ لا تدخلوا الجنۃ حتی تومنوا، ولا تومنوا حتی تحابوا (جامع بیان العلم وفضلہ، جزء ثانی، صفحہ ۱۵۰) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بغض مونڈنے والی چیز ہے۔ میں یہ نہیں کہتا وہ بال کو مونڈتا ہے بلکہ وہ دین کو مونڈ دیتا ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے، تم جنت میں نہیں داخل ہو سکتے جب تک کہ مومن نہ بنو اور مومن بن نہیں سکتے جب تک آپس میں محبت نہ کرو۔

■ اجتماعی زندگی ہر حال میں ضروری ہے

عن ابی الدرداء قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما من ثلاثۃ فی قریۃ ولا بدو لا تقام فیھم الصلوۃ الا استحوذ علیھم الشیطان فعلیکم بالجماعۃ فانما یاکل الذئب من الغنم القاصیۃ وان ذئب الانسان الشیطان اذا خلا بہ اکلہ (ترغیب وترہیب)

ابو الدرداء رض کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: جس گاؤں یا جنگل میں تین آدمی ہوں اور وہاں با جماعت نماز نہ ہوتی ہو تو ان پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے۔ اس لئے جماعت کو ضروری سمجھو۔ بھیڑیا اکیلی بکری کو کھا جاتا ہے اور آدمیوں کا بھیڑیا شیطان ہے

■ انسان سے معاملہ کرتے ہوئے اللہ کو یاد رکھنا

ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ ایک بار اپنے غلام کو مار رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا: ابومسعود! جان لو کہ اس غلام پر تم کو جتنی قدرت ہے، اللہ کو تمھارے اوپر اس سے زیادہ قدرت ہے۔ ابومسعود انصاری رضی آپ کی زبان سے یہ سن کر کانپ اٹھے اور کہا: اے خدا کے رسول اس غلام کو میں اللہ کی راہ میں آزاد کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم ایسا نہ کرتے تو دوزخ کی آگ تم کو پکڑ لیتی (ابوداؤد، کتاب الادب، باب حق المملوک)

■ اپنے اوپر قیاس کرکے بدگمانی سے بچنا

اِفک کا قصہ جس میں نعوذ باللہ حضرت عائشہ رض پر الزام لگایا گیا، اس کے ذیل کے بہت سے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوایوب انصاری رض سے ان کی بیوی نے کہا کہ لوگ عائشہ کی نسبت ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ کہنے والے جھوٹے ہیں۔ پھر انھوں نے اپنی بیوی سے پوچھا: تم بتاؤ، کیا تم ایسا کام کرسکتی ہو۔ خاتون نے کہا ہرگز نہیں۔ حضرت ابوایوبؓ نے فرمایا: پھر عائشہ رضی تم سے کہیں زیادہ پاک اور طاہرہ مطہرہ ہیں، ان کی نسبت ایسا برا گمان کیوں کیا جائے

■ مسلمان کی بہتری پر خوش ہونا

طبرانی نے ابن بریدہ اسلمی سے روایت کیا ہے۔ عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انی لاسمع بالغیث قد اصاب البلد من بلاد المسلمین فافرح ومالی بہ سائمۃ (حلیۃ الاولیاء) میں سنتا ہوں کہ مسلمانوں کے شہروں میں سے کسی شہر میں بارش ہوئی ہے تو میں خوش ہوتا ہوں۔ حالاں کہ میرا کوئی جانور وہاں چرنے والا نہیں۔

■ اللہ کی خاطر انتقامی کارروائی سے رک جانا

غزوہ بنی المصطلق سے واپسی میں ایک اتفاقی غلطی سے عائشہ رضی اللہ عنہا راستہ میں رہ گئیں۔ بعد کو ایک صحابی نے ان کو میدان میں دیکھا تو اپنے اونٹ سے اتر کر ان کو بٹھایا اور خود اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ کو مدینہ پہنچا دیا اس واقعہ کو مدینہ کے منافقین نے شوشہ بنا لیا اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف جھوٹی باتیں پھیلانے لگے۔ منافقین کے پروپگنڈے سے متاثر ہونے والوں میں ایک مسطح بھی تھے جو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار تھے اور آپ ان کو ہر ماہ مدد کے طور پر کچھ رقم دیا کرتے تھے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ اس پروپگنڈے میں مسطح بھی شریک ہیں تو انھوں نے کہا: خدا کی قسم اب میں مسطح کو کچھ بھی نہیں دوں گا۔ اس کے بعد قرآن میں حکم اترا کہ تم میں سے جو لوگ مال اور قدرت رکھتے ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ اپنے رشتہ دار، مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ کی مدد نہ کریں گے۔ ان کو چاہئے کہ معاف کردیں اور درگزر کریں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کردے اور اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے (نور ۲۲) یہ آیت اتری تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں خدا کی قسم مجھے محبوب ہے کہ اللہ مجھے معاف کردے (بلی واللہ انی لاحب ان یغفرلی، سیرت ابن ہشام) اور اس کے بعد دوبارہ مسطح کی رقم جاری کردی۔

■ اللہ اس کو قیامت کے دن آگ سے بچائے گا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے بھائی کو بے آبروئی سے بچائے، قیامت کے دن اللہ اس کو آگ سے

بچائے گا (من ردعن عرض اخیہ رد اللہ عن وجھہ النار یوم القیامۃ)

■ صدقہ ہر آدمی پر فرض ہے

کُلُّ سُلامیٰ مِنَ النَّاسِ عَلَیْہِ صَدَقَۃٌ کُلَّ یَوْمٍ تَطْلُعُ فِیْہِ الشَّمْسُ۔ تَعْدِلُ بَیْنَ اثْنَیْنِ صَدَقَۃٌ وَتُعِیْنُ الرَّجُلَ فِیْ دَابَّتِہٖ فَتَحْمِلُہٗ عَلَیْھَا اَوْتَرْفَعُ لَہٗ عَلَیْھَا مَتَاعَہٗ صَدَقَۃٌ۔ وَالْکَلِمَۃُ الطَّیِّبَۃُ صَدَقَۃٌ۔ وَبِکُلِّ خَطْوَۃٍ تَمْشِیْھَا اِلَی الصَّلٰوۃِ صَدَقَۃٌ وَتُمِیْطُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ صَدَقَۃٌ (بخاری و مسلم)

آدمی کے ہر جوڑ پر ایک صدقہ ہے ہر دن جب کہ سورج طلوع ہو۔ دو آدمیوں کے درمیان انصاف کرنا صدقہ ہے۔ آدمی کو سواری پر چڑھنے میں یا سامان اتارنے میں مدد کرنا صدقہ ہے۔ ایک اچھا بول صدقہ ہے۔ راستہ سے تکلیف کی ہر چیز کو ہٹا دینا صدقہ ہے۔

■ اللہ کا محبوب بندہ وہ ہے جو اخلاق میں اچھا ہو

طبرانی اور ابن حبان نے اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے اور ہم اس طرح چپ تھے جیسے کہ ہمارے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں، ہم میں سے کوئی بھی بول نہیں رہا تھا اتنے میں کچھ لوگ آئے۔ انھوں نے پوچھا: اللہ کے بندوں میں سے کون اللہ کو زیادہ محبوب ہے۔ آپ نے فرمایا: جو ان میں سے اخلاق میں اچھے ہیں (احسنھم خلقا، الترغیب والترہیب جلد ۴)

■ بندوں کے حقوق ادا کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے چند دن پہلے خلاف معمول ایک لمبی تقریر فرمائی۔ آخر میں آپ نے کہا: میں اللہ کے یہاں اپنا صحیفۂ زندگی صاف ستھرا لے کر جانا چاہتا ہوں۔ اگر کسی کا کوئی قرض مجھ پر رہ گیا ہو جس کو میں ادا کرنا بھول گیا ہوں۔ یا غیر ارادی طور پر کسی شخص کو مجھ سے کوئی ذہنی یا جسمانی تکلیف پہنچی ہو تو وہ مجھ سے اس کا بدلہ لے لے یا مجھے معاف کر دے" آپ نے تقریر ختم کر کے انتظار فرمایا مگر کوئی نہ بولا۔ اب ظہر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ آپ نے جماعت کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کی۔ نماز ظہر کے بعد آپ دوبارہ ممبر پر آئے اور وہی سوال پھر دہرایا کہ میرے ذمہ کسی کا قرض ہو یا مجھ سے کسی کی اہانت ہوئی ہو تو وہ اپنا بدلہ لے لے۔ اب ایک شخص اٹھا اس نے کہا کہ "اے خدا کے رسول! آپ کے اوپر میرا پانچ درہم کا قرض ہے" اس کے بعد آپ نے حکم دیا اور ان کے پانچ درہم اسی وقت مسجد میں ادا کر دئے گئے۔

■ ہر ایک کے ساتھ انصاف کرنا خواہ وہ کمزور ہو یا طاقت ور

معاویہ بن ابوسفیان نے ضرار صدائی سے کہا کہ اے ضرار، مجھ سے علی کی صفت بیان کرو (یا ضرار صف لی علیا) اس کے جواب میں انھوں نے جو کچھ کہا اس کے چند جملے یہ تھے: وہ ہمارے اندر ہمارے ایک شخص کی مانند تھے۔ کوئی طاقت ور اپنے باطل میں ان سے امید نہ کرسکتا تھا اور کوئی کمزور ان سے عدل پانے میں مایوس نہ ہو سکتا تھا (کان فینا کاحدنا لا یطمع القوی فی باطلہ ولا ییأس الضعیف من عدلہ)

خدا سے ڈرنے والے

ہٹلر کی حکومت کے زمانہ میں جرمنی میں جب یہودی پکڑے جانے لگے تو وہاں بہت سے لطیفے مشہور ہوئے۔ ایک لطیفہ یہ تھا کہ شہر کی ایک سڑک پر ایک یہودی بھاگا جا رہا تھا۔ دوسرے یہودی نے اس کو دیکھ کر پوچھا کہ تم کیوں بھاگ رہے ہو۔ اس نے کہا "تم بھی بھاگو" اس نے دوبارہ پوچھا "آخر کیوں" بھاگنے والے یہودی نے جواب دیا: چڑیا گھر سے ایک بھیڑیا بھاگ نکلا ہے اور اس کو گولی مارنے کا حکم ہوا ہے۔ دوسرے یہودی نے حیران ہو کر کہا: ہم کو کیا ڈر ہے، ہم بھیڑیے تو نہیں ہیں، پھر ہم کیوں بھاگیں۔" پہلے یہودی نے جواب دیا: ہاں ہم بھیڑیے نہیں ہیں۔ مگر کیا ہم اس کو ثابت کر سکتے ہیں۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈر کی نفسیات سے جو انسان بنتا ہے وہ کیسا انسان ہوتا ہے۔ وہ ہر مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھتا ہے۔ کیوں کہ اس کو ڈر ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے کہیں میں نہ پکڑ لیا جاؤں۔ کسی سے ڈرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اس کے مقابلہ میں اپنے کو کمزور پا رہا ہے۔ وہ فیصلہ کا سرا دوسرے کے ہاتھ میں سمجھتا ہے۔ اور جب بھی فیصلہ کا سرا دوسرے کے ہاتھ میں ہو تو لازماً ایسا ہوگا کہ آدمی اندیشہ میں مبتلا رہے گا۔ اس کو یہ ڈر لگا رہے گا کہ کہیں میں ہی مجرم نہ قرار دے دیا جاؤں۔ ایک بکری جو مجھ سے بہت دور فرات کے کنارے مری ہو، اگر اس کے مرنے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی جائے تو میرے پاس کیا جواب ہوگا۔ اور میں کس طرح اپنے کو بری الذمہ ثابت کر سکوں گا۔

اللہ تمام طاقتوں سے بڑھ کر طاقت ور ہے۔ تمام فیصلوں کا سرا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ایسی حالت میں جو شخص اللہ کو پالے وہ اس کی طرف سے مستقل اندیشہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ہر معاملہ میں وہ سوچنے لگتا ہے کہ خدا کی عدالت میں کہیں مجھ کو اس کا ذمہ دار نہ قرار دے دیا جائے۔ اپنے کو بچانے کا جذبہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ لوگوں سے معاملہ کرنے میں وہ حد درجہ محتاط رہے، لوگوں کے ساتھ وہ ہمیشہ فیاضی کا سلوک کرے، وہ لوگوں کے حق سے زیادہ انھیں دے۔ اس کا کوئی ساتھی یا اس کا ماتحت اگر کوئی غلط کام کرتا ہے تو اس کا خطرہ وہ اپنے اوپر محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ وہ سوچتا ہے کہ خدا اگر قیامت میں کہہ دے کہ تمھاری وجہ سے اس کو یہ جرأت ہوئی تو میرے پاس کیا عذر ہوگا۔ اس کی لاعلمی میں ظلم کا ایک واقعہ ہو تب بھی وہ کانپ جاتا ہے کہ اگر خدا کے یہاں یہ کہا جائے کہ تم عوامی قائد بنے ہوئے تھے تو تم اس سے باخبر کیوں نہ ہوئے تو میں خدا کو کیا جواب دوں گا۔ اس کے دائرہ میں کوئی شخص کسی کو ستاتا ہے تو وہ بے تاب ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ ڈر جاتا ہے کہ اگر خدا یہ کہے کہ تم نے اپنی کارروائیوں سے جو ماحول بنایا اس کی وجہ سے ایسا واقعہ ممکن ہو سکا تو میں کس طرح اپنے کو بری الذمہ ثابت کروں گا۔ کوئی شخص اس کو مدد کے لئے پکارتا ہے اور وہ ایک عذر کر کے آگے بڑھ جاتا ہے تو وہ لرز اٹھتا ہے۔ کیوں کہ یہ احساس اس کو پریشان کر دیتا ہے کہ قیامت میں اگر خدا یہ کہہ دے کہ تم نے اپنے جس کام کو عذر بنایا اس سے زیادہ ضروری یہ تھا کہ تم اس کو چھوڑ کر میرے بندے کا ساتھ دیتے تو میں کیا کہہ کر چھوٹ سکوں گا۔

"ہر ایک کے پاس اپنی عظمت کی داستانیں ہیں، خدا کی عظمت کی داستان کسی کے پاس نہیں"، یہ فقرہ اکثر دردناک آہ کے ساتھ میری زبان سے اس وقت نکل جاتا ہے جب میں ان اخبارات و رسائل کو پڑھتا ہوں جو مختلف اسلامی اداروں اور جماعتوں نے اپنی ترجمانی کے لئے نکال رکھے ہیں اور روزانہ چھپ چھپ کر لوگوں تک پہنچتے ہیں۔ ایک آدمی اپنی محبوب شخصیت کے حق میں لمبا نثری قصیدہ پڑھے گا جس میں یہ خبر دی جائے گی کہ "آپ کی ذات گرامی کے آفتاب سے گوشے گوشے جگمگا رہے ہیں" مگر طویل تحریر میں کہیں بھی یہ محسوس نہ ہوگا کہ کہنے اور سننے والے خدا کی عظمت و جلال کے احساس سے لرز رہے ہیں اور رب العالمین کے بے پایاں کرشموں کو دیکھ کر محو حیرت ہیں۔ البتہ خاتمہ کلام پر یہ فقرہ ادا کر دیا جائے گا: وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ کلام کے پورے مجموعہ میں دیکھئے تو عربی کا یہ فقرہ ایک بے جوڑ سا فقرہ معلوم ہوگا۔ جس کلام میں انسانی عظمت کے آبشار برسائے جا رہے ہوں وہاں "تمام تعریف صرف اللہ کے لئے ہے"، کہنے کا کیا مقام۔ اس قسم کا فقرہ ہمیشہ رسمی ہوتا ہے نہ کہ حقیقی۔ انسان کی عظمت کا طویل قصیدہ پڑھنے کے بعد یہ مختصر عربی فقرہ حقیقتاً اللہ کی حمد کے جذبہ سے نہیں نکلتا بلکہ صرف تبرک یا رسم کی خانہ پری کے لئے ہوتا ہے۔ کسی دوسرے مذہب کا آدمی ہو اور وہ اپنی محبوب شخصیت کا قصیدہ پڑھے تو وہ اپنے کلام کے آخر میں اپنے مذہب اور روایات کے لحاظ سے کوئی فقرہ بول دے گا اور مسلمان اپنے مذہب اور روایات کے لحاظ سے۔ بظاہر دونوں ایک دوسرے سے مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ ایک کا فقرہ "اسلامی" فقرہ ہے اور دوسرے کا "غیر اسلامی" فقرہ۔ مگر جس نفسیاتی حالت کے تحت یہ فقرے نکلے ہیں، اس کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ اندرونی کیفیت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ایک شخص اپنی روایتی تسکین کے لئے عربی فقرہ کا تلفظ کر رہا ہے، دوسرا کسی غیر عربی فقرہ کا۔

جو لوگ اپنے ان مشغلوں پر خوش ہیں اور ان کو کارنامہ سمجھتے ہیں وہ بہت جلد جان لیں گے کہ ان کی یہ سرگرمیاں خدا کی نظر میں اس سے بھی زیادہ بے قیمت تھیں جتنا کہ مٹی کے ڈھیر میں ایک چیونٹی کا رینگنا۔ یہ زمین کسی کے "اکابر" کی جلوہ گاہ نہیں، یہ خدا کی تجلیات کا ظہور ہے۔ جب بھی خدا کے سوا کسی اور کی تعریف اس زمین پر کی جاتی ہے تو وہ سب سے بڑا جھوٹ ہوتا ہے جو کوئی شخص بولتا ہے۔

انسانی عظمت کے قصیدے جب پڑھے جاتے ہیں تو زمین و آسمان کی ہر چیز پڑھنے اور سننے والوں پر لعنت بھیجتی ہے مگر جب خدا کی عظمت کا چرچا کیا جائے تو زمین و آسمان اس کے ہم آواز ہو جاتے ہیں۔ انسانی عظمت کے قصیدے چھوٹی زبانوں سے نکلتے ہیں اور چھوٹے کانوں سے سنے جاتے ہیں۔ مگر جب کسی کو خدا کی عظمت بیان کرنے کی توفیق ملتی ہے تو یہ ایک ملکوتی کلام ہوتا ہے جو فرشتوں کی ہم نشینی سے کسی کی زبان سے ابلتا ہے۔ جو لوگ کسی انسان کی عظمت سے مسحور ہوں وہ اس کی شان میں الفاظ کے دریا بہاتے ہیں جب کہ خدا کی عظمت سے مسحور ہونے والے شخص پر چپ لگ جاتی ہے۔ انسانی عظمت کے چرچے پر رونق مجلسوں اور عمدہ چھپے ہوئے کاغذوں میں ہوتے ہیں اور اللہ کی عظمت کا چرچا ایک بندۂ خدا کے قلب میں ابلتا ہے اور صرف اس کی تنہائیوں کو یہ خوش قسمتی حاصل ہوتی ہے کہ وہ اس کو سنیں اور دیکھیں۔ خدا کی عظمتوں میں جینے والے اور انسان کی عظمتوں میں جینے والے میں وہی فرق ہے جو خود خدا اور انسان میں۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زرتعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت —— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔

دوسری صورت —— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

حقیقت کی تلاش

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۶۰ ـ قیمت ایک روپیہ

دین کی سیاسی تعبیر

(تعبیر کی غلطی کا خلاصہ)

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۷۰ قیمت ۲/-

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

کتاب وسنت کا داعی ونقیب

زر تعاون سالانہ پندرہ روپے

دفتر اخبار ترجمان

پوسٹ بکس نمبر 1306 دہلی ـ ۶

اسلام کا تعارف

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۲۴، قیمت ۵۰/۰

اسلام

ایک عظیم جدوجہد

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۸۰ قیمت ۱/۶۰

مکتبہ الرسالہ

جمعیت بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی

سوشلزم

ایک غیر اسلامی نظریہ

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۷۲ ـ قیمت ۱/۲۵

مارکسزم

تاریخ جس کو رد کر چکی ہے

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۱۴۸ قیمت ۳/۰۰

مکتبہ الرسالہ

جمعیت بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی

جدید اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

REGD. R. N. NO. 28822/76
REGD. D. (D.) NO. 532

May 1980
Issue No. 42

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI-110006, INDIA

جو لوگ دوسروں کی شکایت کرتے ہیں وہ
صرف اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ
زندگی کی دوڑ میں وہ دوسروں سے پیچھے ہو گئے

شمارہ ۴۳ زرتعاون سالانہ ۲۴ روپے قیمت فی پرچہ
جون ۱۹۸۰ خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے دو روپے
بیرونی ممالک سے [illegible]

الرسالہ

جون ۱۹۸۰
شمارہ ۴۳

جمعیۃ بلڈنگ . قاسم جان اسٹریٹ . دہلی ۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے ڈرافٹ پر صرف الرسالہ Al-Risala Monthly لکھیں

دعا کیوں قبول نہیں ہوتی

لوگوں نے ایک بزرگ سے پوچھا: کیا وجہ ہے کہ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں اور ہماری دعا قبول نہیں ہوتی۔ بزرگ نے جواب دیا: اس لئے کہ آپ لوگ خدا سے وہ چیز مانگتے ہیں جو آپ دوسرے انسانوں کو دینے کے لئے تیار نہیں۔ آپ خدا سے مانگتے ہیں کہ وہ آپ کو ظالموں کے ظلم سے بچائے۔ مگر آپ میں سے ایک شخص کو جب کسی کے اوپر غلبہ حاصل ہوتا ہے تو وہ اس کو اپنے ظلم کا مزہ چکھانے سے باز نہیں رہتا۔ آپ خدا سے جان و مال کی امان مانگتے ہیں مگر آپ میں سے ایک شخص کو جب موقع ملتا ہے تو وہ اپنے بھائی کے جان و مال کو اپنے لئے جائز کر لیتا ہے۔ آپ خدا سے باعزت زندگی مانگتے ہیں مگر آپ میں سے ایک شخص اگر کسی کے اوپر قابو پالے تو وہ اس کو بے عزت کر کے خوش ہوتا ہے۔ آپ خدا سے مانگتے ہیں کہ وہ آپ کو دشمن قوموں کی سازش سے بچائے مگر آپ میں سے ایک شخص کو اگر کسی سے اختلاف ہو جائے تو اس کو اکھاڑنے کے لئے وہ ہر قسم کی سازشیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔

دعا کی قبولیت کی لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی دعا مانگنے میں سنجیدہ ہو۔ اس کی دعا اس کی پوری ہستی کی پکار ہو نہ کہ محض زبان کی حرکت سے نکلے ہوئے الفاظ۔ جب آدمی سنجیدہ ہو تو اس کی زندگی تضاد سے خالی ہو جاتی ہے۔ اس کی دعا میں اور اس کے عمل میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اگر ایک شخص فی الواقع ظلم کو ناپسند کرتا ہے اور دوسرے آدمی کے ظلم کو قابل شکایت سمجھ رہا ہے تو ناممکن ہے کہ وہ خود اپنے دائرے میں ظالم بن جائے۔ اپنے دائرہ اختیار میں ظلم کرنا اور دوسرے کے ظلم پر احتجاج کرنا ایسا تضاد ہے جو ثابت کرتا ہے کہ آدمی اپنے کہنے میں سنجیدہ نہیں ہے، وہ قول بلا فعل (صفت) کی سطح پر ہے۔ اور جو شخص قول بلا فعل کی سطح پر ہو اس کی دعا اس کے منہ پر مار دی جاتی ہے نہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کا شرف حاصل کرے۔ ایک شخص لوگوں کو باہم لڑاتا پھرتا ہو اور خدا سے دعا کرے کہ "خدایا لوگوں کو متحد کر دے" تو یہ اللہ کی نظر میں دعا نہیں ہے بلکہ ایک مذاق ہے جو دعا کرنے والے کو صرف سزا کا مستحق بناتی ہے۔ دعا کی قبولیت کے لئے ضروری ہے کہ آدمی بندوں کو وہی دے رہا ہو جو وہ خدا سے اپنے لئے مانگ رہا ہے۔ اس سے دوسروں کو وہی رحمت و عنایت ملے جس رحمت و عنایت کی درخواست وہ خدا سے اپنے لئے کر رہا ہے۔ اس کے بغیر دعا ایک جرم ہے نہ کہ حقیقۃً اللہ کے سامنے پیش کی جانے والی درخواست۔

موت کے عقیدہ نے زندگی دے دی

ایک نوجوان نے عربی مدرسہ سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد ان کا ارادہ مزید تعلیم حاصل کرنے کا تھا۔ اسی دوران گھر سے ایک خبر آئی جس نے ان کے حوصلے ختم کر دیے۔ خبر یہ تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کے گھر پر معمولی کھیتی باڑی تھی۔ اسی میں محنت کرکے ان کے والد صاحب گھر کا کام چلاتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد گھر پر صرف ان کی بیوی تھیں اور چند چھوٹے بچے۔ اب مذکورہ نوجوان ہی گھر کے بڑے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کو اپنی ذمہ داری کا شدید احساس ہوا۔ والد صاحب کی وفات کا مطلب ان کے لئے صرف ایک تھا۔ یہ کہ وہ مزید تعلیم کا ارادہ ترک کرکے اپنے گھر چلے جائیں اور اپنے والد صاحب کی طرح کھیتی باڑی کے کام میں لگ کر گھر کا انتظام سنبھالیں۔

مدرسہ میں ایک بزرگ سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ اس کے بعد وہ ان سے ملے اور کہا "حضرت اب میں یہاں سے جا رہا ہوں اور آپ سے آخری ملاقات کے لئے آیا ہوں" بزرگ نے کہا: آخر کیا بات ہے۔ کہاں جا رہے ہو۔ انھوں نے بتایا کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے اور میں ہی اپنے گھر میں سب سے بڑا ہوں۔ اس لئے اب مجھ ہی کو گھر کا انتظام سنبھالنا ہے۔ شاید قدرت کو یہی منظور ہے کہ میرے ہاتھوں میں "قلم" کے بجائے "ہل" ہو۔ بظاہر اب میرے لئے مزید تعلیم کا کوئی سوال نہیں۔ بزرگ یہ سن کر خاموش ہو گئے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بولے: "کیا موت آپ کے لئے نہیں ہے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ گھر پہنچ کر آپ کا انتقال نہیں ہو جائے گا۔ پھر اگر آپ کا بھی انتقال ہو گیا تو" اس کے بعد بزرگ نے کہا کہ کسی گھر کا سنبھالنے والا کوئی شخص نہیں ہوتا۔ ہر گھر کا سرپرست اور کفیل اللہ تعالیٰ ہے کسی کے جینے مرنے سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ اپنے تعلیمی منصوبہ کو جاری رکھئے اور گھر کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیجئے۔ "آپ تھوڑی دیر کے لئے سمجھ لیجئے کہ میرا بھی انتقال ہو گیا ہے"

یہ بات نوجوان کے دل کو لگ گئی۔ انھوں نے گھر کا خیال چھوڑ دیا اور اس کے معاملہ کو اللہ کے حوالے کرکے اپنی تعلیمی جدوجہد شروع کر دی۔ انھوں نے مدینہ کے جامعہ اسلامیہ میں درخواست بھیجی اور اس کے لئے ضروری کوششیں کرنے لگے۔ کوشش کامیاب رہی اور ان کا داخلہ جامعہ اسلامیہ (مدینہ) میں ہو گیا۔ انھوں نے مدینہ کا سفر کرکے جامعہ اسلامیہ میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ وہاں سے فراغت کے بعد وہ سعودی عرب کے دار الافتاء کے تحت افریقہ کے ایک ملک میں مبلغ اور استاد کی حیثیت سے بھیج دیے گئے۔ ۱۱ اپریل ۲۰۰۰ کو ایک ملاقات میں انھوں نے راقم الحروف کو بتایا کہ افریقہ میں رہتے ہوئے ان کو دس سال ہو چکے ہیں۔ اور ان کی موجودہ زندگی سے وہ اور ان کے گھر والے دونوں مطمئن ہیں۔ وہ اپنے کو ایک کامیاب انسان سمجھتے ہیں اور یہ کامیابی ان کو اسی مختصر جملہ سے ہوئی ـــــــ سمجھ لیجئے کہ آپ کا بھی انتقال ہو گیا ہے

موت کا عقیدہ بظاہر منفی عقیدہ ہے۔ مگر وہ اپنے اندر زبردست مثبت اثرات رکھتا ہے۔ جس کو موت کا یقین ہو زندگی کے بارے میں اس کا یقین بڑھ جاتا ہے۔ جو شخص موت کو دیکھ لے وہ اپنی زندگی میں زیادہ با عمل ہو جاتا ہے۔

قابلیت اور مستعدی

راجہ مہندر پرتاپ (۱۹۷۹ - ۱۸۸۶) ہندوستان کے ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے روس جاکر ولادیمیر لینن (۱۹۲۴ - ۱۸۷۰) سے ملاقات کی تھی۔ وہ ۱۹۱۹ میں آزادی پسندوں کے ایک وفد کے ساتھ لینن سے ملے تھے۔ وہ جب اشتراکی روس کے پہلے حکمراں کے کمرے میں داخل ہوئے تو لینن کھڑا ہو گیا۔ کمرے کے ایک گوشہ سے وہ خود ہی ایک چھوٹی آرام کرسی اٹھا کر لایا۔ راجہ مہندر پرتاپ کہتے ہیں کہ میں آرام کرسی پر بیٹھا اور میرے ساتھ قریب کے ایک چھوٹے صوفہ پر لینن بیٹھ گیا۔ لینن کا پہلا جملہ یہ تھا:

In which language should I speak ; English, German, French or Russian

میں کس زبان میں بولوں۔ انگریزی میں، جرمن میں، فرانسیسی میں یا روسی میں۔ بالآخر طے ہوا کہ انگریزی زبان میں گفتگو ہو۔ راجہ مہندر پرتاپ نے اپنی ایک کتاب لینن کو پیش کی۔ اس کتاب کا نام تھا —— پریم دھرم

The Religion of Love.

لینن نے کتاب کو ہاتھ میں لیتے ہی فوراً کہا: "میں اس کتاب کو پڑھ چکا ہوں" راجہ مہندر پرتاپ کہتے ہیں کہ میں حیران ہوا کہ لینن کو آخر یہ کتاب کہاں سے ملی۔ پوچھنے پر لینن نے بتایا کہ پچھلے دن شام کو جب آپ میرے سکریٹری سے ملاقات کا وقت مقرر کرنے کے لئے ملے تھے تو آپ نے سکریٹری کو اس کتاب کا ایک نسخہ دیا تھا۔ سکریٹری نے آپ کا تعارف کرتے ہوئے یہ کتاب مجھے دکھائی۔ میں نے کتاب اس سے لے لی اور رات ہی کو اسے پڑھ ڈالا تاکہ کل صبح میں جس شخص سے ملنے والا ہوں، اس کے خیالات سے واقف ہو جاؤں"

لینن جدید روس کا بانی ہے۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں والا آدمی تھا۔ اوپر کے واقعہ سے اس کی دو خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک قابلیت، دوسرے مستعدی۔ اس نے تعلیم اور مطالعہ میں اتنی محنت کی تھی کہ وہ چار مختلف زبانیں جانتا تھا اور بیک وقت چاروں زبانوں میں گفتگو کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اسی کے ساتھ اس کی مستعدی کا عالم یہ تھا کہ دنیا کا انتہائی مصروف حکمراں ہونے کے باوجود ایک غیر معروف ہندستانی کی کتاب اس نے راتوں رات محض اس لئے پڑھ ڈالی کہ کل کے دن وہ جس سے ملنے والا ہے اس کے خیالات کا اس کو پیشگی اندازہ ہو جائے۔ اس نے اپنی فطری صلاحیتوں کو بھرپور طور پر بروئے کار لانے کی کوشش کی اور اسی کے ساتھ عمل کے مواقع پر بھرپور عمل کیا، وہ دنیا کا ایک کامیاب لیڈر بن گیا۔

اسلام کی خدمت کا میدان ہو یا غیر اسلام کی خدمت کا، وہی لوگ دنیا میں کوئی بڑا کام کرتے ہیں جو ان دو خصوصیات کا ثبوت دیں، ایک طرف وہ وقت کے مطابق مکمل علمی قابلیت رکھتے ہوں۔ دوسرے وہ اپنی کارکردگی میں پوری طرح مستعدی کا ثبوت دیں۔ قابلیت اور مستعدی کے ان ضروری اوصاف کے بغیر نہ اسلام کا کوئی کام کیا جا سکتا ہے اور نہ غیر اسلام کا۔

کل کو یاد رکھئے

لارڈ کرزن ۱۸۹۸ میں ہندوستان کے وائسرائے ہوکر انگلستان سے یہاں آئے۔ ان کے دو لڑکیاں تھیں۔ تیسری پیدائش کے وقت لارڈ کرزن اور لیڈی کرزن کی بہت خواہش تھی کہ ان کے یہاں لڑکا پیدا ہو۔ دونوں بڑی امیدوں کے ساتھ آنے والے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر تیسری بار بھی مارچ ۱۹۰۴ میں ان کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ اس وقت ان کا قیام نالدرا میں تھا اس مناسبت نے انھوں نے اپنی لڑکی کا نام الکزنڈر نالدرا کرزن رکھا۔ لارڈ کرزن نے اس زمانہ میں اپنی بیوی کے نام جو خطوط لکھے ان میں سے ایک خط وہ ہے جو انھوں نے شملہ سے لندن بھیجا تھا۔ اس خط میں انھوں نے اپنی بیوی کو تسکین دلانے کی کوشش کی۔ ان کے خط کا ایک جملہ یہ تھا: لڑکا یا لڑکی کا کیا فائدہ جب کہ ہم دونوں اس دنیا سے جا چکے ہوں گے۔

After all what does sex matter after we are both of us gone.

لارڈ کرزن کا یہ جملہ محض اپنی مایوس نفسیات کو چھپانے کی ایک کوشش تھی۔ لیکن یہی بات اگر آدمی کے اندر شعوری طور پر پیدا ہوجائے تو دنیا کا آدھا مسئلہ حل ہوجائے۔ دولت، اولاد، اقتدار، یہی وہ چیزیں ہیں جن کو آدمی سب سے زیادہ چاہتا ہے اور ان کو حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر ڈالتا ہے۔ اگر آدمی یہ سوچ لے کہ کسی چیز کو پانے کا کیا فائدہ جب کہ چند ہی روز بعد اس کو چھوڑ کر چلا جانا ہے تو لوگوں کے اندر قناعت آجائے، اور دنیا کا تمام ظلم و فساد ختم ہوجائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہاں پانے اور نہ پانے میں بہت زیادہ فرق نہیں۔ جو پانا اگلے روز کھونا بننے والا ہو اس پانے کی کیا قیمت ہے۔ آدمی اپنی ساری کوشش خرچ کر کے جو چیز حاصل کرتا ہے وہ صرف اس لئے ہوتی ہے کہ اگلے لمحہ وہ اس کو کھودے۔ ہر زندگی بالآخر موت سے دوچار ہونے والی ہے، ہر وہ محبوب چیز جس کو آدمی اپنے گرد و پیش جمع کرتا ہے اس کو چھوڑ کر وہ اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے چلا جانے والا ہے۔

آدمی "آج" میں جیتا ہے، وہ "کل" کو بالکل بھولا ہوا ہے۔ آدمی دوسرے کا گھر اجاڑ کر اپنا گھر بناتا ہے حالاں کہ اگلے دن وہ قبر میں جانے والا ہے۔ آدمی دوسرے کے اوپر جھوٹے مقدمے چلا کر اس کو انسانی عدالت میں لے جاتا ہے حالانکہ فرشتے خود اس کو خدائی عدالت میں لے جانے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ آدمی دوسرے کو نظر انداز کر کے اپنی عظمت کے گنبد میں خوش ہوتا ہے حالاں کہ بہت جلد اس کا گنبد اس طرح ڈھ جانے والا ہے کہ اس کی ایک اینٹ بھی باقی نہ رہے۔

بچاؤ کا انتظام

الور میں ایک مدرسہ ہے جو شہر کے کنارے واقع ہے۔ مدرسہ کے ایک طرف شہر کی عمارتیں ہیں اور دوسری طرف کھیت شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک بار مجھ کو اس مدرسہ میں چند دن گزارنے کا اتفاق ہوا۔ شام کو عصر کی نماز کے بعد میں مدرسہ سے نکلا اور کھیتوں کی طرف ٹہلنے چلا گیا۔ کچھ دور آگے بڑھا تو ایک جگہ بہت سے کتے نظر پڑے۔ وہ مجھ کو دیکھ کر زور زور سے بھونکنے لگے اور میری طرف لپکے۔ مجھ کو پتھر پھینک کر انھیں بھگانا پڑا۔ مغرب کے قریب میں ٹہل کر واپس ہوا تو میں نے مدرسہ کے ناظم مولانا مفتی جمال الدین قاسمی سے اس کا ذکر کیا۔ وہ مسکرائے انھوں نے کہا کہ کل ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔ پھر آپ دیکھئے گا کہ کوئی کتا نہیں بھونکے گا۔ اگلے دن عصر کی نماز کے بعد جب میں ٹہلنے کے لئے نکلا تو مفتی صاحب بھی میرے ساتھ ہو گئے۔ انھوں نے اپنے ہاتھ میں ایک لمبی لاٹھی لے لی جو دور سے دکھائی دیتی تھی۔ ہم لوگ چلتے ہوئے اس مقام پر پہنچے جہاں پچھلے روز مجھے کتوں کا غول ملا تھا، میں نے دیکھا تو اب بھی کتے وہاں موجود تھے۔ مگر آج کوئی کتا ہماری طرف نہیں لپکا اور نہ کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ ہم سکون کے ساتھ اس مقام سے گزر گئے اور کتے ہماری طرف متوجہ ہونے کے بجائے اپنے مشغلوں میں لگے رہے۔ واپس ہوتے ہوئے ہم دوبارہ اس مقام سے گزرے۔ اب بھی کتے وہاں موجود تھے۔ مگر انھوں نے ہماری طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ہم کسی مزاحمت کے بغیر اپنی منزل پر واپس آ گئے۔

"یہ لاٹھی کی برکت تھی" مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "کل آپ لاٹھی کے بغیر تھے تو کتوں کو ہمت ہوئی وہ بھونکتے ہوئے آپ کی طرف دوڑ پڑے۔ آج ہمارے ساتھ لمبی لاٹھی تھی تو کتے اس کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ ہم بے زور نہیں ہیں بلکہ ان کا جواب دینے کے لئے ہمارے پاس مضبوط ہتھیار موجود ہے۔ اس چیز نے کتوں کو ہمارے اوپر اقدام کرنے سے بے ہمت کر دیا۔ کتا ہمیشہ اس وقت آپ کی طرف دوڑے گا جب وہ آپ کو کمزور محسوس کرے۔ اگر وہ دیکھے کہ آپ کے پاس طاقت ہے تو وہ آپ کی طرف رخ نہیں کرے گا"

انسانوں میں بھی کچھ لوگ اسی قسم کا مزاج والے ہوتے ہیں۔ وہ اس شخص سے ٹھیک رہتے ہیں جو اپنے ہاتھ میں ایک "لاٹھی" لئے ہوئے ہو۔ ایسے شخص سے سامنا ہو تو وہ کترا کر الگ ہو جاتے ہیں۔ البتہ جب وہ کسی کو دیکھتے ہیں کہ وہ لاٹھی کے بغیر ہے تو اس کے لئے وہ شیر ہو جاتے ہیں۔ وہ طاقت ور کے لئے بزدل ہوتے ہیں اور کمزور کے لئے بہادر۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ آدمی سماج کے ایسے افراد کے لئے "لاٹھی" کا انتظام بھی رکھے۔ اصولی اور عمومی طور پر وہ پرامن ہو۔ وہ لوگوں کے ساتھ تواضع اور نرمی کا رویہ اختیار کرے۔ مگر اسی کے ساتھ کم از کم دکھانے کی حد تک وہ اپنے آس پاس "لاٹھی" بھی کھڑی رکھے تاکہ اس قسم کے لوگوں کو اس کے اوپر حملہ کی جرأت نہ ہو سکے ——— ٹھیک ویسے ہی جیسے قدرت ایک شاخ پر نرم و نازک پھول کھلاتی ہے تو اسی کے ساتھ وہ شاخ کے چاروں طرف کانٹے بھی اگا دیتی ہے۔

تاریخ سبق دیتی ہے

آٹومین لینڈر (۱۹۸۰-۱۸۹۵) ایک یہودی سائنس داں تھا۔ وہ جرمنی میں پیدا ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں وہ ہٹلر کے وی ٹو راکٹ (V-2 Rocket) کے منصوبہ میں کام کر رہا تھا۔ ہٹلر کے زمانہ میں جرمنی میں پہلی بار یہ راکٹ تیار کئے گئے۔ ان راکٹوں نے لندن میں زبردست دہشت پھیلا دی تھی۔ ہٹلر نے جب اپنے ملک کے یہودیوں کے خلاف ظلم و زیادتی شروع کی تو آٹومین لینڈر (Otto Mainlander) اور دوسرے یہودی سائنس داں ہٹلر سے سخت برہم ہو گئے۔

اس برہمی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آٹومین لینڈر اور تقریباً ایک درجن یہودی سائنس داں جو ہٹلر کے راکٹ کے منصوبہ میں کام کر رہے تھے، وہ ضروری سامان اور فنی راز لے کر بھاگے اور ان کو امریکہ کے حوالے کر دیا۔ امریکہ میں بھی راکٹ کی سائنس پر ابتدائی تجربات ہو رہے تھے۔ جرمنی کے یہودی ماہرین کی مدد حاصل ہونے کے بعد اس تحقیق میں مزید تیزی پیدا ہوئی۔ چنانچہ امریکہ نے راکٹ تیار کر کے جرمن علاقوں پر اتنی تیزی سے حملے کئے کہ ہٹلر کو دفاع کی پوزیشن میں ڈال دیا۔ انھیں جرمن یہودیوں کی مدد سے امریکہ نے وہ ایٹم بم تیار کئے جو ۱۹۴۵ میں جاپان پر گرائے گئے اور جس کے بعد دوسری جنگ عظیم کا فیصلہ اتحادیوں کے حق میں ہو گیا (۲۱ جنوری ۱۹۸۰)

تاریخ میں اس طرح کے واقعات بار بار ہوئے ہیں۔ کسی شخص یا گروہ کے زوال کا سبب اکثر اس کے وہ اپنے لوگ ہوتے ہیں جن کو وہ شخص یا گروہ اپنی آمرانہ پالیسی کی بنا پر ناراض کر دیتا ہے۔ یہ ناراض لوگ منفی نفسیات کا شکار ہو جاتے ہیں اور "بغض معاویہ" کے جذبہ کے تحت اس کے دشمنوں سے مل جاتے ہیں۔ اپنوں کے اس تعاون سے دشمن کو غیر معمولی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لئے ممکن ہو جاتا ہے کہ اپنے حریف کے خلاف زیادہ مؤثر اقدام کر سکے۔ وہ نہایت آسانی کے ساتھ اپنے حریف کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ حریف کے ساتھیوں کی مدد اس کے لئے اس مہم کو آسان کر دیتی ہے جو تنہا اپنی قوت سے اس کے لئے مشکل بنی ہوئی تھی۔ یہ بات ایک خاندان کے لئے بھی صحیح ہے اور ایک حکومت کے لئے بھی اور اسی طرح ایک پوری قوم کے لئے بھی۔

اپنوں کا ٹوٹ کر حریف سے ملنا بہت سے پہلوؤں سے نہایت خطرناک ہے۔ اس کا ایک سنگین پہلو یہ ہے کہ حریف کو اپنے دشمن کے راز معلوم ہو جاتے ہیں۔ وہ دشمن کے کمزور پہلوؤں کو جان کر اس کے مطابق اپنا منصوبہ بناتا ہے اور ٹھیک اس مقام پر وار کرتا ہے جہاں اس کا حریف سب سے کم مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں ہو۔

موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکوں نے "ظالمانہ نظام" کو ختم کرنے میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ مگر یہی تحریکیں "عادلانہ نظام" کو قائم کرنے میں سراسر ناکام رہیں۔ اس کی وجہ مذکورہ بالا حقیقت کی روشنی میں سمجھی جا سکتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایک ظالمانہ نظام کو توڑنے کے لئے صرف ظلم دشمنوں کی فوج مل جانا کافی ہے اور وہ ذاتی اسباب کے تحت بہت آسانی سے مل جاتی ہے۔ مگر عادلانہ نظام کو قائم کرنے کے لئے عدل دوستوں کی ضرورت ہے اور حقیقی معنوں میں عدل دوست اتنے کم ہیں کہ صرف امکان ہی کے درجہ میں ان کا وجود تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مشترک دشمنی کی بنیاد پر قائم ہونے والا اتحاد مشترک دوستی کی بنیاد نہ پاکر ٹوٹ جاتا ہے۔ نفرت اور بغض کی بنیاد پر اٹھنے والی تحریک محبت کی فضا پیدا نہیں کر سکتی۔ اسی طرح ظلم دشمنی کی بنیاد پر اٹھنے والی بھیڑ عدل دوستی کا نظام قائم نہیں کر سکتی

یہ ایک پابند زندگی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن کی مثال اور ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے رسی میں بندھا ہوا گھوڑا، وہ گھومتا ہے پھر اپنے کھونٹے کی طرف واپس آجاتا ہے۔ (مثل المومن ومثل الایمان کمثل الفرس فی آخیتہ یجول ثم یرجع الی آخیتہ) جانور ایک ظاہری رسی میں بندھا ہوا ہوتا ہے۔ مگر ایمان اس طرح کی کوئی ظاہری رسی نہیں ہے۔ یہ ایک نظر نہ آنے والی رسی ہے۔ جانور مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنی رسی سے آگے نہ جائے۔ مومن یہی کام اپنے ارادہ سے کرتا ہے۔ اللہ کی پکڑ کا اندیشہ اس کے لئے ایک نہ دکھائی دینے والی رسی بن جاتا ہے۔ جو ہر وقت اس کو اندر سے تھامے رہتا ہے۔ وہ وہاں تک جاتا ہے جہاں تک جانے کی اللہ نے اجازت دی ہے اور وہاں جانے سے رک جاتا ہے جہاں جانے سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ وہ اللہ کا ایک بندھا ہوا بندہ ہوتا ہے نہ کہ آزاد چھوٹا ہوا جانور۔

دنیا میں آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ اختیار رکھتے ہوئے بے اختیار ہو جائے۔ وہ آزادی کا موقع پاتے ہوئے اپنے کو پابند بنالے۔ وہ ایک آدمی پر غصہ کرنے کی قدرت رکھتا ہو مگر وہ اس کو معاف کر دے۔ ایک حق بات اس کے سامنے آئے اور وہ اس کو جھٹلانے کے لئے آزاد ہو پھر بھی وہ اس کے آگے جھک جائے۔ وہ ایک شخص کے ساتھ ظلم کرنے پر قادر ہو اس کے باوجود وہ اس کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرے۔ وہ ایک شخص کا مال ہڑپ کر لینے کی طاقت رکھتا ہو مگر وہ اس کا مال اسے لوٹا دے۔ وہ ایک شخص کو نظر انداز کر دینے کی حیثیت میں ہو مگر اللہ کے خیال سے اس کو نظر انداز نہ کرے۔

اللہ نے ہر معاملہ میں آدمی کے لئے ایک حد مقرر کر دی ہے۔ آدمی کو اسی حد کے اندر رہنا ہے، اس کے باہر نہیں جانا ہے۔ دوسرے کے بارے میں رائے قائم کرنے کی حد یہ ہے کہ وہ خارجی واقعات کی بنیاد پر رائے قائم کرے۔ اس لئے آدمی کو یہ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ قیاس اور گمان کی بنیاد پر دوسرے کے بارے میں رائے زنی کرنے لگے۔ تلاش معاش کی حد یہ ہے کہ آدمی محنت اور دیانت داری کے ساتھ کما کر جو چیز پائے اس کو اپنی چیز سمجھے، اس لئے آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ دھوکا اور لوٹ کھسوٹ کے ذریعہ حاصل کئے ہوئے مال کو وہ اپنا مال سمجھ لے۔ تنقید کی حد یہ ہے کہ واضح دلائل کی بنیاد پر کسی کا رد کیا جائے اس لئے آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ دلیل کے بغیر کسی کو برا بھلا کہنے لگے۔ گفتگو کی حد یہ ہے کہ آدمی سنجیدہ انداز میں اپنی بات دوسرے کے سامنے رکھے اس لئے آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ گالی گلوج کی زبان میں بولنے لگے۔ کسی کو برا سمجھنے کی حد یہ ہے کہ معلوم واقعات سے ثابت ہو جانے کے بعد اس کو برا سمجھا جائے، اس لئے آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ نامعلوم اور غیر ثابت شدہ چیزوں کی روشنی میں کسی کے بارے میں برا خیال قائم کرلے۔

رسی سے بندھا ہوا گھوڑا رسی کی لمبائی تک آزاد ہوتا ہے اور اس کے بعد پابند۔ مومن خدا کی اجازت کے دائرے میں آزاد ہے اور خدا کی ممنوعات کے دائرے میں پابند۔ جو شخص اس حد بندی کو قبول کر کے زندگی گزارے وہی مومن ہے اور اسی کے لئے آخرت کی جنتیں ہیں۔ جو شخص اس حد بندی کو قبول نہ کرے وہ خدا کی نظر میں مجرم ہے اور آخرت میں اس کے لئے جہنم کی آگ کے سوا اور کچھ نہیں۔

باہمی اختلاف

واطیعوا اللہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم واصبروا ان اللہ مع الصابرین (انفال ۴۶)

اے مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو۔ اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تمھارے اندر کمزوری آجائے گی اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور صبر کرو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

مسلمان اگر مل جل کر رہیں۔ وہ اللہ اور رسول کی مرکزیت کے گرد متحد رہیں تو وہ زبردست طاقت ہوتے ہیں۔ دیگر قوموں کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ان کے اکثر کام محض رعب و دبدبہ سے انجام پاتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ان میں آپس کا اختلاف پیدا ہو جائے تو دوسروں کی نظر میں ان کی ہوا اکھڑ جاتی ہے۔ ان کے دشمن ان پر ہاتھ ڈالنے کے لئے جری ہو جاتے ہیں۔

اتحاد و اتفاق کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ صبر ہے۔ کیوں کہ جب بھی بہت سے لوگ ایک ساتھ رہیں گے تو ان کے درمیان طرح طرح کی شکایتیں پیدا ہوں گی۔ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچے گی۔ کبھی کسی کی تنقید پر کسی کو غصہ آئے گا، کبھی کسی کی ترقی سے کسی کے دل میں جلن پیدا ہوگی۔ کبھی لین دین میں ایک دوسرے کا مفاد ٹکرائے گا۔ کبھی ایک شخص کی امیدیں دوسرے سے پوری نہ ہوں گی اور اس کے جذبات کو ٹھیس لگے گی۔ اس طرح کے بہت سے اسباب ہیں جو لازماً پیدا ہوں گے۔ ان اسباب کی پیدائش کو روکنا ممکن نہیں ہے۔ ممکن صرف یہ ہے کہ آدمی ناخوش گواریوں کو سہے اور جب بھی اس قسم کی کوئی صورت پیش آئے تو اللہ کے لئے اس پر صبر کرے۔ اختلاف کو برداشت کرنے کی زمین پر اتحاد وجود میں آتا ہے نہ کہ اختلاف کو ختم کرنے کی زمین پر۔ جو لوگ اختلاف اور شکایت کو برداشت کر کے متحد رہ سکیں وہی اپنے درمیان اتحاد قائم کرتے ہیں۔ زندگی کی بیشتر کامیابیوں کا راز صبر ہے اور اسی طرح اتحاد کا بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اتحاد نام ہے اختلاف کے باوجود متحد رہنے کا۔ اگر یہ برداشت اور یہ وسعت ظرف نہ ہو تو اتحاد کبھی وجود میں نہیں آسکتا۔

آج ہر طرف مسجدیں بھر رہی ہیں۔ ہر جگہ بے شمار لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود مسلمان کیوں ذلیل ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں پر اللہ کی نصرت کیوں نازل نہیں ہوتی۔ اتنے بے شمار لوگ اللہ سے تعلق جوڑے ہوئے ہیں، پھر بھی اللہ ان کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے مسلمانوں کا باہمی اختلاف۔ خدا سے جڑنے کے لئے ہر آدمی مسجد کی طرف بھاگ رہا ہے مگر انسان سے جڑنے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ انفرادی عبادت ہر ایک کر رہا ہے۔ مگر اجتماعی عبادت جس کا دوسرا نام اتحاد ہے، اس میں اپنے کو شامل کرنے کی اہمیت کو کوئی نہیں جانتا۔

باعزت زندگی ایک ایک مسلمان کو الگ الگ نہیں مل سکتی۔ وہ جب بھی ملے گی پورے گروہ کو یکجائی طور پر

طے گی۔ مسلمانوں کے لئے باعزت زندگی کا ملنا ایک اجتماعی واقعہ ہے۔ اس کے لئے اللہ کی اجتماعی مدد درکار ہے۔ اور اللہ کی سنت یہ ہے کہ اجتماعی مدد وہ ہمیشہ اجتماعی عمل پر نازل کرتا ہے۔ انفرادی عمل پر اجتماعی مدد کبھی نہیں آتی۔ آدمی نماز میں خدا سے "ملاقات" کر کے مسجد سے باہر آتا ہے تاکہ وہ بندوں سے "ملاقات" کرے۔ مگر وہ بندوں کی طرف سے منھ پھیر لیتا ہے۔ خدا سے جڑنے والا بندوں سے جڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اللہ سے جڑ کر بھی وہ اکیلا رہتا ہے۔ کروروں مسلمان روزانہ اللہ سے جڑ رہے ہیں مگر وہ آپس میں جڑ کر متحدہ ملت نہیں بنتے۔ حالاں کہ اللہ سے جڑنے کا تقاضا ہے کہ آدمی اللہ کے بندوں کے ساتھ جڑ جائے۔ اللہ سے "اتحاد" اور اللہ کو ماننے والوں سے "اختلاف" خدا کے غضب کو بھڑکانے والا عمل ہے نہ کہ خدا کی نصرت کو کھینچنے والا۔

جب ایسا ہو کہ لوگ اللہ سے جڑتے ہوئے نظر آتے ہوں مگر وہ بندوں کے ساتھ نہ جڑ رہے ہوں تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے بھی جڑے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ ظاہری عبادت کو دہرا رہے ہیں مگر عبادت کی حقیقت سے خالی ہیں۔ اللہ کے ساتھ جڑنا آدمی کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے۔ ایسا آدمی مسجد سے باہر انسانوں کے ساتھ انانیت اور سرکشی کا مظاہرہ کس طرح کرے گا۔ اللہ سے جڑنا آدمی کو حساب کے دن کی یاد دلاتا ہے پھر ایسا آدمی بندوں کے درمیان خدا کی پکڑ سے بے خوف ہو کر کس طرح رہے گا۔ اللہ سے جڑنا آدمی کے اندر خداوندی اوصاف پیدا کرتا ہے پھر وہ دوسروں کے اوپر مہربانی کرنے سے کیوں کر خالی ہو سکتا ہے جو اللہ کی سب سے بڑی صفت ہے۔ اللہ سے جڑنا آدمی کو ایک ایسی ہستی کا پڑوس عطا کرتا ہے جو تمام خوبیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ ہے پھر ایسے آدمی سے دوسروں کو برائی کا تجربہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ اللہ سے جڑنا آدمی کو اس روز حساب کی یاد دلاتا ہے جب کہ ہر آدمی بے لاگ انصاف کے ترازو پر کھڑا کیا جائے گا۔ پھر وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ بے انصافی کر کے یہ خطرہ کیسے مول لے سکتا ہے کہ قیامت کے دن وہ خدا کی پکڑ کی زد میں آجائے۔ اللہ سے جڑنا اس لئے ہوتا ہے کہ آدمی اللہ سے درخواست کرے کہ وہ اس کی غلطیوں سے درگزر فرمائے پھر جو آدمی خود اپنے لئے عفو و درگزر کی درخواست کر رہا ہے وہ دوسروں کے ساتھ سخت گیری کا رویہ کس طرح اختیار کر سکتا ہے۔ سورج کی دنیا میں رہنے والا کبھی تاریکی نہیں پھیلاتا پھولوں کے پڑوس میں رہنے والا کبھی بدبو نہیں بکھیرتا۔ یہی معاملہ بندہ مومن کا ہے۔ مومن خدا اور فرشتوں کی صحبت میں اپنے روز و شب گزارتا ہے۔ پھر جو آدمی خدا اور فرشتوں کی صحبت میں رہے اس سے کسی کو ظلم اور بدخواہی کا تجربہ کیسے ہو سکتا ہے اور جس معاشرہ میں ظلم اور بدخواہی نہ ہو وہاں اختلاف کا کیا گزر۔

یہ اوصاف جب کسی کے اندر پیدا ہو جائیں تو اس کے اندر سے ان اوصاف کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو آدمی کو بندوں سے دور کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس کا خدا سے جڑنا لازماً بندوں سے جڑنا بن جاتا ہے۔ اور جب بندے باہم جڑ جائیں تو اللہ کو یہ منظر اتنا زیادہ پسند ہے کہ وہ کل صبح آنے والی بارش کو آج شام ہی ان پر برسا دیتا ہے، وہ کل کی نعمتوں کو آج ہی اپنے بندوں پر انڈیل دیتا ہے۔ اتحاد کسی گروہ کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اتحاد اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اتحاد دنیا کی عزت بھی ہے اور اتحاد آخرت کی عزت بھی۔

خدا کی مدد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے ایک غزوۂ خندق ہے جو شوال ۵ ھ میں پیش آیا۔ اس کو غزوۂ احزاب بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی فوجوں کا غزوہ۔ اس جنگ میں عرب کے مختلف قبیلوں نے مل کر مدینہ پر حملہ کر دیا تھا۔ قبائل قریش، قبائل غطفان اور قبائل یہود کے دس ہزار سے زیادہ افراد اس میں شریک تھے۔ یہ حملہ کتنا شدید تھا، اس کا اندازہ قرآن کے ان الفاظ سے ہوتا ہے: "جب وہ اوپر سے اور نیچے سے تمھارے اوپر چڑھ آئے۔ اس وقت ڈر کی وجہ سے تمھاری آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منھ کو آگئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت اہل ایمان کی بڑی جانچ ہوئی اور وہ بہت ہلا مارے گئے (احزاب) مخالفین اسلام کا یہ لشکر پوری طرح ہتھیار بند تھا۔ اس میں ساڑھے چار ہزار اونٹ اور تین سو گھوڑے تھے۔

دشمنوں نے مدینہ کو اس طرح گھیرے میں لے لیا کہ باہر سے ہر قسم کی امداد آنا بند ہو گئی۔ سامان رسد کی اتنی کمی ہوئی کہ لوگ فاقے کرنے لگے۔ اسی دوران کا واقعہ ہے کہ ایک صحابی نے بھوک کی شکایت کی اور کرتا اٹھا کر دکھایا کہ پیٹ پر ایک پتھر باندھ رکھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں اپنا کرتا اٹھایا تو آپ کے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوا کہ مختلف قبائل ایک ساتھ ہو کر مدینہ پر حملہ کرنے والے ہیں تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ سلمان فارسی کی رائے کے مطابق طے ہوا کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے۔ اس وقت مدینہ تین طرف سے پہاڑوں، گھنے درختوں اور مکانات کی دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ شمال مغربی حصہ خالی تھا۔ طے ہوا کہ اس کھلے ہوئے حصہ میں دو پہاڑوں کے درمیان خندق کھودی جائے۔ چنانچہ چھ دن کی لگاتار محنت سے ایک خندق کھود کر تیار کی گئی۔ یہ خندق دشمنوں کی یلغار کو روکنے کے لئے اتنی کارآمد ثابت ہوئی کہ اس غزوہ کا نام غزوۂ خندق پڑ گیا۔

سیرت کی کتابوں میں خندق کی تفصیلات جب ہم پڑھتے ہیں تو ایک سوال سامنے آتا ہے۔ "ایک معمولی خندق دشمنوں کی فوج کو روکنے کا سبب کیسے بن گئی"۔ مذکورہ تفصیلات کے مطابق یہ خندق تقریباً چھ کیلو میٹر لمبی تھی۔ اور اس کی گہرائی اور چوڑائی ایک معمولی نہر سے زیادہ نہ تھی۔ وہ تقریباً ڈھائی میٹر گہری اور تقریباً تین میٹر چوڑی تھی۔ اس قسم کی ایک خندق ایک مسلح فوج کے لئے ایک نالی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ وہ لوگ باسانی اس کو عبور کر کے مدینہ میں داخل ہو سکتے تھے۔ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس خندق کے باوجود مسلمان دشمن فوج کی تیروں کی زد میں تھے۔ جیسا کہ حضرت سعد بن معاذؓ کو تیر لگنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم کچھ لوگ خندق کے دوسری طرف پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ عمرو بن عبدود اور اس کے کچھ ساتھیوں نے گھوڑے پر سوار ہو کر خندق کا جائزہ لیا اور ایک جگہ خندق کو کچھ کم چوڑی دیکھ کر وہاں ٹھہرے اور گھوڑا کدا کر خندق کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ اس کے بعد عمرو بن عبدود کا مقابلہ حضرت علی بن ابی طالبؓ سے ہوا جس میں عمرو بن عبدود مارا گیا۔ تقریباً ایک مہینہ کا یہ محاصرہ اپنے آخری دنوں میں آندھی

اور طوفان کے بعد ختم ہوگیا۔ آندھی نے دشمن کے لشکر میں اتنی بدحواسی پیدا کی کہ ابوسفیان نے اونٹ کی رسی کھولے بغیر اونٹ پر بیٹھ کر اس کو ہانکنا شروع کر دیا۔ پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ ۱۰ ہزار سے زیادہ تعداد کی مسلح فوجیں خندق کو عبور کرکے مدینہ میں کیوں نہ داخل ہوئیں جہاں تین ہزار آدمیوں کا بے سروسامان قافلہ ان کی یلغار کو روکنے کے لئے بالکل ناکافی تھا۔

اس سوال کا جواب خدا کی ایک سنت میں ملتا ہے۔ وہ سنت یہ کہ اللہ اہل ایمان کی طاقت ان کے دشمنوں کو بڑھاکر دکھاتا ہے تاکہ وہ مرعوب اور ہیبت زدہ ہوجائیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے "ہم منکروں کے دلوں میں تمھارا رعب ڈال دیں گے۔ کیوں کہ انھوں نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک ٹھہرایا جن کے حق میں خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری (آل عمران ۱۵۱) اللہ تعالیٰ کی یہ نصرت رعب غزوۂ خندق میں اور دوسرے مواقع پر ظاہر ہوئی۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کی کھودی ہوئی نالی ان کے دشمنوں کو بہت بڑی خندق کی صورت میں دکھائی دی۔ تاہم مسلمانوں کو اپنے ہاتھوں کو تھکاکر ایک "نالی" کھودنا ضروری ہے۔ اگر وہ نالی کھودنے میں اپنے ہاتھوں کو نہ تھکائیں تو خدا ان کی نالی کو خندق بناکر کس طرح دکھائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی نصرت رعب جو قرن اول کے مسلمانوں کو کمال درجہ میں حاصل ہوئی وہ بعد کے دور کے مسلمانوں کو بھی مل سکتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ اس راستہ پر چلیں جس راستہ پر صحابہ خدا کے رسول کی رہنمائی میں چلے۔ کسی اور راستہ پر چلنے والے شیطان کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ پھر ان کو خدا کی نصرت کس طرح ملے گی۔ اللہ کی نصرت کا مستحق آدمی اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو حق کے ساتھ اس طرح شامل کرے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے اس کو وہ حق کے حوالے کردے، وہ اپنے سر کا تاج دوسرے کے سر پر رکھ دے جیسا کہ ہجرت کے بعد مدینہ کے لوگوں نے کیا۔

خدا کی نصرت کا مستحق بننے کی شرط ایک لفظ میں یہ ہے کہ "جب تم مدد کروگے تو تمھاری مدد کی جائے گی"۔ خدا ہماری مدد پر اس وقت آتا ہے جب کہ ہم دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کریں جو ہم خدا سے اپنے لئے چاہتے ہیں۔ ہماری ذات سے اگر دوسروں کو زحمت پہنچ رہی ہو تو خدا کے فرشتے ہمارے لئے خدا کی رحمت کا تحفہ لے کر نہیں آسکتے۔ اگر ہمارا یہ حال ہو کہ جس پر ہمارا قابو چلے اس کو ہم ناحق ستانے لگیں تو ناممکن ہے کہ خدا وہاں ہماری مدد کرے جہاں کوئی دوسرا ہمارے اوپر قابو پاکر ہمیں ستانے لگتا ہے۔ ایک آدمی اپنی مصیبت میں ہم کو پکارے اور ہم استطاعت کے باوجود اس کی پکار پر دھیان نہ دیں تو کبھی یہ ممکن نہیں کہ خدا اس وقت ہماری پکار کو سنے جب کہ کوئی طاقت ور ہمارے اوپر چڑھ آتا ہے اور ہم خدا کو پکارنے لگتے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے مقابلہ میں آدمی طاقت ور ہوتا ہے اور کسی کے مقابلہ میں کمزور۔ یہی صورت حال نصرت خداوندی کے معاملہ میں آدمی کے امتحان کا پرچہ ہے۔ کوئی شخص یا قوم اپنے طاقت وروں کے مقابلہ میں خدا کی جو نصرت چاہے اس کا ثبوت اس کو اپنے کمزوروں کے معاملہ میں دینا پڑتا ہے اگر آدمی اپنے کمزوروں پر ظلم کرتا ہو تو اپنے طاقت وروں کے مقابلہ میں وہ خدا کی مدد کا مستحق نہیں بن سکتا، خواہ وہ کتنا ہی خدا کو پکارے، خواہ وہ کتنا ہی یوم دعا منائے۔

پیغمبر اسلام کا کردار

طائف کی وہ شام بھی کس قدر بھیانک تھی جب شہر کے لڑکے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو پتھر مار مار کر شہر سے باہر نکال رہے تھے۔ آپ مکہ سے پچاس میل کا پیدل سفر طے کر کے حجاز کے رئیسوں کے گرمائی صدر مقام پہنچے تھے تاکہ انھیں دین اسلام کی دعوت دیں۔ مگر طائف کے رئیسوں نے آپ کے خیر خواہانہ پیغام کو سننے کے بجائے شہر کے لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ یہ شریر لڑکے اس وقت تک آپ کا پیچھا کرتے رہے جب تک سورج نے غروب ہو کر آپ کے اور ان لڑکوں کے درمیان تاریکی کا پردہ نہ ڈال دیا۔ آپ کا جسم زخموں سے چور تھا۔ سر سے پاؤں تک آپ خون میں نہائے ہوئے تھے۔ اس وقت آپ نے تھک کر انگور کے ایک باغ میں پناہ لی۔ غور کیجئے۔ یہ کسی آدمی کے لئے کتنا نازک وقت ہوتا ہے۔ آپ نے خود ایک بار اپنی بیوی حضرت عائشہ رضہ سے فرمایا کہ طائف کی یہ شام میری زندگی کی سخت ترین شام تھی۔ مگر آپ کی زبان سے اس انتہائی سنگین موقع پر اپنے دشمنوں کے خلاف کوئی برا کلمہ نہیں نکلا۔ بلکہ آپ نے فرمایا "خدایا ان کو صحیح راستہ دکھا، کیوں کہ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں،، اللہ کے رسول ؐ کا یہی اخلاق تھا جس نے آپ کے دشمنوں کو اس طرح زیر کیا کہ سارے عرب نے آپ کے پیغام کو قبول کر لیا۔ آپ کے اعلیٰ کردار کے آگے کوئی تعصب، کوئی عداوت اور کوئی ہٹ دھرمی ٹھہر نہ سکی۔ آپ کی بلند سیرت لوگوں کو جادو کی طرح مسخر کرتی چلی گئی۔

ایک بار آپ نے فرمایا: صلۂ رحمی یہ نہیں ہے کہ تم صلۂ رحم کرنے والوں کے ساتھ صلۂ رحم کرو۔ بلکہ صلۂ رحمی یہ ہے کہ جو قطع رحم کرے اس کے ساتھ تم صلہ رحم کرو (بخاری، کتاب الادب) تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار اسلام کے کچھ دشمنوں نے حضرت عائشہ رضہ پر بدکاری کی تہمت لگائی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ اور حضرت ابوبکر رضہ کی صاحبزادی تھیں۔ یہ تہمت سراسر جھوٹ اور بے بنیاد تھی۔ اس فرضی داستان کو گھڑنے اور اس کو پھیلانے میں ایک شخص مسطح نام کا بھی شریک تھا۔ یہ شخص حضرت ابوبکر رضہ کا رشتہ دار تھا۔ اس کو ضرورت مند سمجھ کر حضرت ابوبکر رضہ اس کو ماہانہ کچھ رقم دیا کرتے تھے۔ جب حضرت ابوبکر رضہ کو معلوم ہوا کہ ان کی معصوم صاحبزادی پر جھوٹی تہمت لگانے میں مسطح بھی شریک رہا ہے تو انھوں نے مسطح کی امدادی رقم بند کر دی۔ اس پر اللہ کے رسول صہ کے پاس یہ وحی آئی کہ اگر کوئی شخص معاشی اعتبار سے ضرورت مند ہے تو اس کے اخلاقی جرم کی وجہ سے اس کی مالی امداد بند نہ کرو۔ بلکہ اس کے جرم سے درگزر کرتے ہوئے اس کی معاشی امداد کو جاری رکھو ——— تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور کشائش والے ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ اپنے رشتہ داروں، محتاجوں اور اللہ کی راہ میں وطن چھوڑنے والوں کی مدد نہ کریں گے۔ ان کو معاف کر دینا چاہئے اور درگزر کرنا چاہئے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کر دے اور اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے (نور ۲۲) حضرت ابوبکر رضہ ہی کا واقعہ ہے کہ ایک بار وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آکر آپ کو برا بھلا کہا۔ حضرت ابوبکر رضہ پہلی بار سن کر چپ رہے۔ اس نے دوسری بار برا بھلا کہا تو اس وقت بھی آپ چپ رہے۔ مگر جب اس نے تیسری بار بدزبانی کی تو آپ خاموش نہ رہ سکے اور جواب میں بول اٹھے۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ صہ فوراً وہاں سے اٹھ گئے۔ حضرت

ابوبکر رضؓ نے پوچھا: اے خدا کے رسول آپ کیوں اٹھ گئے۔ آپ نے کہا: ابوبکر! جب تک تم چپ تھے، خدا کا فرشتہ تمھاری طرف سے جواب دے رہا تھا، جب تم خود بول پڑے تو فرشتہ وہاں سے چلا گیا (سنن ابی داؤد، کتاب الادب) اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ برائی کے جواب میں جب آدمی اپنی طرف سے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کرتا تو وہاں خدا اس کی طرف سے انتقام لینے کے لئے موجود ہوتا ہے۔ مگر جب آدمی خود انتقام لینے پر اتر آئے تو خدا اس کے معاملہ کو اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ خدا سے بہتر انتقام لے سکے۔

حضرت علی رضؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی عالم سے کچھ اشرفیاں قرض لیں۔ کچھ دن گزر گئے تو وہ یہودی تقاضے کے لئے پہنچا۔ آپ نے فرمایا کہ "اس وقت میرے پاس تمھارا قرض ادا کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے"۔ یہودی نے کہا "جب تک تم میرا قرض ادا نہ کرو گے میں تم کو نہیں چھوڑوں گا"۔ چنانچہ ظہر کے وقت سے لے کر رات تک وہ آپ کو گھیرے میں لئے ہوئے بیٹھا رہا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب کہ مدینہ میں آپ کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ آپ اس کے خلاف کارروائی کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ کے ساتھیوں نے اس کو ڈانٹ کر بھگانا چاہا۔ مگر آپ نے سب کو منع کر دیا۔ کسی نے کہا: "اے خدا کے رسول، ایک یہودی آپ کو قید کئے ہوئے ہے"۔ آپ نے کہا کہ ہاں، مگر مجھ کو ظلم کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اسی حال میں صبح ہو گئی۔ جب اگلا دن شروع ہوا تو یہودی کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوا کہ آپ قدرت رکھتے ہوئے بھی برداشت کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مسلمان ہو گیا۔ یہ یہودی مدینہ کا ایک مالدار آدمی تھا۔ کل تک اس نے چند اشرفیوں کے لئے آپ کا گھراؤ کر رکھا تھا۔ مگر آپ کے اعلیٰ کردار نے اس پر اتنا اثر کیا کہ اس نے اپنی ساری دولت آپ کی خدمت میں پیش کر دی اور کہا کہ آپ اس کو جس طرح چاہیں خرچ کریں (بیہقی) عبداللہ بن ابی الحسماء بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار میں نے خرید و فروخت کا ایک معاملہ کیا۔ ابھی معاملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ مجھے کچھ ضرورت پیش آگئی۔ میں نے کہا کہ آپ ٹھہرئے۔ میں گھر سے واپس آتا ہوں تو بقیہ معاملہ کو مکمل کروں گا۔ گھر پہنچنے کے بعد میں بعض کاموں میں ایسا مشغول ہوا کہ اپنا وعدہ بھول گیا۔ تین دن کے بعد یاد آیا تو میں اس مقام پر پہنچا۔ دیکھا کہ وہاں رسول اللہ صلعم موجود ہیں۔ آپ نے مجھ کو دیکھنے کے بعد صرف اتنا کہا: تم نے مجھ کو بہت تکلیف دی۔ میں تین دن سے یہاں تمھارا انتظار کر رہا ہوں (ابوداؤد) اس طرح کا عمل اپنے اندر اتنی کشش رکھتا ہے کہ انتہائی کٹر آدمی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حضرت عائشہ رضؓ بتاتی ہیں کہ یہودی عالموں کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ جب وہ لوگ آپ کے پاس پہنچے تو انھوں نے کہا: السام علیکم (تباہی ہو تم پر) حضرت عائشہ نے سنا تو ان سے برداشت نہ ہو سکا، انھوں نے کہا "بلکہ تم لوگ غارت ہو جاؤ اور تم پر خدا کی لعنت ہو"۔ آپ نے حضرت عائشہ کو اس قسم کے جواب سے منع فرمایا اور کہا: "خدا مہربان ہے اور وہ ہر کام میں مہربانی کو پسند کرتا ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ مخالف کا دل جیتنے کے لئے اس سے بڑا کوئی حربہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی بدزبانی کا جواب نرم باتوں سے دیا جائے۔ ہتھیار کے حملہ کی تاب لانا تو ممکن ہے مگر کردار کے حملہ کے مقابلہ میں کوئی ٹھہر نہیں سکتا۔ یہاں ہر شخص کو اپنی ہار ماننی پڑتی ہے۔

براء بن عازبؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے موقع پر تین شرطوں کے ساتھ قریش سے معاہدہ کیا تھا۔ ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ کوئی غیر مسلم اسلام قبول کر کے مسلمانوں کے یہاں چلا جائے تو مسلمان اس کو واپس کر دیں گے۔ مگر جو مسلمان قریش کے پاس پہنچ جائے اس کو قریش واپس نہیں کریں گے۔ یہ معاہدہ ہو رہا تھا کہ ایک مسلم نوجوان ابو جندل مکہ سے بھاگ کر حدیبیہ پہنچے۔ ان کو ان کے گھر والوں نے اسلام کے جرم میں قید کر رکھا تھا۔ وہ بیڑیاں پہنے ہوئے اس حال میں حدیبیہ پہنچے کہ ان کا جسم بیڑیوں کی رگڑ سے زخمی ہو رہا تھا۔ وہ فریاد کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ مجھ کو دشمنوں کے چنگل سے بچاؤ۔ یہ بے حد نازک وقت تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں نے تلواریں نکال لیں۔ ابو جندل کے جذباتی واقعہ کو دیکھنے کے بعد لوگوں کا رجحان ہو گیا کہ معاہدہ کو توڑ کر ابو جندل کی زندگی کو بچایا جائے دوسری طرف مکہ والوں نے کہا: "محمد! ہمارے اور تمھارے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے، یہ اس کی تکمیل کا پہلا موقع ہے"۔ بالآخر اللہ کے رسول نے فیصلہ کیا کہ جو معاہدہ طے ہو چکا ہے اب اس سے ہم پھر نہیں سکتے۔ آپ کے ساتھیوں کے لئے یہ بات بے حد تکلیف کی تھی۔ مگر آپ نے ابو جندل کو دوبارہ مکہ والوں کے حوالے کر دیا (صحیحین) بظاہر اس واقعہ کے معنی یہ تھے کہ مظلوم کو دوبارہ ظالم کے چنگل میں دے دیا جائے۔ مگر اس واقعہ میں اصول پسندی کا جو شاندار عملی مظاہرہ ہوا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ظالم اندر سے بالکل ڈھ گئے۔ اب ان کا ابو جندل کو لے جانا اور اپنے یہاں ان کو قید میں رکھنا محض ایک عام واقعہ نہ رہا بلکہ ان کی طرف سے اخلاقی گراوٹ اور اسلام کے لئے اخلاقی بلندی کی ایک مثال بن گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ کے لوگ اسلام کی اخلاقی برتری سے مرعوب ہو گئے۔ وہاں کثرت سے لوگ مسلمان ہونے لگے۔ ابو جندل کا وجود مکہ میں اسلام کی زندہ تبلیغ بن گیا۔ حتیٰ کہ قید و بند کی حالت میں بھی ابو جندل ان کو اپنی قومی زندگی کے لئے خطرہ معلوم ہونے لگے۔ چنانچہ انھوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ ان کو رہا کر کے مکہ کے باہر بھیج دیا جائے۔

حضرت ابوہریرہ رضہ مدنی زندگی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجد کے لوگوں کی طرف چند سوار بھیجے جو آپ کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ وہ شہر یمامہ کے حاکم ثمامہ بن اثال کو راستہ میں پا گئے اور اس کو گرفتار کر لائے۔ مدینہ پہنچ کر انھوں نے اس کو مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا۔ رسول اللہ اس کے پاس آئے اور حال پوچھا۔ ثمامہ نے جواب دیا: "اگر تم نے مجھ کو قتل کر دیا تو میری قوم تم سے میرے خون کا بدلہ لے گی۔ اور اگر تم مجھ کو چھوڑ دو گے تو میں عمر بھر تمھارا احسان مانوں گا اور اگر مال کی خواہش ہے تو جتنا مال چاہو میں دینے کے لئے تیار ہوں"۔ رسول اللہ صنے اس کی رہائی کا حکم دے دیا۔ یہ واقعہ اس وقت کی دنیا میں بہت عجیب تھا۔ کیوں کہ قبائلی زندگی میں کسی دشمن کے ہاتھ آجانے کے بعد اس کا ایک ہی انجام تھا، اور وہ یہ کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ رسول اللہ نے اس کے جسم کو تو قتل نہیں کیا مگر اپنے اخلاقی سلوک سے اس کی روح کو قتل کر دیا۔ چنانچہ قید سے چھوٹنے کے بعد ثمامہ قریب کے ایک باغ میں گیا اور غسل کر کے دوبارہ مسجد میں آیا۔ لوگ حیران تھے کہ وہ دوبارہ کس لئے یہاں آیا ہے۔ مگر جب اس نے بلند آواز سے کلمہ شہادت ادا کر کے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا تو معلوم ہوا کہ رسول اللہ نے اس کو چھوڑ کر در اصل ہمیشہ کے لئے اس کو گرفتار کر لیا تھا۔ اس کے بعد ثمامہ عمرہ کرنے کے لئے مکہ گیا۔ جب وہ حرم میں پہنچا اور وہاں کے لوگوں کو ثمامہ کے اسلام کا حال معلوم ہوا تو انھوں

نے کہا" تم بے دین ہو گئے "۔ ثمامہ نے جواب دیا کہ میں بے دین نہیں ہوا بلکہ میں نے خدا کے رسول کے دین کو اختیار کر لیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ثمامہ اسلام کی قوت کا ذریعہ بن گیا۔ اس زمانہ میں مکہ کے لوگوں کو باہر کے جن مقامات سے گندم فراہم ہوتی تھی ان میں یمامہ ایک خاص مقام تھا۔ چنانچہ ثمامہ نے مکہ والوں سے کہا کہ سن لو، محمدؐ کی اجازت کے بغیر اب گندم کا ایک دانہ بھی تمہارے یہاں نہیں آئے گا (صحیح مسلم) ——— کردار بظاہر ایک بے قیمت چیز ہے مگر اس کو دے کر آدمی ہر چیز خرید لیتا ہے۔

اخلاق کی بلندی یہ ہے کہ کہنے والا جو کچھ کہے اس پر وہ خود عمل کرتا ہو۔ کمزوروں کے ساتھ بھی وہ رعایت و شرافت کا وہی طریقہ اختیار کرے جو کوئی شخص طاقت ور کے ساتھ کرتا ہے۔ اپنے لئے اس کے پاس جو معیار ہو وہی معیار دوسروں کے لئے بھی ہو۔ مشکل حالات میں بھی وہ اپنے اصولوں سے نہ ہٹے۔ حتیٰ کہ دوسروں کی طرف سے پست کردار کا مظاہرہ ہو تب بھی وہ اعلیٰ کردار پر قائم رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس اعتبار سے اخلاق کے کمال درجہ پر تھے۔ آپ نے کبھی اعلیٰ اخلاق کو نہیں چھوڑا۔ کوئی مصلحت یا کوئی اختلاف آپ کو اخلاق سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آپ کے انتہائی قریبی ساتھیوں نے اس معاملہ میں جو گواہی دی ہے اس سے بڑی اور کوئی گواہی نہیں ہو سکتی۔

سعید بن ہشام تابعی نے آپ کی زوجہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہؐ کا اخلاق کیسا تھا۔ انھوں نے جواب دیا: آپ کا اخلاق تو قرآن تھا۔ گویا قرآن کی صورت میں مطلوب زندگی کا جو نقشہ آپ نے دوسروں کے سامنے پیش کیا خود آپ اسی نقشہ میں ڈھل گئے۔ انس بن مالک رضؓ کہتے ہیں کہ میں نے دس سال تک رسول اللہؐ کی خدمت کی مگر کبھی آپ نے اف تک نہ کیا اور نہ کبھی میرے کسی کام کی بابت آپ نے کہا کہ تم نے ایسا کیوں کیا اور جو کام میں نے نہیں کیا اس کی بابت بھی آپ نے کبھی یہ نہ کہا کہ تم نے اس کو کیوں نہیں کیا۔ وہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اچھے اخلاق والے تھے (صحیحین) امام احمد نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی خادم کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا نہ کسی عورت کو مارا اور نہ کسی دوسرے کو اپنے ہاتھ سے مارا۔ البتہ آپ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے تھے۔ جب بھی آپ کو دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو لینے کا اختیار دیا گیا تو آپ نے آسان کو اختیار فرمایا، الّا یہ کہ وہ گناہ ہو۔ جو چیز گناہ ہوتی اس سے آپ تمام لوگوں سے زیادہ دور رہنے والے تھے۔ آپ کو خواہ کوئی بھی تکلیف پہنچائی گئی ہو کبھی آپ نے اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیا، الا یہ کہ اللہ کی حرمتوں کو توڑا گیا ہو اور آپ نے اللہ کی خاطر اس کا بدلہ لیا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی کردار تھا جس نے آپ کو دشمنوں کی نظر میں بھی قابل عزت بنا دیا۔ جن لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا وہ ہر طرح کی مصیبت اور نقصان کے باوجود آپ کے ساتھ جڑے رہے۔ اپنی مظلومی کے دور میں بھی آپ لوگوں کی نظر میں اتنے ہی محبوب تھے جتنا فتح و غلبہ کے دور میں۔ آپ کو دور سے دیکھنے والوں نے آپ کو جیسا پایا ویسا ہی ان لوگوں نے بھی پایا جو آپ کو قریب سے دیکھ رہے تھے۔ آپ کا کردار ایسا نمونہ بن گیا جیسا نمونہ تاریخ میں دوسرا نہیں پایا جاتا۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۹ جون ۱۹۶۸ کو نشر کی گئی۔

منافقین کہتے ہیں کہ رسول کے ساتھیوں پر خرچ نہ کرو یہاں تک کہ وہ منتشر ہو جائیں۔ حالاں کہ اللہ کے ہیں زمین و آسمان کے خزانے مگر منافق اس کو نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم مدینہ واپس پہنچ جائیں تو جو زور والا ہے وہ کمزور لوگوں کو وہاں سے نکال دے گا۔ حالاں کہ زور صرف اللہ کا ہے اور اس کے رسول کا اور ایمان والوں کا، مگر منافق اس کو نہیں جانتے ۸-۷

کسی کے لئے رزق کا ایک دروازہ کھلے اور ایک آدمی اس کو بند کرنے کا منصوبہ بنائے تو یہ خدا کے تقسیم رزق کے نظام میں مداخلت کرنا ہے۔ جو شخص ایسا منصوبہ بنائے وہ بدترین جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اسی طرح کسی شخص کو کوئی ٹھکانا ملا ہوا ہے۔ اب کوئی شخص اس کو اس ٹھکانے سے اجاڑنے کی سازش کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ قدرت کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے۔

خدا ہی دینے والا ہے اور خدا ہی چھیننے والا۔ دنیا میں کسی کو جو کچھ ملا ہے وہ خدا کے دئے سے ملا ہے اور وہی یہ طاقت رکھتا ہے کہ کسی سے کوئی چیز چھین لے۔ ایسی دنیا میں کسی شخص کا یہ منصوبہ بنانا کہ وہ کسی سے چھینے اور اس کو برباد کرے، خدا کو چیلنج کرنے کے ہم معنی ہے۔ یہ اپنے کو بندہ کے مقام سے اٹھا کر خدا کے مقام پر بٹھانا ہے، ظاہر ہے کہ کوئی بندہ کبھی خدا نہیں بن سکتا۔ اس لئے کسی بندہ کا ایسا منصوبہ اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

جب کوئی شخص کسی انسان کے خلاف سازش کرتا ہے تو وہ گویا خدا کے خلاف سازش کرتا ہے، خدا نے جس کو اپنی زمین پر آباد کیا اس کو وہ چاہتا ہے کہ اس کی زمین سے اجاڑ دے۔ خدا نے جس کو کھانا اور پانی دیا اس کو وہ چاہتا ہے کہ بھوکا اور پیاسا بنا دے۔ خدا نے جس کو گھر دیا اس کو وہ چاہتا ہے کہ بے گھر کر دے۔ خدا نے جس کو عزت دی اس کو وہ چاہتا ہے کہ بے عزت کر کے چھوڑ دے۔ ایسا آدمی خدا کے دئے کو چھین لینا چاہتا ہے۔ وہ خدا کے منصوبہ کو باطل کر دینا چاہتا ہے۔ ایسا شخص خدا کی اس کائنات میں مجرم ہے۔ وہ اس قابل ہے کہ خود اس کو اجاڑ دیا جائے، بجائے کہ وہ کسی کو اجاڑنے میں کامیاب ہو۔ اس زمین و آسمان کے اندر سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ کوئی شخص خدا کی جگہ پر بیٹھنا چاہے۔ وہ خدا کی تقسیم رزق میں خلل ڈالنے کا منصوبہ بنائے۔ ایسا شخص اگر کامیاب ہوتا ہوا دکھائی دے تو وہ خدا کی اس ڈھیل کی بنا پر ہوگا کہ اس کا جرم پوری طرح کھل جائے۔ تاکہ خدا جب اس کو پکڑے تو وہ ایک ثابت شدہ مجرم کو پکڑ نا ہو۔

اللہ کی تقسیم رزق میں مداخلت کا یہ جرم اس وقت اور زیادہ سنگین ہو جاتا ہے جب کہ وہ حق کے داعیوں کے خلاف کیا گیا ہو۔ اللہ کے کچھ بندے اگر حق کی پیغام رسانی کا کام کر رہے ہوں تو وہ براہ راست اللہ کی توفیق سے کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں کسی کا یہ منصوبہ بنانا کہ ان کا رزق بند کر دو یا ان کا آشیانہ اجاڑ دو تاکہ یہ کام ختم ہو جائے، بہت بڑی بھول ہے اور بہت بڑا جرم بھی۔

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جو الٹا پھرا تو ہم نے ان پر تم کو نگراں بنا کر نہیں بھیجا ہے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو قبول ہے۔ پھر جب تمھارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ اس کے خلاف مشورہ کرتا ہے جو وہ کہہ چکا تھا۔ اور اللہ ان کی سرگوشیوں کو لکھ رہا ہے۔ پس تم ان سے اعراض کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو، اور اللہ بھروسہ کے لئے کافی ہے۔ کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے، اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس کے اندر بڑا اختلاف پاتے۔ اور جب ان کو کوئی بات امن یا خوف کی پہنچتی ہے تو وہ اس کو پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر وہ اس کو رسول تک یا اپنے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے تو ان میں سے جو لوگ تحقیق کرنے والے ہیں وہ اس کی حقیقت جان لیتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے　　۸۳ — ۸۰

خدا کے داعی کو ماننا "اپنے جیسے انسان" کو ماننا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی خدا کو مان لیتا ہے مگر وہ خدا کے داعی کو ماننے پر راضی نہیں ہوتا۔ مگر آدمی کا اصل امتحان یہی ہے کہ وہ خدا کے داعی کو پہچانے اور اس کی جانب اپنے کو کھڑا کرے۔ داعی کے معاملہ کو جب آدمی خدا کا معاملہ نہ سمجھے تو وہ اس کے بارے میں سنجیدہ بھی نہیں ہوتا۔ سامنے وہ رسمی طور پر ہاں کر دیتا ہے مگر جب الگ ہوتا ہے تو اپنی سابقہ روش پر چلنے لگتا ہے۔ وہ اس کے خلاف ایسی باتیں پھیلاتا ہے جن کا پھیلانا سراسر غیر ذمہ دارانہ فعل ہو۔ جو لوگ خدا کے داعی کے ساتھ اس قسم کا بے پروائی کا سلوک کریں وہ خدا کے یہاں یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکتے کہ ہم نہیں جانتے تھے۔ آدمی اگر ٹھہر کر سوچے تو داعی کی صداقت کو جاننے کے لئے وہ کلام ہی کافی ہے جو خدا نے اس کی زبان پر جاری کیا ہے۔

قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ اس کا کوئی بیان کسی بھی مسلمہ صداقت کے خلاف نہیں۔ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو انسانی فطرت کے خلاف ہو۔ اس میں کوئی ایسا بیان نہیں جو سابق آسمانی کتابوں کے ذریعہ جانی ہوئی کسی حقیقت سے ٹکراتا ہو۔ اس میں کوئی ایسا اشارہ نہیں جو تجربی علوم سے دریافت شدہ کسی واقعہ کے غیر مطابق ہو۔ حقائق واقعی سے یہ مکمل مطابقت اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے آیا ہوا کلام ہے۔ تاہم کسی بھی سچائی کا سچائی نظر آنا اس پر موقوف ہے کہ آدمی سنجیدگی کے ساتھ اس کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ قرآن کا اختلاف کثیر سے خالی ہونا اس شخص کو دکھائی دے گا جو قرآن میں "تدبر" کرے۔ جو شخص تدبر کرنا نہ چاہے اس کے لئے بے معنی اعتراضات نکالنے کا دروازہ اس وقت تک کھلا ہوا ہے جب تک قیامت آکر موجودہ امتحانی حالات کا خاتمہ نہ کر دے۔

اسلامی معاشرہ وہ ہے جس کے افراد اتنے خود شناس ہوں کہ وہ دوسرے کے مقابلہ میں اپنی نااہلی کو جان لیں۔ وہ کسی معاملہ کو اہل تر شخص کے حوالے کرکے اس کی رہنمائی پر راضی ہو جائیں۔ یہ خود شناسی ہی واحد چیز ہے جو اجتماعی زندگی میں کسی کو شیطان کے پیچھے چل پڑنے سے بچاتی ہے۔ آدمی اگر اپنے آپ کو نہ جانے تو وہ اہلیت نہ رکھتے ہوئے بھی نازک معاملات میں کود پڑتا ہے اور پھر خود بھی ہلاک ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی ہلاک کرتا ہے۔ اجتماعی معاملات میں بولنے سے زیادہ چپ رہنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ شیطان کی مدد کرتا ہے کہ آدمی جو بات سنے اس کو دوسروں کے سامنے دہرانے لگے

پس لڑو اللہ کی راہ میں۔ تم پر اپنی جان کے سوا کسی کی ذمہ داری نہیں اور مسلمانوں کو ابھارو۔ امید ہے کہ اللہ منکروں کا زور توڑ دے اور اللہ بڑا زور والا اور بہت سخت سزا دینے والا ہے۔ جو شخص کسی اچھی بات کے حق میں کہے گا اس کے لئے اس میں سے حصہ ہے اور جو اس کی مخالفت میں کہے گا اس کے لئے اس میں سے حصہ ہے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اور جب کوئی تم کو دعا دے تو تم بھی دعا دو اس سے بہتر یا الٹ کر وہی کہہ دو، بے شک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ تم سب کو قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔ اور اللہ کی بات سے بڑھ کر سچی بات اور کس کی ہو سکتی ہے ۸۴ — ۸۷

دینداری کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی عملی طور پر جہاں ہے وہیں رہے۔ وہ اپنی حقیقی زندگی میں کوئی تبدیلی نہ کرے۔ البتہ کچھ اوپری مظاہر کا اہتمام کر کے سمجھے کہ میں دیندار بن گیا ہوں۔ ایسے دین سے کسی کو ضد نہیں ہوتی۔ لوگ اس کی مخالفت کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ مگر جب دین کے ایسے تقاضے پیش کئے جائیں جو قربانی کا مطالبہ کرتے ہوں، جس میں آدمی کو اپنی بنی بنائی زندگی اجاڑنا پڑے تو اس کے سامنے آنے کے بعد لوگوں میں دو فریق ہو جاتے ہیں۔ ایک طبقہ دعوت کے مخالفین کا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سستے مظاہر کے ذریعہ اپنی دینداری کا سکہ قائم کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ قربانی والے دین کے مخالف بن جاتے ہیں۔ کیوں کہ ایسے دین کو اختیار کرنا ان کو برتری کے مقام سے اترنے کے ہم معنی نظر آتا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہوتا ہے جس کی فطرت زندہ ہوتی ہے۔ وہ چیزوں کو مفاد اور مصلحت سے اوپر اٹھ کر دیکھتا ہے۔ ایک بات کا حق ثابت ہو جانا ہی اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو قبول کرلے۔ یہ صورت حال کبھی اتنی سنگین ہو جاتی ہے کہ حق کی تائید و حمایت میں زبان کھولنا جہاد کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس حق کے بارے میں خاموشی یا مخالفت کا رویہ اختیار کرنا آدمی کو انعام کا مستحق بنا دیتا ہے۔ تاہم جہاں تک سچے اہل ایمان کا تعلق ہے ان کو ہر حال میں یہ حکم ہے کہ عام معاشرتی تعلقات کو اس اختلاف سے متاثر نہ ہونے دیں۔ اور ان کے ساتھ غیر اخلاقی رویہ اختیار نہ کریں۔ مسلمان کا رویہ دوسروں کے ردعمل میں نہیں بننا چاہئے بلکہ اس قسم کی چیزوں کو نظر انداز کر کے بننا چاہئے۔ یہ معاملہ اللہ سے متعلق ہے کہ وہ کس کو کیا بدلہ دے اور کسی کے لئے کیا فیصلہ کرے۔

نازک حالات میں دعوت حق کو زندہ رکھنے کی ضمانت صرف یہ ہوتی ہے کہ کم از کم داعی اپنی ذات کی سطح پر یہ عزم رکھے کہ وہ ہر حال میں اپنے موقف پر قائم رہے گا خواہ کوئی تائید کرنے والا ہو یا نہ ہو۔ ایسے حالات میں داعی کا عزم اس کو اللہ کی خصوصی نصرت کا مستحق بنا دیتا ہے۔ اس کی ایک مثال بدر صغریٰ کا غزوہ ہے جو احد کے صرف ایک ماہ بعد پیش آیا۔ اس وقت مدینہ میں ایسی کیفیت چھائی ہوئی تھی کہ صرف ستر آدمی رسول اللہ کے ساتھ نکلے۔ مگر اس مختصر قافلہ کو اللہ کی خصوصی مدد ملی کہ مکہ والوں پر ایسا رعب طاری ہوا کہ وہ مقابلہ میں نہ آسکے۔ خدا کی سنت ہے کہ وہ منکرین کا زور توڑے۔ مگر خدا کی یہ سنت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب کہ دین کے علم بردار اپنی بے سروسامانی کے باوجود خدا کے دشمنوں کا زور توڑنے کے لئے نکل پڑے ہوں۔

پھر تم کو کیا ہوا ہے کہ تم منافقوں کے معاملہ میں دو گروہ ہو رہے ہو۔ حالاں کہ اللہ نے ان کے اعمال کے سبب سے ان کو الٹا پھیر دیا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ان کو راہ پر لاؤ جن کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہے۔ اور جس کو اللہ گمراہ کر دے تم ہرگز اس کے لئے کوئی راہ نہیں پا سکتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح انھوں نے انکار کیا ہے تم بھی انکار کرو تاکہ تم سب برابر ہو جاؤ۔ پس تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔ پھر اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو ان کو پکڑو اور جہاں کہیں ان کو پاؤ انھیں قتل کرو اور ان میں سے کسی کو ساتھی اور مددگار نہ بناؤ۔ مگر وہ لوگ جن کا تعلق کسی ایسی قوم سے ہو جن کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہے۔ یا وہ لوگ جو تمھارے پاس اس حال میں آئیں کہ ان کے سینے تنگ ہو رہے ہیں تمھاری لڑائی سے اور اپنی قوم کی لڑائی سے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر زور دے دیتا تو وہ ضرور تم سے لڑتے۔ پس اگر وہ تم کو چھوڑے رہیں اور تم سے جنگ نہ کریں اور تمھارے ساتھ صلح کا رویہ رکھیں تو اللہ تم کو بھی ان کے خلاف کسی اقدام کی اجازت نہیں دیتا۔ دوسرے کچھ ایسے لوگوں کو بھی تم پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں۔ جب کبھی وہ فتنہ کا موقع پائیں وہ اس میں کود پڑتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر تم سے یکسو نہ رہیں اور تمھارے ساتھ صلح کا رویہ نہ رکھیں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو تم ان کو پکڑو اور ان کو قتل کرو جہاں کہیں پاؤ۔ یہ لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تم کو کھلی حجت دی ہے ۹۱ — ۸۸

آدمی جب اللہ کے دین کو اختیار کرتا ہے تو اس کے بعد اس کی زندگی میں بار بار ایسے مرحلے آتے ہیں جہاں یہ جانچ ہوتی ہے کہ وہ اپنے فیصلہ میں سنجیدہ ہے یا نہیں۔ اسی سلسلے کا ایک امتحان "ہجرت" ہے۔ یعنی دین کی راہ میں جب دنیا کے فائدے اور مصلحتیں حائل نظر آئیں تو فائدوں اور مصلحتوں کو چھوڑ کر اللہ کی طرف بڑھ جانا۔ حتیٰ کہ اگر رشتہ دار اور گھر بار کو چھوڑنے کی ضرورت پیش آئے تو اس کو بھی چھوڑ دینا۔ ایسا نازک موقع پیش آنے کی صورت میں اگر ایسا ہو کہ آدمی اپنے فائدوں اور مصلحتوں کو نظر انداز کر کے حق کی طرف بڑھے تو اس نے حق کے ساتھ اپنے قلبی تعلق کو پختہ کیا۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ ایسے موقع پر آدمی اپنے فائدوں اور مصلحتوں سے لپٹا رہے تو اس نے حق کے ساتھ اپنے قلبی تعلق کو کمزور کیا۔ جو شخص پہلی راہ پر چلے اس کے اندر حق کی مزید قبولیت کا مادہ پیدا ہوتا ہے، وہ برابر حق کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ اور جو شخص دوسری راہ کو اختیار کرے اس کے اندر حق کی قبولیت کا مادہ گھٹتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اتنا بے حس ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر حق کو قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔

جب دین کے سخت تقاضے سامنے آتے ہیں تو لوگوں میں مختلف گروہ بن جاتے ہیں۔ کوئی مخلصین کا ہوتا ہے اور کوئی مخالفین کا۔ اور کچھ ایسے لوگوں کا جو ظاہر میں حق سے قریب مگر اندر سے اس سے دور ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ اہل ایمان ہر ایک سے اس کے حسب حال معاملہ کریں۔ وہ فتنہ کے استیصال میں سخت اور اخلاقی ذمہ داریاں کو نبھانے میں نرم ہوں۔ وہ کمزوروں کے ساتھ رعایت کا سلوک کریں۔ دوسروں سے متاثر ہونے کے بجائے خود ان کو متاثر کرنے کی کوشش کریں۔ کسی کو اگر اللہ خاموش کر کے بٹھا دے تو اس سے بلا ضرورت لڑائی نہ چھیڑیں۔

اور مسلمان کا کام نہیں کہ وہ مسلمان کو قتل کرے مگر یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔ اور جو شخص کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کردے تو وہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خوں بہا دے الا یہ کہ وہ معاف کردیں۔ پھر مقتول اگر ایسی قوم میں سے تھا جو تمہاری دشمن ہے اور وہ خود مسلمان تھا تو وہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرے۔ اور اگر وہ ایسی قوم سے تھا کہ تمہارے اور اس کے درمیان عہد ہے تو وہ اس کے وارثوں کو خوں بہا دے اور ایک مسلمان کو آزاد کرے۔ پھر جس کو میسر نہ ہو تو وہ لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے۔ یہ توبہ ہے اللہ کی طرف سے۔ اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور جو شخص کسی مسلمان کو جان کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے　　۹۲-۹۳

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کے جو حقوق ہیں ان میں سب سے بڑا حق یہ ہے کہ وہ اس کی جان کا احترام کرے۔ اگر ایک مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو قتل کردے تو اس نے سب سے بڑا معاشرتی جرم کیا۔ ایک شخص جب دوسرے شخص کو قتل کرتا ہے تو وہ اس کے اوپر آخری ممکن وار کرتا ہے۔ نیز یہ وہ جرم ہے جس کے بعد مجرم کے لئے اپنے جرم کی تلافی کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ قتل عمد کی سزا خلود فی النار ہے۔ جو شخص کسی مسلمان کو جان بوجھ کر مار ڈالے اس سے اللہ اتنا غضب ناک ہوتا ہے کہ اس کو ملعون قرار دے کر اس کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈال دیتا ہے۔ البتہ قتل خطا کا جرم ہلکا ہے۔ کوئی شخص کسی مسلمان کو غلطی سے مار ڈالے، اس کے بعد اس کو غلطی کا احساس ہو وہ اللہ کے سامنے رو ئے گڑگڑائے اور مقررہ قاعدہ کے مطابق اس کی تلافی کرے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف کردے گا۔ غلطی کے بعد مال خرچ کرنا یا مسلسل روزے رکھنا گویا خود اپنے ہاتھوں اپنے کو سزا دینا ہے۔ جب آدمی کے اوپر شدت سے یہ احساس طاری ہوتا ہے کہ اس سے غلطی ہوگئی تو وہ چاہتا ہے کہ اپنے اوپر اصلاحی عمل کرے۔ اللہ نے بتایا کہ ایسی حالت میں آدمی کو اپنی اصلاح کے لئے کیا کرنا چاہئے۔

یہاں اصلاً قتل کا حکم بتایا گیا ہے۔ تاہم اسی نوعیت کے دوسرے معاشرتی جرائم بھی ہیں اور مذکورہ حکم سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان دوسری چیزوں کے بارے میں شریعت کا تقاضا کیا ہے۔

ایک مسلمان کا فرض جس طرح یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کو زندگی سے محروم کرنے کی کوشش نہ کرے، اسی طرح ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ حق بھی ہے کہ وہ اس کو بے عزت نہ کرے۔ اس کا مال نہ چھینے۔ اس کو بے گھر نہ کرے۔ اس کے روزگار میں خلل نہ ڈالے۔ اس کے سکون کو غارت کرنے کا منصوبہ نہ بنائے۔ وہ چیزیں جو اس کے لئے زندگی کے اثاثہ کی حیثیت رکھتی ہیں، ان میں سے کسی چیز کو اس سے چھیننے کی کوشش نہ کرے۔ ایک آدمی اگر غلطی سے ایسا کوئی فعل کر بیٹھے جس سے اس کے مسلمان بھائی کو اس قسم کا کوئی نقصان پہنچ جائے تو اس کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہونا چاہئے اور غلطی کے احساس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اللہ سے معافی مانگے اور اپنے بھائی کے نقصان کی تلافی کرے۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ آدمی قصداً ایسی کارروائی کرے جس کا سوچا سمجھا مقصد اپنے بھائی کو نقصان پہنچانا اور اس کو پریشان کرنا ہو تو درجہ کے فرق کے ساتھ یہ اسی نوعیت کا جرم ہے جیسا قتل عمد۔

اے ایمان والو جب تم سفر کرو اللہ کی راہ میں تو خوب تحقیق کر لیا کرو اور جو شخص تم کو سلام کرے اس کو یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں تم دنیوی زندگی کا سامان چاہتے ہو تو اللہ کے پاس بہت سامان غنیمت ہے۔ تم بھی پہلے ایسے ہی تھے۔ پھر اللہ نے تم پر فضل کیا تو تحقیق کر لیا کرو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔ برابر نہیں ہو سکتے بیٹھ رہنے والے مسلمان جن کو کوئی عذر نہیں اور وہ مسلمان جو اللہ کی راہ میں لڑنے والے ہیں اپنے مال اور اپنی جان سے۔ مال و جان سے جہاد کرنے والوں کی نسبت اللہ نے بیٹھ رہنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے اور ہر ایک سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے۔ اور اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر اجر عظیم میں برتری دی ہے۔ ان کے لئے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۹۶ - ۹۴

عرب کے مخالف قبائل میں کچھ ایسے افراد تھے جو اندر سے مسلمان تھے مگر ہجرت کر کے ابھی اپنے قبیلہ سے کٹے نہیں تھے۔ ایک غزوہ میں ایسا ایک شخص مسلمان کی تلوار کی زد میں آگیا۔ اس نے "السلام علیکم" کہہ کر ظاہر کیا کہ میں تمہارا دینی بھائی ہوں۔ بعض پرجوش مسلمانوں نے پھر بھی اس کو قتل کر دیا۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ مسلمان نہیں ہے اور محض اپنے کو بچانے کی خاطر السلام علیکم کہہ رہا ہے۔ مگر السلام علیکم کہنے کی حد تک بھی کوئی شخص مسلمان ہو تو اس پر ہاتھ اٹھانا جائز نہیں۔ حتیٰ کہ جنگ کے موقع پر بھی نہیں جب کہ یہ اندیشہ ہو کہ دشمن اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ کسی مسلمان کا مارا جانا اللہ کے نزدیک اتنا بڑا حادثہ ہے کہ ساری دنیا کا فنا ہو جانا بھی اس کے مقابلہ میں کم ہے (زوال الدنیا اھون علی اللہ من قتل امرئ مسلم، حدیث)

جب بھی کوئی شخص اس قسم کا اسلامی جوش دکھاتا ہے کہ وہ دوسرے آدمی کی اسلامیت کو ناقابل تسلیم قرار دے کر اس کو سزا دینے پر اصرار کرتا ہے تو اس کے پیچھے ہمیشہ دنیوی محرکات ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی مادی لالچ، کبھی انتقام کی آگ، کبھی اپنے کسی حریف کو میدان سے ہٹانے کا شوق، بس اس قسم کے جذبات ہیں جو اس کا باعث بنتے ہیں۔ اگر آدمی کے سینہ میں اللہ سے ڈرنے والا دل ہو تو وہ اسلام کا اظہار کرنے والے کے الفاظ کو قبول کرے گا اور اس کے معاملہ کو اللہ کے حوالے کر کے خاموش ہو جائے گا۔

عمل کے لحاظ سے مسلمانوں کے دو درجے ہیں۔ ایک وہ لوگ جو فرائض کے دائرہ میں اسلامی زندگی اختیار کریں۔ وہ اللہ کی عبادت کریں اور حرام و حلال کے حدود کا لحاظ کرتے ہوئے زندگی گزاریں۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو قربانی کی سطح پر اسلام کو اختیار کریں۔ وہ خود اسلام کو اپناتے ہوئے دوسروں کو بھی اسلام پر لانے کی کوشش کریں اور اس راہ کی مصیبتوں کو برداشت کریں۔ وہ اسلام کے محاذ پر اپنی جان و مال کو لے کر حاضر ہو جائیں۔ وہ فرائض کے حدود میں نہ ٹھہریں بلکہ فرائض سے آگے بڑھ کر اپنے آپ کو اسلام کے لئے پیش کر دیں۔ یہ دونوں ہی گروہ مخلص ہیں اور دونوں اللہ کی رحمتوں میں اپنا حصہ پائیں گے۔ مگر دوسرے گروہ کا معاملہ بنیادی طور پر الگ ہے۔ انھوں نے ناپ کر خدا کی راہ میں نہیں دیا اس لئے خدا بھی ان کو ناپ کر نہیں دے گا۔ انھوں نے مصلحتوں کی پروا کئے بغیر خدا کے مشن میں اپنے آپ کو شریک کیا اس لئے خدا بھی پروا کئے بغیر ان کو اپنی رحمتوں میں لے لے گا۔

جو لوگ اپنا برا کر رہے ہیں جب ان کی جان فرشتے نکالیں گے تو وہ ان سے پوچھیں گے کہ تم کس حال میں تھے۔ وہ کہیں گے کہ ہم زمین میں بے بس تھے۔ فرشتے کہیں گے کیا خدا کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم وطن چھوڑ کر وہاں چلے جاتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ مگر وہ بے بس مرد اور عورتیں اور بچے جو کوئی تدبیر نہیں کر سکتے اور نہ کوئی راہ پا رہے ہیں، یہ لوگ توقع ہے کہ اللہ انھیں معاف کر دے گا اور اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔ اور جو کوئی اللہ کی راہ میں وطن چھوڑے گا وہ زمین میں بڑے ٹھکانے اور بڑی وسعت پائے گا اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کر کے نکلے، پھر اس کو موت آجائے تو اس کا اجر اللہ کے یہاں مقرر ہو چکا اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے　۹۷—۱۰۰

مومن کی فطرت چاہتی ہے کہ اس کو آزادانہ ماحول ملے جہاں اس کی ایمانی ہستی کے اظہار کے لیے کھلے مواقع ہوں۔ جب بھی ایسا نہ ہو تو آدمی کو چاہئے کہ اپنا ماحول بدل دے۔ اسی کا نام ہجرت ہے۔ ہجرت اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ آدمی اپنے کو غیر موافق فضا سے نکالے اور اپنے کو موافق فضا میں لے جائے۔ ایک ادارہ ہے جس میں بعض شخصیتوں کا زور ہے۔ وہاں رہنے والا ایک آدمی محسوس کرتا ہے کہ میں یہاں شخصیت پرست بن کر تو رہ سکتا ہوں مگر خدا پرست بن کر نہیں رہ سکتا۔ اب اگر وہ آدمی اپنے مفاد کی خاطر ایسے ماحول سے مصالحت کر کے اس میں پڑا رہے اور جو چیز اس کو حق نظر آئے اس کے حق ہونے کا اعلان نہ کرے، یہاں تک کہ اسی حال میں مر جائے تو اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اسی طرح کوئی قوم ہے جس کا ایک قومی مذہب ہے۔ وہ اسی شخص کو اعزاز عطا کرتی ہے جو اس کے قوم پرستانہ مذہب کو اپنائے۔ جو شخص ایسا نہ کرے وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر ایک شخص اس قوم کا ساتھی بنتا ہے اور اسی حال میں اس کی موت آجاتی ہے تو اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اسی طرح ایک ماحول میں حق کی دعوت اٹھتی ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ بکھرے ہوئے اہل ایمان اس کی پشت پر جمع ہوں۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو اس کی خدمت میں لگائیں۔ وہ اپنے مال سے اس کی مدد کریں۔ مگر ایمان والے اپنے فائدوں اور مصلحتوں کے خول میں پڑے رہتے ہیں۔ وہ ایسا نہیں کرتے کہ اپنے خول سے باہر آئیں اور حق کے قافلہ میں شریک ہو کر اس کی قوت کا باعث بنیں۔ اگر وہ اسی حال میں اپنی زندگی کے دن پورے کر دیتے ہیں تو وہ خدا کے یہاں اس حال میں پہنچیں گے کہ انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا۔ تاہم وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو اس قدر معذور ہوں کہ ان سے کوئی تدبیر نہ بن رہی ہو اور نہ باہر سے ان کے لئے کوئی راہ کھل رہی ہو۔

آدمی اپنے ماحول میں ناموافق حالات دیکھ کر سمجھ لیتا ہے کہ ساری دنیا اس کے لئے ایسی ہی ناموافق ہوگی۔ مگر خدا کی وسیع دنیا میں طرح طرح کے لوگ بستے ہیں۔ یہاں اگر مکہ ہے جہاں داعی کو پتھر مارے جاتے ہیں تو یہاں یثرب بھی ہے جہاں داعی کا استقبال کیا جاتا ہے۔ اس لئے آدمی کو ماحول سے مصالحت کے بجائے ماحول کی تبدیلی کے اصول کو اپنانا چاہئے۔ عین ممکن ہے کہ نئے مقام کو اپنا میدان عمل بنانا اس کے لئے نئے امکانات کا دروازہ کھولنے کا سبب بن جائے۔

اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز میں کمی کرو، اگر تم کو ڈر ہو کہ کافر تم کو ستائیں گے۔ بے شک کافر لوگ تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔ اور جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور ان کے لئے نماز قائم کرو تو چاہئے کہ ان کی ایک جماعت تمہارے ساتھ کھڑی ہو اور وہ اپنے ہتھیار لئے ہوئے ہو۔ پس جب وہ سجدہ کر چکیں تو وہ تمہارے پاس سے ہٹ جائیں اور دوسری جماعت آئے جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے اور وہ تمہارے ساتھ نماز پڑھیں۔ اور وہ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار لئے رہیں۔ کافر لوگ چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور سامان سے کسی طرح غافل ہو جاؤ تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ اور تمہارے اوپر کوئی گناہ نہیں اگر تم کو بارش کے سبب سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو اپنے ہتھیار اتار دو اور اپنے بچاؤ کا سامان لئے رہو۔ بے شک اللہ نے کافروں کے لئے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ پس جب تم نماز ادا کر لو تو اللہ کو یاد کرو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے۔ پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کی اقامت کرو۔ بے شک نماز اہل ایمان پر مقرر وقتوں کے ساتھ فرض ہے۔ اور قوم کا پیچھا کرنے سے ہمت نہ ہارو۔ اگر تم دکھ اٹھاتے ہو تو وہ بھی تمہاری طرح دکھ اٹھاتے ہیں اور تم اللہ سے وہ امید رکھتے ہو جو امید وہ نہیں رکھتے۔ اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۱۰۱–۱۰۴

دین میں جتنے اعمال بتائے گئے ہیں، خواہ وہ نماز اور زکوٰۃ کی قسم سے ہوں یا تبلیغ اور جہاد کی قسم سے، سب کا آخری مقصود اللہ کی یاد ہے۔ تمام اعمال کا اصل مدعا یہ ہے کہ ایسا انسان تیار ہو جو اس طرح جئے کہ خدا اس کی یادوں میں بسا ہوا ہو۔ زندگی کا ہر موڑ اس کو خدا کی یاد دلانے والا بن جائے۔ اندیشہ کا موقع اس کو اللہ سے ڈرائے امید کا موقع اس کے اندر اللہ کا شوق پیدا کرے۔ اس کا بھروسہ اللہ پر ہو۔ اس کی توجہات اللہ کی طرف لگی ہوئی ہوں۔ جو چیز ملے اس کو وہ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی جانے اور جو چیز نہ ملے اس کو وہ اللہ کے حکم کا نتیجہ سمجھے۔ اس کی پوری اندرونی ہستی اللہ کے جلال و جمال میں کھوئی ہوئی ہو۔ یہ معاملہ اتنا اہم ہے کہ جنگ کے نازک ترین موقع پر بھی کسی نہ کسی شکل میں نماز ادا کرنے کا حکم ہوا تاکہ موت کے کنارے کھڑے ہو کر انسان کو یاد دلایا جائے کہ وہ اصل چیز کیا ہے جو بندے کو اس دنیا سے لے کر اپنے رب کے پاس جانا چاہئے۔

اہل ایمان کا بھروسہ اگرچہ تمام تر اللہ پر ہوتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ حکم ہے کہ دشمنوں سے اپنے بچاؤ کا ظاہری سامان تیار رکھو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی مدد ظاہری سامان کے اندر سے ہو کر ہی آتی ہے۔ اہل ایمان نے اگر اپنے بچاؤ کا ممکن انتظام نہ کیا ہو تو گویا انھوں نے وہ شکل ہی کھڑی نہیں کی جس کے ڈھانچہ میں اللہ کی مدد اتر کر ان کی طرف آئے۔ مومن کو دنیا میں جو مصیبتیں پیش آتی ہیں وہ اللہ کے اس منصوبہ کی قیمت ہیں کہ وہ آزمائشی حالات پیدا کر کے دیکھے کہ کون سچائی پر قائم رہنے والا ہے اور کون دوسروں کو ناحق ستانے والا۔

اسلام اور غیر اسلام کی کش مکش میں کبھی اہل اسلام کو شکست اور نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت کچھ لوگ پست ہمت ہونے لگتے ہیں۔ مگر ایسے حادثات میں بھی اللہ کی مصلحت شامل رہتی ہے۔ وہ اس لئے پیش آتے ہیں کہ بندہ کے اندر مزید انابت اور توجہ ابھرے اور اس کے نتیجہ میں وہ اللہ کی مزید عنایتوں کا مستحق بنے۔

بے شک ہم نے یہ کتاب تمھاری طرف حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تم کو دکھایا ہے۔ اور بد دیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو۔ اور اللہ سے بخشش مانگو۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور تم ان لوگوں کی طرف سے نہ جھگڑو جو اپنے آپ سے خیانت کر رہے ہیں۔ اللہ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو خیانت والا اور گنہ گار ہو۔ وہ آدمیوں سے شرماتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے۔ حالاں کہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب کہ وہ سرگوشیاں کرتے ہیں اس بات کی جس سے اللہ راضی نہیں۔ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے ۱۰۵ — ۱۰۸

انسان کی یہ ضرورت ہے کہ وہ مل جل کر رہے۔ یہی ضرورت قوم یا گروہ کو وجود میں لاتی ہے۔ اجتماعیت سے وابستہ ہو کر ایک آدمی اپنی طاقت کو ہزاروں لاکھوں گنا بڑا کر لیتا ہے۔ مگر دھیرے دھیرے ایسا ہوتا ہے کہ جو چیز اجتماعی ضرورت کے طور پر بنی تھی وہ اجتماعی مذہب کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ وہ بذات خود لوگوں کا مقصود بن جاتی ہے۔ اب یہ ذہن بن جاتا ہے کہ "میرا گروہ خواہ وہ صحیح ہو یا غلط۔ میری قوم خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر" اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنا حلقہ اہم دکھائی دیتا ہے اور دوسرا حلقہ غیر اہم۔ اپنے حلقہ کا آدمی اگر باطل پر ہے تب بھی اس کی حمایت ضروری سمجھی جاتی ہے اور دوسرے حلقہ کا آدمی اگر حق پر ہے تب بھی اس کا ساتھ نہیں دیا جاتا۔

کسی گروہ میں یہ ذہن بن جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی گروہی مصلحتوں اور جماعتی تعصبات کو معیار کا درجہ دے دیا۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ہدایت کو معیار کا درجہ دے اور اس کی روشنی میں اپنا رویہ متعین کرے نہ کہ دنیوی مصلحتوں اور جماعتی تعصبات کے تحت۔ ایک آدمی غلطی کرے تو اس کا ہاتھ پکڑا جائے خواہ وہ اپنا ہو۔ ایک آدمی صحیح بات کہے تو اس کا ساتھ دیا جائے خواہ وہ کوئی غیر ہو۔ حتیٰ کہ ایسا معاملہ جس میں ایک فریق اپنا ہو اور ایک فریق باہر کا تب بھی معاملہ کو اپنے اور غیر کی نظر سے نہ دیکھا جائے بلکہ حق اور ناحق کی نظر سے دیکھا جائے اور ہر دوسری چیز کی پروا کئے بغیر اپنے کو حق کی جانب کھڑا کیا جائے۔

سچائی کو چھوڑنا، خود اپنے آپ کو چھوڑنے کے ہم معنی ہے۔ جب آدمی دوسرے کے ساتھ خیانت کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنے ساتھ خیانت کر چکا ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہر سینہ کے اندر اللہ نے اپنا ایک نمائندہ بٹھا دیا ہے۔ یہ انسان کا ضمیر ہے۔ جب بھی آدمی حق کے خلاف جانے کا ارادہ کرتا ہے تو یہ اندر کا چھپا ہوا نمائندۂ حق اس کو ٹوکتا ہے۔ اس اندرونی آواز کو آدمی دباتا ہے اور اس کو نظر انداز کرتا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ انصاف کے راستہ کو چھوڑے اور بے انصافی کے راستہ پر چل پڑے۔ مزید یہ کہ آدمی جب ناحق میں کسی کا ساتھ دیتا ہے تو وہ انسان کا لحاظ کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ دنیوی تعلقات اور مصلحتوں کی وجہ سے وہ ایک شخص کو نظر انداز نہیں کر پاتا اس لئے وہ اس کو غلط جانتے ہوئے اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔ مگر ناحق کے باوجود ایک شخص کو نہ چھوڑنا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی اپنے خدا کو چھوڑ دے۔ عین اس وقت جب کہ وہ دنیا میں ایک شخص کا ساتھ دیتا ہے، آخرت میں وہ خدا کے ساتھ سے محروم ہو جاتا ہے۔

تم لوگوں نے دنیا کی زندگی میں تو ان کی طرف سے جھگڑا کر لیا۔ مگر قیامت کے دن کون ان کے بدلے اللہ سے جھگڑا کرے گا یا کون ہوگا ان کا کام بنانے والا۔ اور جو شخص برائی کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے پھر اللہ سے بخشش مانگے تو وہ اللہ کو بخشنے والا رحم کرنے والا پائے گا۔ اور جو شخص کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ اپنے ہی حق میں کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور جو شخص کوئی غلطی یا گناہ کرے پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگا دے تو اس نے ایک بڑا بہتان اور کھلا ہوا گناہ اپنے سر لے لیا۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو یہ ٹھان ہی لیا تھا کہ تم کو بہکا کر رہے گا۔ حالانکہ وہ اپنے آپ کو بہکا رہے ہیں۔ وہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور تم کو وہ چیز سکھائی ہے جس کو تم نہیں جانتے تھے اور اللہ کا فضل ہے تم پر بہت بڑا ۱۰۹-۱۱۳

دنیا آزمائش کی جگہ ہے۔ یہاں ہر آدمی سے غلطی ہو سکتی ہے۔ خدا کے معاملہ میں بھی اور بندوں کے معاملہ میں بھی۔ جب کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی غلطی پر شرمندہ ہو۔ وہ اللہ کی طرف اور زیادہ توجہ کے ساتھ دوڑ پڑے۔ وہ اللہ سے درخواست کرے کہ وہ اس کی غلطی کو معاف کر دے اور آئندہ کے لئے اس کو نیکی کی توفیق دے۔ جو شخص اس طرح اللہ کی پناہ چاہے تو اللہ بھی اس کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ اللہ اس کے دینی احساس کو بیدار کر کے اس کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو کر دنیا میں رہنے لگے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی جب غلطی کرے تو وہ غلطی کو ماننے کے لئے تیار نہ ہو۔ بلکہ اپنی غلطی کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش میں لگ جائے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی حمایت سے خود ان لوگوں سے لڑنے لگے جو اس کی غلطی سے اس کو آگاہ کر رہے ہیں۔ جو لوگ اپنی غلطی پر اس طرح اکڑتے ہیں اور جو لوگ ان کا ساتھ دیتے ہیں وہ خدا کے نزدیک بدترین مجرم ہیں۔ وہ اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے جن الفاظ کا سہارا لیتے ہیں وہ آخرت میں بالکل بے معنی ثابت ہوں گے اور جن حمایتیوں کے بھروسے پر وہ گھمنڈ کر رہے ہیں وہ بالآخر جان لیں گے کہ وہ کچھ بھی ان کے کام آنے والے نہ تھے۔

ایک شخص کسی کا مال چرائے اور جب پکڑے جانے کا اندیشہ ہو تو اس کو دوسرے کے گھر میں رکھ کر کہے کہ فلاں نے اس کو چرایا تھا۔ ایک شخص کسی عورت کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہے اور جب وہ پاک دامن خاتون اس کا ساتھ نہ دے تو وہ جھوٹے افسانے گھڑ کر اس خاتون کو بدنام کرے۔ دو آدمی مل کر ایک کام شروع کریں۔ اس کے بعد ایک شخص کو محسوس ہو کہ اس کی ذاتی مصلحتیں مجروح ہو رہی ہیں، وہ تدبیر کر کے اس کام کو بند کرا دے اور اس کے بعد مشہور کرے کہ اس کے بند ہونے کی ذمہ داری فریق ثانی کے اوپر ہے۔ یہ سب اپنا جرم دوسرے کے سر ڈالنے کی کوششیں ہیں۔ مگر ایسی کوششیں صرف آدمی کے جرم کو بڑھاتی ہیں، وہ اس کو بری الذمہ ثابت نہیں کرتیں۔ اللہ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ وہ ہدایت کے دروازے کھولے۔ وہ آدمی کو سمجھائے کہ غلطی کرنے کے بعد اپنی غلطی کو مان لو نہ کہ بحث کر کے اپنے کو صحیح ثابت کرو۔ کسی سے معاملہ پڑے تو ساتھیوں کے بل پر گھمنڈ نہ کرو بلکہ اللہ سے ڈر کر تواضع کا انداز اختیار کرو۔ کسی کے خلاف کارروائی کرنے کا موقع مل جائے تو اپنے کو کامیاب سمجھ کر خوش نہ ہو بلکہ اللہ سے دعا کرو کہ وہ تم کو ظالم بننے سے بچائے۔

ان کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں۔ بھلائی والی سرگوشی صرف اس کی ہے جو صدقہ کرنے کو کہے یا کسی نیک کام کے لئے یا لوگوں میں صلح کرانے کے لئے کہے۔ جو شخص اللہ کی خوشی کے لئے ایسا کرے تو ہم اس کو بڑا اجر عطا کریں گے۔ مگر جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا اور مومنین کے راستہ کے سوا کسی اور راستہ پر چلے گا، حالاں کہ اس پر راہ واضح ہو چکی تو اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے ۱۱۴-۱۵

حق کی بے آمیز دعوت جب اٹھتی ہے تو وہ زمین پر خدا کا ترازو کھڑا کرنا ہوتا ہے۔ اس کی میزان میں ہر آدمی اپنے کو تلتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ حق کی دعوت ہر ایک کے اوپر سے اس کا ظاہری پردہ اتار دیتی ہے اور ہر شخص کو اس کے اس مقام پر کھڑا کر دیتی ہے جہاں وہ باعتبار حقیقت تھا۔ یہ صورت حال اتنی سخت ہوتی ہے کہ لوگ چیخ اٹھتے ہیں۔ سارا ماحول داعی کے لئے ایسا بن جاتا ہے جیسے وہ انگاروں کے درمیان کھڑا ہوا ہو۔

جو لوگ دعوتِ حق کے ترازو میں اپنے کو بے وزن ہوتا ہوا محسوس کرتے ہیں ان کے اندر ضد اور گھمنڈ کے جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ تیزی سے مخالفانہ رخ پر چل پڑتے ہیں۔ وہ چاہنے لگتے ہیں کہ ایسی دعوت کو مٹا دیں جو ان کی حق پرستانہ حیثیت کو مشتبہ ثابت کرتی ہو۔ ان کے لئے اپنی زبان کا استعمال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ دعوت اور داعی کے خلاف جھوٹی باتیں پھیلائیں۔ اس کو زیر کرنے کے منصوبے بنائیں۔ وہ لوگوں کو منع کریں کہ اس کی مالی مدد نہ کرو۔ جو اللہ کے بندے اللہ کی رسی کے گرد متحد ہو رہے ہوں ان کو بدگمانیوں میں مبتلا کر کے منتشر کریں۔

اس کے برعکس جو لوگ اپنی فطرت کو زندہ رکھے ہوئے تھے ان کو اللہ کی مدد سے یہ توفیق ملتی ہے کہ وہ اس کے آگے جھک جائیں، وہ اس کا ساتھ دیں، وہ اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیں۔ ایسے لوگوں کے لئے ان کی زبان کا استعمال یہ ہوتا ہے کہ وہ کھلے طور پر سچائی کا اعتراف کریں۔ وہ لوگوں سے کہیں کہ یہ اللہ کا کام ہے اس میں اپنا مال اور اپنا وقت خرچ کرو۔ وہ لوگوں کو ترغیب دیں کہ وہ اپنی قوتوں کو نیکی اور بھلائی کے کاموں میں لگائیں۔ وہ آپس کی رنجشوں اور شکایتوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ حق کا اعتراف ان کے اندر جو نفسیات جگاتا ہے اس کا قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ اس قسم کے کاموں میں لگ جائیں۔

اللہ کے نزدیک یہ ایک ناقابلِ معافی جرم ہے کہ حق کی دعوت کی مخالفت کی جائے اور جو لوگ حق کی دعوت کے گرد جمع ہوئے ہیں ان کو اپنی دشمنی کی آگ میں جلانے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے اکثر گناہوں میں یہ امکان رہتا ہے کہ وہ انسان کی غفلت یا کمزوری کی وجہ سے صادر ہوئے ہوں۔ مگر دعوت حق کی مخالفت تمام تر سرکشی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور سرکشی کسی آدمی کا وہ جرم ہے جس کو اللہ کبھی معاف نہیں کرتا، الایہ کہ وہ اپنی غلطی کا اقرار کرے اور سرکشی سے باز آجائے۔ دین کی دعوت جب بھی اپنی بے آمیز شکل میں اٹھتی ہے تو وہ ایک خدائی کام ہوتا ہے جو خدا کی خصوصی مدد پر شروع ہوتا ہے۔ ایسے کام کی مخالفت کرنا گویا خدا کے مقابلہ میں کھڑا ہونا ہے اور کون ہے جو خدا کے مقابلہ میں کھڑا ہو کر کامیاب ہو۔

بے شک اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے سوا گناہوں کو بخش دے گا جس کے لئے چاہے گا۔ اور جس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا وہ بہک کر بہت دور جا پڑا۔ وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں دیویوں کو اور وہ پکارتے ہیں سرکش شیطان کو۔ اس پر اللہ نے لعنت کی ہے۔ اور شیطان نے کہا تھا کہ میں تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ لے کر رہوں گا۔ میں ان کو بہکاؤں گا اور ان کو امیدیں دلاؤں گا اور ان کو سجھاؤں گا تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے اور ان کو سجھاؤں گا تو وہ اللہ کی بناوٹ کو بدلیں گے اور جو شخص اللہ کے سوا شیطان کو اپنا دوست بنائے تو وہ کھلے ہوئے نقصان میں پڑ گیا۔ وہ ان کو وعدہ دیتا ہے اور ان کو امیدیں دلاتا ہے اور شیطان کے تمام وعدے فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ اس سے بچنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ان کو ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنی بات میں سچا ہوگا ۱۱۶ ــ ۲۲

جو شخص ایک اللہ کو پکڑ لے اس کے عمل کی جڑیں خدا میں قائم ہو جاتی ہیں۔ اس سے وقتی لغزش بھی ہوتی ہے۔ مگر اس کے بعد جب وہ پلٹتا ہے تو دوبارہ وہ حقیقی سرے کو پا لیتا ہے۔ اور جو شخص اللہ کے سوا کہیں اور اٹکا ہوا ہو وہ گویا اس زمین سے محروم ہے جو اس کائنات میں واحد حقیقی زمین ہے۔ بظاہر اگر وہ کوئی اچھا عمل کرے تب بھی وہ خدا کے سرچشمہ سے نکلا ہوا عمل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایک اوپری عمل ہوتا ہے جو معمولی جھٹکا لگتے ہی باطل ثابت ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ توحید کے ساتھ کیا ہوا عمل آخرت میں اپنا نتیجہ دکھاتا ہے اور شرک کے ساتھ کیا ہوا عمل اسی دنیا میں برباد ہو کر رہ جاتا ہے، وہ آخرت تک نہیں پہنچتا۔

اس دنیا میں آدمی کا اصلی مقابلہ شیطان سے ہے۔ تاہم شیطان کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ وہ اتنا ہی کر سکتا ہے کہ آدمی کو لفظی وعدوں کا فریب دے اور فرضی تمناؤں میں الجھائے۔ اور اس طرح لوگوں کو حق سے دور کر دے۔ شیطان کی گمراہی کی دو خاص صورتیں ہیں۔ ایک توہم پرستی۔ اور دوسرے خدا کی تخلیق میں فرق کرنا۔ توہم پرستی یہ ہے کہ کسی چیز سے ایسے نتیجہ کی امید کر لی جائے جس نتیجہ کا کوئی تعلق اس سے نہ ہو۔ مثلاً خود ساختہ مفروضوں کی بنیاد پر اللہ کے سوا کسی چیز کو معاملات میں مؤثر مان لینا، حالاں کہ اس دنیا میں اللہ کے سوا کسی کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ یا زندگی کو عملاً دنیا کے حصول میں لگا دینا اور آخرت کے بارے میں فرضی خوش خیالیوں کی بنا پر یہ امید قائم کر لینا کہ وہ اپنے آپ حاصل ہو جائے گی۔ شیطان کے بہکاوے کا دوسرا طریقہ اللہ کے بتائے ہوئے نقشہ کو بدلنا ہے۔ خدا نے انسان کو اس فطرت پر پیدا کیا ہے کہ وہ اپنی تمام توجہ کو اللہ کی طرف لگائے، اس فطرت کو بدلنا یہ ہے کہ انسان کی توجہات کو دوسری دوسری چیزوں کی طرف مائل کر دیا جائے۔ یا کسی مقصد کے حصول کا جو طریقہ فطری طور پر مقرر کیا گیا ہے اس کو بدل کر کسی خود ساختہ طریقہ سے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ کائنات کے خدائی نقشہ کی مطابقت میں انسان کو جس طرح رہنا چاہئے اس نقشہ کو تلپٹ کر دیا جائے۔

نہ تمھاری آرزوؤں پر ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو کوئی بھی برا کرے گا اس کا بدلہ پائے گا۔ اور وہ نہ پائے گا اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور نہ مددگار۔ اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ اور اس سے بہتر کس کا دین ہے جو اپنا چہرہ اللہ کی طرف جھکا دے اور وہ نیکی کرنے والا ہو۔ اور وہ چلے دین ابراہیم پر جو ایک طرف کا تھا اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔ اور اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے ۱۲۳ — ۱۲۶

خدا اور آخرت کو ماننے والے لوگ جب دنیا پرستی میں غرق ہوتے ہیں تو وہ خدا اور آخرت کا انکار کر کے ایسا نہیں کرتے۔ وہ صرف یہ کرتے ہیں کہ آخرت کے معاملہ کو رسمی عقیدہ کے خانہ میں ڈال دیتے ہیں اور عملاً اپنی تمام محنتیں اور سرگرمیاں دنیا کو حاصل کرنے میں لگا دیتے ہیں۔ دنیا کی عزت اور دنیا کے فائدہ کو سمیٹنے کے معاملہ میں وہ پوری طرح سنجیدہ ہوتے ہیں۔ ان کو پانے کے لیے ان کے نزدیک مکمل جدوجہد ضروری ہوتی ہے۔ مگر آخرت کی کامیابی کو پانے کے لئے صرف خوش فہمیاں ان کو کافی نظر آنے لگتی ہیں۔ کسی بزرگ کی سفارش، کسی بڑے گروہ سے وابستگی، کچھ پاک کلمات کا ورد، بس اس قسم کے سستے اعمال سے یہ امید قائم کر لی جاتی ہے کہ وہ آدمی کو جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ سے بچا لیں گے اور اس کو جنت کے پر بہار باغوں میں داخل کریں گے۔ مگر اس قسم کی خوش خیالیاں خواہ ان کو کتنے ہی خوب صورت الفاظ میں بیان کیا گیا ہو، وہ کسی کے کچھ کام آنے والے نہیں۔ اللہ کا نظام حد درجہ محکم نظام ہے۔ اس کے یہاں تمام فیصلے حقیقتوں کی بنیاد پر ہوتے ہیں نہ کہ محض آرزوؤں کی بنیاد پر۔ اللہ کی عدالت میں ہر آدمی کا اپنا عمل دیکھا جائے گا اور جیسا جس کا عمل ہوگا ٹھیک اسی کے مطابق اس کا فیصلہ ہوگا۔ اللہ کے قانون عدل کے سوا کوئی بھی دوسری چیز نہیں جو اللہ کے یہاں فیصلہ کی بنیاد بننے والی ہو۔

اللہ کا وہ بندہ کون ہے جس پر اللہ اپنی رحمتوں کی بارش کرے گا۔ اس کی ایک تاریخی مثال ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ یہ وہ بندے ہیں جو دنیا میں اللہ کے مومن بن کر رہیں۔ جو اپنے آپ کو ہمہ تن اپنے رب کی طرف یکسو کر لیں۔ جو اپنی وفاداریاں پوری طرح اللہ کے لئے خاص کر دیں۔ انھوں نے دنیا میں اپنے معاملات کو اس طرح قائم کیا ہو کہ وہ ظلم اور سرکشی سے دور رہنے والے اور عدل اور تواضع کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے ہوں۔ چہرہ آدمی کے پورے وجود کا نمائندہ ہے۔ چہرہ خدا کی طرف پھیرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے پورے وجود کو خدا کی طرف پھیر دے۔

اللہ تمام کائنات کا مالک ہے۔ اس کے پاس ہر قسم کی طاقتیں ہیں۔ مگر موجودہ دنیا میں اللہ نے اپنے کو غیب کے پردہ میں چھپا دیا ہے۔ دنیا میں جتنی بھی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اسی لئے پیدا ہوتی ہیں کہ آدمی خدا کو نہیں دیکھتا، وہ سمجھ لیتا ہے کہ میں آزاد ہوں کہ جو چاہوں کروں۔ اگر آدمی یہ جان لے کہ انسان کے اختیار میں کچھ نہیں تو آدمی پر جو کچھ قیامت کے دن بیتنے والا ہے وہ اس پر آج ہی بیت جائے۔

اور لوگ تم سے عورتوں کے بارے میں حکم پوچھتے ہیں۔ کہہ دو اللہ تمھیں ان کے بارے میں حکم دیتا ہے اور وہ آیات بھی جو تمھیں کتاب میں ان یتیم عورتوں کے بارے میں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں جن کو تم وہ نہیں دیتے جو ان کے لئے لکھا گیا ہے اور چاہتے ہو کہ ان کو نکاح میں لے آؤ۔ اور جو آیات کمزور بچوں کے بارے میں ہیں اور یتیموں کے ساتھ انصاف کرو اور جو بھلائی تم کروگے وہ اللہ کو خوب معلوم ہے۔ اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے بدسلوکی یا بے رخی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں آپس میں کوئی صلح کرلیں اور صلح بہتر ہے۔ اور حرص انسان کی طبیعت میں بسی ہوئی ہے۔ اور اگر تم اچھا سلوک کرو اور خدا ترسی سے کام لو تو جو کچھ تم کروگے اللہ اس سے باخبر ہے۔ اور تم ہرگز عورتوں کو برابر نہیں رکھ سکتے اگرچہ تم ایسا کرنا چاہو۔ پس بالکل ایک ہی طرف نہ جھک پڑو کہ دوسری کو لٹکی ہوئی کی طرح چھوڑ دو۔ اور اگر تم اصلاح کرلو اور ڈرو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر دونوں جدا ہوجائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی وسعت سے بے احتیاج کردے گا اور اللہ بڑی وسعت والا حکمت والا ہے ۱۲۷ - ۱۳۰

پوچھنے والوں نے بعض معاشرتی امور کی بابت شرعی حکم دریافت کیا تھا۔ اس سلسلے میں حکم بتاتے ہوئے خیر و انصاف اور اصلاح و تقویٰ پر زور دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی قانون اسی وقت اپنے مقصد کو پورا کرتا ہے جب کہ اس کو عمل میں لاتے والا آدمی اللہ سے ڈرتا ہو اور فی الواقع انصاف کا طالب ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو قانون کی ظاہری تعمیل کے باوجود حقیقی بہتری پیدا نہیں ہوسکتی۔ معاشرہ کی واقعی اصلاح صرف اس وقت ہوتی ہے جب کہ برائی کرنے والا برائی سے اس لئے ڈرے کہ اصل معاملہ خدا سے ہے اور برائی کرنے کے بعد میں کسی طرح اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔ اسی طرح بھلائی کرنے والا یہ سوچے کہ لوگوں کی طرف سے خواہ مجھے اس کا کوئی صلہ نہ ملے مگر اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور وہ ضرور مجھ کو اس کا انعام دے گا۔ جہنم کا اندیشہ آدمی کو ظلم سے روکتا ہے اور جنت کی امید اس نقصان کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کردیتی ہے جو حق پرستانہ زندگی کے نتیجہ میں لازماً سامنے آتا ہے۔

میاں بیوی یا دو آدمیوں میں اختلاف کی وجہ ہمیشہ حرص ہوتی ہے۔ ایک فریق دوسرے فریق کا لحاظ کئے بغیر صرف اپنے مطالبات کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ یہ ذہنیت ہر ایک کو دوسرے کی طرف سے غیر مطمئن بنادیتی ہے۔ صحیح مزاج یہ ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کی معذوری کو سمجھیں اور ایک دوسرے کی رعایت کرتے ہوئے کسی باہمی تصفیہ کو پہنچنے کی کوشش کریں۔ اللہ کا مطالبہ جس طرح یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی رعایت کرے، اسی طرح اللہ بھی اپنے بندوں کے ساتھ آخری حد تک رعایت فرماتا ہے۔ اللہ کے یہاں آدمی کی پکڑ اس کی فطری کمزوریوں پر نہیں ہے بلکہ اس کی اس سرکشی پر ہے جو وہ جان بوجھ کر کرتا ہے۔ اگر آدمی اللہ سے ڈرے اور دل میں اصلاح کا جذبہ رکھے تو وہ نیت کی درستگی کے ساتھ جو کچھ کرے گا اس کے لئے وہ اللہ کے یہاں قابل معافی قرار پائے گا۔ اسی کے ساتھ آدمی کو کبھی اس غلط فہمی میں نہ پڑنا چاہیے کہ وہ دوسرے کا کام بنانے والا ہے۔ ہر ایک کا کام بنانے والا صرف اللہ ہے، خواہ وہ بظاہر ایک طرح کے حالات میں ہو یا دوسری طرح کے حالات میں۔

اور اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور ہم نے حکم دیا ہے ان لوگوں کو جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تم کو بھی کہ اللہ سے ڈرو۔ اور اگر تم نے نہ مانا تو اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ بے نیاز ہے سب خوبیوں والا ہے۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بھروسہ کے لئے اللہ کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم سب کو لے جائے اے لوگو، اور دوسروں کو لے آئے۔ اور اللہ اس پر قادر ہے۔ جو شخص دنیا کا ثواب چاہتا ہو تو اللہ کے پاس دنیا کا ثواب بھی ہے اور آخرت کا ثواب بھی۔ اور اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے ۱۳۱ - ۳۴

دنیا میں آدمی کو جو صالح زندگی اختیار کرنا ہے وہ اس کو اسی وقت اختیار کر سکتا ہے جب کہ وہ اندر سے اللہ والا بن گیا ہو۔ اللہ کو مالک کائنات کی حیثیت سے پا لینا، صرف اللہ سے ڈرنا اور صرف اللہ پر بھروسہ کرنا، آخرت کو اصل سمجھ کر اس کی طرف متوجہ ہو جانا، یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی آدمی کو اس قابل بناتی ہیں کہ وہ دنیا میں وہ صالح زندگی گزارے جو اللہ کو مطلوب ہے اور جو اس کو آخرت کی دنیا میں کامیاب کرنے والی ہے۔ اسی لئے نبیوں کی تعلیمات میں ہمیشہ اسی پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا رہا ہے۔

موجودہ دنیا آزمائش کے لئے ہے۔ یہاں ہر آدمی کو جانچ کر دیکھا جا رہا ہے کہ کون اچھا ہے اور کون برا۔ اس مقصد کے لئے موجودہ دنیا کو اس ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ یہاں آدمی کو ہر قسم کے عمل کی آزادی ہو۔ حتی کہ اس کو یہ موقع بھی حاصل ہو کہ وہ اپنے سیاہ کو سفید کہہ سکے اور اپنی بے عملی کو عمل کا نام دے۔ یہاں ایک آدمی کے لئے ممکن ہے کہ وہ برائیوں میں مبتلا ہو مگر اس کو بیان کرنے کے لئے وہ بہترین الفاظ پالے۔ یہاں یہ ممکن ہے کہ آدمی ایک کھلی ہوئی سچائی کا انکار کر دے اور اپنے انکار کی ایک خوبصورت توجیہہ تلاش کر لے۔ یہاں یہ ممکن ہے کہ آدمی جاہ طلبی، شہرت پسندی، نفع اندوزی اور مصلحت پر اپنی زندگی کی تعمیر کرے اور اس کے باوجود وہ لوگوں کو یقین دلانے میں کامیاب ہو جائے کہ وہ خالص حق کے لئے کام کر رہا ہے۔ یہاں یہ ممکن ہے کہ ایک شخص خدا کے دین کو اپنے دنیوی اور مادی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنائے اور پھر بھی وہ دنیا میں پھلتا اور پھولتا رہے۔ یہاں یہ ممکن ہے کہ آدمی حلال کو چھوڑ کر حرام ذرائع اختیار کرے، انصاف کے بجائے وہ ظلم کے راستہ پر چلے اور اس کے باوجود اس کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہ ہو۔ ان مختلف مواقع پر آدمی چاہے تو اپنے کو حق و صداقت کا پابند بنائے اور چاہے تو سرکشی اور بے انصافی کی طرف چل پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین کے تمام احکام میں اہمیت کی چیز یہ ہے کہ آدمی اللہ سے ڈرتا ہے یا نہیں۔ یا صرف اللہ کا ڈر ہے جو اس کو ذمہ دارانہ زندگی گزارنے کے قابل بناتا ہے۔ اگر اللہ کا ڈر نہ ہو تو ایک ایسی دنیا میں کسی کو باطل سے روکنے والی کیا چیز ہو سکتی ہے جہاں باطل کو بھی حق کے پیرایہ میں بیان کیا جا سکتا ہو اور جہاں بے انصافی کی بنیاد پر بھی بڑی بڑی ترقیاں حاصل کی جا سکتی ہوں۔ جہاں ہر ظالم کو اپنے ظلم کو چھپانے کے لئے خوبصورت الفاظ مل جاتے ہوں۔

اے ایمان والو، انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنو، چاہے وہ تمھارے یا تمھارے ماں باپ یا عزیزوں کے خلاف ہو۔ اگر کوئی مال دار ہے یا محتاج تو اللہ تم سے زیادہ دونوں کا خیر خواہ ہے۔ پس تم خواہش کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ۔ اور اگر تم کجی کروگے یا پہلو تہی کروگے تو جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے ۱۳۵

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے سامنے ایسا معاملہ آتا ہے جس میں ایک راستہ اپنے مفاد اور خواہش کا ہوتا ہے اور دوسرا حق اور انصاف کا۔ جو لوگ اللہ کی طرف سے غافل ہوتے ہیں، جن کو یقین نہیں ہوتا کہ اللہ ہر وقت ان کو دیکھ رہا ہے وہ ایسے مواقع پر اپنی خواہش کے رخ پر چل پڑتے ہیں۔ وہ اس کو کامیابی سمجھتے ہیں کہ حق کی پروا نہ کریں اور معاملہ کو اپنے مفاد اور اپنی مصلحت کے مطابق طے کریں۔ مگر جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں، جو اللہ کو اپنا نگراں بنائے ہوئے ہیں وہ تمام تر انصاف کے پہلو کو دیکھتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جو حق وانصاف کا تقاضا ہو۔ ان کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ ان کو موت آئے تو اس حال میں آئے کہ انھوں نے کسی کے ساتھ بے انصافی نہ کی ہو، وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر قسط اور عدل پر قائم کئے ہوئے ہوں۔

ان کی انصاف پسندی کا یہ جذبہ اتنا بڑھا ہوا ہوتا ہے کہ ان کے لئے ناممکن ہوجاتا ہے کہ وہ انصاف سے ہٹا ہوا کوئی رویہ دیکھیں اور اس کو برداشت کرلیں۔ جب بھی ایسا کوئی معاملہ سامنے آتا ہے کہ ایک شخص دوسرے کے ساتھ ناانصافی کر رہا ہو تو وہ ایسے موقع پر حق کا اعلان کرنے سے باز نہیں رہتے۔ اگر انصاف کا اعلان کرنے میں ان کے قریبی تعلق والوں پر زد پڑتی ہو یا ان کی اپنی مصلحتیں مجروح ہوتی ہوں تب بھی وہ وہی کہتے ہیں جو انصاف کی رو سے انھیں کہنا چاہئے۔ ان کی زبان کھلتی ہے تو اللہ کے لئے کھلتی ہے نہ کہ کسی اور چیز کے لئے۔ اسی طرح یہ بات بھی غلط ہے کہ صاحب معاملہ طاقت ور ہو تو اس کو اس کا حق دیا جائے اور اگر صاحب معاملہ کمزور ہو تو اس کا حق اس کو نہ دیا جائے۔ مومن وہ ہے جو ہر آدمی کے ساتھ انصاف کرے خواہ وہ زور آور ہو یا کم زور۔

جب کوئی آدمی ناانصافی کا ساتھ دے تو وہ یہ کہہ کر ایسا نہیں کرتا کہ میں ناانصافی کرنے والے کا ساتھی ہوں۔ بلکہ وہ اپنی ناانصافی کو انصاف کا رنگ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے موقع پر ہر آدمی دو میں سے کوئی ایک رویہ اختیار کرتا ہے۔ یا تو وہ یہ کرتا ہے کہ بات کو بدل دیتا ہے۔ وہ معاملہ کی نوعیت کو ایسے الفاظ میں بیان کرتا ہے جس سے ظاہر ہو کہ یہ ناانصافی کا معاملہ نہیں بلکہ عین انصاف کا معاملہ ہے، جس کے ساتھ زیادتی کی جارہی ہے وہ اسی کا مستحق ہے کہ اس کے ساتھ ایسا کیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی خاموشی اختیار کرلے۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہاں ناانصافی کی جارہی ہے وہ کترا کر نکل جائے اور جو کہنے کی بات ہے اس کو زبان پر نہ لائے۔ اس قسم کا طرز عمل ثابت کرتا ہے کہ آدمی اپنے اوپر اللہ کو نگراں نہیں سمجھتا۔

کیسے اچھے ساتھی

ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا۔ ذلک الفضل من اللہ وکفیٰ باللہ علیما نساء ۷۰

اور جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا تو ایسے لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا انعام کیا۔ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ اور وہ کیسے اچھے ساتھی ہیں۔ یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ کا علم کافی ہے۔

اللہ کے انعام یافتہ بندے کون ہیں۔ یہ وہ نیک روحیں ہیں جن کو دنیا میں اطاعت خداوندی کے تحت زندگی گزارنے کی توفیق ملی۔ وہ اس دین پر قائم رہے جس پر تمام زمین و آسمان قائم ہیں۔ جنھوں نے اپنے کو خدا کے اس تخلیقی منصوبہ میں شامل کر دیا جس میں کائنات کی تمام چیزیں اپنے کو شامل کئے ہوئے ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے "کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اسی کی فرماں بردار ہیں زمین و آسمان کی تمام چیزیں (آل عمران) گویا انسان سے جس دین کو اختیار کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ کوئی نیا یا کائنات سے علیحدہ دین نہیں ہے، بلکہ وہی دین ہے جس پر ساری کائنات قائم ہے۔

کائنات کا دین کیا ہے۔ کائنات کا دین اطاعت الٰہی ہے۔ یعنی اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں کے اندر اپنی سرگرمیاں جاری کرنا۔ درخت زمین کے اوپر کھڑا ہوتا ہے مگر وہ اپنا سایہ زمین پر بچھا دیتا ہے۔ ہوائیں چلتی ہیں مگر وہ کسی سے ٹکراؤ نہیں کرتیں۔ سورج اپنی روشنی بکھیرتا ہے مگر وہ چھوٹے بڑے میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ بادل بارش برساتے ہیں مگر وہ اپنے اور غیر میں تمیز نہیں کرتے۔ چڑیاں اور چیونٹیاں اپنے اپنے رزق کی تلاش میں مصروف ہوتی ہیں مگر وہ ایک دوسرے کا حصہ نہیں چھینتیں۔

یہ کائنات کا دین ہے اور اسی دین پر انسان کو بھی رہنا ہے۔ اللہ کے محبوب بندے وہ ہیں جو دنیا میں درخت کے سایہ کی طرح متواضع بن کر رہے۔ جو دوسروں کے درمیان اس طرح گزرے جیسے ہوا کے لطیف جھونکے لوگوں کے درمیان سے گزر جاتے ہیں۔ جن کا فیض اور جن کی مہربانیاں بارش کی طرح ہر ایک کے لئے عام ہوں۔ جو دریا کے پانی کی طرح دوسروں کے لئے سیرابی بن جائیں۔ جنھوں نے سورج کی روشنی کی طرح ہر ایک کو اجالے کا تحفہ دیا۔ جنھوں نے اپنی سرگرمیوں کے دوران اس بات کی احتیاط رکھی کہ ان سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

انبیاء اس دین کی تعمیل میں کمال کے درجہ پر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد صدیقین کا درجہ ہے، پھر شہداء اور پھر صالحین کا۔ جنت انھیں پاک روحوں کا معاشرہ ہے۔ جنت وہ نفیس اور لذیذ مقام ہے جہاں آدمی کو اپنے پڑوسی سے پھولوں کی مانند خوشبو ملے گی اور چڑیوں کے چہچہے جیسے بول سننے کو ملیں گے۔ جہاں ایک کا دوسرے سے ملنا لطیف ہواؤں سے ملنے کی طرح ہوگا۔ کیسی عجیب ہوگی جنت اور کیسا عجیب ہوگا اس کا پڑوس۔

جب گفتگو بے نتیجہ ہو کر رہ جائے

دو آدمیوں کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک شخص نے کہا: "بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ان کو صرف محسوس کر سکتے ہیں، ان کو الفاظ کی صورت میں متعین نہیں کر سکتے۔ مثلاً گڑ اور شکر کو لیجئے۔ چکھ کر ہر آدمی محسوس کر سکتا ہے کہ گڑ کا مزہ کیا ہے اور شکر کا مزہ کیا۔ لیکن اگر دونوں کے مزے کے فرق کو لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو آپ ان کو بیان نہیں کر سکتے۔" دوسرا آدمی فوراً بولا: "مجھے دونوں کا فرق معلوم ہے۔" اس کے بعد اس نے دونوں کے طبی اور غذائی فرق پر تقریر شروع کر دی "شکر کی تاثیر ٹھنڈی ہے اور گڑ کی تاثیر گرم ہے . . . ."

ظاہر ہے کہ اس قسم کی معلومات کی ایک انسائیکلو پیڈیا بھی تیار ہو جائے تو وہ گڑ اور شکر کے مزہ کے فرق کو لفظوں میں متعین نہ کر سکے گی۔ مگر مذکورہ بزرگ نے مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی مسکراہٹ کا لحاظ کئے بغیر اپنی تقریر جاری رکھی۔

کسی گفتگو کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کچھ باتیں پہلے سے جانتا ہو اور ان کو تسلیم کرتا ہو۔ اگر آپ کا مخاطب ایسا ہو کہ وہ نہ تو ضروری باتوں کو جانے اور نہ ان کو تسلیم کرے تو آپ اپنی گفتگو کو کسی حقیقی نتیجہ تک پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

کبھی آدمی اپنے خیالات میں اتنا گم ہوتا ہے کہ دوسرے کی بات اس کے ذہن میں داخل نہیں ہوتی۔ اس کو سن کر وہ ایسے عجیب و غریب انداز میں اس کا جواب دیتا ہے جیسے اس نے کہنے والے کے اصل مدعا کو سمجھا ہی نہ ہو۔ ٹرین چل رہی تھی۔ ڈبہ کے ایک مسافر نے اپنا سگار سلگایا۔ سامنے بیٹھی ہوئی عورت نے اس کی طرف دیکھا اور نرمی سے کہا: "تمباکو کے دھوئیں سے میری طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔" مسافر نے اطمینان سے عورت کی بات سنی اور اس کے بعد گہرا کش لیتے ہوئے بولا: "محترمہ! ایسی حالت میں تو میں آپ کو یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ آپ تمباکو نوشی نہ کیا کریں۔" خاتون کا مقصد یہ تھا کہ مسافر ڈبہ کے اندر تمباکو نوشی نہ کرے۔ مگر مسافر نے خود خاتون کو تمباکو نوشی نہ کرنے کی تلقین شروع کر دی۔ جب بھی آپ کسی کی بات کا جواب دے رہے ہوں تو سب سے پہلے آپ کو بے لاگ طور پر یہ جاننے کی کوشش کرنا چاہئے کہ کہنے والے نے کیا کہا ہے۔ اس کے بعد ہی آپ اس کی بات کا صحیح جواب دے سکتے ہیں۔ اچھی طرح سمجھے بغیر جو جواب دیا جائے وہ خود اپنے ذہن کی بات کا جواب ہوتا ہے نہ کہ مخاطب کی کہی ہوئی بات کا جواب۔

ایک صاحب نے کہا: "الرسالہ کی غلطی اسی سے واضح ہے کہ اس نے اپنا نام الرسالہ رکھا ہے۔" ان کے نزدیک الرسالہ کا مطلب تھا "سب سے اچھا رسالہ"۔ اور ظاہر ہے کہ جو اپنے کو سب سے اچھا کہے وہ یقیناً سب سے زیادہ برا ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ الرسالہ اردو "رسالہ" کے معنی میں نہیں ہے۔ یہ عربی لفظ ہے اور اس کے معنی پیغام (The Message) کے ہیں۔ مگر وہ بدستور بحث کرتے رہے۔ وہ صرف اردو "رسالہ" سے آشنا تھے پھر عربی "الرسالہ" ان کے ذہن کا جزء کس طرح بنتا۔ عربی الرسالہ کو سمجھنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔ اور اپنی غلطی کا اعتراف کرنا وہ مشکل ترین کام ہے جہاں بڑے بڑے پہلوان بھی بے بس ثابت ہوتے ہیں۔

آخرت کے بغیر موجودہ زندگی بے معنی ہے

ڈاکٹر آر۔ سبرانیم (آر ناکولم) بے حد ذہین تھے اور سنجیدہ بھی۔ وہ اپنی بھاری عینک کے ساتھ طالب علمی ہی کے زمانہ میں "پروفیسر" دکھائی دیتے تھے۔ ہائی اسکول سے لے کر ایم ایس سی تک وہ فرسٹ کلاس پاس ہوتے رہے۔ اس کے بعد ان کو ہارورڈ یونیورسٹی سے اسکالرشپ ملا اور انھوں نے انجینرنگ میں پی ایچ ڈی کیا۔ ان کو صنعت میں اچھی جگہ مل سکتی تھی مگر انھوں نے بنگلور کے ایک کالج میں استاد بننا پسند کیا۔ اچانک وہ بیمار ہوئے اور آپریشن کے لئے بمبئی لے جائے گئے۔ آپریشن کے ایک ہفتہ بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر صرف ۳۸ سال تھی۔ ڈاکٹر سبرانیم کے دوست مسٹر ڈی گنگا دھر نے ان کے بارے میں ایک مضمون شائع کیا ہے۔ مسٹر گنگا دھر اپنے مضمون کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں:

Why do these things happen? I cannot find an answer

اس طرح کی باتیں کیوں ہوتی ہیں، مجھے اس کا جواب نہیں معلوم (ٹائمس آف انڈیا ۱۵ نومبر ۱۹۷۹)

اس طرح کے سوالات آدمی کے ذہن میں اس لئے آتے ہیں کہ وہ موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھتا ہے۔ حالاں کہ موت ایک اور زندگی کا آغاز ہے۔ آدمی اگر آج کی زندگی میں اچھا کام کرے تو اگلی دنیا میں جاکر وہ دوبارہ زیادہ بہتر طور پر رہنے لگتا ہے۔ اس کے لئے موت موت نہیں بلکہ زندگی ہے۔ البتہ جو شخص حقیقت کے ساتھ اپنے کو مطابق نہ کرے اس کے لئے یہاں بھی بربادی ہے اور وہاں بھی۔

موجودہ دنیا کی محدودیت

گرسن ولوریا (Gerson Viloria) فلپائن کا ایک باشندہ ہے جس کی عمر ۴۴ سال ہے۔ وہ ایک ٹریژری میں کلرک تھا۔ اس نے لوگوں کی طرف سے فرضی دستخط کرکے بہت سے لوگوں کی رقم وصول کرلی۔ اس کا مقدمہ فلپائن کی ایک عدالت میں پیش ہوا۔ جج کا نام رومیو اسکاریل (Romeo M. Escareal) تھا۔ جج نے تفصیلی سماعت کے بعد گرسن ولوریا کو ۷ معاملات میں مجرم پایا۔ قانون کے مطابق اس طرح کے ایک جرم میں آدمی کو ۱۰ سال قید با مشقت کی سزا ملنی چاہئے۔ اس کے مطابق جج نے مجرم کو ۷۰ سال کی سزا دی۔ اسی کے ساتھ اس نے مجرم پر ۶۲۵-۳ ڈالر جرمانہ عائد کیا۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں سزائے قید میں اضافہ ہوجائے گا (ٹائمس آف انڈیا ۹ نومبر ۱۹۷۹)

مجرم کی عمر ۴۴ سال ہوچکی ہے۔ اگر "قبل از وقت" اس کا خاتمہ نہ ہو بلکہ وہ اپنی عمر طبعی کو پورا کرکے مرے تب بھی اس کی موت کے وقت اس کی سزا کی مدت میں کم از کم سو سال باقی رہ جائیں گے ——— انسان کا ضمیر کسی عمل کا جو بدلہ یا کسی جرم کی جو سزا چاہتا ہے وہ موجودہ محدود دنیا میں ناممکن ہے۔ جو ہونا چاہئے اور جو ہو رہا ہے کے درمیان یہ تضاد بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا نامکمل ہے۔ اس کی تکمیل کے لئے ایک اور دنیا ہونی چاہئے جہاں یہ تضاد ختم ہوجائے اور جو کچھ ہونا چاہئے وہی عملاً بھی ہونے لگے۔

اخلاص یہ ہے کہ آدمی حرام سے بچے

عن زید بن ارقم رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قال لا الٰہ الا اللہ مخلصاً دخل الجنۃ قیل وما اخلاصھا قال ان تحجزہ عن محارم اللہ (ترغیب و ترہیب)

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اخلاص کے ساتھ کہے گا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں وہ جنت میں داخل ہوگا۔ پوچھا گیا اس کا اخلاص کیا ہے۔ فرمایا: یہ کہ یہ کلمہ اس کو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے روک دے۔

اپنے کو تول لو اس سے پہلے کہ تمھیں تولا جائے

عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اپنا حساب آپ کر لو قبل اس کے کہ آخرت میں تمھارا حساب کیا جائے۔ اور اپنے آپ کو تول لو قبل اس کے کہ تم کو تولا جائے۔ اور سب سے بڑی پیشی کے لئے تیاری کر لو (حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا و زنوھا قبل ان توزنوا و تھیئوا للعرض الاکبر)

دین کو ذاتی وقار کا ذریعہ بنانا

عن ابی بن کعب قال تعلموا العلم واعملوا بہ ولا تتعلموہ لتتجملوا بہ فانہ یوشک ان طال بکم زمان ان یتجمل بالعلم کما یتجمل الرجل بالثوب (جلد دوم ۶)

ابی بن کعب نے کہا۔ علم کو سیکھو اور اس پر عمل کرو۔ علم کو اس لئے نہ سیکھو کہ اس سے اپنی زیبائش کرو۔ کیوں کہ وہ زمانہ آنے والا ہے جب کہ علم سے زیبائش کا کام لیا جائے گا جس طرح آدمی کپڑے سے اپنی زیبائش کرتا ہے۔

شہرت پسندی سب سے بڑا فتنہ ہے

حضرت شداد بن اوس کی موت کا وقت آیا تو انھوں نے کہا: اخوف ما اخاف علی ھذہ الامۃ الریاء والشھوۃ الخفیۃ (دوم ۳) اس امت پر مجھ کو سب سے زیادہ جس چیز کا اندیشہ ہے وہ ریا اور شہوت خفی ہے۔

سفیان ثوری نے کہا: الشھوۃ الخفیۃ الذی یحب ان یحمد علی البر (شہوت خفی یہ ہے کہ نیکی پر تعریف سننا چاہے)

یزید بن ابی حبیب کہتے ہیں: سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الشھوۃ الخفیۃ فقال ھو الرجل یتعلم العلم یحب ان یجلس الیہ ابن عبد البر، جامع بیان العلم و فضلہ۔ ۱۹۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ شہوت خفی کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: آدمی دینی علم سیکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے پاس لوگ بیٹھیں۔

وہاں عمل کرنا جہاں لوگ دیکھیں

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعوذوا باللہ من جب الحزن قالوا یا رسول اللہ وما جب الحزن، قال وادٍ فی جھنم یتعوذ منہ جھنم کل یوم اربع مئۃ مرۃ۔ قیل یا رسول اللہ ومن یدخلھا قال: القراء المراؤن باعمالھم (ترمذی۔ ابن ماجہ)

ابوہریرہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ جب الحزن سے پناہ مانگو۔ لوگوں نے پوچھا اے خدا کے رسول جب الحزن کیا ہے۔ فرمایا وہ جہنم میں ایک وادی ہے جس سے خود جہنم روزانہ چار سو بار پناہ مانگتی ہے۔ لوگوں نے پوچھا اے خدا کے رسول اس میں کون داخل ہوگا۔ فرمایا علماء جو دکھاوے کے لئے عمل کرتے ہیں۔

نیک اور بد ہونے کی پہچان

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک شخص نے پوچھا: میں اپنے آپ کو نیک کب سمجھوں۔ انھوں نے جواب دیا: جب تجھ کو اپنے برے ہونے کا گمان ہوجائے۔ آدمی نے دوبارہ پوچھا: میں اپنے آپ کو برا کب سمجھوں۔ جواب دیا جب تو اپنے آپ کو نیک سمجھنے لگے۔

دین کے نام پر دنیا کمانا بے حسی پیدا کرتا ہے

حسن بصری نے کہا۔ عالم کی سزا اس کے دل کا مرجانا ہے۔ پوچھا گیا دل کا مرنا کیا ہے۔ فرمایا: آخرت کے عمل سے دنیا کا فائدہ چاہنا۔ (عقوبة العالم موت القلب۔ قیل له وما موت القلب۔ قال: طلب الدنیا بعمل الآخرة۔ جامع بیان العلم وفضلہ: جزء اول، صفحہ ۱۹۲)

موت کا دن آدمی کے جاگنے کا دن ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگ سوئے ہوئے ہیں۔ جب مریں گے تو بیدار ہوں گے (الناس نیام اذا ماتوا انتبہوا) یعنی انسان دنیا میں اتنا مشغول ہے کہ وہ آخرت کے معاملہ میں غافل ہوگیا ہے۔ گویا کہ وہ دنیا میں جاگ رہا ہے اور آخرت میں سو رہا ہے۔ مگر جب موت اس کی آنکھ کا پردہ ہٹائے گی تو اس کو معلوم ہوگا کہ وہی چیز اصل تھی جس کو اس نے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔

دنیا کی طرف لگاؤ آدمی کو آخرت کے معاملہ میں کمزور کر دیتا ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک زمانہ آئے گا جب تم سیلاب کے خس و خاشاک کی طرح بے حقیقت ہو جاؤ گے۔ صحابہ نے پوچھا اے خدا کے رسول اس کا سبب کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا تمھارے اندر وُھن پیدا ہو جائے گا۔ لوگوں نے دوبارہ پوچھا اے خدا کے رسول وھن کیا ہے۔ آپ نے فرمایا دنیا کی محبت اور موت کا ڈر (حب الدنیا وکراھیة الموت)

آدمی اپنے کو جہنم کے کنارے کھڑا ہوا پائے گا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ پہنچے۔ وہاں آپ نے جو پہلا خطبہ دیا وہ یہ تھا: اے لوگو! اپنے لئے آگے بھیجو، یقیناً تم اس کو جان لوگے۔ خدا کی قسم ضرور ایسا ہوگا کہ تم میں سے ہر شخص پر بے ہوشی طاری ہوگی بکریوں والا بکریاں چھوڑ کر اس طرح چلا جائے گا کہ ان کا کوئی گلہ بان نہ ہوگا۔ پھر اس کا رب اس سے کہے گا اور اس کے اور خدا کے درمیان کوئی ترجمان نہ ہوگا اور نہ بیچ میں کوئی رکاوٹ حائل ہوگی۔ اس کا رب اس سے کہے گا کیا تمھارے پاس میرا پیغمبر نہیں آیا۔ پھر تم کو اس نے میرا پیغام پہنچایا۔ اور میں نے تم کو مال دیا اور تمھارے اوپر فضل کیا۔ پھر تو نے اپنے لئے آگے کیا بھیجا۔ اس وقت وہ آدمی اپنے دائیں اور بائیں دیکھے گا تو وہاں کچھ نہ پائے گا۔ پھر وہ اپنے آگے دیکھے گا تو اس کو وہاں جہنم کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ پس جو اپنے چہرے کو آگ سے بچا سکے تو وہ ضرور بچائے خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ سے ہو۔ اور جس کے پاس وہ بھی نہ ہو تو وہ میٹھا بول بولے۔ کیوں کہ اس کا بھی بدلہ ملے گا۔ اور نیکی کا بدلہ دس گنا سے شروع ہوتا ہے اور سات سو گنا تک ملتا ہے والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ (سیرت النبی لابن ہشام، جلد ۲)

کوئی اندھیرے کی طرف جا رہا ہے کوئی اجالے کی طرف

اللہ ولی الذین آمنوا یخرجہم من الظلمات الی النور والذین کفروا اولیائہم الطاغوت یخرجونہم من النور الی الظلمات اولئک اصحٰب النار ھم فیھا خالدون (بقرہ ۲۵۷)

اللہ ساتھی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے، ان کو وہ اندھیرے سے نکال کر اجالے میں لاتا ہے۔ اور جو منکر ہوئے ان کے دوست شیطان ہیں، وہ ان کو اجالے سے نکال کر اندھیرے میں لے جاتے ہیں ایسے لوگ آگ میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

اندھیرے سے نکل کر اجالے میں جانا یہ ہے کہ آدمی کے سامنے باطل کا راستہ کھلا ہوا ہو، مگر وہ اس کو چھوڑ کر حق کے راستہ کی طرف جائے۔ اور اجالے سے نکل کر اندھیرے میں جانا یہ ہے کہ آدمی کے سامنے حق کا راستہ کھلا ہوا ہے مگر وہ اس کو چھوڑ کر باطل کے رخ پر چل پڑتا ہے۔ ایک شخص اسٹیشنری کی دکان کرتا ہے۔ محلہ کا ایک آدمی اس کے پاس آیا اور کہا کہ مجھ کو ایک قلم چاہئے۔ اس نے دیکھ کر دس روپیہ کا ایک قلم پسند کیا۔ اس نے کہا کہ یہ مجھے دے دو، میں کل آؤں گا اور اس کی قیمت تم کو ادا کر دوں گا۔ دکان دار نے قلم دے دیا۔ کل آئی اور گزر گئی۔ مگر آدمی نہ دکان پر آیا اور نہ پیسہ ادا کیا۔ یہاں تک کہ ایک ہفتہ گزر گیا۔ ایک ہفتہ کے بعد وہ آدمی دکان دار کو ملا۔ دکان دار نے پیسہ کا تقاضا کیا۔ اب اس آدمی کے لئے دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ وہ کہتا کہ "معاف کیجئے، مجھ سے بھول ہو گئی۔ میں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔ میں ابھی آپ کو پیسہ دیتا ہوں" اس کے بعد وہ دکان دار کو دس روپے ادا کر دے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ دکان دار کا تقاضا سنتے ہی بگڑ گیا۔ اس نے کہا "آپ دس روپے کے لئے مجھ کو بے عزت کر رہے ہیں۔ یہ کوئی مانگنے کا طریقہ ہے۔ آپ کو شرم نہیں آتی۔ کسی شریف آدمی سے کہیں سر بازار پیسہ مانگا جاتا ہے،" وہ اس طرح لڑ جھگڑ کر چلا گیا اور پیسہ نہیں دیا ان دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت تاریکی سے روشنی کی طرف جانے کی صورت ہے اور دوسری صورت روشنی سے تاریکی کی طرف جانے کی۔ جس آدمی کا ساتھی خدا ہو اس کا ذہن خدا کی توفیق سے حق کو ماننے اور امانت کو ادا کرنے کے رخ پر چلتا ہے۔ وہ انکار کے بجائے اعتراف کو اپنا شیوہ بناتا ہے۔ اس کے برعکس جس کا ساتھی شیطان ہو وہ شیطان کی ترغیب سے متاثر ہو جاتا ہے اور اس کا ذہن حق کو جھٹلانے اور امانت کو ادا نہ کرنے کی طرف چلنے لگتا ہے۔ وہ اعتراف کے بجائے انکار کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ انصاف کے بجائے ظلم کے راستہ پر دوڑ پڑتا ہے۔

یہی صورت ہر معاملہ میں پیش آتی ہے، جب بھی کوئی معاملہ سامنے پیش آئے، خواہ وہ ایک دینی پیغام کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا ہو یا لین دین کے ایک معاملہ میں حق کو ادا کرنے یا حق کو ادا نہ کرنے کا سوال ہو، ہر معاملہ میں آدمی کے سامنے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک اجالے کا اور دوسرا اندھیرے کا۔ اگر آدمی کا ساتھی خدا ہو تو اس کے ذہن کی پٹری اعتراف اور تسلیم اور ادائگی حق کے رخ پر چلتی ہے۔ اور اگر اس کا ساتھی شیطان ہو تو وہ اس کے خیال کو

اس طرح موڑتا ہے کہ اس کا ذہن برعکس پٹری پر چل پڑتا ہے۔ وہ ماننے کے بجائے انکار کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ تواضع کے بجائے گھمنڈ کے رخ پر چلنے لگتا ہے۔ ایک شخص ربانی نفسیات کے تحت عمل کرتا ہے اور دوسرا شیطانی نفسیات کے تحت۔

جس شخص کو اندھیرے کے بجائے اجالے کی طرف چلنے کی توفیق ملتی ہے وہ بولنے سے زیادہ چپ دکھائی دیتا ہے، کیوں کہ وہ اپنا احتساب کرنے لگتا ہے۔ وہ حق کو ٹھکرانے کے بجائے حق کو مان لیتا ہے۔ کیوں کہ وہ گھمنڈ کی نفسیات سے خالی ہوتا ہے۔ وہ معاملات میں بے انصافی کے بجائے انصاف پر چلتا ہے، کیوں کہ اس کو ڈر ہوتا ہے کہ وہ آخرت کی عدالت میں پکڑا جائے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ اجالے کے بجائے اندھیرے کی طرف چل پڑتے ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہوتے۔ وہ بے معنی بحثیں چھیڑتے ہیں کیونکہ انھیں یہ یقین نہیں ہوتا کہ ان کو ہر بولے ہوئے لفظ کا حساب دینا ہے۔ وہ اپنی غلطی کو ماننے کے بجائے دوسروں کو الزام دیتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ ہمارے کئے کو رد کرنے والا کوئی نہیں۔ کسی کی عزت پر حملہ یا کسی کے خلاف جارحانہ کارروائی کرنے کا منصوبہ بنانا ان کے لئے بہت آسان ہوتا ہے، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ میں جو چاہوں کروں، میرا کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔

جب آدمی دنیا کو نظر انداز کرکے آخرت کی طرف بڑھتا ہے تو وہ اندھیرے سے اجالے کی طرف جاتا ہے۔ اسی طرح جب آدمی آخرت سے بے پروا ہوکر دنیا کو اپنا لیتا ہے تو وہ اجالے سے اندھیرے کی طرف جاتا ہے۔ یہ عمل آدمی کی زندگی میں ہر روز جاری رہتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے وقت اور پیسے کو ان چیزوں میں نہیں لگاتا جن کا فائدہ آئندہ زندگی میں ملنے والا ہو، بلکہ وہ اپنے وقت اور پیسہ کو ان چیزوں میں لگاتا ہے جن کا فائدہ اس کو آج کی دنیا میں مل جائے۔ جب ایک شخص خاموش دینی خدمت سے بے رغبت ہوتا ہے اور ان کاموں کی طرف دوڑتا ہے جن میں شہرت اور مرتبہ حاصل ہوتا ہو۔ جب ایک شخص ان چیزوں کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے جو دنیا کی رونقوں سے تعلق رکھتی ہیں، وہ چیزیں اس کی روح کی غذا نہیں بنتیں جن کو آخرت میں اللہ نے اپنے وفادار بندوں کے لئے جمع کر رکھا ہے تو ایسی تمام صورتوں میں آدمی اجالے کو چھوڑ کر اندھیرے کی طرف گیا۔

اس کے برعکس معاملہ اس شخص کا ہے جس کے پاس اپنے وقت اور اپنے پیسہ کا مصرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کو اگلی زندگی کی بہتری میں لگائے، وہ نظر آنے والے فائدوں کے مقابلہ میں غیب میں چھپے ہوئے فائدوں پر اپنی جد و جہد کی بنیاد رکھتا ہے، جس کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی شہرتوں اور عزتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا بلکہ ان خاموش کاموں میں لگا رہتا ہے جن کو دنیا کے لوگ نہیں دیکھتے۔ البتہ خدا اور اس کے فرشتے ان کو دیکھتے ہیں۔ جس کی روح خدا کی حمد اور آخرت کی یاد میں پرورش پاتی ہے نہ کہ دنیوی اہمیت والی چیزوں پر۔ ایسا شخص وہ شخص ہے جس کے سامنے اندھیرے کی راہیں کھلی ہوئی تھیں مگر وہ ان کو چھوڑ کر اجالے کی طرف چلا گیا۔ اندھیرے کی طرف سفر کرنے والوں کی منزل دوزخ ہے اور اجالے کی طرف سفر کرنے والوں کی منزل جنت۔

امتحان غیر معمولی حالات میں

قرآن میں کہا گیا ہے: کیا لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ اتنا کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ جانچے نہ جائیں گے۔ حالانکہ ہم نے ان لوگوں کو جانچا ہے جو پہلے تھے۔ پس ضرور ہے کہ اللہ جان لے کہ کون سچے ہیں اور کون جھوٹے ہیں (عنکبوت) اس سے معلوم ہوا کہ کسی کا مومن ہونا یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے کو مومن کہے یا اپنے کو مومن سمجھے۔ مومن حقیقۃً وہ ہے جس کے مومن ہونے کی تصدیق خدا کے یہاں ہو جائے۔ کسی کے ایمان کو اگر خدا جھوٹا ایمان کہہ دے تو اس کے ایمان کی کوئی قیمت نہیں خواہ دنیا میں وہ مومن اعظم کے نام سے پکارا جاتا ہو۔

کسی کے ایمان کے بارے میں خدا کا فیصلہ معمول کے حالات میں نہیں ہوتا بلکہ غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے جس طرح دنیا کی زندگی میں کسی ساتھی یا رشتہ دار کے تعلق کا صحیح پتہ اس وقت چلتا ہے جب کہ کسی قسم کے غیر معمولی حالات پیدا ہو جائیں۔ عام حالات میں کسی ساتھی یا رشتہ دار کی جانچ نہیں ہوتی۔ یہی معاملہ آخرت کا ہے۔ آخرت کی دنیا میں جن لوگوں کو اس قابل سمجھا جائے گا کہ ان کو اللہ کا پسندیدہ بندہ قرار دیا جائے اور ان کے لئے جنت کے دروازے کھولے جائیں وہ وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے غیر معمولی حالات میں اپنی خدا پرستی اور تقویٰ کا ثبوت دیا ہوگا۔ یہ غیر معمولی حالات کیا ہیں، اس سلسلہ میں یہاں چند صورتیں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ ایک صورت وہ ہے جو داعی حق کے اعتراف کے سلسلے میں پیش آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب بھی حق کی دعوت اٹھتی ہے، پردہ داری کی سنت کے تحت اٹھتی ہے۔ یعنی حق کی آواز بلند کرنے کے لئے اللہ ایک ایسے شخص کا انتخاب کرتا ہے جو دیکھنے میں لوگوں کو محض ایک "آدمی" معلوم ہوتا ہو۔ خدا کا داعی ہمیشہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جس کی زندگی میں دو چیزیں اپنی انتہائی صورت میں جمع ہو جاتی ہیں۔ دلائل کا زور اس کے یہاں کامل صورت میں موجود ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ مادی زور کے اعتبار سے اس کو بالکل ناقابل لحاظ بنا دیا جاتا ہے۔ اس طرح مدعو گروہ کو اس امتحان میں ڈالا جاتا ہے کہ اہمیت کے نہ ہوتے ہوئے بھی وہ دلائل کے وزن کو پا سکے۔ وہ داعی کی "ظاہری حیثیت" سے گزر کر اس کو اس کی "چھپی ہوئی حیثیت" میں دیکھے۔ یہ ایک غیر معمولی صورت حال ہوتی ہے اور جو اس غیر معمولی صورت حال میں حق کو پہچان لے وہی خدا کے یہاں ماننے والا اور تسلیم کرنے والا قرار پائے گا۔ ایک طرف وہ پکارنے والے ہیں جن کے گرد و پیش دنیا کی رونقیں جمع ہوتی ہیں۔ دوسری طرف وہ خدا کا بندہ ہے جو ظاہری رونقوں سے خالی ہو کر خالص حق کے لئے آواز دیتا ہے۔ جو لوگ پہلی قسم کی آوازوں پر دوڑیں وہ گویا ظاہری رونقوں پر دوڑے۔ اور جنھوں نے دوسری آواز کو پہچانا اور اس کا ساتھ دیا وہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے خدا کی پکار پر لبیک کہا۔

۲۔ دنیوی تعلقات میں ہم کو دو طرح کے آدمیوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ایک وہ شخص جس سے ہمیں کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ دوسرا وہ شخص جس سے کسی نہ کسی سبب سے ہم کو شکایت ہو جاتی ہے۔ اللہ کا حکم ہے کہ لوگوں

کے ساتھ معاملہ کرنے میں ہم انصاف اور خیر خواہی کا طریقہ اختیار کریں۔ بے انصافی اور بدخواہی کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ مگر اس معاملہ میں اللہ ہم کو جہاں جانچ رہا ہے وہ حقیقۃً وہ لوگ نہیں ہیں جن سے ہم کو شکایت کا موقع پیش نہیں آیا۔ بلکہ وہ لوگ ہیں جن کے خلاف کسی وجہ سے ہمارے اندر شکایت اور تلخی پیدا ہو گئی ہے۔ جب ہم شکایت اور ان بن کے باوجود کسی کے ساتھ معاملہ کرنے میں انصاف سے نہ ہٹیں اس وقت ہم اللہ کے یہاں انصاف کرنے والے قرار پاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو آدمی ان بن پیدا ہونے والے شخص کے ساتھ انصاف نہ کرے وہ اسی مقام پر ناکام ہو گیا جہاں خدا اس کی خدا پرستی کا امتحان لے رہا تھا۔

اسی طرح دنیا کی زندگی میں ہمیں دو طرح کے لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ایک وہ جو کمزور اور ناقابل ذکر ہوں، اور دوسرے وہ جو طاقت ور ہوں یا کسی وجہ سے وہ قابل ذکر بن جائیں۔ پہلی قسم کا ایک آدمی جب ہمارے سامنے آتا ہے اور ہم سے مدد چاہتا ہے تو اس کے پاس اپنی مدد کی طرف مائل کرنے کے لئے کوئی اضافی کشش نہیں ہوتی۔ اگر ہم اس کی مدد نہ کریں تو ہم کو نہ کسی نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے اور نہ بدنامی کا۔ اس کے برعکس طاقت ور کا ساتھ دینے میں بہت سے پہلوؤں سے امید ہوتی ہے کہ اس کا ساتھ بالآخر خود ہمارے لئے مفید بنے گا۔ اسی طرح مثلاً کوئی قومی مصیبت کا معاملہ پیش آجائے تو وہاں یہ کشش موجود ہوتی ہے کہ اس میں شرکت کرنے سے ہماری عزت و شہرت میں اضافہ ہو گا، ہماری قیادت زیادہ مستحکم ہو جائے گی۔ مگر خدا ہماری انسانیت یا مسلم دوستی کو جہاں جانچ رہا ہے وہ حقیقۃً وہ مواقع نہیں ہیں جہاں طاقت اور عزت کی ترغیبات موجود موجود ہوتی ہیں۔ بلکہ خدا کے جانچنے کے مواقع وہ ہیں جہاں ایک کمزور اور ناقابل لحاظ آدمی آپ کے سامنے کھڑا ہو اور اس کی مدد کرنے کے لئے اللہ کی رضا کے سوا کوئی اور محرک موجود نہ ہو۔ اگر آپ طاقت اور شہرت کے مواقع پر تعاون کرنے میں پرجوش ہوں اور ایک کمزور اور معمولی آدمی کا ساتھ دینے میں آپ کو دلچسپی نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ خدا کے امتحان میں پورے نہیں اترے۔

۴۔ اللہ کے لئے عمل کرنے کی ایک صورت وہ ہوتی ہے جب کہ آدمی اپنی زندگی میں کوئی خلل پیدا کئے بغیر دین دار بنا ہوا ہو۔ دوسری صورت وہ ہے جب کہ اپنی بنی بنائی زندگی کو اجاڑ کر دین دار بنا ہو اور جان و مال کو قربان کر کے اللہ کی طرف بڑھنا پڑے۔ اللہ کے مقبول بندوں میں شامل ہونے کے لئے پہلی قسم کی دین داری کافی نہیں۔ اللہ کے یہاں صرف اس کا ایمان و اسلام مقبول ہوتا ہے جو فائدوں اور مصلحتوں کے گھروندے کو توڑ کر اللہ والا بنے۔ اللہ کا دین جب اس سے اس کی جان اور اس کے مال کا تقاضا کرے تو وہ جان و مال کو دے کر اللہ کی طرف بڑھے۔ وہ کسی تحفظ کے بغیر اللہ کے دین کو اپنی زندگی کا دین بنا لے۔ اس کے برعکس جس شخص کا حال یہ ہو کہ وہ بغیر قربانی والے دین کا اہتمام کرے اور قربانی والے دین سے اپنے کو بچا کر رکھے تو ایسے شخص کی اللہ کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ قربانی والے دین سے اپنے کو دور رکھنا گویا اپنے آپ کو اس امتحان ہال میں داخل نہ کرنا ہے جہاں لوگوں کی لیاقتوں کو جانچا جا رہا ہے اور جہاں کی جانچ کے مطابق ہی کسی کے مستقبل کا فیصلہ کیا جانے والا ہے۔

بات کو موقع و محل میں رکھ کر دیکھئے

بنی اسرائیل (یہود) کے درمیان قدیم انبیاء کی بابت بہت سے قصے مشہور تھے۔ ان میں صحیح قصے بھی تھے اور غلط بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی بابت پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: لا تصدقوھم ولا تکذبوھم (ان قصوں کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب) دوسری طرف ایک اور روایت میں آپ نے فرمایا: حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج (بنی اسرائیل سے باتیں نقل کرو، اس میں کوئی حرج نہیں)

بظاہر یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے خلاف معلوم ہوتی ہیں۔ مگر حقیقۃً ان میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ کیوں کہ پہلی بات عام علمائے بنی اسرائیل کی بابت کہی گئی ہے، جب کہ دوسری بات بنی اسرائیل کے ان علماء سے متعلق کہی گئی ہے، جب کہ دوسری بات بنی اسرائیل کے ان علماء سے متعلق کہی گئی ہے جو حق پرست تھے اور جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کی اور ایمان لائے ـــــ کسی بات کو سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ کس موقع و محل میں کہی گئی ہے، اگر بات کو موقع و محل سے ہٹا دیا جائے تو ایک صحیح بات بھی دیکھنے والے کو غلط نظر آئے گی۔

الفاظ دھوکا دیتے ہیں

امام ربیع بن سلیمان مرادی مصری (م ۲۷۰ھ) امام شافعی کے شاگرد اور ان کی فقہ کے راوی ہیں۔ امام شافعی ان کو بہت مانتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اپنے محبوب شاگرد کی بابت کہا: لوددت انی حشوته العلم حشوا (میں چاہتا ہوں کہ ربیع کو علم سے بھر دوں) اسی طرح ایک موقع پر ان کی زبان سے نکلا: اے ربیع! علم اگر کوئی کھلانے والی چیز ہوتی تو میں تم کو اسے کھلا دیتا۔ اس سے بعد کے بعض سیرت نگاروں نے یہ قیاس کر لیا کہ امام ربیع کم فہم تھے اور باتوں کو زیادہ اخذ نہیں کر پاتے تھے۔ قفال مروزی نے اپنے فتاوی میں اسی قسم کا خیال ظاہر کیا ہے۔ مگر یہ محض ایک غلط فہمی ہے۔ امام ربیع کے بعد کے کارنامے اس خیال کی تردید کے لئے کافی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ امام شافعی کا یہ جملہ اپنے شاگردوں کے بارے میں ان کے تعلق خاطر کو بتاتا ہے نہ کہ شاگرد کی کم فہمی کو۔

خود ساختہ مطلب کیسے نکلتا ہے

خواجہ حافظ شیرازی (۷۹۱ - ۷۲۶ھ) کا ایک شعر ہے۔

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد   وائے گر در پئے امروز بود فردائے

اس شعر کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ اسلام اگر اسی عملی حالت کا نام ہے جو مسلمانوں میں نظر آتی ہے تو اس آج سے کوئی بہتر مستقبل پیدا ہونے کی امید نہیں۔ مگر حافظ کے بعض ہم عصر جو ان سے عناد رکھتے تھے انھوں نے اس شعر سے یہ مطلب نکال لیا کہ حافظ عقیدۂ آخرت کے منکر ہیں۔

زبر زیر کے فرق سے

سورۂ حج کی آیت ہے: اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا (۳۹) مسٹر آربری نے اس کا ترجمہ ان لفظوں میں کیا ہے:

Permission is given to those who fight

اجازت دی گئی ان کو (جنگ کی) جو لڑتے ہیں۔ یہ ترجمہ اس وقت صحیح ہوتا جب لفظ یقاتلون (زیر سے) ہوتا۔ جب کہ آیت میں

یقاتلون (زبر سے) ہے۔ یعنی یہ معروف کا صیغہ نہیں ہے بلکہ مجہول کا صیغہ ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہوگا۔

Permission is given to those who are attacked.

اجازت دی گئی ان کو جن سے جنگ کی جاتی ہے۔ صحیح تلاوت کے مطابق یہ آیت بتاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے اپنے دفاع میں تلوار اٹھائی۔ جب کہ مذکورہ ترجمہ سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ آپ جارح تھے اور خود ہی تلوار لے کر دوسروں کے اوپر ٹوٹ پڑے۔

مخاطب کی رعایت سے کلام کرنا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر تم بڑے گناہوں سے بچتے رہے جن سے تمھیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمھاری چھوٹی برائیوں کو معاف کر دیں گے (نساء ۳۱) کسی نے حضرت سفیان ثوری سے پوچھا کہ اس آیت میں بڑے گناہ اور چھوٹے گناہ سے کیا مراد ہے۔ انھوں نے کہا: بڑا گناہ وہ ہے جو بندے اور بندے کے درمیان ہو اور چھوٹا گناہ وہ ہے جو بندے اور خدا کے درمیان ہو (الکبائر ما کان فیہ المظالم بینك وبین عباد اللہ تعالیٰ والصغائر ما کان بینك وبین اللہ تعالیٰ) ظاہر ہے کہ حضرت سفیان ثوری اس بات سے ناواقف نہ تھے کہ قرآن میں شرک کو سب سے بڑا ناقابل معافی گناہ قرار دیا گیا ہے (نساء ۴۸) انھوں نے یہ بات مخاطب کی رعایت سے کہی نہ کہ مطلق معنوں میں۔ ایسے ماحول میں جب کہ لوگ خدا کے حقوق ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہوں مگر بندوں کے معاملہ میں سرکش اور ظالم بنے ہوئے ہوں تو مصلح کو اسی زبان میں کلام کرنا پڑتا ہے جس کا ایک نمونہ سفیان ثوری کے مذکورہ قول میں نظر آتا ہے۔

کچھ سے کچھ مطلب لے لینا

دیہات کی ایک خاتون بہت تیز نماز پڑھتی تھیں۔ رکوع، سجدہ سب بہت جلد جلد کرتی تھیں۔ کسی نے کہا کہ تم نماز میں اتنی تیزی کیوں کرتی ہو، ٹھہر ٹھہر کر کیوں نہیں پڑھتیں۔ خاتون نے فوراً پُر اعتماد لہجہ میں کہا: جس استاد نے مجھ کو نماز سکھائی اس نے کہا تھا کہ "دیکھو، نماز میں کبھی سستی نہ کرنا"۔ استاد کا مطلب یہ تھا کہ نماز کی پابندی میں کمی نہ کرنا، مگر خاتون نے یہ مطلب لے لیا کہ تیز تیز نماز پڑھنا، دھیرے دھیرے نہ پڑھنا۔

بات کا رخ بدل دینے سے

ایک شخص دعا کر رہا تھا: اے میرے خدا، مجھے کھانے کو روٹی دے۔ مجھے پہننے کو کپڑا دے۔ مجھے رہنے کو مکان دے، مجھ کو عزت و آرام کی زندگی دے۔ ایک بزرگ نے سنا تو کہا: تم کیسی دعا کر رہے ہو۔ خدا سے مانگنے کی چیزیں تو کچھ اور ہیں۔ آدمی نے پوچھا: پھر آپ کس طرح دعا کرتے ہیں۔ بزرگ نے کہا: میں اس قسم کی چیزیں نہیں مانگتا۔ میں تو جب دعا کرتا ہوں تو کہتا ہوں: اے میرے خدا، مجھ کو ایمان دے۔ مجھ کو عمل کی توفیق دے۔ آدمی نے یہ سن کر کہا: حضرت آپ ٹھیک ہی دعا مانگتے ہیں۔ کیوں کہ انسان خدا سے دعا کرتا ہے تو وہی چیز مانگتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتی ——— کسی بات کا مطلب سمجھنے کے لیے آدمی کا سنجیدہ ہونا ضروری ہے۔ اگر آدمی بات کو سمجھنے کے معاملہ میں سنجیدہ نہ ہو تو وہ اس کا کچھ سے کچھ مطلب نکال سکتا ہے۔ حتیٰ کہ ایسا مطلب بھی جس کا قائل کی منشا سے کوئی تعلق نہ ہو۔

ہم ان کو اچھا ٹھکانا دیں گے

والذین ھاجروا فی اللہ من بعد ما ظلموا لنبوئنھم فی الدنیا حسنۃ ولاجر الاخرۃ اکبر لو کانوا یعلمون۔ الذین صبروا وعلیٰ ربھم یتوکلون (نحل ۴۲)

اور جنھوں نے ظلم سہنے کے بعد اللہ کے واسطے ہجرت کی ان کو ہم دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے، کاش ان کو معلوم ہوتا۔ جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر بھروسہ کیا۔

حق کی بے آمیز دعوت جب بھی اٹھتی ہے تو وہ تمام لوگ اس کے سخت مخالف ہو جاتے ہیں جو ناحق کو حق بتا کر اپنی قیادت قائم کئے ہوئے ہوں۔ ایسی دعوت ان لوگوں کے لئے اپنی حیثیت کی نفی کے ہم معنی بن جاتی ہے۔ وہ حق کی دعوت کو دبانے اور کچلنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اس کے خلاف شوشے نکال کر اس کو بدنام کرتے ہیں۔ وہ اس کی جڑ اکھاڑنے کے منصوبے بناتے ہیں۔ وہ عوام کو اس سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اس کے خلاف جارحانہ اقدام سے بھی باز نہیں آتے۔ ان مظالم کے مقابلہ میں حق کے داعیوں کے پاس جو سہارا ہوتا ہے وہ صرف صبر اور توکل ہے۔ یعنی اللہ کی خاطر ہر تکلیف کو برداشت کرنا اور اس امید پر اپنا سفر جاری رکھنا کہ اللہ ضرور ان کی مدد فرمائے گا۔ مخالفین کے پاس مادی اسباب ہوتے ہیں اور ان کے پاس خدا کے وہ وعدے ہوتے ہیں جو اس نے حق کے داعیوں سے اپنی کتاب میں کئے ہیں۔ مخالفین کے پاس دنیوی طاقتیں ہوتی ہیں اور ان کے پاس یہ یقین کہ اللہ کا ایک غیبی نظام ہے اور یہ نظام ضرور ان کی مدد کرے گا۔

حق کے داعیوں کو جب اپنے ابتدائی مقام پر کام کرنا ناممکن بنا دیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف سے ایک مُبَوَّءُ (ٹھکانا) فراہم کرتا ہے۔ یعنی ایک ایسی متبادل جگہ جو ان کے لئے دعوتی مرکز کا کام دے۔ جہاں اپنے قدم جما کر وہ زیادہ موثر انداز میں اپنی دعوتی مہم کو جاری رکھ سکیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو مکہ میں یہ مبوء دیا گیا (حج ۲۶) یہود کے لئے شام و فلسطین کی زمین کی مبوء بنا دیا گیا (یونس ۹۳) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو مدینہ کی صورت میں مبوء فراہم کیا گیا (حشر ۹)

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مہربان باپ اپنی جیب سے پیسہ نکالتا ہے اور اپنے چھوٹے بچہ کے ہاتھ میں پکڑا کر کہتا ہے کہ یہ فلاں آدمی کو دے دو۔ ایسا ہی کچھ معاملہ دعوتِ حق کے لئے مبوء کی فراہمی کا ہے۔ یہ اگرچہ ایک خدائی عطیہ ہے مگر ظاہری طور پر کچھ انسانوں کے ذریعہ اس کا انتظام کیا جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اس عظیم خوش قسمتی کے لئے چنتا ہے کہ اس کو دعوت حق کے ساتھ تعاون کرنے والوں میں لکھے تو وہ اس کے دل میں اس کام کی اہمیت ڈال دیتا ہے۔ ہجرت کے بعد مدینہ کے قبائل نے جس طرح باہر کے مسلمانوں کو ٹھکانا دیا اور اپنی جائدادیں اور مکانات ان کے لئے پیش کر دئے وہ انسانی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہے۔ یہ عظیم قربانی اس کے بغیر ممکن نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ خصوصی طور پر ان کے دلوں کو اس طرف مائل کر دے۔

ایک اپیل

اسلامی مرکز ایک خالص تعمیری اور دعوتی ادارہ ہے۔ اس کی تجویز اولاً ہفت روزہ الجمعیۃ ۲۷ نومبر ۱۹۷۰ میں پیش کی گئی تھی۔ اس کے بعد متعدد عرب جرائد نے اس پر مفصل تعارفی مضامین شائع کیے (مثلاً الاسبوع الثقافی، طرابلس ۸ اکتوبر ۱۹۷۰، المجتمع الاسلامی، قاہرہ ۹ نومبر ۱۹۷۰) بیروت اور قاہرہ سے "نحو بعث اسلامی" کے نام سے ۳۲ صفحات پر مشتمل عربی زبان میں ایک تعارفی کتابچہ چھپا جو اب تک سات بار شائع ہو چکا ہے اور عالم اسلام میں پھیلا ہے۔ ۱۹۷۶ میں ایک باقاعدہ رجسٹرڈ ادارہ کی حیثیت سے اسلامی مرکز کا قیام عمل میں آیا

الرسالہ اسی اسلامی مرکز کا ترجمان ہے۔ اس کا پہلا شمارہ اکتوبر ۱۹۷۶ میں نکلا تھا۔ اس مدت میں اللہ نے اس کو غیر معمولی مقبولیت عطا فرمائی۔ اب الرسالہ محض ایک پرچہ نہیں، اب وہ ایک تحریک بن چکا ہے۔ الرسالہ آج نہ صرف ہندستان کے مختلف حصوں میں مسلسل پڑھا جا رہا ہے بلکہ ہندستان کے علاوہ ڈیڑھ درجن بیرونی ملکوں میں بھی اس کی آواز پہنچ رہی ہے۔ عربی زبان میں بھی اس کے مضامین ترجمہ ہو کر شائع ہو رہے ہیں۔

اسلامی مرکز کی یہ تحریک، الرسالہ اور اس کی مختلف مطبوعات کے ذریعہ، ایک ایسے مرحلہ میں پہنچ چکی ہے کہ وقت آگیا ہے کہ اس کو مزید مستحکم اور منظم بنایا جائے اور اسلامی مرکز کے بقیہ منصوبے زیر عمل لائے جائیں۔ اس نئے مرحلہ کے آغاز کے لیے ہم کو سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایک عمارت ہے۔ دہلی میں اسلامی مرکز کی اپنی عمارت ہو جائے تو یہ تحریک زیادہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہو جائے گی اور اس مشن کے تحت دوسرے عملی پروگرام شروع کرنا بھی ممکن ہو جائے گا۔

الرسالہ کے ایک ہمدرد نے دہلی میں اس مقصد کے لیے ایک زمین دینے کی پیش کش کی ہے۔ یہاں تعمیرات کر کے اسلامی مرکز کی اپنی عمارت قائم کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ایک "تعمیر فنڈ" کھول رہے ہیں اور الرسالہ کے مشن سے دلچسپی رکھنے والوں سے تعاون کی اپیل کر رہے ہیں۔ اس فنڈ میں ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق حصہ لے سکتا ہے۔

اسلامی مرکز، دفتر الرسالہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶ (انڈیا)

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتا ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپیے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

چند معیاری مطبوعات

	ہدیہ
تدبر قرآن (جلد اول) مفسر امین احسن اصلاحی۔ اردو، فوٹو آفسٹ	۳۲-۰۰
دی مینِنگ آف گلوریس قرآن مترجم مارماڈیوک پکتھال انگریزی فوٹو آفسٹ پیپربیک	۱۱-۰۰
دی مینِنگ آف گلوریس قرآن مترجم مارماڈیوک پکتھال انگریزی عربی فوٹو آفسٹ	۲۲-۰۰
نماز احکام الصلوٰۃ، خوش نما ٹائیٹل، فوٹو آفسٹ	۵-۰۰
نماز مترجم (مع ضروری مسائل) فوٹو آفسٹ	۱-۵۰
قرآن مصری عکسی نمبر ۳، جدید ترین کتابت، بمعہ پلاسٹک کور	۱۹-۰۰
قرآن مجید، حوالہ نمبر ۵۳، مصری عکسی، ریگزین بائنڈنگ	۱۲-۰۰
حمائل شریف، حوالہ نمبر ۲۳، بمعہ پلاسٹک کور	۱۳-۰۰
اعمال قرآنی، مصری عکسی ریگزین بائنڈنگ	۵-۰۰
قاعدے اور سپارے	
کرامات صحابہ، خوش نما ٹائیٹل، پلاسٹک لیمینیشن	۴-۰۰
نشر الطیب فی ذکر النبی الطیب، خوش نما ٹائیٹل، پلاسٹک لیمینیشن	۹-۰۰
مجموعۂ درود شریف، خوش نما ٹائیٹل، پلاسٹک لیمینیشن	۱-۵۰
آداب زندگی، خوش نما ٹائیٹل، پلاسٹک لیمینیشن	۴-۵۰
نسخۂ کیمیا، خوش نما ٹائیٹل، پلاسٹک لیمینیشن	۷-۵۰
قرآنی نصیحتیں (انگریزی) خوش نما ٹائیٹل، پلاسٹک لیمینیشن	۶-۰۰

ملنے کا پتہ

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان دہلی ۶

REGD. R. N. NO. 23822/76
REGD. D. (D.) NO. 532

June 1980
Issue No. 43

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

اسلام یہ ہے کہ آدمی خدا کی منع کی ہوئی چیزوں سے بچ کر زندگی گزارے ———
روزہ ہر سال یہی سبق دینے کے لئے فرض کیا گیا ہے

شمارہ ۴۴ — زرتعاون سالانہ ۲۴ روپے — قیمت فی پرچہ
جولائی ۱۹۸۰ — خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے — دو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی
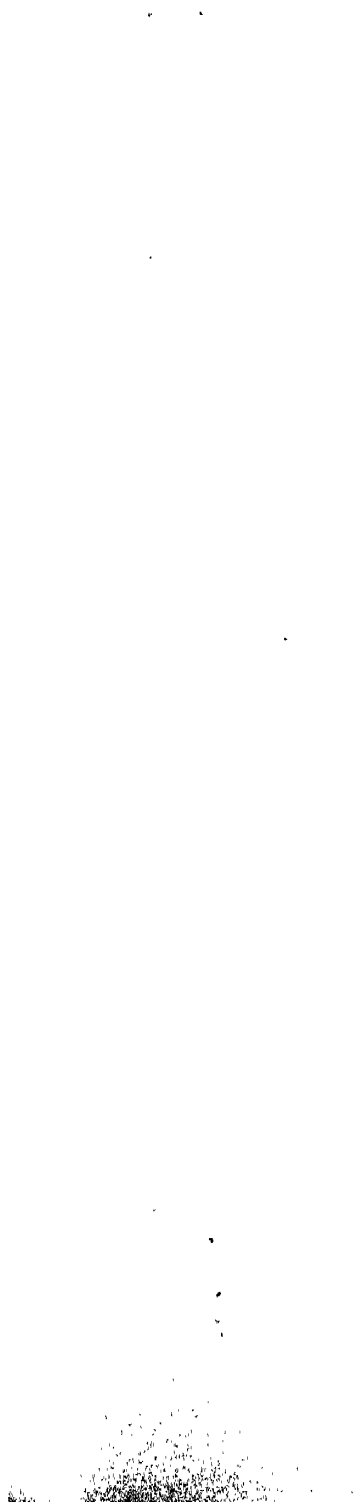
جولائی ۱۹۸۰
شمارہ ۴۴

جمعیۃ بلڈنگ ، قاسم جان اسٹریٹ ، دہلی ۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک اقتباس

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ مسلمان مسلمان کے اوپر نرم ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اہل ایمان کے مقابلہ میں اپنی طاقت کبھی استعمال نہ کرے۔ اس کی ذہانت، اس کی ہوشیاری، اس کی قابلیت، اس کا رسوخ واثر، اس کا مال، اس کا جسمانی زور، کوئی چیز بھی مسلمانوں کو دبانے اور ستانے اور نقصان پہنچانے کے لئے نہ ہو۔ مسلمان اپنے درمیان اس کو ہمیشہ ایک نرم خو، رحم دل، ہمدرد اور حلیم انسان ہی پائیں۔

تفہیم القرآن ، جلد اول ، صفحہ ۴۸۲

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی Al-Risala Monthly لکھیں

اتحاد کی جڑ تواضع

حاجی امداد اللہ صاحب (۱۸۹۹ - ۱۸۱۷) نے فرمایا: اتفاق کی جڑ تواضع ہے۔ اگر ہر شخص کا حال یہ ہو جائے کہ وہ اپنے مقابلہ میں دوسرے کو بہتر سمجھنے لگے تو نااتفاقی کی نوبت ہی نہ آئے۔ کیوں کہ نااتفاقی اسی سبب سے پیدا ہوتی ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو دوسرے سے بہتر سمجھتا ہے اور اپنی ذات کو اور اپنی بات کو ہر حال میں اوپر رکھنا چاہتا ہے جب کوئی اپنے کو بہتر نہ سمجھے تو اس کے بعد اختلاف کس بات پر ہوگا۔

بہت سے لوگ ایک ساتھ رہتے ہوں تو بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے رائے یا مفاد کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر ہر آدمی کے اندر اپنی بہتری کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ میری رائے سب سے اچھی ہے، میرا حق سب سے زیادہ ہے میرے مفاد کا تحفظ سب سے پہلے ضروری ہے۔ یہ احساسات ہر آدمی کو دوسرے آدمی کا حریف بنا دیتے ہیں اور آپس کا اختلاف شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر اگر دونوں فریق اکڑ جائیں تو باہمی اختلاف جنم لیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ایک آدمی تواضع کا انداز اختیار کرلے، وہ اپنی رائے یا اپنے مفاد کو اوپر رکھنے کے بجائے نیچے رکھنے پر راضی ہو جائے تو اس کے بعد اختلاف خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اور معاشرہ میں اتحاد کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہے گی —— اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا نام اتحاد ہے نہ کہ اختلاف کے بغیر متحد ہونے کا۔

یہ ممکن نہیں کہ لوگوں کے درمیان اختلاف اور شکایت پیدا نہ ہو۔ اختلاف اور شکایت کا پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ اس لئے باہمی اتحاد کی صورت صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ لوگ اختلاف سے دل میلا نہ کریں۔ اختلاف کے باوجود باہم متحد ہو کر رہیں۔

جب بادشاہ بھی جھک جاتے تھے

چوتھی صدی ہجری کا واقعہ ہے۔ اندلس میں سلطان عبدالرحمن الناصر کی حکومت تھی۔ اس کا دارالسلطنت قرطبہ تھا۔ قاضی منذر بن سعید اس وقت قرطبہ کے قاضی تھے اور اسی کے ساتھ وہ قرطبہ کی جامع مسجد میں نماز کی امامت کی خدمت بھی انجام دے رہے تھے۔ وہ بہت اچھے خطیب تھے اور اسی کے ساتھ بہت بڑے عالم بھی۔

سلطان عبدالرحمن الناصر کو عمارتوں کا بہت شوق تھا۔ اس نے الزہرار کے نام سے ایک شاہی بستی بسائی اور اس میں شان دار محل تعمیر کئے۔ ان تعمیرات کے آخری دنوں میں سلطان اتنا مشغول رہا کہ مسلسل تین جمعہ میں وہ مسجد نہ پہنچ سکا۔ چوتھے جمعہ کو جب وہ جامع مسجد آیا تو اس کی موجودگی میں قاضی منذر نے جو خطبہ دیا اس میں نام لئے بغیر سلطان پر سخت تنقید کی۔ قاضی منذر نے ایسی آیتیں پڑھیں جن میں دنیا میں عمارتیں کھڑی کرنے اور آخرت سے غافل ہو جانے پر وعیدیں تھیں۔ مثلاً: کیا تم ہر بلندی پر عبث یادگاریں تعمیر کرتے ہو اور شان دار محل بناتے ہو گویا کہ تم کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے۔ اور جب تم کسی پر حملہ کرتے ہو تو جبارانہ حملہ کرتے ہو۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو (شعرار) تمھارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی اور وہ اس کو لے کر جہنم کی آگ میں جا گری۔ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہے، ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی یہاں تک کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اور اللہ علیم و حکیم ہے (توبہ) اسی طرح قاضی منذر نے اس مضمون کی بہت سی حدیثیں سنائیں اور ان کی تشریح کی۔ اپنے خطبہ میں اگرچہ انھوں نے سلطان کا نام نہیں لیا مگر مسجد کا ہر نمازی سمجھ رہا تھا کہ ان سخت تنقیدوں کا مخاطب کون ہے اور وہ کس کے اوپر پڑ رہی ہیں۔

تنقید یوں بھی آدمی کے اوپر بہت سخت ہوتی ہے اور جب مجمع عام میں کسی پر تنقید کی جائے تو وہ اور بھی زیادہ ناگواری کا باعث ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ یہ تنقید ایک ماتحت کی زبان سے اپنے حاکم کے اوپر تھی۔ اور جب کوئی حاکم اپنے ماتحت کو تنقید کرتے ہوئے سنتا ہے تو اس پر کبر کا سخت دورہ پڑتا ہے۔ بڑے بڑے شریف اور دین دار لوگ بھی اس وقت قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ مگر سلطان نے حد درجہ ضبط سے کام لیا۔ اگرچہ

سلطان پر اس تنقید کا بہت زیادہ اثر تھا مگر وہ مسجد میں کچھ نہ بولا اور نماز کے بعد خاموشی سے اٹھ کر باہر آگیا۔

گھر پہنچ کر سلطان نے اپنے لڑکے الحکم سے کہا کہ آج قاضی منذر نے مجھ کو بہت تکلیف دی۔ اب میں نے طے کر لیا ہے کہ ان کے پیچھے جمعہ کی نماز کبھی نہیں پڑھوں گا۔ الحکم نے کہا: قاضی منذر کا امام ہونا یا نہ ہونا آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ ان کو معزول کر دیجئے اور ان کی جگہ دوسرا کوئی امام مقرر کر دیجئے جو ایسی گستاخی نہ کرے۔ یہ سن کر سلطان غصہ میں آگیا۔ اس نے اپنے لڑکے کو ڈانٹ کر کہا: تمھارا برا ہو، ایک شخص جو ہدایت سے دور ہے اور راستہ سے بھٹکا ہوا ہے کیا اس کی خوشی کی خاطر قاضی منذر جیسے خوبیوں والے آدمی کو معزول کر دیا جائے گا۔ یہ بات کبھی نہیں ہو سکتی (ھذا مالا یکون) مجھے ان کی باتوں سے چوٹ لگی اس لئے میں نے ان کے پیچھے جمعہ نہ پڑھنے کی قسم کھالی۔ میری خواہش ہے کہ اس قسم کے کفارہ کی کوئی صورت نکل آئے۔ تاہم قاضی منذر ہماری زندگی میں اور اپنی زندگی میں لوگوں کو نماز پڑھاتے رہیں گے (بل یصلی بالناس حیاتنا وحیاته انشاءاللہ تعالیٰ) چنانچہ قاضی منذر بدستور جمعہ کی نماز پڑھاتے رہے۔ عبدالرحمٰن الناصر کے انتقال کے بعد اس کے لڑکے نے بھی ان کے مقام کو اسی طرح باقی رکھا۔

سلطان عبدالرحمٰن الناصر کے زمانہ میں ایک بار قحط پڑا۔ بہت سخت حالات پیدا ہو گئے۔ سلطان نے اپنا ایک خاص آدمی قاضی منذر بن سعید کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ آپ استسقاء کی نماز پڑھائیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بارش برسائے۔ قاضی منذر نے سلطان کے قاصد سے پوچھا کہ سلطان نے میرے پاس دعا کا پیغام بھیجا ہے مگر وہ خود کیا کر رہے ہیں۔ قاصد نے کہا: آج سے زیادہ ہم نے کبھی ان کو اللہ سے ڈرنے والا نہیں پایا۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ حیران و پریشان ہیں۔ تنہائی میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ مٹی کے فرش پر نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے تھے اور اللہ سے کہہ رہے تھے: خدایا میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے کیا تو میرے گناہوں کی وجہ سے لوگوں کو عذاب دے گا حالاں کہ تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (ھذہ ناصیتی بیدك، اتراك تعذب بی الرعیة وانت ارحم الراحمین)

یہ سن کر قاضی منذر کے چہرے پر اطمینان ظاہر ہو گیا۔ انھوں نے قاصد سے کہا: اپنے ساتھ بارش لے کر واپس جاؤ۔ اب ضرور بارش ہو گی۔ کیوں کہ زمین کا حاکم جب تضرع کرتا ہے تو آسمان کا حاکم ضرور رحم فرماتا ہے (اذا خشع جبار الارض فقد رحم جبار السماء) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قاصد واپس ہو کر گھر پہنچا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔

کلمۂ شہادت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ آدمی صرف اللہ کو اپنا سب کچھ بنائے گا اور اپنی زندگی میں پوری طرح پیغمبر خدا کی تعلیمات کی پابندی کرے گا۔ اب جو شخص کلمہ پڑھنے کے باوجود اپنی سوچ اور اپنی توجہ کا مرکز خدا کے سوا دوسری چیزوں کو بنائے اور اپنی زبان اور اپنے ہاتھ پاؤں کو رسول کے طریقے کا پابند نہ کرے اس کا کلمہ پڑھنا محض فرضی تھا۔ اس کا کلمہ پڑھنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی شخص زبان سے کہے کہ میں مسجد جا رہا ہوں، حالانکہ عملاً وہ کلب کی طرف جا رہا ہو تاکہ وہاں کلب کے ممبروں کے ساتھ تفریح کرے۔

نماز

نماز آدمی کو اللہ سے ڈرنے والا بناتی ہے۔ نماز اس لئے فرض کی گئی ہے کہ وہ آدمی کو متواضع بنائے اور اس کو بری باتوں سے روکے۔ اب جو شخص نماز پڑھنے کے بعد بھی متکبر بنا رہے اور بری باتوں کو چھوڑنے پر راضی نہ ہو اس نے صرف نماز کی شکل کو لیا اور اس کی روح کو چھوڑ دیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بھوکا آدمی برتن چبائے مگر اس کے اندر جو کھانا ہے اس کو منھ میں نہ ڈالے۔

روزہ

روزہ اس بات کا ایک سالانہ سبق ہے کہ آدمی خدا کی منع کی ہوئی چیزوں سے بچ کر زندگی گزارے۔ ایسی حالت میں جو شخص کھانے پینے کا روزہ رکھے اور حسد اور بغض اور جھوٹ اور بے انصافی کو نہ چھوڑے اس نے روزہ رکھ کر بھی روزہ نہیں رکھا۔ اس نے گویا خدا کی جائز کی ہوئی چیزوں سے روزہ رکھا اور خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو بدستور کھاتا رہا۔

زکوٰۃ

زکوٰۃ کا مقصد آدمی کے دل کو حرص اور بخل اور تنگ ظرفی سے پاک کرنا ہے اور ایک آدمی کو دوسرے آدمی کا خیر خواہ بنانا ہے۔ زکوٰۃ کا پیغام یہ ہے کہ تم دوسروں سے بے تعلق نہ رہو بلکہ ان کے معاملات میں ان کے مددگار بنو۔ اب اگر زکوٰۃ دینے کے بعد بھی آدمی کے دل سے خود غرضی اور تنگ ظرفی ختم نہ ہو وہ بدستور اپنے بھائی کا بدخواہ بنا رہے تو گویا کہ اس نے زکوٰۃ نہیں دی بلکہ زکوٰۃ کے نام پر محض ایک قسم کا ٹیکس ادا کیا۔

حج

حج خدا کی طرف سفر ہے۔ حج آدمی کو اس دن کی یاد دلاتا ہے جب کہ وہ دنیا سے نکل کر آخرت کی طرف چلا جائے گا۔ اب اگر حج کرنے کے بعد بھی آدمی دنیا میں غرق ہو۔ دنیا کی مصلحتیں، دنیا کے فائدے، دنیا کے تقاضے اس کی دلچسپیوں کا مرکز بنے رہیں تو اس نے حج کے نام پر ایک دنیوی سیاحت کی نہ کہ خدا کی طرف سفر جس کے بعد آدمی ہمہ تن اللہ والا ہو جاتا ہے۔

سب سے بڑی خبر

ایک ایم سی نوجوان دہلی میں سرکاری ملازم ہیں۔ ان سے میری پرانی ملاقات ہے۔ ایک روز میں کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا، رات کو واپس آیا تو گھر والوں نے بتایا کہ آج مذکورہ نوجوان کئی بار آپ سے ملنے کے لئے آچکے ہیں۔ ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا گیا تو مذکورہ نوجوان تیسری بار مجھ سے ملنے کے لئے دروازے پر موجود تھے۔ مجھ کو دیکھتے ہی وہ مسکرا کر بولے "آج میں آپ کو ایک خوش خبری دینے آیا ہوں" اس کے بعد انھوں نے بتایا کہ میرا پرموشن ہو گیا ہے اور اب میری تنخواہ میں سو روپیہ ماہوار کا اضافہ ہو جائے گا۔

میں نے سوچا کہ آدمی کے پاس اگر کوئی اہم خبر ہو تو وہ اس کو چھپانے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ اہم خبر کو آدمی بتا کر رہتا ہے۔ بلکہ وہ ڈھونڈتا ہے کہ کوئی ملے تاکہ وہ اس کو بتا سکے۔ کسی نے نئی کار خریدی ہو یا نیا مکان بنایا ہو تو اس کا چرچا کئے بغیر وہ رہ نہیں سکتا۔ کسی مجلس میں اگر اس کی کار یا اس کا مکان موضوع گفتگو نہ ہو تو وہ کسی نہ کسی طرح موضوع کو بدل کر ایسے رخ پر لاتا ہے کہ وہ اپنی نئی کار اور نئے مکان کی خبر لوگوں کو دے سکے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ کوئی بھی انسان ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی اہم خبر کو دوسروں کو سنانے کے لئے بے قرار نہ رہتا ہو۔

آج بے شمار آوازیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی پیغام ہے جس کو وہ دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ مگر سنانے والوں کی بھیڑ میں کوئی آخرت کی خبر سنانے والا نہیں۔ کوئی جنت اور جہنم سے آگاہ کرنے والا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بولنے اور لکھنے والوں کے پاس آخرت کی خبر ہی نہیں۔ ہر ایک کے پاس دنیا کی کوئی نہ کوئی خبر ہے۔ آخرت کی خبر کسی کے پاس موجود ہی نہیں۔ اگر کسی کے پاس آخرت کی خبر ہوتی تو وہ اس کو سنائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ بلکہ آخرت کی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر اس کا یہ حال ہوتا کہ اس کے لئے کوئی دوسری خبر، خبر نہ ہوتی جس کو سنانے کے لئے وہ لوگوں کے سامنے کھڑا ہو۔ وہ اپنی ساری طاقت اور سارا وقت بس آخرت کی خبر سنانے میں لگا دیتا، جہنم سے ڈرانے اور جنت کی خوش خبری دینے کے سوا کوئی کام اس کو کام نظر نہ آتا۔

اگر یہ معلوم ہو کہ اگلے چند لمحہ کے بعد بھونچال آنے والا ہے یا آتش فشاں پھٹنے والا ہے تو ہر آدمی اسی کا تذکرہ کرنے میں مشغول ہو گا۔ ہر دوسری بات کو بھول کر لوگ آنے والے ہولناک لمحہ پر بات کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ مگر تقریر کرنے والے تقریریں کر رہے ہیں اور مضامین لکھنے والے مضامین لکھ رہے ہیں مگر یہ سب چیزیں قیامت کے تذکرہ سے اس طرح خالی ہوتی ہیں جیسے کہ لوگوں کو آنے والے ہولناک دن کی خبر ہی نہیں۔

آدمی اکثر اپنے گرد و پیش کے مسائل میں الجھا رہتا ہے، ذاتی یا قومی قسم کے معاشی اور سیاسی اور سماجی واقعات جن کا وہ اپنے آس پاس تجربہ کرتا ہے وہ انھیں کو واقعہ سمجھتا ہے اور انھیں کے چرچے میں مشغول رہتا ہے۔ مگر سب سے بڑا مسئلہ قیامت کا مسئلہ ہے۔ قیامت ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے مگر وہ ہونے والے واقعات میں سب سے بڑا واقعہ ہے، وہ تمام واقعات سے زیادہ اس قابل ہے کہ اس کا چرچا کیا جائے۔

یہ وقت کا سوال ہے نہ کہ قیمت کا

آکسفورڈ یونیورسٹی ۱۱۶۳ء میں قائم ہوئی۔ اس کے ہرے ہرے لان ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ ایک امریکن کروڑپتی نے اس کے لان دیکھے تو وہ ان کو بہت پسند آ گئے۔ انھوں نے چاہا کہ ایسا ہی لان ان کی کوٹھی میں بھی ہو۔

" ایسا لان کتنے ڈالر میں تیار ہو جائے گا "، انھوں نے آکسفورڈ کے مالی سے پوچھا۔

" مفت میں " مالی نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا

" وہ کیسے "

" اس طرح کہ آپ اپنی زمین کو ہموار کرکے اس پر گھاس جما دیجئے۔ جب گھاس بڑھے تو اس کو کاٹ کر اوپر سے رولر پھیر دیجئے۔ اسی طرح پانچ سو برس تک کرتے رہیے۔ جب پانچ سو سال پورے ہوں گے تو ایسا ہی لان آپ کے یہاں تیار ہو جائے گا۔ یہ وقت کا سوال ہے نہ کہ قیمت کا۔"

شام کے وقت سورج آپ کے اوپر غروب ہو جائے اور آپ دوبارہ صبح کا منظر دیکھنا چاہیں تو آپ کو پوری رات تک انتظار کرنا ہوگا۔ رات کا وقفہ گزارے بغیر آپ دوبارہ صبح کے ماحول میں آنکھ نہیں کھول سکتے۔ آپ کے پاس ایک بیج ہے اور آپ اس کو درخت کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ۲۵ سال تک انتظار کریں۔ اس سے پہلے آپ کا بیج ایک سرسبز و شاداب درخت کی صورت میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح قدرت کے تمام واقعات کے ظہور کے لئے ایک " وقت " مقرر ہے۔ کوئی واقعہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ظہور میں نہیں آتا۔

وقت سے مراد وہ مدت ہے جس میں ایک طبعی عمل جاری ہو کر اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ قدرت کے پورے نظام میں یہی اصول کارفرما ہے۔ انسان کے سوا بقیہ کائنات میں یہ اصول براہ راست خدائی انتظام کے تحت قائم ہے اور انسان کو اپنے ارادہ کے تحت اس کو اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ کائنات اپنے پورے نظام کے ساتھ انسان کو یہ عملی سبق دے رہی ہے کہ واقعات کے ظہور کے لئے وہ کون سی حقیقی تدبیر ہے جس کو اختیار کرکے آدمی اس دنیا میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

شخصی زندگی کی تعمیر کا معاملہ ہو یا قومی زندگی کی تعمیر کا، دونوں معاملات میں انسان کے لئے واحد صورت یہ ہے کہ وہ " آغاز " سے اپنا سفر جاری کرے اور مطلوبہ مدت سے پہلے نتیجہ دیکھنے کی تمنا نہ کرے۔ ورنہ اس کا انجام اس مسافر کا ہوگا جو ایک دوڑتی ہوئی ٹرین میں بیٹھا ہو اور اسٹیشن کے آنے سے پہلے اسٹیشن پر اترنا چاہے۔ ایسا مسافر اگر وقت سے پہلے اپنے ڈبہ کا دروازہ کھول کر اتر پڑے تو اس کے بعد وہ جہاں پہنچے گا وہ قبر ہوگی نہ کہ اس کی مطلوبہ منزل ——— ہر کامیابی سب سے زیادہ جو چیز مانگتی ہے وہ وقت ہے۔ مگر کامیابی کی یہی وہ قیمت ہے جو آدمی دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

ذاتی رنجش سے بلند ہو کر

امریکہ کے سابق وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کسنجر کی ایک کتاب چھپی ہے۔ اس کا نام ہے وھائٹ ہاؤس کے سال (The White House Years) اس کتاب میں مصنف نے سابق صدر رچرڈ نکسن کا ۱۹۶۹ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ مسٹر نکسن کے صدر منتخب ہونے سے چند ماہ پہلے ایک انگریز مسٹر جان فری مین نے ان پر سخت تنقید کی تھی۔ انھوں نے عوامی طور پر مسٹر نکسن کے بارے میں کہا تھا: مسٹر نکسن ایک ایسے شخص ہیں جن کا کوئی بھی اصول نہیں سوا اس کے کہ وہ اپنی ذات کی خاطر ہر چیز کو قربان کر دینا چاہتے ہیں۔

He is a man of no principle whatsoever except a willingness to sacrifice everything in the cause of Dick Nixon.

عجیب اتفاق ہے کہ مسٹر نکسن جب امریکہ کے صدر منتخب ہوئے تو اس وقت کے برطانی وزیر اعظم مسٹر ہیرولڈ ولسن نے انھیں مسٹر فری مین کو امریکہ میں برطانی سفیر نامزد کیا۔ مسٹر نکسن کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ انھوں نے مسٹر ولسن کو پیغام بھیجا کہ وہ کسی دوسرے شخص کو اپنا سفیر مقرر کریں جو امریکہ کی نئی حکومت کے لئے زیادہ قابل قبول ہو۔ مگر مسٹر ولسن نے اس تجویز کو نہیں مانا۔ اس میں مزید ناگواری اس وقت پیدا ہوئی جب مسٹر نکسن نے صدر امریکہ کی حیثیت سے برطانیہ کا دورہ کیا۔ ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ (برطانوی وزیر اعظم کی سرکاری قیام گاہ) میں مسٹر نکسن کے اعزاز میں ڈنر کا انتظام کیا گیا۔ اس کے شرکار کی فہرست میں مذکورہ مسٹر فری مین کا نام بھی تھا۔ مسٹر نکسن نے سختی سے چاہا کہ ان کا نام فہرست سے خارج کر دیا جائے۔ مگر ان کی یہ خواہش بھی برطانی وزیر اعظم نے پوری نہ کی۔ یہ بڑا نازک لمحہ تھا۔ ڈنر میں جب مسٹر نکسن جام صحت نوش کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو بالکل خلاف امید انھوں نے سیدھے مسٹر فری مین کی طرف دیکھا اور کہا: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں ایک نیا نکسن ہے۔ اور وہ حیران ہیں کہ کیا یہاں ایک نیا فری مین ہے۔ میں یہ پسند کروں گا کہ پچھلی یادوں کو ہم ماضی کے خانہ میں ڈال دیں۔ آخر کار وہ ایک نئے ڈپلومیٹ ہیں اور میں ایک نیا سیاست داں ہوں۔ دنیا میں امن قائم کرنے کے لئے دونوں اپنی بہترین کوشش کر رہے ہیں۔

Some say there's a new Nixon. And they wonder if there's a new Freeman. I would like to think that that's all behind us. After all, he is the new diplomat and I am the new statesman, trying to do our best for peace in the world.

ڈاکٹر کسنجر لکھتے ہیں کہ فری مین جو عام طور پر ایک مضبوط آدمی سمجھے جاتے ہیں، یہ سن کر تقریباً رو پڑے۔

The usually impurturable Freeman was close to tears,

مسٹر رچرڈ نکسن نے اپنے آپ کو بدل کر مسٹر فری مین کو بھی بدل دیا تھا۔ اس کے بعد فری مین نکسن کے لئے دوسرے فری مین تھے اور نکسن فری مین کے لئے دوسرے نکسن (۸ مئی ۱۹۸۰)

۲۵ پیسے سے

شام کا وقت تھا۔ بارہ سال کا بچہ اپنے گھر میں داخل ہوا، اس کو بھوک لگ رہی تھی۔ وہ اس امید میں تیز تیز چل کر آرہا تھا کہ گھر پہنچ کر کھانا کھاؤں گا اور پیٹ کی آگ بجھاؤں گا۔ مگر جب اس نے اپنی ماں سے کھانا مانگا تو جواب ملا "اس وقت گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے"۔ بچہ کا باپ ایک غریب آدمی تھا۔ وہ محنت کر کے معمولی کمائی کرتا تھا۔ روزانہ کمانا اور روزانہ دکان سے سامان لا کر پیٹ بھرنا یہ اس کی زندگی تھی تاہم ایسا بھی ہوتا کہ کسی دن کوئی کمائی نہ ہوتی اور باپ خالی ہاتھ گھر واپس آتا۔ یہ ان کے لئے فاقہ کا دن ہوتا تھا۔ اس خاندان کی معاشیات کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ تھا: "کام مل گیا تو روزی، کام نہیں ملا تو روزہ"

ماں کا جواب سن کر بچہ کو بڑا صدمہ ہوا " مجھے بھوک لگ رہی ہے اور میرے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں،، وہ چپ ہو کر دیر تک سوچتا رہا۔ اس کے بعد بولا "کیا تمھارے پاس ۲۵ پیسے بھی نہیں ہیں" ماں نے بتایا کہ ۲۵ پیسے اس کے پاس موجود ہیں " اچھا تو لاؤ ۲۵ پیسے مجھے دو" بچہ نے کہا۔ اس نے اپنی ماں سے ۲۵ پیسے لئے۔ اس کے بعد ایک بالٹی میں پانی بھرا۔ دو گلاس لئے۔ ۲۵ پیسے کا برف لے کر بالٹی میں ڈالا اور سیدھا سینما ہاؤس پہنچا۔ یہ گرمی کا زمانہ تھا جب کہ ہر آدمی پانی پینے کے لئے بے تاب رہتا ہے۔ وہاں اس نے آواز لگا کر "ٹھنڈا پانی،، بیچنا شروع کیا۔ اس کا پانی تیزی سے بکنے لگا۔ کئی لوگوں نے بچہ سمجھ کر زیادہ پیسے دئے۔ آخر میں جب وہ خالی بالٹی میں گلاس ڈال کر واپس گھر پہنچا تو اس کے پاس پندرہ روپے ہو چکے تھے۔

اب بچہ روزانہ ایسا ہی کرنے لگا۔ دن کو وہ اسکول میں محنت سے پڑھتا اور شام کو پانی یا اور کوئی چیز بیچ کر کمائی کرتا۔ اسی طرح وہ دس سال تک کرتا رہا، ایک طرف وہ گھر کا ضروری کام چلاتا رہا دوسری طرف اپنی تعلیم کو مکمل کرتا رہا۔ آج یہ حال ہے کہ اس لڑکے نے تعلیم پوری کر کے ملازمت کر لی ہے - اس کو تنخواہ سے ساڑھے سات سو روپے مہینہ مل جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ "شام کا کاروبار" بھی وہ بدستور جاری رکھے ہوئے ہے۔ اپنے چھوٹے سے خاندان کے ساتھ اس کی زندگی بڑی عافیت سے گزر رہی ہے۔ اس کی محنت کی کمائی میں اللہ نے اتنی برکت دی کہ اپنا آبائی ٹوٹا پھوٹا مکان اس نے ازسرنو بنوا لیا۔ سارے محلہ والے اس کی عزت کرتے ہیں ماں باپ کی دعائیں ہر وقت اس کو مل رہی ہیں۔

مشکل حالات آدمی کے لئے ترقی کا زینہ بن سکتے ہیں، بشرطیکہ مشکل حالات آدمی کو پست ہمت نہ کریں بلکہ اس کے اندر نیا عزم پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائیں۔ زندگی میں اصل اہمیت ہمیشہ صحیح آغاز کی ہوتی ہے۔ اگر آدمی اتنے پیچھے سے اپنا سفر شروع کرنے پر راضی ہو جائے جہاں سے ہر قدم اٹھانا آگے بڑھنا ہو تو کوئی بھی چیز اس کو کامیابی تک پہنچنے سے روک نہیں سکتی۔ "۲۵ پیسہ" سے سفر شروع کیجئے۔ کیوں کہ "۲۵ پیسے" سے سفر شروع کرنا ہر ایک کے لئے ممکن ہے۔ اور جو سفر "۲۵ پیسے" سے شروع کیا جائے وہ ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔

موت کے کنارے

سکندر اعظم نے بڑی بڑی فتوحات کیں۔ مگر جب آخر وقت آیا تو اس نے کہا: میں دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ مگر موت نے مجھ کو فتح کر لیا۔ افسوس کہ مجھ کو زندگی کا وہ سکون بھی حاصل نہ ہو سکا جو ایک معمولی آدمی کو حاصل ہوتا ہے۔ نپولین بوناپارٹ کے آخری احساسات یہ تھے: مایوسی میرے نزدیک جرم تھی مگر آج مجھ سے زیادہ مایوس انسان دنیا میں کوئی نہیں۔ میں دو چیزوں کا بھوکا تھا۔ ایک حکومت، دوسرے محبت۔ حکومت مجھے ملی مگر وہ میرا ساتھ نہ دے سکی۔ محبت کو میں نے بہت تلاش کیا مگر میں نے اسے کبھی نہیں پایا۔ انسان کی زندگی اگر یہی ہے جو مجھ کو ملی تو یقیناً انسانی زندگی ایک بے معنی چیز ہے۔ کیوں کہ اس کا انجام مایوسی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ ہارون الرشید ایک بہت بڑی سلطنت کا حکمراں تھا۔ مگر آخر عمر میں اس نے کہا: میں نے ساری عمر غم غلط کرنے کی کوشش کی، پھر بھی میں غم غلط نہ کر سکا۔ میں نے بے حد غم اور فکر کی زندگی گزاری ہے۔ زندگی کا کوئی دن ایسا نہیں جو میں نے بے فکری کے ساتھ گزارا ہو۔ اب میں موت کے کنارے ہوں۔ جلد ہی قبر میرے جسم کو نگل لے گی۔ یہی ہر انسان کا آخری انجام ہے۔ مگر ہر انسان اپنے انجام سے غافل رہتا ہے۔ خلیفہ منصور عباسی کی موت کا وقت آیا تو اس نے کہا: اگر میں کچھ دن اور زندہ رہتا تو اس حکومت کو آگ لگا دیتا جس نے مجھے بار بار سچائی سے ہٹا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک نیکی اس ساری حکومت سے بہتر ہے۔ مگر یہ بات مجھ کو اس وقت معلوم ہوئی جب موت نے مجھے اپنے چنگل میں لے لیا۔

دنیا کے اکثر کامیاب ترین انسانوں نے اس احساس کے ساتھ جان دی ہے کہ وہ دنیا کے ناکام ترین انسان تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت کے قریب پہنچ کر آدمی پر جو کچھ گزرتا ہے اگر وہی اس پر موت سے پہلے گزر جائے تو اس کی زندگی بالکل بدل جائے۔ ہر آدمی جب موت کے کنارے کھڑا ہوتا ہے تو اس کی وہ تمام رونقیں راکھ کے ڈھیر سے بھی زیادہ بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں جن میں وہ اس قدر گم تھا کہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے کی اسے فرصت ہی نہ ملی۔ اس کے پیچھے ایک ایسی دنیا ہوتی ہے جس کو وہ کھو چکا اور آگے ایک ایسی دنیا ہوتی ہے جس کے لئے اس نے کچھ نہیں کیا۔

موت جب سر پر آ جائے اس وقت موت کو یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ موت کو یاد کرنے کا وقت اس سے پہلے ہے۔ جب آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ دوسروں پر ظلم کرے اور اپنی ظالمانہ کارروائیوں کو عین انصاف کہے اس وقت وہ کچھ سوچنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس وقت وہ اپنی انا کی تسکین کے لئے وہ سب کچھ کر ڈالتا ہے جو اس کو نہیں کرنا چاہئے۔ مگر جب اس کی طاقت ختم ہو جاتی ہے، جب اس کے الفاظ جواب دینے لگتے ہیں، جب اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ موت کے بے رحم فرشتہ کے قبضہ میں ہے اس وقت اس کو اپنی غلطیاں یاد آتی ہیں۔ حالاں کہ یاد آنے کا وقت وہ تھا جب کہ وہ غلطیاں کر رہا تھا اور کسی نصیحت کی پروا کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

اسمِ اعظم کیا ھے

ایک بزرگ سے ان کے شاگردوں نے پوچھا کہ اللہ کا اسم اعظم کیا ہے۔ بزرگ نے فرمایا: جب آدمی کا پیٹ غذا سے خالی ہو اور اس کا دل کینہ سے خالی ہو تو وہ اللہ کے ناموں میں سے جس نام سے بھی اپنے رب کو پکارے گا وہی اسم اعظم ہوگا (تذکرۃ الاولیاء) گویا اسم اعظم کا تعلق "اسم" سے نہیں بلکہ کیفیت سے ہے۔ اسم اعظم وہ ہے جو اعلیٰ کیفیات کے ساتھ زبان سے نکلے۔ کیفیات کی عظمت کسی اسم کو اسمِ اعظم بناتی ہے نہ کہ حروف تہجی کی عظمت۔ پیٹ خالی ہونا اس بات کی علامت ہے کہ آدمی مادیات کے غلبہ سے آزاد ہے اور دل میں کینہ نہ ہونا بتاتا ہے کہ آدمی اپنے سینہ میں کسی قسم کی نفسیاتی پیچیدگی لئے ہوئے نہیں ہے۔ جب کوئی آدمی اپنے کو مادی رونقوں سے اور انسانی شکایتوں سے اوپر اٹھالیتا ہے تو وہ خدا کے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ اس کو خدا کے خصوصی فیضان میں سے حصہ ملنے لگتا ہے۔ ایسے وقت میں خدا کے صفاتی ناموں میں سے کوئی نام جب اس کی زبان پر آتا ہے تو وہ ربانی کیفیات میں نہایا ہوا ہوتا ہے۔ ان کیفیات کے ساتھ جو بہتر نام آدمی کی زبان سے نکلے وہی اس کے لئے اسم اعظم ہے۔

کچھ لوگ اسلام کے معاملہ کو پاک کلمات کا ایک پراسرار معاملہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام کے کچھ خاص عربی الفاظ ہیں جن میں طلسماتی اوصاف چھپے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان پاک الفاظ کو یاد کرلے اور زبان سے ان کو ادا کرے تو ان کی صرف ادائگی سے کراماتی نتائج ظاہر ہونا شروع ہو جائیں گے۔ دنیا میں آل واولاد میں برکت ہوگی اور آخرت میں جنتی محل بننے لگیں گے۔ ان کے نزدیک ان بابرکت کلمات میں سب سے زیادہ اونچا "اسم اعظم" ہے۔ مگر یہ محض بے بنیاد خیال ہے جس کا کوئی ثبوت کتاب وسنت میں موجود نہیں۔ اسم اعظم حقیقۃً حروف کے کسی مجموعہ کا نام نہیں بلکہ کیفیات کے مجموعہ کا نام ہے۔ اللہ کو جب کوئی بندہ اس طرح یاد کرتا ہے کہ وہ ہر دوسری چیز سے اپنا رخ موڑ کر صرف اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ میں اپنے آپ کو اس طرح شامل کرتا ہے کہ انسانوں کے لئے اس کے دل میں خیر خواہی کے سوا کوئی اور جذبہ باقی نہیں رہتا تو اس وقت اس کی زبان سے اللہ کے لئے جو کلمات نکلتے ہیں، اسی کا نام اسم اعظم ہے۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے "کہو کہ تم اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکاروگے تو اس کے سب نام اچھے ہیں" (بنی اسرائیل) اللہ خالق بھی ہے اور مالک بھی وہ رحیم بھی ہے اور اکبر بھی۔ وہ سب کچھ ہے۔ جس برتر نام سے بھی آدمی اس کو پکارے وہ اس کے لئے جائز ہوگا۔ البتہ پکارنے والے کی زبان سے نکلنے والا ایک لفظ کبھی اس کے لئے "اسم اعظم" بن جاتا ہے۔ یہ پکارنے والے کی کیفیت پر ہوتا ہے۔ اللہ کو اس کی صفتوں میں سے کسی صفت سے پکارنا کبھی سادہ اور عام حالت میں ہوتا ہے اور کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ خدا کا نام لیتے ہوئے آدمی کی شخصیت پھٹ پڑتی ہے۔ خدا کا نام لینا اس کی روح میں برپا ہونے والے طوفان کی آواز ہوتا ہے۔ اس طرح دل کے بھونچال کے ساتھ خدا کا نام لینا عام حالت میں اس کا نام لینے سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ اس کی زبان سے ادا ہونے والے اسم کو اسم اعظم بنا دیتا ہے۔ بندہ جب اللہ کی عظمتوں کے احساس سے سرشار ہو اور اس کی سرشاری زبان پر لفظ کی صورت میں ڈھل جائے تو یہی اللہ کو اسم اعظم کے ساتھ یاد کرنا ہے۔

اللہ کی نعمتیں بے شمار ہیں

ابن عساکر نے ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا ایک قول نقل کیا ہے۔ انھوں نے کہا: من لم یر ان للہ علیہ نعمۃ الا فی الاکل والشرب فقد قل فہمہ وحضر عذابہ (حلیۃ الاولیاء جلد ۱) جس شخص نے یہ نہ جانا کہ کھانے پینے کے سوا بھی اس کے اوپر اللہ کی نعمتیں ہیں، اس کی سمجھ بہت کم ہے اور عذاب اس کے لئے تیار ہے۔

اللہ سے تعلق روح کی غذا ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ ایک کھلانے والا مجھے کھلاتا ہے اور ایک پلانے والا مجھے پلاتا ہے (انی ابیت لی مُطعِم یطعمنی وساق یسقینی)

ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہو

ابن ابی شیبہ نے ضحاک سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خلیفہ ثانی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابوموسیٰ اشعری رض کو ایک خط میں نصیحت کرتے ہوئے لکھا: کونوا من اللہ علی وجل وتعلموا کتاب اللہ فانہ ینابیع العلوم وربیع القلوب (کنزالعمال جلد ۸ صفحہ ۲۰۸) اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ کی کتاب کو سیکھو کیوں کہ وہ علوم کی سرچشمہ اور دلوں کے لئے موسم بہار ہے۔

اللہ کی رحمتوں کی کوئی حد نہیں

ابن ماجہ نے محمد بن کعب قرظی کے واسطہ سے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

ما کان اللہ لیفتح باب الشکر ویخزن باب المزید وما کان اللہ لیفتح باب الدعاء ویخزن باب الاجابۃ وما کان اللہ لیفتح باب التوبۃ ویخزن باب المغفرۃ (کنزالعمال جلد ۲)

اللہ ایسا نہیں کرتا کہ وہ کسی کے اوپر شکر کا دروازہ کھولے اور زیادتی کے دروازہ کو بند کردے۔ اللہ ایسا نہیں کرتا کہ دعا کا دروازہ کھولے اور قبولیت کے دروازہ کو بند کردے۔ اللہ ایسا نہیں کرتا کہ توبہ کے دروازہ کو کھولے اور مغفرت کے دروازہ کو بند کردے۔

اللہ کے سوا کسی کو کوئی اختیار نہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضمام بن ثعلبہ رض کو بھیجا کہ وہ اپنے قبیلہ بنو سعد بن بکر کے لوگوں کو توحید کا پیغام پہنچائیں۔ حضرت ضمام نے آکر اپنی قوم کو بت پرستی سے روکا اور کہا: بئست اللات والعزیٰ (کیسے برے ہیں لات اور عزیٰ کے بت) لوگوں نے جواب دیا: مہ یا ضمام! اتق البرص اتق الجذام واتق الجنون (رکوا ضمام۔ برص سے ڈرو، جذام سے ڈرو، پاگل پن سے ڈرو۔ لات اور عزیٰ ان کے بزرگوں کے مجسمے تھے جن کو وہ پوجنے لگے تھے۔ ان کو ڈر ہوا کہ بزرگوں کو برا کہنے سے کہیں ایسا نہ ہو کہ ضمام بن ثعلبہ پاگل ہوجائیں یا ان کو برص اور جذام جیسی بیماری ہوجائے۔ انھوں نے کہا: ویلکم انہما واللہ لایضران ولا ینفعان (سیرۃ ابن ہشام) تمھارا برا ہو۔ خدا کی قسم لات اور عزیٰ نہ تو کوئی نقصان کرسکتے اور نہ نفع پہنچا سکتے۔

جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے

ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: کیا ہم آپ کی پہرہ داری نہ کریں۔ آپ نے فرمایا: آدمی کی تقدیر اس کی پہرہ داری کرتی ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق آپ نے فرمایا: وانہ لا یجد طعم الایمان حتی یعلم ان ما اصابہ لم یکن لیخطئہ وما اخطأہ لم یکن لیصیبہ (ابوداؤد) ایمان کی لذت آدمی اس وقت تک نہیں پاتا جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ جو کچھ اس پر گزرا ہے وہ اس سے چوکنے والا نہ تھا اور جو کچھ اس پر نہیں گزرا وہ اس پر گزرنے والا نہ تھا۔

ایک معمولی چیز بھی بہت بڑی نعمت ہے

ابن ابی الدنیا اور ابن عساکر نے عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول نقل کیا ہے: ما من عبد یشرب الماء القراح فیدخل بغیر اذی ویخرج بغیر اذی الا وجب علیہ الشکر (کنز العمال جلد ۲) ایک بندہ سادہ پانی پئے۔ اور وہ پانی تکلیف کے بغیر اندر داخل ہو جائے اور تکلیف کے بغیر باہر نکل جائے تو اس پر اللہ کا شکر واجب ہے۔

اسلام اس لئے ہے کہ آدمی اس کے ساتھ جئے

عن حمید بن عبد الرحمٰن بن عوف ان رجلا اتیٰ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: یا رسول اللہ علّمنی کلماتٍ اعیشُ بھن ولا تکثر علی فانسیٰ۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا تغضب (موطا الامام مالک، کتاب الجامع)

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ اے خدا کے رسول مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جس کے ساتھ میں جیوں اور لمبا نہ کیجئے کہ میں بھول جاؤں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غصہ نہ کر

اللہ سے اس حال میں ملو کہ کسی کا بوجھ تم پر نہ ہو

ایک شخص نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ مجھے بتائیے کہ علم کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا: علم کی باتیں اس سے زیادہ ہیں کہ میں ان کو تمھیں لکھوں۔ مختصر یہ کہ اگر تم سے ہو سکے تو اللہ سے اس طرح ملو کہ تم نے اپنی زبان مسلمانوں کی عزت پر حملہ کرنے سے روکا ہو۔ تمھاری پیٹھ ان کے خون سے ہلکی ہو۔ تمھارا پیٹ ان کے مال سے خالی ہو۔ تم نے اپنے آپ کو مسلمانوں کی جماعت سے باندھ رکھا ہو (کتب رجل الی ابن عمر رضی اللہ عنہ یسألہ عن العلم فاجابہ: ان العلم اکثر من ان اکتب بہ الیک ولکن اذا استطعت ان تلقی اللہ کافّ اللسان عن اعراض المسلمین، خفیف الظھر من دمائھم، خمیص البطن من اموالھم، لازما لجماعتھم فافعل)

آدمی غیر معمولی حالات میں پہچانا جاتا ہے

لا یعرف الحلم الا ساعۃ الغضب۔ حلم و بردباری کی پہچان صرف اس وقت ہوتی ہے جب کہ آدمی غصہ کی حالت میں ہو (ابن عبد البر، جامع بیان العلم و فضلہ، جزء ثانی، صفحہ ۱۵۵)

یہ قیادت ہے، خدمت نہیں

سی کو ناحق ستانا، کسی کو بلا وجہ بے عزت کرنا اس زمین پر سب سے بڑا ناقابل معافی جرم ہے۔ جو لوگ ایسا جرم کریں وہ
للہ کے غضب کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ ایسے جرم کی سزا ان کو اِس دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لئے
سخت عذاب ہے، خواہ وہ بزعم خود اپنے کو کتنا ہی بڑا مسلمان سمجھتے ہوں۔ کتنی سنگین ہے یہ صورت حال۔ اس کے باوجود
آدمی دوسرے کو ناحق ستاتا ہے، وہ بلا وجہ دوسرے کو بے عزت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی براہ راست یا بالواسطہ طور
پر اس جرم میں شریک رہتے ہیں جو اسی نام پر اپنی قیادت قائم کئے ہوئے ہیں کہ وہ خدا کی زمین کو ظلم و فساد سے پاک کرنے
کے لئے اٹھے ہیں۔ شاید لوگوں کو معلوم نہیں کہ "عدل" کے الفاظ بولنا اور "ظلم" پر عمل کرنا اللہ کی نظر میں آدمی کے جرم کو بڑھاتا
ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس کے جرم کو کم نہیں کرتا۔ کوئی آدمی عادل ہے یا ظالم، اس کا فیصلہ آدمی کے حقیقی عمل کی
بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ بولے اور لکھے ہوئے الفاظ کی بنیاد پر۔ مزید یہ کہ ظالم صرف وہ نہیں ہے جس نے اپنے ہاتھوں سے ظلم
کیا۔ بلکہ وہ لوگ بھی یکساں طور پر ظالم ہیں جنھوں نے ظالم کو شہ دی ہو، جنھوں نے قدرت کے باوجود ظالم کا ہاتھ نہ پکڑا ہو،
جو ظالم کے ظلم کو دیکھنے اور جاننے کے باوجود اس پر راضی رہے ہوں۔ اللہ کے یہاں یہ سارے لوگ ایک ساتھ اٹھائے
جائیں گے۔ آخرت میں ان میں سے ایک کا جو انجام ہوگا وہی انجام ان میں سے دوسرے کا بھی ہوگا

"بہت سے شاعر اپنے اشعار میں انسان دوست ہوتے ہیں، مگر ان کو زید، عمر، بکر سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی"

یہ بات جو ادبی ناقد نے شاعروں کے بارے میں کہی ہے، وہی ہمارے قائدین کے بارے میں صد فی صد درست ہے۔
ہمارا ہر قائد ملت کی ہمدردی کی باتیں کرتا ہے۔ وہ ملت کے مسائل پر تقریریں کرتا ہے اور بیان دیتا ہے۔ کہیں فساد
ہو جائے تو فوراً ہوائی جہاز سے اڑ کر وہاں حالات کا جائزہ لینے کے لئے جاتا ہے۔ ملی مسائل کے بارے میں حکومت کے
ذمہ داروں سے ملاقاتیں کرتا ہے اور بڑے بڑے اجتماعات میں ان کی بابت تجویزیں پاس کرتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ جس "ملت"
کے بارے میں ہوتا ہے، اسی ملت کا ایک فرد اگر اس سے ہمدردی اور انصاف کی مانگ کرے تو اس کو سخت مایوسی ہوتی ہے۔ وہ
"ملت" پر قربان ہونے کے لئے تیار ہے مگر "فرد" کو اس کا حق دینے کے لئے تیار نہیں۔ جمشید پور کے فساد کے زمانہ کا واقعہ
ہے۔ ایک لیڈر اپنے مکان سے باہر نکلا تو اس کے محلہ کا ایک آدمی اس کے سامنے آگیا۔ اس آدمی کو لیڈر کے کارندے
نے پریشان کر رکھا تھا۔ آدمی نے اس کی شکایت کی اور صورت حال بتائی۔ مگر لیڈر نے پوری بات سننے کی زحمت نہیں
کی۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا "مجھے اس وقت کی فلائٹ سے جمشید پور جانا ہے"۔ لیڈر ہوائی جہاز کے ذریعہ جمشید پور
پہنچا۔ اگلے دن "بذریعہ ٹیلیفون" موصول شدہ خبر اس کے اپنے اخبار میں چھپی کہ لیڈر محترم نے جمشید پور کا دورہ کیا
اور وہاں اقلیتی فرقہ کے ساتھ جو بربریت کی گئی ہے اس کے سلسلے میں حکام سے ملاقاتیں کیں" ——— یہی ہمارے
تمام لیڈروں کا حال ہے۔ ملت پر فدا ہونے کے لئے ہر شخص بے قرار ہے مگر فرد ملت پر فدا ہونے کی فرصت کسی کو نہیں۔
"اڑنے" کی سطح پر ہر آدمی مظلوموں کا ہمدرد ہے مگر "کرنے" کی سطح پر کوئی مظلوموں کا ہمدرد نہیں۔ (۸ اپریل ۱۹۸۰)

علمی جہاد — انفاق فی سبیل اللہ کا بہترین مصرف

اسلام کا مطلب اپنے جان اور مال کو اللہ کے حوالے کرنا ہے۔ یہ حوالگی مکمل معنوں میں ہے۔ تاہم ایک خاص حد تک اس کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ زکوٰۃ اسی قسم کا ایک حکم ہے جو یاد دلاتا ہے کہ آدمی کے مال میں خدا اور اس کے دین کا بھی حق ہے۔

قرآن میں زکوٰۃ کے جو مصارف بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک فی سبیل اللہ (توبہ ۶۰) ہے۔ یعنی اللہ کے راستہ میں دینا۔ اس سلسلے میں فی سبیل اللہ کا مفہوم متعین کرنے کے لئے بہت سی علمی و فقہی بحثیں کی گئی ہیں۔ شیخ یوسف القرضاوی (قطر) نے اس موضوع پر اپنی تحقیقی کتاب "فقہ الزکوٰۃ" میں مفصل اور مدلل گفتگو کی ہے اور آخر میں یہ فیصلہ دیا ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد صرف قتال نہیں ہے، نہ شخصی تملیک اس کے لئے ضروری ہے، بلکہ عمومی نوعیت کا تربیتی اور علمی جہاد بھی اس میں داخل ہے۔ (اور شاید آج مسلمان اس کے سب سے زیادہ ضرورت مند ہیں) ذیل میں شیخ یوسف القرضاوی کی بحث کا ایک حصہ نقل کیا جاتا ہے۔ شیخ موصوف لکھتے ہیں:

"موجودہ حالات میں فی سبیل اللہ سے جو اولین اور اہم ترین چیز مراد لی جائے گی وہ ہے صحیح اسلامی زندگی کے احیاء کا وہ پروگرام جو اسلام کے جملہ احکام، عقائد، تصورات، شعائر، شرعی قوانین اور اخلاق و آداب کو بروئے کار لانے کے لئے ہو۔

یہ کام اس قدر اہم اور ضروری ہے کہ اسلام کے غیرت مندوں کو اپنی زکوٰۃ کا مال اور اپنی اعانتیں اس پر صرف کرنی چاہئیں۔

ہماری رائے یہ ہے کہ بحالات موجودہ زکوٰۃ کے اس مصرف کو ثقافتی، تربیتی اور علمی جہاد کے لئے استعمال کرنا بہتر ہوگا۔ بشرطیکہ وہ خالص اور صحیح اسلامی جہاد ہو۔

عصر حاضر میں اسلام کے پیغام کو عام کرنے کے لئے جن سرگرمیوں کی ضرورت ہے۔ اس کی چند مثالیں ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا شمار بجا طور پر فی سبیل اللہ میں کیا جا سکتا ہے۔

- صحیح اسلام کو پیش کرنے کے لئے دعوتی مراکز قائم کرنا جن کے ذریعہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں ادیان و مذاہب کی کش مکش کے درمیان غیر مسلمین تک اسلام کا پیغام پہنچایا

سورہ توبہ (آیت ۶۰) میں صدقات کے آٹھ مصارف بیان کئے گئے ہیں جن میں سے پہلے چار مصارف — (فقراء، مساکین، عاملین، مولفۃ القلوب) کے لئے حرف لام استعمال ہوا ہے۔ یعنی یہ کہا گیا کہ صدقات "ان کے لئے" ہیں۔ مگر بعد کے چار مصارف (غلام، قرضدار، سبیل اللہ، مسافر) کے لئے حرف فی استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہا گیا کہ صدقات ان کی مد میں صرف کرنے کے لئے ہیں۔ پہلے چار مستحقین کے لئے لام ہے جو تملیک کا معنی دیتا ہے۔ بقیہ چار مستحقین کے لئے فی ہے جو عربی زبان میں ظرفیت کے لئے آتا ہے —— حکم کے الفاظ میں اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ پہلی چار اصناف کو زکوٰۃ اس طور پر ملتی ہے کہ وہ اس کی مالک ہو جاتی ہیں جب کہ بقیہ چار اصناف کی حیثیت چار مدات کی ہے (فقہ الزکوٰۃ از شیخ یوسف القرضاوی، قطر)

اسکے یقیناً جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

اسلامی ممالک کے اندر ایسے اسلامی مراکز قائم کرنا بھی جہاد فی سبیل اللہ میں شامل ہے جو مسلم نوجوانوں کی صحیح تربیت کریں۔ اسلام کے اعتدال پسندانہ نقطۂ نظر کے مطابق ان کی رہنمائی کریں، الحاد، فکری انحراف اور عملی بے راہ روی سے انھیں بچائیں اور انھیں اسلام کی حمایت ونصرت اور اس کے دشمنوں سے نبرد آزمائی کے لئے تیار کریں۔

اسی طرح خالص اسلامی پرچہ کا اجراء جو گمراہ صحافت کے درمیان اللہ کا کلمہ بلند کرنے حق بات کا اظہار کرنے، اسلام پر عائد کئے جانے والے جھوٹے الزامات کی تردید کرنے، شبہات کا ازالہ کرنے، اور اسلام کو ہر قسم کی حاشیہ آرائی اور شائبوں سے پاک کرکے صحیح شکل میں پیش کرنے کی خدمت انجام دے ——— بلاشبہ جہاد فی سبیل اللہ ہے

ایسی دینی کتاب کی وسیع پیمانہ پر اشاعت جو بنیادی اہمیت کی حامل ہو اور جو اسلام کو یا اس کے کسی پہلو کو اس خوبی کے ساتھ پیش کرے کہ اس کے پوشیدہ جواہر پر سے پردہ اٹھ جائے۔ اس کی تعلیمات کی خوبیاں نمایاں ہوں اور اس کے حقائق بے نقاب ہوں جہاد فی سبیل اللہ کے مترادف ہے۔

پختہ کار، امانت دار اور مخلص افراد کو فارغ کرنا تاکہ وہ دین کی خدمت کریں، اس کی روشنی چار دانگ عالم میں پھیلائیں، اس کے دشمنوں کی چالوں کو بے اثر کرکے رکھ دیں۔ فرزندان اسلام میں بیداری پیدا کریں اور عیسائی مشن، الحاد اور اباحیت کے طوفان کا مقابلہ کریں من جملہ جہاد فی سبیل اللہ کے ہے اور دین حق کے داعیوں کی معاونت کرنا جن پر خارج سے اسلام دشمن طاقتیں داخلی عناصر۔ مرتد اور سرکش افراد۔ کی مدد سے مسلط ہو جاتی ہیں اور انھیں طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دینے لگتی ہیں۔ ان کی معاونت کرنا تاکہ وہ کفر اور سرکشی کے مقابلہ میں ثابت قدم رہیں سراسر جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ زکوٰۃ کے صرف میں ایسے کاموں کو اولین اہمیت دیں کیوں کہ اسلام کے مددگار اللہ کے بعد فرزندانِ اسلام ہی ہیں اور خاص طور سے ایسے دور میں جب کہ اسلام غربت سے دوچار ہے۔

فقہ الزکوٰۃ، ترجمہ از مولانا شمس پیرزادہ۔ بمبئی

اسلامی مرکز

ایک رجسٹرڈ ادارہ ہے

اس کا مقصد تعمیر ملت اور

احیاء اسلام کے لیے

جد وجہد کرنا ہے

ماہنامہ الرسالہ اور مکتبہ الرسالہ

اسی مرکز کے تحت قائم ہیں

اس دینی وملی مہم میں

ہر طرح تعاون کرنا

وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے

اے ایمان والو، ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس نے پہلے نازل کی۔ اور جو شخص انکار کرے اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور آخرت کے دن کا تو وہ بہک کر دور جا پڑا۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے پھر انکار کیا، پھر ایمان لائے پھر انکار کیا، پھر انکار میں بڑھتے گئے تو اللہ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا اور نہ ان کو راہ دکھائے گا۔ منافقوں کو خوش خبری دے دو کہ ان کے لئے ایک دردناک عذاب ہے۔ وہ لوگ جو مومنوں کو چھوڑ کر منکروں کو دوست بناتے ہیں، کیا وہ ان کے پاس عزت کی تلاش کر رہے ہیں، تو عزت ساری اللہ کے لئے ہے ۱۳۹-۱۳۶

"ایمان والو ایمان لاؤ" ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ مسلمانو مسلمان بنو۔ اپنے کو مسلمان کہنا یا مسلمان سمجھنا اس بات کے لئے کافی نہیں کہ آدمی اللہ کے یہاں بھی مسلمان قرار پائے۔ اللہ کے یہاں صرف وہ شخص مسلمان قرار پائے گا جو اللہ کو اس طرح پائے کہ وہی اس کے یقین و اعتماد کا مرکز بن جائے۔ جو رسول کو اس طرح مانے کہ ہر دوسری رہنمائی اس کے لئے بے حقیقت ہو جائے۔ جو آسمانی کتاب کو اس طرح اپنائے کہ اس کی سوچ اور جذبات بالکل اس کے تابع ہو جائیں۔ جو فرشتوں کے عقیدہ کو اس طرح اپنے دل میں بٹھائے کہ اس کو محسوس ہونے لگے کہ اس کے دائیں بائیں ہر وقت خدا کے چوکیدار کھڑے ہوئے ہیں۔ جو آخرت کا اس طرح اقرار کرے کہ وہ اپنے ہر قول و فعل کو آخرت کی میزان پر جانچنے لگے۔ جو شخص اس طرح مومن بنے وہی اللہ کے نزدیک اس راستہ پر ہے جو ہدایت اور کامیابی کا راستہ ہے۔ اور جو شخص اس طرح مومن نہ بنے وہ ایک بھٹکا ہوا انسان ہے، خواہ وہ اپنے نزدیک خود کو کتنا ہی مومن و مسلم سمجھتا ہو۔

ماننے اور نہ ماننے کا یہ معرکہ آدمی کی زندگی میں ہر وقت جاری رہتا ہے۔ جب بھی کوئی معاملہ پڑتا ہے تو آدمی کا ذہن دو میں سے کسی ایک رخ پر چل پڑتا ہے۔ یا خواہشات کی طرف یا حق کے تقاضے پورے کرنے کی طرف۔ اگر ایسا ہو کہ معاملہ کے وقت آدمی کی سوچ اور جذبات خواہش کی سمت میں چل پڑیں تو گویا ایمان لانے والے نے ایمان سے انکار کیا۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنی سوچ اور جذبات کو حق کا پابند بنائے تو گویا ایمان لانے والا ایمان لے آیا۔ آدمی مسلمان بن کر دنیا کی زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک حق بات اس کے سامنے آتی ہے۔ اب ایک شخص وہ ہے جو ایسے موقع پر تواضع کا رویہ اختیار کرے اور حق کا اعتراف کرے۔ دوسرا شخص وہ ہے جس کے اندر کبر کی نفسیات جاگ اٹھیں اور وہ اس کو ٹھکرا دے۔ پہلی صورت ایمان کی صورت ہے اور دوسری صورت ایمان کا انکار کرنے کی۔ جو شخص سچا مومن نہ ہو وہ دنیا کی عزت و جاہ کو پسند کرتا ہے اس لئے وہ ان لوگوں کی طرف جھک پڑتا ہے جن سے منسوب ہو کر اس کی عزت و جاہ میں اضافہ ہو، خواہ وہ اہل باطل ہوں۔ اس کو ان لوگوں سے دلچسپی نہیں ہوتی جن سے منسوب ہونا اس کی عزت و جاہ میں اضافہ نہ کرے، خواہ وہ اہل حق ہوں۔

اور اللہ کتاب میں تم پر یہ حکم اتار چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا جارہا ہے اور ان کا مذاق کیا جارہا ہے تو تم ان کے ساتھ نہ بیٹھو یہاں تک کہ وہ دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔ ورنہ تم بھی انھیں جیسے ہو گئے۔ اللہ منافقوں کو اور کافروں کو جہنم میں ایک جگہ اکٹھا کرنے والا ہے۔ وہ منافق تمھارے لئے انتظار میں رہتے ہیں۔ اگر تم کو اللہ کی طرف سے کوئی فتح حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے۔ اور اگر منکروں کو کوئی حصہ مل جائے تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا۔ تو اللہ ہی تم لوگوں کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا اور اللہ ہرگز کافروں کو مومنوں پر کوئی راہ نہیں دے گا ۱۴۱-۱۴۰

اللہ کی پکار جب بھی کسی انسانی گروہ میں اٹھتی ہے تو اتنی مضبوط بنیادوں پر اٹھتی ہے کہ دلیل کے ذریعہ اس کی کاٹ کرنا کسی کے لئے ممکن نہیں رہتا۔ اس لئے کہ جو لوگ اس کو ماننا نہیں چاہتے وہ اس کا مذاق اڑا کر اس کو بے وزن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو لوگ ایسا کریں وہ اپنے اس رویہ سے یہ بتا رہے ہیں کہ وہ حق کے معاملہ کو کوئی سنجیدہ معاملہ نہیں سمجھتے اور جب آدمی کسی معاملہ میں سنجیدہ نہ ہو تو اس وقت اس سے بحث کرنا بالکل بے کار ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی چپ ہو جائے اور اس وقت کا انتظار کرے جب کہ گفتگو کا موضوع بدل جائے اور مخاطب اس قابل ہو جائے کہ وہ بات کو سن سکے۔ جس مجلس میں خدا کی دعوت کا مذاق اڑایا جائے وہاں بیٹھنا یہ ثابت کرتا ہے کہ آدمی حق کے معاملہ میں غیرت مند نہیں۔

منافق اس کی پروا نہیں کرتا کہ اصول پسندی کا تقاضا کیا ہے بلکہ جس چیز میں فائدہ نظر آئے اس طرف جھک جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس حلقہ کے ساتھ جوڑتا ہے جس کا ساتھ دینے میں اس کے دنیوی حوصلے پورے ہوتے ہوں، خواہ وہ اہل ایمان کا حلقہ ہو یا غیر اہل ایمان کا۔ وہ جس مجلس میں جاتا ہے اس کو خوش کرنے والی باتیں کرتا ہے۔ مصلحتوں کی بنا پر کبھی اس کو سچے اہل ایمان کے ساتھ جڑنا پڑے تب بھی وہ دل سے ان کا خیر خواہ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ سچے اہل ایمان کا وجود کسی معاشرہ میں حق کا پیمانہ بن جاتا ہے۔ اس لئے جو لوگ جھوٹی دین داری پر کھڑے ہوئے ہوں وہ چاہتے ہیں کہ ایسے پیمانے ٹوٹ جائیں جو ان کی دین داری کو مشتبہ ثابت کرنے والے ہیں۔ مگر اہل ایمان کے بدخواہ جو کچھ زور دکھا سکتے ہیں اسی دنیا میں دکھا سکتے ہیں۔ آخرت میں وہ ان کے خلاف کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔

منافق وہ ہے جو بظاہر دین دار مگر اندر سے بے دین ہو۔ ایسے شخص کا انجام کافر کے ساتھ ہونا بتاتا ہے کہ اللہ کے نزدیک ظاہری دین داری اور کھلی ہوئی بے دینی میں کوئی فرق نہیں۔ کیوں کہ ظاہر کی سطح پر خواہ دونوں مختلف نظر آئیں مگر باطن کی سطح پر دونوں ایک ہوتے ہیں۔ اور اللہ کے یہاں اعتبار باطن کا ہے نہ کہ ظاہر کا۔

نافقین اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں۔ حالاں کہ اللہ ہی نے ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔
ر جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں محض لوگوں کو دکھانے کے لئے۔
ر وہ اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ وہ دونوں کے بیچ لٹک رہے ہیں، نہ ادھر ہیں اور نہ اُدھر۔ اور جس کو اللہ
ٹکادے تم اس کے لئے کوئی راہ نہیں پاسکتے۔ اے ایمان والو، مومنوں کو چھوڑ کر منکروں کو اپنا دوست
بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کی کھلی حجت قائم کر لو۔ بے شک منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے
بقہ میں ہوں گے اور تم ان کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔ البتہ جو لوگ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں اور اللہ
مضبوطی سے پکڑ لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر لیں تو یہ لوگ ایمان والوں کے ساتھ ہوں گے
ور اللہ ایمان والوں کو بڑا ثواب دے گا۔ اللہ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر گزاری کرو اور ایمان
اؤ۔ اللہ بڑا قدرداں ہے سب کچھ جاننے والا ہے ۱۴۷-۱۴۲

جو لوگ اپنے کو اللہ کے حوالے کئے ہوئے نہ ہوں وہ اپنے کو اپنے دنیوی مفاد کے حوالے کئے ہوئے ہوتے
ہیں۔ دنیوی مفاد جس سے وابستہ ہو وہ اسی کے ساتھ ہو جاتے ہیں خواہ وہ دین دار ہو یا بے دین۔ ایسے لوگ
زبان سے اسلام کے الفاظ بولتے ہیں اور بعض اسلامی اعمال بھی ظاہری حد تک ادا کرتے رہتے ہیں۔ مگر ان کا
عمل اللہ کے لئے نہیں ہوتا۔ بلکہ لوگوں کی نظر میں مسلمان بنے رہنے کے لئے ہوتا ہے۔ ان کا اصلی دین موقع پرستی ہوتا
ہے مگر لوگوں کے سامنے وہ اپنے کو خدا پرست ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگ گویا خدا کو دھوکا دے رہے
ہیں۔ وہ خدا والے نہ ہو کر اپنے کو خدا والا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اسلام کو سچا دین جانتے ہیں، اس کے باوجود
اپنے مفادات کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اس کی وجہ سے وہ دونوں کے درمیان معلق رہتے ہیں، نہ پوری طرح اپنے
عقیدہ کے لئے یکسو ہوتے اور نہ پوری طرح اپنے مفادات کے۔ ایسے لوگ اللہ کی مدد سے محروم رہتے ہیں۔
کیوں کہ اللہ کی مدد کا مستحق بننے کے لئے اللہ کے راستہ پر جمنا ضروری ہے۔ اور یہی چیز ان کے یہاں موجود
نہیں ہوتی ـــــ حق کو ماننے والے اور حق کا انکار کرنے والے جب الگ الگ ہو چکے ہوں تو ایسی حالت
میں حق کا انکار کرنے والوں کا ساتھ دینا اپنے خلاف خدا کی کھلی حجت قائم کرنا ہے۔ یہ کسی کے قابل سزا ہونے
کا ایسا ثبوت ہے جس کے بعد کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں۔

اس قسم کے لوگ اپنے دکھاوے کے اعمال کی بنا پر خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔ اسلام کی ظاہری نمائش
کے باوجود حقیقت کے اعتبار سے وہ اسلام سے دور تھے اس لئے ان کا انجام بھی ان کی حقیقت کے اعتبار سے
ہوگا نہ کہ ان کے ظاہر کے اعتبار سے۔ تاہم کسی کی گمراہی کی وجہ سے خدا اس کا دشمن نہیں ہو جاتا۔ اس قسم کے لوگ اگر
اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں، وہ اپنی زندگی کو بدلیں، اپنی توجہات کو ہر طرف سے موڑ کر اللہ کی طرف لگائیں اور یکسو
ہو کر دین کے راستہ پر چلنے لگیں تو یقیناً اللہ انھیں معاف کر دے گا۔

اللہ بدگوئی کو پسند نہیں کرتا مگر یہ کہ کسی پر ظلم ہوا ہو اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اگر تم بھلائی کو ظاہر کرو یا اس کو چھپاؤ یا کسی برائی سے درگزر کرو تو اللہ معاف کرنے والا قدرت رکھنے والا ہے۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ میں ایک راہ نکالیں۔ ایسے لوگ پکے کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کو جدا نہ کیا ان کو اللہ ان کا اجر دے گا اور اللہ غفور رحیم ہے ۱۴۸ ــ ۵۲

کسی شخص کے اندر کوئی دینی یا دنیوی عیب معلوم ہو تو اس کو شہرت دینا اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ نصیحت کا حق ہر ایک کو ہے۔ مگر نصیحت یا تو کسی کا نام لئے بغیر عمومی انداز میں کی جانی چاہئے یا متعلقہ شخص سے مل کر تنہائی میں۔ اللہ صبح و شام لوگوں کے جرائم کو نظر انداز کرتا رہتا ہے۔ بندوں کو بھی اپنے اندر یہی اخلاق پیدا کرنا ہے البتہ اگر ایک شخص مظلوم ہو تو اس کے لئے رخصت ہے کہ وہ ظالم کے ظلم کو لوگوں کے سامنے بیان کرے۔ تاہم مظلوم اگر صبر کرے اور ظلم کرنے والے کو معاف کر دے تو یہ اس کے حق میں زیادہ بہتر ہے۔ کیوں کہ اس طرح وہ ثابت کرتا ہے کہ اس کو دنیا کے نقصان سے زیادہ آخرت کے نقصان کی فکر ہے۔ جو شخص کسی بڑے غم میں مبتلا ہو اس کے لئے چھوٹے غم بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔ یہی حال اس شخص کا ہوتا ہے جس کے دل میں آنے والے ہولناک دن کا غم سمایا ہوا ہو۔

مکہ کے لوگ حضرت ابراہیمؑ کی نبوت کو مانتے تھے۔ اسی طرح یہودی حضرت موسیٰ کی نبوت کو تسلیم کرتے تھے اور مسیحی حضرت عیسیٰ کی نبوت کو۔ مگر ان سب نے پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے ہر ایک ماضی کے پیغمبر کو ماننے کے لئے تیار تھا مگر ان میں سے کوئی وقت کے پیغمبر کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوا۔ حالاں کہ جن نبیوں کو وہ مان رہے تھے وہ بھی اپنے زمانہ میں اسی قسم کے مخالفانہ ردعمل سے دوچار ہوئے تھے جس سے پیغمبر عربی کو دوچار ہونا پڑا ــــــ اس قسم کی ہر کوشش حق پرستی اور نفس پرستی کے درمیان راستہ نکالنے کے لئے ہوتی ہے تاکہ خواہشات کا ڈھانچہ بھی ٹوٹنے نہ پائے اور آدمی خدا کی جنت تک پہنچ جائے۔

اصل یہ ہے کہ ماضی کی نبوت ایک مانی ہوئی نبوت ہوتی ہے جب کہ وقت کے پیغمبر کو ماننے کے لئے آدمی کو نیا ذہنی سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ ماضی کی نبوت زمانہ گزرنے کے بعد ایک تسلیم شدہ نبوت بن جاتی ہے۔ وہ پیدائشی طور پر آدمی کے ذہن کا جزء دین چکی ہوتی ہے۔ مگر زمانہ کا پیغمبر ایک متنازعہ شخصیت ہوتا ہے، وہ دیکھنے والوں کو محض "ایک انسان" دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے اس کو ماننے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ آدمی ایک نیا ذہنی سفر کرے۔ وہ خدا کو دوبارہ شعور کی سطح پر پائے۔ ماضی کے پیغمبر کو ماننا تقلیدی ایمان کے تحت ہوتا ہے اور وقت کے پیغمبر کو ماننا ارادی ایمان کے تحت۔ مگر اللہ کے یہاں قیمت ارادی ایمان کی ہے نہ تقلیدی ایمان کی۔

ں کتاب تم سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ تم ان پر آسمان سے ایک کتاب اتار لاؤ۔ پس موسیٰ سے وہ اس سے بھی بڑی چیز کا
طالبہ کر چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اللہ کو بالکل سامنے دکھا دو۔ پس ان کی اس زیادتی کے باعث ان پر
ل آپڑی۔ پھر کھلی نشانی آچکنے کے بعد انھوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ پھر ہم نے اس سے درگزر کیا۔ اور
وسیٰ کو ہم نے کھلی حجت عطا کی۔ اور ہم نے ان کے اوپر کوہ طور کو اٹھایا ان سے عہد لینے کے واسطے۔ اور
م نے ان سے کہا کہ دروازے میں داخل ہو سر جھکائے ہوئے اور ان سے کہا کہ سبت کے معاملہ میں
یادتی نہ کرنا۔ اور ہم نے ان سے مضبوط عہد لیا ۱۵۳-۵۴

خدا کا پیغمبر انسانوں میں سے ایک انسان ہوتا ہے۔ وہ عام آدمی کی صورت میں لوگوں کے سامنے
تا ہے۔ اس لئے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایک عام آدمی کو کس طرح خدا کا نمائندہ مان لیں۔ وہ کیسے
قین کر لیں کہ سامنے کا آدمی ایک ایسا شخص ہے جو خدا کی طرف سے بولنے کے لئے مقرر ہوا ہے۔ چنانچہ وہ
ہتے ہیں کہ جو کلام تم پیش کر رہے ہو اس کو آسمان سے آتا ہوا دکھاؤ یا خدا خود تمھاری تصدیق کے لئے
سمان سے اتر پڑے تب ہم تمھاری بات مانیں گے۔ مگر اس قسم کا مطالبہ حد درجہ غیر سنجیدہ مطالبہ ہے۔ کیونکہ
نسان کا امتحان تو یہ ہے کہ وہ دیکھے بغیر مانے، وہ حقیقتوں کو ان کی معنوی صورت میں پالے۔ ایسی حالت
میں دکھا کر منوانے کا کیا فائدہ۔ نیز یہ کہ اگر کچھ دیر کے لئے عالم کے نظام کو بدل دیا جائے اور آدمی کو اس
کے مطالبہ کے مطابق چیزوں کو دکھا دیا جائے تب بھی وہ بے فائدہ ہوگا۔ کیوں کہ یہ دکھانا بہرحال وقتی ہوگا نہ کہ
مستقل۔ اور انسان کی آزادی جو اس کو سرکشی کی طرف لے جاتی ہے اس کے بعد بھی باقی رہے گی۔ نتیجہ یہ
ہوگا کہ دیکھنے کے وقت تک وہ سہم کر مان لے گا اور اس کے بعد دوبارہ اپنی آزادی کا غلط استعمال شروع
کر دے گا جیسا کہ دیکھنے سے پہلے کر رہا تھا۔ یہود کی مثال اس کی تاریخی تصدیق کرتی ہے۔

کوہ طور کے دامن میں غیر معمولی حالات پیدا کر کے یہود سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ وہ اپنے عبادت خانہ
(باب) میں تواضع کے ساتھ داخل ہوں اور خشوع کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں۔ اور یہ کہ معاش کے حصول کے
لئے جو جد و جہد کریں وہ اللہ کے حدود میں رہ کر کریں نہ کہ اس سے آزاد ہو کر۔ مگر یہود نے اس قسم کے تمام
عہدوں کو توڑ دیا۔

"موسیٰ کو ہم نے سلطان مبین (کھلی حجت) دی" اللہ کا یہ معاملہ ہر پیغمبر کے ساتھ ہوتا ہے۔ پیغمبر
اگرچہ ایک عام انسان کی طرح ہوتا ہے مگر اس کے کلام اور اس کے احوال میں ایسے کھلے ہوئے دلائل موجود
ہوتے ہیں جو اس کی خدائی حیثیت کو قطعیت کے ساتھ ثابت کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر ظالم انسان ہر
خدائی نشانی کی ایک ایسی توجیہہ ڈھونڈ لیتا ہے جس کے بعد وہ اس کو رد کر کے اپنی سرکشی کی زندگی
کو بدستور جاری رکھے۔

ان کو جو سزا ملی وہ اس پر کہ انھوں نے اپنے عہد کو توڑا اور اس پر کہ انھوں نے اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا اور اس پر کہ انھوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا اور اس کہنے پر کہ ہمارے دل تو بند ہیں ــــــ بلکہ اللہ نے ان کے انکار کے سبب سے ان کے دلوں پر مہر کردی ہے تو وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔ اور ان کے انکار پر اور مریم پر بڑا طوفان باندھنے پر اور ان کے اس کہنے پر کہ ہم نے مسیح بن مریم، اللہ کے رسول کو قتل کر دیا ــــــ حالاں کہ انھوں نے نہ اس کو قتل کیا اور نہ سولی دی بلکہ معاملہ ان کے لئے مشتبہ کر دیا گیا۔ اور جو لوگ اس میں اختلاف کر رہے ہیں وہ اس کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کو اس کا کوئی علم نہیں، وہ صرف اٹکل پر چل رہے ہیں۔ اور بے شک انھوں نے اس کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھالیا اور اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے　۱۵۵ ـ ۵۸

یہود پر آسمانی ہدایت اتاری گئی تھی جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ وہ دنیا میں اللہ کی مرضی پر چلیں تو آخرت میں اللہ ان کو جنت دے گا۔ انھوں نے پہلے حصہ کو بھلا دیا البتہ دوسرے حصہ کو اپنا پیدائشی حق سمجھ لیا۔ یہود ہر قسم کے بگاڑ میں مبتلا ہوئے۔ اس کے باوجود اپنے نجات یافتہ ہونے کے بارے میں ان کا یقین اتنا بڑھا ہوا تھا کہ انھوں نے سمجھ لیا کہ اب ان کو نئے نبی کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ وہ بطور طنز کہتے "ہمارے دل تو بند ہیں" ان کا یہ جملہ رسول کو ماننے کے بارے میں اپنی عدم صلاحیت کا اظہار نہ تھا بلکہ اس اطمینان کا اظہار تھا کہ وہ رسول کے ساتھ خواہ جو بھی سلوک کریں ان کی نجات کسی حال میں مشتبہ ہونے والی نہیں۔

جو لوگ اس قسم کے جھوٹے یقین میں مبتلا ہوں وہ ہر قسم کے جرم پر جری ہو جاتے ہیں۔ خدا پر ایمان ان کو جس عہد خداوندی میں باندھتا ہے اس کو توڑنا ان کے لئے کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ اللہ کی طرف سے ظاہر ہونے والے کھلے دلائل کے باوجود وہ اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ حق کی طرف بلانے والے جو ان کی غیر خدا پرستانہ روش کو بے نقاب کرتے ہیں ان کے خلاف جارحانہ اقدام کرنے سے وہ نہیں جھجکتے۔ حتی کہ جھوٹی تہمت لگا کر داعی کو بے عزت کرنے سے بھی انھیں کوئی چیز نہیں روکتی۔ یہود نے حضرت مسیح کے خلاف قتل کا اقدام کیا اور اس کے بعد فخریہ کہا کہ "مریم کا بیٹا مسیح جو اپنے کو رسول کہتا تھا اس کو ہم نے مار ڈالا"۔ مگر اس قسم کے لوگ اللہ کے داعیوں کے خلاف جو بھی سازش کریں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اللہ کی طاقت اور اس کا حکیمانہ نظام ہمیشہ حق کے داعیوں کی پشت پر ہوتا ہے۔ ہر سازش اور ہر مخالفت کے باوجود وہ اس وقت تک اپنا کام جاری رکھنے کی توفیق پاتے ہیں جب کہ وہ اپنے حصہ کا کام مکمل کرلیں۔

جو لوگ حق کے مقابلہ میں سرکشی کا رویہ اختیار کریں اللہ ان سے حق کو قبول کرنے کی صلاحیت چھین لیتا ہے۔ وہ اپنی مخالفانہ سرگرمیوں کو جاری رکھتے ہیں یہاں تک کہ خدا کے فرشتے ان کو مجرم کی حیثیت سے پکڑ کر خدا کی عدالت میں حاضر کر دیتے ہیں۔

اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا۔ پس یہود کے ظلم کی وجہ سے ہم نے وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو ان کے لئے حلال تھیں۔ اور اس وجہ سے کہ وہ اللہ کی راہ سے بہت روکتے تھے۔ اور اس وجہ سے کہ وہ سود لیتے تھے حالاں کہ اس سے انھیں منع کیا گیا تھا اور اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کا مال باطل طریقہ سے کھاتے تھے۔ اور اور ہم نے ان میں سے کافروں کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ مگر ان میں جو لوگ علم میں پختہ اور ایمان والے ہیں وہ ایمان لائے ہیں اس پر جو تمھارے اوپر اتاری گئی اور جو تم سے پہلے اتاری گئی اور وہ نماز کے پابند ہیں اور زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں اور اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہم ضرور بڑا اجر دیں گے ۱۵۹-۶۲

عکرمہ کہتے ہیں کہ کوئی یہودی یا عیسائی نہیں مرے گا یہاں تک کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے (لا یموت النصرانی ولا الیہودی حتی یؤمن بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم) یہود و نصاری کے پاس آسمانی علم تھا ایسے لوگ یہ سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتے تھے کہ پیغمبر عربی کی دعوت خالص خدائی دعوت ہے۔ مگر پیغمبر عربی کو ماننا اور ان کے مشن میں اپنا مال اور اپنی زندگی لگانا ان کو دنیوی مصلحتوں کے خلاف نظر آتا تھا۔ اس بنا پر انھوں نے آپ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ مگر جب موت آدمی کے سامنے آتی ہے تو اس قسم کی تمام مصلحتیں باطل ہوتی ہوئی نظر آنے لگتی ہیں۔ اس وقت آدمی کے ذہن سے تمام مصنوعی پردے ہٹ جاتے ہیں اور حق اپنی کھلی صورت میں سامنے آجاتا ہے۔ موت کے دروازے پر پہنچ کر آدمی اس چیز کا اقرار کر لیتا ہے جس کو وہ موت سے پہلے ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ مگر اس وقت کے اقرار کی اللہ کی نظر میں کوئی قیمت نہیں۔

جب کوئی گروہ خدائی دین کے بجائے خود ساختہ دین کو اختیار کرتا ہے تو وہ اپنی دینی حیثیت کو ظاہر کرنے کے لئے کچھ خود ساختہ نشانات بھی قائم کرتا ہے۔ وہ اپنے مزاج اور اپنے حالات کے لحاظ سے حرام و حلال کے نئے قاعدے بناتا ہے اور ان کا خصوصی اہتمام کر کے ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ دین پر قائم ہے۔ ایسے لوگوں کا دین بعض ظاہری چیزوں کے اہتمام پر مبنی ہوتا ہے نہ کہ اللہ والا بننے پر۔ چنانچہ وہ اس سے نہیں ڈرتے کہ اللہ کے منع کئے ہوئے طریقوں سے دنیوی فائدے حاصل کریں اور اللہ کے لئے ہوتے والے کام کا راستہ روکیں۔ ایسے لوگوں کا انجام اللہ کے یہاں بے دینوں کے ساتھ ہوگا نہ کہ دین داروں کے ساتھ۔

یہودیوں میں چند لوگ (عبداللہ بن سلام وغیرہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور آپ کا ساتھ دیا۔ جو لوگ انسانی اضافوں سے گزر کر اصل آسمانی دین سے آشنا ہوتے ہیں، جو عصبیت اور تقلید اور مفاد پرستی کی ذہنیت سے آزاد ہوتے ہیں ان کو سچائی کو سمجھنے اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی۔ وہ ہر قسم کے ذہنی خول سے باہر آکر سچائی کو دیکھ لیتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی جنتوں میں داخل کئے جائیں گے۔

ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی ہے جس طرح ہم نے نوح اور اس کے بعد کے نبیوں کی طرف وحی بھیجی تھی۔ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف وحی بھیجی تھی۔ اور ہم نے داؤد کو زبور دی۔ اور ہم نے ایسے رسول بھیجے جن کا حال ہم تم کو پہلے سنا چکے ہیں اور ایسے رسول بھی جن کا حال ہم نے تم کو نہیں سنایا۔ اور موسیٰ سے اللہ نے کلام کیا۔ اللہ نے رسولوں کو خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت باقی نہ رہے اور اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے ۱۶۳-۶۵

اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور پھر جنت اور جہنم بنائی۔ اس کے بعد انسان کو زمین پر بسایا۔ یہاں انسان کو آزادی ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ مگر یہ آزادی مستقل نہیں ہے بلکہ وقتی ہے اور امتحان کے لئے ہے۔ وہ اس لئے ہے تاکہ اچھے اور برے کو چھانٹا جائے۔ خدا یہ دیکھ رہا ہے کہ لوگوں میں کون وہ شخص ہے جو اپنی آزادی کے باوجود حقیقت پسندی کا رویہ اختیار کرتا ہے اور اپنے کو اللہ کا بندہ بنا کر رکھتا ہے اور کون وہ ہے جو اپنی آزادی کا غلط استعمال کرکے بتاتا ہے کہ وہ ایک سرکش انسان ہے۔ دنیا میں دونوں قسم کے لوگ ملے ہوئے ہیں۔ دونوں کو یہاں یکساں طور پر خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہے۔ مگر امتحان کی مقررہ مدت پوری ہونے کے بعد دونوں گروہ ایک دوسرے سے الگ کر دئے جائیں گے۔ پہلے گروہ کو ابدی طور پر جنت کے باغوں میں بسایا جائے گا اور دوسرے گروہ کو ابدی طور پر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

زندگی کے بارے میں اللہ کا یہ منصوبہ انسان کو بڑی نزاکت میں ڈال رہا ہے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی مختصر زندگی کا انجام دو انتہائی صورتوں میں سامنے آنے والا ہے، یا ابدی راحت یا ابدی عذاب۔ اس لئے اللہ نے رہنمائی کے دوسرے فطری انتظامات کے علاوہ پیغمبروں اور کتابوں کے بھیجنے کا انتظام کیا تاکہ کوئی شخص زندگی کی حقیقت سے بے خبر نہ رہے اور فیصلہ کے دن یہ نہ کہہ سکے کہ ہم کو الٰہی منصوبہ کا پتہ نہ تھا کہ ہم اپنی زندگی کو اس کے مطابق بناتے۔

اللہ کے اس منصوبہ کے لازمی معنی یہ ہیں کہ شروع سے آخر تک آنے والے تمام نبیوں کا پیغام اور منصبی فریضہ ایک ہو۔ جب تمام انسان ایک ہی امتحان کی ترازو میں کھڑے ہوئے ہیں تو ان کے امتحان کا پرچہ ایک دوسرے سے مختلف کیسے ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام نبیوں کا پیغام ایک تھا اور اسی ایک پیغام سے انھوں نے تمام انسانوں کو باخبر کیا۔ اور وہ یہ کہ ہر آدمی ایک ایسے نازک مقام پر کھڑا ہوا ہے جس کے ایک طرف جنت ہے اور دوسری طرف جہنم۔ وہ ایک طرف چلے تو جنت میں پہنچے گا اور دوسری طرف چلے تو جہنم میں جا گرے گا —— تمام نبیوں کی دعوت ایک تھی۔ البتہ زمانی ضرورت کے اعتبار سے ان کو خدا کی تائید مختلف صورتوں میں ملی۔ اللہ کی یہ سنت آج بھی باقی ہے۔ ڈرانے اور خوش خبری سنانے کا پیغمبرانہ کام کرنے کے لئے آج جو لوگ اٹھیں گے وہ اپنے حالات کے لحاظ سے یقیناً اللہ کی خصوصی تائید کے مستحق ہوں گے تاکہ وہ اپنی دعوتی ذمہ داری کو مؤثر طور پر جاری رکھ سکیں۔

۔ اللہ گواہ ہے اس پر جو اس نے تمہارے اوپر اتارا ہے کہ اس نے اس کو اپنے علم کے ساتھ اتارا ہے اور فرشتے
ی گواہی دیتے ہیں اور اللہ گواہی کے لئے کافی ہے۔ جن لوگوں نے انکار کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا وہ بہک کر
ہت دور نکل گئے۔ جن لوگوں نے انکار کیا اور ظلم کیا ان کو اللہ ہرگز نہیں بخشے گا نہ ہی ان کو جہنم کے ۔ ۔ کوئی راستہ
کھائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور اللہ کے لئے یہ آسان ہے۔ اے لوگو، تمہارے پاس رسول آچکا
ہارے رب کی ٹھیک بات لے کر۔ پس مان لو تاکہ تمہارا بھلا ہو۔ اور اگر نہ مانو گے تو اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں
ر زمین میں ہے۔ اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۱۶۶-۷۰

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت یہود کو آسمانی مذہب کے نمائندہ کی حیثیت حاصل تھی۔
ہ مذہب کے بڑے بڑے مناصب پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کو منظور نہ ہوا کہ وہ اپنے سوا کسی کی بڑائی تسلیم کریں۔ انھوں
نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ آپ اللہ کی طرف سے اس کے بندوں تک اس کا پیغام پہنچانے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ وہ
سمجھتے تھے کہ ہم دین کے اجارہ دار ہیں۔ ہم جس شخص کی دینی صداقت کو تسلیم نہ کریں وہ بطور واقعہ بھی غیر تسلیم شدہ
ن جاتا ہے۔ مگر وہ بھول گئے کہ یہ کائنات خدا کی کائنات ہے اور اس کا نظام خدا کے فرماں بردار فرشتے چلا رہے ہیں۔
س لئے یہاں کسی کی اصل تصدیق وہ ہے جو خدا کی طرف سے ہو اور کائنات کا پورا نظام جس کی تائید کرے۔ اور یقیناً
خدا اور اس کی پوری کائنات اپنے پیغمبر کے ساتھ ہے نہ کہ کسی کے خود ساختہ مزعومات کے ساتھ۔

خدا کی پکار کے مقابلہ میں جو لوگ یہ ردعمل دکھائیں کہ وہ اس کا اعراض وانکار کریں، وہ لوگوں کو اس کا
ساتھ دینے سے روکیں وہ صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ بندگی کے صحیح مقام سے بھٹک کر بہت دور نکل گئے
ہیں۔ وہ ایسی بات کہتے ہیں جس کی تردید ساری کائنات کر رہی ہے۔ وہ ایک ایسے منصوبہ کے خلاف محاذ
بنا رہے ہیں جس کی پشت پر زمین و آسمان کا مالک کھڑا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی نادانی اس دنیا میں اور
کوئی نہیں۔ ایسے لوگ دین کے نام پر سب سے بڑی بے دینی کر رہے ہیں۔ جو لوگ اپنے لئے اس قسم کا ظالمانہ رویہ
پسند کریں ان کا ذہن اعتراف کے بجائے انکار کے رخ پر چلنے لگتا ہے۔ وہ دن بدن حق سے دور ہوتے چلے
جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ابدی بربادی کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ خدا کی دعوت کا انکار خود خدا کا انکار ہے۔
خدا کی دعوت اتنے کھلے ہوئے دلائل کے ساتھ ہوتی ہے کہ اس کو سمجھنا کسی کے لئے مشکل نہ رہے۔ اس کے باوجود
جو لوگ خدا کی دعوت کا انکار کریں وہ گویا خدا کے سامنے ڈھٹائی کر رہے ہیں۔ اور ڈھٹائی اللہ کے نزدیک
سب سے بڑا جرم ہے۔

اگر آدمی نے اپنے دل کی کھڑکیاں کھلی رکھی ہوں تو اللہ کی پکار اس کو عین اپنی تلاش کا جواب معلوم ہوگی۔
اس کو محسوس ہوگا کہ وہ حق جو انسانی باتوں میں ڈھک کر رہ گیا تھا، اللہ نے اس کی بے آمیز شکل میں اس کے اعلان
کا انتظام کیا ہے، یہ اللہ کے علم اور حکمت کا ظہور ہے نہ کہ کسی شخص کے ذاتی جوش کا کوئی معاملہ۔

اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کے بارے میں کوئی بات حق کے سوا نہ کہو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم تو بس اللہ کے ایک رسول اور اس کا ایک کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم کی طرف القا فرمایا اور اس کی جانب سے ایک روح ہیں۔ پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ خدا تین ہیں۔ باز آجاؤ، یہی تمھارے حق میں بہتر ہے۔ معبود تو بس ایک اللہ ہی ہے۔ وہ پاک ہے کہ اس کے اولاد ہو۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کا کارساز ہونا کافی ہے۔ مسیح کو ہرگز اللہ کا بندہ بننے سے عار نہ ہوگا اور نہ مقرب فرشتوں کو ہوگا۔ اور جو اللہ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا تو اللہ ضرور سب کو اپنے پاس جمع کرے گا۔ پھر جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے تو ان کو وہ پورا پورا اجر دے گا اور اپنے فضل سے ان کو مزید بھی دے گا۔ اور جن لوگوں نے عار اور تکبر کیا ہوگا ان کو دردناک عذاب دے گا اور وہ اللہ کے مقابلہ میں نہ کسی کو اپنا دوست پائیں گے اور نہ مددگار ۱۷۱ – ۱۷۳

آدمی کی یہ کمزوری ہے کہ کسی چیز میں کوئی امتیازی پہلو دیکھتا ہے تو اس کے بارے میں مبالغہ آمیز تصور قائم کر لیتا ہے۔ وہ اس کا مقام متعین کرنے میں حد سے آگے نکل جاتا ہے۔ اسی کا نام غلو ہے۔ شرک اور شخصیت پرستی کی تمام قسمیں اصلاً اسی غلو کی پیداوار ہیں۔

دین میں غلو یہ ہے کہ دین میں کسی چیز کا جو درجہ ہو اس کو اس کے واقعی درجہ پر نہ رکھا جائے بلکہ اس کو بڑھا کر زیادہ بڑا درجہ دینے کی کوشش کی جائے ـــــ اللہ اپنے ایک بندے کو باپ کے بغیر پیدا کرے تو کہہ دیا جائے کہ یہ خدا کا بیٹا ہے۔ اللہ کسی کو کوئی بڑا مرتبہ دے دے تو سمجھ لیا جائے کہ وہ کوئی مافوق شخصیت ہے اور بشری غلطیوں سے پاک ہے۔ دنیا کی چمک دمک سے بچنے کی تاکید کی جائے تو اس کو بڑھا چڑھا کر ترک دنیا تک پہنچا دیا جائے۔ زندگی کے کسی پہلو کے بارے میں کچھ احکام دیے جائیں تو اس میں مبالغہ کرکے اسی کی بنیاد پر ایک پورا دینی فلسفہ بنا دیا جائے۔ اس قسم کی تمام صورتیں جن میں کسی دینی چیز کو اس کے واقعی مقام سے بڑھا کر مبالغہ آمیز درجہ دیا جائے وہ غلو کی فہرست میں شامل ہوگا۔

ہر قسم کی طاقتیں صرف اللہ کو حاصل ہیں۔ اس کے سوا جتنی چیزیں ہیں سب عاجز اور محکوم ہیں۔ انسان اپنے شعور کے کمال درجہ پر پہنچ کر جو چیز دریافت کرتا ہے وہ یہ کہ خدا قادر مطلق ہے اور وہ اس کے مقابلہ میں عاجز مطلق۔ پیغمبر اور فرشتے اس شعور میں سب سے آگے ہوتے ہیں اس لیے وہ خدا کی قدرت اور اپنے عجز کے اعتراف میں بھی سب سے آگے ہوتے ہیں۔ یہ اعتراف ہی انسان کا اصل امتحان ہے۔ جس کو اپنے عجز کا شعور ہو جائے اس نے خدا کے مقابلہ میں اپنی نسبت کو پالیا۔ اور جس کو اپنے عجز کا شعور نہ ہو وہ خدا کے مقابلہ میں اپنی نسبت کو پانے سے محروم رہا۔ پہلا شخص آنکھ والا ہے جو کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کو پہنچے گا۔ دوسرا شخص اندھا ہے جس کے لیے اس کے سوا کوئی انجام نہیں کہ وہ بھٹکتا رہے یہاں تک کہ ذلت کے گڑھے میں جا گرے۔

اے لوگو، تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمھارے اوپر ایک واضح روشنی اتار دی۔ پس جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس کو انھوں نے مضبوط پکڑ لیا ان کو ضرور اللہ اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا اور ان کو اپنی طرف سیدھا راستہ دکھائے گا۔ لوگ تم سے حکم پوچھتے ہیں۔ کہہ دو اللہ تم کو کلالہ کے بارے میں حکم بتاتا ہے۔ اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کے کوئی اولاد نہ ہو۔ اور اس کے ایک بہن ہو تو اس کے لئے اس کے ترکہ کا نصف ہے۔ اور وہ مرد اس بہن کا وارث ہوگا اگر اس بہن کے کوئی اولاد نہ ہو۔ اور اگر دو بہنیں ہوں تو ان کے لئے اس کے ترکہ کا دو تہائی ہوگا۔ اور اگر کئی بھائی بہن مرد عورتیں ہوں تو ایک مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے۔ اللہ تمھارے لئے بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے ۱۷۴-۷۶

اللہ کی طرف سے جب اس کی پکار انسانوں کے سامنے بلند ہوتی ہے تو وہ ایسی کھلی ہوئی صورت میں بلند ہوتی ہے جو تاریکیوں کو ختم کرکے حقائق کو آخری حد تک روشن کردے۔ اسی کے ساتھ وہ ایسے دلائل سے مسلح ہوتی ہے جس کا رد کرنا کسی کے لئے ممکن نہ ہو۔ وہ اس کا استہزا تو کرسکتے ہیں مگر دلیل کی زبان میں اس کو کاٹ نہیں سکتے۔ خدا وہ ہے جو سورج کو نکالتا ہے تو روشنی اور تاریکی ایک دوسرے سے جدا ہوجاتی ہیں۔ خدا کی یہی قدرت اس کی پکار میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے بعد حق اور باطل ایک دوسرے سے اس طرح الگ ہوجاتے ہیں کہ کسی آنکھ والے کے لئے اس کا جاننا ناممکن نہ رہے۔ تاہم سورج کو دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنی آنکھ کھولے۔ اسی طرح خدا کی پکار سے ہدایت لینے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اس پر دھیان دے۔ جو شخص دھیان نہ دے وہ خدا کی پکار کے درمیان رہ کر بھی اس سے محروم رہے گا۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حق کو مضبوطی کے ساتھ پکڑا جائے۔ کیونکہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں شیطان ہر آدمی کے پیچھے لگا ہوا ہے جو طرح طرح کے دھوکے میں ڈال کر آدمی کو حق سے بدکاتا رہتا ہے۔ اگر آدمی شیطان کے وسوسوں سے لڑ کر حق کا ساتھ دینے کا فیصلہ نہ کرے تو یقیناً شیطان اس کو درمیان میں اچک لے گا۔ تاہم آزمائش کی اس دنیا میں انسان اکیلا نہیں ہے۔ جو لوگ خدا کی طرف چلنا چاہیں گے ان کو ہر موڑ پر خدا کی رہنمائی حاصل ہوگی۔ وہ خدا کی مدد سے منزل پر پہنچنے میں کامیاب ہوں گے۔ جب آدمی کا یہ حال ہوجائے کہ وہ صرف حق کو اہمیت دے تو اللہ کی توفیق سے اس کے اندر یہ صلاحیت ابھر آتی ہے کہ وہ خالص حق پر مضبوطی کے ساتھ جمے اور دوسری راہوں میں بھٹکنے سے بچا رہے۔

میراث اور ترکہ کا حکم بتاتے ہوئے یہ کہنا کہ "اللہ اپنا حکم بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہی میں نہ پڑو" ظاہر کرتا ہے کہ میراث اور ترکہ کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ان امور میں سے ہے جس میں اللہ کے بتائے ہوئے قاعدے کی پابندی نہ کرنا آدمی کو گمراہی کی خندق میں ڈال دیتا ہے۔

آیاتہا ۱۲۰　　　　　　　　سورۃ المائدہ　مدنیۃ۔ ۵　　　　　　　　رکوعاتہا ۱۶

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اے ایمان والو، عہد و پیمان کو پورا کرو۔ تمھارے لئے مویشی کی قسم کے سب جانور حلال کیے گئے سوا ان کے جن کا ذکر آگے کیا جا رہا ہے۔ مگر احرام کی حالت میں شکار کو حلال نہ جانو۔ اللہ حکم دیتا ہے جو چاہتا ہے۔ اے ایمان والو، بے حرمتی نہ کرو اللہ کی نشانیوں کی اور نہ حرمت والے مہینوں کی اور نہ حرم میں قربانی والے جانوروں کی اور نہ پٹے بندھے ہوئے نیاز کے جانوروں کی اور نہ حرمت والے گھر کی طرف آنے والوں کی جو اپنے رب کا فضل اور اس کی خوشی ڈھونڈنے نکلے ہیں۔ اور جب تم احرام کی حالت سے باہر آجاؤ تو شکار کرو۔ اور کسی قوم کی دشمنی کہ اس نے تم کو مسجد حرام سے روکا ہے تم کو اس پر نہ ابھارے کہ تم زیادتی کرنے لگو۔ تم نیکی اور تقوی میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے ۲-۱

مومن کی زندگی ایک پابند زندگی ہے۔ وہ دنیا میں آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اس کے باوجود وہ اللہ کی آقائی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے آپ کو پابند بنا لیتا ہے، وہ اپنے آپ کو از خود عہد کی رسی میں باندھ لیتا ہے۔ اللہ کا معاملہ ہو یا بندوں کا معاملہ، دونوں قسم کے معاملات میں اس نے اپنے کو پابند کر لیا ہے کہ وہ آزادانہ عمل نہ کرے بلکہ خدا کے حکم کے مطابق عمل کرے۔ وہ انھیں چیزوں کو اپنی خوراک بنائے جو خدا نے اس کے لئے حلال کی ہیں اور جو چیزیں خدا نے حرام کی ہیں ان کو کھانا چھوڑ دے۔ کسی موقع پر اگر کسی جائز چیز سے بھی روک دیا جائے جیسا کہ احرام کی حالت میں یا حرام مہینوں کے بارے میں حکم سے واضح ہوتا ہے تو اس کو بھی بے چون و چرا مان لے۔ کوئی چیز کسی دینی حقیقت کی علامت بن جائے تو اس کا احترام کرے، کیوں کہ ایسی چیز کا احترام خود دین کا احترام ہے۔ اور یہ سب کچھ اللہ کے خوف سے کرے نہ کہ کسی اور جذبہ سے۔

آدمی عام حالات میں اللہ کے حکموں پر عمل کرتا ہے۔ مگر جب کوئی غیر معمولی حالت پیدا ہوتی ہے تو وہ بدل کر دوسرا انسان بن جاتا ہے۔ اللہ سے ڈرنے والا بجائے اللہ سے بے خوف انسان بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ موقع وہ ہے جب کہ کسی کی کوئی مخالفانہ حرکت اس کو مشتعل کر دیتی ہے۔ ایسے موقع پر آدمی انصاف کی حدوں کو بھول جاتا ہے اور یہ چاہنے لگتا ہے کہ جس طرح بھی ہو اپنے حریف کو ذلیل اور ناکام کرے۔ مگر اس قسم کی معاندانہ کارروائی خدا کے نزدیک جائز نہیں، حتی کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ مسجد حرام کی زیارت جیسے پاک کام سے کسی نے دوسرے کو روکا ہو۔ کوئی شخص اس قسم کی ظالمانہ کارروائی کرنے کے لئے اٹھے اور کچھ لوگ اس کا ساتھ دینے لگیں تو یہ گناہ کی راہ میں کسی کی مدد کرنا ہوگا۔ جب کہ اللہ سے ڈرنے والوں کا شیوہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ صرف نیکی کے کاموں میں دوسرے کی مدد کریں۔ جو شخص حق پر ہو اس کا ساتھ دینا اور جو ناحق پر ہو اس کا ساتھ نہ دینا موجودہ دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ مگر اسی مشکل کام پر آدمی کے اخروی انجام کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

تم پر حرام کیا گیا مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور نام پر ذبح کیا گیا ہو اور وہ جو مر گیا ہو گلا گھونٹنے سے یا چوٹ سے یا اونچے سے گر کر یا سینگ مارنے سے اور وہ جس کو درندے نے کھایا ہو مگر جس کو تم نے ذبح کر لیا اور وہ جو کسی تھان پر ذبح کیا گیا ہو اور یہ کہ تقسیم کرو جوئے کے تیروں سے۔ یہ گناہ کا کام ہے۔ آج کافر تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ پس تم ان سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو پورا کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔ پس جو بھوک سے مجبور ہو جائے لیکن گناہ پر مائل نہ ہو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۳

بعض جانور اپنے طبی اور اخلاقی نقصانات کی وجہ سے اس قابل نہیں کہ انسان ان کو اپنی خوراک بنائے خنزیر کو اللہ تعالیٰ نے اسی سبب سے حرام قرار دیا۔ اسی طرح جانور کے جسم میں گوشت کے علاوہ کئی دوسری چیزیں ہوتی ہیں جو انسانی خوراک بننے کے قابل نہیں۔ انھیں میں سے خون بھی ہے۔ چنانچہ اسلام میں جانور کو ذبح کرنے کی ایک خاص صورت مقرر کی گئی تاکہ جانور کے جسم کا خون پوری طرح بہہ کر نکل جائے۔ ذبح کے سوا جانور کو مارنے کے جو طریقے ہیں ان میں خون جانور کے گوشت میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے، وہ پوری طرح اس سے الگ نہیں ہوتا۔ اسی سبب سے شریعت میں مردار کی تمام قسموں کو بھی حرام کر دیا گیا۔ کیوں کہ مردار جانور کا خون فوراً ہی اس کے گوشت میں جذب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایسا گوشت بھی حرام کر دیا گیا جس میں کسی طرح مشرکانہ عقیدہ کی آمیزش ہو جائے۔ مثلاً غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کرنا یا غیر اللہ کے تقرب کی خاطر جانور کو قربان کرنا۔ تاہم اللہ نے اپنی رحمت خاص سے یہ گنجائش دے دی کہ کسی کو بھوک کی ایسی مجبوری پیش آجائے کہ اس کو موت یا حرام خوراک میں سے ایک کو لینا ہو تو وہ موت کے مقابلہ میں حرام خوراک کو اختیار کرے۔

"آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا" یعنی تم کو جو احکام دئے جانے تھے وہ سب دے دئے گئے۔ تمہارے لئے جو کچھ بھیجنا مقدر کیا گیا وہ سب بھیجا جا چکا۔ یہاں علی الاطلاق دین کے کامل کئے جانے کا ذکر نہیں ہے بلکہ امت محمدی پر جو قرآن نازل ہونا شروع ہوا تھا اس کے پورے ہونے کا اعلان ہے۔ یہ نزول کی تکمیل کا ذکر ہے نہ کہ دین کی تکمیل کا۔ اسی لئے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ "آج میں نے دین کو کامل کر دیا" بلکہ یہ فرمایا کہ "آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا"۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کا دین ہر زمانہ میں اپنی کامل صورت میں انسان کو دیا گیا ہے۔ خدا نے کبھی ناقص دین انسان کے پاس نہیں بھیجا۔

قرآن کو ماننے والی امت کو خدا نے اتنی مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیا ہے کہ وہ اپنی امکانی قوت کے اعتبار سے ہر بیرونی خطرہ کی زد سے باہر جا چکی ہے۔ اب اگر اس کو کوئی نقصان پہنچے گا تو اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے نہ کہ خارجی حملوں کی وجہ سے۔ اور اندرونی کمزوریوں سے پاک رہنے کی سب سے بڑی ضمانت یہ ہے کہ اس کے افراد اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔

وہ پوچھتے ہیں کہ ان کے لئے کیا چیز حلال کی گئی ہے۔ کہو کہ تمھارے لئے ستھری چیزیں حلال ہیں۔ اور شکاری جانوروں میں سے جن کو تم نے سدھایا ہے، تم ان کو سکھاتے ہو اس میں سے جو اللہ نے تم کو سکھایا۔ پس تم ان کے شکار میں سے کھاؤ جو وہ تمھارے لئے پکڑ رکھیں۔ اور ان پر اللہ کا نام لو اور اللہ سے ڈرو، اللہ بے شک جلد حساب لینے والا ہے۔ آج تمھارے لئے سب ستھری چیزیں حلال کر دی گئیں۔ اور اہل کتاب کا کھانا تمھارے لئے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لئے حلال ہے۔ اور حلال ہیں تمھارے لئے پاک دامن عورتیں مسلمان عورتوں میں سے اور پاک دامن عورتیں ان میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی جب تم انھیں ان کے مہر دے دو اس طرح کہ تم نکاح میں لانے والے ہو، نہ علانیہ بدکاری کرو اور نہ خفیہ آشنائی کرو۔ اور جو شخص ایمان کے ساتھ کفر کرے گا تو اس کا عمل ضائع ہو جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا ۵-۴

وہ تمام چیزیں جن کو فطرت کی نگاہ پاک اور ستھرا محسوس کرتی ہے۔ اور وہ تمام جانور جو اپنی سرشت کے لحاظ سے انسان کی سرشت سے مناسبت رکھتے ہیں انسان کے لئے حلال ہیں۔ البتہ یہ شرط ہے کہ خارجی سبب سے ان کے اندر کوئی فساد شرعی یا طبی نہ پیدا ہوا ہو۔ تاہم اس اصول کو انسان محض اپنی عقل سے پوری طرح متعین نہیں کر سکتا اس لئے اس کو تعین کے ساتھ بھی بیان کر دیا گیا۔ سدھائے ہوئے جانور کا شکار بھی اسی لئے حلال ہے کہ وہ شکار کو اپنے مالک کے لئے پکڑ کر رکھتا ہے۔ گویا اس نے آدمی کی خو سیکھ لی۔ ایسا جانور گویا شکار کے معاملہ میں خود آدمی کا قائم مقام بن گیا۔

حلال و حرام کا قانون خواہ کتنی ہی تفصیل کے ساتھ بتا دیا جائے بالآخر آدمی کا اپنا ارادہ ہی ہے جو اس کو کسی چیز سے روکتا ہے اور کسی چیز کی طرف لے جاتا ہے۔ آدمی کے اوپر اصل نگراں قانون کی دفعات نہیں بلکہ وہ خود ہے۔ اگر آدمی خود نہ چاہے تو قانون کو مانتے ہوئے وہ اس سے فرار کی راہیں تلاش کر لے گا۔ یہ صرف اللہ کا خوف ہے جو آدمی کو پابند کرتا ہے کہ وہ قانون کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ ملحوظ رکھے۔ اسی لئے حرام و حلال کا قانون بتاتے ہوئے کہا گیا: اللہ سے ڈرو، اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

مسلمان عورت کے لئے کسی حال میں جائز نہیں کہ وہ غیر مسلم مرد سے نکاح کرے۔ مگر مسلمان مردوں کو مخصوص شرائط کے تحت اجازت دی گئی ہے کہ وہ اہل کتاب عورتوں کے ساتھ نکاح کر سکتے ہیں۔ اس گنجائش کی حکمت یہ ہے کہ عورت فطرۃً تاثر پذیر مزاج رکھتی ہے۔ اس سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ عملی زندگی میں آنے کے بعد اپنے مسلم شوہر اور مسلم معاشرہ کا اثر قبول کرے اور اس طرح نکاح اس کے لئے اسلام میں داخلہ کا ذریعہ بن جائے۔

"جو شخص ایمان سے انکار کرے تو اس کا عمل ضائع ہو گیا"، یعنی ایمان کے بغیر عمل کی کوئی حقیقت نہیں۔ عمل وہی ہے جو خالص اللہ کے لئے کیا جائے۔ جو عمل اللہ کے لئے نہ ہو وہ خود اپنے لئے ہوتا ہے۔ پھر اپنی خاطر کئے ہوئے عمل کی قیمت اللہ کیوں دے گا۔

اے ایمان والو، جب تم نماز کے لئے اٹھو تو اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوؤ اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پیروں کو ٹخنوں تک دھوؤ اور اگر تم حالت جنابت میں ہو تو غسل کر لو۔ اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی استنجا سے آئے یا تم نے عورت سے صحبت کی ہو پھر تم کو پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کر لو اور اپنے چہروں اور ہاتھوں پر اس سے مسح کر لو۔ اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی ڈالے۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے تاکہ تم شکر گزار بنو ۶

نماز کا مقصد آدمی کو برائیوں سے پاک کرنا ہے۔ وضو اسی کی ایک خارجی تیاری ہے۔ آدمی جب نماز کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے وہ پانی کے پاس جاتا ہے۔ پانی بہت بڑی نعمت ہے جو آدمی کے لئے ہر قسم کی گندگی کو دھونے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اسی طرح نماز بھی ایک ربانی چشمہ ہے جس میں نہا کر آدمی اپنے آپ کو برے جذبات اور گندے خیالات سے پاک کرتا ہے۔

آدمی وضو کو شروع کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں پر پانی ڈالتا ہے تو گویا عمل کی زبان میں یہ دعا کرتا ہے کہ خدایا میرے ان ہاتھوں کو برائی سے بچا اور ان کے ذریعہ جو برائیاں مجھ سے ہوئی ہیں ان کو دھو کر صاف کر دے۔ پھر وہ اپنے منھ میں پانی ڈالتا ہے اور اپنے چہرے کو دھوتا ہے تو اس کی روح زبان حال سے کہہ اٹھتی ہے کہ خدایا میں نے اپنے منھ میں جو غلط خوراک ڈالی ہو، میں نے اپنی زبان سے جو برا کلمہ نکالا ہو، میری آنکھوں نے جو بری چیز دیکھی ہو ان سب کو تو مجھ سے دور کر دے۔ پھر وہ پانی لے کر اپنے ہاتھوں کو سر کے اوپر پھیرتا ہے تو اس کا وجود سراپا اس دعا میں ڈھل جاتا ہے کہ خدایا میرے ذہن نے جو بری باتیں سوچی ہوں اور جو غلط منصوبے بنائے ہوں ان کے اثرات کو مجھ سے دھو دے اور میرے ذہن کو پاک صاف ذہن بنا دے۔ پھر جب وہ اپنے پیروں کو دھوتا ہے تو اس کا عمل اس کے لئے اپنے رب کے سامنے یہ درخواست بن جاتا ہے کہ وہ اس کے پیروں سے برائی کی گرد کو دھو دے اور اس کو ایسا بنا دے کہ سچائی اور انصاف کے راستہ کے سوا کسی اور راستہ پر وہ کبھی نہ چلے۔ اس طرح پورا وضو آدمی کے لئے گویا اس دعا کی عملی صورت بن جاتا ہے کہ: خدایا مجھے غلطی سے پلٹنے والا بنا اور مجھ کو برائیوں سے پاک رہنے والا بنا۔

عام حالات میں پاکی کا احساس پیدا کرنے کے لئے وضو کافی ہے۔ مگر جنابت کی حالت ایک غیر معمولی حالت ہے اس لئے اس میں پورے جسم کا دھونا (غسل) ضروری قرار دیا گیا۔ وضو اگر چھوٹا غسل ہے تو غسل بڑا وضو ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں کہ وہ بندوں کو غیر ضروری مشقت میں ڈالے۔ اس لئے معذوری کی حالتوں میں پاکی کے احساس کو تازہ کرنے کے لئے تیمم کو کافی قرار دیا گیا۔ وضو اور غسل کے سادہ طریقے اللہ کی بہت بڑی نعمت ہیں۔ اس طرح طہارت شرعی کو طہارت طبعی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ معذوری کی حالت میں تیمم کی اجازت مزید نعمت ہے کیونکہ یہ غلو سے بچانے والی ہے جس میں اکثر مذاہب مبتلا ہوئے۔

اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو اور اس کے اس عہد کو یاد کرو جو اس نے تم سے لیا ہے۔ جب تم نے کہا کہ ہم نے سنا اور ہم نے مانا۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ دلوں کی بات تک جانتا ہے۔ اے ایمان والو، اللہ کے لئے قائم رہنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بنو۔ اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اس پر نہ ابھارے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو۔ یہی تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو۔ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کے لئے بخشش ہے اور بڑا اجر ہے۔ اور جنھوں نے انکار کیا اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا ایسے لوگ دوزخ والے ہیں۔ اے ایمان والو، اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو جب ایک قوم نے ارادہ کیا کہ تم پر دست درازی کرے تو اللہ نے تم سے ان کے ہاتھ کو روک دیا۔ اور اللہ سے ڈرو اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے ۷—۱۱

ایمان ایک عہد ہے جو بندے اور خدا کے درمیان قرار پاتا ہے۔ بندہ یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ دنیا میں اللہ سے ڈر کر رہے گا اور اللہ اس کا ضامن ہوتا ہے کہ وہ دنیا و آخرت میں بندہ کا کفیل ہو جائے گا۔ بندے کو اپنے عہد میں پورا اترنے کے لئے دو باتوں کا ثبوت دینا ہے۔ ایک یہ کہ وہ قوام للہ بن جائے۔ یعنی وہ خدا کی باتوں پر خوب قائم رہنے والا ہو۔ اس کا وجود ہر موقع پر صحیح ترین جواب پیش کرے جو بندے کو اپنے رب کے لئے پیش کرنا چاہئے۔ وہ جب کائنات کو دیکھے تو اس کا ذہن خدا کی قدرتوں اور عظمتوں کے تصور سے سرشار ہو جائے۔ وہ جب اپنے آپ کو دیکھے تو اس کو اپنی زندگی سراپا فضل اور احسان نظر آئے۔ اس کے جذبات امنڈیں تو خدا کے لئے امنڈیں۔ اس کی توجہات کسی چیز کو اپنا مرکز بنائیں تو خدا کو بنائیں۔ اس کی محبت خدا کے لئے ہو۔ اس کے اندیشے خدا سے وابستہ ہوں۔ اس کی یادوں میں خدا سمایا ہوا ہو۔ وہ خدا کی عبادت و اطاعت کرے۔ وہ خدا کے ر[illegible] میں اپنے اثاثہ کو خرچ کرے۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے دین کے راستہ میں لگا کر خوش ہوتا ہو۔

عہد پر قائم رہنے کی دوسری شرط بندوں کے ساتھ انصاف ہے۔ انصاف کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے ساتھ کمی بیشی کئے بغیر وہ سلوک کرنا جس کا وہ باعتبار واقعہ مستحق ہے۔ معاملات میں حق کو اپنانا نہ کہ اپنی خواہشات کو۔ اس معاملہ میں بندے کو اتنا زیادہ پابند بننا ہے کہ وہ ایسے مواقع پر بھی اپنے کو انصاف سے باندھے رہے جب کہ وہ دشمنوں اور باطل پرستوں سے معاملہ کر رہا ہو، جب کہ شکایتیں اور تلخ یادیں اس کو انصاف کے راستہ سے پھیرنے لگیں۔

دنیا میں خدا نشانیوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی ایسے دلائل کی صورت میں جس کی کاٹ آدمی کے پاس موجود نہ ہو۔ جب آدمی کے سامنے خدا کی دلیل آئے اور وہ اس کو ماننے کے بجائے لفظی تکرار کرنے لگے تو اس نے خدا کی نشانی کو جھٹلایا۔ ایسے لوگ خدا کے یہاں سخت سزا پائیں گے۔ اور جن لوگوں نے اس کو مان لیا وہ خدا کے انعام کے مستحق ہوں گے۔

رسالت اور پیغمبری

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ غیر مسلم آئے اور آپ سے آپ کے پیغمبر ہونے کا ثبوت مانگا۔ انھوں نے کہا کہ خدا کے پیغمبر حضرت موسیٰ عصا اور ید بیضا لے کر آئے جو لوگوں کے لئے ان کی پیغمبری کا ثبوت تھا۔ اسی طرح خدا کے پیغمبر حضرت عیسیٰ اندھوں کو بینا کرتے تھے اور کوڑھیوں کو اچھا کرتے تھے، یہ ان کا معجزہ تھا جو ان کے پیغمبر خدا ہونے کو ثابت کرتا تھا۔ اسی طرح دوسرے پیغمبر بھی کوئی نہ کوئی معجزہ لائے اور اس کو اپنی پیغمبری کے ثبوت کے لئے پیش کیا۔ آپ بتائیں کہ آپ اپنی پیغمبری کے ثبوت کے لئے کیا معجزہ لائے ہیں۔ آپ نے خاموشی کے ساتھ ان کے سوال کو سنا اور اس کے بعد سورۂ آل عمران کے آخر کی یہ آیتیں پڑھیں: زمین و آسمان کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی بناوٹ میں غور کرتے ہیں۔ وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب، تو نے یہ سب کچھ بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے اس سے کہ تو عبث کام کرے۔ پس اے ہمارے رب، ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف پکار رہا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ اے ہمارے رب، ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہم سے درگزر فرما۔ ہماری برائیوں کو دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔۔۔۔ آل عمران

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ آیتیں پڑھ کر سنانا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا تھا کہ میری نبوت کا ثبوت وہ پوری کائنات ہے جو تمہارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ زمین و آسمان کا پورا نظام اپنی خاموش زبان میں رسالت اور پیغام رسالت کی تصدیق کر رہا ہے۔ پھر اس کے بعد کسی اور معجزہ کی کیا ضرورت۔ پیغمبر اسلام کی نبوت دائمی نبوت تھی۔ اس لئے آپ کے لئے وقتی معجزہ کار آمد نہ تھا۔ آپ کے لئے وہ معجزہ مفید تھا جو آپ کی نبوت کی طرح مستقل ہو اور آپ کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی باقی رہے۔ تاکہ ہر دور کا انسان اس کو دیکھ سکے۔ اسی لئے آپ نے خدا کی دنیا کو اپنے حق میں ابدی معجزہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ قرآن میں عالمی نظام کے ان پہلوؤں کی نشان دہی کی گئی جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ انسان کی اصلاح کے لئے خدائی رہنمائی کا انتظام ہونا چاہئے۔

کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک سوال ہے اور پیغمبری اسی سوال کا جواب۔ ہمارے سامنے ایک انتہائی عظیم اور مکمل دنیا ہے۔ وہ نہ صرف موجود ہے بلکہ ایک حد درجہ محکم نظام کے ساتھ مسلسل متحرک ہے۔ اس کے اندر نہ کوئی نقص ہے اور نہ کوئی خلا۔ وہ ناقابل قیاس پھیلاؤ اور تنوع کے باوجود کمال درجہ ہم آہنگ ہے۔

اس کے اندر انتہائی با معنی سرگرمیاں جاری ہیں۔ وہ اپنے بے شمار اجزار کے ساتھ انتہائی محکم بنیادوں پر چل رہی ہے۔ ایسی ایک کائنات کو دیکھ کر فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا خالق و مالک کون ہے۔ کون ہے جو اس کو عدم سے وجود میں لے آیا۔ کائنات یہ انتہائی اہم سوال ہمارے سامنے لاتی ہے مگر وہ اس کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ وہ ہم کو توس قزح کا مشاہدہ کراتی ہے مگر وہ ہم کو اپنے خالق کا چہرہ نہیں دکھاتی۔ کائنات میں حرکت ہے، زندگی ہے، روشنی ہے، تخلیق ہے، مختلف قسم کی طاقتیں ہیں۔ حتیٰ کہ طرح طرح کے جانداروں کی صورت میں بولنے والی زبانیں بھی ہیں۔ مگر اس اہم ترین سوال کے بارے میں سب خاموش ہیں۔ کوئی بھی انسان کو اس سوال کا جواب نہیں دیتا۔ کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایسا کوئی بورڈ لگا ہوا نہیں ہے جہاں اس سوال کا جواب لکھ دیا گیا ہو۔ یہ صورت حال پکار رہی ہے کہ کوئی بتانے والا ہو جو انسان کو اس سوال کے بارے میں بتائے۔

اسی کے ساتھ دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اس کائنات کا انجام کیا ہے۔ کائنات کی ہر چیز حرکت میں ہے۔ زمین مسلسل سفر کر رہی ہے۔ شمسی نظام زمین اور دوسرے سیاروں کو لئے ہوئے ایک طرف کو چلا جا رہا ہے۔ پھر کہکشاں ہمارے شمسی نظام اور دوسرے ستاروں کو لئے ہوئے ہر لمحہ رواں دواں ہے۔ کائنات کا قافلہ اپنے تمام اجزار کے ساتھ کسی منزل کی طرف چلا جا رہا ہے۔ مگر کوئی بھی اپنی منزل کے بارے میں اعلان نہیں کرتا۔ کائنات کچھ نہیں بتاتی کہ وہ کہاں سے چلی ہے اور کہاں چلی جا رہی ہے اور بالآخر اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ یہ شدید ترین اہمیت رکھنے والا سوال ہے۔ کیوں کہ کائنات کے تیز رفتار قافلہ میں انسان بھی شریک ہے اور وہ مسلسل ایک نامعلوم سفر کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ اگر وہ اپنے سفر اور اپنی منزل کی بابت نہ جانے تو سارا سفر اندھیرے کا سفر بن جائے گا۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ یہاں کوئی انتظام ہو جو انسان کو اس معاملہ کی حقیقت سے باخبر کرے۔

پھر اسی سے متعلق یہ سوال ہے کہ انسان کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ آدمی کے سامنے بے شمار معاملات آتے ہیں اور ان کے درمیان ایک سے زیادہ طریقے اختیار کرنا اس کے لئے ممکن رہتا ہے، پھر انسان کون سا معیار اپنے سامنے رکھے۔ وہ کون سا طریقہ اختیار کرے اور کون سا طریقہ اختیار نہ کرے۔ انسان کے لئے راہ عمل کیا ہو۔ پانی کا راستہ زمین کے نشیب و فراز سے بن جاتا ہے۔ درخت سے لے کر ستاروں تک ہر چیز کا ایک نظام مقرر ہے جس پر وہ پابندی کے ساتھ چلے جا رہے ہیں۔ کائنات کی دوسری چیزوں کے لئے یہ سوال نہیں کہ وہ ک ے اور کس کو چھوڑ دے۔ جب کہ انسان اپنے اختیار کی وجہ سے ہر وقت اس سوال سے دوچار رہتا ہے پوری کائنات میں انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جس کے سامنے کوئی معلوم اور مقرر راہ عمل نہیں۔ سورج ایک حد درجہ پابند نظام کے تحت ہر روز ہمارے لئے روشنی بھیجتا ہے مگر وہ ہماری اپنی زندگی کے سوال پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ ہوا ایک مکمل نظام کے تحت چلتی ہے اور پھولوں کی خوشبو ہمارے مشام تک پہنچاتی ہے

مگر وہ ہمارے اصل مسئلہ کے بارے میں ہم کو کوئی خبر نہیں دیتی۔ پانی ایک متعین قانون میں بندھا ہوا ہے، وہ ہمارے لئے ٹھنڈک اور تراوٹ لے کر آتا ہے مگر ہماری تلاش کے بارے میں وہ ہماری کوئی مدد نہیں کرتا۔ زمین اپنی محوری گردش کے ذریعہ ہر روز ہمارے لئے دن لاتی ہے اور رات کا پردہ ہمارے اوپر سے ہٹاتی ہے مگر وہ زندگی کے بھید کا پردہ نہیں کھولتی۔ درخت زمین کو پھاڑ کر نکلتے ہیں اور ایک منظم کارخانہ کی طرح عمل کرتے ہوئے ہمارے لئے سایہ اور رزق فراہم کرتے ہیں۔ مگر وہ ہماری ذہنی غذا کے لئے ہمیں کوئی چیز فراہم نہیں کرتے۔ چڑیاں چہچہاتی ہیں، ان کو اپنی زندگی کا نظام پوری طرح معلوم ہے مگر وہ ہماری قابل فہم زبان میں ہم کو کوئی پیغام نہیں دیتیں۔ ستارے اور سیارے اپنے نظام میں ایک سکنڈ کا فرق کئے بغیر دوڑ رہے ہیں مگر وہ نہیں بتاتے کہ وہ کون سی منزل ہے جس کی طرف انسان کو رواں دواں ہونا چاہئے۔ کائنات کی ہر چیز ایک ہی مقرر راستہ پر چل رہی ہے، حقیر چیونٹی سے لے کر عظیم کہکشانوں تک سب کے سب اپنے مقرر نظام کے اس طرح پابند ہیں جیسے ان کو اپنی راہ عمل پوری طرح معلوم ہو۔ یہاں صرف ایک انسان ہے جو اپنی راہ عمل سے بے خبر ہے۔ ایک باخبر کائنات میں وہ بالکل بے خبر حالت میں کھڑا ہوا تمام چیزوں کو دیکھ رہا ہے۔ وہ ہر چیز کو اپنی منزل کی طرف جاتا ہوا دیکھتا ہے مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ خود کیا کرے اور کدھر جائے۔

کائنات میں جتنی بھی چیزیں ہیں سب کا ایک نظام عمل مقرر ہے جس پر وہ حد درجہ پابندی کے ساتھ قائم ہیں۔ یہاں صرف ایک انسان کا استثنا ہے۔ انسان واحد مخلوق ہے جو کسی نظام میں بندھا ہوا نہیں ہے۔ وہ اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔ زمین اپنے مدار میں گھومتی ہے۔ وہ دوسرے سیاروں کے مدار میں داخل نہیں ہوتی۔ ایک متعین صورت حال جہاں دوسری چیزیں ہمیشہ ایک ہی رخ اختیار کرتی ہیں، انسان کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ کئی رخ اختیار کر سکے۔ وہ اپنے "مدار" سے نکل کر دوسرے کے "مدار" میں مداخلت کرنے لگے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے لئے راہ عمل پانے کا معاملہ اس سے مختلف ہے جو بقیہ کائنات کا ہے۔ بقیہ چیزیں اپنے لئے راہ عمل خود اپنے ساتھ لاتی ہیں مگر انسان کو اپنی راہ عمل باہر سے حاصل کرنا ہے۔

مطالعہ یہ بھی بتاتا ہے کہ انسان اپنی راہ عمل خود دریافت نہیں کر سکتا۔ انسان عقل و فہم رکھتا ہے مگر اس کی عقل و فہم اصل مسئلہ کی نسبت سے اتنی محدود ہے کہ کسی طرح بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی کوشش سے اس سوال کا جواب معلوم کر سکے۔ پچھلے ہزاروں سال کی تاریخ نے اس کو تجرباتی سطح پر ثابت کر دیا ہے۔ کائنات کے اندر اپنے سوال کا جواب نہ پا کر انسان نے خود تحقیق شروع کی۔ مگر نسلوں کی کوششیں بھی اس کو کسی ایسی بات تک نہ پہنچا سکیں جس پر وہ یقین کر سکے۔ اس نے ستاروں اور سیاروں کی حرکت کے اصول معلوم کر لئے مگر انسان کے سفر اور اس کے آغاز و انجام کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ کر سکا۔ اس نے جمادات، نباتات اور حیوانات کا قانون دریافت کر لیا مگر خود انسان کا قانون دریافت کرنے میں ناکام رہا۔ اس نے یہ جان لیا کہ مادہ فنا ہوتا ہے تو انرجی

بن جاتا ہے اور انرجی ختم ہوتی ہے تو وہ مادہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے مگر انسان مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے اس کی بابت وہ کچھ نہ جان سکا۔ اس نے معلوم کر لیا کہ کائنات کی تمام چیزیں ایک ہی محکم قانون میں بندھی ہوئی ہیں اور اس سے ادنیٰ انحراف کئے بغیر کھرب ہا کھرب سال تک چلتی رہتی ہیں۔ مگر انسان کا قانون حیات کیا ہو، اس کے بارے میں وہ کچھ معلوم نہ کر سکا۔ اس نے کائنات کی وسعتوں کو اپنے آلات کی مدد سے دیکھ لیا اور انتہائی چھوٹے ایٹم کے اندرونی نظام کا پتہ کر لیا۔ مگر انسان کی حقیقت کیا ہے، وہ کس منصوبہ کے تحت وجود میں آیا ہے اس کی بابت وہ کچھ نہ جان سکا۔ انسان کی سب سے بڑی ضرورت کے بارے میں انسان کی یہ مجبوری ثابت کرتی ہے کہ اس کو اس بارے میں ایک خصوصی رہنما درکار ہے۔ اس سے پیغمبر کی ضرورت پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے۔ انسان اپنی زندگی کو بامعنی بنانے کے لئے پیغمبر کا لازمی طور پر محتاج ہے۔ اس کے بعد جب ہم ان تعلیمات پر غور کرتے ہیں جو پیغمبر نے پیش کی ہیں تو مزید یقین ہو جاتا ہے کہ پیغمبری فی الواقع انسان کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ پیغمبر کی بتائی ہوئی باتیں ان تمام سوالات کا تسلی بخش اور مکمل جواب ہیں جو انسان کو درپیش ہیں۔ یہ تعلیمات خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ پیغمبر واقعی اللہ کی طرف سے ہے۔ اللہ نے اس کو حقیقت کا علم دے کر انسانوں کی رہنمائی کے لئے بھیجا ہے۔ بقیہ چیزوں کا قانون عمل ان کے پیدا کرنے والے نے اندرونی طور پر ان کے اندر رکھ دیا اور انسان کا قانون عمل پیغمبر کے ذریعہ اس کے پاس بھیجا۔

پیغمبر ہم کو بتاتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے اور وہ اپنی غیر معمولی قدرت کے ساتھ اس نظام کو چلا رہا ہے۔ اس جواب سے زیادہ صحیح جواب کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ یہ جواب ایسا ہی ہے جیسے ایک مشین بہت عمدہ چل رہی ہو۔ لوگ اس کی کارکردگی کو دیکھ کر حیران ہوتے ہوں۔ مگر اس کی ساخت اس پر لکھی ہوئی نہ ہو۔ اب ایک واقف کار یہ کہے کہ یہ فلاں کارخانہ کی بنی ہوئی ہے جو دنیا بھر میں انجینیرنگ کا سب سے اچھا کارخانہ ہے۔ یہ بات معلوم ہوتے ہی دیکھنے والوں کی الجھن ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ اب ان کو مشین کی اعلیٰ کارکردگی کی توجیہ مل گئی۔ اسی طرح ایک عظیم کائنات کا موجود ہونا اور پھر اس کا حد درجہ محکم طریقہ پر چلنا اس کے بارے میں یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ وہ کیوں کر بنی اور کیسے چل رہی ہے۔ جب پیغمبر یہ کہتا ہے کہ ایک خدا ہے جس نے اس کو بنایا اور جو اس کو اپنی خدائی طاقتوں سے چلا رہا ہے تو فوراً ہم کو اپنے سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ یہ جواب ہمارے لئے ذرا بھی بعید از قیاس نہیں۔ کیوں کہ خدا کو ماننا ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو ماننا۔ ہم اپنی ذات کی سطح پر ایک ایسے وجود کا تجربہ کر رہے ہیں جو دیکھتا ہے، جو سنتا ہے، جو سوچتا ہے، جو چلتا ہے، جو پکڑتا ہے، جو منصوبہ بناتا ہے، جو واقعات کو ظہور میں لاتا ہے۔ "انسان" کی صورت میں جن قوتوں کو ہم محدود طور پر دیکھ رہے ہیں وہی قوتیں زیادہ کامل طور پر خدا کی صورت میں موجود ہوں تو اس میں تعجب کی بات کیا ہے۔ یہ تو گویا اسی واقعہ کو زیادہ بڑے پیمانہ پر ماننا ہے جس کا ہر وقت ہم چھوٹے پیمانہ پر تجربہ کر رہے ہیں۔ "میں" ہوں یہی اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ "خدا" ہے۔

دوسری بات جو پیغمبر بتاتا ہے وہ یہ کہ یہ کائنات بے انجام نہیں۔ اس کا ایک انجام ہے جو موت کے بعد سامنے آنے والا ہے۔ آدمی کو بظاہر اس دنیا میں جو آزادی حاصل ہے وہ صرف امتحان کے لئے ہے۔ یہ آزادی ایک خاص مدت تک ہے۔ اس مدت کے ختم ہونے کے بعد موجودہ نظام توڑ دیا جائے گا۔ اور نیا زیادہ کامل اور ابدی نظام بنایا جائے گا۔ وہاں خدا اپنی طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہو جائے گا جو اس وقت امتحان کی مصلحت کی بنا پر غیب کے پردہ میں چھپا ہوا ہے۔ آج کی دنیا میں ہر ایک کو فائدہ اٹھانے کا موقع ہے۔ مگر آنے والی دنیا میں خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا حق صرف ان لوگوں کو ہوگا جنھوں نے حالت غیب میں خدا کی وفاداری کی ہوگی۔ بقیہ تمام لوگ خدا کی نعمتوں سے دور پھینک دئے جائیں گے۔ پیغمبر کی یہ خبر بھی پوری طرح سچائی کے مطابق معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایسا خدا جس نے دیکھنے اور سمجھنے والے انسان کو بنایا، کیسی عجیب بات ہوگی کہ انسان یوں ہی پیدا ہو کر مر جائے اور اس کا خدا اس کے سامنے ظاہر نہ ہو کہ وہ اس کو دیکھے اور جانے۔ پھر موجودہ کائنات اتنی باحکمت ہے کہ کسی طرح بھی یہ بات قابل تصور نہیں ہے کہ اس کا کوئی انجام نہ ہو، کوئی ایسا دن نہ آئے جہاں ظلم ظلم کی صورت میں اور انصاف انصاف کی صورت میں نمایاں ہو۔ پیغمبر کی خبر عین وہی ہے جس کا انسانی فطرت تقاضا کر رہی تھی، ایک ایسی دنیا جہاں عدم سے وجود کے مظاہرے ہوتے ہوں۔ جہاں رات کے بعد دن آتا ہو، جہاں ایک معمولی بیج سے بے شمار بڑے بڑے درخت پیدا ہوتے ہوں۔ جہاں "آج" ہمیشہ "کل" میں تبدیل ہوتا ہو، ایسی دنیا کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کی ایک آخرت ہے حد درجہ قابل فہم ہے۔ جو دن ہم ہر روز نکلتا دیکھتے ہیں، یہ اسی کے زیادہ بڑے پیمانہ پر نکلنے کی خبر ہے۔ جو کل ہر روز ہمارے اوپر آتی ہے یہ اسی کے زیادہ بڑی صورت میں ظاہر ہونے کی اطلاع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر ہماری اپنی فطرت کی مانگ کو شعور تک پہنچاتا ہے، جس بات کے اشارے آج بھی کائنات میں موجود ہیں اس کو وہ یقینی علم کا درجہ عطا کرتا ہے۔

پیغمبر نے انسان کے لئے جو راہ عمل بتائی ہے وہ بھی حد درجہ قابل فہم ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ پیغمبر کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا ہے۔ کیوں کہ اتنی صحیح بات وہی کہہ سکتا ہے جو خدا کی طرف سے بول رہا ہو۔ پیغمبر یہ بتاتا ہے کہ انسان کے لئے راہ عمل یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے۔ عبادت کا مطلب ہے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دینا۔ اسی سے ڈرنا اور اسی سے محبت کرنا۔ اللہ ہی کو اپنا سب کچھ بنا لینا۔

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک ایسا وجود ہے جو اپنی توجہات کا ایک مرکز چاہتا ہے۔ اس کو کوئی ایسا نقطہ درکار ہے جس کے اوپر وہ اپنی سوچ اور اپنے جذبات کو مرتکز کر سکے۔ یہ انسان کی ایسی ضرورت ہے جس سے وہ کسی حال میں خالی نہیں ہو سکتا، اور نہ کوئی ایسا شخص موجود ہے جو اس سے خالی ہو۔ کسی کا مرکز توجہ اس کے بیوی بچے ہیں۔ کسی کا مرکز اس کا قبیلہ اور برادری ہے۔ کسی کا مرکز توجہ قوم اور وطن ہے۔ کوئی دولت کو اور کوئی اقتدار کو اپنا مرکز توجہ بنائے ہوئے ہے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی چیز نہیں جو حقیقۃً اس قابل ہو کہ انسان

اس کو اپنا مرکز توجہ بنائیے۔ مرکز توجہ بننے کے قابل وہ ہو سکتا ہے جو انسان کو سہارا دے سکے ۔ جو زندگی کے انجام کو بہتر بنانے میں انسان کی مدد کر سکتا ہو۔ مگر ان میں سے کسی چیز کو بھی یہ طاقت حاصل نہیں ۔ یہ تمام چیزیں خود ہی دوسروں کی محتاج ہیں پھر وہ کسی انسان کی کیا مدد کر سکتی ہیں ۔ پھر مرکز توجہ بننے کے قابل وہ ہے جس کو بیک وقت سارے انسان مرکز توجہ بنائیں اور اس کے باوجود معاشرہ میں کوئی بگاڑ پیدا نہ ہو۔ مگر ان میں سے ہر چیز کا معاملہ اس کے برعکس ہے ۔ وہ تمام چیزیں جن کو آدمی عام طور پر مرکز توجہ بناتا ہے وہ محدود ہیں۔ ایک آدمی کا انھیں پانا ہمیشہ دوسرے آدمی کی محرومی کی قیمت پر ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ سماج میں مستقل چھین جھپٹ جاری رہتی ہے ۔ ایک شخص جب پاتا ہے تو وہ دوسرے شخص سے چھین رہا ہوتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف خدا ہی کی شان ہے کہ بیک وقت سارے انسان اس کو پانے کے لئے دوڑیں اور پھر بھی لوگوں میں کوئی ٹکراؤ پیدا نہ ہو۔ کیوں کہ خدا مادی چیزوں سے بلند ہے ، خدا ہر قسم کی محدودیت سے پاک ہے ۔

انسانی سماج کا بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ خواہ کتنا ہی اچھا قانون بنایا جائے ، انسان اس سے بچنے کا راستہ تلاش کر لیتا ہے ۔ کسی کے پاس طاقت ہے تو وہ طاقت کے بل پر دھاندلی کرتا ہے ۔ کسی کے پاس دولت ہے تو وہ دولت کے ذریعہ انصاف کو خرید لیتا ہے ۔ کسی کے پاس الفاظ ہیں تو وہ خوبصورت الفاظ کے ذریعہ اپنے ظلم کو عدل ثابت کرتا ہے ۔ غرض ہر ایک اپنے ناحق کو حق ظاہر کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر پا لیتا ہے ۔ مگر جب خدا کو درمیان میں کھڑا کر دیا جائے تو ہر آدمی محسوس کر لیتا ہے کہ اس کی تدبیریں بے معنی ہیں ۔ تمام تدبیریں اسی وقت تک تدبیریں ہیں جب تک معاملہ انسان اور انسان کے درمیان ہو۔ جب معاملہ کو انسان اور خدا کا معاملہ بنا دیا جائے تو ہر آدمی مکمل طور پر سنجیدہ اور محتاط ہو جاتا ہے ۔ کیوں کہ خدا سے نہ کوئی بات چھپائی جا سکتی اور نہ وہاں کسی قسم کا کوئی زور چل سکتا ۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا پرستی ہی واحد بنیاد ہے جس سے لوگوں میں قانون کے احترام کا جذبہ پیدا کیا جا سکتا ہے ۔ اس کے سوا کوئی بنیاد نہیں جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے ۔

دنیا میں صحیح نظام بنانے کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت پڑتی ہے وہ قربانی ہے ۔ کہیں کسی کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے کو چھوڑنا پڑتا ہے ۔ کہیں اپنے ایک کریڈٹ کو دوسرے کے حوالے کرنے پر راضی ہونا پڑتا ہے ۔ کہیں اپنے گھر والوں کے مفاد کے مقابلہ میں دوسروں کے مفاد کو ترجیح دینی پڑتی ہے ۔ کہیں اپنی محنت سے کمائے ہوئے مال کو دوسروں کے حوالے کر دینا پڑتا ہے ۔ کہیں ایک ایسے کام میں اپنی قوتیں کھپانے کا سوال ہوتا ہے جس میں بظاہر کچھ ملنے والا نہیں ہے ۔ جب تک افراد میں اس قسم کی قربانی کا مزاج نہ ہو حقیقی معنوں میں کسی درست نظام کا قائم ہونا ممکن نہیں ۔ اس کے بغیر ہر آدمی اپنی بات پر اصرار کرے گا اور نتیجۃً پورا سماج چھین جھپٹ کا سماج بن جائے گا ۔ اگر یہی موجودہ دنیا سب کچھ ہو تو آدمی اس قسم کی قربانیاں کیوں کرے ۔ یہی وجہ ہے کہ جس سماج میں خدا کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کو مرکز توجہ بنایا جائے وہاں مستقل فساد برپا رہتا ہے ۔ لوگ قربانی دینے پر تیار نہیں ہوتے اس لئے صالح ماحول بننے کی نوبت ہی نہیں آتی ۔ مگر پیغمبر زندگی کے جس مقصد کی

ان دہی کرتا ہے اس میں یہ مسئلہ نہایت خوبی کے ساتھ حل ہو جاتا ہے۔ اب قربانی کرنے کے لئے بہت بڑا
ے مل جاتا ہے۔ اب انسان جان لیتا ہے کہ اس کی ہر قربانی کی اللہ کے یہاں بہت بڑی قیمت ہے جو مرنے کے بعد
ں کو ابدی زندگی میں لوٹائی جائے گی۔ یہ ذہن انسانی سماج میں ہر قسم کے ظلم کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور حق و
ساف کے لئے مضبوط ترین بنیاد فراہم کر دیتا ہے۔ اب ہر شخص اس قربانی کے لئے تیار ہو جاتا ہے جو ماحول
صالح بنانے کے لئے ضروری ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے وہ وہی دین ہے جو خدا کے دوسرے پیغمبر لے کر
ئے تھے۔ مگر دوسرے پیغمبروں کا دین ان کے بعد محفوظ نہ رہ سکا۔ ان کے بعد ان کے دین کے ماننے والے اتنے
اقت ور ثابت نہ ہو سکے کہ ان کے دین کو اس کی اصلی صورت میں محفوظ رکھ سکتے۔ پیغمبر اسلام کو اللہ تعالیٰ نے
خری نبی کی حیثیت سے بھیجا اور ان کی خصوصی مدد کر کے ان کو تمام قوموں اور مذہبوں کے اوپر غالب کر دیا۔
پ کی یہ غیر معمولی فتح ایک طرف آپ کے پیغمبر خدا ہونے کی دلیل بن گئی۔ آپ کی کامیابی اتنی غیر معمولی تھی کہ دنیا
ں کبھی کسی کو ایسی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ یہ واقعہ اس بات کا ایک محسوس ثبوت ہے کہ آپ خدا کی طرف سے
ھے اور خدا نے اپنی خصوصی مدد سے آپ کو یہ غلبہ اور کامیابی عطا فرمائی۔ کوئی عام آدمی کبھی اس قسم کی کامیابی
رقادر نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف آپ کی اسی کامیابی کے ذریعہ آپ کے لائے ہوئے دین کی مستقل حفاظت کا
نتظام ہو گیا۔ آپ کی اس کامیابی کی وجہ سے آپ کے ماننے والوں کی ایک بہت بڑے رقبہ پر طاقت ور حکومت
ائم ہو گئی۔ یہ حکومت آپ کے دین کی دائمی محافظ بن گئی۔ چنانچہ آپ کی آمد کو چودہ سو سال ہو گئے اور آج تک
آپ کے دین میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔ وہ اسی خالص صورت میں محفوظ ہے جس صورت میں آپ نے اس کو
دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی پیغمبر آنے والا نہیں۔ آپ قیامت تک کے لئے تمام انسانوں
کے اوپر خدا کے پیغمبر ہیں۔ نیا پیغمبر آنے کی ضرورت ہمیشہ اس لئے پڑتی ہے کہ خدا کا دین اپنی اصلی صورت میں
محفوظ نہ رہا ہو۔ پچھلے زمانہ میں بار بار ایسا ہوا کہ آسمانی کتاب کی حامل قومیں اپنی کتاب کو ضائع کرتی رہیں۔ اس
لئے بار بار نبی آئے تاکہ خدا کی تعلیمات کو زندہ کریں اور ان کو دوبارہ ان کی صحیح صورت میں لوگوں کے سامنے پیش
کریں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی صورت میں جو کتاب پیش کی وہ مکمل طور پر اپنی ابتدائی صورت میں محفوظ
ہے اور پریس کا دور آنے کے بعد آخری طور پر محفوظ ہو چکی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آپ آج بھی ایک زندہ نبی
کی حیثیت سے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ کیوں کہ آپ کے اقوال، آپ کے حالات، آپ کی پیغمبرانہ جدوجہد، غرض
آپ کے پورے عمل کا ریکارڈ اس طرح مکمل طور پر محفوظ ہے کہ جب ہم اس کو پڑھتے ہیں تو گویا کہ ہم آپ کو اپنے درمیان
محسوس کرنے لگتے ہیں۔ بحیثیت رسول آپ نے جو کچھ کیا وہ سب کا سب ہم شروع سے آخر تک آج بھی معتبر کتابوں میں
دیکھ رہے ہیں۔ ایسی حالت میں اب نیا نبی آنے کی کیا ضرورت۔

حدیث کی اہمیت دین میں

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ آئی ہے۔ ترمذی کے الفاظ یہ ہیں:

الا ھل عسی رجل یبلغہ الحدیث عنی وھو متکئ علی اریکتہ فیقول: بیننا و بینکم کتاب اللہ فما وجدنا فیہ حلالاً استحللناہ وما وجدنا فیہ حراماً حرمناہ وان ماحرم رسول اللہ کما حرم اللہ

سنو۔ ایسا ہوگا کہ ایک شخص کے پاس میری حدیث پہنچے گی۔ وہ اپنے تخت پر ٹیک لگائے ہوئے بیٹھا ہوگا، وہ سن کر کہے گا: ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے۔ ہم اس میں جو چیز حلال پائیں گے اس کو حلال قرار دیں گے۔ اور جس چیز کو اس میں حرام پائیں گے اس کو حرام قرار دیں گے۔ حالاں کہ جو اللہ کے رسول نے حرام کیا وہ ویسا ہی ہے جیسے اللہ نے حرام کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی موجودہ زمانہ میں پوری ہوگئی ہے۔ آج ایسے لوگ پیدا ہوگئے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہدایت کے لئے صرف قرآن کافی ہے۔ ہم قرآن کو مانیں گے اور حدیث کو نہ مانیں گے۔ مگر یہ اتنی زیادہ بے معنی بات ہے کہ جو شخص ایسا کہے وہ صرف یہ اعلان کر رہا ہے کہ اس کی دیانت داری حد درجہ مشکوک ہے۔ حتیٰ کہ یہ یقین کرنا بھی مشکل ہے کہ وہ خدا کی کتاب کو صحیح معنوں میں مانتا ہے۔ کیوں کہ خدا کی کتاب کو ماننا اور خدا کی کتاب لانے والے کی بات کو نہ ماننا دونوں ایسی متضاد باتیں ہیں جو کسی ایک ذہن میں سنجیدگی کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں۔

رائیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو سنجیدہ رائے ہو۔ دوسری وہ جو آدمی کی سنجیدہ رائے نہ ہو بلکہ اس نے محض تفنن یا شرارت کے طور پر اس کو اختیار کر لیا ہو۔ اس کی وضاحت کے لئے ایک مثال لیجئے۔ قرآن میں یہ حکم ہے کہ دشمنوں کے مقابلہ میں قوت فراہم کرو (انفال ۶۰) یہاں قوت سے کیا مراد ہے، اس سلسلہ میں حدیث میں آیا ہے کہ قوت سے مراد تیر اندازی ہے (الا ان القوۃ الرمی) اب ایک شخص رمی کو وسعت دے کر کہہ سکتا ہے کہ اس سے مراد دور مار ہتھیار ہیں۔ دوسرا شخص لفظی مفہوم پر اصرار کرتے ہوئے کہہ سکتا ہے کہ اس سے مراد تیر کمان والی طاقت فراہم کرنا ہے۔ یہ دونوں رائیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ سنجیدہ ہوں اور پوری نیک نیتی کے ساتھ انھوں نے اپنی رائیں قائم کی ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ رمی کے معنی عربی زبان میں تہمت لگانے کے بھی آتے ہیں۔ اور یہاں یہ مراد ہے کہ دشمنوں پر خوب تہمت لگاؤ اور ان کی عیب جوئی کر کے ان کے مقابلہ میں طاقت حاصل کرو تو یہ ایک فضول بات ہوگی۔ یہ کوئی رائے نہیں بلکہ محض شوشہ ہے۔ حقیقی اظہار رائے کے لئے آدمی کا سنجیدہ ہونا ضروری ہے۔ جو اظہار رائے غیر سنجیدہ ذہن سے نکلا ہو اس کو اظہار رائے نہیں کہا جا سکتا۔ اس قسم کی تشریح نہ قواعد زبان کے اعتبار سے درست ہے اور نہ عقل

ہم کے اعتبار سے ۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حدیث دین میں حجت نہیں ہے وہ اسی دوسری قسم کی غلطی میں مبتلا ہیں۔ ن کی اس رائے کو رائے نہیں کہا جا سکتا بلکہ اسے فتنہ انگیزی کہا جائے گا۔ کیوں کہ قرآن کو ماننا اور حدیث کو نہ ماننا نی زیادہ غیر معقول بات ہے کہ کوئی آدمی سنجیدگی کے ساتھ کبھی ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن سے متعلق دو ذمہ داریاں تھیں۔ ایک یہ کہ جو کچھ آپ پر اترا ہے اس و آپ اسی طرح پڑھ کر لوگوں کو سنا دیں (وان اتلو القرآن ، نمل ۹۲) دوسری ذمہ داری یہ تھی کہ آپ لوگوں کے سامنے اترے ہوئے قرآن کی تشریح و توضیح کریں :

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون (نحل ۳۹)

اور یہ قرآن ہم نے تمھارے اوپر اتارا تاکہ تو لوگوں کے سامنے وہ چیز بیان کردے جو ان کے لئے اتری ہے تاکہ وہ غور کریں۔

پہلی ذمہ داری کے تحت آپ کو صرف یہ کرنا تھا کہ جو الفاظ آپ پر اتارے گئے ہیں ان کو ان کی اصلی صورت میں پڑھ کر سنا دیں۔ مگر دوسرا کام جو تبیین و وضاحت کا کام تھا، اس کے لئے ضروری تھا کہ آپ نازل شدہ الفاظ کے علاوہ مزید الفاظ بولیں۔ انھیں مزید وضاحتی الفاظ کا نام حدیث ہے۔ یہ مزید الفاظ اگرچہ داخل قرآن نہیں ہیں مگر وہ آپ کے منصب رسالت کا لازمی جزء ہیں۔ یہ خود خدا کے حکم کے تحت اور اس کے منصوبہ کے مطابق بولے گئے ہیں۔ اس لئے اللہ کی مرضی کو جاننے کے لیے وہ بھی اسی طرح مستند ہیں جس طرح قرآن مستند ہے اللہ کی قربت چاہنے والا کوئی بندہ جس طرح اللہ کی کتاب کو نظر انداز نہیں کر سکتا، اسی طرح وہ اللہ کے رسول کے کلام کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ ان میں جدائی ممکن نہیں۔

۲۔ قرآن ہم کو رسول کے ذریعہ سے ملا ہے۔ رسول کے کہنے ہی کی وجہ سے ہم یہ مانتے ہیں کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔ پیغمبر کی صداقت پر ایمان لاکر ہی ہم قرآن کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں۔ پھر اسی پیغمبر کی زبان سے نکلی ہوئی دوسری باتوں کو ہم کیوں کر جھٹلا دیں گے۔ ابو داؤد کی روایت کے مطابق پیغمبرؐ نے فرمایا: سن لو، مجھے یہ قرآن دیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ اس کا مثل بھی (الا انی اوتیت ھذا الکتاب ومثلہ معہ) ہم نے اپنی آنکھوں سے نہ جبریل کو دیکھا اور نہ یہ کہ جبریل آپ کو کتاب اللہ کی تعلیم کر رہے ہیں۔ صرف پیغمبرؐ کے کہنے پر ہم یہ مانتے ہیں کہ آپ کو وحی متلو دی گئی ہے۔ پھر وہی پیغمبر جب یہ کہے کہ مجھ کو وحی غیر متلو بھی دی گئی ہے تو اس کے بعد کسی کے پاس وہ کون سی دلیل ہے جس کی بنا پر وہ یہ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ وحی متلو کی حد تک وہ پیغمبر کے بیان کو مانے گا اور وحی غیر متلو کے بارے میں وہ پیغمبر کے بیان کو چھوڑ دے گا۔ اس قسم کی متضاد رائے رکھنے کا کسی کے پاس کوئی منطقی جواز نہیں۔

۳۔ قرآن کو ماننے کے بعد علمی طور پر کسی کے پاس حدیث کو جانچنے کا صرف ایک ہی معیار رہ جاتا ہے اور وہ وہی ہے جس کا اعتبار خود قرآن کے سلسلے میں کیا جاتا ہے۔ یعنی روایت۔ جس کتاب کو ہم قرآن کہتے ہیں

اس کو بھی ہم قرآن اسی لئے سمجھتے ہیں کہ معتبر راویوں کی کثرت سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ یہ وہی کتاب ہے جس کو محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ کہہ کر پیش کیا تھا کہ یہ میرے پاس خدا کی طرف سے اتری ہے۔ اسی طرح معتبر راویوں کے ذریعہ جب یہ ثابت ہو جائے کہ فلاں قول یا فلاں حکم آپ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا قول یا حکم ہے تو صرف یہ ثابت ہو جانا ہی کافی ہے کہ اس کو بھی اسی طرح مقدس مانا جائے جس طرح ہم قرآن کو مقدس مانتے ہیں۔ معتبر راویوں کے ذریعہ کسی حدیث کا آپ سے انتساب ثابت ہو جانے کے بعد اس کو نہ ماننا صرف حدیث کو نہ ماننا نہیں ہے بلکہ یہ خود قرآن کو نہ ماننا ہے۔ کیونکہ حدیث اور قرآن دونوں جب راویوں کے ایک ہی سلسلے سے ہم تک پہنچ رہے ہوں تو حدیث کے معاملہ میں ان کی خبر رسانی کو مشکوک سمجھنے کے بعد قرآن کے معاملہ میں ان کی خبر رسانی کو قابل اعتماد سمجھنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

۴۔ یہ ایک معلوم اور مسلّم بات ہے کہ قرآن میں عام طور پر دین کے اساسی احکام ہیں، ان کی عملی تفصیلات قرآن میں درج نہیں ہیں۔ اب جو شخص قرآن کو ماننے میں سنجیدہ ہو وہ کبھی حدیث کے حجت ہونے پر شبہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ نماز اور زکوٰۃ کی ادائگی سے لے کر حدود کی اقامت تک کسی بھی قرآنی حکم پر وہ عملاً کاربند نہیں ہو سکتا جب تک وہ حدیث اور سنت سے مدد نہ لے۔ ایک آدمی اگر فی الواقع قرآن کو مانتا ہے تو ضرور ایسا ہوگا کہ قرآن میں جب وہ پڑھے گا کہ "نماز ادا کرو" تو وہ چاہے گا کہ قرآنی حکم کی تعمیل میں نماز ادا کرے۔ مگر اس کے بعد جب وہ قرآن میں اس کی عملی تفصیل ڈھونڈے گا تو وہاں اس کو اس کی تفصیل نہیں ملے گی۔ اب اگر وہ سنجیدہ ہے تو لازماً اس کی تلاش اس کو سنت تک لے جائے گی۔ کیوں کہ سنت کے سوا کوئی بھی دوسرا ذریعہ نہیں جس سے کوئی طالب قرآن یہ جان سکے کہ اقیموا الصلوٰۃ کے حکم کی تعمیل کی عملی صورت کیا ہے۔

اس معاملہ کے دو پہلو ہیں اور دونوں ہی کی تکمیل پیغمبر کی سنت سے ہوتی ہے۔ بعض اعمال ایسے ہیں جن کی صرف لفظی تفصیل بتانا کافی نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ ان کو کر کے دکھایا جائے۔ آدمی بالفعل ان کے دیکھنے کے بعد ہی ان پر عمل کر سکتا ہے۔ دوسرے اعمال وہ ہیں جن کے لئے اگرچہ عملی مظاہرہ ضروری نہیں مگر ان کو زیر عمل لانے کے لئے تفصیلی قواعد کی تشکیل ضروری ہوتی ہے۔ عبادات کا تعلق زیادہ تر پہلی قسم سے ہے اور حدود کا تعلق زیادہ تر دوسری قسم سے۔ یہ دونوں ہی باتیں وہ ہیں جن کو ہم صرف قرآن سے معلوم نہیں کر سکتے۔

ایک عالم نے اپنے سفر حجاز کے تاثرات کے ذیل میں لکھا تھا: کتب فقہ و حدیث کے درس و تدریس ہی میں پچیس سالہ مشغولیت کی بنا پر گمان تھا کہ بغیر کسی راہ نما کے بآسانی عمرہ کی ادائیگی مسنون طریقہ پر کی جا سکے گی۔ مگر بیت اللہ پہنچ کر اندازہ ہوا کہ تنہا کتابی علم نہ صرف کافی نہیں بلکہ عملی نمونہ کے بغیر علم سفینہ کیا علم سینہ بھی بے راہ ہی نہیں گمراہ بھی بنا سکتا ہے (الفرقان جون ۱۹۷۹) قرآن میں عبادت کے سلسلہ میں صرف اساسی احکام دئے گئے ہیں۔ ان کی تفصیل حدیث میں ملتی ہے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ صرف لفظی احکام کو پڑھ کر کوئی شخص صحیح طور پر عبادت کی ادائیگی نہیں کر سکتا۔ یہ ایسا کام ہے جو دیکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ نماز اس طرح پڑھو جیسے تم مجھ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو (صلوا کما رأیتمونی اصلی، بخاری) حج کے بارے میں آپ نے فرمایا: تم مجھ کو

دیکھ کر حج کے طریقے سیکھ لو (خذوا عنی مناسککم، مسلم) صحابہ کرام نے رسول کو دیکھ کر عبادت کی، ان سے تابعین نے دیکھا اور ان سے تبع تابعین نے۔ اور اس طرح یہ سلسلہ ہوتے ہوتے ہم تک پہنچ گیا۔ اگر اس سلسلہ کو کاٹ دیا جائے اور رسول کے عملی نمونہ کو سامنے رکھے بغیر عبادت کرنے کی کوشش کی جائے تو کوئی شخص نہ اقیموا الصلوٰۃ پر عمل کر سکتا ہے اور نہ اتموا الحج پر۔

قرآن میں بہت سے جرائم کی سزائیں بتائی گئی ہیں مگر وہ مجمل صورت میں ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن میں حکم ہے کہ چوری کرنے والے کے ہاتھ کاٹ دو (السارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما، مائدہ) آیت سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ کاٹ دئے جائیں۔ مگر اس حکم کو نافذ کرنے کے لئے بہت سی مزید تفصیلات درکار ہیں جن کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں۔ مثلاً چوری کی تعریف کیا ہے۔ کتنے مقدار کی چوری پر حد جاری کی جائے گی۔ پھر یہ کہ دونوں ہاتھ کاٹے جائیں گے یا ایک ہاتھ۔ جب ہاتھ کاٹا جائے گا تو کس مقام سے کاٹا جائے گا۔ اس طرح کے بہت سے سوالات ہیں جن کا جواب حدیث میں موجود ہے۔ اگر ہم حدیث کے تفصیلی بیانات کو شامل نہ کریں تو ہم قرآن کی بیان کردہ سزا کو عدالتی طور پر جاری نہیں کر سکتے۔

۵۔ عبداللہ بن عباس رض کہتے ہیں کہ قرآن میں جب یہ آیت اتری: اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔ جس دن کہ اس کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیوں اور ان کے پہلوؤں کو اور ان کی پیٹھوں کو داغا جائے گا، یہی ہے وہ جس کو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا پس اب اپنے جمع کرنے کا مزا چکھو (توبہ) مسلمانوں کو یہ بات بہت بھاری معلوم ہوئی۔ انھوں نے کہا: ہم میں سے کوئی مال نہیں چھوڑ سکتا جو اس کے بعد بچوں کے کام آئے۔ حضرت عمر رض نے کہا کہ میں اس کو معلوم کرتا ہوں۔ وہ اور حضرت ثوبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ اے خدا کے رسول، یہ آیت آپ کے اصحاب پر بہت شاق گزری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے زکوٰۃ اسی لئے فرض کیا ہے کہ زکوٰۃ نکالنے کے بعد تمھارا بقیہ مال پاک ہو جائے (ابن کثیر) اس طرح کی مثالیں کثرت سے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے حدیث کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔

۶۔ قدیم زمانے میں حافظے بہت قوی ہوتے تھے۔ عربوں کا حافظہ اور بھی زیادہ مشہور تھا۔ چنانچہ آپ کی باتیں لوگوں کو تقریباً اصلی صورت میں یاد ہو جاتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک گفتگو جو مختلف صحابہ نے الگ الگ بیان کی ہو جب ہم اس کو جمع کرکے دیکھتے ہیں تو مختلف روایتوں کے درمیان بہت کم لفظی فرق دکھائی دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام مختصر اور جامع ہوتا تھا۔ مزید یہ کہ آپ اکثر اپنی بات کو ایک سے زیادہ بار دہراتے تھے۔ اس طرح آپ کے کلام کو یاد رکھنا بہت آسان ہو جاتا تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات فرماتے تو اس کو تین بار دہراتے، یہاں تک کہ وہ بات اچھی طرح لوگوں کی سمجھ میں آجائے (کان اذا تکلم بکلمۃ اعادھا ثلاثا حتی تفهم عنه، بخاری)

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم اس کی بھی نگرانی فرماتے تھے کہ آپ کا کلام محفوظ کرنے میں کسی نے غلطی تو نہیں کی ہے۔ ایک صحابی کو آپ نے بتایا کہ سوتے وقت تم یہ دعا پڑھ لیا کرو۔ جب آپ دعا کے کلمات بتا چکے تو ان سے کہا کہ اس کو دہراؤ۔ صحابی نے ایک کلمہ کو دہراتے ہوئے ذرا فرق سے اس طرح ادا کیا: آمنتُ بکتابك الذی انزلت و برسولك الذی ارسلت۔ آپ نے فرمایا نہیں، اس طرح کہو: و بنبیك الذی ارسلت۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے تھے خدا کی طرف سے فرماتے تھے۔ اس لئے آپ برابر لوگوں کو تلقین کرتے تھے کہ میری باتوں کو سن کر محفوظ رکھو اور ان کو تمام لوگوں تک پہنچا دو۔ آپ نے دعا کرتے ہوئے فرمایا: اللہ اس بندہ کو تر و تازہ رکھے جس نے میری باتوں کو سنا پھر اس کو یاد کر لیا اور جس نے اس کو نہیں سنا ہے اس تک اس کو پہنچا دیا (نضر اللہ عبدا سمع مقالتی فوعا واداها الی من لم یسمعها، بخاری) حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ وفد عبدالقیس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا۔ آپ نے اس کو دینی احکام بتائے اور اس کے بعد فرمایا: اس کو یاد کر لو اور ان لوگوں کو باخبر کر دو جو تمھارے پیچھے ہیں (احفظوه و اخبروا من وراءکم، بخاری) حجۃ الوداع کے خطبہ کے بعد آپ نے ایک لاکھ کے مجمع سے پوچھا: کیا میں نے تمھیں پہنچا دیا۔ لوگوں نے گواہی دی کہ ہاں آپ نے پہنچا دیا اور نصیحت کا حق ادا کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: سنو، جو حاضر ہے وہ غائب کو پہنچا دے، اس لئے کہ جس کو پہنچایا جائے ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے زیادہ محفوظ کرنے والا ہو جس نے مجھ سے سنا ہے (الا لیبلغ الشاهد الغائب فلعل من یبلغه ان یکون اوعی له من بعض سمعه، (بخاری) آپ کی اس تلقین کی وجہ سے آپ کے اصحاب خصوصیت سے آپ کا کلام محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ حضرت انس کا بیان ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آپ کی باتوں کو سنتے اور جب آپ مجلس سے چلے جاتے تو ہم یک جا ہو کر آپ کی باتوں کا دور کرتے۔ ہم میں سے ہر شخص باری باری آپ کی سنی ہوئی باتوں کو دہراتا۔ جب ہم اس مجلس سے اٹھتے تو آپ کی باتیں ہم کو اس طرح یاد ہو جاتیں جیسے کہ وہ ہمارے دلوں میں بو دی گئی ہیں (مجمع الزوائد)

روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو تلقین کرتے تھے کہ وہ آپ کا کلام لکھ لیا کریں اور آپ خود بھی اپنی ہدایات ان کو لکھوا کر دیتے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک انصاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھتے تھے اور آپ کی باتوں کو بہت پسند کرتے تھے مگر یاد نہیں رکھ پاتے تھے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی یادداشت کی خرابی کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا کہ اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو اور اپنے ہاتھ سے لکھنے کی طرف اشارہ فرمایا (استعن بیمینك و اوماً بیده للخط، ترمذی) حضرت عبداللہ بن عمر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علم کو مقید کرو۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ مقید کرنا کیا ہے۔ آپ نے فرمایا لکھ لینا (مجمع الزوائد) صحابہ نے آپ کی پیروی میں یہی نصیحت اپنے بعد والوں کو کی —

حضرت انس نے اپنے بچوں کو مخاطب کر کے کہا: اے میرے بچو، اس علم کو لکھ لو (یا بنیّ قیّدوا ھذا العلم، دارمی) اس طرح کے واقعات بہت ہیں۔ مختصر مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ تحفۃ الاحوذی مولفہ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری

روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آپ کی مجلس میں بیٹھ کر آپ کے کلام کو لکھا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر ایک روایت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: اس اثنا میں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے (بینما نحن حول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکتب ـ ـ ـ دارمی) چونکہ آپ اپنی ہر بات ٹھہر ٹھہر کر اور اکثر دہرا کر فرماتے تھے اس لئے سننے والوں کے لئے اس کو لکھ لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ جو کچھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتا اس کو لکھ لیتا (ابوداؤد) حضرت عبداللہ بن عمرو کے پاس لکھتے لکھتے احادیث کا ایک ذخیرہ جمع ہو گیا جس کا نام انھوں نے صادقہ رکھا۔ وہ کہتے ہیں: صادقہ وہ کتاب ہے جس کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھا ہے (فاما الصادقۃ فصحیفۃ کتبتہا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) معبد بن ہلال تابعی کہتے ہیں کہ حضرت انس سے جب لوگ کسی حدیث کی تحقیق کرتے تو وہ ایک دفتر نکال کر لاتے اور کہتے کہ یہ وہ احادیث ہیں جن کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی بہت سی چیزیں بول کر لکھواتے تھے۔ احکام، معاہدے، خطوط، دستاویز وغیرہ۔ اس قسم کی سیاسی دستاویزوں کو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے جمع کر کے شائع کر دیا ہے ۔ ۲۸۱ خطوط و وثائق پر مشتمل اس کتاب کا نام مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ ہے۔ آپ کا اس طرح لکھوانا بکثرت روایات سے ثابت ہوتا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا تھا۔ حضرت ابوہریرہ رض کہتے ہیں کہ ابوشاہ یمنی نے درخواست کی کہ یہ خطبہ میرے لئے لکھوا دیا جائے۔ چنانچہ آپ نے اس خطبہ کو لکھوا کر ان کے حوالے کیا (ابوداؤد) حضرت عمرو بن حزم کو سنہ ۱۰ھ میں آپ نے نجران میں عامل بنا کر بھیجا۔ اس سلسلے میں حافظ ابن حجر مالکی لکھتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم کے لئے صدقات، دیت، فرائض اور سنن کے متعلق ایک تحریر لکھوائی (کتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب الصدقات والدیات والفرائض والسنن لعمرو بن حزم وغیرہ، جامع بیان العلم)

خلاصہ یہ کہ احادیث کو آپ کے زمانہ ہی میں ہزاروں جاں نثار اصحاب نے محفوظ کرنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ لوگ زبانی یاد کر لیا کرتے تھے، کچھ لوگ لکھ کر محفوظ کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ صحابہ کے ذریعہ یہ ذخیرۂ احادیث تابعین کو منتقل ہوا اور پھر تبع تابعین کو۔ اس مدت میں نہ صرف کتابت کا اہتمام مسلسل جاری رہا بلکہ ایک مستقل علم حدیث وجود میں آیا جس کے تحت روایات اور راویوں کی فنی جانچ کی جانے لگی۔ یہاں تک کہ احادیث کا ذخیرہ ان مستقل کتابوں کی صورت میں باقاعدہ مدون ہو گیا جو آج ہمارے سامنے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ثابت شدہ احادیث اسی طرح قابل اعتبار ہیں جس طرح قرآن۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقۃً یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے۔ یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

تفسیر دعوۃ القرآن

سورۂ فاتحہ و سورۂ بقرہ

مرتبہ مولانا شمس پیرزادہ

عصر حاضر کے ذہن کو متاثر کرنے والی مختصر، مدلل اور جامع تفسیر جس میں جدید فکری گمراہیوں کے مقابلہ میں دعوت قرآنی کو اجاگر کیا گیا ہے اور تعلیمات ربانی کی حکمتوں، نظم کلام کے رموز اور مسائل حیات میں قرآن کی رہنمائی کو سہل اور دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ صفحات ۱۸۴ ہدیہ صرف پانچ روپے

شائع کردہ: اِدارہ دعوۃ القرآن ۵۹ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

اسلام کا تعارف

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۲۴، قیمت ۵۰/.

اسلام

ایک عظیم جدوجہد

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۸۰ قیمت ۱/۶۰

مکتبہ الرسالہ
جمعیت بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی

سوشلزم

ایک غیر اسلامی نظریہ

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۷۲، قیمت ۱/۲۵

مارکسزم

تاریخ جس کو رد کر چکی ہے

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۱۴۸ قیمت ۳/۰۰

مکتبہ الرسالہ
جمعیت بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

- **دین کیا ہے** — صفحات ۳۲ قیمت ۱/۵۰ روپے
- **تجدیدِ دین** — صفحات ۴۸ قیمت -/۲ روپے
- **مذہب اور جدید چیلنج** — صفحات ۲۲۴ قیمت ۱۳/۵۰ روپے
- **تعمیرِ ملت** — صفحات ۴۸ قیمت -/۲ روپے
- **الاسلام** — صفحات ۱۷۶ قیمت -/۱۲ روپے
- **اسلام دینِ فطرت** — صفحات ۴۸ قیمت -/۲ روپے
- **ظہورِ اسلام** — صفحات ۲۰۰ قیمت -/۱۲ روپے
- **زلزلۂ قیامت** — صفحات ۶۴ قیمت -/۳ روپے
- **اسلامی دعوت** — صفحات ۴۸ قیمت -/۲ روپے
- **تاریخ کا سبق** — صفحات ۴۸ قیمت -/۲ روپے
- **عقلیاتِ اسلام** — صفحات ۴۸ قیمت -/۲ روپے
- **قرآن کا مطلوب انسان** — صفحات ۸۰ قیمت ۴/۵۰ روپے
- **مذہب اور سائنس** — صفحات ۷۲ قیمت -/۴
- **پیغمبر اسلام** — صفحات ۴۸ قیمت -/۲
- **سبق آموز واقعات** — صفحات ۴۸ قیمت -/۲

مکتبہ الرسالہ جمعیت بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

ثمین خالد پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

REGD. R. N. NO 28822/76
REGD. D. (D.) NO. 532

July 1980
Issue No. 44

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231
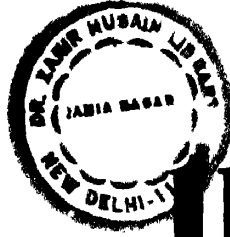
الرسالہ

سرپرست
مولانا وحیدالدین خاں

اگست ۱۹۸۰
شمارہ ۴۵

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ صرف ایک ماہانہ پرچہ نہیں، وہ ایک دینی اور تعمیری مشن ہے۔ اس کا حق اس طرح ادا نہیں ہوتا کہ آپ اس کو پڑھ لیں یا ڈاک کے ذریعہ ہمارے نام ایک تعریفی خط بھیج دیں۔ آپ کے اوپر اس کا حق کم سے کم یہ ہے کہ آپ اس کی ایجنسی لیں اور اپنے حلقہ میں اس کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ ہر مشن کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس میں شریک کرے ——— ایجنسی، اس مشن میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی سب سے زیادہ آسان صورت ہے۔ الرسالہ کی ایجنسی لیجئے، مستقبل کی بننے والی فہرست میں اپنا نام درج کرائیے۔

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی Al-Risala Monthly لکھیں

سنت رسول

لا تزالون منصورين على اعدائكم ما دمتم متمسكين بسنتي فان خرجتم عن سنتي سلط الله عليكم من لا يخافكم ولا يرحمكم حتى تعودوا الى سنتي (رواه مسلم)

تم اپنے دشمنوں پر اس وقت تک غالب رہوگے جب تک میری سنت کو پکڑے رہوگے۔ اور جب تم میری سنت سے نکل جاؤگے تو اللہ تمہارے اوپر ایسے کو مسلط کر دے گا جو نہ تم سے ڈرے گا اور نہ تم پر رحم کرے گا، یہاں تک کہ تم میری سنت کی طرف لوٹ آؤ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین چھوڑا ہے اس میں کوئی کمی نہیں جس کو کوئی پورا کرے۔ اس میں کوئی زیادتی نہیں جس کو کوئی اس سے دور کرے۔ یہ پوری طرح ایک کامل دین ہے۔ ہماری کامیابی کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم اس کی اسی طرح پیروی کریں جیسا کہ وہ ہے۔ اگر ہم نے اس میں کمی بیشی کی کوشش کی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ باہمی اختلاف اور تصادم شروع ہو جائے گا۔ اور باہمی اختلاف ہی کا دوسرا نام کمزوری اور مغلوبیت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو کچھ عقائد سکھائے ہیں ـــــ خدا ایک ہے۔ مرنے کے بعد جنت اور دوزخ ہے۔ نبیوں پر خدا اپنے فرشتے کے ذریعہ اپنا کلام بھیجتا ہے، وغیرہ۔ ان عقائد کو ہمیں اسی طرح ماننا ہے جس طرح وہ قرآن اور حدیث میں آئے ہیں۔ اگر ہم اپنی طرف سے موشگافیاں کریں اور نئی نئی کلامی بحثیں چھیڑیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ مختلف لوگ مختلف باتیں نکالیں گے۔ رایوں کا اختلاف امت کے افراد کو ایک دوسرے سے ٹکرا دے گا۔ اسی طرح عبادت کے سلسلے میں آپ نے کچھ احکام بتائے اور ان کو کرکے دکھا دیا۔ اب ہمیں چاہئے کہ ان کو جیسا ہے ویسا ہی پکڑ لیں۔ اگر ہم نے عبادت میں نئے مسائل اور نئے طریقے نکالے تو اس کا لازمی نتیجہ فرقہ بندی ہوگا جو بالآخر امت کی کمزوری کا باعث بنے گا۔ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے تکلیف پہنچے تو آپ نے بتایا کہ صبر کرو اور اپنے بھائی کو معاف کر دو۔ اب اگر ایسے موقع پر ایک آدمی دوسرے آدمی سے بدلہ لینے اور اس کو اس کے کئے کا مزہ چکھانے کے لئے کھڑا ہو جائے تو اس سے آپس کا ٹکراؤ وجود میں آئے گا اور بالآخر ساری امت کو کمزور کر دے گا۔ حکومت کے معاملات میں آپ نے یہ تعلیم دی کہ منصب کی خواہش نہ کرو۔ اب اگر لوگ عہدہ اور منصب کی خواہش کرنے لگیں تو باہمی رقابت اور دشمنی پیدا ہوگی۔ ملت کے اندر مختلف جتھے بن کر ایک دوسرے سے لڑنے لگیں گے۔ ملت خود اپنے افراد کے ہاتھوں برباد کی جانے لگے گی۔ آپ نے یہ تعلیم دی کہ دنیا کو غیر اہم سمجھو اور ساری توجہ آخرت کی طرف لگاؤ۔ اب اگر امت کے لوگ دنیا کی چیزوں کو اپنا مقصود سمجھ لیں تو ایک چیز کے کئی کئی امیدوار بنیں گے اور اس کے حصول کے لئے باہم لڑنا شروع کر دیں گے۔ اس کے نتیجہ میں پورا مسلم معاشرہ حسد، بغض، نفرت اور انتقام کی آگ میں جل اٹھے گا۔

جنّت کس کے لئے

جنت کا داخلہ صرف اس کے لئے لکھا گیا ہے جس نے ہر دوسری عظمت کی نفی کر کے ایک ایک خدا کی عظمت کو پایا ہو، جس نے اپنے سینہ کو ہر دوسری محبت سے خالی کر کے اس میں صرف خدا کی محبت کو جگہ دی ہو۔ جب کسی سے کوئی اختلافی معاملہ پڑتا ہے اور آدمی انصاف کو چھوڑ کر بے انصافی کا رویہ اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے لئے جنت میں بسائے جانے کا استحقاق کھو دیتا ہے۔ کیونکہ جنت انصاف پسندوں کی بستی ہے نہ کہ بے انصافوں کی سرائے۔ جب کسی سے شکایت پیدا ہونے کے موقع پر آدمی کبر اور سرکشی کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ جنت کی دنیا میں بسائے جانے کے قابل نہیں۔ کیونکہ جنت متواضعین کے لئے ہے نہ کہ متکبرین کے لئے۔ جب کسی سے ان بن ہونے پر آدمی اس کی بربادی کے منصوبے بناتا ہے تو وہ اپنے آپ کو جنت کا نااہل ثابت کر دیتا ہے۔ کیونکہ جنت ان اونچے انسانوں کی بستی ہے جو ایک دوسرے کی عزت کرنے والے ہوں نہ کہ ایک دوسرے کی کاٹ کرنے والے۔ کسی غیر خدا پر تنقید سن کر جب آدمی کے عقیدت و محبت کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں تو وہ ثابت کرتا ہے کہ وہ جنت کی دنیا میں بسائے جانے کے قابل نہیں۔ کیونکہ جنت تو ان پاکیزہ روحوں کی کالونی ہے جو خدا کی محبت و عقیدت میں جیتے ہوں نہ کہ انسانوں میں سے کسی انسان کی عقیدت و محبت میں۔ جب آدمی اپنی تعریف سن کر لذت لیتا ہے اور اپنی عزت و شہرت کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے تو وہ جنت کی شہریت کو کھو دیتا ہے کیونکہ جنت ان بے نفس لوگوں کے لئے ہے جو صرف اللہ کی تعریف پر خوش ہوں اور اللہ کی کبریائی کو دیکھ کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہوں۔ جب آدمی کے سامنے سچائی آئے اور وہ اس کے ساتھ اندھے پن کا معاملہ کرے تو وہ جنت میں بسائے جانے کا استحقاق کھو دیتا ہے۔ کیونکہ جنت تو ان لوگوں کا مقام ہے جو اپنے آپ کو حق کے ساتھ اس طرح شامل کر لیں کہ حق کو ہمیشہ حق کی صورت میں دیکھیں اور باطل کو ہمیشہ باطل کی صورت میں۔

انسانوں کی تین قسمیں

ایمان و اسلام کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی اللہ سے ڈرتا ہو۔ وہ اپنے معاملات میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ وہ اس طرح زندگی گزارے گویا وہ اپنے آپ پر خدا کی نگرانی قائم کئے ہوئے ہے۔ وہ خدا کو نہ دیکھتے ہوئے بھی تمام دکھائی دینے والی طاقتوں سے زیادہ اس کا اندیشہ رکھتا ہو۔ وہ خدا کے پاس ایسا دل لے کر پہنچے جو دنیا کی زندگی میں ہمیشہ خدا کی طرف متوجہ رہا ہو۔ یہی اللہ کے مطلوب اور محبوب بندے ہیں۔ جب اللہ کی خاطر وہ دنیا کا دکھ اٹھا کر آخرت میں پہنچیں گے تو ان کا رب ان کو نہال کر دے گا۔ وہ ان سے کہے گا کہ ہرے بھرے باغوں والے جنتی مکانات میں داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ وہاں رہو۔ یہاں تمہارے لئے وہ سب کچھ ہے جو تم چاہو۔ اور ہمارے اتھاہ انعامات اس کے علاوہ ہیں۔ (ق ۳۵-۳۱)

دوسرے لوگ وہ ہیں جو اللہ پر ایمان لائے اور عمل صالح کیا۔ تاہم ان سے کوتاہیاں بھی ہوئیں۔ ان کے ٹھیک کام میں غلط کام بھی شامل ہوتا رہا۔ مگر اس کمزوری کے باوجود وہ ڈھیٹ نہیں بنے۔ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اللہ سے معافی مانگتے رہے اور بار بار اس کی طرف پلٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ امید ہے کہ اللہ ان کو بھی اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے گا۔ وہ جب خدا کی طرف لوٹے تو خدا بھی ان کی طرف لوٹے گا۔ کیوں کہ وہ بخشنے والا مہربان ہے (توبہ ۱۰۲)

اس کے بعد تیسرا گروہ وہ ہے جس نے نفس پرستی، دنیا طلبی اور گھمنڈ کو اپنا دین بنایا۔ انھوں نے اپنی زبان اللہ کے لئے بند نہیں کی۔ ان کے قدم اللہ کے لئے نہیں رکے۔ ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں جہنم کی آگ کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے لئے نہیں جئے بلکہ اپنے لئے جئے۔ انھوں نے آخرت کی فکر نہیں کی بلکہ دنیا کی فکر کی۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ وہ خدا کی ابدی دنیا میں عزت کا مقام حاصل کر سکیں (ہود ۱۶-۱۵)

خدا کی موجودگی کا تجربہ

اپالو ۱۵ میں امریکہ کے جو تین خلا باز چاند پر گئے تھے، ان میں سے ایک کرنل جیمز اردن (James Irwin) تھے۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں کہا کہ اگست ۱۹۷۲ کا وہ لمحہ میرے لئے بڑا عجیب تھا جب میں نے چاند کی سطح پر قدم رکھا۔ میں نے وہاں خدا کی موجودگی (God's Presence) کو محسوس کیا۔ انھوں نے کہا کہ میری روح پر اس وقت وجدانی کیفیت طاری تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے خدا بہت قریب ہو۔ خدا کی عظمت مجھے اپنی آنکھوں سے نظر آرہی تھی۔ چاند کا سفر میرے لئے صرف ایک سائنسی سفر نہیں تھا بلکہ اس سے مجھے روحانی زندگی نصیب ہوئی (ٹریبون ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۲)

کرنل جیمز اردن کا یہ تجربہ کوئی انوکھا تجربہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ اتنا حیرتناک ہے کہ اس کو دیکھ کر آدمی خالق کی صناعیوں میں ڈوب جائے۔ تخلیق کے کمال میں ہر آن خالق کا چہرہ جھلک رہا ہے۔ مگر ہمارے گرد و پیش جو دنیا ہے اس کو ہم بچپن سے دیکھتے دیکھتے عادی ہو جاتے ہیں۔ اس سے ہم اتنا مانوس ہو جاتے ہیں کہ اس کے انوکھے پن کا ہم کو احساس نہیں ہوتا۔ ہوا اور پانی اور درخت اور چڑیا غرض جو کچھ بھی ہماری دنیا میں ہے سب کا سب حد درجہ عجیب ہے، ہر چیز اپنے خالق کا آئینہ ہے۔ مگر عادی ہونے کی وجہ سے ہم اس کے عجوبہ پن کو محسوس نہیں کر پاتے۔ مگر ایک شخص جب اچانک چاند کے اوپر اترا اور پہلی بار وہاں کے تخلیقی منظر کو دیکھا تو وہ اس کے خالق کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے تخلیق کے کارنامہ میں اس کے خالق کو موجود پایا۔ ہماری موجودہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں یہاں بھی "خدا کی موجودگی" کا تجربہ اسی طرح ہو سکتا ہے جس طرح چاند پر پہنچ کر کرنل اردن کو ہوا۔ مگر لوگ موجودہ دنیا کو اس استعجابی نگاہ سے نہیں دیکھ پاتے جس طرح چاند کا ایک نیا مسافر چاند کو دیکھتا ہے۔ اگر ہم اپنی دنیا کو اس نظر سے دیکھنے لگیں تو ہر وقت ہم کو اپنے پاس "خدا کی موجودگی" کا تجربہ ہو۔ ہم اس طرح رہنے لگیں جیسے کہ ہم خدا کے پڑوس میں رہ رہے ہیں اور ہر وقت وہ ہماری نظروں کے سامنے ہے۔

اگر ہم ایک اعلیٰ درجہ کی مشین کو پہلی بار دیکھیں تو فی الفور ہم اس کے ماہر انجینیر کی موجودگی کو وہاں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم دنیا کو اور اس کی چیزوں کو گہرائی کے ساتھ دیکھ سکیں تو اسی وقت ہم وہاں خدا کی موجودگی کو پالیں گے۔ خالق ہم کو اس طرح نظر آئے گا کہ ہم خالق اور تخلیق کو ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکیں۔

موجودہ دنیا میں انسان کی سب سے بڑی یافت یہ ہے کہ وہ خدا کو دیکھنے لگے، وہ اپنے پاس خدا کی موجودگی کو محسوس کرے۔ اگر آدمی کا احساس زندہ ہو تو سورج کی سنہری کرنوں میں اس کو خدا کا نور جگمگاتا ہوا دکھائی دے گا ہرے بھرے درختوں کے حسین منظر میں وہ خدا کا روپ جھلکتا ہوا پائے گا۔ ہواؤں کے لطیف جھونکے میں اس کو لمس ربانی کا تجربہ ہوگا۔ اپنی ہتھیلی اور اپنی پیشانی کو زمین پر رکھتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوگا گویا اس نے اپنا وجود اپنے رب کے قدموں میں ڈال دیا ہے۔ خدا ہر جگہ موجود ہے بشرطیکہ دیکھنے والی نگاہ آدمی کو حاصل ہو جائے۔

غلطی کرکے پلٹنا

ایک مسافر کو کلکتہ جانا ہے، وہ ایک ٹرین میں سوار ہوتا ہے۔ مگر روانگی کے بعد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس گاڑی میں بیٹھا ہوا ہے وہ امرت سر جانے والی گاڑی ہے۔ ایسے مسافر کا حال کیا ہوگا۔ وہ اپنی غلطی پر تڑپ اٹھے گا۔ جس سیٹ پر وہ اطمینان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا وہ اس کو کاٹنے لگے گی۔ اگلے اسٹیشن پر جیسے ہی گاڑی رکے گی وہ فوراً اتر پڑے گا تاکہ واپس جاکر اپنی مطلوبہ گاڑی پکڑ سکے۔

ٹرین کا ایک مسافر جس طرح فوراً اپنی غلطی کو مان کر پلٹ پڑتا ہے وہی حال مومن کا آخرت کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ اس سے جب کوئی ایسی غلطی ہو جاتی ہے جو آخرت کے رخ سے بے رخ کرنے والی ہو، جو اس کو اگلی زندگی میں نقصان پہنچانے والی ہو تو وہ بے حد شرمندہ ہوتا ہے اس کو اپنی غلطی ماننے میں دیر نہیں لگتی۔ وہ غلط سمت سے لوٹ کر فوراً صحیح سمت میں چلنے لگتا ہے۔

مومن وہی ہے جو غلطی کرکے پلٹ آئے۔ جو غصہ ہونے کے بعد معاف کر دے۔ عزت کا سوال جس کو اعتراف سے روکنے والا ثابت نہ ہو۔ اس کے برعکس جس کا حال یہ ہو کہ وہ غلطیوں میں لپٹا رہے۔ کسی سے ایک بار رنجش ہو جائے تو اس کو معاف کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ جو کسی حال میں اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اقرار نہ کرے۔ ایسا شخص اللہ کی نظر میں مومن نہیں ہے، خواہ وہ اپنے کو کتنا ہی بڑا مسلمان سمجھتا ہو، خواہ اس نے ایمان و اسلام کے کتنے ہی تمغے اپنے اوپر لگا رکھے ہوں۔ موجودہ دنیا میں آدمی اپنی غلطی کو ماننا نہ چاہے تو اس کو اپنی غلطی کی تاویل کے لئے بہت سے الفاظ مل جاتے ہیں۔ کسی کے لئے اس کی دنیوی شان و شوکت اس کی برائیوں کا پردہ بن جاتی ہے۔ مگر آخرت میں کوئی چیز کسی کے کام نہ آئے گی۔ وہاں حقیقتیں اس طرح کھل جائیں گی کہ اندھے بھی اس کو دیکھنے لگیں۔

استاد کے بغیر

ایک خاتون نے انگریزی پڑھی۔ ان کے والد مولوی تھے۔ ان کے گھر پر انگریزی کا ماحول نہ تھا۔ چنانچہ ایم۔ اے (انگلش) انھوں نے بمشکل تھرڈ نمبروں سے پاس کیا۔ ان کو شوق تھا کہ ان کو انگریزی لکھنا آجائے۔ یہ کام ایک اچھے استاد کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن ان کے گھر کے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ کوئی استاد رکھیں اور اس کی مدد سے اپنے اندر انگریزی لکھنے کی صلاحیت پیدا کریں۔

مگر جہاں تمام راستے بند ہوتے ہیں وہاں بھی ایک راستہ آدمی کے لئے کھلا ہوتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی کے اندر طلب ہو اور وہ اپنے مقصد کے حصول میں اپنی پوری طاقت لگا دے۔ خاتون نے استاد کے مسئلہ کا ایک نہایت کامیاب حل تلاش کر لیا۔ انھوں نے لندن کی چھپی ہوئی ایک کتاب پڑھی۔ اس میں انگریز مصنف نے بیرونی ملکوں کے انگریزی طالب علموں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ انگریزی لکھنے کی مشق اس طرح کریں کہ کسی اہل زبان کی لکھی ہوئی کوئی کتاب لے لیں۔ اس کے بعد روزانہ اس سے چند صفحات لے کر پہلے اس کا اپنی زبان میں ترجمہ کریں پھر کتاب بند کر کے الگ رکھ دیں۔ اور اپنے ترجمہ کو بطور خود انگریزی میں منتقل کریں۔ جب ایسا کر لیں تو اس کے بعد دوبارہ کتاب کھولیں اور اس کی چھپی ہوئی عبارت سے اپنے انگریزی ترجمہ کا مقابلہ کریں۔ جہاں نظر آئے کہ انھوں نے کوئی غلطی کی ہے یا طریق اظہار میں کوتاہی ہوئی ہے اس کو اچھی طرح ذہن کی گرفت میں لائیں اور کتاب کی روشنی میں خود ہی اپنے مضمون کی اصلاح کریں۔

خاتون نے اس بات کو پکڑ لیا۔ اب وہ روزانہ اس پر عمل کرنے لگیں۔ انگریزی اخبار یا رسالہ یا کسی کتاب سے انگریزی کا کوئی مضمون لے کر وہ روزانہ اس کو اردو میں ترجمہ کرتیں اور پھر اپنے اردو ترجمہ کو دوبارہ انگریزی میں منتقل کرتیں اور پھر اپنے انگریزی ترجمہ کو اصل انگریزی عبارت سے ملا کر دیکھتیں کہ کہاں کہاں فرق ہے۔ کہاں کہاں ان سے کوئی کمی ہوئی ہے۔ اس طرح وہ روزانہ تقریباً دو سال تک کرتی رہیں۔ اس کے بعد ان کی انگریزی اتنی اچھی ہوگئی کہ وہ انگریزی میں مضامین لکھنے لگیں۔ ان کے مضامین انگریزی جرائد میں چھپنے لگے۔ ان کے بھائی نے اکسپورٹ کا ایک کام شروع کیا جس میں انگریزی خط و کتابت کی کافی ضرورت پڑتی تھی۔ خاتون نے انگریزی خط و کتابت کا پورا کام سنبھال لیا اور اس کو کامیابی کے ساتھ انجام دیا ——— مذکورہ خاتون نے جو تجربہ انگریزی زبان میں کیا وہی تجربہ دوسری زبانوں میں بھی کیا جاسکتا ہے۔

ہماری دنیا کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی کامیابی تک پہنچنے کے بہت سے ممکن طریقے ہوتے ہیں۔ کچھ دروازے اگر آدمی کے اوپر بند ہو جائیں تب بھی کچھ دوسرے دروازے کھلے ہوتے ہیں جن میں داخل ہو کر وہ اپنی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی شخص کی ناکامی کا سبب ہمیشہ پست ہمتی ہوتا ہے نہ کہ اس کے لئے مواقع کا نہ ہونا۔

گروہ پرستی

عبداللہ بن سلام ایک یہودی عالم تھے جو قبیلہ بنو قینقاع سے تعلق رکھتے تھے۔ جب انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر سنی تو انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ وہی نبی ہیں جن کا ذکر ہماری کتابوں میں آیا ہے اور جن کا ہم انتظار کر رہے تھے۔ جب تک آپ مکہ میں تھے وہ خاموش رہے۔ جب آپ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو عبداللہ بن سلام مدینہ آئے تاکہ آپ سے ملیں۔ جب وہ آئے تو ان کے مشورے کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک گھر کے اندر بٹھا دیا اور یہودیوں کو بلا کر پوچھا کہ عبداللہ بن سلام تمھارے درمیان کیسے آدمی ہیں۔ انھوں نے کہا: سیدنا وابن سیدنا وحبرنا وعالمنا (وہ ہمارے سردار ہیں اور ہمارے سردار کے بیٹے ہیں۔ وہ ہمارے بزرگ اور ہمارے عالم ہیں) اس کے بعد عبداللہ بن سلام گھر سے نکل کر ان کے سامنے آگئے اور کہا: اے گروہ یہود، اللہ سے ڈرو اور محمدؐ جو کچھ لائے ہیں اس کو قبول کر لو۔ خدا کی قسم تم جانتے ہو کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ تم ان کو تورات میں لکھا ہوا پاتے ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ میں ان پر ایمان لاتا ہوں۔ ان کی تصدیق کرتا ہوں اور میں نے ان کو پہچان لیا ہے۔

عبداللہ بن سلام نے جب اپنے قبول اسلام کا اعلان کیا تو وہی یہود جو اس سے پہلے ان کے علم اور ان کی فضیلت کا اعتراف شاندار لفظوں میں کر چکے تھے بولے: تم نے جھوٹ کہا (کذبت) حتیٰ کہ وہ ان کو مارنے کے لئے دوڑے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھ چند اور یہودیوں نے اسلام قبول کیا تو یہودی علماء نے کہا: محمد پر جو لوگ ایمان لائے ہیں اور ان کا اتباع کیا ہے وہ صرف ہمارے برے لوگ ہیں۔ اگر وہ ہمارے اچھے لوگ ہوتے تو ہرگز وہ آباء و اجداد کے دین کو نہ چھوڑتے اور دوسرے دین میں نہ چلے جاتے (ما آمن بمحمد ولا اتبعه الا شرارنا، ولو کانوا من اخیارنا ما ترکوا دین آبائهم وذهبوا الی دین غیرہ، سیرت ابن ہشام جزء ۲)

بہت سے لوگ خدا اور مذہب کا نام لیتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا پرست ہیں۔ مگر جب جانچ کا وقت آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنے حزب کے پرستار تھے نہ کہ حقیقۃً خدا کے پرستار۔ جب کسی آدمی کا یہ حال ہو کہ اس کو صرف وہ حق حق نظر آئے جو اس کے اپنے مانوس گروہ کی طرف سے اس کو مل رہا ہے، وہ حق اس کو حق دکھائی نہ دے جو اس کے گروہ کے باہر سے اس کے پاس آ رہا ہے تو وہ حق کا نہیں بلکہ اپنے گروہ کا پرستار ہے۔ ایسے آدمی کا شمار اللہ کے یہاں حق پرستوں میں نہیں ہوگا بلکہ باطل پرستوں میں ہوگا۔ کیوں کہ حق کے نام پر وہ جس کی پرستش کر رہا تھا وہ در اصل اس کا اپنا گروہ تھا نہ کہ فی الواقع حق و صداقت۔

خدا پرست وہ ہے جو خدا کے سوا ہر دوسری چیز سے اپنے کو اوپر اٹھا لے۔ خدا کے مقابلہ میں کوئی بھی دوسری چیز اس کے لئے عزیز تر نہ رہے۔ اس کی عقیدت و محبت کا مرکز ہر اعتبار سے صرف ایک اللہ ہو جائے۔

اوپر اٹھ کر سوچنا

جب تیز ہواؤں کا طوفان آتا ہے تو کم زور بازوؤں والی چھوٹی چڑیاں اس کے اندر گھر کر رہ جاتی ہیں۔ مگر جو بڑی چڑیاں ہوتی ہیں وہ اپنے مضبوط بازوؤں کے ساتھ اڑ کر اوپر چلی جاتی ہیں اور اس طرح وہ طوفان کی زد سے باہر نکل جاتی ہیں۔ اسی واقعہ کی روشنی میں انگریزی مثل ہے دی بگ برڈ آف دی اسٹارم (طوفان کی بڑی چڑیا) یہ مثل اس وقت بولی جاتی ہے جب کہ کوئی شخص حالات کے گھراؤ کو توڑ کر باہر نکل جانے میں کامیاب ہو گیا ہو۔

اسی طرح سوچنے کی بھی دو سطحیں ہوتی ہیں۔ کچھ لوگوں کی سوچ ان کے قریبی حالات کے زیر اثر بنتی ہے۔ جن معاملات میں وہ گھرے ہوئے ہیں ان سے الگ ہو کر وہ سوچ نہیں پاتے۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو "طوفان کی بڑی چڑیا" کی طرح اپنے قریب کے حالات سے اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ وہ حالات سے متاثر ہو کر نہیں سوچتے بلکہ حالات سے بلند ہو کر اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔

مومن کی سوچ بڑی چڑیا کے انداز کی سوچ (بگ برڈ تھنکنگ) ہوتی ہے۔ وہ حالات سے اوپر اٹھ کر جیتا ہے۔ وہ تکلیفوں میں بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ وہ مشکل حالات میں بھی دین پر جمنے والا ہوتا ہے۔ وہ شکایتوں کے باوجود لوگوں سے خیر خواہی اور انصاف کا معاملہ کرتا ہے۔ وہ حالات کی پیداوار نہیں ہوتا بلکہ حالات سے الگ اپنی شخصیت بناتا ہے۔ وہ طوفانوں سے باہر زندگی گزارتا ہے نہ کہ ان کے اندر۔

غیر مومن ردعمل کی نفسیات میں جیتا ہے اور مومن مثبت نفسیات میں۔ غیر مومن دوسروں کی تخریب میں اپنی تعمیر کا راز سمجھتا ہے اور مومن خود اپنے امکانات کو بروئے کار لانے میں۔ غیر مومن دنیا کا غم لئے ہوئے ہوتا ہے اور مومن آخرت کا غم۔ غیر مومن کا دل انسانوں میں اٹکا ہوا ہوتا ہے اور مومن کا دل صرف اللہ میں۔

جب آدمی عقل کھو دے

پندرھویں صدی قبل مسیح تک مصر میں عمالقہ کی حکومت تھی جو مصر کے باہر سے آکر مصر کی حکومت پر قابض ہو گئے تھے۔ یوسف علیہ السلام اسی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بعد مصر میں قومی انقلاب ہوا۔ عمالقہ کی حکومت ختم ہو گئی اور ایک ملکی خاندان نے مصر کی حکومت پر قبضہ کر لیا اور اپنا لقب فرعون اختیار کیا۔ موسیٰ علیہ السلام سابق حکمراں قوم (بنی اسرائیل) سے تعلق رکھتے تھے اور فراعنہ میں سے ایک فرعون کے پاس خدا کا پیغام لے کر بھیجے گئے۔

فرعون اپنے زمانہ میں بڑے جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ حضرت موسیٰ جب اس کے دربار میں آکر کھڑے ہوئے تو فرعون نے ان کو حقیر سمجھا۔ دبے ہوئے فرقہ کا ایک فرد جس کے پاس نہ شاندار کپڑے تھے اور نہ پرشکوہ سواری، نہ اس کے آس پاس دنیوی اہمیت کی اور کوئی چیز موجود تھی، اچانک بادشاہ کے دربار میں آکر کہتا ہے کہ میں تمھارے پاس خدا کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ یہ دیکھ کر فرعون اور اس کے درباری ہنس پڑے۔ انھوں نے حضرت موسیٰ کی بات کو مذاق سمجھا۔ ان کے لئے ناقابل فہم تھا کہ اتنی معمولی حیثیت کا آدمی خدا کا نمائندہ ہو سکتا ہے۔ انھوں نے حضرت موسیٰ کے پیغام کو اس کے دلائل کے اعتبار سے نہیں دیکھا بلکہ اس اعتبار سے دیکھا کہ اس کا پیش کرنے والا کیسا ہے۔ اور جب انھیں نظر آیا کہ پیش کرنے والا ایک معمولی آدمی ہے تو انھوں نے ان کی بات کو، دلائل کی عظمت کے باوجود، حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

حضرت موسیٰ کی بات ملک میں پھیلنے لگی اور بہت سے لوگ اس کے وزن کو محسوس کرنے لگے۔ اس وقت فرعون نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ تم کس کی باتوں پر دھیان دے رہے ہو۔ یہ شخص تو عجیب الجھی ہوئی باتیں کرتا ہے۔ ابھی تک یہ واضح نہ ہو سکا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ دوسری طرف میرا معاملہ ہے کہ میں صاف اور سمجھ میں آنے والی بات کہتا ہوں۔ میرے برسرحق ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ خدا نے مجھ کو بڑائی عطا کی ہے۔ اس ملک کا اقتصادی نظام میرے حکم کے تحت چل رہا ہے۔ موسیٰ اگر خدا کے نمائندے ہیں تو "کیوں نہ ان پر سونے کے کنگن اتارے گئے۔ یا فرشتوں کا دستہ ان کے ساتھ ہوتا" فرعون کی یہ باتیں اس حد تک کارگر ہوئیں کہ اس نے اپنی قوم کی عقل کھو دی اور قوم نے اس کا کہنا مان لیا، وہ پہلے ہی سے فاسق لوگ تھے (زخرف ۵۴)

جب بھی حق کی بے آمیز دعوت اٹھتی ہے تو اس کی زد سب سے پہلے ان لوگوں پر پڑتی ہے جو کسی چلے ہوئے مذہب کے بل پر عوامی قیادت حاصل کئے ہوں۔ ایسے لوگ جب دیکھتے ہیں کہ داعی کی باتوں سے لوگ متاثر ہو رہے ہیں تو وہ کچھ دلفریب باتیں کہہ کر لوگوں کے ذہن کو اس سے پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ داعی کے کھلے ہوئے دلائل کے مقابلہ میں ان کی پرفریب باتوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ تاہم اکثر لوگ چونکہ حق اور ناحق کے معاملہ میں زیادہ سنجیدہ نہیں ہوتے وہ گہرائی کے ساتھ دونوں باتوں کا موازنہ نہیں کرتے اور قائدین کی خوش نما باتوں میں آکر ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور حق کے داعی کو چھوڑ دیتے ہیں۔

مومن اللہ میں جیتا ہے

ایک چھوٹے بچے کے لئے سب کچھ اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے والدین میں جیتا ہے۔ مومن وہ ہے جو اللہ میں جینے لگے۔ اس کی یادوں میں اللہ بسا ہوا ہو۔ اس کو ڈر لگتا ہو تو اللہ کا ڈر لگتا ہو۔ اس کے اندر محبت کے جذبات امنڈتے ہوں تو اللہ کے لئے امنڈتے ہوں۔ وہ جو کچھ کرتا ہو اللہ کے لئے کرتا ہو۔ وہ اللہ کو اپنے اوپر نگراں بنائے ہوئے ہو۔

لوگ عام طور پر دوسری چیزوں میں جیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو کبھی چین حاصل نہیں ہوتا۔ کوئی کسی انسانی شخصیت میں جی رہا ہے۔ کوئی دنیا کی رونقوں میں جی رہا ہے۔ کوئی اپنے بیوی بچوں میں جی رہا ہے۔ کوئی دولت اور عزت کی طلب میں جی رہا ہے۔ اسی طرح کوئی ہے جو کسی کی دشمنی میں جی رہا ہے۔ کوئی کسی کو اکھاڑنے اور برباد کرنے کی سازشوں میں جی رہا ہے۔ کوئی کسی کو بے عزت کرنے کے منصوبوں میں جی رہا ہے۔ یہ سب جینے کے باطل طریقے ہیں۔ یہ بے حقیقت چیزوں میں جینا ہے۔ یہ ایسی چیزوں میں جینا ہے جو فانی بھی ہیں اور خدا کی کائنات میں بے جوڑ بھی۔ اس لئے ایسی چیزیں آدمی کو نہ سچا سکون دے سکتی ہیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ آدمی کو اس خدائی راستہ پر چلا سکیں جو کسی کے لئے منزل تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں تمام چیزیں خدا میں جی رہی ہوں، کوئی شخص اپنے لئے جینے کا دوسرا سہارا تلاش کرے تو وہ ایسا جھوٹا سہارا ہو گا جو اس کے کسی کام آنے والا نہیں۔

جب آدمی خدا میں جینے لگے تو اس کے اندر ایک نیا انسان ابھرتا ہے۔ اب اس کو بولنے سے زیادہ چپ رہنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس کو سرکشی کے بجائے اعتراف میں لذت ملتی ہے۔ اس کو شکایت کے موقع پر معاف کر دینے میں سکون ملتا ہے۔ اس کو اپنے بھائی کی پردہ پوشی کرکے راحت حاصل ہوتی ہے۔ امتیاز کے مقام پر بیٹھنے سے زیادہ خوشی اس کو اس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے کو عجز کے مقام پر بیٹھا ہوا دیکھے۔

لڑائی کے ساتھ تعمیر نہیں ہوتی

لنڈن بی جانسن (۱۹۷۳-۱۹۰۸) جان کینیڈی کے قتل کے بعد ۱۹۶۳ میں امریکہ کے صدر بنائے گئے۔ وہ امریکہ کے پہلے صدر تھے جن کو ۱۶ ملین ووٹوں کی اکثریت سے صدر چنا گیا۔ صدر جانسن کو امریکہ کے اندرونی مسائل سے خصوصی دلچسپی تھی۔ ان کے چھ سالہ صدارت کے زمانہ میں ملک کی اندرونی اصلاح کے لئے سول رائٹس بل اور دوسرے کئی اہم قوانین پاس ہوئے۔ ان کے ذہن میں یہ پروگرام تھا کہ امریکہ کو عظیم سماج (Great Society) بنائیں۔ مگر جلد ہی وہ ویٹ نام کی جنگ میں الجھ گئے جو ان کے بعد اس طرح ختم ہوئی کہ اس نے امریکہ کی بنیاد یں ہلادیں۔ کہا جاتا ہے کہ ویٹ نام کی بارہ سالہ جنگ میں امریکہ کے ۳۶۰۰ جیٹ طیارے اور ۵ ہزار ہیلی کاپٹر تباہ ہوئے۔ اس کے علاوہ تقریباً ۵۰ ہزار امریکی مارے گئے اور تین لاکھ سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اسی نسبت سے دوسرے نقصانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق دور حاضر کی اس طویل ترین جنگ میں امریکہ کے تقریباً ایک سو کھرب ڈالر برباد ہوئے۔

صدر جانسن نے امریکہ کو دنیا کا عظیم ترین سماج بنانے کا خواب دیکھا تھا۔ مگر عملاً صرف یہ ہوا کہ انھوں نے امریکہ کو اس قدر کمزور کر دیا کہ وہ دوسرے درجہ کی طاقت بننے کی طرف چل پڑا۔ مسلسل واقعات ثابت کر رہے ہیں کہ امریکہ زوال کی طرف جا رہا ہے۔ مبصرین کا خیال ہے کہ مستقبل قریب میں وہ روس کے مقابلہ میں دوسرے درجہ کی طاقت بن جائے گا۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ امریکہ، صدر جانسن کے زمانہ میں، ایک ایسی ہولناک جنگ میں الجھ گیا جس سے بربادی کے سوا کچھ اور ملنے والا نہ تھا۔ جب بھی آدمی کسی مقصد کو حاصل کرنے کا ارادہ کرے تو اس کے ساتھ ضروری ہے کہ وہ مقصد کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے۔ آپ اپنے کمرہ کی دیوار کو سفید دیکھنا چاہتے ہوں تو آپ کے لئے لازم ہے کہ کمرہ میں کوئلہ کی انگیٹھی نہ جلائیں۔ کوئی شخص اپنی معاشی زندگی کی تعمیر کرنا چاہے تو ضروری ہے کہ وہ قتل اور مقدمہ بازی جیسی چیزوں میں نہ الجھے۔ یہ اصول فرد کے لئے بھی ضروری ہے اور قوم کے لئے بھی۔

سیاست لڑنے بھڑنے کا نام نہیں ہے بلکہ اپنے کو طاقت ور بنانے کا نام ہے۔ ایک چینی کہاوت ہے کہ امن کے زمانہ میں جتنا زیادہ پسینہ بہاؤگے، جنگ کے زمانہ میں اتنا ہی کم خون بہے گا۔ حقیقی جنگ یہ ہے کہ جنگ سے پہلے اتنی تیاری کی جائے کہ جنگ کے بغیر صرف دھمکی سے کام چل جائے اور اگر جنگ کرنی ہی پڑے تو معمولی نقصان کے بعد جنگ کا فیصلہ ہو جائے۔ کسی قوم کو ترقی یافتہ بنانے کا کام تعمیری سرگرمیوں کے ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ جنگی اقدام سے۔ یقیناً زندگی میں اشتعال کے مواقع آتے ہیں جو آدمی کو جنگ اور مقابلہ آرائی کی طرف کھینچتے ہیں۔ مگر عقل مند وہ ہے جو ایسے موقع پر صبر و تحمل سے کام لے نہ کہ جوش میں آکر جنگ کے میدان میں کود پڑے۔ جنگ سے پہلے جنگ سے بچنا صرف جذبات کی قربانی مانگتا ہے مگر جنگ میں کودنے کے بعد جنگ کو چھوڑنے کے لئے مفاد کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اور پہلی چیز کے مقابلہ میں دوسری چیز یقیناً زیادہ بھاری ہے۔

اپنی غلطی کو جانیئے

"کچھ لوگ گویا کہ عجیب ہوتے ہیں" ایک شخص نے کہا "گویا کہ ان کا ایک تکیہ کلام بن جاتا ہے۔ گویا کہ وہ اس کو گویا کہ بار بار دہراتے رہتے ہیں۔ گویا کہ۔۔۔" مذکورہ بزرگ اسی طرح اپنی گفتگو میں "گویا کہ" کا لفظ بار بار دہراتے رہے جو ان کا اپنا تکیہ کلام تھا۔ وہ نہایت اطمینان کے ساتھ دوسروں پر یہ تنقید کر رہے تھے کہ وہ اپنا ایک تکیہ کلام بنا لیتے ہیں اور اس کو بے موقع دہراتے رہتے ہیں۔ مگر خود اپنے بارہ میں ان کو ذرا بھی یہ احساس نہ تھا کہ انھوں نے بھی اپنا ایک تکیہ کلام بنا رکھا ہے جس کو وہ اپنی گفتگو میں بلا ضرورت بار بار دہراتے رہتے ہیں۔ ان کو دوسروں کی غلطی کی خبر تھی مگر اپنی غلطی سے وہ بالکل ناواقف تھے۔

یہ انسان کی عام کمزوری ہے۔ وہ دوسروں کی غلطیوں کو انتہائی باریک بینی کے ساتھ جانتا ہے۔ دوسروں کا معاملہ ہو تو وہ ان کی کوتاہیوں کے چھپے ہوئے گوشوں تک کو پالیتا ہے۔ مگر جب معاملہ اپنا اور اپنے متعلقین کا ہو تو وہ ایسا بے خبر ہو جاتا ہے جیسے وہ کچھ جانتا ہی نہیں۔ مگر خدا کے یہاں جو چیز کام آئے گی وہ اپنی غلطیوں کو جاننا ہے نہ کہ دوسروں کی غلطیوں کا ماہر بننا۔ جو شخص دوسروں کی غلطیوں کو جانے مگر اپنی غلطیوں کو نہ جانے وہ صرف اللہ کے سامنے یہ حجت قائم کر رہا ہے کہ اس کو اتنی سمجھ تھی کہ وہ اپنی غلطیوں کو جان لے مگر اس کی سرکشی نے اس کو اندھا بہرا بنا دیا۔ آنکھ رکھتے ہوئے اس نے نہ دیکھا اور کان رکھتے ہوئے اس نے نہ سنا۔ ایسے آدمی کے لئے خدا کے یہاں سخت سزا کے سوا اور کچھ نہیں۔

انسان کے اندر اللہ نے برائی اور بھلائی کی پہچان رکھی ہے تاکہ وہ جہنم کے راستہ سے بچے اور جنت کے راستہ کا مسافر بنے۔ مگر جس آدمی کا یہ حال ہو کہ وہ خود خلاف حق باتوں میں مبتلا ہو اور دوسروں کو حق کی تلقین کرے، اس نے اپنی پہچان کو صرف اپنے جہنمی سفر کو تیز تر کرنے میں استعمال کیا کیونکہ اس قسم کی تلقین صرف ایک جرم ہے نہ کہ کوئی حقیقی عمل۔

پیغمبر کی سنت

عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: کیا آپ پر ایسا کوئی
ن گزرا ہے جو جنگ احد کے دن سے زیادہ سخت ہو۔ آپ نے فرمایا: تمھاری قوم سے مجھ کو بہت کچھ پہنچا ہے۔ اور اس کی
ن سے جو سب سے زیادہ شدید چیز مجھے پہنچی وہ عقبہ (طائف) کے دن تھی۔ جب کہ میں نے اپنے آپ کو ابن عبدیالیل کے
امنے پیش کیا۔ پھر اس نے وہ بات قبول نہ کی جو میں نے چاہا تھا (مجھ کو اپنی پناہ میں لینا منظور نہ کیا) پھر میں (طائف سے)
اپس روانہ ہوا۔ اور میں سخت غم زدہ تھا۔ میں چلتا رہا یہاں تک کہ میں قرن ثعالب پہنچ گیا۔ پھر میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا
ا چانک میں نے پایا کہ ایک بادل میرے اوپر سایہ کئے ہوئے ہے۔ میں نے دیکھا تو اس میں جبریل تھے۔ انھوں نے مجھے
کارا اور کہا: اللہ نے اس قول کو سنا جو آپ کی قوم نے آپ سے کہا ہے اور جس طرح انھوں نے آپ کی بات کا جواب دیا
ہے۔ اللہ نے پہاڑوں کے فرشتے کو آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ قوم کے بارہ میں آپ جو کچھ چاہتے ہیں اس کا اسے حکم دیں۔
س کے بعد پہاڑوں کے فرشتے نے مجھ کو پکارا اور مجھ کو سلام کیا اور کہا: اے محمدؐ! اللہ نے آپ کے بارے میں آپ کی
وم کے کلام کو سنا۔ میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں۔ میرے رب نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ آپ جو چاہیں اس کا
مجھے حکم دیں۔ پھر آپ کیا چاہتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں چکی کے دو پاٹ کی طرح ان دونوں پہاڑوں کو ان کے اوپر کر دوں۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، بلکہ مجھے امید ہے کہ ان کی صلب سے اللہ ایسا شخص پیدا کرے جو ایک اللہ
کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے (بل ارجو ان یخرج اللہ من اصلابھم من یعبد اللہ
وحدہ لا یشرک بہ شیئا، متفق علیہ)

اس واقعہ سے پیغمبر کا انداز اور طریق کار معلوم ہوتا ہے۔ لوگوں کی طرف سے پیغمبر کو خواہ کتنی ہی تکلیف پہنچے
وہ منفی نفسیات میں مبتلا نہیں ہوتا، اس کے اندر نفرت اور انتقام کا جذبہ نہیں بھڑکتا۔ وہ حال کے بجائے مستقبل کو
دیکھتا ہے۔ اس کی نظریں سامنے کے واقعات کے بجائے ان واقعات پر ہوتی ہیں جو آئندہ ظہور میں آسکتے ہیں۔ وہ
آنے والے بہتر امکان کی امید میں آج کی ناخوش گواریوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ فرد سے تعلق کا معاملہ ہو یا قوموں
سے تعلقات کا معاملہ، ہر معاملہ میں پیغمبر کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جذبات سے اوپر اٹھ کر سوچے اور شکایتوں
اور تکلیفوں سے بلند ہو کر معاملہ کرے۔

ایک حدیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نکاح میری سنت سے ہے اور جو میری سنت
سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں۔ یہی بات یہاں بھی صادق آتی ہے۔ انتقام نہ لینا اور مستقبل کی امید میں حال کی
تلخیوں کو نظر انداز کر دینا پیغمبر کی سنت ہے، اور جو پیغمبر کی سنت سے اعراض کرے وہ پیغمبر سے نہیں۔ حقیقت یہ ہے
کہ اگر ہم پیغمبر کی اس سنت پر عمل نہ کریں تو ہم کو نہ پیغمبر کے امتی ہونے کا حق ہے اور نہ پیغمبر کی شفاعت میں حصہ دار بننے کا۔
وہ شخص جس کو آج کی زندگی میں پیغمبر کا طریقہ پسند نہ ہو وہ کل کی زندگی میں پیغمبر کا رفیق کس طرح بن سکتا ہے۔

ناموافق حالات ترقی کا زینہ بن گئے

ایک "ملاجی" دہلی کی ایک مسجد میں امام تھے۔ امامت کے علاوہ ان کی ذمہ داری یہ بھی تھی کہ وہ روزانہ قرآن کا درس دیں۔ ان تمام خدمات کا معاوضہ تھا۔ ماہانہ ۲۵ روپے تنخواہ، مسجد میں ایک حجرہ اور دو وقت کا کھانا۔ نوجوان ملاجی اس مختصر معاوضہ پر قانع ہونے کے لئے تیار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ مسجد میرے لئے کم از کم ایک ٹھکانا تو ہے۔ یہاں رہ کر میں اپنے بچہ کی تعلیم پوری کرا لوں گا۔ میں نہیں تو میرا بچہ مستقبل میں بہتر معاشی زندگی حاصل کرے گا۔

مگر مسجد کے لوگوں کا سلوک ان کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ ہر نمازی ان کو اپنا ملازم سمجھتا۔ ذرا ذرا سی بات میں ہر آدمی ان کے اوپر برس پڑتا اور ان کو ذلیل کرتا۔ کوئی فرش کے لئے، کوئی جھاڑو کے لئے، کوئی لوٹے کے لئے، کوئی کسی اور چیز کے لئے ان کو بگڑتا رہتا۔ وہ معاشی تنگی برداشت کر سکتے تھے۔ مگر ذلت ان کے لئے برداشت سے باہر تھی۔ بالآخر انھوں نے ایک نیا فیصلہ کیا۔ انھوں نے طے کیا کہ مجھے اپنی زندگی کو مستقل طور پر مسجد سے وابستہ نہیں رکھنا ہے بلکہ اپنے لئے کوئی دوسرا کام پیدا کرنا ہے۔ تاہم فوری طور پر مسجد چھوڑنا بھی برا تھا۔ کیونکہ مسجد کی امامت چھوڑنے کے بعد مسجد کا حجرہ ان سے چھن جاتا۔ اور شہر میں دوسری جگہ حاصل کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔

انھوں نے مسجد کی امامت کرتے ہوئے شہر کے طبیہ کالج میں داخلہ لے لیا اور خاموشی کے ساتھ طب کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ طبی تعلیم کی تکمیل میں ان کو پانچ سال لگ گئے۔ اس دوران میں وہ مسجد کے لوگوں کے برے سلوک کو پہلے سے بھی زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔ نئے فیصلہ میں کامیاب ہونے کے لئے ضروری تھا کہ وہ صبر کریں۔ ذلت کی زندگی سے نکلنے ہی کی خاطر ذلت کی زندگی کو چند سال اور برداشت کریں۔

بالآخر وہ وقت آیا کہ انھوں نے طبی کالج سے ڈاکٹری کی سند حاصل کر لی۔ اب انھوں نے مسجد والوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے امامت سے استعفا دے دیا اور شہر کے ایک محلہ میں ایک جگہ کرایہ پر لے کر اپنا مطب کھول لیا۔ ان کی زندگی کے تلخ تجربات اور مستقبل کی خاطر ان کی طویل جد و جہد نے ان کو بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ انھوں نے نہایت محنت اور ہوشیاری کے ساتھ اپنا مطب چلایا۔ صرف چھ ماہ بعد ان کی آمدنی اتنی ہو گئی کہ ایک مکان لے کر وہ بچوں کے ساتھ بفراغت رہنے لگے۔ ایک سال کے بعد انھیں مقامی طبی کالج میں لکچرر کی جگہ بھی مل گئی۔ اس طرح ان کی معاشی زندگی میں مزید استحکام پیدا ہو گیا۔ کل کے ملاجی اب ڈاکٹر صاحب بن کر زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کو عزت بھی حاصل ہے اور معاشی فارغ البالی بھی۔

زندگی کے ناموافق حالات زندگی کے نئے زینے ہوتے ہیں جن کو استعمال کر کے آدمی آگے بڑھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ناموافق حالات سے نفرت اور شکایت کا سبق نہ لے۔ بلکہ مثبت ذہن کے تحت اپنے لئے نیا مستقبل بنانے میں لگ جائے۔

اسلام کی برتری

مریم جمیلہ ایک امریکی نومسلمہ ہیں۔ وہ امریکہ کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے مسلم ممالک کا سفر کیا۔ بالآخر ایک پاکستانی مسلمان سے شادی کرلی اور اب وہ پاکستان میں مقیم ہیں۔ ان کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے اسلام مغرب کے مقابلہ میں (Islam Versus The West) اس کتاب میں وہ اپنی کہانی بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں :

یونیورسٹی کی تعلیم کے زمانہ میں میں نے ایک مضمون لیا جو "یہودیت اسلام میں" کہا جاتا تھا۔ میرا ربی پروفیسر اپنے طلبہ کو، جو سب کے سب یہودی ہوتے تھے، اس بات پر مطمئن کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ اسلام کا ماخذ یہودیت ہے ہماری نصابی کتاب میں قرآن کی ایک ایک آیت کو لے کر دکھایا گیا تھا کہ کس طرح وہ یہودی ذرائع علم پر مبنی ہے۔ پروفیسر کے لکچر کے ساتھ ہم کو ایسے فلم اور سلائڈ بھی دکھائے جاتے تھے جن میں صہیونیت اور یہودی ریاست کی تعریف ہوتی۔ اگرچہ پروفیسر کا حقیقی مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ اسلام پر یہودیت کی برتری ثابت کرے مگر میرے اوپر اس کا اثر بالکل الٹا پڑا۔ جیسے جیسے میں نے قدیم عہدنامہ اور قرآن کا گہرا مطالعہ کیا، دونوں کا تضاد مجھ پر نمایاں ہوتا چلا گیا۔ ایک معنی میں قدیم عہدنامہ صرف یہودیوں کی تاریخ تھی جو خدا کے چنے ہوئے لوگ تھے۔ قرآن اگرچہ عربی زبان میں ایک عرب پیغمبر پر اترا، اس کا پیغام ایک عالمی پیغام ہے جو تمام نسل انسانی کو خطاب کرتا ہے۔ جب میرے پروفیسر نے بتایا کہ فلسطین پر یہودیوں کا خدائی حق ہمیشہ سے یہودی شریعت کا مرکزی جزء رہا ہے تو مجھے خدا کے اس تنگ نظر عقیدہ سے بہت دھکا لگا۔ کیا قرآن یہ نہیں کہتا کہ : پورب پچھم سب خدا کے ہیں، تم جدھر بھی رخ کرو ادھر خدا موجود ہوگا۔ کیا پیغمبر اسلام نے نہیں کہا کہ تمام زمین خدا کی مسجد ہے۔ صہیونیت کہتی ہے کہ یہودیوں کا وطن صرف فلسطین ہے، دوسری جگہ وہ جلاوطن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرے پروفیسر کا دعویٰ کہ یہودی صرف فلسطین میں رہ کر انسانی تہذیب میں اپنا حصہ ادا کرسکتے ہیں بے بنیاد نظر آتا ہے، جب اس حقیقت کو دیکھا جائے کہ حضرت موسیٰ پر وحی مصر میں آئی۔ تالمود کے انتہائی اہم حصے اس سرزمین میں لکھے گئے جو آج عراق کہا جاتا ہے (صفحہ ۴)

اسلام اتنا برحق مذہب ہے کہ دوسرے مذہبوں سے اس کا سادہ تقابل ہی اس کی برتری ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ بائبل ایک قوم کی قومی تاریخ معلوم ہوتی ہے جبکہ قرآن میں عالمی انسانی پیغام ملتا ہے۔ یہودیت کے نزدیک سارا تقدس بس فلسطین کی سرزمین میں ہے جب کہ اسلام کہتا ہے کہ ساری زمین خدا کی زمین ہے۔ یہودیت کے مطابق ان کے مذہب اور فلسطین کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا جب کہ خود حضرت موسیٰ کو خدا نے فلسطین سے باہر خطاب کیا اور یہودیوں کی مقدس مذہبی کتاب فلسطین کے باہر مرتب کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اتنا کامل اور اتنا برحق دین ہے کہ دوسروں کے سامنے صرف اس کو سادہ صورت میں پیش کردینا کافی ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کو کسی ملاوٹ کے بغیر اس کی اصلی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرسکیں۔

اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے ان میں بارہ سردار مقرر کئے۔ اور اللہ نے کہا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نماز قائم کروگے اور زکوٰۃ ادا کروگے اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤگے اور ان کی مدد کروگے اور اللہ کو قرض حسن دوگے تو میں تم سے تمھارے گناہ ضرور دور کردوں گا اور تم کو ضرور ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ پس تم میں سے جو شخص اس کے بعد انکار کرے گا تو وہ سیدھے راستہ سے بھٹک گیا۔ پس ان کی عہد شکنی کی بنا پر ہم نے ان پر لعنت کردی اور ہم نے ان کے دلوں کو سخت کردیا۔ وہ کلام کو اس کی جگہ سے بدل دیتے ہیں۔ اور جو کچھ ان کو نصیحت کی گئی تھی اس کا بڑا حصہ وہ بھلا بیٹھے۔ اور تم برابر ان کی کسی نہ کسی خیانت سے آگاہ ہوتے رہتے ہو بجز تھوڑے لوگوں کے۔ ان کو معاف کرو اور ان سے درگزر کرو، اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے　۱۲-۱۳

بنی اسرائیل سے ان کے پیغمبر کی معرفت خدا پرستانہ زندگی گزارنے کا عہد لیا گیا اور ان کے بارہ قبائل سے بارہ سرداران کی نگرانی کے لئے مقرر کئے گئے۔ بنی اسرائیل سے جو عہد لیا گیا وہ یہ تھا کہ وہ نماز کے ذریعہ اپنے کو اللہ والا بنائیں۔ وہ زکوٰۃ کی صورت میں بندوں کے حقوق ادا کریں۔ پیغمبروں کا ساتھ دے کر وہ اپنے کو اللہ کی پکار کی جانب کھڑا کریں اور اللہ کے دین کی جدوجہد میں اپنا اثاثہ خرچ کریں۔ ان کاموں کی ادائگی اور اپنے درمیان ان کی نگرانی کا اجتماعی نظام قائم کرنے کے بعد ہی وہ خدا کی نظر میں اس کے مستحق تھے کہ خدا ان کا ساتھی ہو۔ وہ ان کو پاک صاف کرکے اس قابل بنائے کہ وہ جنت کی لطیف فضاؤں میں داخل ہوسکیں۔ جنت کسی کو عمل سے ملتی ہے نہ کہ کسی قسم کے نسلی تعلق سے۔

اس عہد میں جن اعمال کا ذکر ہے یہی دین کے اساسی اعمال ہیں۔ یہی وہ شاہراہ ہے جو تمام انسانوں کو خدا اور اس کی جنت کی طرف لے جانے والی ہے۔ مگر جب آسمانی کتاب کی حامل قوموں میں بگاڑ آتا ہے تو وہ اس شاہراہ کے دائیں بائیں مڑ جاتی ہیں۔ اب یہ ہوتا ہے کہ خود ساختہ تشریحات کے ذریعہ دین کا تصور بدل دیا جاتا ہے۔ عبادت کے نام پر غیر متعلق بحثیں شروع ہو جاتی ہیں۔ نجات کے ایسے راستے تلاش کرلئے جاتے ہیں جو بندوں کے حقوق ادا کئے بغیر آدمی کو منزل تک پہنچا دیں۔ دعوتِ حق کے نام پر ان کے یہاں بے معنی قسم کے دنیوی ہنگامے جاری ہو جاتے ہیں۔ وہ دنیوی اخراجات کی بہت سی مدیں بناتے ہیں اور انھیں کو دین کے لئے خرچ کا نام دے دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ اپنے دنیوی مصالح کے مطابق ایک دین گھڑتے ہیں اور اسی کو خدا کا دین کہنے لگتے ہیں۔ جب کوئی گروہ بگاڑ کی اس نوبت تک پہنچتا ہے تو خدا اپنی توجہ اس سے ہٹا لیتا ہے۔ خدا کی توفیق سے محروم ہو کر ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنی خواہشوں کی زبان سمجھتے ہیں اور اسی میں مصروف رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ موت کا فرشتہ آجاتا ہے تاکہ ان کو پکڑ کر خدا کی عدالت میں پہنچا دے۔

اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم نصرانی ہیں، ان سے ہم نے عہد لیا تھا۔ پس جو کچھ ان کو نصیحت کی گئی تھی اس کا بڑا حصہ وہ بھلا بیٹھے۔ پھر ہم نے قیامت تک کے لئے ان کے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دیا۔ اور آخر اللہ ان کو آگاہ کردے گا اس سے جو کچھ وہ کر رہے تھے ۱۴

آسمانی کتاب کی حامل قوموں پر جب بگاڑ آتا ہے تو وہ دین کے محکم حصہ کو چھوڑ کر اس کے غیر محکم حصہ پر دوڑ پڑتی ہیں۔ اس کا نتیجہ دنیا میں اختلاف کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور آخرت میں رسوائی کی صورت میں۔

مسیح علیہ السلام باپ کے بغیر ایک پاکباز خاتون کے بطن سے پیدا ہوئے۔ پیدائش کے بعد انھوں نے اپنی زبان سے اپنا جو تعارف کرایا وہ یہ تھا "میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں"، اب حضرت مسیح کے بارہ میں رائے قائم کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ آنجناب نے اپنے بارے میں جو واضح الفاظ فرمائے ہیں انھیں کی پابندی کی جائے اور آپ کو وہی سمجھا جائے جو ان الفاظ سے براہ راست طور پر معلوم ہوتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس معاملہ میں اپنے قیاس کو دخل دیا جائے اور کہا جائے کہ "انسان وہ ہے جو کسی باپ کا بیٹا ہو۔ مسیح کسی باپ کے بیٹے نہ تھے۔ اس لئے وہ خدا کے بیٹے تھے"، پہلی رائے کی بنیاد خود مسیح کا محکم اور مستند قول ہے اس لئے اگر اس کو اختیار کیا جائے تو اس میں اختلاف پیدا نہ ہوگا۔ جب کہ دوسری رائے کی بنیاد محض انسانی قیاس پر ہے۔ اس لئے جب دوسری رائے کو اختیار کیا جائے گا تو رایوں کا اختلاف شروع ہو جائے گا، جیسا کہ مسیح کو ماننے والوں کے ساتھ بعد کے زمانہ میں ہوا۔

آسمانی کتاب کی حامل کسی قوم میں جب بگاڑ آتا ہے تو اس کے اندر اسی قسم کی خرابیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ محکم دین کو چھوڑ کر قیاسی دین پر چل پڑتی ہیں۔ یہیں سے اختلاف اور فرقہ بندیوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ فقہ اور کلام، روحانیت اور سیاست میں خدا ور رسول نے جو کھلے ہوئے احکام دئے ہیں لوگ ان کے سادہ مفہوم پر قانع نہیں رہتے بلکہ بطور خود نئی نئی بحثیں نکالتے ہیں۔ کبھی زمانہ کے خیالات سے متاثر ہو کر، کبھی اپنی دنیوی خواہشوں کو دینی جواز عطا کرنے کے لئے۔ کبھی بزعم خود خدا کے ناقص دین کو کامل بنانے کے لئے، اپنی طرف سے ایسی باتیں دین میں داخل کر دی جاتی ہیں جو حقیقۃً دین کا حصہ نہیں ہوتیں۔ اس طرح نئے نئے دینی ایڈیشن تیار ہو جاتے ہیں۔ کوئی روحانی ایڈیشن، کوئی سیاسی ایڈیشن، کوئی اور ایڈیشن۔ ہر ایک کے گرد اس کے موافق ذوق رکھنے والے لوگ جمع ہوتے رہتے ہیں۔ بالآخر ان کا ایک فرقہ بن جاتا ہے۔ ان کی بعد کی نسلیں اس کو اسلاف کا ورثہ سمجھ کر اس کی حفاظت شروع کر دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجاتا ہے کہ وہ قیامت تک کبھی ختم نہ ہو۔ کیونکہ انسان ماضی کو ہمیشہ مقدس سمجھ لیتا ہے اور جو چیز مقدس بن جائے وہ کبھی ختم نہیں ہوتی ——— مذہب کے نام پر فرقہ بندی ایک طرف مقدس ہو کر ابدی بن جاتی ہے۔ دوسری طرف خدا کا حکم بن کر دوسروں کے خلاف نفرت اور جارحیت کا اجازت نامہ بھی۔

اے اہل کتاب، تمھارے پاس ہمارا رسول آیا ہے۔ وہ کتاب الٰہی کی بہت سی ان باتوں کو تمھارے سامنے کھول رہا ہے جن کو تم چھپاتے تھے۔ اور وہ درگزر کرتا ہے بہت سی چیزوں سے۔ بے شک تمھارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور ایک ظاہر کرنے والی کتاب آچکی ہے۔ اس کے ذریعہ سے اللہ ان لوگوں کو سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے جو اس کی رضا کے طالب ہیں اور اپنی توفیق سے ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لا رہا ہے اور سیدھی راہ کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا کہ خدا ہی تو مسیح ابن مریم ہے۔ کہو پھر کون اختیار رکھتا ہے اللہ کے آگے اگر وہ چاہے کہ ہلاک کردے مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں کو اور جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کو۔ اور اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ وہ پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۱۵-۱۷

اہل کتاب نے اپنے دین میں دو قسم کی غلطیاں کیں۔ ایک یہ کہ کچھ تعلیمات کو تاویل یا تحریف کے ذریعہ دین سے خارج کر دیا۔ مثلاً انھوں نے اپنی کتاب میں ایسی تبدیلیاں کیں کہ اب ان کو اپنی نجات کے لئے کسی اور پیغمبر کو ماننے کی ضرورت نہ تھی۔ اپنے آبائی مذہب سے وابستگی ان کی نجات کے لئے بالکل کافی تھی۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے دین کے نام پر ایسی پابندیاں اپنے اوپر ڈال لیں جو خدا نے ان کے اوپر نہ ڈالی تھیں۔ مثال کے طور پر قربانی کی ادائگی کے وہ جزئی مسائل جن کا حکم ان کے نبیوں نے ان کو نہیں دیا تھا بلکہ ان کے علماء نے اپنی فقہی موشگافیوں سے بطور خود ان کو گھڑ لیا۔

قرآن ان کے لئے ایک نعمت بن کر آیا۔ اس نے ان کے لئے دین خداوندی کی "تجدید" کی۔ قرآن نے ان کو اس اندھیرے سے نکالا کہ وہ ایسے راستہ پر چلتے رہیں جس کے متعلق وہ اس خوش فہمی میں ہوں کہ وہ جنت کی طرف جا رہا ہے، حالاں کہ وہ ان کو خدا کے غضب کی طرف لے جا رہا ہو۔ قرآن نے ایک طرف ان کی کھوئی ہوئی تعلیمات کو ان کی اصلی صورت میں پیش کیا۔ دوسری طرف قرآن نے یہ کیا کہ انھوں نے اپنے آپ کو جن غیر ضروری دینی پابندیوں میں مبتلا کر لیا تھا اس سے انھیں آزاد کر دیا۔ اب جو لوگ اپنی خواہشوں کی پیروی کریں وہ بدستور اندھیروں میں بھٹکتے رہیں گے۔ اور جن کو اللہ کی رضا کی تلاش ہو وہ حق کی سیدھی راہ کو پالیں گے وہ اللہ کی توفیق سے اپنے آپ کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا اپنی کامل صورت میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ مگر وہ ہمیشہ دلیل کی زبان میں ہوتا ہے۔ اور دلیل انھیں لوگوں کے ذہن کا جزء بنتی ہے جو اس کے لئے اپنے ذہن کو کھلا رکھیں۔

خدا کو چھوڑ کر انسانوں نے جو خدا بنائے ہیں ان میں سے ہر ایک کا یہ حال ہے کہ وہ نہ کوئی چیز بطور خود پیدا کر سکتے ہیں اور نہ کسی چیز کو بطور خود مٹا سکتے ہیں۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں۔ جو ہستیاں پیدائش اور موت پر قادر نہ ہوں وہ خدا کس طرح ہو سکتی ہیں۔

اور یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ تم کہو کہ پھر وہ تمھارے گناہوں پر تم کو سزا کیوں دیتا ہے۔ نہیں بلکہ تم بھی اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق میں سے ایک آدمی ہو۔ وہ جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اے اہل کتاب، تمھارے پاس ہمارا رسول آیا ہے، وہ تم کو صاف صاف بتا رہا ہے رسولوں کے ایک وقفہ کے بعد۔ تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی خوش خبری دینے والا اور ڈر سنانے والا نہیں آیا۔ پس اب تمھارے پاس خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا آگیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۱۸ — ۱۹

جو قوم کتاب اور پیغمبر کی حامل بنائی جائے اور وہ اس کو ماننے کا ثبوت دیدے تو اس پر خدا کی بہت سی نعمتیں نازل ہوتی ہیں ــــــ مخالفین کے مقابلہ میں خصوصی نصرت، زمین پر اقتدار، مغفرت اور جنت کا وعدہ، وغیرہ۔ قوم کے ابتدائی لوگوں کے لئے یہ ان کے عمل کا بدلہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو خدا کے حوالے کیا اس لئے خدا نے ان پر اپنی نعمتیں برسائیں۔ مگر بعد کی نسلوں میں صورت حال بدل جاتی ہے اب ان کے لئے سارا معاملہ قومی معاملہ بن جاتا ہے۔ اولین لوگوں کو جو چیز عمل کے سبب سے ملی تھی، بعد کے لوگ قومی اور نسلی تعلق کی بنا پر اپنے کو اس کا مستحق سمجھ لیتے ہیں۔ وہ یقین کر لیتے ہیں کہ وہ خدا کے خاص لوگ ہیں اور وہ خواہ کچھ بھی کریں خدا کی نعمتیں ان کو ملا کرر ہیں گی۔ حامل کتاب قوموں کو اس غلط فہمی سے نکالنے کی خاطر خدا نے ان کے لئے یہ خصوصی قاعدہ مقرر کیا ہے کہ ان کی جزا کا آغاز اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ اسی موجودہ دنیا میں دیکھ سکتے ہیں کہ آنے والی دنیا میں ان کا خدا ان کے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہے۔ اگر وہ دنیا میں اپنے دشمنوں پر غالب آرہے ہوں تو وہ خدا کے مقبول گروہ ہیں اور اگر ان کے دشمن ان پر غلبہ پالیں تو وہ خدا کے نامقبول گروہ ہیں۔ کوئی حامل کتاب گروہ کثرت تعداد کے باوجود اگر دنیا میں مغلوب اور ذلیل ہو رہا ہو تو اس کو ہرگز یہ امید نہ رکھنا چاہئے کہ آخرت میں وہ سربلند اور باعزت رہے گا۔

کسی قوم کو بحیثیت قوم کے خدا کا محبوب سمجھنا سراسر باطل خیال ہے۔ خدا کے یہاں فرد فرد کا حساب ہوتا ہے نہ کہ قوم قوم کا۔ ہر آدمی جو کچھ کرے گا اسی کے مطابق وہ خدا کے یہاں بدلہ پائے گا۔ ہر آدمی اللہ کی نظر میں بس ایک انسان ہے، خواہ وہ اِس قوم سے تعلق رکھتا ہو یا اُس قوم سے۔ ہر آدمی کے مستقبل کا فیصلہ اس بنیاد پر کیا جائے گا کہ امتحان کی دنیا میں اس نے کس قسم کی کارکردگی کا ثبوت دیا ہے۔ جنت کسی کا قومی وطن نہیں اور جہنم کسی کا قومی جیل خانہ نہیں۔ اللہ کے فیصلہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے ایسے افراد اٹھاتا ہے جو لوگوں کو زندگی کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں۔ اس کو جہنم سے ڈراتے ہیں اور جنت کی خوش خبری دیتے ہیں۔ خدا کے اسی بشیر و نذیر کا ساتھ دے کر آدمی خدا کو پاتا ہے نہ کہ کسی اور طریقے سے۔

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم، اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ اس نے تمہارے اندر نبی پیدا کئے۔ اور تم کو بادشاہ بنایا اور تم کو وہ دیا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا تھا۔ اے میری قوم، اس پاک زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے۔ اور اپنی پیٹھ کی طرف نہ لوٹو ورنہ نقصان میں پڑ جاؤ گے۔ انھوں نے کہا کہ وہاں ایک زبردست قوم ہے۔ ہم ہرگز وہاں نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو ہم داخل ہوں گے۔ دو آدمی جو اللہ سے ڈرنے والوں میں سے تھے اور ان دونوں پر اللہ نے انعام کیا تھا، انھوں نے کہا کہ تم ان پر حملہ کر کے شہر کے پھاٹک میں داخل ہو جاؤ۔ جب تم اس میں داخل ہو جاؤ گے تو تم ہی غالب ہوگے اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم مومن ہو۔ انھوں نے کہا کہ اے موسیٰ ہم کبھی وہاں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ لوگ وہاں ہیں۔ پس تم اور تمہارا خداوند دونوں جا کر لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں ۲۴-۲۰

اللہ کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے کسی گروہ کو چن لیتا ہے۔ اس گروہ کے اندر وہ اپنے پیغمبر اور اپنی کتاب بھیجتا ہے اور اس کو مامور کرتا ہے کہ وہ اس پیغام کو دوسروں تک پہنچائے۔ جس طرح وحی ایک خاص شخص پر اترتی ہے اسی طرح وحی کا حامل بھی ایک خاص گروہ کو بنایا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں یہ خاص حیثیت بنی اسرائیل کو حاصل تھی اور نبی آخرالزماں کے بعد امت محمدی اس خصوصی منصب پر مامور ہے۔

اللہ کو جس طرح یہ مطلوب ہے کہ کوئی قوم اس کے دین کی نمائندگی کرے۔ اسی طرح اس کو یہ بھی مطلوب ہے کہ جو قوم اس کے دین کی نمائندہ ہو وہ دنیا میں باعزت اور سربلند ہو تاکہ لوگوں پر اس بات کا مظاہرہ ہو سکے کہ قیامت کے بعد جو نیا اور ابدی عالم بنے گا اس میں ہر قسم کی سرفرازیاں صرف اہل حق کو حاصل ہوں گی۔ باقی لوگ مغلوب کر کے خدا کی رحمتوں سے دور پھینک دئے جائیں گے۔ تاہم اس گروہ کو یہ دنیوی انعام یک طرفہ طور پر نہیں دیا جاتا اس کے لئے اس کو استحقاق کے امتحان میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ اس کو عملی طور پر یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ پر اعتماد کرنے والا اور صبر کی حد تک اس کی مرضی پر قائم رہنے والا ہے۔

بنی اسرائیل جب تک اس معیار پر قائم رہے ان کو خدا نے ان کی حریف قوموں پر غالب کیا۔ حتیٰ کہ ایک زمانہ تک وہ اپنے وقت کی مہذب دنیا میں سب سے زیادہ سربلند حیثیت رکھتے تھے۔ مگر حضرت موسیٰ تشریف لائے تو بنی اسرائیل پر زوال آچکا تھا۔ امتحان کے وقت ان کی اکثریت اعتماد علی اللہ اور صبر کا ثبوت دینے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ ان کا ایک طبقہ اللہ اور اس کے رسول کے سامنے گستاخی کرنے لگا۔ ان کے دل میں اللہ سے بھی زیادہ دنیا کی طاقت ور قوموں کا ڈر سمایا ہوا تھا —— جب خدا کا کوئی نمائندہ گروہ خدا کے کام کے لئے قربانی نہ دے تو گویا کہ وہ چاہتا ہے کہ خدا خود زمین پر اترے اور اپنے دین کا کام خود انجام دے، خواہ وہ بنی اسرائیل کے کچھ لوگوں کی طرح اس بات کو زبان سے کہہ دے یا دوسرے لوگوں کی طرح زبان سے نہ کہے بلکہ صرف اپنے عمل سے اس کو ظاہر کرے۔

موسیٰ نے کہا کہ اے میرے رب، اپنے اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر میرا اختیار نہیں۔ پس تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان جدائی کردے۔ اللہ نے کہا: وہ ملک ان پر چالیس سال کے لئے حرام کر دیا گیا۔ یہ لوگ زمین میں بھٹکتے پھریں گے۔ پس تم اس نافرمان قوم پر افسوس نہ کرو　۲۶-۲۵

بنی اسرائیل جب حضرت موسیٰ کی قیادت میں مصر سے نکل کر صحرائے سینا میں پہنچے تو اس زمانہ میں شام و فلسطین کے علاقہ میں ایک ظالم قوم (عمالقہ) کی حکومت تھی۔ اللہ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ یہ ظالم لوگ اپنی عمر پوری کر چکے ہیں۔ تم ان کے ملک میں داخل ہو جاؤ، تم کو خدا کی مدد حاصل ہوگی اور تم معمولی مقابلہ کے بعد ان کے اوپر قبضہ پا لوگے۔ مگر بنی اسرائیل پر اس قوم کی ایسی ہیبت طاری تھی کہ وہ ان کے ملک میں داخل ہونے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اللہ سے زیادہ انسانوں سے ڈرتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ کی نظر میں ان کی کوئی قیمت نہ رہی۔ اللہ نے ان کے بارے میں فیصلہ کر دیا کہ وہ چالیس سال (۱۴۴۰-۱۴۰۰ ق م) تک فاران اور شرق اردن کے درمیان صحرا میں بھٹکتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ ۲۰ سال سے لے کر اوپر کی عمر تک کے سارے لوگ ختم ہو جائیں گے۔ اس دوران ان کی نئی نسل نئے حالات میں پرورش پاکر اٹھے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ۴۰ سال کی صحرائی زندگی میں ان کے تمام بڑی عمر والے مر کر ختم ہو گئے۔ اس کے بعد ان کی نئی نسل نے یوشع بن نون کی قیادت میں شام و فلسطین کو فتح کیا۔ یہ یوشع بن نون ان دو صالح اسرائیلیوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ تم اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے عمالقہ کے ملک میں داخل ہو جاؤ۔

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ اگر ہم اس ملک پر حملہ کریں تو ہم کو شکست ہوگی اور اس کے بعد "ہمارے بچے لوٹ کا مال ٹھہریں گے"، مگر یہی بچے بڑے ہو کر عمالقہ کے ملک میں داخل ہوئے اور اس پر قبضہ کیا۔ بچوں میں یہ طاقت اس لئے پیدا ہوئی کہ انھوں نے لمبی مدت تک صحرائی زندگی کی مشقتوں کو برداشت کیا تھا۔ بچوں کے باپ جن پر خطر حالات کو اپنے بچوں کے حق میں موت سمجھتے تھے انھیں پر خطر حالات کے اندر داخل ہونے میں ان کے بچوں کی زندگی کا راز چھپا ہوا تھا۔

موافق حالات میں جینا بظاہر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے اندر تمام بہترین اوصاف اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کہ اس کو حالات کا مقابلہ کر کے زندہ رہنا پڑے۔ مصر میں بنی اسرائیل صدیوں تک عافیت کی زندگی گزارتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک مردہ قوم بن گئے۔ مگر خروج کے بعد ان کو جو صحرائی زندگی حاصل ہوئی اس میں زندگی ان کے لئے سراپا چیلنج تھی۔ ان حالات میں جو لوگ بچپن سے جوانی کی عمر کو پہنچے وہ قدرتی طور پر بالکل دوسری قسم کے لوگ تھے۔ صحرائی حالات نے ان کے اندر سادگی، ہمت، جفاکشی اور حقیقت پسندی پیدا کر دی تھی۔ اور یہی وہ اوصاف ہیں جو کسی قوم کو زندہ قوم بناتے ہیں ——— کوئی قوم اگر حالات کے نتیجہ میں مردہ قوم بن جائے تو اس کو دوبارہ زندہ قوم بنانے کے لئے غیر معمولی حالات میں ڈال دیا جاتا ہے۔

اور ان کو آدم کے دو بیٹوں کا قصہ حق کے ساتھ سناؤ۔ جب کہ ان دونوں نے قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوئی اور دوسرے کی قربانی قبول نہ ہوئی۔ اس نے کہا میں تجھ کو مار ڈالوں گا۔ اس نے جواب دیا کہ اللہ تو صرف متقیوں سے قبول کرتا ہے۔ اگر تم مجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ اٹھاؤ گے تو میں تم کو قتل کرنے کے لئے تم پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو سارے جہان کا رب ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی لے لے پھر تو آگ والوں میں شامل ہو جائے۔ اور یہی سزا ہے ظلم کرنے والوں کی۔ ۲۹ - ۲۷

اللہ کے لئے جو عمل کیا جائے اس کا اصل بدلہ تو آخرت میں ملتا ہے، تاہم بعض اوقات دنیا میں بھی ایسے واقعات ظاہر ہوتے ہیں جو بتاتے ہیں کہ آدمی کا عمل خدا کے یہاں مقبول ہوا یا نہیں۔ آدم کے بیٹوں میں سے قابیل اور ہابیل کے ساتھ بھی ایسی ہی صورت پیش آئی۔ قابیل کسان تھا اور ہابیل بھیڑ بکریوں کا کام کرتا تھا، ہابیل نے اپنی محنت کی کمائی اللہ کے لئے دی۔ وہ اللہ کے یہاں مقبول ہوئی اور اس کی برکت اس کی زندگی اور اس کے کام میں ظاہر ہوئی۔ قابیل نے بھی اپنی بھیڑ بکریوں میں سے کچھ اللہ کے لئے پیش کیا مگر وہ قبول نہ ہوا اور وہ خدا کی برکت پانے سے محروم رہا۔ یہ دیکھ کر قابیل کے دل میں اپنے چھوٹے بھائی ہابیل کے لئے حسد پیدا ہو گیا۔ یہ حسد اتنا بڑھا کہ اس نے ہابیل سے کہا کہ میں تم کو جان سے مار ڈالوں گا۔ ہابیل نے کہا کہ تمہاری قربانی قبول نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ تمہارے دل میں خدا کا خوف نہیں۔ تم کو میرے پیچھے پڑنے کے بجائے اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہئے۔ مگر حسد اور بغض کی آگ جب کسی کے اندر بھڑکتی ہے تو وہ اس کو اس قابل نہیں رکھتی کہ وہ اپنی غلطیوں کا جائزہ لے۔ وہ بس ایک ہی بات جانتا ہے : یہ کہ جس طرح بھی ہو اپنے مفروضہ حریف کا خاتمہ کر دے۔

ہابیل نے قابیل سے کہا کہ تم خواہ میرے قتل کے لئے ہاتھ بڑھاؤ، میں تمہارے قتل کے لئے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اور مسلمان کی باہمی لڑائی کو اللہ نے سراسر حرام قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایک مسلمان اپنے دوسرے بھائی کے قتل کے درپے ہو جائے تو اس وقت بھی عزیمت یہ ہے کہ دوسرا بھائی اپنے بھائی کے خون کو اپنے لئے حلال نہ کرے۔ وہ اپنی طرف سے جارحانہ اقدام نہ کرکے باہمی ٹکراؤ کو پہلے ہی مرحلہ میں ختم کر دے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ بھی جواب میں جارحیت کرنے لگے تو مسلم معاشرہ کے اندر عمل اور ردعمل کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ لیکن حملہ آور اگر غیر مسلم ہو تو اس وقت ایسا کرنا درست نہیں۔ اسی طرح جب دینی دشمنوں کی طرف سے جارحیت کی جائے تو مسلم اور غیر مسلم کا فرق کئے بغیر ایسے لوگوں سے بھرپور مقابلہ کیا جائے گا۔

دو مسلمان جب ایک دوسرے کی بربادی کے درپے ہوں تو گناہ دونوں کے درمیان تقسیم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی بربادی کی کارروائیاں کرے اور دوسرا مسلمان صبر اور دعا میں مشغول ہو تو پہلا شخص نہ صرف اپنے گناہ کا بوجھ اٹھاتا ہے بلکہ دوسرے شخص کے اس ممکن گناہ کا بوجھ بھی اس کے اوپر ڈال دیا جاتا ہے جو صبر اور دعا کے طریقہ پر نہ چلنے کی صورت میں وہ کرتا۔

پھر اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر راضی کر لیا اور اس نے اس کو قتل کر ڈالا۔ پھر وہ نقصان اٹھانے والوں میں شامل ہو گیا۔ پھر خدا نے ایک کوے کو بھیجا جو زمین میں کریدتا تھا تاکہ وہ اس کو دکھائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کو کس طرح چھپائے۔ اس نے کہا افسوس میری حالت پر کہ میں اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش کو چھپا دیتا۔ پس وہ بہت شرمندہ ہوا ۳۰-۳۱

دنیا میں جو کچھ کسی کو ملتا ہے خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اس لئے کسی کو اچھے حال میں دیکھ کر جلنا اور اس کے نقصان کے درپے ہونا گویا خدا کے منصوبہ کو باطل کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ ایسا آدمی اگرچہ موجودہ امتحان کی دنیا میں ایک حد تک عمل کرنے کا موقع پاتا ہے۔ مگر خدا کی نظر میں وہ بدترین مجرم ہے۔ ہابیل نے اپنے بڑے بھائی کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے بعد اس کے دل میں جھجھک پیدا ہوئی۔ اس کو محسوس ہوا کہ وہ واقعی بلا سبب اپنے بھائی کو مار ڈالنا چاہتا ہے۔ مگر اس کا حسد کا جذبہ ٹھنڈا نہ ہو سکا۔ اس نے اپنے ذہن میں ایسے عذرات گھڑ لئے جو اس کے لئے اپنے بھائی کے قتل کو جائز ثابت کر سکیں۔ اس کی اندرونی کش مکش نے بالآخر خود ساختہ توجیہات میں اپنے لئے تسکین تلاش کر لی اور اس نے اپنے بھائی کو مار ڈالا ——— ضمیر کی آواز خدا کی آواز ہے۔ ضمیر کے اندر کسی عمل کے بارہ میں سوال پیدا ہونا آدمی کا امتحان کے میدان میں کھڑا ہونا ہے۔ اگر آدمی اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہے تو وہ کامیاب ہوا۔ اور اگر اس نے جھوٹے الفاظ کا سہارا لے کر ضمیر کی آواز کو دبا دیا تو وہ ناکام ہو گیا۔

حدیث میں ہے کہ زیادتی اور قطع رحم ایسے گناہ ہیں کہ ان کی سزا اسی موجودہ دنیا سے شروع ہو جاتی ہے (ما من ذنب اجدر ان یعجل اللہ عقوبتہ فی الدنیا مع ما یدخر لصاحبہ فی الآخرۃ من البغی وقطیعۃ الرحم) قابیل نے اپنے بھائی کے ساتھ جو ناحق ظلم کیا تھا اس کی سزا اس کو نہ صرف آخرت میں ملی بلکہ اسی دنیا سے اس کا انجام شروع ہو گیا۔ مجاہد اور جبیر تابعی سے منقول ہے کہ قتل کے بعد قابیل کا یہ حال ہوا کہ اس کی پنڈلی اس کی ران سے چپک گئی۔ وہ بے یار و مددگار زمین پر پڑا رہتا، یہاں تک کہ اسی حال میں ذلت اور تکلیف کے ساتھ مر گیا (ابن کثیر)

قابیل کو کوے کے ذریعہ یہ تعلیم دی گئی کہ وہ لاش کو زمین کے نیچے دفن کر دے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ انسان فطرت کے راستہ کو جاننے کے معاملہ میں جانور سے بھی زیادہ کم عقل ہے۔ اس کے باوجود اگر وہ اپنے جذبات کے پیچھے چلتا ہے تو اس سے زیادہ ظالم اور کوئی نہیں۔ نیز اس میں اس حقیقت کی طرف بھی لطیف اشارہ ہے کہ جرم سے پہلے اگر آدمی جرم کے ارادہ کو اپنے سینہ میں دفن کر دے تو اس کو شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ دل کے احساس کو دل کے اندر دبائے، اس کو دل سے باہر آ کر واقعہ نہ بننے دے۔ برے احساس کو دل کے باہر نکالنے سے پہلے تو صرف احساس کو دفن کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر اس نے اس کو باہر نکالا تو پھر ایک زندہ انسان کی "لاش" کو دفن کرنے کا مسئلہ اس کے لئے پیدا ہو جائے گا جو دفن ہو کر بھی خدا کے یہاں دفن نہیں ہوتا۔

اسی سبب سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ لکھ دیا کہ جو شخص کسی کو قتل کرے، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے سارے آدمیوں کو قتل کر ڈالا اور جس نے ایک شخص کو بچایا تو گویا اس نے سارے آدمیوں کو بچالیا۔ اور ہمارے پیغمبر ان کے پاس کھلے ہوئے احکام لے کر آئے۔ اس کے باوجود ان میں سے بہت سے لوگ زمین میں زیادتیاں کرتے ہیں۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد کرنے کے لئے دوڑتے ہیں ان کی سزا یہی ہے کہ ان کو قتل کیا جائے یا وہ سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمت سے کاٹے جائیں یا ان کو ملک سے باہر نکال دیا جائے۔ یہ ان کی رسوائی دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ مگر جو لوگ توبہ کرلیں تمھارے قابو پانے سے پہلے تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۳۲ — ۳۴

کوئی شخص جب کسی شخص کو قتل کرتا ہے تو وہ صرف ایک انسان کا قاتل نہیں ہوتا بلکہ تمام انسانوں کا قاتل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ حرمت کے اس قانون کو توڑتا ہے جس میں تمام انسانوں کی زندگیاں بندھی ہوئی ہیں۔ اسی طرح جب کوئی شخص کسی کو ظالم کے ظلم سے نجات دیتا ہے تو وہ صرف ایک شخص کا نجات دہندہ نہیں ہوتا بلکہ تمام انسانوں کا نجات دہندہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس نے اس اصول کی حفاظت کی کہ تمام انسانوں کی جان محترم ہے۔ کسی کو کسی کے اوپر ہاتھ اٹھانے کا حق نہیں۔ جب کوئی شخص کسی کی عزت یا اس کے مال یا اس کی جان پر حملہ کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرہ کے اندر ہنگامی حالت پیدا ہوگئی ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ ایسے کسی ایک واقعہ کو بھی اس نظر سے دیکھیں گویا سارے لوگوں کی جان اور مال اور آبرو خطرہ میں ہے۔ کسی معاشرہ میں ایک دوسرے کے احترام کی روایات لمبی تاریخ کے نتیجہ میں بنتی ہیں۔ اور اگر ایک بار یہ روایات ٹوٹ جائیں تو دوبارہ لمبی تاریخ کے بعد ہی ان کو معاشرہ کے اندر قائم کیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ معاشرہ کے اندر فساد کی روایت قائم کریں وہ معاشرہ کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔

خدا نے اپنی دنیا کا نظام جس اصول پر قائم کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنے حصہ کا فرض انجام دے۔ کوئی شخص دوسرے کے دائرہ میں بے جا مداخلت نہ کرے۔ تمام جمادات اور حیوانات اسی فطرت پر عمل کر رہے ہیں۔ انسان کو بھی پیغمبروں کے ذریعہ یہ ہدایات واضح طور پر بتادی گئی ہیں۔ مگر انسان جو کہ دیگر مخلوقات کے برعکس وقتی طور پر آزاد رکھا گیا ہے، سرکشی کرتا ہے اور اس طرح فطرت کے نظام میں فساد پیدا کرتا ہے۔ ایسے لوگ خدا کی نظر میں سخت مجرم ہیں۔ اور وہ لوگ اور بھی زیادہ بڑے مجرم ہیں جو خدا و رسول سے جنگ کریں۔ یعنی خدا اپنے بندوں کے درمیان ایسی دعوت اٹھائے جو لوگوں کو مفسدانہ طریقوں سے بچنے اور فطرت خداوندی پر زندگی گزارنے کی طرف بلاتی ہو تو وہ اس کا راستہ روکیں اور اس کے خلاف تخریبی کارروائیاں کریں۔ ایسے لوگوں کے لئے دنیا میں عبرت ناک سزا ہے اور آخرت میں بھڑکتی ہوئی آگ۔

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور اس کا قرب تلاش کرو اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔
بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ہے اگر ان کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اتنا ہی اور ہو تاکہ وہ اس
کو فدیہ میں دے کر قیامت کے دن کے عذاب سے چھوٹ جائیں تب بھی وہ ان سے قبول نہ کی جائے گی اور ان کے
لئے دردناک عذاب ہے۔ وہ چاہیں گے کہ آگ سے نکل جائیں مگر وہ اس سے نکل نہ سکیں گے اور ان کے لئے ایک
مستقل عذاب ہے۔ اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی
طرف سے عبرت ناک سزا۔ اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ پھر جس نے اپنے ظلم کے بعد توبہ کی اور اصلاح کر لی تو اللہ
بے شک اس پر توجہ کرے گا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ زمین اور آسمانوں کی سلطنت
کا مالک ہے۔ وہ جس کو چاہے سزا دے اور جس کو چاہے معاف کر دے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۳۵ - ۴۰

بندے کے لیے سب سے بڑی چیز اللہ کی قربت ہے۔ یہ قربت اپنی محسوس اور کامل صورت میں تو آخرت
میں حاصل ہوگی۔ تاہم کسی بندے کا عمل جب اس کو اللہ سے قریب کرتا ہے تو ایک لطیف احساس کی صورت میں
ربہ اس کو اسی دنیا میں ہونے لگتا ہے۔ اس قربت تک پہنچنے کا ذریعہ تقویٰ اور جہاد ہے۔ یعنی ڈرنے اور
بدوجہد کرنے کی سطح پر اللہ کا پرستار بننا۔ آدمی کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب کہ وہ اپنے کو حق اور ناحق
کے درمیان کھڑا ہوا پاتا ہے۔ حق کی طرف بڑھنے میں اس کی انا ٹوٹتی ہے۔ اس کی دنیوی مصلحتوں کا ڈھانچہ بکھرتا ہوا نظر
آتا ہے۔ جب کہ ناحق کا طریقہ اختیار کرنے میں اس کی انا قائم رہتی ہے۔ اس کی مصلحتیں پوری طرح محفوظ دکھائی
دیتی ہیں۔ ایسے وقت میں جو شخص خدا سے ڈرے اور تمام دوسری باتوں کو نظر انداز کرکے خدا کو پکڑ لے۔ اور ہر مشکل
اور ہر ناخوش گواری کو جھیل کر خدا کی طرف بڑھے تو یہی وہ چیز ہے جو آدمی کو خدا سے قریب کرتی ہے۔ اور اس قربت
کا نقد تجربہ آدمی کو حسیات کی سطح پر ایک لطیف ادراک کی صورت میں اسی وقت ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص
تقویٰ اور جہاد کے راستہ پر چلنے کے لئے تیار نہ ہو اس نے خدا کا انکار کیا۔ وہ خدا سے دور ہو کر ایسے عذاب میں
پڑ جاتا ہے جس سے وہ کسی طرح چھٹکارا نہ پا سکے گا۔

جزا کا معاملہ تمام تر خدا کے اختیار میں ہے۔ نہ تو ایسا ہے کہ کوئی بعد کی زندگی میں اصلاح کرے تب بھی اس
کے پچھلے اعمال اس سے نہ دھلیں اور نہ یہ بات ہے کہ یہاں کوئی اور طاقت ہے جو سفارش یا مداخلت کے زور پر کسی کے
نجام کو بدل سکے۔ سارا معاملہ ایک خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہی کمال درجہ حکمت اور قدرت کے ساتھ سب کا فیصلہ کرے گا۔

سماجی جرائم کے لئے اسلام کی سزائیں دو خاص پہلوؤں کو سامنے رکھ کر مقرر کی گئی ہیں۔ ایک، آدمی کے
رم کی سزا۔ دوسرے یہ کہ سزا ایسی عبرت ناک ہو کہ اس کو دیکھ کر دوسرے مجرمین کی حوصلہ شکنی ہو۔ تاہم مجرم اگر جرم
کے بعد اپنے فعل پر شرمندہ ہو۔ وہ اللہ سے معافی مانگے اور آئندہ اس قسم کی چیزوں کو بالکل چھوڑ دے تو امید ہے کہ
ین اللہ اسے معاف کر دے گا۔

اے پیغمبر، تم کو وہ لوگ رنج میں نہ ڈالیں جو کفر کی راہ میں بڑی تیزی دکھا رہے ہیں۔ خواہ وہ ان میں سے ہوں جو اپنے منھ سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے یا ان میں سے ہوں جو یہودی ہیں، جھوٹ کے بڑے سننے والے، سننے والے دوسرے لوگوں کی خاطر جو تمھارے پاس نہیں آئے۔ وہ کلام کو اس کے مقام سے ہٹا دیتے ہیں۔ وہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تم کو یہ حکم ملے تو قبول کر لینا اور اگر یہ حکم نہ ملے تو اس سے بچ کر رہنا۔ اور جس کو اللہ فتنہ میں ڈالنا چاہے تو تم اللہ کے مقابل اس کے معاملہ میں کچھ نہیں کر سکتے۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے نہ چاہا کہ ان کے دلوں کو پاک کرے۔ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہے ۴۱

مدینہ میں اندرونی طور پر دو قسم کے لوگ اسلامی دعوت کی مخالفت کر رہے تھے۔ ایک منافقین، دوسرے یہود۔ منافقین وہ لوگ تھے جو ظاہری اور نمائشی اسلام کو لئے ہوئے تھے۔ سچے اسلام کی دعوت میں ان کو اپنے اغراض و مفادات پر زد پڑتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ یہود وہ لوگ تھے جو مذہب کی نمائندگی کی گدیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کو محسوس ہوتا تھا کہ اسلامی دعوت ان کو ان کے برتری کے مقام سے نیچے اتار رہی ہے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ سچے اسلام کی دعوت کو اپنا مشترک دشمن سمجھتے تھے۔ اس لئے اسلام کے خلاف مہم چلانے میں دونوں ایک ہو گئے۔ ان کے "بڑے" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ خود نہ آتے۔ البتہ ان کے "چھوٹے" اس پر لگے ہوئے تھے کہ وہ آپ کی باتوں کو سنیں اور ان کو اپنے بڑوں تک پہنچائیں۔ پھر یہ لوگ اس کو الٹے معنی پہناتے اور آپ کو اور آپ کی تحریک کو بدنام کرتے۔ ان کی سرکشی نے ان کو ایسا ڈھیٹ بنا دیا تھا کہ وہ اللہ کے کلام کو اس کے موقع و محل سے ہٹا کر اس سے اپنا مفید مطلب مفہوم نکالنے سے بھی نہ ڈرتے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے کو خدا و رسول کے تابع نہیں کرتے۔ بلکہ ان کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ جو بات اپنے ذوق کے مطابق ہو اس کو لے لو اور جو بات ذوق کے مطابق نہ ہو اس کو چھوڑ دو۔ یہ مزاج کسی آدمی کے لئے سخت فتنہ ہے۔ جن لوگوں کا یہ حال ہو کہ وہ حق کے مقابلہ میں مفاد اور مصلحت کو ترجیح دیں، جو ہر حال میں اپنے کو بڑائی کے مقام پر دیکھنا چاہیں، جو حق کو زیر کرنے کے لئے اس کے خلاف تخریبی سازشیں کریں، حتیٰ کہ اپنے عمل کو جائز ثابت کرنے کے لئے خدا کے کلام کو بدل ڈالیں، ایسے لوگوں کی نفسیات بالآخر یہ ہو جاتی ہے کہ وہ حق کو قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے خدا کا ساتھ چھوڑا، اس لئے خدا نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ایسے لوگ خدا کی توفیق سے محروم ہو کر باطل مشغلوں میں لگے رہتے ہیں، یہاں تک کہ آگ کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔

اللہ کا جو بندہ اللہ کے سچے دین کا پیغام لے کر اٹھا ہو اس کو مخالفتوں کی وجہ سے بے ہمت نہیں ہونا چاہئے۔ ایسے لوگوں کی سرگرمیاں حقیقۃً داعی کے خلاف نہیں بلکہ خدا کے خلاف ہیں۔ اس لئے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ دعوتی عمل سے اللہ کو جو چیز مطلوب ہے وہ صرف یہ کہ اصل بات سے تجزیی طور پر لوگوں کو آگاہ کر دیا جائے۔ اور یہ کام اللہ کی مدد سے لازماً اپنی تکمیل تک پہنچ کر رہتا ہے۔

وہ جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں، حرام کے بڑے کھانے والے ہیں۔ اگر وہ تمھارے پاس آئیں تو خواہ ان کے درمیان فیصلہ کرو یا ان کو ٹال دو۔ اگر تم ان کو ٹال دو گے تو وہ تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اور اگر تم فیصلہ کرو تو ان کے درمیان انصاف کے مطابق فیصلہ کرو۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اور وہ کیسے تم کو حکم بناتے ہیں حالاں کہ ان کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا حکم موجود ہے۔ اور پھر وہ اس سے منھ موڑ رہے ہیں۔ اور یہ لوگ ہرگز ایمان والے نہیں ہیں ۴۳ - ۴۲

حرام (سُحت) سے مراد رشوت ہے۔ رشوت کی ایک عام شکل وہ ہے جو براہ راست اسی نام پر لی جاتی ہے۔ چنانچہ یہودی علماء میں ایسے لوگ تھے جو رشوت لے کر غلط مسائل بتایا کرتے تھے۔ تاہم رشوت کی ایک اور صورت وہ ہے جس میں براہ راست لین دین نہیں ہوتا مگر وہ تمام رشوتوں میں زیادہ بڑی اور زیادہ قبیح رشوت ہوتی ہے۔ یہ ہے دین کو عوامی پسند کے مطابق بنا کر پیش کرنا تاکہ عوام کے درمیان مقبولیت ہو، لوگوں کا اعزاز و اکرام ملے، لوگوں کے چندے اور نذرانے وصول ہوتے رہیں۔

دین کو اس کی بے آمیز صورت میں پیش کرنا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی عوام کے اندر نامقبول ہو جائے۔ اس کے برعکس دین کو اگر ایسی صورت میں پیش کیا جائے کہ زندگی میں کوئی حقیقی تبدیلی بھی نہ کرنا پڑے اور آدمی کو دین بھی حاصل رہے تو ایسے دین کے گرد بہت جلد بھیڑ کی بھیڑ اکٹھا ہو جاتی ہے —— وہ دین جس میں اپنی دنیا پرستانہ زندگی کو بدلے بغیر کچھ سستے اعمال کے ذریعہ جنت مل رہی ہو۔ وہ دین جو قومی اور مادی ہنگامہ آرائیوں کو دینی جواز عطا کرتا ہو۔ وہ دین جس میں یہ موقع ہو کہ آدمی اپنی جاہ پسندی کے لیے سرگرم ہو، پھر بھی وہ جو کچھ کرے سب دین کے خانہ میں لکھا جاتا رہے۔ جو لوگ اس قسم کا دین پیش کریں وہ بہت جلد عوام کے اندر محبوبیت کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

یہود کے قائدین اسی قسم کا دین چلا کر عوام کا مرجع بنے ہوئے تھے۔ وہ عوام کو ان کا پسندیدہ دین پیش کر رہے تھے اور عوام اس کے معاوضہ میں ان کو مالی تعاون سے لے کر اعزاز و اکرام تک ہر چیز نثار کر رہے تھے۔ ایسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سچے دین کی آواز بلند کرنا ان کو ناقابل برداشت معلوم ہوا۔ کیوں کہ یہ ان کے مفادات کے ڈھانچہ کو توڑنے کے ہم معنی تھا۔ آپ سے ان کو اتنی ضد ہو گئی کہ آپ کے متعلق کسی اچھی خبر سے ان کو کوئی دلچسپی نہ رہی۔ البتہ اگر وہ آپ کے بارے میں کوئی بری خبر سنتے تو اس میں خوب دل چسپی لیتے اور اس میں اضافہ کر کے اس کو پھیلاتے۔ جن لوگوں میں اس قسم کا بگاڑ آ جائے ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ اگر وہ دینی فیصلہ لینے کی طرف رجوع بھی ہوتے ہیں تو اس امید میں کہ فیصلہ اپنی خواہش کے مطابق ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ جانتے ہوئے کہ یہ خدا و رسول کا فیصلہ ہے اس کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ایسا کرنا محض ایک فیصلہ کو نہ ماننا نہیں ہے بلکہ خود ایمان و اسلام کا انکار کرنا ہے۔

بے شک ہم نے تورات اتاری ہے جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ اسی کے مطابق خدا کے فرماں بردار انبیاء یہودی لوگوں کا فیصلہ کرتے تھے اور ان کے درویش اور علماء بھی۔ اس لئے کہ وہ خدا کی کتاب پر نگہبان ٹھہرائے گئے تھے۔ اور وہ اس کے گواہ تھے۔ پس تم انسانوں سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو اور میری آیتوں کو متاع حقیر کے عوض نہ بیچو۔ اور جو کوئی اس کے موافق حکم نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو وہی لوگ کافر ہیں۔ اور ہم نے اس کتاب میں ان پر لکھ دیا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا بدلا ان کے برابر۔ پھر جس نے اس کو معاف کر دیا تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے۔ اور جو شخص اس کے موافق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ اور ہم نے ان کے پیچھے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا تصدیق کرتے ہوئے اپنے سے قبل کی کتاب تورات کی اور ہم نے اس کو انجیل دی جس میں ہدایت اور نور ہے اور وہ تصدیق کرنے والی تھی اپنے سے اگلی کتاب تورات کی اور ہدایت اور نصیحت ڈرنے والوں کے لئے۔ اور چاہئے کہ انجیل والے اس کے موافق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں اتارا ہے۔ اور جو کوئی اس کے موافق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا تو وہی لوگ نافرمان ہیں ۴۷ - ۴۴

خدا کی کتاب اس لئے آتی ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی ابدی فلاح کی راہ دکھائے۔ خواہش پرستی کے اندھیرے سے نکال کر ان کو حق پرستی کی روشنی میں لائے۔ جو خدا سے ڈرنے والے ہیں وہ خدا کی کتاب کو خدا اور بندے کے درمیان مقدس عہد سمجھتے ہیں جس میں اپنی طرف سے کمی یا زیادتی جائز نہ ہو۔ وہ اس کی تعمیل اس طرح کرتے ہیں جس طرح کسی کے پاس کوئی امانت ہو اور وہ ٹھیک ٹھیک اس کی ادائگی کرے۔ اللہ کی کتاب بندوں کے حق میں اللہ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ ضرورت ہوتی ہے کہ زندگی کے معاملات میں اسی کی ہدایت پر چلا جائے اور باہمی نزاعات میں اسی کے احکام کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ خدا کی کتاب کو اگر یہ حاکمانہ حیثیت نہ دی جائے بلکہ اپنے معاملات و نزاعات کو اپنی دنیوی مصلحتوں کے تابع رکھا جائے تو یہ خدا کی کتاب سے انکار کے ہم معنی ہوگا، خواہ تبرک کے طور پر اس کا کتنا ہی زیادہ ظاہری احترام کیا جاتا ہو۔ جو لوگ اپنے کو مسلم کہیں مگر ان کا حال یہ ہو کہ وہ اختیار اور آزادی رکھتے ہوئے بھی اپنے معاملات کا فیصلہ اللہ کی کتاب کے مطابق نہ کریں بلکہ خواہشوں کی شریعت پر چلیں وہ اللہ کی نظر میں کافر اور ظالم اور فاسق ہیں۔ وہ خدا کی حاکمانہ حیثیت کا انکار کرنے والے ہیں، وہ حق کے تلف کرنے والے ہیں، وہ اطاعت خداوندی کے عہد سے نکل جانے والے ہیں۔ حکم شریعت کو جان بوجھ کر نظر انداز کرنے کے بعد آدمی کی کوئی حیثیت خدا کے یہاں باقی نہیں رہتی۔

قصاص کے سلسلے میں شریعت کا تقاضا ہے کہ کسی کی حیثیت کی پروا کئے بغیر اس کا نفاذ کیا جائے۔ تاہم بعض اوقات آدمی کی جارحیت اس کی شر پسندی کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ وقتی جذبہ کے تحت صادر ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر مجروح جارح کو معاف کر دے تو یہ اس کی طرف سے جارح کے لئے ایک صدقہ ہوگا اور سماج میں وسعت ظرف کی فضا پیدا کرنے کا ذریعہ۔

اور ہم نے تمھاری طرف کتاب اتاری حق کے ساتھ، تصدیق کرنے والی پچھلی کتاب کی اور اس کے مضامین پر نگہبان۔ پس تم ان کے درمیان فیصلہ کرو اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا۔ اور جو حق تمھارے پاس آیا ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک طریقہ ٹھہرایا۔ اور اگر خدا چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ مگر اللہ نے چاہا کہ وہ اپنے دئے ہوئے حکموں میں تمھاری آزمائش کرے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف دوڑو۔ آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ پھر وہ تم کو آگاہ کر دے گا اس چیز سے جس میں تم اختلاف کر رہے تھے ۴۸

یہاں "کتاب" سے مراد دین کی اصلی اور اساسی تعلیمات ہیں۔ اللہ کی یہ کتاب ایک ہی کتاب ہے اور وہی ایک کتاب، زبان اور ترتیب کے فرق کے ساتھ، تمام نبیوں کی طرف اتاری گئی ہے۔ تاہم دین کی حقیقت جس ظاہری ڈھانچہ میں متشکل ہوتی ہے اس میں مختلف انبیار کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ نہیں کہ دین کے اتارنے میں کوئی ارتقائی ترتیب ہے۔ یعنی پہلے کم ترقی یافتہ اور غیر کامل دین اتارا گیا اور اس کے بعد زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ کامل دین اترا۔ اس فرق کی وجہ خدا کی حکمت ابتلا ہے نہ کہ حکمت ارتقار۔ قرآن کے مطابق ایسا صرف اس لئے ہوا کہ لوگوں کو آزمایا جائے۔ زمانہ گزرنے کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ دین کی اندرونی حقیقت گم ہو جاتی ہے اور ظواہر و رسوم مقدس ہو کر اصل بن جاتے ہیں۔ لوگ عبادت اس کو سمجھ لیتے ہیں کہ ایک خاص ڈھانچہ کو ظاہری شرائط کے ساتھ دہرالیا جائے۔ اس لئے ظاہری ڈھانچہ میں بار بار تبدیلیاں کی گئیں تاکہ ڈھانچہ کی مقصودیت کا ذہن ختم ہو اور خدا کے سوا کوئی اور چیز توجہ کا مرکز نہ بننے پائے۔ اس کی ایک مثال قبلہ کی تبدیلی ہے۔ بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے عبادت کریں۔ یہ حکم صرف رخ بندی کے لئے تھا۔ مگر دھیرے دھیرے ان کا ذہن یہ بن گیا کہ بیت المقدس کی طرف رخ کرنے ہی کا نام عبادت ہے۔ اس وقت سابق حکم کو بدل کر کعبہ کو قبلہ بنا دیا گیا۔ اب کچھ لوگ سابقہ روایت سے لپٹے رہے اور کچھ لوگوں نے خدا کی ہدایت کو پالیا۔ اس طرح تبدیلیٔ قبلہ سے یہ کھل گیا کہ کون درو دیوار کو پوجنے والا تھا اور کون خدا کو پوجنے والا (بقرہ ۱۴۳)

اب اس قسم کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔ کیونکہ ڈھانچہ کو نبی بدلتا ہے اور نبی اب آنے والا نہیں۔ تاہم جہاں تک اصل مقصود کا تعلق ہے وہ بدستور باقی ہے۔ اب بھی خدا کے یہاں اس کا سچا پرستار وہی شمار ہوگا جو ظاہری ڈھانچہ کی پابندی کے باوجود ظاہری ڈھانچہ کو مقصودیت کا درجہ نہ دے، جو ظواہر سے ذہن کو آزاد کر کے خدا کی عبادت کرے۔ پہلے یہ مقصد ظاہری ڈھانچہ کو توڑ کر حاصل ہوتا تھا اب اس کو ذہنی شکست و ریخت کے ذریعہ حاصل کرنا ہوگا۔

ظواہر کے نام پر دین میں جو جھگڑے ہیں وہ صرف اس لئے ہیں کہ لوگوں کی غفلت نے ان کو اصل حقیقت سے بے خبر کر دیا ہے۔ اگر حقیقت کو وہ اس طرح پالیں جس طرح وہ آخرت میں دکھائی دے گی تو تمام جھگڑے ابھی ختم ہو جائیں۔

اور ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے اتارا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو اور ان لوگوں سے بچو کہ کہیں وہ تم کو پھسلا دیں تمہارے اوپر اللہ کے اتارے ہوئے کسی حکم سے۔ پس اگر وہ پھر جائیں تو جان لو کہ اللہ ان کو ان کے بعض گناہوں کی سزا دینا چاہتا ہے۔ اور یقیناً لوگوں میں سے زیادہ آدمی نافرمان ہیں۔ کیا یہ لوگ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ اور اللہ سے بڑھ کر کس کا فیصلہ ہو سکتا ہے ان لوگوں کے لئے جو یقین کرنا چاہیں ۵۰ - ۴۹

قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفے الگ الگ کتابیں نہیں ہیں۔ یہ سب ایک ہی کتاب الٰہی کے مختلف ایڈیشن ہیں جس کو یہاں "الکتاب" کہا گیا ہے۔ خدا کی طرف سے جتنی کتابیں آئیں، خواہ وہ جس دور میں اور جس زبان میں آئی ہوں، سب کا مشترک مضمون ایک ہی تھا۔ تاہم پچھلی کتابوں کے حاملین بعد کے زمانہ میں ان کو ان کی اصلی صورت میں محفوظ نہ رکھ سکے۔ اس لئے خدا نے ایک کتاب مہیمن (قرآن) اتارا۔ یہ خدا کی طرف سے اس کی کتاب کا مستند ایڈیشن ہے اور اس بنا پر وہ ایک کسوٹی ہے جس پر جانچ کر معلوم کیا جائے کہ بقیہ کتابوں کا کون سا حصہ اصلی حالت میں ہے اور کون سا وہ ہے جو بدلا جا چکا ہے۔

یہود خدا کے سچے دین کے ساتھ اپنی باتوں کو ملا کر ایک خود ساختہ دین بنائے ہوئے تھے۔ اس خود ساختہ دین سے ان کی عقیدتیں بھی وابستہ تھیں اور ان کے مفادات بھی۔ اس لئے وہ کسی طرح تیار نہ تھے کہ اس کو چھوڑ کر پیغمبر کے لائے ہوئے بے آمیز دین کو مان لیں۔ انھوں نے حق کے آگے جھکنے کے بجائے اپنے لئے یہ طریقہ پسند کیا کہ وہ حق کے علم بردار کو اتنا زیادہ پریشان کریں کہ وہ خود ان کے آگے جھک جائے، وہ خدا کے سچے دین کو چھوڑ کر ان کے اپنے بنائے ہوئے دین کو اختیار کر لے۔ خدا اگر چاہتا تو پہلے ہی مرحلہ میں ان ظالموں کا ہاتھ روک دیتا اور وہ حق کے داعی کو ستانے میں کامیاب نہ ہوتے۔ مگر اللہ نے انھیں چھوٹ دی کہ وہ اپنے ناپاک منصوبوں کو بروئے کار لا سکیں۔ ایسا اس لئے ہوا تاکہ یہ بات پوری طرح کھل جائے کہ دین داری کے یہ دعوے دار سب سے زیادہ بے دین لوگ ہیں۔ وہ خدا کے پرستار نہیں ہیں بلکہ خود اپنی ذات کے پرستار ہیں۔ اللہ کی یہ سنت اگرچہ حق کے داعیوں کے لئے بڑا سخت امتحان ہے۔ مگر یہی وہ عمل ہے جس کے ذریعہ یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ کون جنت کا مستحق ہے اور کون جہنم کا۔

انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ اپنی خواہشوں کے پیچھے چلنا چاہتا ہے، اللہ کے حکم کا پابند بن کر رہنا اس کو گوارا نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ دین خداوندی کی خود ساختہ تشریح کر کے وہ اس کو بھی اپنی خواہشوں کے سانچہ میں ڈھال لیتا ہے۔ ایسی حالت میں بے آمیز دین کو وہی لوگ قبول کریں گے جو چیزوں کو خواہش کی سطح پر نہ دیکھتے ہوں بلکہ اس سے اوپر اٹھ کر اپنی رائے قائم کرتے ہوں۔ اللہ کی بات بلاشبہ صحیح ترین بات ہے۔ مگر موجودہ آزمائشی دنیا میں ہر سچائی پر ایک شبہ کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ اس پردہ کو پھاڑ کر اس پر یقین کرے، وہ غیب کو شہود میں دیکھ لے۔ جو شخص ظاہری شبہات میں اٹک جائے وہ ناکام ہو گیا اور جو شخص ظاہری شبہات کے غبار کو پار کر کے سچائی کو پا لے وہ کامیاب رہا۔

اے ایمان والو، یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور تم میں سے جو شخص ان کو اپنا دوست بنائے گا تو وہ ان ہی میں سے ہوگا۔ اللہ ظالم لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔ تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں روگ ہے وہ ان ہی کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ تو ممکن ہے کہ اللہ فتح دیدے یا اپنی طرف سے کوئی خاص بات ظاہر کرے تو یہ لوگ اس چیز پر جس کو یہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں نادم ہوں گے۔ اور اس وقت اہل ایمان کہیں گے کیا یہ وہی لوگ ہیں جو زور شور سے اللہ کی قسمیں کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ ان کے سارے اعمال ضائع ہوگئے اور وہ گھاٹے میں رہے　۵۳ — ۵۱

عرب میں مسلمان ابھی ایک نئی طاقت کی حیثیت رکھتے تھے۔ مزید یہ کہ ان کے مخالفین ان کو اکھاڑنے کی کوشش میں رات دن لگے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ملک کے یہودی اور عیسائی قبائل کا یہ حال تھا کہ ملک کے بیشتر اقتصادی وسائل پر ان کا قبضہ تھا۔ صدیوں کی تاریخ نے ان کی عظمت لوگوں کے دلوں پر بٹھا رکھی تھی۔ لوگوں کو یقین نہیں تھا کہ ایسی طاقت کو ملک سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی جماعت میں جو کمزور لوگ تھے وہ چاہتے تھے کہ م کی جدوجہد میں اس طرح شریک نہ ہوں کہ یہود و نصاریٰ کو اپنا دشمن بنا لیں۔ تاکہ یہ کش مکش اگر مسلمانوں کی شکست پر ختم ہو تو یہود و نصاریٰ کی طرف سے انھیں کسی انتقامی کارروائی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہ لوگ مستقبل کے موہوم خطرہ سے بچنے کے لئے اپنے کو وقت کے یقینی خطرہ میں مبتلا کر رہے تھے، اور وہ ان کی دہری وفاداری تھی۔ جو شخص بے ضرر معاملات میں حق پرست بنے اور ضرر کا اندیشہ ہو تو باطل پرستوں کا ساتھ دینے لگے، اس کا انجام خدا کے یہاں انھیں لوگوں میں ہوگا جن کا اس نے خطرہ کے مواقع پر ساتھ دیا۔

کسی کی زندگی میں وہ وقت بڑا نازک ہوتا ہے جب کہ اسلام پر قائم رہنے کے لیے اس کو کسی قسم کی قربانی دینی پڑے۔ ایسے مواقع آدمی کے اسلام کی تصدیق یا تردید کرنے کے لئے آتے ہیں۔ خدا چاہتا ہے کہ آدمی جس اسلام کا ثبوت بے خطر حالات میں دے رہا تھا اسی اسلام کا ثبوت وہ اس وقت بھی دے جب کہ جذبات کو دبا کر یا جان و مال کا خطرہ مول لے کر آدمی اپنے اسلام کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ اس امتحان میں پورا اترنے کے بعد ہی آدمی اس قابل بنتا ہے کہ اس کا خدا اس کو اپنے وفادار بندوں میں لکھ لے۔ ان مواقع پر اسلامیت کا ثبوت دینا ہی کسی آدمی کے پچھلے اعمال کو باقیمت بناتا ہے۔ اور اگر وہ ایسے مواقع پر اسلامیت کا ثبوت نہ دے سکے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے پچھلے تمام اعمال کو بے قیمت کر لیا۔

دنیا کا ہر امتحان ارادہ کا امتحان ہے۔ آدمی کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ خطرات کو نظر انداز کر کے ارادہ کا ثبوت دے دے، وہ اللہ کی طرف اپنا پہلا قدم اٹھا دے۔ اس کے بعد فوراً خدا کی مدد اس کا سہارا بن جاتی ہے۔ مگر جو شخص ارادہ کا ثبوت نہ دے، جو خدا کی طرف اپنا پہلا قدم نہ اٹھائے وہ اللہ کی نظر میں ظالم ہے۔ ایسے لوگوں کو خدا یک طرفہ طور پر اپنی مدد کا سہارا نہیں بھیجتا۔

روزہ کِس کے لئے

سورہ بقرہ رکوع ۲۳ میں رمضان کے روزوں کا بیان ہے۔ روزہ کے احکام بتاتے ہوئے درمیان
ں ارشاد ہوا ہے: اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو میں نزدیک ہوں۔ پکارنے
الے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ پس چاہئے کہ وہ میری پکار کا جواب دیں اور مجھ پر ایمان رکھیں۔ امید ہے کہ وہ
ھلائی کو پالیں گے (بقرہ ۱۸۶) گویا خدا سے پانے کے لئے بندہ کو بھی خدا کو کچھ دینا ہے۔ روزہ اسی "دینے" کے
مل کی ایک علامت ہے۔ روزہ میں آدمی خدا کی خاطر اپنا کھانا پانی چھوڑ دیتا ہے جو آدمی کی آخری سب سے بڑی
ضرورت ہے۔ یہ اس بات کا ایک سبق ہے کہ دنیا کی زندگی میں آدمی کو جو کچھ اپنے رب کے سامنے پیش کرنا ہے اس کا
سلسلہ ناگزیر ضروریات تک پہنچتا ہے۔ روزہ یہ پیغام دیتا ہے کہ آدمی خود "بھوکا" رہ کر اپنی متاع کو خدا
کے حضور نذر کر دے۔

روزہ عمل کا خاتمہ نہیں بلکہ عمل کا آغاز ہے۔ روزہ دار کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ اللہ
کے لئے وقف کر دے۔ اس کو اپنے بیوی بچوں کی امنگوں میں کمی کر کے دین کے تقاضے پورے کرنا ہیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی
ہو سکتا ہے کہ اس کو اپنی زندگی یہاں تک مختصر کرنی پڑے کہ بہت سی ضروری چیزوں سے اس کے لئے "فاقہ" کرنے
کی نوبت آجائے۔ اگر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کو وہ سب کچھ ملے جو خدا کے پاس ہے تو اس کو بھی وہ سب کچھ دینا
پڑے گا جو اس کے پاس ہے۔ "سب کچھ" دے کر ہی سب کچھ ملتا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

جس طرح رمضان کے مہینہ میں خدا روزہ کے لئے پکارتا ہے اسی طرح سال بھر اس کی پکار بلند
ہوتی رہتی ہے۔ آدمی کے سامنے ناجائز کمائی کی صورتیں آتی ہیں، اس وقت خدا پکارتا ہے کہ اے میرے بندے ناجائز
کمائی کو چھوڑ کر جائز کمائی پر قناعت کر۔ کسی بھائی کے خلاف اس کے اندر غصہ کی آگ بھڑکتی ہے، اس وقت خدا
پکارتا ہے کہ میرے بندے تو اس کو معاف کر دے۔ حق کو ماننے میں مفاد یا عزت نفس کا سوال رکاوٹ بنتا ہے،
اس وقت خدا پکارتا ہے کہ میرے بندے تو کسی مصلحت کی پروا کئے بغیر حق کو مان لے۔ اسی طرح زندگی کے ہر موقع پر
خدا اپنے بندوں کو پکارتا ہے۔ اب جو شخص ان مواقع پر وہی کرے جو اس کا خدا اس سے چاہتا ہے تو اس نے
خدا کی پکار پر لبیک کہا۔ اسی کو قرآن میں تقویٰ کہا گیا ہے (بقرہ ۔ ۱۸۳)

روزہ کا عمل اللہ کو بڑا بنانے (بقرہ ۱۸۵) کی ایک علامت ہے۔ اللہ کے حکم سے آدمی اپنے ایک
ایسے تقاضے پر پابندی لگا لیتا ہے جو اس کی زندگی کا سب سے زیادہ ضروری تقاضا ہے۔ یہ عمل کی زبان میں
اس بات کا عہد ہے کہ آدمی اللہ کو اپنا "کبیر" اور اپنے آپ کو اس کے مقابلہ میں "صغیر" بنائے گا۔

یہی تکبیر ہے جو زبان سے اللہ اکبر کی صورت میں نکلتی ہے اور عمل سے اپنی انا کو ختم کر دینے کی صورت میں۔ آدمی کی پوری زندگی اس بات کا امتحان ہے کہ وہ کس کو بڑا بناتا ہے، خدا کو یا اپنے آپ کو۔ اپنے کو بڑا بنانے والے کے اندر گھمنڈ کی نفسیات پرورش پاتی ہیں اور خدا کو بڑا بنانے والے کے اندر تواضع کی نفسیات۔ جو شخص خدا کو اپنا بڑا بنائے اس کے اندر سے انانیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی پوری ہستی خدا کے آگے جھک جاتی ہے۔ خدا کی عظمت کا تصور اس کے اوپر اتنا چھا جاتا ہے کہ اپنی ہستی اس کو بالکل بے قیمت دکھائی دینے لگتی ہے۔ ایسے شخص سے جب کسی کا معاملہ پڑتا ہے تو وہ "عبد" کی طرح اس سے معاملہ کرتا ہے نہ کہ "معبود" کی طرح۔ وہ خدا کے بندوں کے مقابلہ میں سرکشی نہیں دکھاتا۔ وہ بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے گھمنڈ کا مظاہرہ نہیں کرتا، اس کو دولت یا عہدہ یا حیثیت کا کوئی حصہ مل جائے تو وہ اپنے کو دوسروں سے بڑا نہیں سمجھتا۔ اللہ کو اپنا بڑا بنانا اللہ کے سامنے ذکر اور عبادت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور بندوں کے سامنے تواضع اور بے نفسی کی صورت میں۔

روزہ ایک ایسا تجربہ ہے جو بالآخر "افطار" تک پہنچاتا ہے۔ بھوک کا لمبا وقفہ گزار کر آدمی اپنے آپ کو کھانے اور پانی سے سیراب کرتا ہے۔ اس طرح وہ خدا کی نعمتوں کے بارے میں اپنے اندر شکر کے احساس (بقرہ ۱۸۵) کو جگاتا ہے۔ وہ عمل کی زبان میں اپنے آپ کو بتاتا ہے کہ خدا کی وہ عنایات کتنی بڑی ہیں جو روزانہ اس کو خدا کی طرف سے ملتی رہتی ہیں۔ روزہ کے مہینہ میں قرآن کا اتارنا اس بات کا ایک اشارہ ہے کہ قرآن بھی تمھارے لئے ایک خدائی افطار کا انتظام ہے۔ تم ہدایت کے معاملہ میں بھوکے تھے۔ خدا نے اپنی نعمت ہدایت سے تم کو سیراب کیا۔

اللہ نے انسان کو پیدا کیا۔ اس کو بہترین صلاحیتیں عطا کیں۔ دنیا میں اعلیٰ ترین انتظام کر کے یہاں اس کو بسایا۔ اس کے لئے ایک ابدی جنت بنائی اور اپنی کتاب کے ذریعے پیشگی بتا دیا کہ اس جنت تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے۔ جس خدا کے اتنے احسانات ہوں اس کے ساتھ آدمی کا تعلق ایسا ہونا چاہئے کہ اس کا تصور اس کی روح کو سرشار کر دے۔ اس کی یاد آتے ہی قلب و دماغ شکر کے سجدہ میں گر پڑیں۔ زبان پر اس کی احسان مندی کے نغمے جاری ہوں۔ اس کی اندرونی ہستی اس کے احسانات کے اعتراف سے بھر جائے۔ اس کی عملی زندگی ایسی گزرے گویا کہ وہ خدا کے انعام واحسان کی بارش میں نہائی ہوئی ہے۔

تقویٰ اور تکبیر اور تشکر کا یہ ثبوت جو بندے کو دینا ہے وہ بہت بڑی قیمت مانگتا ہے، وہ اپنے نفس اور مفادات کی قربانی ہے۔ اس پر آدمی اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب کہ اس کا ایمان اس کے لئے حقیقی معنوں میں یقین و اعتماد کے ہم معنی بن گیا ہو۔

عقلیت کا فریب

"میں ایک سوال میں الجھ گیا ہوں" ایک صاحب نے کہا "آپ اس کو حل کیجئے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ اسلام کی صداقت کے بارے میں میرا یقین ختم نہ ہو جائے" ان کا سوال موت کے بعد آنے والے انجام سے متعلق تھا۔ انھوں نے کہا کہ اسلام کے مطابق آدمی کے مرنے کے بعد ہی اس کا اخروی انجام شروع ہو جاتا ہے۔ اب ایک شخص آج پیدا ہوتا ہے اور ایک شخص وہ ہے جو دس ہزار سال پہلے پیدا ہوا۔ دونوں پچاس پچاس سال زندگی گزارتے ہیں اور اس کے بعد مر کر اپنی آخرت میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق ان میں سے ایک شخص دس ہزار سال پہلے سے اپنا انجام پا رہا ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جس کا اخروی انجام دس ہزار سال بعد آج سے شروع ہوگا۔ یہ آخر کون سا انصاف ہے۔

میں نے کہا کہ اس مسئلہ کو سمجھنا ناممکن نہیں۔ مثلاً جدید نظریہ اضافیت نے زمان و مکان کے تصور کو ختم کر دیا ہے۔ ماضی اور مستقبل کی تقسیم دراصل ہماری ذہنی محدودیت کی وجہ سے ہے۔ اگر ہم اپنی ذہنی حدبندیوں سے آزاد ہو جائیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس قسم کی تمام تقسیمات بالکل اضافی تھیں۔ اس کا ایک تجربہ وہ ہے جو ہر آدمی کو خواب میں ہوتا ہے۔ خواب میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سالوں کے اندر گزرنے والے واقعات کو ایک لمحہ میں دیکھ لیتا ہے۔ خواب کی دنیا میں دور اور قریب، ماضی اور مستقبل کی کوئی تقسیم نہیں۔

تاہم اصل بات یہ ہے کہ ان سوالات میں الجھنا اصولی طور پر درست نہیں۔ اس قسم کے سوالات سوالات نہیں ہیں بلکہ موشگافیاں ہیں۔ اور آدمی اگر موشگافیوں میں پڑ جائے تو ان کا کبھی خاتمہ نہیں ہوتا۔ سوچنے کا یہ انداز صرف بھٹکانے والا ہے۔ آدمی اگر اس قسم کے سوالات کے حل پر اصرار کرے تو نہ وہ دنیا میں کوئی کامیابی حاصل کر سکتا ہے اور نہ آخرت میں۔

میں نے کہا کہ آپ دنیوی حیثیت سے ایک کامیاب آدمی ہیں۔ یہ کامیابی آپ نے اپنی محنت سے حاصل کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ سے پہلے کے زمانہ میں بھی بہت سے لوگ پیدا ہوئے اور انھوں نے دنیوی کامیابیاں حاصل کیں۔ اب آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ آپ سے پہلے پیدا ہونے کی وجہ سے ان کو زیادہ موقع ملا۔ انھوں نے بے حد سستی زمینیں خرید لیں۔ ان کو ہر قسم کا سامان بہت کم قیمت میں مل گیا۔ آجکل کی سیاست اور قانونی الجھاؤں کے وجود میں آنے سے پہلے انھوں نے اپنی زندگیاں بنا لیں۔ وغیرہ۔ مذکورہ سوال کی طرح یہاں بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک انسان کے حالات اور دوسرے انسان کے حالات میں یہ فرق کیوں۔ جب تک اس سوال کا جواب نہ ملے میں کوئی معاشی کام نہیں کروں گا۔ مگر یہاں آپ ان موشگافیوں میں نہیں پڑتے۔ بلکہ ایک عملی انسان کی طرح پہلا موقع ملتے ہی اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن جب اسلام کا اور آخرت کا معاملہ آتا ہے تو موشگافیاں کر کے سوالات پیدا کرتے ہیں اور ان کا جواب چاہتے ہیں۔ یہ تضاد بتاتا ہے کہ اس قسم کے تمام سوالات بالکل غیر فطری ہیں۔ موجودہ دنیا کا ڈھانچہ

حقائق کی بنیاد پر بنا ہے۔ یہاں کامیابی اس کے لئے ہے جو ایک عملی انسان کی طرح حقائق کی پیروی کرے۔ جو شخص موشگافیوں میں الجھے اس کے لئے یہاں بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

ایک نوجوان نے بی اے کیا۔ مگر اپنے قریب اس کو کوئی ملازمت نہیں ملی۔ اس نے طے کیا کہ وہ باہر کے کسی شہر میں جائے اور وہاں اپنے لئے روزگار تلاش کرے۔ بالآخر ایک روز صبح کو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ میں بمبئی جا رہا ہوں۔ اب میں اس وقت تک نہیں آؤں گا جب تک اپنے لئے کوئی کام حاصل نہ کر لوں۔

دادی نے کہا آج شبھ ساعت نہیں ہے۔ تم کو جانا ہی ہے تو کسی اور دن جانا۔ ماں نے کہا کہ آج کل ریلوے میں ایکسیڈنٹ کی خبریں آ رہی ہیں، آج کل اتنا لمبا سفر کرنا ٹھیک نہیں۔ باپ نے کہا کہ بمبئی میں ان دنوں برسات کا موسم چل رہا ہے اور وہاں برسات کے موسم میں کام بہت کم ہو جاتا ہے۔ چھوٹے بھائی نے کہا کہ آپ چلے جائیں گے تو محلہ کے لڑکے ہم کو ماریں گے۔ آپ کی وجہ سے وہ سب ڈرتے تھے۔ نوجوان اگر اپنے گھر والوں کی ان باتوں پر دھیان دیتا تو ان میں سے ہر بات اس کو سفر سے روکنے کے لئے کافی تھی۔ مگر اس نے ان میں سے کسی بات پر سرے سے غور ہی نہیں کیا۔ اس نے سب باتوں کو نظر انداز کرکے صرف ایک بات اپنے سامنے رکھی: مجھے بمبئی جانا ہے اور وہاں اپنے لئے روزگار حاصل کرنا ہے۔ وہ سب کو سلام کرکے تیزی سے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ اور ٹرین میں سوار ہو کر بمبئی پہنچ گیا۔ بمبئی میں اس کو اتنے سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا جو اس کے گھر والوں کے بدترین اندیشوں سے بھی کہیں زیادہ تھے۔ تاہم اس کے عزم اور اس کی جد و جہد نے مشکل آسان کر دی۔ آج وہ ایک بڑی تجارتی فرم میں اعلیٰ عہدہ پر ہے اور اپنے گھر والوں کو لے کر ایک شاندار مکان میں کامیاب زندگی گزار رہا ہے۔

یہی مثال ہر معاملہ پر صادق آتی ہے حتیٰ کہ دینی معاملات پر بھی۔ اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کو کچھ اس ڈھنگ پر بنایا ہے کہ یہاں ہر کام میں موافق امکان کے ساتھ ناموافق امکان چھپا ہوا ہے۔ ہر یقین کے ساتھ ایک شبہ کا پہلو لگا ہوا ہے۔ مزید یہ کہ انسان کی عقل تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے لئے قطعاً ناکافی ہے۔ کوئی آدمی اگر اس پر اصرار کرے کہ وہ سارے پہلوؤں کو عقل کی گرفت میں لانے کے بعد اس کی طرف اقدام کرے گا تو ایسا شخص کبھی کوئی اقدام نہیں کر سکتا۔ ہر آدمی کو لازماً یہ کرنا پڑتا ہے کہ کسی معاملہ میں جب وہ بنیادی پہلوؤں کے اعتبار سے مطمئن ہو جاتا ہے تو وہ اپنا دماغ غیر ضروری بحثوں میں نہیں الجھاتا۔ وہ بے شمار غیر حل شدہ پہلوؤں کو نظر انداز کرکے آگے بڑھ جاتا ہے۔ آدمی اگر ایسا نہ کرے تو موجودہ دنیا میں وہ کسی بھی قسم کا کوئی کام نہیں کر سکتا۔

یہی بات قرآن سے ہدایت لینے کے لئے بھی درست ہے۔ قرآن بلاشبہ ہدایت کی کتاب ہے۔ اس میں روشنی اور سکون ہے۔ مگر جو شخص قرآن کا طالب ہو اس کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ آخرت کی دنیا میں نہیں اتری ہے بلکہ ہماری موجودہ دنیا میں اتری ہے جو امتحان اور آزمائش کی دنیا ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے والا اپنی اس محدود عقل کے ساتھ اس کا مطالعہ کر رہا ہے جو موجودہ دنیا میں اس کو حاصل ہے نہ کہ اس عقل سے جو اس کو آخرت کے لامحدود عالم میں

ل ہوں۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ ہے کہ قرآن میں آدمی کو اگر ایسی باتیں ملیں جو سمجھ میں آتی ہوں تو ہی
ساتھ اس کے سامنے ایسی باتیں آئیں جو بظاہر سمجھ میں نہ آرہی ہوں۔ اگر اس کو یقین کے صفحات پڑھنے کو ملیں تو
کے ساتھ وہ ایسے صفحات بھی پڑھے جو کریدنے والے ذہن کو بےیقینی میں مبتلا کرنے والے ہوں۔ موجودہ عقل
موجودہ دنیوی حالات کی بنا پر ایسا ہونا بالکل فطری ہے۔ کیونکہ یہی تو آدمی کا امتحان ہے۔ دنیوی کامیابی اس
ن کا امتحان ہے کہ وہ کون شخص ہے جو راستہ کے "کانٹوں" کو نظر انداز کرکے آگے بڑھ جاتا ہے اور وہ کون
ص ہے جو "کانٹوں" میں الجھ کر اپنے سفر کو کھوٹا کر لیتا ہے۔ اسی طرح اخروی کامیابی بھی اس بات کا امتحان ہے
یقی عقلمند اور جھوٹے عقلمند کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ حقیقی عقلمند وہ ہے جو بے فائدہ سوالات
ں نہ الجھے اور تمام ناموافق باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے آخرت کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھے۔ اس کے برعکس
ٹا عقلمند وہ ہے جو بے فائدہ موشگافیوں کو حل کرنے میں لگا رہے، جو اس پر اصرار کرے کہ وہ مکمل عقلی اطمینان کے
قرآن کو قرآن سمجھے گا۔ ایسا آدمی کبھی قرآن کو نہیں پا سکتا —— شبہات کے باوجود یقین کا درجہ حاصل کرنا
سی آدمی کو کامیاب بناتا ہے، موجودہ دنیا میں بھی اور آخرت کی دنیا میں بھی۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ موجودہ دنیا میں التباس (انعام ۹) کا قانون جاری ہے۔ یعنی یہاں
یقتوں کو کھولنے کے باوجود ان کے اوپر شبہ کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ شبہات
ں نہ پڑے بلکہ عقل سے صحیح کام لیتے ہوئے حقائق کو اپنی روح کی غذا بنائے۔ اگر آدمی یہ اصرار کرے کہ شبہات کا
ہ اس کے لئے پھٹ جائے اور وہ "مکمل عقلی اطمینان" کے ساتھ حقیقتوں کو پا سکے تو ایسا مکمل عقلی اطمینان
ں کبھی ممکن نہ ہوگا۔ اس قسم کا عقلی اطمینان تلاش کرنے والے کے لئے اس دنیا میں بھٹکنے اور برباد ہونے کے
کوئی دوسرا انجام نہیں۔ ایسے مزاج کے تحت یہاں نہ کوئی لادینی کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے اور نہ کوئی
نی کامیابی۔ جو چیز خدا نے اپنی دنیا میں نہ بنائی ہو وہ آپ اس کی دنیا میں حاصل نہیں کر سکتے۔ آپ
رت کے نظام سے صرف مطابقت کر سکتے ہیں، اس کے خلاف اپنی راہ نہیں بنا سکتے۔

ایک طالب علم امتحان ہال میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے سامنے امتحان کا پرچہ آتا ہے۔ پرچہ میں ایک مسئلہ مبہم شکل میں
ج ہے۔ وہ اس طرح واضح صورت میں درج نہیں جیسا کہ ایک باقاعدہ کتاب میں ہوتا ہے۔ اب اگر وہ مطالبہ کرے
امتحان کا پرچہ مبہم شکل میں لینا مجھے منظور نہیں۔ میں تو اس کو اس وقت لوں گا جب کہ وہ مجھے کتاب کی سی واضح صورت
ملے تو ایسا مطالبہ کبھی منظور نہیں کیا جائے گا۔ قرآن کی مثال بھی جزئی طور پر اسی قسم کی ہے۔ قرآن بلاشبہ کتاب
ایت ہے مگر اسی کے ساتھ وہ ہمارے امتحان کا پرچہ بھی ہے۔ ہمیں قرآن سے رہنمائی بھی حاصل کرنا ہے اور اسی
ے ساتھ یہ ثبوت بھی دینا ہے کہ ہم غیب کا پردہ باقی رہتے ہوئے خدا کو پا سکتے ہیں۔ شبہات کا غبار رہتے ہوئے بھی
قین کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں۔ حقیقت سے دور ہوتے ہوئے بھی اس سے قربت کا تجربہ کر سکتے ہیں۔ یہی تو
دمی کا امتحان ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو امتحان کس بات کا ہوگا۔

موت جب آتی ہے

جے۔ اے۔ ڈیو ۱۹۲۳ء میں شملہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے نہایت محنت سے تعلیم حاصل کی۔ بالآخر انھوں نے آئی۔ اے۔ ایس کا امتحان پاس کیا۔ وہ مزید تعلیم کے لئے برطانیہ بھی گئے۔ اس کے بعد ان کو حکومت میں اچھی ملازمت مل گئی۔ جولائی ۱۹۷۹ میں وہ اپنی اعلیٰ ترین ترقی کے منصب پر پہنچ گئے جب کہ ان کو ڈیفنس سکریٹری کے عہدہ پر مقرر کیا گیا۔ مگر اس ترقی پر ان کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ ۱۰ اپریل ۱۹۸۰ کو ۵۷ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ۱۱ اپریل کو مسٹر ڈیو کا جسم نگم بودھ گھاٹ پر اس وقت جلا دیا گیا جب کہ ہندستانی فوج کے تینوں سپہ سالار ان کے اظہار عقیدت کے لئے گھاٹ پر موجود تھے۔ بری اور بحری اور ہوائی فوجوں کے اعلیٰ ترین افسران جو ساٹھ کروڑ انسانوں کے اس ملک پر کسی بھی حملہ کو پسپا کرنے کی پوری طاقت رکھتے تھے وہ اپنے حاکم اعلیٰ کو موت کے حملہ کا شکار ہونے سے بچانے کے لئے بے بس ہو گئے۔

اس سے بھی زیادہ عبرت ناک مثال وہ ہے جو سنجے گاندھی کے ساتھ پیش آئی ہے۔

۱۹۸۰ میں مرکزی پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات میں اندرا گاندھی اور ان کے بیٹے سنجے گاندھی کی پارٹی کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد عام طور پر سمجھا جانے لگا کہ اب سنجے گاندھی ہندوستان کے وزیر اعظم ہوں گے۔ مگر وزارت عظمیٰ کی عین چوکھٹ پر پہنچ کر اچانک ۳۳ سال کی عمر میں ان کا خاتمہ ہو گیا۔ ۲۳ جون ۱۹۸۰ کی صبح کو سنجے گاندھی ایک نئے امریکی ہوائی جہاز میں تفریحی سواری (Joy Ride) کے لئے نکلے۔ ان کا دو سیٹوں کا جہاز صفدر جنگ کے ہوائی اڈے سے اڑ کر ابھی فضا میں پہنچا ہی تھا کہ اچانک اس کے انجن نے کام کرنا بند کر دیا اور دھماکہ کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔ جہاز کے ملبہ سے اس کے دونوں مسافر (سنجے گاندھی اور کیپٹن سکسینا) مردہ اور کچلی ہوئی حالت میں باہر نکالے گئے۔ سنجے گاندھی کو اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا کہ حادثہ سے صرف ایک دن پہلے دہلی کے لفٹننٹ گورنر مسٹر جگ موہن کے ساتھ کار پر سفر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ کار ہو یا ہوائی جہاز، ڈیل پر اگر میں ہوں تو کچھ بھی نہیں ہوگا"۔ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ اگلے دن آنے والی صبح صرف اس لئے آرہی ہے کہ ان کے اس اعتماد کی ہمیشہ کے لئے تردید کر دے۔

اس واقعہ میں بڑی عبرت ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۴ جون ۱۹۸۰) نے اس سلسلے میں جو اداریہ شائع کیا ہے اس میں اولاً ان شاندار امکانات کا ذکر کیا ہے جن کے بالکل کنارے سنجے گاندھی پہنچ چکے تھے۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے: قسمت کی کیسی ستم ظریفی ہے کہ اس کے بعد وہ اتنی جلد مر جائیں:

What an irony that he should die so soon afterwards.

آدمی دنیا میں جن کامیابیوں کے لئے اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے ان کے بے حقیقت ہونے کا یہی ایک کافی ثبوت ہے۔ عین اس وقت جب کہ وہ اپنی ترقی کے عروج پر پہنچ چکا ہوتا ہے، موت اس کے اور اس کی کامیابیوں

کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ گویا کہ وہ اس کامیابی کی نفی کر رہی ہے جس کو آدمی اپنے لئے کامیابی سمجھ کر اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

آدمی زندگی چاہتا ہے مگر بہت جلد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں صرف موت ہے جو اس کا استقبال کرنے کے لئے کھڑی ہوئی ہے۔ ۲۴ جون کی شام کو ایک طرف شانتی ون میں سنجے گاندھی کا مردہ جسم جلایا جا رہا تھا، دوسری طرف وہاں کھڑے ہوئے ان کے ہزاروں معتقدین یہ نعرہ لگا رہے تھے :

جب تک سورج چاند رہے، سنجے تیرا نام رہے۔

انسان "سورج چاند کے رہنے تک" زندہ رہنا چاہتا ہے مگر موت اس قدر بے رحمی کے ساتھ اس کو اس دنیا سے اٹھا لیتی ہے جیسے اس کے نزدیک نہ انسان کی کوئی اہمیت ہے اور نہ اس کی خواہشوں کی۔

انسان اپنی عظمت کا قلعہ تعمیر کرتا ہے مگر موت کا طوفان اس کو تنکوں کی طرح اڑا کر یہ سبق دیتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں کوئی قدرت حاصل نہیں۔ انسان کہتا ہے کہ میں اپنا مالک ہوں مگر تقدیر اس کو کھول کر بتاتی ہے کہ تیرا مالک کوئی اور ہے۔ انسان موجودہ دنیا میں اپنی آرزوؤں کا باغ اگانا چاہتا ہے مگر موت اس کے منصوبہ کو مٹا کر یہ سبق دیتی ہے کہ اپنے لئے دوسری دنیا تلاش کرو کیونکہ موجودہ دنیا میں تمھاری آرزوؤں کی تکمیل ممکن نہیں۔

زندگی کا سب سے بڑا سبق وہ ہے جو موت کے ذریعہ ملتا ہے۔ موت ہماری زندگی کی سب سے بڑی معلم ہے۔ موت ہر آدمی کو ایک ایسے سوال کے بارہ میں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے جس کے جواب میں زندگی کا تمام راز چھپا ہوا ہے۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ ہم اپنے مالک آپ نہیں ہیں۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا میں ہماری زندگی محض عارضی زندگی ہے۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا وہ مقام نہیں جہاں ہم اپنی تمناؤں کو حاصل کرنے کی امید کر سکیں۔ موت دراصل زندگی کا پیغام ہے۔ موت ہم کو جینا سکھاتی ہے۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ اپنی حقیقی زندگی کی تعمیر کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

موت انسانی زندگی کا سب سے زیادہ عبرت ناک واقعہ ہے۔ وہ آدمی کو آسمان میں اٹھا کر زمین پر گرا دیتی ہے۔ وہ آدمی کو زمین پر ختم کر کے اس کی راکھ کو ہوا میں اڑا دیتی ہے۔ موت کے سامنے ہر آدمی بالکل بے بس ہے، موت کے سامنے کسی بھی شخص کی کوئی قیمت نہیں۔ یہ واقعہ ہماری زمین پر روزانہ لاکھوں کی تعداد میں پیش آتا ہے۔ مگر انسان غفلت کی ایسی شراب پئے ہوئے ہے کہ اس کے باوجود اس کی مدہوشی ختم نہیں ہوتی۔ آدمی دوسرے کو مٹانے کا منصوبہ بناتا ہے حالاں کہ موت خود اس کو مٹانے کے لئے اس کے پیچھے کھڑی ہوئی ہے۔ آدمی دوسرے کو برباد کرنے کی سازشیں کرتا ہے حالاں کہ اپنی سازش کی تکمیل سے پہلے وہ خود موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ آدمی دوسرے کا اعتراف نہیں کرتا، وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ اپنی بڑائی کا تحفظ کر رہا ہے۔ حالاں کہ اگلے ہی لمحہ موت آکر اس کی بڑائی کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ انسان "خدا" بننا چاہتا ہے مگر موت اس کو بتاتی ہے کہ وہ صرف ایک بے قیمت "آدمی" ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

موت جب آتی ہے

جے۔ اے۔ ڈیو ۱۹۲۳ء میں شملہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے نہایت محنت سے تعلیم حاصل کی۔ بالآخر انھوں نے آئی۔ اے۔ ایس کا امتحان پاس کیا۔ وہ مزید تعلیم کے لئے برطانیہ بھی گئے۔ اس کے بعد ان کو حکومت میں اچھی ملازمت مل گئی۔ جولائی ۱۹۷۹ میں وہ اپنی اعلیٰ ترین ترقی کے منصب پر پہنچ گئے جب کہ ان کو ڈفینس سکریٹری کے عہدہ پر مقرر کیا گیا۔ مگر اس ترقی پر ان کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ ۱۰ اپریل ۱۹۸۰ کو ۵۷ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ۱۱ اپریل کو مسٹر ڈیو کا جسم نگم بودھ گھاٹ پر اس وقت جلا دیا گیا جب کہ ہندستانی فوج کے تینوں سپہ سالار ان کے اظہار عقیدت کے لئے گھاٹ پر موجود تھے۔ بری اور بحری اور ہوائی فوجوں کے اعلیٰ ترین افسران جو ساٹھ کروڑ انسانوں کے اس ملک پر کسی بھی حملہ کو پسپا کرنے کی پوری طاقت رکھتے تھے وہ اپنے حاکم اعلیٰ کو موت کے حملہ کا شکار ہونے سے بچانے کے لئے بے بس ہو گئے۔

اس سے بھی زیادہ عبرت ناک مثال وہ ہے جو سنجے گاندھی کے ساتھ پیش آئی ہے۔

۱۹۸۰ میں مرکزی پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات میں اندرا گاندھی اور ان کے بیٹے سنجے گاندھی کی پارٹی کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد عام طور پر سمجھا جانے لگا کہ اب سنجے گاندھی ہندستان کے وزیر اعظم ہوں گے۔ مگر وزارت عظمیٰ کی عین چوکھٹ پر پہنچ کر اچانک ۳۳ سال کی عمر میں ان کا خاتمہ ہو گیا۔ ۲۳ جون ۱۹۸۰ کی صبح کو سنجے گاندھی ایک نئے امریکی ہوائی جہاز میں تفریحی سواری (Joy Ride) کے لئے نکلے۔ ان کا دو سیٹوں کا جہاز صفدر جنگ کے ہوائی اڈے سے اڑ کر ابھی فضا میں پہنچا ہی تھا کہ اچانک اس کے انجن نے کام کرنا بند کر دیا اور دھماکہ کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔ جہاز کے ملبہ سے اس کے دونوں مسافر (سنجے گاندھی اور کیپٹن سکسینا) مردہ اور کچلی ہوئی حالت میں باہر نکالے گئے۔ سنجے گاندھی کو اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا کہ حادثہ سے صرف ایک دن پہلے دہلی کے لفٹننٹ گورنر مسٹر جگ موہن کے ساتھ کار پر سفر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ کار ہو یا ہوائی جہاز، ڈھیل پر اگر میں ہوں تو کچھ بھی نہیں ہوگا"۔ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ اگلے دن آنے والی صبح صرف اس لئے آ رہی ہے کہ ان کے اس اعتماد کی ہمیشہ کے لئے تردید کر دے۔

اس واقعہ میں بڑی عبرت ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۴ جون ۱۹۸۰) نے اس سلسلے میں جو اداریہ شائع کیا ہے اس میں اولاً ان شان دار امکانات کا ذکر کیا ہے جن کے بالکل کنارے سنجے گاندھی پہنچ چکے تھے۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے: قسمت کی کیسی ستم ظریفی ہے کہ اس کے بعد وہ اتنی جلد مر جائیں:

What an irony that he should die so soon afterwards.

آدمی دنیا میں جن کامیابیوں کے لئے اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے ان کے بے حقیقت ہونے کا یہی ایک کافی ثبوت ہے۔ عین اس وقت جب کہ وہ اپنی ترقی کے عروج پر پہنچ چکا ہوتا ہے، موت اس کے اور اس کی کامیابیوں

کے درمیان حائل ہوجاتی ہے، گویا کہ وہ اس کامیابی کی نفی کررہی ہو جس کو آدمی اپنے لئے کامیابی سمجھ کر اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

آدمی زندگی چاہتا ہے مگر بہت جلد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں صرف موت ہے جو اس کا استقبال کرنے کے لئے کھڑی ہوئی ہے۔ ۲۴ جون کی شام کو ایک طرف شانتی ون میں سنجے گاندھی کا مردہ جسم جلایا جارہا تھا، دوسری طرف وہاں کھڑے ہوئے ان کے ہزاروں معتقدین یہ نعرہ لگا رہے تھے:

جب تک سورج چاند رہے، سنجے تیرا نام رہے۔

انسان "سورج چاند کے رہنے تک" زندہ رہنا چاہتا ہے مگر موت اس قدر بے رحمی کے ساتھ اس کو اس دنیا سے اٹھا لیتی ہے جیسے اس کے نزدیک نہ انسان کی کوئی اہمیت ہے اور نہ اس کی خواہشوں کی۔

انسان اپنی عظمت کا قلعہ تعمیر کرتا ہے مگر موت کا طوفان اس کو تنکوں کی طرح اڑا کر یہ سبق دیتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں کوئی قدرت حاصل نہیں۔ انسان کہتا ہے کہ میں اپنا مالک ہوں مگر تقدیر اس کو کچل کر بتاتی ہے کہ تیرا مالک کوئی اور ہے۔ انسان موجودہ دنیا میں اپنی آرزوؤں کا باغ اگانا چاہتا ہے مگر موت اس کے منصوبہ کو مٹا کر یہ سبق دیتی ہے کہ اپنے لئے دوسری دنیا تلاش کرو کیونکہ موجودہ دنیا میں تمھاری آرزوؤں کی تکمیل ممکن نہیں۔

زندگی کا سب سے بڑا سبق وہ ہے جو موت کے ذریعہ ملتا ہے۔ موت ہماری زندگی کی سب سے بڑی معلم ہے۔ موت ہر آدمی کو ایک ایسے سوال کے بارہ میں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے جس کے جواب میں زندگی کا تمام راز چھپا ہوا ہے۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ ہم اپنے مالک آپ نہیں ہیں۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا میں ہماری زندگی محض عارضی زندگی ہے۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا وہ مقام نہیں جہاں ہم اپنی تمناؤں کو حاصل کرنے کی امید کرسکیں۔ موت دراصل زندگی کا پیغام ہے۔ موت ہم کو جینا سکھاتی ہے۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ اپنی حقیقی زندگی کی تعمیر کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

موت انسانی زندگی کا سب سے زیادہ عبرت ناک واقعہ ہے۔ وہ آدمی کو آسمان میں اٹھا کر زمین پر گرا دیتی ہے۔ وہ آدمی کو زمین پر ختم کرکے اس کی راکھ کو ہوا میں اڑا دیتی ہے۔ موت کے سامنے ہر آدمی بالکل بے بس ہے۔ موت کے سامنے کسی بھی شخص کی کوئی قیمت نہیں۔ یہ واقعہ ہماری زمین پر روزانہ لاکھوں کی تعداد میں پیش آتا ہے۔ مگر انسان غفلت کی ایسی شراب پئے ہوئے ہے کہ اس کے باوجود اس کی مدہوشی ختم نہیں ہوتی۔ آدمی دوسرے کو مٹانے کا منصوبہ بناتا ہے حالاں کہ موت خود اس کو مٹانے کے لئے اس کے پیچھے کھڑی ہوئی ہے۔ آدمی دوسرے کو برباد کرنے کی سازشیں کرتا ہے حالاں کہ اپنی سازش کی تکمیل سے پہلے وہ خود موت کا شکار ہوجاتا ہے۔ آدمی دوسرے کا اعتراف نہیں کرتا، وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ اپنی بڑائی کا تحفظ کر رہا ہے۔ حالاں کہ اگلے ہی لمحہ موت آکر اس کی بڑائی کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ انسان "خدا" بننا چاہتا ہے مگر موت اس کو بتاتی ہے کہ وہ صرف ایک بے قیمت "آدمی" ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

اور ہم نے تمھاری طرف کتاب اتاری حق کے ساتھ، تصدیق کرنے والی پچھلی کتاب کی اور اس کے مضامین پر نگہبان۔ پس تم ان کے درمیان فیصلہ کرو اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا۔ اور جو حق تمھارے پاس آیا ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک طریقہ ٹھہرایا۔ اور اگر خدا چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ مگر اللہ نے چاہا کہ وہ اپنے دئے ہوئے حکموں میں تمھاری آزمائش کرے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف دوڑو۔ آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ پھر وہ تم کو آگاہ کر دے گا اس چیز سے جس میں تم اختلاف کر رہے تھے ۴۸

یہاں "کتاب" سے مراد دین کی اصلی اور اساسی تعلیمات ہیں۔ اللہ کی یہ کتاب ایک ہی کتاب ہے اور وہی ایک کتاب، زبان اور ترتیب کے فرق کے ساتھ، تمام نبیوں کی طرف اتاری گئی ہے۔ تاہم دین کی حقیقت جس ظاہری ڈھانچہ میں متشکل ہوتی ہے اس میں مختلف انبیاء کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ نہیں کہ دین کے اتارنے میں کوئی ارتقائی ترتیب ہے۔ یعنی پہلے کم ترقی یافتہ اور غیر کامل دین اتارا گیا اور اس کے بعد زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ کامل دین اترا۔ اس فرق کی وجہ خدا کی حکمت ابتلاء ہے نہ کہ حکمت ارتقاء۔ قرآن کے مطابق ایسا صرف اس لئے ہوا کہ لوگوں کو آزمایا جائے۔ زمانہ گزرنے کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ دین کی اندرونی حقیقت گم ہو جاتی ہے اور ظواہر و رسوم مقدس ہو کر اصل بن جاتے ہیں۔ لوگ عبادت اس کو سمجھ لیتے ہیں کہ ایک خاص ڈھانچہ کو ظاہری شرائط کے ساتھ دہرا لیا جائے۔ اس لئے ظاہری ڈھانچہ میں بار بار تبدیلیاں کی گئیں تاکہ ڈھانچہ کی مقصودیت کا ذہن ختم ہو اور خدا کے سوا کوئی اور چیز توجہ کا مرکز نہ بننے پائے۔ اس کی ایک مثال قبلہ کی تبدیلی ہے۔ بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے عبادت کریں۔ یہ حکم صرف رخ بندی کے لئے تھا۔ مگر دھیرے دھیرے ان کا ذہن یہ بن گیا کہ بیت المقدس کی طرف رخ کرنے ہی کا نام عبادت ہے۔ اس وقت سابقہ حکم کو بدل کر کعبہ کو قبلہ بنا دیا گیا۔ اب کچھ لوگ سابقہ روایت سے لپٹے رہے اور کچھ لوگوں نے خدا کی ہدایت کو پا لیا۔ اس طرح تبدیلی قبلہ سے یہ کھل گیا کہ کون در و دیوار کو پوجنے والا تھا اور کون خدا کو پوجنے والا (بقرہ ۱۴۳)

اب اس قسم کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔ کیونکہ ڈھانچہ کو نبی بدلتا ہے اور نبی اب آنے والا نہیں۔ تاہم جہاں تک اصل مقصود کا تعلق ہے وہ بدستور باقی ہے۔ اب بھی خدا کے یہاں اس کا سچا پرستار وہی شمار ہوگا جو ظاہری ڈھانچہ کی پابندی کے باوجود ظاہری ڈھانچہ کو مقصودیت کا درجہ نہ دے، جو ظواہر سے ذہن کو آزاد کر کے خدا کی عبادت کرے۔ پہلے یہ مقصد ظاہری ڈھانچہ کو توڑ کر حاصل ہوتا تھا اب اس کو ذہنی شکست و ریخت کے ذریعہ حاصل کرنا ہوگا۔

ظواہر کے نام پہ دین میں جو جھگڑے ہیں وہ صرف اس لئے ہیں کہ لوگوں کی غفلت نے ان کو اصل حقیقت سے بے خبر کر دیا ہے۔ اگر حقیقت کو وہ اس طرح پالیں جس طرح وہ آخرت میں دکھائی دے گی تو تمام جھگڑے ابھی ختم ہو جائیں۔

اور ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے اتارا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو اور ان لوگوں سے بچو کہ کہیں وہ تم کو پھسلا دیں تمہارے اوپر اللہ کے اتارے ہوئے کسی حکم سے۔ پس اگر وہ پھر جائیں تو جان لو کہ اللہ ان کو ان کے بعض گناہوں کی سزا دینا چاہتا ہے۔ اور یقیناً لوگوں میں سے زیادہ آدمی نافرمان ہیں۔ کیا یہ لوگ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ اور اللہ سے بڑھ کر کس کا فیصلہ ہو سکتا ہے ان لوگوں کے لئے جو یقین کرنا چاہیں ۵۰ - ۴۹

قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفے الگ الگ کتابیں نہیں ہیں۔ یہ سب ایک ہی کتاب الٰہی کے مختلف ایڈیشن ہیں جس کو یہاں "الکتاب" کہا گیا ہے۔ خدا کی طرف سے جتنی کتابیں آئیں، خواہ وہ جس دور میں اور جس زبان میں آئی ہوں، سب کا مشترک مضمون ایک ہی تھا۔ تاہم پچھلی کتابوں کے حاملین بعد کے زمانہ میں ان کو ان کی اصلی صورت میں محفوظ نہ رکھ سکے۔ اس لئے خدا نے ایک کتاب مہیمن (قرآن) اتارا۔ یہ خدا کی طرف سے اس کی کتاب کا مستند ایڈیشن ہے اور اس بنا پر وہ ایک کسوٹی ہے جس پر جانچ کر معلوم کیا جائے کہ بقیہ کتابوں کا کون سا حصہ اصلی حالت میں ہے اور کون سا وہ ہے جو بدلا جا چکا ہے۔

یہود خدا کے سچے دین کے ساتھ اپنی باتوں کو ملا کر ایک خود ساختہ دین بنائے ہوئے تھے۔ اس خود ساختہ دین سے ان کی عقیدتیں بھی وابستہ تھیں اور ان کے مفادات بھی۔ اس لئے وہ کسی طرح تیار نہ تھے کہ اس کو چھوڑ کر پیغمبر کے لائے ہوئے بے آمیز دین کو مان لیں۔ انھوں نے حق کے آگے جھکنے کے بجائے اپنے لئے یہ طریقہ پسند کیا کہ وہ حق کے علم بردار کو اتنا زیادہ پریشان کریں کہ وہ خود ان کے آگے جھک جائے، وہ خدا کے سچے دین کو چھوڑ کر ان کے اپنے بنائے ہوئے دین کو اختیار کر لے۔ خدا اگر چاہتا تو پہلے ہی مرحلہ میں ان ظالموں کا ہاتھ روک دیتا اور وہ حق کے داعی کو ستانے میں کامیاب نہ ہوتے۔ مگر اللہ نے انھیں چھوٹ دی کہ وہ اپنے ناپاک منصوبوں کو بروئے کار لا سکیں۔ ایسا اس لئے ہوا تاکہ یہ بات پوری طرح کھل جائے کہ دین داری کے یہ دعوے دار سب سے زیادہ بے دین لوگ ہیں۔ وہ خدا کے پرستار نہیں ہیں بلکہ خود اپنی ذات کے پرستار ہیں۔ اللہ کی یہ سنت اگر چہ حق کے داعیوں کے لئے بڑا سخت امتحان ہے۔ مگر یہی وہ عمل ہے جس کے ذریعہ یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ کون جنت کا مستحق ہے اور کون جہنم کا۔

انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ اپنی خواہشوں کے پیچھے چلنا چاہتا ہے، اللہ کے حکم کا پابند بن کر رہنا اس کو گوارا نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ دین خداوندی کی خود ساختہ تشریح کر کے وہ اس کو بھی اپنی خواہشوں کے سانچہ میں ڈھال لیتا ہے۔ ایسی حالت میں بے آمیز دین کو وہی لوگ قبول کریں گے جو چیزوں کو خواہش کی سطح پر نہ دیکھتے ہوں بلکہ اس سے اوپر اٹھ کر اپنی رائے قائم کرتے ہوں۔ اللہ کی بات بلاشبہ صحیح ترین بات ہے۔ مگر موجودہ آزمائشی دنیا میں ہر سچائی پر ایک شبہ کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ اس پردہ کو پھاڑ کر اس پر یقین کرے، وہ غیب کو شہود میں دیکھ لے۔ جو شخص ظاہری شبہات میں اٹک جائے وہ ناکام ہو گیا اور جو شخص ظاہری شبہات کے غبار کو پار کر کے سچائی کو پالے وہ کامیاب رہا۔

اے ایمان والو، یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور تم میں سے جو شخص ان کو اپنا دوست بنائے گا تو وہ ان ہی میں سے ہوگا۔ اللہ ظالم لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔ تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں روگ ہے وہ ان ہی کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ تو ممکن ہے کہ اللہ فتح دیدے یا اپنی طرف سے کوئی خاص بات ظاہر کرے تو یہ لوگ اس چیز پر جس کو یہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں نادم ہوں گے۔ اور اس وقت اہل ایمان کہیں گے کیا یہ وہی لوگ ہیں جو زور شور سے اللہ کی قسمیں کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ ان کے سارے اعمال ضائع ہوگئے اور وہ گھاٹے میں رہے ۵۳ - ۵۱

عرب میں مسلمان ابھی ایک نئی طاقت کی حیثیت رکھتے تھے۔ مزید یہ کہ ان کے مخالفین ان کو اکھاڑنے کی کوشش میں رات دن لگے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ملک کے یہودی اور عیسائی قبائل کا یہ حال تھا کہ ملک کے بیشتر اقتصادی وسائل پر ان کا قبضہ تھا۔ صدیوں کی تاریخ نے ان کی عظمت لوگوں کے دلوں پر بٹھا رکھی تھی۔ لوگوں کو یقین نہیں تھا کہ ایسی طاقت کو ملک سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی جماعت میں جو کمزور لوگ تھے وہ چاہتے تھے کہ م کی جدوجہد میں اس طرح شریک نہ ہوں کہ یہود و نصاریٰ کو اپنا دشمن بنا لیں۔ تاکہ یہ کشمکش اگر مسلمانوں کی ست پر ختم ہو تو یہود و نصاریٰ کی طرف سے انھیں کسی انتقامی کارروائی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہ لوگ مستقبل کے ہوم خطرہ سے بچنے کے لیے اپنے کو وقت کے یقینی خطرہ میں مبتلا کر رہے تھے، اور وہ ان کی دہری وفاداری تھی۔ جو شخص بے ضرر معاملات میں حق پرست بنے اور ضرر کا اندیشہ ہو تو باطل پرستوں کا ساتھ دینے لگے، اس کا انجام خدا کے یہاں انھیں لوگوں میں ہوگا جن کا اس نے خطرہ کے مواقع پر ساتھ دیا۔

کسی کی زندگی میں وہ وقت بڑا نازک ہوتا ہے جب کہ اسلام پر قائم رہنے کے لیے اس کو کسی قسم کی قربانی دینی پڑے۔ ایسے مواقع آدمی کے اسلام کی تصدیق یا تردید کرنے کے لیے آتے ہیں۔ خدا چاہتا ہے کہ آدمی جس اسلام کا ثبوت بے خطر حالات میں دے رہا تھا اسی اسلام کا ثبوت وہ اس وقت بھی دے جب کہ جذبات کو دبا کر یا جان و مال کا خطرہ مول لے کر آدمی اپنے اسلام کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ اس امتحان میں پورا اترنے کے بعد ہی آدمی اس قابل بنتا ہے کہ اس کا خدا اس کو اپنے وفادار بندوں میں لکھ لے۔ ان مواقع پر اسلامیت کا ثبوت دینا ہی کسی آدمی کے پچھلے اعمال کو باقیمت بناتا ہے۔ اور اگر وہ ایسے مواقع پر اسلامیت کا ثبوت نہ دے سکے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے پنے پچھلے تمام اعمال کو بے قیمت کر لیا۔

دنیا کا ہر امتحان ارادہ کا امتحان ہے۔ آدمی کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ خطرات کو نظر انداز کر کے ارادہ کا ثبوت دے دے، وہ اللہ کی طرف اپنا پہلا قدم اٹھا دے۔ اس کے بعد فوراً خدا کی مدد اس کا سہارا بن جاتی ہے۔ مگر جو شخص ارادہ کا ثبوت نہ دے، جو خدا کی طرف اپنا پہلا قدم نہ اٹھائے وہ اللہ کی نظر میں ظالم ہے۔ ایسے لوگوں کو خدا یک طرفہ طور پر اپنی مدد کا سہارا نہیں بھیجتا۔

روزہ کس کے لئے

سورہ بقرہ رکوع ۲۳ میں رمضان کے روزوں کا بیان ہے۔ روزہ کے احکام بتاتے ہوئے درمیان میں ارشاد ہوا ہے: اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو میں نزدیک ہوں۔ پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ پس چاہئے کہ وہ میری پکار کا جواب دیں اور مجھ پر ایمان رکھیں۔ امید ہے کہ وہ بھلائی کو پالیں گے (بقرہ ۱۸۶) گویا خدا سے پانے کے لئے بندہ کو بھی خدا کو کچھ دینا ہے۔ روزہ اسی "دینے" کے عمل کی ایک علامت ہے۔ روزہ میں آدمی خدا کی خاطر اپنا کھانا پانی چھوڑ دیتا ہے جو آدمی کی آخری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ یہ اس بات کا ایک سبق ہے کہ دنیا کی زندگی میں آدمی کو جو کچھ اپنے رب کے سامنے پیش کرنا ہے اس کا سلسلہ ناگزیر ضروریات تک پہنچتا ہے۔ روزہ یہ پیغام دیتا ہے کہ آدمی خود "بھوکا" رہ کر اپنی متاع کو خدا کے حضور نذر کر دے۔

روزہ عمل کا خاتمہ نہیں بلکہ عمل کا آغاز ہے۔ روزہ دار کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ اللہ کے لئے وقف کر دے۔ اس کو اپنے بیوی بچوں کی امنگوں میں کمی کر کے دین کے تقاضے پورے کرنا ہیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کو اپنی زندگی یہاں تک مختصر کرنی پڑے کہ بہت سی ضروری چیزوں سے اس کے لئے "فاقہ" کرنے کی نوبت آجائے۔ اگر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کو وہ سب کچھ ملے جو خدا کے پاس ہے تو اس کو بھی وہ سب کچھ دینا پڑے گا جو اس کے پاس ہے۔ "سب کچھ" دے کر ہی سب کچھ ملتا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

جس طرح رمضان کے مہینہ میں خدا روزہ کے لئے پکارتا ہے اسی طرح سال بھر اس کی پکار بلند ہوتی رہتی ہے۔ آدمی کے سامنے ناجائز کمائی کی صورتیں آتی ہیں، اس وقت خدا پکارتا ہے کہ اے میرے بندے ناجائز کمائی کو چھوڑ کر جائز کمائی پر قناعت کر۔ کسی بھائی کے خلاف اس کے اندر غصہ کی آگ بھڑکتی ہے، اس وقت خدا پکارتا ہے کہ میرے بندے تو اس کو معاف کر دے۔ حق کو ماننے میں مفاد یا عزت نفس کا سوال رکاوٹ بنتا ہے، اس وقت خدا پکارتا ہے کہ میرے بندے تو کسی مصلحت کی پروا کئے بغیر حق کو مان لے۔ اسی طرح زندگی کے ہر موقع پر خدا اپنے بندوں کو پکارتا ہے۔ اب جو شخص ان مواقع پر وہی کرے جو اس کا خدا اس سے چاہتا ہے تو اس نے خدا کی پکار پر لبیک کہا۔ اسی کو قرآن میں تقویٰ کہا گیا ہے (بقرہ۔ ۱۸۳)

روزہ کا عمل اللہ کو بڑا بنانے (بقرہ ۱۸۵) کی ایک علامت ہے۔ اللہ کے حکم سے آدمی اپنے ایک ایسے تقاضے پر پابندی لگا لیتا ہے جو اس کی زندگی کا سب سے زیادہ ضروری تقاضا ہے۔ یہ عمل کی زبان میں اس بات کا عہد ہے کہ آدمی اللہ کو اپنا "کبیر" اور اپنے آپ کو اس کے مقابلہ میں "صغیر" بنائے گا۔

یہی تکبیر ہے جو زبان سے اللہ اکبر کی صورت میں نکلتی ہے اور عمل سے اپنی انا کو ختم کر دینے کی صورت میں۔ آدمی کی پوری زندگی اس بات کا امتحان ہے کہ وہ کس کو بڑا بناتا ہے، خدا کو یا اپنے آپ کو۔ اپنے کو بڑا بنانے والے کے اندر گھمنڈ کی نفسیات پرورش پاتی ہیں اور خدا کو بڑا بنانے والے کے اندر تواضع کی نفسیات۔ جو شخص خدا کو اپنا بڑا بنائے اس کے اندر سے انانیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی پوری ہستی خدا کے آگے جھک جاتی ہے۔ خدا کی عظمت کا تصور اس کے اوپر اتنا چھا جاتا ہے کہ اپنی ہستی اس کو بالکل بے قیمت دکھائی دینے لگتی ہے۔ ایسے شخص سے جب کسی کا معاملہ پڑتا ہے تو وہ "عبد" کی طرح اس سے معاملہ کرتا ہے نہ کہ "معبود" کی طرح۔ وہ خدا کے بندوں کے مقابلہ میں سرکشی نہیں دکھاتا۔ وہ بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے گھمنڈ کا مظاہرہ نہیں کرتا، اس کو دولت یا عہدہ یا حیثیت کا کوئی حصہ مل جائے تو وہ اپنے کو دوسروں سے بڑا نہیں سمجھتا۔ اللہ کو اپنا بڑا بنانا اللہ کے سامنے ذکر اور عبادت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور بندوں کے سامنے تواضع اور بے نفسی کی صورت میں۔

روزہ ایک ایسا تجربہ ہے جو بالآخر "افطار" تک پہنچتا ہے۔ بھوک کا لمبا وقفہ گزار کر آدمی اپنے آپ کو کھانے اور پانی سے سیراب کرتا ہے۔ اس طرح وہ خدا کی نعمتوں کے بارے میں اپنے اندر شکر کے احساس (بقرہ ۱۸۵) کو جگاتا ہے۔ وہ عمل کی زبان میں اپنے آپ کو بتاتا ہے کہ خدا کی وہ عنایات کتنی بڑی ہیں جو روزانہ اس کو خدا کی طرف سے ملتی رہتی ہیں۔ روزہ کے مہینہ میں قرآن کا اتارنا اس بات کا ایک اشارہ ہے کہ قرآن بھی تمھارے لئے ایک خدائی افطار کا انتظام ہے۔ تم ہدایت کے معاملہ میں بھوکے تھے۔ خدا نے اپنی نعمت ہدایت سے تم کو سیراب کیا۔

اللہ نے انسان کو پیدا کیا۔ اس کو بہترین صلاحیتیں عطا کیں۔ دنیا میں اعلیٰ ترین انتظام کرکے یہاں اس کو بسایا۔ اس کے لئے ایک ابدی جنت بنائی اور اپنی کتاب کے ذریعے پیشگی بتا دیا کہ اس جنت تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے۔ جس خدا کے اتنے احسانات ہوں اس کے ساتھ آدمی کا تعلق ایسا ہونا چاہئے کہ اس کا تصور اس کی روح کو سرشار کر دے۔ اس کی یاد آتے ہی قلب و دماغ شکر کے سجدہ میں گر پڑیں۔ زبان پر اس کی احسان مندی کے نغمے جاری ہوں۔ اس کی اندرونی ہستی اس کے احسانات کے اعتراف سے بھر جائے۔ اس کی عملی زندگی ایسی گزرے گویا کہ وہ خدا کے انعام و احسان کی بارش میں نہائی ہوئی ہے۔

تقویٰ اور تکبیر اور تشکر کا یہ ثبوت جو بندے کو دینا ہے وہ بہت بڑی قیمت مانگتا ہے، وہ اپنے نفس اور مفادات کی قربانی ہے۔ اس پر آدمی اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب کہ اس کا ایمان اس کے لئے حقیقی معنوں میں یقین و اعتماد کے ہم معنی بن گیا ہو۔

عقلیت کا فریب

"میں ایک سوال میں الجھ گیا ہوں" ایک صاحب نے کہا "آپ اس کو حل کیجئے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ اسلام کی صداقت کے بارے میں میرا یقین ختم نہ ہو جائے" ان کا سوال موت کے بعد آنے والے انجام سے متعلق تھا۔ انھوں نے کہا کہ اسلام کے مطابق آدمی کے مرنے کے بعد ہی اس کا اخروی انجام شروع ہو جاتا ہے۔ اب ایک شخص آج پیدا ہوتا ہے اور ایک شخص وہ ہے جو دس ہزار سال پہلے پیدا ہوا۔ دونوں پچاس پچاس سال زندگی گزارتے ہیں اور اس کے بعد مر کر اپنی آخرت میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق ان میں سے ایک شخص دس ہزار سال پہلے سے اپنا انجام پا رہا ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جس کا اخروی انجام دس ہزار سال بعد آج سے شروع ہوگا۔ یہ آخر کون سا انصاف ہے۔

میں نے کہا کہ اس مسئلہ کو سمجھنا ناممکن نہیں۔ مثلاً جدید نظریہ اضافیت نے زمان و مکان کے تصور کو ختم کر دیا ہے۔ ماضی اور مستقبل کی تقسیم دراصل ہماری ذہنی محدودیت کی وجہ سے ہے۔ اگر ہم اپنی ذہنی حدبندیوں سے آزاد ہو جائیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس قسم کی تمام تقسیمات بالکل اضافی تھیں۔ اس کا ایک تجربہ وہ ہے جو ہر آدمی کو خواب میں ہوتا ہے۔ خواب میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سالوں کے اندر گزرنے والے واقعات کو ایک لمحہ میں دیکھ لیتا ہے۔ خواب کی دنیا میں دور اور قریب، ماضی اور مستقبل کی کوئی تقسیم نہیں۔

تاہم اصل بات یہ ہے کہ ان سوالات میں الجھنا اصولی طور پر درست نہیں۔ اس قسم کے سوالات سوالات نہیں ہیں بلکہ موشگافیاں ہیں۔ اور آدمی اگر موشگافیوں میں پڑ جائے تو ان کا کبھی خاتمہ نہیں ہوتا۔ سوچنے کا یہ انداز صرف بھٹکانے والا ہے۔ آدمی اگر اس قسم کے سوالات کے حل پر اصرار کرے تو نہ وہ دنیا میں کوئی کامیابی حاصل کر سکتا ہے اور نہ آخرت میں۔

میں نے کہا کہ آپ دنیوی حیثیت سے ایک کامیاب آدمی ہیں۔ یہ کامیابی آپ نے اپنی محنت سے حاصل کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ سے پہلے کے زمانہ میں بھی بہت سے لوگ پیدا ہوئے اور انھوں نے دنیوی کامیابیاں حاصل کیں۔ اب آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ آپ سے پہلے پیدا ہونے کی وجہ سے ان کو زیادہ موقع ملا۔ انھوں نے بے حد سستی زمینیں خرید لیں۔ ان کو ہر قسم کا سامان بہت کم قیمت میں مل گیا۔ آجکل کی سیاست اور قانونی الجھاؤں کے وجود میں آنے سے پہلے انھوں نے اپنی زندگیاں بنا لیں۔ وغیرہ — مذکورہ سوال کی طرح یہاں بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک انسان کے حالات اور دوسرے انسان کے حالات میں یہ فرق کیوں۔ جب تک اس سوال کا جواب نہ ملے میں کوئی معاشی کام نہیں کروں گا۔ مگر یہاں آپ ان موشگافیوں میں نہیں پڑتے۔ بلکہ ایک عملی انسان کی طرح پہلا موقع ملتے ہی اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن جب اسلام کا اور آخرت کا معاملہ آتا ہے تو موشگافیاں کر کے سوالات پیدا کرتے ہیں اور ان کا جواب چاہتے ہیں۔ یہ تضاد بتاتا ہے کہ اس قسم کے تمام سوالات بالکل غیر فطری ہیں۔ موجودہ دنیا کا ڈھانچہ

حقائق کی بنیاد پر بنا ہے۔ یہاں کامیابی اس کے لئے ہے جو ایک عملی انسان کی طرح حقائق کی پیروی کرے۔ جو شخص موشگافیوں میں الجھے اس کے لئے یہاں بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

ایک نوجوان نے بی اے کیا۔ مگر اپنے قریب اس کو کوئی ملازمت نہیں ملی۔ اس نے طے کیا کہ وہ باہر کے کسی شہر میں جائے اور وہاں اپنے لئے روزگار تلاش کرے۔ بالآخر ایک روز صبح کو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ میں بمبئی جا رہا ہوں۔ اب میں اس وقت تک نہیں آؤں گا جب تک اپنے لئے کوئی کام حاصل نہ کرلوں۔

دادی نے کہا آج شبھ ساعت نہیں ہے۔ تم کو جانا ہی ہے تو کسی اور دن جانا۔ ماں نے کہا کہ آج کل ریلوے میں ایکسیڈنٹ کی خبریں آ رہی ہیں، آج کل اتنا لمبا سفر کرنا ٹھیک نہیں۔ باپ نے کہا کہ بمبئی میں ان دنوں برسات کا موسم چل رہا ہے اور وہاں برسات کے موسم میں کام بہت کم ہوجاتا ہے۔ چھوٹے بھائی نے کہا کہ آپ چلے جائیں گے تو محلہ کے لڑکے ہم کو ماریں گے۔ آپ کی وجہ سے وہ سب ڈرتے تھے۔ نوجوان اگر اپنے گھر والوں کی ان باتوں پر دھیان دیتا تو ان میں سے ہر بات اس کو سفر سے روکنے کے لئے کافی تھی۔ مگر اس نے ان میں سے کسی بات پر سرے سے غور ہی نہیں کیا۔ اس نے سب باتوں کو نظرانداز کرکے صرف ایک بات اپنے سامنے رکھی: مجھے بمبئی جانا ہے اور وہاں اپنے لئے روزگار حاصل کرنا ہے۔ وہ سب کو سلام کرکے تیزی سے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔ اور ٹرین میں سوار ہوکر بمبئی پہنچ گیا۔ بمبئی میں اس کو اتنے سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا جو اس کے گھر والوں کے بدترین اندیشوں سے بھی کہیں زیادہ تھے۔ تاہم اس کے عزم اور اس کی جدوجہد نے مشکل آسان کردی۔ آج وہ ایک بڑی تجارتی فرم میں اعلیٰ عہدہ پر ہے اور اپنے گھر والوں کو لے کر ایک شاندار مکان میں کامیاب زندگی گزار رہا ہے۔

یہی مثال ہر معاملہ پر صادق آتی ہے حتیٰ کہ دینی معاملات پر بھی۔ اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کو کچھ اس ڈھنگ پر بنایا ہے کہ یہاں ہر کام میں موافق امکان کے ساتھ ناموافق امکان چھپا ہوا ہے۔ ہر یقین کے ساتھ ایک شبہ کا پہلو لگا ہوا ہے۔ مزید یہ کہ انسان کی عقل تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے لئے قطعاً ناکافی ہے۔ کوئی آدمی اگر اس پر اصرار کرے کہ وہ سارے پہلوؤں کو عقل کی گرفت میں لانے کے بعد اس کی طرف اقدام کرے گا تو ایسا شخص کبھی کوئی اقدام نہیں کرسکتا۔ ہر آدمی کو لازماً یہ کرنا پڑتا ہے کہ کسی معاملہ میں جب وہ بنیادی پہلوؤں کے اعتبار سے مطمئن ہوجاتا ہے تو وہ اپنا دماغ غیر ضروری بحثوں میں نہیں الجھاتا۔ وہ بے شمار غیر حل شدہ پہلوؤں کو نظرانداز کرکے آگے بڑھ جاتا ہے۔ آدمی اگر ایسا نہ کرے تو موجودہ دنیا میں وہ کسی بھی قسم کا کوئی کام نہیں کرسکتا۔

یہی بات قرآن سے ہدایت لینے کے لئے بھی درست ہے۔ قرآن بلاشبہ ہدایت کی کتاب ہے۔ اس میں روشنی اور سکون ہے۔ مگر جو شخص قرآن کا طالب ہو اس کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ آخرت کی دنیا میں نہیں اتری ہے بلکہ ہماری موجودہ دنیا میں اتری ہے جو امتحان اور آزمائش کی دنیا ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے والا اپنی اس محدود عقل کے ساتھ اس کا مطالعہ کر رہا ہے جو موجودہ دنیا میں اس کو حاصل ہے نہ کہ اس عقل سے جو اس کو آخرت کے لامحدود عالم میں

کے ساتھ اس کے سامنے ایسی باتیں آئیں جو بظاہر سمجھ میں نہ آرہی ہوں۔ اگر اس کو یقین کے صفحات پڑھنے کو ملیں تو اسی کے ساتھ وہ ایسے صفحات بھی پڑھے جو کریدنے والے ذہن کو بے یقینی میں مبتلا کرنے والے ہوں۔ موجودہ عقل اور موجودہ دنیوی حالات کی بنا پر ایسا ہونا بالکل فطری ہے۔ کیونکہ یہی تو آدمی کا امتحان ہے۔ دنیوی کامیابی اس بات کا امتحان ہے کہ وہ کون شخص ہے جو راستہ کے "کانٹوں" کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتا ہے اور وہ کون شخص ہے جو "کانٹوں" میں الجھ کر اپنے سفر کو کھوٹا کر لیتا ہے۔ اسی طرح اخروی کامیابی بھی اس بات کا امتحان ہے کہ حقیقی عقلمند اور جھوٹے عقلمند کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ حقیقی عقلمند وہ ہے جو بے فائدہ سوالات میں نہ الجھے اور تمام ناموافق باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے آخرت کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھے۔ اس کے برعکس جھوٹا عقلمند وہ ہے جو بے فائدہ موشگافیوں کو حل کرنے میں لگا رہے، جو اس پر اصرار کرے کہ وہ مکمل عقلی اطمینان کے بعد قرآن کو قرآن سمجھے گا۔ ایسا آدمی کبھی قرآن کو نہیں پا سکتا ——— شبہات کے باوجود یقین کا درجہ حاصل کرنا ہی کسی آدمی کو کامیاب بناتا ہے، موجودہ دنیا میں بھی اور آخرت کی دنیا میں بھی۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ موجودہ دنیا میں التباس (انعام ۹) کا قانون جاری ہے۔ یعنی یہاں حقیقتوں کو کھولنے کے باوجود ان کے اوپر شبہ کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ شبہات میں نہ پڑے بلکہ عقل سے صحیح کام لیتے ہوئے حقائق کو اپنی روح کی غذا بنائے۔ اگر آدمی یہ اصرار کرے کہ شبہات کا پردہ اس کے لئے پھٹ جائے اور وہ "مکمل عقلی اطمینان" کے ساتھ حقیقتوں کو پا سکے تو ایسا مکمل عقلی اطمینان یہاں کبھی ممکن نہ ہوگا۔ اس قسم کا عقلی اطمینان تلاش کرنے والے کے لئے اس دنیا میں بھٹکنے اور برباد ہونے کے سوا کوئی دوسرا انجام نہیں۔ ایسے مزاج کے تحت یہاں نہ کوئی لادینی کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے اور نہ کوئی دینی کامیابی۔ جو چیز خدا نے اپنی دنیا میں نہ بنائی ہو وہ آپ اس کی دنیا میں حاصل نہیں کر سکتے۔ آپ قدرت کے نظام سے صرف مطابقت کر سکتے ہیں، اس کے خلاف اپنی راہ نہیں بنا سکتے۔

ایک طالب علم امتحان ہال میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے سامنے امتحان کا پرچہ آتا ہے۔ پرچہ میں ایک مسئلہ مبہم شکل میں درج ہے۔ وہ اس طرح واضح صورت میں درج نہیں جیسا کہ ایک باقاعدہ کتاب میں ہوتا ہے۔ اب اگر وہ مطالبہ کرے کہ امتحان کا پرچہ مبہم شکل میں لینا مجھے منظور نہیں۔ میں تو اس کو اس وقت لوں گا جب کہ وہ مجھے کتاب کی سی واضح صورت میں ملے تو ایسا مطالبہ کبھی منظور نہیں کیا جائے گا۔ قرآن کی مثال بھی جزئی طور پر اسی قسم کی ہے۔ قرآن بلاشبہ کتاب ہدایت ہے مگر اسی کے ساتھ وہ ہمارے امتحان کا پرچہ بھی ہے۔ ہمیں قرآن سے رہنمائی بھی حاصل کرنا ہے اور اسی کے ساتھ یہ ثبوت بھی دینا ہے کہ ہم غیب کا پردہ باقی رہتے ہوئے خدا کو پا سکتے ہیں۔ شبہات کا غبار رہتے ہوئے بھی یقین کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں۔ حقیقت سے دور ہوتے ہوئے بھی اس سے قربت کا تجربہ کر سکتے ہیں۔ یہی تو آدمی کا امتحان ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو امتحان کس بات کا ہوگا۔

موت جب آتی ہے

جے۔ اے۔ دیو ۱۹۲۳ء میں شملہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے نہایت محنت سے تعلیم حاصل کی۔ بالآخر انھوں نے آئی۔ اے۔ ایس کا امتحان پاس کیا۔ وہ مزید تعلیم کے لئے برطانیہ بھی گئے۔ اس کے بعد ان کو حکومت میں اچھی ملازمت مل گئی۔ جولائی ۱۹۷۹ میں وہ اپنی اعلیٰ ترین ترقی کے منصب پر پہنچ گئے جب کہ ان کو ڈیفنس سکریٹری کے عہدہ پر مقرر کیا گیا۔ مگر اس ترقی پر ان کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ ۱۰ اپریل ۱۹۸۰ کو ۵۷ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ۱۱ اپریل کو مسٹر دیو کا جسم نگم بودھ گھاٹ پر اس وقت جلادیا گیا جب کہ ہندوستانی فوج کے تینوں سپہ سالار ان کے اظہار عقیدت کے لئے گھاٹ پر موجود تھے۔ بری اور بحری اور ہوائی فوجوں کے اعلیٰ ترین افسران جو ساٹھ کروڑ انسانوں کے اس ملک پر کسی بھی حملہ کو پسپا کرنے کی پوری طاقت رکھتے تھے وہ اپنے حاکم اعلیٰ کو موت کے حملہ کا شکار ہونے سے بچانے کے لئے بے بس ہو گئے۔

اس سے بھی زیادہ عبرت ناک مثال وہ ہے جو سنجے گاندھی کے ساتھ پیش آئی ہے۔

۱۹۸۰ میں مرکزی پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات میں اندرا گاندھی اور ان کے بیٹے سنجے گاندھی کی پارٹی کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد عام طور پر سمجھا جانے لگا کہ اب سنجے گاندھی ہندوستان کے وزیر اعظم ہوں گے۔ مگر وزارت عظمیٰ کی عین چوکھٹ پر پہنچ کر اچانک ۳۳ سال کی عمر میں ان کا خاتمہ ہوگیا۔ ۲۳ جون ۱۹۸۰ کی صبح کو سنجے گاندھی ایک نئے امریکی ہوائی جہاز میں تفریحی سواری (Joy Ride) کے لئے نکلے۔ ان کا دو سیٹوں کا جہاز صفدر جنگ کے ہوائی اڈے سے اڑ کر ابھی فضا میں پہنچا ہی تھا کہ اچانک اس کے انجن نے کام کرنا بند کر دیا اور دھماکہ کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔ جہاز کے ملبہ سے اس کے دونوں مسافر (سنجے گاندھی اور کیپٹن سکسینا) مردہ اور کچلی ہوئی حالت میں باہر نکالے گئے۔ سنجے گاندھی کو اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا کہ حادثہ سے صرف ایک دن پہلے دہلی کے لفٹننٹ گورنر مسٹر جگ موہن کے ساتھ کار پر سفر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ کار ہو یا ہوائی جہاز، ڈھیل پر اگر میں ہوں تو کچھ بھی نہیں ہوگا" ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ اگلے دن آنے والی صبح صرف اس لئے آرہی ہے کہ ان کے اس اعتماد کی ہمیشہ کے لئے تردید کر دے۔

اس واقعہ میں بڑی عبرت ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۴ جون ۱۹۸۰) نے اس سلسلے میں جو اداریہ شائع کیا ہے اس میں اولاً ان شاندار امکانات کا ذکر کیا ہے جن کے بالکل کنارے سنجے گاندھی پہنچ تھے۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے: قسمت کی کیسی ستم ظریفی ہے کہ اس کے بعد وہ اتنی جلد مر جائیں:

What an irony that he should die so soon afterwards.

آدمی دنیا میں جن کامیابیوں کے لئے اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے ان کے بے حقیقت ہونے کا یہی ایک کافی ثبوت ہے۔ عین اس وقت جب کہ وہ اپنی ترقی کے عروج پر پہنچ چکا ہوتا ہے، موت اس کے اور اس کی کامیابیوں

کے درمیان حائل ہو جاتی ہے، گویا کہ وہ اس کامیابی کی نفی کر رہی ہو جس کو آدمی اپنے لئے کامیابی سمجھ کر اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

آدمی زندگی چاہتا ہے مگر بہت جلد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں صرف موت ہے جو اس کا استقبال کرنے کے لئے کھڑی ہوئی ہے۔ ۲۴ جون کی شام کو ایک طرف شانتی ون میں سنجے گاندھی کا مردہ جسم جلایا جا رہا تھا، دوسری طرف وہاں کھڑے ہوئے ان کے ہزاروں معتقدین یہ نعرہ لگا رہے تھے:

جب تک سورج چاند رہے، سنجے تیرا نام رہے۔

انسان "سورج چاند کے رہنے تک" زندہ رہنا چاہتا ہے مگر موت اس قدر بے رحمی کے ساتھ اس کو اس دنیا سے اٹھا لیتی ہے جیسے اس کے نزدیک نہ انسان کی کوئی اہمیت ہے اور نہ اس کی خواہشوں کی۔

انسان اپنی عظمت کا قلعہ تعمیر کرتا ہے مگر موت کا طوفان اس کو تنکوں کی طرح اڑا کر یہ سبق دیتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں کوئی قدرت حاصل نہیں۔ انسان کہتا ہے کہ میں اپنا مالک ہوں مگر تقدیر اس کو کچل کر بتاتی ہے کہ تیرا مالک کوئی اور ہے۔ انسان موجودہ دنیا میں اپنی آرزوؤں کا باغ اگانا چاہتا ہے مگر موت اس کے منصوبہ کو مٹا کر یہ سبق دیتی ہے کہ اپنے لئے دوسری دنیا تلاش کرو کیونکہ موجودہ دنیا میں تمھاری آرزوؤں کی تکمیل ممکن نہیں۔

زندگی کا سب سے بڑا سبق وہ ہے جو موت کے ذریعہ ملتا ہے۔ موت ہماری زندگی کی سب سے بڑی معلم ہے۔ موت ہر آدمی کو ایک ایسے سوال کے بارہ میں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے جس کے جواب میں زندگی کا تمام راز چھپا ہوا ہے۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ ہم اپنے مالک آپ نہیں ہیں۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا میں ہماری زندگی محض عارضی زندگی ہے۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا وہ مقام نہیں جہاں ہم اپنی تمناؤں کو حاصل کرنے کی امید کر سکیں۔ موت دراصل زندگی کا پیغام ہے۔ موت ہم کو جینا سکھاتی ہے۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ اپنی حقیقی زندگی کی تعمیر کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

موت انسانی زندگی کا سب سے زیادہ عبرت ناک واقعہ ہے۔ وہ آدمی کو آسمان میں اٹھا کر زمین پر گرا دیتی ہے۔ وہ آدمی کو زمین پر ختم کر کے اس کی راکھ کو ہوا میں اڑا دیتی ہے۔ موت کے سامنے ہر آدمی بالکل بے بس ہے۔ موت کے سامنے کسی بھی شخص کی کوئی قیمت نہیں۔ یہ واقعہ ہماری زمین پر روزانہ لاکھوں کی تعداد میں پیش آتا ہے۔ مگر انسان غفلت کی ایسی شراب پئے ہوئے ہے کہ اس کے باوجود اس کی مدہوشی ختم نہیں ہوتی۔ آدمی دوسرے کو مٹانے کا منصوبہ بناتا ہے حالاں کہ موت خود اس کو مٹانے کے لئے اس کے پیچھے کھڑی ہوئی ہے۔ آدمی دوسرے کو برباد کرنے کی سازشیں کرتا ہے حالاں کہ اپنی سازش کی تکمیل سے پہلے وہ خود موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ آدمی دوسرے کا اعتراف نہیں کرتا، وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ اپنی بڑائی کا تحفظ کر رہا ہے۔ حالاں کہ اگلے ہی لمحہ موت آکر اس کی بڑائی کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ انسان "خدا" بننا چاہتا ہے مگر موت اس کو بتاتی ہے کہ وہ صرف ایک بے قیمت "آدمی" ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

امت مسلمہ کی طاقت : اتحاد

قرآن میں تکمیل دین کی آیت کے تحت ارشاد ہوا ہے ـــــ آج کفر کرنے والے لوگ تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے ، اب تم ان سے نہ ڈرو بلکہ صرف مجھ سے ڈرو (مائدہ ۳) یہ آیت حجۃ الوداع کے موقع پر ۱۰ھ میں نازل ہوئی۔ اس کے تقریباً ڈھائی ماہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا۔ اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اور اصحاب رسول کی جدوجہد کے بعد اسلام کی تاریخ جہاں پہنچ چکی ہے وہ اتنی مضبوط ہے کہ اسلام اب اپنی ذاتی بنیادوں پر قائم ہو گیا ہے۔ اب اسلام بیرونی خطرات کی زد سے نکل گیا ہے ۔ اب اس کے لئے خطرہ ہو سکتا ہے تو اندر کی طرف سے نہ کہ باہر کی طرف سے۔

مذکورہ آیت میں امت مسلمہ کے لئے اللہ کا یہ کھلا ہوا وعدہ ہے کہ اب اس کے لئے تشویش کی بات یہ نہیں ہے کہ اس کے اوپر اس کے دشمن غلبہ پالیں۔ بلکہ تشویش کی بات یہ ہے کہ امت کے افراد میں اللہ کا ڈر باقی نہ رہے۔ اب مسلمانوں کے لئے کمزوری کی بات خوف خدا کا نہ ہونا ہے نہ کہ کسی خارجی قوت کے مقابلہ میں ان کا کمزور ہونا ـ یہ اعتقادی بات نہیں ہے بلکہ وہ معلوم حقائق پر مبنی ہے۔ مسلمانوں کے معاملہ کو اللہ نے یہاں تک پہنچایا کہ زمین کے بڑے رقبہ پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ وہ اس اندیشہ سے باہر نکل گئے کہ محض تعداد کی کمی کی وجہ سے وہ کسی کے مقابلہ میں شکست کھا سکیں۔ ان کے پاس بہترین اقتصادی خطے ہیں۔ انتہائی اہم فوجی مقامات پر ان کا قبضہ ہے۔ ہر قسم کی صلاحیتوں والے افراد رات دن ان کے یہاں پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کو ایک ایسی کتاب حاصل ہے جو ان کو ساری دنیا میں فکری برتری عطا کر سکے۔ ان کی تاریخ اتنی شاندار ہے جو قیامت تک ان کی نسلوں کو جوش و ولولہ کی خوراک دینے کے لئے کافی ہے۔

جس قوم کے پاس برتری کے اتنے اسباب جمع ہو جائیں باہر کی کوئی قوم اس کو زیر کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی ، الا یہ کہ اس نے اپنی حماقت سے اپنے کو کمزور کر لیا ہو ، اور یہ حماقت دراصل اندرونی اختلاف ہے قوم کے افراد جب اللہ سے ڈرنے والے ہوں تو وہ ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ وہ انصاف کے ساتھ ایک دوسرے کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ پورا معاشرہ حسد اور بغض کی نفسیات سے پاک ہوتا ہے۔ اور جس معاشرہ کا یہ حال ہو اس میں باہمی اتحاد کے سوا کیا چیز جنم پائے گی۔ اس کے برعکس جب قوم کے افراد اللہ سے بے خوف ہو جائیں تو ہر ایک دوسرے کی کاٹ میں لگ جاتا ہے۔ ہر آدمی خود غرضی کے خول میں سمٹ جاتا ہے۔ بدخواہی، انتقام اور حسد سے پورا معاشرہ کھوکھلا ہو جاتا ہے ـــــ اللہ کا ڈر اتحاد کی فضا پیدا کرتا ہے جو سب سے بڑی طاقت ہے۔ اللہ سے نڈر ہو جانا اختلاف پیدا کرتا ہے اور جو قوم باہمی اختلافات کی شکار ہو جائے وہ لازماً کمزور ہو جاتی ہے خواہ اس کی تعداد بظاہر کتنی ہی زیادہ ہو۔

دو مسلمان مل کر ایک کام شروع کرتے ہیں۔ اس کے بعد کسی وجہ سے دونوں میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ اب اگر دونوں خاموشی سے اپنے کام کو الگ کر لیں اور اپنی کوششوں کو جاری رکھنے کے لئے الگ الگ میدان تلاش کر لیں تو اس سے معاشرہ میں کوئی خرابی یا کمزوری پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ ایک دوسرے کی کاٹ میں لگ جائے تو دونوں کے تعلقات میں فساد پیدا ہو جاتا ہے جو بالآخر معاشرہ کی کمزوری کا باعث ہوتا ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے یہاں نکاح کا پیغام دیتا ہے۔ دوسرا مسلمان کسی وجہ سے پیغام قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اب اگر پہلا مسلمان اس سے کوئی برا اثر نہ لے اور اپنے لئے کوئی دوسرا رشتہ ڈھونڈ لے تو معاشرہ کسی خرابی کا شکار نہیں ہوتا، اس کے برعکس اگر پہلے مسلمان کے اندر دوسرے مسلمان کے خلاف دشمنی کی آگ بھڑک اٹھے۔ وہ اس کے خلاف جھوٹے مقدمے قائم کرے اور اس کی بربادی کے منصوبے بنائے تو دو مسلمان خاندان نامعلوم مدت کے لئے ایک دوسرے سے کٹ جائیں گے اور نتیجۃً پورے معاشرہ میں بگاڑ پھیل جائے گا۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی عمارت میں کرایہ دار ہے۔ مالک مکان کو کرایہ دار سے کوئی شکایت ہو گئی۔ اب اگر مالک مکان وسعت ظرف کا طریقہ اختیار کرے تو دونوں کے تعلقات میں کوئی بگاڑ نہیں آئے گا اور ملت کا اتحاد قائم رہے گا۔ اس کے برعکس اگر مالک مکان یہ کرے کہ کرایہ دار کو اکھاڑنے کے لئے اس کو بدنام کرے۔ اس کے خلاف تخریبی منصوبے بنائے۔ اس کو ذلیل کرنے کی کوشش کرے تو یہ ملت کے قلعہ میں نقب لگانے کے ہم معنی ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کچھ لوگ کرایہ دار کا ساتھ دیں گے اور کچھ لوگ مالک مکان کا۔ ملت دو حصوں میں بٹ جائے گی۔ ملت کی جو طاقت ملت کی ترقی و استحکام میں لگتی وہ ملت کی بربادی میں صرف ہونے لگے گی۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ملت کے افراد ایک رویہ اختیار کر کے اپنے کو طاقت ور بناتے ہیں اور دوسرا رویہ اختیار کر کے اپنے کو اور بالآخر پوری ملت کو کمزور کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اس قسم کی تمام کمزوریوں کی واحد وجہ اللہ کی پکڑ سے بے خوف ہونا ہے۔ اگر آدمی اللہ سے ڈرے تو وہ ایسے الفاظ اپنی زبان سے نہیں نکالے گا جو اللہ کے یہاں بے قیمت ہو جانے والے ہیں۔ وہ ایسے عمل نہیں کرے گا جو اللہ کی میزان میں جرم ثابت ہونے والے ہیں۔ ہر آدمی اپنی غلطی کو تسلیم کرے گا۔ ہر آدمی دوسرے کو تکلیف دینے سے بچے گا اور جس معاشرہ میں یہ فضا ہو وہاں لازماً اتحاد فروغ پاتا ہے اور اتحاد ہی کا دوسرا نام طاقت ہے۔

آدمی دوسرے کی بربادی کے منصوبے بناتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اس سے پہلے کہ دوسرے کے خلاف اس کے ارادے پورے ہوں خود اس کی موت کا وقت آجائے گا۔ وہ دنیا سے اٹھا کر آخرت میں پہنچا دیا جائے گا۔ وہاں اس کو جواب دینا ہوگا کہ خدا نے اس کو جو کچھ دیا تھا وہ خدا کی امانت تھا۔ اس کو کیا حق تھا کہ ان کو خدا کے بندوں کی بربادی کے لئے استعمال کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر صرف موت کو یاد رکھے تو وہ اس کی اصلاح کے لئے کافی ہو۔

آپ کس پیغام کے ساتھ بھیجے گئے

ابونجیح عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اسلام سے پہلے بھی میرا یہ احساس تھا کہ لوگ گمراہی پر ہیں۔ بتوں کی پرستش جس میں وہ لگے ہوئے ہیں اس کی کچھ بھی حقیقت نہیں ہے۔ پھر میں نے سنا کہ مکہ میں ایک شخص ظاہر ہوا ہے جو آسمانی باتیں بتاتا ہے۔ میں اپنی سواری پر بیٹھ کر وہاں پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھپ کر تبلیغ کرتے ہیں اور آپ کی قوم آپ پر بہت جری ہو گئی ہے۔ مکہ میں جب میں آپ سے ملاقات میں کامیاب ہو گیا تو میں نے پوچھا: ما انت (آپ کون ہیں) آپ نے فرمایا۔ انا نبیؐ (میں نبی ہوں) میں نے پوچھا نبی کس کو کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا مجھ کو اللہ نے بھیجا ہے۔ میں نے پوچھا کس چیز کے ساتھ بھیجا ہے۔ آپ نے فرمایا:

ارسلنی بصلۃ الارحام وکسر الاوثان وان یوحد اللہ لا یشرک بہ شیئ (مسلم)

مجھ کو اس پیغام کے ساتھ بھیجا ہے کہ رشتوں کو جوڑا جائے اور بتوں کو توڑا جائے۔ اور اللہ کو ایک سمجھا جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔

نصیحت عمومی انداز میں

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کسی کے بارے میں کوئی ایسی بات معلوم ہوتی جو آپ کو ناگوار ہو تو آپ یہ نہ کہتے کہ "فلاں شخص کو کیا ہو گیا ہے کہ اس نے ایسا کہا" بلکہ یوں فرماتے: ما بال اقوام یصنعون او یقولون کذا لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ ایسا کرتے ہیں یا ایسا کہتے ہیں۔ اس طرح عمومی انداز میں روکتے۔ مگر کسی کا نام نہ لیتے۔ (کتاب الشفاء از قاضی عیاض، صفحہ ۸۹)

وہ لوگوں کے اسلام کے سب سے زیادہ حریص تھے

حضرت عبداللہ بن عباس قرآن کے بہت بڑے عالم تھے۔ قرآنی مضامین کی گہرائیوں تک پہنچنے کی ان کے اندر غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ایک بار انھوں نے سورہ بقرہ کی تفسیر اپنے مخصوص انداز میں بیان کی۔ اس کو سن کر حاضرین میں سے ایک شخص بول اٹھا: لو سمع ھذا الدیلم لاسلمت (دیلم کے کفار بھی اگر اس کو سنیں تو ضرور اسلام قبول کر لیں۔

آخرت کی بات رسول کے لئے اہم، ابولہب کے لئے غیر اہم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دعوت عام کا حکم ہوا تو آپ نے صفا کے ٹیلے پر کھڑے ہو کر مکہ والوں کو پکارا۔ لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا: لوگو: میں تم کو آخرت کے عذاب سے ڈراتا ہوں (انی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید) ابولہب نے یہ سن کر کہا: تبالک سائر الیوم اما دعوتنا الا لھذا (سیرت ابن کثیر) سارے دن تمہارا برا ہو۔ کیا یہی بات بتانے کے لئے تم نے ہم کو بلایا تھا۔

مدعو کو حقیر نہ سمجھنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے واپس ہوئے تو سخت زخمی ہو چکے تھے۔ راستہ میں آپ نے انگور کے ایک باغ

میں پناہ لی۔ یہ باغ مکہ کے ایک سردار ربیعہ کے بیٹوں عتبہ اور شیبہ کا تھا۔ یہ دونوں اس وقت باغ میں تھے۔ انھوں نے آپ کی حالت دیکھ کر اپنے نصرانی غلام عداس کے ہاتھ کچھ انگور آپ کے پاس بھیجے۔ آپ نے اس کو کھانا شروع کیا تو کہا "بسم اللہ"۔ عداس کو یہ بات عجیب لگی۔ آپ نے اس سے پوچھا "تم کہاں کے رہنے والے ہو" اس نے کہا "نینویٰ کا"۔ آپ نے فرمایا: اس بھلے آدمی کے شہر کے جس کا نام یونس بن متی تھا۔ اس نے کہا "آپ کو یونس بن متی کی خبر ہے"۔ آپ نے اس کو قرآن کا وہ حصہ سنایا جو حضرت یونس علیہ السلام کے بارہ میں آپ پر نازل ہوا تھا:

وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یحقر احد ابلغہ رسالات اللہ تعالیٰ (ابونعیم فی دلائل النبوۃ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کو اللہ کا پیغام پہنچاتے اس کو کبھی حقیر نہیں سمجھتے تھے۔

بے آمیز سچائی لوگوں کے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی اتری تو آپ گھبرائے ہوئے مکان واپس آئے۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ نے فرمایا: مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میری جان نکل جائے گی (لقد خشیت علی نفسی) خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کو اپنے عزیز ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ وہ نصرانی ہو گئے تھے اور انبیاء کی تاریخ اور قدیم آسمانی کتب کا مطالعہ کیا تھا۔ آپ کے حالات سن کر انھوں نے کہا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم اس امت کے نبی ہو۔ تمھارے پاس وہی فرشتہ آیا ہے جو موسیٰ کے پاس آیا تھا اور تمھاری قوم تم کو جھٹلائے گی، تم کو تکلیف دے گی، تم کو وطن سے نکالے گی، تم سے جنگ کرے گی"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا: او مخرجی ھم (کیا وہ مجھے نکال دیں گے) ورقہ بن نوفل نے کہا ہاں، جو پیغام تم لے کر آئے ہو، یہ پیغام جب بھی کوئی لے کر آیا ہے تو لوگ اس کے دشمن ہو گئے ہیں۔ اور اس سے لڑائی کی ہے۔

مدعو کی زبان میں کلام کرنا

ابوالبختری کہتے ہیں۔ ایران سے جنگ کے زمانہ میں ایک لشکر کے امیر سلمان فارسی رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے ایک قلعہ کا محاصرہ کیا۔ لشکر والوں نے کہا: اے ابوعبداللہ! کیوں نہ ہم ان پر حملہ کر دیں۔ سلمان فارسی رض نے کہا مجھے موقع دو کہ میں ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کروں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا۔ سلمان فارسی نے اہل قلعہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا: میں بھی تمھارے جیسا ایک فارسی ہوں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ عربی لوگ کس طرح میری اطاعت کر رہے ہیں۔ تم اسلام لے آؤ۔ جو ہمارے لئے ہوگا وہی تمھارے لئے ہوگا۔ جو ہمارے لئے نہ ہوگا وہ تمھارے لئے بھی نہ ہوگا (ان اسلمتم فلکم مثل الذی لنا وعلیکم مثل الذی علینا) اور اگر تم اپنے دین پر قائم رہنا چاہتے ہو تو جزیہ ادا کرو۔ اگر تم اس سے بھی انکار کرو گے تو ہم تم سے جنگ کریں گے۔ قال و رطن الیھم بالفارسیۃ (احمد) ابوالبختری کہتے ہیں کہ یہ بات انھوں نے فارسی زبان میں کہی۔

اصلاح سے مایوس ہو کر بددعا کرنا درست نہیں

طفیل بن عمرو رض دوسی زیارت کعبہ کے لئے مکہ آئے۔ قریش کے کچھ لوگوں نے ان سے کہا۔ "دیکھو تم ہمارے شہر میں آئے ہو۔

یہ آدمی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے دین سے الگ ہو گیا ہے۔ اس نے ہماری جماعت میں تفریق ڈال دی ہے اس کی باتوں میں جادو ہے۔ وہ باپ بیٹے میں اور بھائی بھائی میں جدائی کر دیتا ہے۔ ہم کو ڈر ہے کہ اس نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہی تمھارے ساتھ بھی نہ کرے۔ تم اس سے بات نہ کرنا نہ اس کا کلام سننا۔ طفیل بن عمرو دوسی رض کہتے ہیں کہ میں بیت اللہ میں گیا تو میں نے اپنے کان میں روئی ڈال لی کہ اس آدمی کی بات میرے کان میں نہ پڑے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ آخر میں بھی تو سمجھ رکھتا ہوں۔ مجھ سے کسی کلام کا حسن و قبح چھپ نہیں سکتا کیوں نہ میں اس کی بات سنوں۔ اگر معقول ہو گی تو مان لوں گا۔ اور اگر نامعقول ہوئی تو چھوڑ دوں گا۔ چنانچہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا۔ انھوں نے مجھ کو قرآن سنایا: فواللہ ما سمعت قولاً قط احسن ولا امرا اعدل منہ (خدا کی قسم وہ کلام ایسا تھا کہ میں نے اتنا اچھا اور اتنا منصفانہ کلام کبھی نہیں سنا تھا۔ میں نے اسلام قبول کر لیا اور واپس آکر اپنی قوم میں تبلیغ کرنے لگا۔ مگر اس وقت میری تبلیغ سے صرف ایک شخص (ابوہریرہ رضی اللہ عنہ) اسلام لائے میں دوبارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور قوم کی سرکشی کا ذکر کر کے درخواست کی کہ آپ ان کے حق میں بددعا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا اللّٰھم اھد دوسا (خدایا قبیلہ دوس کو ہدایت دے) میں نے کہا اے خدا کے رسول! میرا یہ منشا نہ تھا۔ آپ نے فرمایا: اپنی قوم کی طرف واپس جاؤ ان کو اسلام کی دعوت دو اور نرمی کا معاملہ کرو: ان فیھم مثلک کثیرا (ابن عبدالبر فی الاستیعاب) ان میں تمھارے جیسے بہت ہوں گے۔

اچھی بات سب سے بڑی دین ہے

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ما افاد المسلم اخاہ فائدۃ احسن من حدیث حسن بلغہ فبلغہ کوئی مسلمان اپنے بھائی کو اس سے اچھا فائدہ نہیں پہنچا سکتا کہ اس کو ایک اچھی بات ملی اور وہ اس نے اپنے بھائی کو پہنچا دی (جامع بیان العلم وفضلہ ۔ ۴۴)

دوسروں کا احتساب کرنے کے بجائے اپنا احتساب

حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: اے اللہ کے رسول، میرے لئے کوئی ایسی چیز ٹھہرا دیجئے جس کے ساتھ میں جیوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے حمزہ، کسی جان کو زندہ کر دینا تمھیں زیادہ پسند ہے یا کسی جان کو مار ڈالنا۔ انھوں نے کہا کہ کسی کی جان کو زندگی دینا مجھے زیادہ پسند ہے۔ آپ نے فرمایا: تمھارے اوپر صرف تمھاری اپنی ذمہ داری ہے۔ (قال الامام احمد جاء حمزۃ بن عبد المطلب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ اجعلنی علی شیئ اعیش بہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا حمزۃ نفس تحییھا احب الیک ام نفس تمیتھا قال بل نفس احییھا قال علیک بنفسک، تفسیر ابن کثیر جلد اول صفحہ ۵۱۰)

کشادہ چہرہ کے ساتھ ملو اور نرم بات بولو

ابن عمر رض نے کہا: نیکی آسان ہے ـــــ کشادہ رو اور نرم بات (البر شیئ ھین: وجہ طلق وکلام لین)

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں ، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں ۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں ۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی ۔

تجربہ یہ ہے کہ یک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے ۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں ۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے ۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے ۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے ۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے ۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں ۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں ۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں ۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے ۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے ۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے ۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں ۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں ۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے ۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا ۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے ۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں ۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں ، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں ۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں ۔

عربی مطبوعات

مولانا وحید الدین خاں کی کتابوں کے بعض عربی ترجمے (مطبوعہ قاہرہ) برائے فروخت مکتبہ الرسالہ میں موجود ہیں :

کتاب	صفحات	قیمت
۱ - الإسلام يتحدى	۲۶۴ صفحات	قیمت ۲۰ روپے
۲ - الدين فى مواجهة العلم	۱۱۲ صفحات	۱۰ روپے
۳ - حكمة الدين	۸۷ صفحات	۸ روپے
۴ - الإسلام والعصر الحديث	۷۷ صفحات	۸ روپے
۵ - مسئوليات الدعوة	۳۹ صفحات	۲ روپے
۶ - نحو تدوين جديد للعلوم الإسلامية	۲۶ صفحات	۲ روپے
۷ - امكانات جديدة للدعوة	۳۴ صفحات	۲ روپے
۸ - الشريعة الإسلامية وتحديات العصر	۳۲ صفحات	۲ روپے
۹ - المسلمون بين الماضى والحال والمستقبل	۷۲ صفحات	۵ روپے
۱۰ - نحو بعث إسلامى	۳۲ صفحات	۵۰ پیسے

سوشلزم

ایک غیر اسلامی نظریہ

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۷۲ ۔ قیمت ۱/۲۵

مارکسزم

تاریخ جس کو رد کر چکی ہے

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۱۴۸ قیمت ۳/۰۰

مکتبہ الرسالہ

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی

اسلام کا تعارف

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۲۴ ۔ قیمت ۰/۵۰

اسلام

ایک عظیم جدوجہد

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۸۰ قیمت ۱/۶۰

مکتبہ الرسالہ

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی

● دین کیا ہے
صفحات ۳۲ قیمت ۱/۵۰ روپے

● تجدید دین
صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے

● مذہب اور جدید چیلنج
صفحات ۲۲۴ قیمت ۱۲/۵۰ روپے

● تعمیر ملت
صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے

● الاسلام
صفحات ۱۴۶ قیمت ۱۲/- روپے

● اسلام دین فطرت
صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے

● ظہور اسلام
صفحات ۲۰۰ قیمت ۱۲/- روپے

● زلزلۂ قیامت
صفحات ۶۴ قیمت ۳/- روپے

● اسلامی دعوت
صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے

● تاریخ کا سبق
صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے

● عقلیات اسلام
صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے

● قرآن کا مطلوب انسان
صفحات ۸۰ قیمت ۴/۵۰ روپے

● مذہب اور سائنس
صفحات ۷۲ قیمت ۴/-

● پیغمبر اسلام
صفحات ۴۸ قیمت ۲/-

● سبق آموز واقعات
صفحات ۴۸ قیمت ۲/-

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

REGD. R. N· NO. 28822/76
REGD. D. (D.) NO. 532

August 1980
Issue No. 45

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

پتھر مارنے والے سے نہ لڑو بلکہ اپنے آپ کو اتنا اونچا
اٹھاؤ کہ پتھر مارنے والے کا پتھر وہاں تک نہ پہنچ سکے

شمارہ ۴۶ زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے قیمت فی پرچہ
ستمبر ۱۹۸۰ خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے دو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

ستمبر ۱۹۸۰
شمارہ ۴۶

جمعیۃ بلڈنگ ، قاسم جہان اسٹریٹ ، دھلی ۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

من انصاری الی اللہ

الرسالہ پہلے بھی خسارہ میں چل رہا تھا مگر پچھلے چند مہینوں میں کاغذ وغیرہ کی قیمتیں اتنی تیزی سے بڑھی ہیں کہ اب یہ خسارہ ناقابل برداشت حد تک پہنچ گیا ہے۔ اس خسارہ کو پورا کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ اس کی قیمت بڑھا دی جائے۔ مگر فی الحال ہم ایک اور تدبیر کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس کے بعد مجبوراً قیمتوں میں اضافہ کر دیا جائے گا۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ صاحب استطاعت افراد اس کے لئے اعانتی رقم (سب سڈی) فراہم کریں۔ کچھ اہل خیر اگر اس طرف توجہ فرمائیں تو انشاء اللہ بآسانی اتنی رقم کا انتظام ہو جائے گا جس سے خسارہ کی تلافی ہو اور پرچہ موجودہ قیمت پر نکلتا رہے۔ واضح ہو کہ اس مد میں اعانت کے علاوہ زکوٰۃ و صدقات وغیرہ کی رقمیں بھی دی جا سکتی ہیں —— اس سلسلے میں ہم کو آپ کے جواب کا انتظار ہے۔

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی Al-Risala Monthly لکھیں

کعبہ سے زیادہ قابل احترام

یا یھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضا ایحب احدکم ان یأکل لحم اخیہ میتا فکرھتموہ واتقوا اللہ ان اللہ تواب رحیم (حجرات ۱۲)

اے ایمان والو، بہت سے گمانوں سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ اور کسی کا بھید نہ ٹٹولو اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو برا نہ کہو۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، اس کو تم خود ناگوار سمجھتے ہو۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا، مہربان ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لما عرج بی مررت بقوم لھم اظفار من نحاس یخمشون وجوھھم وصدورھم فقلت من ھؤلاء یا جبریل قال ھؤلاء الذین یأکلون لحوم الناس ویقعون فی اعراضھم (ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معراج کے سفر میں میرا گزر کچھ لوگوں پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے وہ اس سے اپنے منھ اور سینے کھرچ رہے تھے۔ میں نے کہا اے جبریل، یہ کون لوگ ہیں۔ انھوں نے کہا یہ وہ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے اور ان کی عزتوں پر گرتے تھے۔

المومن اکرم حرمۃ من الکعبۃ (ابن ماجہ)

مومن کعبہ سے زیادہ قابل احترام ہے

من ردّ عن عرض اخیہ ردّ اللہ عن وجھہ النار یوم القیامۃ (ترمذی)

جس نے اپنے بھائی کی عزت کو بچایا تو اللہ قیامت کے دن اس کے منھ کو آگ سے بچائے گا۔

اذا حسدت فاستغفر اللہ واذا ظننت فلا تحقق (طبرانی)

جب تمھارے اندر حسد پیدا ہو تو اللہ سے معافی مانگو اور جب تم کو کسی کے بارے میں گمان گزرے تو اس کی تحقیق نہ کرو۔

یا معشر من آمن بلسانہ لا تغتابوا المسلمین ولا تتبعوا عوراتھم فانہ من یتبع عورۃ اخیہ یتبع اللہ عورتہ ومن یتبع اللہ عورتہ یفضحہ فی جوف بیتہ (ابوداؤد)

اے ایمان لانے والو مسلمانوں کی برائی بیان نہ کرو، اور ان کی پوشیدہ باتوں کے پیچھے نہ پڑو کیونکہ جو اپنے بھائی کی پوشیدہ باتوں کے درپے ہوتا ہے تو خدا اس کی پوشیدہ باتوں کے درپے ہو جاتا ہے اور خدا جس کی پوشیدہ باتوں کے درپے ہو جائے تو وہ ضرور اس کو رسوا کر دیتا ہے خواہ وہ اپنے گھر کے اندر رہو۔

انّ من اربی الربا الاستطالۃ فی عرض المسلم بغیر حق (ابوداؤد)

بدترین زیادتی یہ ہے کہ کسی مسلمان کی عزت پر ناحق حملہ کیا جائے

روایات میں آتا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک روز کعبہ کی طرف دیکھا اور پھر کہا: تو کیسا عظمت و
ہے اور تیری حرمت کتنی زیادہ ہے۔ مگر مومن کی حرمت اللہ کے نزدیک تجھ سے بھی زیادہ ہے (ما اعظمک وا عظم
حرمتک والمومن اعظم حرمۃ عند اللہ منک، مختصر تفسیر ابن کثیر، جلد ثالث، صفحہ ۳۶۶) یہ بات جو حضرت
عبداللہ بن عمر نے کہی یہ دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ہے جس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے
اسی کو صحابی رسول نے اپنی زبان میں دہرایا۔

کعبہ ایک خاموش یادگار ہے۔ اس سے کسی آدمی کے وہ معاملات نہیں پڑتے جو زندہ انسانوں سے
پڑتے ہیں۔ اس لئے کعبہ کا احترام کرنے کے لئے آدمی آسانی سے راضی ہو جاتا ہے۔ اور انسان کا احترام کرنے
راضی نہیں ہوتا۔ مگر انسان کے تقویٰ کا اصل امتحان کعبہ کی سطح پر نہیں بلکہ انسان کی سطح پر ہو رہا ہے۔ جب ایک شخص
کے دل میں اپنے بھائی کے خلاف ایک برا گمان گزرتا ہے مگر وہ محض گمان کی بنیاد پر اس کے بارے میں نہیں
حتیٰ کہ وسعت ظرف سے کام لیتے ہوئے وہ اس کی تحقیق سے بھی بچتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی کی جو بات اللہ نے
رکھی ہے وہ اس کو چھپا ہی رہنے دے تو وہ ایک ایسے عمل کا ثبوت دیتا ہے جو کسی مقدس دیوار کا احترام کرنے
بھی زیادہ بڑا عمل ہے۔ جب اس کو کسی کے اوپر غصہ آتا ہے مگر اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو اس سے روکتا ہے
کہ وہ اس کی عزت پر حملہ کرنے لگے، وہ اس کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں کرے تو وہ ایک ایسا عمل کرتا ہے جو مقد
یادگاروں کا ادب کرنے سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ جب ایک آدمی دیکھتا ہے کہ اس کا بھائی کسی پہلو سے ترقی کر گیا
اس کے باوجود وہ اس سے حسد نہیں کرتا، وہ اس کا برا نہیں چاہتا تو یہ خدا کے نزدیک اتنا بڑا عمل ہوتا ہے
اس کے لئے کعبہ کے احترام سے بھی زیادہ بڑے اجر کا باعث بن جاتا ہے۔

دنیا میں ہر آدمی ایک درمیانی مقام پر کھڑا ہوا ہے۔ ایک طرف اس کا خدا ہے جس سے وہ آخرت
ملنے والا ہے۔ دوسری طرف وہ انسان ہیں جن کے درمیان وہ آج اپنے آپ کو پاتا ہے۔ آدمی کو دوسرے
انسانوں کے ساتھ وہی سلوک کرنا ہے جو وہ خدا سے اپنے بارے میں چاہتا ہے۔ اگر آدمی چاہتا ہے کہ خدا
اس کے بھیدوں کو کھول کر قیامت میں اس کو رسوا نہ کرے تو اس کو دنیا میں یہ کرنا ہے کہ وہ دوسرے
انسانوں کے بھید کے پیچھے نہ پڑے۔ وہ اگر خدا کے بندوں کے بھید کو چھپائے گا تو خدا بھی اس کے بھید
کو چھپائے گا۔ اور اگر اس نے دوسروں کو رسوا کیا تو خدا اس کو یہ سزا دے گا کہ قیامت کے دن اس کو
کرکے اپنی رحمتوں سے اسے دور کر دے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے کی عزت بچانا اپنی عزت بچانا ہے، دوسرے
کے اوپر وار کرنا خود اپنے اوپر وار کرنا ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس راز کو جانتے ہوں اور اس سے بھی
وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو اس پر عمل کرنے کے لئے راضی کر سکیں۔

سب سے بڑا عمل وہ ہے جس کے لئے آدمی کو اپنے نفس سے لڑنا پڑے، جس کے لئے مصلحتوں کے نقصان
برداشت کرنا ہو، جس کی قیمت یہ دینی پڑے کہ آدمی کی عزت و مقبولیت خطرہ میں پڑ جائے۔

توبہ نے طاقتور بنادیا

اُن میں بتایا گیا ہے کہ جادوگر جب فرعون کے پاس جمع ہوئے تو انھوں نے فرعون سے کہا: اگر ہم موسیٰ کے
مقابلہ میں غالب رہے تو ہم کو اس کا انعام توضرور ملے گا۔ فرعون نے کہا ہاں۔ اس کے بعد جادوگروں نے اپنی
رسیاں اور لکڑیاں پھینکیں جو دیکھنے والوں کو رینگتے ہوئے سانپ کی مانند نظر آنے لگیں۔ اب حضرت موسیٰ
نے اپنا عصا ڈالا۔ آپ کا عصا اژدہا بن کر گھوما تو اس کا اثر یہ ہوا کہ جادوگروں کی ہر لکڑی لکڑی اور ہر رسی
رسی ہو کر رہ گئی۔ جادوگر سمجھ گئے کہ موسیٰ نے جو چیز دکھائی ہے وہ جادو نہیں بلکہ خدائی معجزہ ہے۔ ان کا سینہ
حق کے لئے کھل گیا۔ اور انھوں نے اسی وقت ایمان قبول کر لیا۔ فرعون غضب ناک ہو کر بولا: تم لوگ موسیٰ کے مومن
بن گئے قبل اس کے کہ میں تم کو اس کی اجازت دوں۔ یہ تم لوگوں کی خفیہ سازش ہے۔ میں تمھارے ہاتھ پاؤں
مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور پھر تم سب لوگوں کو سولی پر چڑھا دوں گا (اعراف) —— جادوگروں نے
جواب دیا: اس ذات کی قسم جس نے ہم کو پیدا کیا ہے، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ خدا کی روشن نشانیوں کے مقابلہ میں
ہم تم کو ترجیح دیں۔ تم جو کچھ کرنا چاہو کر لو۔ تم صرف اسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتے ہو اور اللہ زیادہ اچھا ہے اور
وہ باقی رہنے والا ہے (طٰہٰ)

وہی جادوگر جو ابھی فرعون کے سامنے خوشامدی باتیں کر رہے تھے اور اس کے انعام اور اعزاز کے طالب
تھے وہی تھوڑی دیر بعد اتنے دلیرا ور بلند حوصلہ ہو گئے کہ فرعون کی انھیں کوئی پروانہ رہی۔ حتیٰ کہ فرعون کی طرف
سے سخت ترین سزا کی دھمکی بھی انھیں مرعوب نہ کر سکی۔ وہ کیا چیز تھی جس نے جادوگروں کو اچانک پستی سے بلندی اور
بزدلی سے بہادری تک پہنچا دیا۔ وہ ایمان کی طاقت تھی۔ انھوں نے انسانوں سے گزر کر خدا کو پا لیا تھا، پھر ان کو
انسانوں کا ڈر کیوں ہوتا۔

شہر کے مسلم محلہ کو تخریب کاروں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ مسلمان اپنے گھروں سے نکلے تو تخریب
کاروں نے پتھر پھینکنے شروع کئے۔ مسلمانوں نے بھی اس کے جواب میں پتھر پھینکے۔ تخریب کاروں کو جب پتھراؤ
سے کامیابی ہوتی نظر نہ آئی تو انھوں نے بندوقوں سے فائر کئے جس سے کچھ مسلمان زخمی ہو گئے۔ اس کے بعد
مسلمان بھاگے اور اپنے گھروں میں داخل ہو گئے۔ اب تخریب کاروں کا حوصلہ بڑھا۔ وہ آگے بڑھ کر محلہ میں
گھس گئے اور مسلمانوں کے مکانوں اور دکانوں میں آگ لگانا شروع کر دیا۔

یہ بڑا نازک موقع تھا۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ اس کے بعد محلہ کے ایک "دادا" کو اللہ
نے ہمت دی اور اس نے مسئلہ کو حل کر دیا۔ اس شخص میں اور کوئی برائی نہ تھی۔ البتہ وہ شراب پیتا تھا۔ وہ اپنے

کرہ میں داخل ہوا۔ اس نے تیمم کیا اور سجدہ میں گر پڑا۔ سجدہ کی حالت میں اس نے دعا کی: خدایا آج تو ہماری عزت رکھ لے اور ہماری مدد کر۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد میں کبھی شراب نہیں پیوں گا۔ اس نے یہ دعا کی اور اس کے بعد پڑوسی کی بندوق لی اور تھیلہ میں کارتوس بھر کر مجمع میں گھس گیا۔ اس نے چن چن کر تخریب کاروں کو اپنی بندوق کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ اگرچہ وہ خود بھی ہر وقت تخریب کاروں کے نشانہ کی زد پر تھا مگر اس وقت ڈر اس کے دل سے بالکل نکل گیا تھا۔ وہ پوری بے خوفی کے ساتھ اپنا کام کرتا رہا۔ تخریب کاروں نے جب دیکھا کہ ان کے بہت سے ساتھی خاک و خون میں تڑپ رہے ہیں اور "ہائے مار ڈالا" کی چیخیں بلند ہو رہی ہیں تو ان کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

قرآن میں ہے کہ اللہ کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور نیک عمل اس کو بلند کرتا ہے (فاطر ۱۰) مذکورہ مسلمان کی دعا کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ اس نے جب اپنی دعا کے ساتھ شراب چھوڑنے کا عہد کیا تو اس نے ایک نیک عمل کیا۔ اس نیک عمل کی وجہ سے اس کی دعا اوپر اٹھ کر فوراً خدا کی بارگاہ میں پہنچی اور مقبول ہوئی۔ جب بھی آدمی اپنی دعا کے ساتھ اس قسم کا کوئی نیک عمل کرے تو اس کی دعا ضرور قبولیت کا شرف حاصل کرتی ہے۔ دعا کے ساتھ اس کے موافق نیک عمل دعا کے معاملہ میں آدمی کے سنجیدہ ہونے کا ثبوت ہے، اور جب آدمی اپنی مانگ میں سنجیدہ ہو تو اس کی مانگ ضرور پوری کی جاتی ہے۔

اس واقعہ کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے۔ جب آدمی نے یہ کہا کہ "خدایا میں آج سے شراب کو چھوڑتا ہوں تو میری مدد کر" تو اس نے اپنی طاقت کو بڑھایا۔ کیوں کہ اب اس نے خدا کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ اگر وہ صرف "خدایا مدد کر" کے الفاظ بولتا تو اس سے اس کے اندر وہ یقین نہ آتا۔ کیوں کہ یہ چھپا ہوا خیال پھر بھی اس کے دل میں باقی رہتا کہ میں خدا کو پکار رہا ہوں حالاں کہ میں خدا کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ جب اس نے شراب چھوڑنے کا عزم کیا تو پھر پورے طور پر اس کو یہ امید پیدا ہو گئی کہ اب خدا ضرور میری مدد کرے گا۔ کیونکہ اب اس نے اپنے اور خدا کے درمیان پڑے ہوئے پردہ کو ہٹا دیا تھا۔ پہلی صورت میں اس کی مثال اگر چور کی سی تھی تو اب اس کی مثال اس شخص کی سی ہو گئی جس نے سامان کی قیمت اس کے دکان دار کو ادا کر دی ہو۔ اس کی توبہ نے اس کو نڈر بنایا اور اس کی قوت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ توبہ کے فوراً بعد اس کے اندر سے احساس جرم نکل گیا۔ اس کا یہ اندیشہ مٹ گیا کہ میں خدا سے دور ہوں۔ اب وہ خدا کی مدد کو اپنے حق میں یقینی سمجھنے لگا۔ اس کے اور خدا کے درمیان جو رکاوٹ تھی جب اس رکاوٹ کو اس نے دور کر دیا تو اندیشوں کے تمام غبار اس کے دل سے ہٹ گئے۔ خدا اس کو اپنا نظر آنے لگا، کیوں کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا بنا چکا تھا۔

سیڑھی نہ کہ لفٹ

"موجودہ منزل تک میں سیڑھی سے پہنچا ہوں نہ کہ لفٹ سے" ایک ٹیلر ماسٹر نے کہا "ایک اچھا کوٹ تیار کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کوٹ تیار کرنے کا پورا عمل اتنا پیچیدہ ہے کہ کوئی شخص کافی معلومات اور تجربہ کے بغیر اس کو بخوبی طور پر انجام نہیں دے سکتا۔ میں نے اس راہ میں ایک عمر صرف کی ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا ہے کہ میں شہر میں سلائی کی ایک دکان کامیابی کے ساتھ چلا سکوں۔"

ٹیلر ماسٹر نے اپنی کہانی بتاتے ہوئے کہا کہ اولاً میں نے ایک ٹیلر ماسٹر کی شاگردی کی۔ اس کے یہاں پانچ سال تک کوٹ کی سلائی اور کٹائی کا کام سیکھتا رہا۔ پانچ سال کی مسلسل محنت کے بعد میں اس قابل ہو گیا کہ میں ایک عام کوٹ سی سکتا تھا۔ مگر جب میں نے اپنی دکان کھول کر کام شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ابھی بہت سے مسائل ہیں جن کو حل کرنا باقی ہے۔ ہر آدمی کا جسمانی ڈھانچہ الگ الگ ہوتا ہے اور کسی کوٹ کو پہننے والے شخص کے اپنے ڈھانچہ کے مطابق ہونا چاہئے۔ چنانچہ جو کوٹ میں تیار کرتا اکثر اس میں شکایت ہو جاتی۔ کیوں کہ اس میں گاہک کے اپنے جسمانی ڈھانچہ کے لحاظ سے کچھ فرق ہو جاتا اور کوٹ صحیح نہ آتا۔ اس تجربہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ انسانی جسم کی بناوٹ (اناٹومی) کے اچھے مطالعہ کے بغیر یہ ناممکن ہے کہ میں ایک معیاری کوٹ تیار کر سکوں۔ میں ایک گریجویٹ تھا۔ میں نے باقاعدہ اناٹومی کا مطالعہ شروع کر دیا اور انسانی جسم کی اوپری ساخت کے بارے میں پوری معلومات حاصل کیں۔ اس مطالعہ میں مجھ کو مزید پانچ سال لگ گئے۔ اس طرح دس سال کی محنت کے بعد یہ ممکن ہوا کہ میں ہر شخص کے جسم سے ٹھیک ٹھیک مطابقت رکھنے والا کوٹ تیار کر سکوں۔ حتیٰ کہ ان لوگوں کا بھی جن میں کبڑاپن یا اور کوئی جسمانی فرق ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کا کوٹ بھی میں اس طرح تیار کر سکتا ہوں کہ کہیں کوئی شکن نہ ہو۔ ہر لحاظ سے ایک موزوں کوٹ تیار کرنے کے لئے بہت سی باتیں بطور خود جاننی پڑتی ہیں۔ کیوں کہ ہر چیز کا ناپ نہیں لیا جا سکتا۔ ایک ٹیلر ماسٹر جسم کے جن حصوں کا ناپ لیتا ہے اگر اس کا علم اتنا ہی ہو تو وہ کبھی ایک معیاری کوٹ تیار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ٹیلر ماسٹر نے اپنے فن کے بارے میں اس طرح کی اور بھی کئی باتیں بتائیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں "تعمیر ملت" کے موضوع پر ایک تجربہ کار آدمی کا لکچر سن رہا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے جو معاشی اور سماجی مسائل ہیں ان میں وہی طریقہ کارآمد ہے جس سے مذکورہ ٹیلر ماسٹر نے کامیابی حاصل کی۔ یعنی لفٹ کے بجائے سیڑھی سے چڑھنا۔ زندگی میں کوئی چھلانگ نہیں۔ یہاں ایسا کوئی بٹن نہیں ہے کہ آپ اس کو دبائیں اور اچانک ایک لفٹ متحرک ہو کر آپ کو اوپر پہنچا دے۔ یہاں تو زینہ بزینہ ہی سفر طے کیا جا سکتا ہے۔ آپ "سیڑھی" کے ذریعہ اپنی زندگی کو کامیاب بنا کر ایک لفٹ خرید سکتے ہیں مگر "لفٹ" کے ذریعہ اپنی زندگی کو کامیاب نہیں بنا سکتے۔

بہتر منصوبہ بندی سے

ایڈمرل ایس۔ این کوہلی (ہندوستانی بحریہ کے سابق چیف) نے نئی دہلی کی ایک تقریر میں کہا کہ کامیابی تمام تر ایک ذہنی چیز ہے۔ اگر آپ کے اندر ارادہ ہے تو آپ اپنے مقصد کی تکمیل کے راستے پالیں گے۔ اور اگر ارادہ نہیں ہے تو آپ یہ کہہ کر بیٹھ جائیں گے کہ "یہ نہیں ہو سکتا" انھوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ ہند۔ پاک جنگ (دسمبر ۱۹۷۱) میں ہندوستانی بحریہ کے پاس جو جنگی جہاز تھے وہ بنیادی طور پر دفاعی کارکردگی (Defensive Role) کے لئے بنائے گئے تھے۔ مگر انھیں جہازوں کو ہم نے اقدامی کارروائی کے لئے استعمال کیا۔ ہم نے کراچی بندرگاہ پر حملہ کیا اور اس میں اتنی شاندار کامیابی حاصل کی کہ فریق ثانی حیران ہو کر رہ گیا۔ اس کامیابی کی وجہ یہ نہ تھی کہ ہم بہتر ساز و سامان سے آراستہ تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ دستیاب ساز و سامان کو ہوشیاری کے ساتھ استعمال کیا گیا:

only that the available equipment was intelligently used

ایڈمرل کوہلی نے جو اصول بتایا وہی اصول فرد کے لئے بھی ہے اور وہی قوم کے لئے بھی۔ کامیابی کا راز ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر اپنے مقصد کے حصول کا پختہ ارادہ ہو اور اس کے بعد وہ یہ کرے کہ اس کے پاس جو وسائل موجود ہیں ان کو پوری احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ اپنے مقصد کو بروئے کار لانے میں لگادے۔

انسان کی ناکامی کا راز بیشتر حالات میں یہ نہیں ہوتا کہ اس کے پاس وسائل نہ تھے۔ بلکہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ممکن وسائل کو صحیح طور پر استعمال نہ کر سکا۔ دیہات میں ایک صاحب نے پختہ گھر بنانے کا ارادہ کیا۔ ان کے وسائل محدود تھے۔ مگر انھوں نے اپنے تعمیری منصوبہ میں اس کا لحاظ نہیں کیا۔ انھوں نے پورے مکان کی نہایت گہری بنیاد کھدوائی، اتنی گہری جیسے کہ وہ قلعہ تیار کرنے جا رہے ہوں۔ ایک شخص نے دیکھ کر کہا: مجھے امید نہیں کہ ان کا گھر مکمل ہو سکے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ان کی بیشتر اینٹ اور مسالا بنیاد میں کھپ گیا اور اوپر کی تعمیر کے لئے ان کے پاس بہت کم سامان رہ گیا۔ بمشکل دیواریں کھڑی ہو سکیں اور ان پر چھت نہ ڈالی جا سکی۔ صرف ایک کمرہ پر کسی طرح چھت ڈال کر انھوں نے اپنے رہنے کا انتظام کیا۔ غیر ضروری طور پر گہری بنیادوں میں اگر وہ اینٹ اور مسالہ ضائع نہ کرتے تو ان کے پاس اتنا سامان تھا کہ مکان پوری طرح مکمل ہو جاتا۔ مگر غلط منصوبہ بندی کی وجہ سے ان کا مکان زمین کے اندر تو پورا بن گیا۔ مگر زمین کے اوپر صرف ادھورا ڈھانچہ کھڑا ہو کر رہ گیا۔

ہمت کے ذریعہ

سیعت اللہ خاں (پیدائش ۱۹۵۲) ایک نوجوان انجینیر ہیں۔ وہ ٹونک (راجستھان) کے ایک شریف خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے گھر کے مالی حالات اچھے نہ تھے۔ ہائر سکنڈری میں انھوں نے سائنس لی تھی مگر اچھے نمبر نہ لا سکے۔ ہائر سکنڈری کا نتیجہ آیا تو اس نے ان کو صرف یہ خبر دی کہ وہ "علم کے دروازہ" میں داخل ہونے کی کوشش میں ناکام ہو چکے ہیں۔

سیعت اللہ خاں بازی ہار چکے تھے مگر وہ ہمت نہیں ہارے تھے۔ ہائر سکنڈری کے امتحان میں ناکامی نے ان کے اندر حوصلہ کا ایک نیا طوفان پیدا کر دیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ گھر کے حالات ان کے لئے مزید تعلیمی جدوجہد کے سلسلہ میں حوصلہ افزا ثابت نہ ہوں گے۔ انھوں نے ایک نئے اقدام کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنا آبائی وطن ٹونک چھوڑ کر بھوپال چلے گئے اور جاتے ہوئے یہ کہہ گئے کہ اب میں ٹونک اسی وقت واپس آؤں گا جب کہ میں انجینیرنگ کی ڈگری حاصل کرلوں۔

سیعت اللہ خاں بھوپال میں اکیلے تھے۔ مگر اکیلے ہو کر انھوں نے اپنے کو زیادہ طاقت ور بنا لیا تھا۔ اب نہ ان کے شاعر دوست تھے جو اپنی "تازہ غزل" سنا کر ان کا وقت چھیننے کی کوشش کریں۔ نہ گھر کے وہ حالات ان کے سامنے تھے جو ان کے ذہن کو مسلسل منتشر کرتے رہتے تھے۔ نہ وہ ماحول تھا جو ان کی ناکامی کو یاد دلا کر ان کے حوصلے پست کر دیتا تھا۔ اب وہ تھے اور ان کی جدوجہد تھی۔ انھوں نے ٹیوشن کے ذریعہ اپنی ضروریات کا انتظام کیا اور خاموشی کے ساتھ تعلیمی محنت میں لگ گئے۔ ہر سہارے کا ٹوٹنا ان کے لئے زیادہ بڑا سہارا بن گیا۔ کیوں کہ اس نے ان کی چھپی ہوئی تمام قوتوں کو جگا دیا تھا۔

سیعت اللہ خاں نے بھوپال میں اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے بے پناہ جدوجہد کی۔ پہلے انھوں نے انجینیرنگ کا ڈپلوما لیا۔ اس کے بعد ان کو بھوپال میں ایک ملازمت مل گئی۔ اب وہ ٹیوشن کی دوڑ دھوپ سے آزاد ہوگئے۔ تاہم انھوں نے تعلیم نہیں چھوڑی۔ ملازمت کے دوران ہی انھوں نے بھوپال سے ۷۰ میل دور ودیشہ کے انجینیرنگ کالج میں داخلہ لیا اور بالآخر وہاں سے انجینیرنگ کی ڈگری حاصل کرلی۔ تقریباً آٹھ سال تک ان کا معمول یہ تھا کہ صبح ۴ بجے اٹھنا دو گھنٹہ ریل کے سفر کے بعد ودیشہ پہنچنا، وہاں کلاس میں حاضری دے کر واپس آنا اور پھر ملازمت کی ڈیوٹی انجام دینا بعد اس سے فراغت کے بعد کورس کی کتابیں پڑھنا۔ اس دوران ان کے گھر میں کئی اتار چڑھاؤ آئے۔ بھوپال کے تقریباً دس سالہ قیام میں ان کو طرح طرح کے خطوط ملتے رہے۔ مگر وہ ہر خط کو پڑھ کر نہایت خاموشی سے رکھ دیتے۔ وہ یکسوئی کے ساتھ ۱۰ سال تک اپنے عہد پر قائم رہے۔ انھوں نے کسی بات کا اثر لئے بغیر اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اپنے لئے کامیاب زندگی حاصل کرنے کی تڑپ نے ان کے اندرونی احساس کو اتنا طاقتور کر دیا کہ تمام ناموافق حالات کے باوجود انھوں نے اپنا سفر جاری رکھا اور بالآخر اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

مشکلیں ہیرو بنا دیتی ہیں

اوہایو اسٹیٹ یونیورسٹی (امریکہ) میں ایک ادارہ ہے جس کا نام ہے آفات وحوادث کی تحقیق کا مرکز (Disaster Research Centre) یہ ادارہ ۱۹۶۳ میں قائم ہوا۔ اب تک اس نے ایک سو سے زیادہ تعداد میں مختلف قسم کی بڑی بڑی انسانی آفتوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اس نے پایا کہ غیر معمولی مشکل مواقع پر انسان کے اندر غیر معمولی طور پر کچھ نئی قوتیں ابھر آتی ہیں جو اس کو حوادث کا شکار ہونے سے بچاتی ہیں۔ مثلاً ۱۹۶۱ میں ٹکساس میں زبردست قسم کا ساحلی طوفان آیا۔ مگر اس طوفان میں اس علاقہ کے صرف آدھے ملین لوگوں نے اپنا مکان چھوڑا۔ ۵۰ فی صد سے زیادہ آبادی اپنے مکانوں میں جمی رہی۔ جب کہ اس طوفان کے آنے کی اطلاع چار دن پہلے دی جا چکی تھی۔ ۱۹۷۱ میں کیلیفورنیا کے زلزلہ میں ایک بہت بڑا ڈیم کمزور ہو گیا جس سے ۷۰ ہزار آبادی کے لئے سنگین خطرہ لاحق ہو گیا۔ مگر ایسے نازک حالات میں اپنے گھروں کو چھوڑ کر جانے والوں کی تعداد صرف ۷ فی صد تھی۔

تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ حادثات کا شکار ہو جانے کے بعد بھی اکثر لوگ پر امید رہتے ہیں۔ ٹیکساس کے دو شہروں میں ہولناک طوفان سے تباہ ہونے والے لوگوں سے ان کے مستقبل کے بارے میں پوچھا گیا۔ ۱۰ فی صد سے بھی کم لوگوں نے مستقبل کے بارے میں کسی اندیشہ کا اظہار کیا بقیہ تمام لوگ تباہی کے باوجود اپنے مستقبل کے بارے میں پرامید تھے۔ حوادث کے بارے میں اپنی لمبی تحقیق کا خلاصہ مذکورہ ادارہ کی رپورٹ میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: واقعات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان مصیبتوں کے مقابلہ میں حیرت انگیز طور پر قابو یافتہ اور لچکدار واقع ہوئے ہیں۔ مصائب کے وقت انسان جس رویہ کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس کو دہشت اور گھبراہٹ کے بجائے ہیروازم کے لفظ سے تعبیر کرنا زیادہ صحیح ہوگا۔

In conclusion, the reality of events suggests that human beings are amazingly controlled and resilient in the face of adversity. Perhaps heroism — not panic or shock — is the right word to describe their most common behaviour in time of disaster.

انسان کو اس کے بنانے والے نے حیرت انگیز طور پر بے شمار صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں۔ انہی میں سے ایک صلاحیت یہ ہے کہ عین بربادی کے کھنڈر میں کھڑا ہو کر بھی وہ ختم نہیں ہوتا بلکہ اپنی نئی تعمیر کا منصوبہ سوچتا ہے اور بہت جلد اپنے نقصانات کی تلافی کر لیتا ہے۔ انسان کے اندر یہ فطری امکان ہم کو بہت بڑا سبق دے رہا ہے۔ کوئی فرد یا قوم اگر کسی حادثہ کا شکار ہو جائے تو اس کو ماتم اور شکایت میں ایک لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ خدا کی دی ہوئی صلاحیت کو بروئے کار لا کر اپنے کو دوبارہ اٹھانے کی کوشش میں لگ جانا چاہئے۔ عین ممکن ہے کہ حالات نے جہاں آپ کی کہانی ختم کر دینی چاہی تھی وہیں سے آپ کی زندگی کے ایک نئے شاندار باب کا آغاز ہو جائے۔

ڈر اس کے لئے علاج بن گیا

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی (۱۹۷۴ - ۱۹۱۳) لکھنؤ میں مطب کرتے تھے۔ انھوں نے علاج معالجے کے فن میں بڑی شہرت حاصل کی۔ ایک مرتبہ ایک مریض ان کے یہاں لایا گیا۔ مریض اتنا موٹا تھا کہ چل نہیں سکتا تھا۔ چھ آدمی اس کو چارپائی پر لٹا کر مطب میں لائے تھے۔ موٹاپے کی وجہ سے اس کا یہ حال تھا کہ وہ معمول کے مطابق سانس نہیں لے سکتا تھا سانس لیتے ہوئے اس کے منھ سے خراٹے جیسی آواز نکلتی تھی۔ چلنا پھرنا بہت پہلے سے بند تھا۔ اب معمولی حرکت بھی اس کے لئے دشوار تھی۔ حتیٰ کہ وہ کروٹ بھی نہیں بدل سکتا تھا۔ ظاہر حالات کے مطابق وہ زندگی کے آخری مرحلہ میں تھا۔ کچھ لوگ دبلے ہو کر مرتے ہیں۔ اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ موت اس کی طرف موٹاپے کی صورت میں آرہی ہے۔

ظاہر ہے کہ مریض مطب کے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر فریدی کو اسے دیکھنے کے لئے باہر آنا پڑا۔ وہ باہر آئے تو مریض کو دیکھتے ہی انھوں نے زور زور سے کہنا شروع کیا —— "اس کو فوراً لے جاؤ۔ اب اس آدمی میں کیا رہ گیا ہے۔ اس کو مشکل سے دو مہینے اور زندہ رہنا ہے۔ اس میں دوا کیا اثر کرے گی۔ اس کو یہاں سے لے جاؤ اور اس کے لئے آگے کا انتظام کرو۔" مریض کے متعلقین جو ساتھ آئے تھے انھوں نے بہت خوشامد کی کہ ڈاکٹر صاحب آپ کم از کم اس کا معائنہ تو کر لیں۔ مگر وہ کسی طرح اس کو ہاتھ لگانے پر تیار نہ ہوئے۔ حتیٰ کہ فیس جو پہلے لی جا چکی تھی وہ بھی اسے لوٹا دی۔ وہ لوگ مایوس ہو کر چلے گئے۔

اس واقعہ کے تقریباً چھ مہینے بعد ایک شخص ڈاکٹر فریدی کے مطب میں داخل ہوتا ہے۔ اس کی عمر ۶۰-۶۵ سال کے درمیان ہے۔ فربہ جسم مگر تندرست اور مطمئن معلوم ہوتا ہے۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ بتا رہی ہے کہ وہ مریض نہیں ہے بلکہ صرف ملاقات کے لئے آیا ہے۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے طنز کے انداز میں کہا: ڈاکٹر صاحب میں وہی شخص ہوں جس کو آپ نے دو مہینے میں مرجانے کی پیشین گوئی کی تھی۔ جس کے دوبارہ اچھے ہونے سے آپ اتنا مایوس تھے کہ آپ نے اس کا معائنہ کئے بغیر اس کو اپنے مطب سے لوٹا دیا تھا۔

بظاہر ڈاکٹر صاحب کا جواب یہ ہونا چاہئے تھا کہ معاف کرنا۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ وہ میرا ایک اندازہ تھا اور ڈاکٹر کا اندازہ کبھی صحیح ہوتا ہے اور کبھی غلط۔ مگر وہاں ایسا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب آدمی کی رپورٹ سنتے ہی ہنس پڑے اور کہا: اسی لئے تو تم اچھے ہو گئے کہ میں نے دیکھے بغیر تم کو لوٹا دیا تھا۔ جب دو مہینے تک ہر روز تم کو اپنی زندگی کا ایک دن کم ہوتا نظر آیا تو تم ڈر کی وجہ سے دبلے ہونے لگے۔ یہی تمھارا علاج تھا۔ اب میری وہ فیس لاؤ جو میں نے اس وقت اس غرض سے واپس کر دی تھی کہ تمھارا ڈر اور زیادہ ہو جائے۔" ڈاکٹر صاحب کی زبان سے یہ بات سن کر آدمی بہت حیران ہوا۔ اس نے ڈاکٹر صاحب کے پیر چھو کر اس بات کا اقرار کیا کہ واقعہ ایسا ہی ہے۔ کسی دوا کے استعمال کے بغیر وہ محض ڈر اور گھبراہٹ کی وجہ سے دبلا ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کا غیر ضروری موٹاپا ختم ہو گیا اور وہ تندرست ہو کر اپنا کام کرنے لگا۔

پرستش کی قسمیں

پرستش کسی صورت کا نام نہیں بلکہ پرستش ایک حقیقت کا نام ہے۔ کسی چیز سے سب سے زیادہ لگاؤ، کسی چیز کی برتری کا اتنا غلبہ کہ اس کے مقابلہ میں دوسری تمام چیزیں غیر اہم بن جائیں، یہی پرستش ہے اور اس اعتبار سے آدمی جس چیز کو اپنی زندگی میں شامل کرے وہ اس کی پرستش کر رہا ہے۔ خواہ وہ زبان سے کسی دوسری چیز کے پرستار ہونے کا اقرار کرتا ہو۔

جب آدمی ایک شخص کو یہ مقام دیتا ہے کہ اس کے آگے اس کی گردن جھک جائے تو وہ اس کی پرستش کرتا ہے۔ جب آدمی اپنے ایک فائدہ کو یہ اہمیت دیتا ہے کہ اس کی خاطر وہ دوسری تمام چیزوں کو نظر انداز کر دے تو وہ اس کی پرستش کرتا ہے۔ جب آدمی مال کو اس قابل سمجھتا ہے کہ وہ اس سے اپنی امیدیں اور تمنائیں وابستہ کرے تو وہ اس کی پرستش کرتا ہے۔

اسی طرح جب آدمی ایک رواج کو یہ حیثیت دیتا ہے کہ ہر دوسرے تقاضے سے بے پروا ہو کر وہ اس کو پورا کرے تو وہ رواج کی پرستش کرتا ہے۔ جب آدمی کسی کے خلاف ابھرنے والے نفسانی جذبات سے اتنا مغلوب ہوتا ہے کہ ہر دوسری چیز کو نظر انداز کرکے اس کو اپنے انتقامی جذبات کا نشانہ بناتا ہے تو وہ اپنے نفس کی پرستش کرتا ہے۔ جب آدمی معیار زندگی کے مسئلہ سے اتنا مرعوب ہوتا ہے کہ اپنے وقت اور کمائی کو تمام تر اپنے دنیوی معیار کو بڑھانے میں لگا دیتا ہے تو وہ معیار زندگی کی پرستش کرتا ہے۔ جب آدمی جاہ و مرتبہ کا اتنا حریص ہوتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ دے کر اپنے کو اونچا اٹھانا چاہتا ہے تو وہ جاہ کی پرستش کرتا ہے ــــــ دنیا میں آدمی کا امتحان یہ ہے کہ ہر اعتبار سے وہ صرف ایک خدا کی پرستش کرے، پرستش میں اس کے ساتھ کسی بھی دوسری چیز کو شریک نہ کرے۔ اس کا لگاؤ، اس کا احترام، اس کی وابستگی، اس کا جھکنا، سب کچھ سب سے زیادہ صرف اللہ کے لئے ہو جائے۔

جیسا بونا ویسا کاٹنا

کاٹنے کے دن وہی آدمی کھیتی کاٹتا ہے جس نے کاٹنے کا دن آنے سے پہلے کھیتی کی ہو اور وہی چیز کاٹتا ہے جو اس نے اپنے کھیت میں بوئی تھی۔ یہی معاملہ آخرت کا بھی ہے۔ آخرت میں ہر شخص کو وہی فصل ملے گی جو اس نے موت سے پہلے دنیا میں بوئی تھی۔ جو شخص حسد و عداوت اور ظلم و خود پرستی کے طریقوں پر چلتا رہا وہ گویا اپنی زمین میں کانٹے دار درخت کا بیج بو رہا ہے ایسا شخص آخرت میں کانٹے دار پھل پائے گا۔ اس کے برعکس جو شخص انصاف اور خیر خواہی اور اعترافِ حق کا طریقہ اختیار کرے وہ گویا خوشبو دار درخت کا بیج بو رہا ہے۔ ایسا شخص آخرت میں خوشبو دار پھلوں کا وارث بنے گا۔

آدمی دنیا میں سرکشی دکھاتا ہے پھر بھی یہ خیال کرتا ہے کہ آخرت میں وہ خدا کے فرماں بردار بندوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ وہ دنیا میں تخریبی سرگرمیوں میں مشغول رہتا ہے پھر بھی یہ سمجھتا ہے کہ وہ آخرت کے تعمیری نتائج میں اپنا حصہ پائے گا۔ وہ دنیا میں الفاظ کے اوپر اپنی زندگی کھڑی کرتا ہے پھر بھی یہ یقین رکھتا ہے کہ آخرت میں حقائق کی صورت میں اس کا انجام اس کی طرف لوٹے گا۔ اس کے پاس خدا کا پیغام آتا ہے مگر وہ اس کو نہیں مانتا پھر بھی وہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کے مقبول بندوں میں شامل کیا جائے گا۔

خدا انسان کو جنت کی طرف بلا رہا ہے جو ابدی آرام اور خوشیوں کی جگہ ہے۔ مگر وہ چند دن کی جھوٹی لذتوں میں کھویا ہوا ہے، وہ خدا کی پکار کی طرف نہیں دوڑتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں حاصل کر رہا ہوں حالانکہ وہ صرف کھو رہا ہے۔ دنیا میں مکان بنا کر وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی زندگی کی تعمیر کر رہا ہوں حالاں کہ وہ صرف ریت کی دیواریں کھڑی کر رہا ہے جو صرف اس لئے بنتی ہیں کہ بننے کے بعد ہمیشہ کے لئے گر پڑیں۔

خدا کے فرشتے

خدا نے اپنی قدرت خاص سے جو مخلوقات پیدا کی ہیں انھیں میں سے اس کی وہ نورانی مخلوق ہے جس کو فرشتہ کہا جاتا ہے۔ یہ فرشتے بے شمار تعداد میں ہیں۔ وہ کائنات کے ہر گوشے میں خدا کے احکام پہنچاتے رہتے ہیں اور خدا کے حکم کے تحت اس کی وسیع سلطنت کا انتظام کر رہے ہیں۔

فرشتے خدا کے حد درجہ وفادار کارندے ہیں جو اس کے حکم کے تحت موجودات کے پورے کارخانے کو چلاتے ہیں۔ زمین، سورج اور ستارے مسلسل حرکت کرتے ہیں مگر ان کی رفتار میں کروروں سال کے اندر بھی کوئی فرق نہیں آتا۔ پانی اور بارش کا ایک زبردست نظام ہے جو زمین کے اوپر اربوں سال سے جاری ہے۔ زمین کی سطح پر ہر آن طرح طرح کے درخت اور پودے نکل رہے ہیں۔ انسان اور دوسرے زندہ اجسام روزانہ پیدا ہوتے ہیں اور زمین پر اپنا رزق حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح کے ان گنت واقعات جو دنیا میں بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہے ہیں وہ کیوں کر ہو رہے ہیں۔ خدا کے رسولوں نے بتایا کہ یہ سب کا سب ایک خدائی نظام ہے جس کو وہ اپنے غیبی فرشتوں کے ذریعہ چلا رہا ہے۔ خدا اور اس کی دوسری مخلوقات کے بیچ میں فرشتے ایک قسم کا درمیانی وسیلہ ہیں جن کے ذریعہ خدا اپنی تمام مخلوقات پر اپنے حکموں کا نفاذ کرتا ہے۔ اسی طرح یہ فرشتے خدا کے پیغمبروں تک خدا کا کلام پہنچاتے ہیں۔ وہ انسانوں کے اعمال کا ریکارڈ تیار کر رہے ہیں۔ ان کے ذریعہ خدا افراد اور قوموں پر اپنا انعام اتارتا ہے اور ان کو سزائیں دیتا ہے۔ فرشتے انسان کی روح قبض کرتے ہیں۔ انھیں فرشتوں کے ذریعہ وہ صور پھونکا جائے گا جو تمام عالم کو درہم برہم کر دے گا اور پھر کچھ لوگ جنت میں جگہ پائیں گے اور کچھ لوگ جہنم میں۔

اتحاد کی طاقت

کسی شخص نے کبھی یہ نہیں سنا ہوگا کہ سورج کی گرمی سے کاغذ جل گیا۔ حالاں کہ سورج کی گرمی اتنی زیادہ ہے کہ کاغذ تو کیا پورا کا پورا پہاڑ بلکہ سارا کرۂ ارض اس طرح جل سکتا ہے جیسے کسی بھڑکتے ہوئے تنور میں ایک تنکا۔ مگر یہی سورج جس کی گرمی اتنی زیادہ ہے کہ بڑے بڑے جنگلوں اور پہاڑوں کو پھونک سے اڑادے وہ موجودہ حالت میں ایک تنکے کو بھی جلانے پر قادر نہیں ہے، ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سورج کی شعاعیں لاکھوں کروروں میل کے دائرے میں بکھری ہوئی ہیں۔ اس انتشار کی وجہ سے کسی ایک چیز پر بیک وقت اس کی شعاعیں اتنی مقدار میں نہیں پڑتیں کہ وہاں وہ اتنی گرمی پیدا کرسکیں جو کسی چیز کو جلانے کے لئے ضروری ہے۔ حالاں کہ یہی بکھری ہوئی شعاعیں اگر سمیٹ دی جائیں تو وہ خوفناک الاؤ کی شکل میں بھڑک سکتی ہیں۔

آفتابی چولھا سورج کی شعاعوں کے اسی قسم کے ارتکاز کا نام ہے۔ بکھری ہوئی شعاعوں کو ایک خاص دائرے میں سمیٹ دینے کی وجہ سے اس جگہ اتنی گرمی پیدا ہوجاتی ہے کہ کھانا پکنے لگتا ہے۔ آفتابی چولھا تو ابھی بہت کم رائج ہوسکا ہے مگر آتشیں شیشہ (Burning Glass) ایک ایسی چیز ہے جو اکثر اشخاص نے کبھی نہ کبھی دیکھا ہوگا۔ آتشیں شیشہ کیا ہے۔ یہ ایک محدب یا کروی عدسہ (Convex Lens) ہے جس سے کاغذ یا دوسری آتش پذیر چیزوں میں آگ لگائی جاسکتی ہے۔ عام حالات میں کاغذ پر سورج کی جو شعاعیں پڑتی ہیں، وہ اتنی زیادہ گرمی نہیں پیدا کرسکتیں کہ اس میں آگ لگ جائے۔ مگر انھیں شعاعوں کو جب مجتمع کردیا جاتا ہے تو وہ شعلہ کی مانند بھڑک اٹھتی ہیں۔ کوئی بھی شخص تجربہ کرکے معلوم کرسکتا ہے کہ لنس ان شعاعوں کو طاقت ور بنانے کے لئے کیا کرتا ہے، ذیل کے نقشہ میں شعاعیں آتشیں شیشہ سے گزر کر مڑ رہی ہیں۔

بکھری ہوئی شعاعیں ایک نقطہ پر جمع ہوکر طاقت ور ہوجاتی ہیں
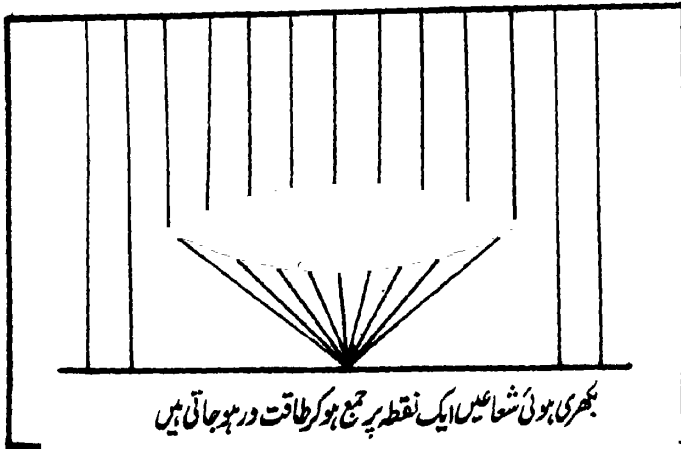
اس نقشہ کے مطابق آتشیں شیشہ کا تمام تر عمل صرف یہ ہے کہ وہ ان شعاعوں کو جمع کرے جو لنس کے پورے دائرے میں پڑ رہی ہیں اور ان کو اس طرح موڑے یا منعطف کر دے کہ وہ سب اکٹھا ہو کر ایک محدود رقبہ پر پڑنے لگیں۔ سورج کی شعاعوں کا یہ اجتماع اس محدود رقبہ میں اتنی حرارت پیدا کر دیتا ہے کہ کاغذ جلنے لگتا ہے۔

یہ مثال میں نے یہ واضح کرنے کے لئے دی ہے کہ انتشار اور اجتماع میں کیا فرق ہے۔ ایک ہی چیز اگر منتشر حالت میں ہو تو وہ بے وزن ہے۔ لیکن اگر اسے اکھٹا کر دیا جائے تو اتنی زبردست طاقت بن سکتی ہے جس کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہندستان کے مسلمان اس وقت جس کمزوری کی حالت میں اپنے آپ کو محسوس کرتے ہیں وہ حقیقۃً اتنے کمزور نہیں ہیں، یہ کمزوری ان کے انتشار کی پیدا کردہ ہے۔ اگر وہ اپنے درمیان اجتماعیت کا آتشیں شیشہ فراہم کر لیں اور انفرادی طور پر بکھری ہوئی شعاعوں کو ایک مقام پر مجتمع کر دیں تو یکایک وہ دیکھیں گے کہ جو شعاعیں الگ الگ ہونے کی صورت میں تنکا جلانے کے لئے بھی ناکافی نظر آتی تھیں، انھیں کی گرمی سے شہتیر بھڑک اٹھا ہے۔ ہماری موجودہ تعداد اور موجودہ ذرائع و وسائل جو منفرد طور پر بالکل بے قیمت نظر آتے ہیں، یہی تعداد اور یہی ذرائع کروروں گنا زیادہ اہمیت اختیار کر لیں گے۔ آج ہر مسلمان اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اس وقت ہر شخص اپنے کو ایک پوری قوم کی مانند سمجھنے لگے گا۔ اور جب ایسا ہو گا تو دوسرے بھی ہم کو اسی نظر سے دیکھیں گے جیسا کہ فی الواقع ہم اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد دس کروڑ بتائی جاتی ہے۔ یہ دس کروڑ افراد گویا دس کروڑ دھاگے ہیں، اگر وہ الگ الگ ہوں تو کوئی شخص بھی انھیں باری باری توڑ سکتا ہے۔ لیکن یہی دس کروڑ دھاگے اگر بل جائیں تو وہ اتنا مضبوط رسا بن جائیں گے جنھیں ایک ہاتھ تو کیا سیکڑوں ہاتھ بھی توڑنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ جو چیز الگ سے دیکھنے میں محض ایک دھاگا ہے وہ اتحاد کی برکت سے موٹے رسے کا مقام حاصل کرے گی۔ قطرہ سمندر میں ہو تو وہ سمندر ہے اور باہر ہو تو وہ قطرہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ اتحاد اور اجتماعیت موجودہ حالات میں مسلمانوں کی شدید ترین ضرورت ہے۔ اس کے بغیر حالات کے سدھار کے لئے کوئی مؤثر کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اصلاح حال کی ہر تجویز اپنی کامیابی کے لئے یہ چاہتی ہے کہ مسلمان ایک نقطہ پر جمع ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ ذرائع و وسائل اس کے لئے مہیا ہو سکیں، زیادہ سے زیادہ حمایت کے ساتھ اس کو مؤثر بنایا جا سکے، جب وہ دنیا کے سامنے آئے تو لوگوں کو وہ زیادہ سے زیادہ وقیع اور باوزن معلوم ہو۔

کوئی بھی اجتماعیت، خواہ وہ کتنے ہی ہلکے درجہ کی ہو، بہرحال قربانی چاہتی ہے ——— وقت کی قربانی، رائے کی قربانی، حیثیت کی قربانی، ذاتی مفادات کی قربانی۔ کبھی ایسا ہو گا کہ ذاتی دائرہ میں آپ کو محسوس ہو گا کہ آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے، مگر قوم کو اس کی ضرورت ہو گی، کبھی اپنی رائے کو محض اس لئے

چھوڑنا ہوگا کہ دوسروں کو آپ اس کا قائل نہیں کر سکے اور اشتراک کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ آپ اپنا رائے سے عملی طور پر دست بردار ہو جائیں۔ کبھی آپ دیکھیں گے کہ اجتماعی ڈھانچہ میں آپ کی حیثیت گھٹ رہی ہے مگر اس کے باوجود ڈھانچہ کو برقرار رکھنے کے لئے آپ اپنی حیثیت کو نظرانداز کر دیں گے۔ کبھی اجتماعی تقاضے آپ کے ذاتی مفادات کو متاثر کرنے لگیں گے۔ ضرورت پکارے گی کہ اس وقت اپنا سرمایہ ذاتی خواہش میں نہیں بلکہ قوم کے کام میں لگاؤ اور آپ اس پکار کو لبیک کہیں گے، کبھی ذاتی اور خاندانی مصالح پر قوم کی مصالح کو ترجیح دینا ہو گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک ایسے معاشرہ میں یہ اجتماعیت قائم نہیں ہو سکتی جہاں صدارت اور نظامت حاصل کرنے کے لئے رسہ کشی ہوتی ہو۔ جہاں قوم کے پڑھے لکھے لوگ محض بیرونی ملکوں کی سیاحت کی قیمت پر اس کے لئے راضی ہو جائیں کہ وہ باہر جاکر قوم کی غلط نمائندگی کریں۔ جس کے افراد کو محض ایک اچھا عہدہ دے کر خریدا جا سکتا ہو، جہاں ایک مسلم گروہ دوسرے مسلم گروہ کو شکست دینے کے لئے قوم کے دشمنوں سے مل جاتا ہو، جہاں یہ حال ہو کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے خفا ہو تو پولیس کے دفتر میں اس کے خلاف مخبری کرنے پہنچ جائے۔ جہاں نظر آئے کہ کچھ لوگ ایک ملی کام کے لئے اٹھیں تو بقیہ لوگ اس کا تعاون کرنے کے بجائے یہ سوچنے لگیں کہ کہیں یہ میدان پر قابض نہ ہو جائیں اور فوراً اسی کام کے لئے ایک اور علیحدہ تنظیم قائم کر کے لوگوں کو اپنی طرف بلانا شروع کر دیں۔ جہاں ملت کی ضروریات، خدمت کرنے کا میدان نہ ہوں بلکہ لیڈری حاصل کرنے کا سستا ذریعہ بن جائیں۔ جہاں لوگ اجتماعی احساس سے اس قدر ناآشنا ہوں کہ اختلافات پر گالی گلوج ہونے لگے اور ترک کلام کی نوبت آجائے۔ جہاں لوگوں کی سطحیت کا عالم یہ ہو کہ اتحاد کے بجائے اختلاف کے اجزار ڈھونڈتے ہوں، جہاں گروہ بندی اس شدت کو پہنچی ہوئی ہو کہ اپنے دائرہ سے باہر نہ کسی حق کو تسلیم کریں اور نہ اپنے سوا کسی کو کام کرنے کا اہل سمجھتے ہوں۔ جہاں پستی کا یہ عالم ہو جہاں اجتماعی اوصاف کی اس درجہ کمی ہو وہاں تمام لوگ آخر ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع کس طرح ہوں گے ——— حقیقت یہ ہے کہ اس وقت سب سے ضروری کام یہ ہے کہ قوم کو اخلاقی پستی سے نکالا جائے اور اس کے اندر اجتماعی احساس پیدا کیا جائے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ہمارے اندر کوئی اجتماعیت برپا ہو سکے۔

اتحاد اور اجتماعیت کے بغیر ہمارا کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اور اتحاد اور اجتماعیت ایسی چیز ہے جو پوری طرح ہمارے بس میں ہے۔ وہ کسی بھی طرح ہمارے لئے ناممکن نہیں۔ بقیہ تمام چیزوں کے لئے دوسروں کو بدلنا پڑتا ہے۔ جب کہ اتحاد قائم کرنے کے لئے ہمیں صرف اپنے آپ کو بدلنا ہے۔ اب اگر ایک ایسے امکان کو بھی ہم حاصل نہیں کرتے جو خود ہمارے اپنے بس میں ہو تو تاریخ ہم کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ مستقبل کا مورخ یقیناً ہم کو مجرم ٹھہرائے گا، خواہ اپنے طور پر ہم دوسروں کو اپنی مصیبت کا ذمہ دار سمجھتے ہوں۔

(ماہنامہ الفرقان جمادی الثانی ۱۳۸۴ھ)

ے ایمان والو، تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ جلد ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے
ور اللہ ان کو محبوب ہوگا۔ وہ مسلمانوں کے لئے نرم اور کافروں کے اوپر سخت ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد
ریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عطا
رتا ہے۔ اور اللہ وسعت والا اور علم والا ہے۔ تمہارے دوست تو بس اللہ اور اس کا رسول اور وہ ایمان والے
ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے
رسول اور ایمان والوں کو دوست بنائے تو بے شک اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے ۵۴-۵۶

ایمان لانے کے بعد جو شخص ایمان کے تقاضے پورے نہ کرے وہ اللہ کی نظر میں دین کو قبول کرنے کے بعد دین سے پھر گیا۔ اللہ کی نظر میں سچے ایمان والے لوگ وہ ہیں جن کے اندر ایمان اس طرح داخل ہو کہ ان کو محبت کی سطح پر اللہ سے تعلق پیدا ہو جائے۔ ان کو اسلامی مقاصد کی تکمیل اتنی عزیز ہو کہ جو لوگ اسلام کی راہ میں ان کے بھائی بنیں ان کے لئے ان کے دل میں نرمی اور ہمدردی کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہے۔ وہ مسلمانوں کے لئے اس درجہ شفیق بن جائیں کہ ان کی طاقت اور ان کی صلاحیت کبھی مسلمانوں کے مقابلہ میں استعمال نہ ہو۔ وہ دین کے کے معاملہ میں اتنے پختہ ہوں کہ غیر اسلامی لوگوں کے افکار و اعمال سے کوئی اثر قبول نہ کریں۔ ان کے جذبات اس درجہ صول کے تابع ہو جائیں کہ مسلمانوں کے لئے وہ پھول سے زیادہ نازک ثابت ہوں مگر نا مسلمانوں کے لئے وہ پتھر سے زیادہ سخت بن جائیں۔ کوئی نا مسلمان کبھی ان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال نہ کر سکے۔

اسلامی زندگی ایک بامقصد زندگی ہے اور اسی لئے وہ جدوجہد کی زندگی ہے۔ مسلمان کا مشن یہ ہے کہ وہ اللہ کے دین کو اللہ کے تمام بندوں تک پہنچائے۔ جہنم کی طرف جاتی ہوئی دنیا کو جنت کے راستہ پر لانے کی کوشش کرے۔ اس کام کے فطری تقاضے کے طور پر آدمی کے سامنے طرح طرح کی مشکلیں اور طرح طرح کی ملامتیں پیش آتی ہیں۔ حتیٰ کہ دو الگ الگ گروہ بن جاتے ہیں۔ ایک دنیا پرستوں کا اور دوسرا آخرت کے مسافروں کا۔ ان کے درمیان ایک مستقل کش مکش شروع ہو جاتی ہے۔ آدمی کا امتحان یہ ہے کہ ان سارے مواقع پر وہ اس انسان کا ثبوت دے جو اللہ کے بھروسہ پر چل رہا ہے اور اللہ کے سوا کسی کی پروا کئے بغیر اپنا اسلامی سفر جاری رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ موت کے دروازہ میں داخل ہو کر خدا کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

اس طرح کے لوگ کسی مقام پر جب قابل لحاظ تعداد میں پیدا ہو جائیں تو زمین کا غلبہ بھی انھیں کے لئے مقدر کر دیا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں۔ یعنی ان کا مرکز توجہ تمام تر اللہ بن جاتا ہے۔ وہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ یعنی ان کے باہمی تعلقات ایک دوسرے کی خیر خواہی پر قائم ہوتے ہیں، وہ اللہ کے آگے جھکنے والے ہوتے ہیں۔ یعنی معاملات دنیا میں کوئی بھی چیز ان کو انانیت پر آمادہ نہیں کرتی بلکہ وہ ہر موقع پر وہی کرتے ہیں جو اللہ چاہے۔ وہ تواضع اختیار کرنے والے ہوتے ہیں نہ کہ سرکشی کرنے والے۔

اے ایمان والو، ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جنھوں نے تمھارے دین کو مذاق اور کھیل بنالیا ہے، ان لوگوں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی اور نہ کافروں کو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اگر تم ایمان والے ہو۔ اور جب تم نماز کے لئے پکارتے ہو تو وہ لوگ اس کو مذاق اور کھیل بنالیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔ کہو کہ اے اہل کتاب، تم ہم سے صرف اس لئے ضد رکھتے ہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور اس پر جو ہم سے پہلے اترا۔ اور تم میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں۔ کہو کیا میں تم کو بتاؤں وہ جو اللہ کے یہاں انجام کے اعتبار سے اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ وہ جس پر خدا نے لعنت کی اور جس پر اس کا غضب ہوا۔ اور جن میں سے بندر اور سور بنادئے اور انھوں نے شیطان کی پرستش کی۔ ایسے لوگ مقام کے اعتبار سے بدتر اور راہ راست سے بہت دور ہیں ۵۷-۶۰

وہ لوگ جو خود ساختہ دین کی بنیاد پر خدا پرستی کے اجارہ دار بنے ہوئے ہوں ان کے درمیان جب سچے اور بے آمیز دین کی دعوت اٹھتی ہے تو اس کے خلاف وہ اتنی شدید نفرت میں مبتلا ہوتے ہیں کہ اپنی معقولیت تک کھو بیٹھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایسی چیزیں جو بلا اختلاف قابل احترام ہیں ان کا بھی مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ یہی مدینہ کے یہود کا حال تھا۔ چنانچہ وہ مسلمانوں کی اذان کا مذاق اڑانے سے بھی نہیں رکتے تھے۔ جو لوگ اتنے بے حس اور اتنے غیر سنجیدہ ہوجائیں ان سے ایک مسلمان کا تعلق دعوت کا تو ہوسکتا ہے مگر دوستی کا نہیں ہوسکتا۔

ان لوگوں کی خدا سے بے خوفی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ سچے مسلمانوں کو مجرم سمجھتے ہیں اور اپنے تمام جرائم کے باوجود اپنے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کا معاملہ خدا کے یہاں بالکل درست ہے۔ جب وہ اپنی اس کیفیت کی اصلاح نہیں کرتے تو بالآخر ان کی بے حسی ان کو اس نوبت تک پہنچاتی ہے کہ ان کی عقل حق و باطل کے معاملہ میں کند ہوجاتی ہے۔ وہ شکل کے اعتبار سے انسان مگر باطن کے اعتبار سے بدترین جانور بن جاتے ہیں۔ وہ لطیف احساسات جو آدمی کے اندر خدا کے چوکیدار کی طرح کام کرتے ہیں، جو اس کو برائیوں سے روکتے ہیں وہ ان کے اندر ختم ہوجاتے ہیں۔ مثلاً حیاء، شرافت، وسعت ظرف، پاکیزہ طریقوں کو پسند کرنا، وغیرہ۔ اس گراوٹ کا آخری درجہ یہ ہے کہ آدمی کی پوری زندگی شیطانی راستوں پر چل پڑے۔ جب کوئی گروہ اس نوبت کو پہنچتا ہے تو وہ لعنت کا مستحق بن جاتا ہے، وہ خدا کی رحمت سے آخری حد تک دور ہوجاتا ہے۔ اس کی انسانیت مسخ ہوجاتی ہے وہ فطرت کے سیدھے راستہ سے بھٹک کر جانوروں کی طرح جینے لگتا ہے۔

انسان کو اپنی خواہشوں کے پیچھے چلنے سے جو چیز روکتی ہے وہ عقل ہے۔ مگر جب آدمی پر ضد اور عداوت کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کی عقل اس کی خواہش کے نیچے دب کر رہ جاتی ہے۔ اب وہ ظاہر میں انسان مگر باطن میں حیوان ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ صاحب بصیرت آدمی اس کو دیکھ کر جان لیتا ہے کہ اس کے ظاہری انسانی ڈھانچہ کے اندر کون سا حیوان چھپا ہوا ہے۔

اور جب وہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ وہ کافر آئے تھے اور کافر ہی چلے گئے۔ اور اللہ خوب جانتا ہے اس چیز کو جسے وہ چھپا رہے ہیں۔ اور تم ان میں سے اکثر کو دیکھو گے کہ وہ گناہ اور ظلم اور حرام کھانے پر دوڑتے ہیں۔ کیسے برے کام ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔ ان کے مشائخ اور علماء ان کو کیوں نہیں روکتے گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے۔ کیسے برے کام ہیں جو وہ کر رہے ہیں ۶۳-۶۱

مدینہ کے یہودیوں میں کچھ لوگ تھے جو اسلام سے ذہنی طور پر مرعوب تھے۔ نیز اسلام کا بڑھتا ہوا غلبہ دیکھ کر کھلم کھلا اس کا حریف بننا بھی نہیں چاہتے تھے۔ یہ لوگ اگرچہ اندر سے اپنے آبائی دین پر جمے ہوئے تھے مگر الفاظ بول کر ظاہر کرتے تھے کہ وہ بھی مومن ہیں۔ ایسے لوگ بھول جاتے ہیں کہ اصل معاملہ کسی انسان سے نہیں بلکہ خدا سے ہے۔ اور خدا وہ ہے جو دلوں تک کا حال جانتا ہے۔ وہ کسی سے جو معاملہ کرے گا حقیقت کے اعتبار سے کرے گا نہ کہ ان الفاظ کی بنا پر جو اس نے مصلحت کے طور پر اپنے منھ سے نکالا تھا۔

یہود کے خواص میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک ربّی جن کو مشائخ کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے احبار جو اُن کے علماء اور فقہاء کی مانند تھے۔ دونوں قسم کے لوگ اگرچہ دین ہی کو اپنا صبح و شام کا مشغلہ بنائے ہوئے تھے۔ دین کے نام پر ان کی قیادت قائم تھی اور دین ہی کے نام پر ان کو بڑی بڑی رقمیں ملتی تھیں۔ مگر ان کی قیادت و مقبولیت کا راز عوام پسند دین کی نمائندگی تھی نہ کہ خدا پسند دین کی نمائندگی۔ ان کا بولنا اور ان کا چلنا بظاہر دین کے لئے تھا۔ مگر حقیقۃً وہ ایک قسم کی دنیاداری تھی جو دین کے نام پر جاری تھی۔ وہ دین کے نام پر لوگوں کو وہی چیز دے رہے تھے جس کو وہ دین کے بغیر اپنے لئے پسند کئے ہوئے تھے۔

خدا کا پسندیدہ دین تقویٰ کا دین ہے۔ یعنی یہ کہ آدمی لوگوں کے درمیان اس طرح رہے کہ اس کی زبان گناہ کے کلمات نہ بولے، وہ اپنی سرگرمیوں میں حرام طریقوں سے پوری طرح بچتا ہو۔ جن لوگوں سے اس کا معاملہ پیش آئے ان کے ساتھ وہ انصاف کرنے والا ہو نہ کہ ظلم کرنے والا۔ مگر آدمی کا نفس ہمیشہ اس کو دنیا پرستی کے راستہ پر ڈال دیتا ہے۔ وہ ایسی زندگی گزارنا چاہتا ہے جس میں اس کو صحیح اور غلط نہ دیکھنا ہو بلکہ صرف اپنے فائدوں اور مصلحتوں کو دیکھنا ہو۔ یہود کے عوام اسی حالت پر تھے۔ اب ان کے خواص کا کام یہ تھا کہ وہ ان کو اس سے روکتے۔ مگر انھوں نے عوام سے ایک خاموش مفاہمت کر لی۔ وہ عوام کے درمیان ایسا دین تقسیم کرنے لگے جس میں اپنی حقیقی زندگی کو بدلے بغیر نجات کی ضمانت ہو اور بڑے بڑے درجات طے ہوتے ہوں۔ یہ خواص اپنے عوام کی حقیقی زندگیوں کو نہ چھیڑتے البتہ ان کو ملت یہود کی فضیلت کے جھوٹے قصے سناتے۔ ان کے قومی ہنگاموں کو دین کے رنگ میں بیان کرتے۔ رسمی قسم کے اعمال دہرا دینے پر یہ بشارت دیتے کہ ان کے ذریعہ سے ان کے لئے جنت کے محل تعمیر ہو رہے ہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ بہت برا کام ہے کہ لوگوں کے درمیان ایسا دین تقسیم کیا جائے جس میں حقیقی عملی زندگی کو بدلنا نہ ہو، البتہ کچھ نمائشی چیزوں کا اہتمام کر کے جنت کی ضمانت مل جائے

اور یہود کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ انھیں کے ہاتھ بندھ جائیں اور لعنت ہو ان کو اس کہنے پر۔ بلکہ خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔ اور تمھارے اوپر تمھارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ اترا ہے وہ ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی اور انکار کو بڑھا رہا ہے۔ اور ہم نے ان کے درمیان دشمنی اور کینہ قیامت تک کے لئے ڈال دیا ہے۔ جب کبھی وہ لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں خدا اس کو بجھا دیتا ہے۔ اور وہ زمین میں فساد پھیلانے میں سرگرم ہیں۔ حالاں کہ اللہ فساد برپا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا　۶۴

قرآن میں جب اللہ کی راہ میں خرچ کرنے پر زور دیا گیا اور کہا گیا کہ اللہ کو قرض حسن دو تو یہود نے اس کو مذاق کا موضوع بنا لیا۔ وہ کہتے کہ اللہ فقیر ہے اور اس کے بندے امیر ہیں۔ اللہ کے ہاتھ آج کل تنگ ہو رہے ہیں۔ ان کی اس قسم کی باتوں کا رخ خدا کی طرف نہیں بلکہ رسول اور قرآن کی طرف ہوتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ خدا اس سے برتر ہے کہ اس کے یہاں کسی چیز کی کمی ہو۔ اس طرح کی باتیں وہ دراصل یہ ظاہر کرنے کے لئے کہتے تھے کہ رسول سچا رسول نہیں۔ اور قرآن خدا کی کتاب نہیں۔ اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے ہوتا تو (نعوذ باللہ) ایسی مضحکہ خیز باتیں اس میں نہ ہوتیں۔ مگر جو لوگ اس قسم کی باتیں کریں وہ صرف یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ حقیقی دینی جذبہ سے خالی ہیں، وہ بے حسی کی سطح پر جی رہے ہیں۔

موجودہ امتحانی دنیا میں انسان کو عمل کی آزادی ہے۔ یہاں ایک شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ "قرآن خدا کی کتاب ہے" اور اگر کوئی شخص یہ کہنا چاہے کہ "قرآن ایک بناوٹی کتاب ہے"، تو اس کو بھی اپنی بات کہنے کے لئے الفاظ مل جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں آدمی ایک واقعہ سے ہدایت پکڑ سکتا ہے اور اسی واقعہ سے دوسرا آدمی سرکشی کی غذا بھی لے سکتا ہے۔

یہود نے جب قرآن کی ہدایت کو ماننے سے انکار کیا تو وہ سادہ معنوں میں محض انکار نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے ان کا یہ زعم شامل تھا کہ ہم تو نجات یافتہ لوگ ہیں، ہمیں کسی اور ہدایت کو ماننے کی کیا ضرورت۔ جو لوگ اس قسم کی پُر فخر نفسیات میں مبتلا ہوں ان کے اندر شدید ترین قسم کی انانیت جنم لیتی ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں جب ان کا معاملہ دوسروں سے پڑتا ہے تو وہاں بھی وہ اپنی "میں" کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورا معاشرہ آپس کے اختلاف اور عناد کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔

پیغمبر کی دعوت یہ ہوتی ہے کہ آدمی بھی اسی اطاعت خداوندی کے دین کو اپنائے جس کو کائنات کی تمام چیزیں اپنائے ہوئے ہیں۔ یہی زمین کی اصلاح ہے۔ اب جو لوگ پیغمبرانہ دعوت کی راہ میں رکاوٹ ڈالیں وہ خدا کی زمین میں فساد پیدا کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ تاہم انسان کو بس اتنی ہی آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے اندر کے فساد کو باہر لائے، دوسروں کی قسمت کا مالک بننے کی آزادی کسی کو نہیں۔

اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور اللہ سے ڈرتے تو ہم ضرور ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے۔ اور اگر وہ تورات اور انجیل کی پابندی کرتے اور اس کی جو ان پر ان کے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے تو وہ کھاتے اپنے اوپر سے اور اپنے قدموں کے نیچے سے۔ کچھ لوگ ان میں سیدھی راہ پر ہیں۔ لیکن زیادہ ان میں ایسے ہیں جو بہت برا کر رہے ہیں ۶۶-۶۵

تمام گمراہیوں کا اصل سبب آدمی کا ڈھیٹ ہو جانا ہے۔ اگر آدمی اللہ سے ڈرے تو اس کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگ سکتی کہ کون سی بات خدا کی طرف سے آئی ہوئی بات ہے۔ ڈر کی نفسیات اس کے اندر سے دوسرے تمام محرکات کو حذف کر دے گی اور آدمی خدا کی بات کو فوراً پہچان کر اس کو مان لے گا۔ جب آدمی اس حد تک اپنے آپ کو خدا کی طرف متوجہ کر دے تو اس کے بعد وہ بھی خدا کی توجہ کا مستحق ہو جاتا ہے۔ خدا اس کی بشری کمزوریوں کو اس سے دھو دیتا ہے اور مرنے کے بعد اس کو جنت کے نعمت بھرے باغوں میں جگہ دیتا ہے۔ آدمی کی برائیاں، بالفاظ دیگر اس کی نفسیاتی کمزوریاں وہ چیزیں ہیں جو اس کو جنت کے راستہ پر بڑھنے نہیں دیتیں۔ خدا کی توفیق سے جو شخص اپنی نفسیاتی کمزوریوں پر قابو پالیتا ہے وہی جنت کی منزل تک پہنچتا ہے۔

جب بھی حق کی دعوت اٹھتی ہے تو وہ لوگ اس سے متوحش ہو جاتے ہیں جو سابقہ نظام کے تحت سرداری کا مقام حاصل کئے ہوئے ہوں۔ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کو قبول کرتے ہی ان کے معاشی مفادات اور ان کی قائدانہ عظمتیں ختم ہو جائیں گی۔ مگر یہ صرف تنگ نظری ہے۔ ایسے لوگ بھول جاتے ہیں کہ جس چیز کو وہ توحش کی نظر سے دیکھ رہے ہیں وہ صرف ان کی اہلیت کو جانچنے کے لئے ظاہر ہوئی ہے۔ آئندہ وہ خدا کے انعامات کے مستحق ہوں یا نہ ہوں اس کا فیصلہ ان کی اپنی تحفظاتی تدبیروں پر نہیں ہوگا بلکہ اس پر ہوگا کہ دعوت حق کے ساتھ وہ کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ گویا دعوت حق کے انکار کے ذریعہ وہ اپنی جس بڑائی کو بچانا چاہتے ہیں وہی انکار وہ چیز ہے جو خدا کے نزدیک ان کے استحقاق کو ختم کر رہا ہے۔

آسمانی کتاب کی حامل قوموں میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ اصل خدائی تعلیمات میں افراط یا تفریط (بڑھا کر یا گھٹا کر) وہ ایک خود ساختہ دین بنالیتی ہیں اور لمبی مدت گزرنے کے بعد اس کے افراد اس سے اس قدر مانوس ہو جاتے ہیں کہ اسی کو اصل خدائی مذہب سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب خدا کا سیدھا اور سچا دین ان کے سامنے آتا ہے تو وہ اس کو اپنے لئے غیر مانوس پاکر متوحش ہوتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کا یہی حال تھا۔ چنانچہ ان کی بہت بڑی اکثریت اسلام کی صداقت کو پانے سے قاصر رہی۔ صرف چند لوگ (مثلاً نجاشی شاہ حبش، عبداللہ بن سلام وغیرہ) جو اعتدال کی راہ پر باقی تھے، انھیں اسلام کی صداقت کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ انھوں نے بڑھ کر اسلام کو اس طرح اپنا لیا جیسے وہ پہلے سے اسی راستہ پر چل رہے ہوں اور اپنے سفر کے تسلسل کو جاری رکھنے کے لئے مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو گئے ہوں۔

اے پیغمبر، جو کچھ تمھارے اوپر تمھارے رب کی طرف سے اترا ہے اس کو پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔ اللہ یقیناً منکر لوگوں کو راہ نہیں دیتا ۶۷

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جب عرب میں آئے تو ایسا نہ تھا کہ وہاں دین کا نام لینے والا کوئی نہ ہو۔ بلکہ ان کا سارا معاشرہ دین ہی کے نام پر قائم تھا۔ دین کے نام پر بہت سے لوگ پیشوائی اور قیادت کا مقام حاصل کیے ہوئے تھے۔ دین کے نام پر لوگوں کو بڑی بڑی رقمیں ملتی تھیں۔ دینی مناصب کا حامل ہونا معاشرہ میں عزت اور فخر کی علامت بنا ہوا تھا۔ اس کے باوجود آپ کو عرب کے لوگوں کی طرف سے سخت ترین مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دین خداوندی کے نام پر ان کے یہاں ایک خود ساختہ دین رائج ہو گیا تھا۔ صدیوں کی روایات کے نتیجہ میں اس دین کے نام پر گدیاں بن گئی تھیں اور مفادات کی بہت سی صورتیں قائم ہو گئی تھیں۔ ایسے ماحول میں جب پیغمبر اسلام نے بے آمیز دین کی دعوت پیش کی تو لوگوں کو نظر آیا کہ وہ ان کی دینی حیثیت کو بے اعتبار ثابت کر رہی ہے۔ ان کو اندیشہ ہوا کہ اگر یہ دین پھیلا تو ان کا وہ مذہبی ڈھانچہ ڈھ جائے گا جس میں ان کو بڑائی کا مقام ملا ہوا ہے۔

یہ صورت حال داعی کے لئے بہت سخت ہوتی ہے۔ اپنے دعوتی کام کو کھلے طور پر انجام دینا وقت کی مذہبی طاقتوں سے لڑنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ اس کو دکھائی دیتا ہے کہ اگر میں کسی مصالحت کے بغیر سچے دین کی تبلیغ کردوں تو مجھ کو سخت ترین ردعمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرا مذاق اڑایا جائے گا۔ مجھ کو بے عزت کیا جائے گا۔ میری معاشیات تباہ کی جائیں گی۔ میرے خلاف جارحانہ کارروائیاں ہوں گی۔ میں اعوان و انصار سے محروم ہو جاؤں گا۔

اب اس کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔ دعوتی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں دنیوی مصلحتوں کے سرے ہاتھ سے چھوٹتے ہیں۔ اور اگر دنیوی مصلحتوں کا لحاظ کیا جائے تو دعوتی عمل کی پوری انجام دہی ناممکن نظر آتی ہے۔ یہاں خدا کا وعدہ داعی کو یکسو کرتا ہے۔ خدا کا وعدہ ہے کہ داعی اگر اپنے آپ کو خدا کے پیغام کی پیغام رسانی میں لگا دے تو لوگوں کی طرف سے ڈالی جانے والی مشکلات میں خدا اس کے لئے کافی ہو جائے گا۔ داعی کو چاہئے کہ وہ صرف دعوت کے تقاضوں کی تکمیل میں لگ جائے اور مدعو قوم کی طرف سے ڈالے جانے والے مصائب میں وہ خدا پر بھروسہ کرے۔

مخاطبین کا ردعمل ایک فطری چیز ہے اور داعی کو بہر حال اس سے سابقہ پیش آتا ہے۔ مگر اس کا اثر اسی دائرہ تک محدود رہتا ہے جتنا خدا کے قانون آزمائش کا تقاضا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ مخالفین اس حد تک قابو یافتہ ہو جائیں کہ وہ دعوتی مہم کو روک دیں یا اس کو تکمیل تک پہنچنے نہ دیں۔ ایک سچی دعوت کا اپنے دعوتی نشانہ تک پہنچنا ایک خدائی منصوبہ ہوتا ہے اس لئے وہ لازماً پورا ہو کر رہتا ہے۔ اس کے بعد مدعو گروہ کا ماننا اس کی اپنی ذمہ داری ہے جو اسی کے بقدر نتیجہ خیز ہوتی ہے جتنا مدعو خود چاہتا ہو۔

کہہ دو، اے اہل کتاب تم کسی چیز پر نہیں جب تک تم قائم نہ کرو تورات اور انجیل کو اور اس کو جو تمہارے اوپر اترا ہے تمہارے رب کی طرف سے۔ اور جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے وہ یقیناً ان میں سے اکثر کے سرکشی اور انکار کو بڑھائے گا۔ پس تم انکار کرنے والوں کے اوپر افسوس نہ کرو۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور صابی اور نصرانی، جو شخص بھی ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور نیک عمل کرے تو ان کے لئے نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۶۸-۶۹

یہود کا یہ حال تھا کہ ان کے افراد عملاً خدا کے دین پر قائم نہ تھے۔ انھوں نے اپنے نفس کو اور اپنی زندگی کے معاملات کو خدا کے تابع نہیں کیا تھا۔ البتہ خوش گمانیوں کے تحت انھوں نے یہ عقیدہ بنا لیا تھا کہ خدا کے یہاں ان کی نجات یقینی ہے۔ وہ اپنی قومی فضیلت کے افسانوں اور اپنے بزرگوں کے تقدس کی داستانوں میں جی رہے تھے۔ مگر اللہ کے یہاں اس قسم کی خوش خیالیوں کی کوئی قیمت نہیں۔ اللہ کے یہاں جو کچھ قیمت ہے وہ صرف اس بات کی ہے کہ آدمی اللہ کے احکام کا پابند بنے اور اپنی حقیقی زندگی کو خدا کے دین پر قائم کرے۔

جو لوگ جھوٹی آرزوؤں میں جی رہے ہوں ان کے سامنے جب یہ دعوت آتی ہے کہ اللہ کے یہاں عمل کی قیمت ہے نہ کہ آرزوؤں اور تمناؤں کی تو ایسی دعوت کے خلاف وہ شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسی دعوت میں ان کو اپنی خوش خیالیوں کا محل گرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ صورت حال ان کے لئے آزمائش بن جاتی ہے۔ وہ ایسی دعوت کے سخت مخالف ہو جاتے ہیں۔ نمائشی خدا پرستی کے اندر چھپی ہوئی ان کی خود پرستی بے پردہ ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ جس دعوت سے ان کو ربانی غذا لینا چاہئے تھا اس سے وہ صرف انکار اور سرکشی کی غذا لینے لگتے ہیں۔

قدیم زمانہ میں جو پیغمبر آئے ان کے ماننے والوں کی نسلیں دھیرے دھیرے مستقل قوم کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اب پیغمبروں کے نمونہ پر عمل تو باقی نہیں رہتا۔ البتہ اپنی عظمت و فضیلت کے قصیدے قصے کہانیوں کی صورت میں خوب پھیل جاتے ہیں۔ ہر گروہ سمجھنے لگتا ہے کہ ہم سب سے افضل ہیں۔ ہماری نجات یقینی ہے۔ اللہ کے یہاں ہمارا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔ مگر اس قسم کے گروہی مذاہب کی خدا کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔ اللہ کے یہاں ہر شخص کا مقدمہ انفرادی حیثیت میں پیش ہوگا اور اس کے مستقبل کی بابت جو کچھ فیصلہ ہوگا وہ تمام تر اس کے اپنے عمل کی بنیاد پر ہوگا نہ کہ کسی اور بنیاد پر۔

خدا کی کتاب کو قائم کرنا نام ہے ـــــ اللہ پر یقین کرنے کا، آخرت کی پکڑ کے اندیشہ کو اپنے اوپر طاری کرنے کا اور انسانوں کے درمیان صالح کردار کے ساتھ زندگی گزارنے کا۔ یہی اصل دین ہے اور ہر فرد کو یہی اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ آسمانی کتاب کی حامل قوم کی قیمت دنیا میں اسی وقت ہے جب کہ اس کے افراد اس دینِ خداوندی پر قائم ہوں۔ اس سے ہٹنے کے بعد وہ خدا کی نظر میں بالکل بے قیمت ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ کھلے ہوئے کافروں اور مشرکوں سے بھی زیادہ بے قیمت۔

ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے۔ جب کوئی رسول ان کے پاس ایسی بات لے کر آیا جس کو ان کا جی نہ چاہتا تھا تو بعضوں کو انھوں نے جھٹلایا اور بعضوں کو قتل کر دیا۔ اور خیال کیا کہ کچھ خرابی نہ ہوگی۔ پس وہ اندھے اور بہرے بن گئے۔ پھر اللہ نے ان پر توجہ کی۔ پھر ان میں سے بہت سے اندھے اور بہرے بن گئے۔ اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں ۷۱-۷۰

یہود سے اللہ نے حضرت موسیٰ کے ذریعہ ایمان و اطاعت کا عہد لیا تھا۔ وہ کچھ دن اس پر قائم رہے۔ اس کے بعد ان میں بگاڑ شروع ہوگیا۔ اب اللہ نے ان کے درمیان اپنے مصلحین اٹھائے جو ان کو اپنے عہد کی یاد دہانی کریں۔ مگر یہود کی بے راہی اور سرکشی بڑھتی ہی چلی گئی۔ انھوں نے خود نصیحت کرنے والوں کی زبان بند کرنے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ کتنے لوگوں کو قتل کر دیا۔ جب ان کی سرکشی حد کو پہنچ گئی تو اللہ نے بابل و نینوی (عراق) کے بادشاہ بنوخذ نصر کو ان کے اوپر مسلط کر دیا جس نے ۵۸۶ ق م میں یروشلم پر حملہ کرکے یہود کے مقدس شہر کو ڈھا دیا اور یہودیوں کو گرفتار کرکے اپنے ملک لے گیا تاکہ ان سے بیگار لے۔ اس واقعہ کے بعد یہود کے دل نرم ہوئے۔ انھوں نے اللہ سے معافی مانگی۔ اب اللہ نے سائرس (شاہ ایران) کے ذریعہ ان کی مدد کی۔ سائرس نے ۵۳۹ ق م میں کلدانیوں کے اوپر حملہ کیا اور ان کو شکست دے کر ان کے ملک پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد اس نے یہود کو جلاوطنی سے نجات دلاکر ان کو ان کے وطن جانے اور وہاں دوبارہ بسنے کی اجازت دے دی۔

اب یہود کو نئی زندگی ملی اور ان کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد وہ دوبارہ غفلت اور سرکشی میں مبتلا ہوئے۔ اب پھر نبیوں اور مصلحین کے ذریعہ اللہ نے ان کو متنبہ کیا۔ مگر وہ ہوش میں نہ آئے، یہاں تک کہ انھوں نے حضرت یحییٰ کو قتل کر دیا اور (اپنی حد تک) حضرت مسیح کو بھی۔ اب اللہ کا غضب ان پر بھڑکا اور ۷۰ء میں رومی شہنشاہ طائیٹس کو ان پر مسلط کر دیا گیا۔ جس نے ان کے ملک پر حملہ کرکے ان کو ویران کر دیا۔ اس کے بعد یہود کبھی اپنی ذاتی بنیادوں پر کھڑے نہ ہوسکے۔

آسمانی کتاب کی حامل قوموں کی نفسیات بعد کے زمانہ میں یہ بن جاتی ہیں کہ وہ خدا کے خاص لوگ ہیں۔ وہ جو کچھ بھی کریں اس پر ان کی پکڑ نہیں ہوگی۔ خدا کی تعلیمات میں اس عقیدہ کے خلاف کھلے کھلے بیانات ہوتے ہیں۔ مگر وہ ان کے بارے میں اندھے اور بہرے بن جاتے ہیں۔ وہ اپنے گرد خود ساختہ عقیدوں اور فرضی قصے کہانیوں کا ایسا ہالہ بنا لیتے ہیں کہ خدا کی تنبیہات ان کو دکھائی اور سنائی نہیں دیتیں۔ یہود کی یہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی ایک حامل کتاب قوم کو اس کے "دشمنوں کے قبضہ" میں دے دیا جائے تو یہ اس کے لئے خدا کی طرف سے آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہلکی سزا دے کر قوم کو جگایا جائے۔ اگر اس کے نتیجہ میں قوم کے افراد میں خدا پرستانہ جذبات جاگ اٹھیں تو اس کے اوپر سے سزا اٹھالی جاتی ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو خدا اس کو رد کرکے پھینک دیتا ہے اور پھر کبھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا کہ خدا ہی تو مسیح ابن مریم ہے۔ حالاں کہ مسیح نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب ہے اور تمھارا رب بھی۔ جو شخص اللہ کا شریک ٹھہرائے گا تو اللہ نے حرام کی اس پر جنت اور اس کا ٹھکانا آگ ہے۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا کہ خدا تین میں کا تیسرا ہے۔ حالاں کہ کوئی معبود نہیں بجز ایک معبود کے۔ اور اگر وہ باز نہ آئے اس سے جو وہ کہتے ہیں تو ان میں سے کفر پر قائم رہنے والوں کو ایک دردناک عذاب پکڑے گا۔ یہ لوگ اللہ کے آگے توبہ کیوں نہیں کرتے اور اس سے معافی کیوں نہیں چاہتے۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ مسیح ابن مریم تو صرف ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت رسول گزر چکے ہیں۔ اور ان کی ماں ایک راستباز خاتون تھیں۔ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو ہم کس طرح ان کے سامنے دلیلیں بیان کر رہے ہیں۔ پھر دیکھو وہ کدھر الٹے چلے جارہے ہیں۔ کہو کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمھارے نقصان کا اختیار رکھتی ہے اور نہ نفع کا۔ اور سننے والا اور جاننے والا صرف اللہ ہی ہے ۷۲ ـ ۷۶

حضرت مسیح کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی معجزے دیے۔ یہ معجزے اس لئے تھے کہ لوگ آپ کے پیغمبر ہونے کو پہچانیں اور آپ پر ایمان لائیں۔ مگر معاملہ برعکس ہوا۔ عیسائیوں نے آپ کے معجزات کو دیکھ کر یہ عقیدہ قائم کیا کہ آپ خدا ہیں۔ آپ کے اندر خدا حلول کئے ہوئے ہے۔ یہود نے یہ کہہ کر آپ کو نظر انداز کر دیا کہ یہ ایک شعبدہ باز اور جادوگر ہیں۔ حضرت مسیح اللہ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لئے آئے تھے۔ مگر ایک گروہ نے آپ سے شرک کی غذا لی اور دوسرے گروہ نے انکار کی۔

معبود وہی ہو سکتا ہے جو خود بے احتیاج ہو اور دوسرے کو نفع نقصان پہنچانے کی قدرت رکھے۔ کھانا آدمی کے محتاج ہونے کی آخری علامت ہے۔ جو کھانے کا محتاج ہے وہ ہر چیز کا محتاج ہے۔ جو شخص کھانا کھاتا ہو وہ مکمل طور پر ایک محتاج ہستی ہے۔ ایسی ہستی خدا کس طرح ہو سکتی ہے۔ یہی معاملہ نفع نقصان کا ہے۔ کسی کو نفع ملنا یا کسی کو نقصان پہنچنا ایسے واقعات ہیں جن کے ظہور میں آنے کے لئے پوری کائنات کی مساعدت درکار ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص اس قسم کے کائناتی اسباب فراہم کرنے پر قادر نہیں۔ اس لئے انسانوں میں سے کسی انسان کا یہ درجہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اس کو معبود فرض کر لیا جائے۔

جب بھی آدمی خدا کے سوا کسی اور کو اپنی عقیدت و محبت کا مرکز بناتا ہے تو اس کے پیچھے یہ چھپا ہوا جذبہ ہوتا ہے کہ اس کو خدا کی دنیا میں کوئی بڑا درجہ حاصل ہے۔ وہ خدا کے یہاں اس کا مددگار بن سکتا ہے۔ مگر اس قسم کی تمام امیدیں محض جھوٹی امیدیں ہیں۔ موجودہ امتحان کی دنیا میں خدا کے سوا دوسری چیزوں کا بے بس ہونا کھلا ہوا نہیں ہے۔ اس لئے یہاں آدمی غلط فہمی میں پڑا ہوا ہے۔ مگر آخرت میں جب تمام حقائق کھول دئے جائیں گے تو آدمی دیکھے گا کہ خدا کے سوا جن سہاروں پر وہ بھروسہ کئے ہوئے تھا وہ کس قدر بے قیمت تھے۔

کہو، اے اہلِ کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کے خیالات کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہوئے اور جنھوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا۔ اور وہ سیدھی راہ (سواء السبیل) سے بھٹک گئے ۷۷

حضرت مسیح کے ابتدائی شاگردوں کے نزدیک مسیح "ایک انسان تھا جو خدا کی طرف سے بھا" وہ آپ کو انسان اور اللہ کا رسول سمجھتے تھے۔ مگر آپ کا دین جب شام کے علاقہ سے باہر نکلا تو اس کو مصر و یونان کے فلسفہ سے سابقہ پیش آیا۔ مسیحیت قبول کرکے ایسے لوگ مسیحیت میں داخل ہوئے جو وقت کے فلسفیانہ افکار سے متاثر تھے۔ اس طرح اندرونی اسباب اور بیرونی محرکات کے تحت مسیحیت میں ایک نیا دور شروع ہوا جب کہ مسیحیت کو وقت کے غالب فلسفیانہ اسلوب میں بیان کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔

اس زمانہ کی مہذب دنیا میں مصر و یونان کے فلسفیوں کا زور تھا۔ وقت کے ذہین لوگ عام طور پر انھیں کے افکار کی روشنی میں سوچتے تھے۔ یونانی فلاسفہ نے اپنے قیاسات کے ذریعہ عالم کی ایک خیالی تصویر بنا رکھی تھی۔ وہ حقیقت کی تعبیر تین اقنوموں (Hypostases) کی صورت میں کرتے تھے —— وجود، حیات اور علم۔ مسیحی علماء جو خود بھی ان افکار سے مرعوب تھے، نیز وقت کے ذہین طبقہ کو مسیحیت کی طرف مائل کرنا چاہتے تھے، انھوں نے اپنے مذہب کو وقت کے غالب فکر پر ڈھالنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مسیحیت کی ایسی تعبیر کی جس میں خدا کا دین بھی اسی "تین" کے جامہ میں ڈھل جائے اور لوگ اس کو اپنے ذہن کے مطابق پاکر اس کو قبول کرلیں۔ انھوں نے کہا کہ مذہبی حقیقت بھی ایک تثلیث کی صورت گری ہے۔ اقنومِ وجود باپ ہے۔ اقنومِ حیات بیٹا ہے اور اقنومِ علم روح القدس ہے۔ اس کلامی مذہب کو مکمل کرنے کے لئے اور بہت سے خیالات اس میں داخل کئے گئے۔ مثلاً یہ کہ حضرت مسیح "کلام" کا جسدی ظہور ہیں۔ ہبوطِ آدم کے بعد ہر انسان گنہ گار ہو چکا ہے اور انسان کی نجات کے لئے خدا کے بیٹے کو مصلوب ہو کر اس کا کفارہ دینا پڑا، وغیرہ۔ اس طرح چوتھی صدی ہجری میں مصری، یونانی اور رومی تخیلات میں ڈھل کر وہ چیز تیار ہوئی جس کو موجودہ مسیحیت کہا جاتا ہے۔

خدا کی سواء السبیل سے بھٹکنے کی وجہ اکثر یہ ہوتی ہے کہ لوگ گمراہ قوموں کے خیالات سے مرعوب ہو کر دین کو ان کے خیالات کے سانچہ میں ڈھالنے لگتے ہیں۔ خدا کے دین کو مانتے ہوئے اس کی تعبیر اس ڈھنگ سے کرتے ہیں کہ وہ غالب افکار کے مطابق نظر آنے لگے۔ وہ خدا کے دین کے نام پر غیر خدا کے دین کو اپنا لیتے ہیں۔ نصاریٰ نے اپنے دین کو اپنے زمانہ کی مشرک قوموں کے افکار میں ڈھال لیا اور اسی کو خدا کا مقبول دین کہنے لگے۔ یہی چیز کبھی اس طرح پیش آتی ہے کہ دین کو خود اپنے قومی عزائم کے سانچہ میں ڈھال لیا جاتا ہے۔ اس دوسری تحریف کی مثال یہود ہیں۔ انھوں نے خدا کے دین کی ایسی تعبیر کی کہ وہ ان کی دنیوی زندگی کی تصدیق کرنے والا بن جائے۔ مسلمانوں کے لئے کتابِ الٰہی کے متن میں اس قسم کی تعبیرات داخل کرنے کا موقع نہیں ہے۔ تاہم متن کے باہر انھیں وہ سب کچھ کرنے کی آزادی ہے جو پچھلی قوموں نے کیا۔

[بنی] اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر لعنت کی گئی داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے۔ اس لئے کہ انھوں نے [نا]فرمانی کی اور وہ حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے برائی سے جو وہ کرتے تھے۔ [ن]ہایت برا کام تھا جو وہ کر رہے تھے۔ تم ان میں بہت آدمی دیکھو گے کہ کفر کرنے والوں سے دوستی رکھتے ہیں۔ کیسی [بر]ی چیز ہے جو انھوں نے اپنے لئے آگے بھیجی ہے کہ خدا کا غضب ہوا ان پر اور وہ ہمیشہ عذاب میں پڑے رہیں گے۔ [اگ]ر وہ ایمان رکھنے والے ہوتے اللہ پر اور نبی پر اور اس پر جو اس کی طرف اترا تو وہ کافروں کو دوست نہ بناتے۔ [م]گر ان میں اکثر نافرمان ہیں　۷۸ ـ ۸۱

ایمان آدمی کو ظلم اور برائی کے بارے میں حساس بنا دیتا ہے۔ وہ کسی کو ظلم اور برائی کرتے دیکھتا ہے تو تڑپ [ا]ٹھتا ہے اور چاہتا ہے کہ فوراً اسے روک دے۔ برے لوگوں سے اس کا تعلق جدائی کا ہوتا ہے نہ کہ دوستی کا۔ مگر جب [ا]یمانی جذبہ کمزور پڑ جائے تو آدمی صرف اپنی ذات کے بارے میں حساس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب اس کو صرف وہ برائی برائی معلوم ہوتی ہے جس کی زد اس کے اپنے اوپر پڑے۔ جس برائی کا رخ دوسروں کی طرف ہو اس کے بارے میں وہ غیر جانب دار ہو جاتا ہے۔

بنی اسرائیل جو اس زوال کا شکار ہوئے اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ انھوں نے اپنی زبان سے اچھی بات بولنا چھوڑ دیا تھا۔ ان کے خواص اب بھی خوبصورت تقریریں کرتے تھے مگر اس معاملہ میں وہ اتنے سنجیدہ نہ تھے کہ جب کسی کو ظلم اور برائی کرتے دیکھیں تو وہاں کود پڑیں اور اس کو روکنے کی کوشش کریں۔ حضرت داؤد اپنے زمانہ کے یہود کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان میں کوئی نیکوکار نہیں، ایک بھی نہیں (۱۴) مگر اسی کے ساتھ آپ کے کلام سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہود اپنے ہمسایوں سے صلح کی باتیں کرتے تھے جب کہ ان کے دلوں میں بدی ہوتی تھی (۲۸) وہ خدا کے آئین کو بیان کرتے اور خدا کے عہد کو زبان پر لاتے (۵۰) حضرت مسیح اپنے زمانہ کے یہودیوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

اے ریاکار فقیہو تم پر افسوس، تم بیواؤں کے گھروں کو دبا بیٹھتے ہو اور دکھاوے کے لئے نماز کو طول دیتے ہو۔ تم پودینہ اور سونف اور زیرہ پر تو دہ یکی دیتے ہو پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف، رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ اے اندھے راہ بتانے والو مچھر کو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔ اے ریاکار فقیہو تم ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو (متی ۲۳)

یہود خدا کا آئین بیان کرتے تھے۔ وہ لمبی نمازیں پڑھتے اور فصلوں میں دسواں حصہ نکالتے۔ مگر ان کی باتیں صرف کہنے کے لئے ہوتی تھیں۔ وہ بے ضرر احکام پر نمائشی اہتمام کے ساتھ عمل کرتے مگر جب صاحب معاملہ سے انصاف کرنے کا سوال ہوتا، جب ایک کمزور پر رحم کا تقاضا ہوتا، جب اپنے نفس کو کچل کر اللہ کے حکم کو ماننے کی ضرورت ہوتی تو وہ پھسل جاتے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی خدا کا بندہ ان کی غلطیوں کو بتاتا تو وہ اس کے دشمن ہو جاتے۔ یہی چیز تھی جس نے ان کو لعنت اور غضب کا مستحق بنا دیا۔

ایمان والوں کے ساتھ دشمنی میں تم سب سے بڑھ کر یہود اور مشرکین کو پاؤ گے۔ اور ایمان والوں کے ساتھ دوستی میں تم سب سے زیادہ ان لوگوں کو پاؤ گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ان میں عالم اور راہب ہیں۔ اور اس لئے کہ وہ تکبر نہیں کرتے۔ اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اس سبب سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے۔ پس تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ اور ہم کیوں نہ ایمان لائیں اللہ پر اور اس حق پر جو ہمیں پہنچا ہے جب کہ ہم یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالح لوگوں کے ساتھ شامل کرے۔ پس اللہ ان کو اس قول کے بدلہ میں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہی بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کا۔ اور جنھوں نے انکار کیا اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں ۸۲-۸۶

اس آیت میں جنت کو "قول" کا بدلہ قرار دیا گیا ہے۔ مگر وہ قول کیا تھا جس نے اس کے قائلین کو ابدی جنت کا مستحق بنایا۔ وہ قول ان کی پوری ہستی کا نمائندہ تھا۔ وہ ان کی شخصیت کی پھٹن کی آواز تھا۔ انھوں نے اللہ کے کلام کو اس طرح سنا کہ اس کے اندر جو حق تھا اس کو وہ پوری طرح پا گئے۔ وہ ان کے دل و دماغ میں اتر گیا۔ اس نے ان کے اندر ایسا انقلاب برپا کیا کہ ان کے حوصلوں اور تمناؤں کا مرکز بدل گیا۔ تعصب اور مصلحت کی تمام دیواریں ڈھ پڑیں۔ انھوں نے حق کے ساتھ اپنے آپ کو اس طرح شامل کیا کہ اس سے الگ ان کی کوئی ہستی باقی نہ رہی۔ وہ اس کے گواہ بن گئے، اور گواہ بننا ایک حقیقت کا انسان کی صورت میں مجسم ہونا ہے۔ قرآن اب ان کے لئے محض ایک کتاب نہ رہا بلکہ مالک کائنات کی زندہ نشانی بن گیا۔ یہ ربانی تجربہ جو ان پر گزرا بظاہر اس کا اظہار اگرچہ لفظوں کی صورت میں ہوا تھا مگر ان کے یہ الفاظ نہ تھے بلکہ وہ ایک زلزلہ تھا جس نے ان کے پورے وجود کو ہلا دیا۔ حتیٰ کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہ پڑیں۔

قول اپنی حقیقت کے اعتبار سے کسی قسم کے لسانی تلفظ کا نام نہیں۔ وہ آدمی کے عمل کو معنویت کا روپ دینے کی اعلیٰ ترین صورت ہے جس کا اختیار معلوم کائنات میں صرف انسان کو حاصل ہے۔ ایک حقیقی قول سب سے زیادہ لطیف اور سب سے زیادہ بامعنی واقعہ ہے۔ قول آدمی کی ہستی کا سب سے بڑا اظہار ہے۔ قول ناطق عمل ہے۔ اس لئے جب کوئی شخص قول کی سطح پر اپنی عبدیت کا ثبوت دیدے تو وہ جنت کا یقینی استحقاق حاصل کر لیتا ہے۔

حق کو نہ ماننے کی سب سے بڑی وجہ ہمیشہ کبر ہوتا ہے۔ جن کے دلوں میں کبر چھپا ہوا ہو وہ حق کی دعوت کے مقابلہ میں سب سے زیادہ سخت ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے اندر کبر نہ ہو، خواہ وہ دوسری کسی گمراہی میں مبتلا ہوں، وہ حق کی مخالفت میں کبھی اتنا آگے نہیں جا سکتے کہ اس کے جانی دشمن بن جائیں۔ اور کسی حال میں اس کو قبول نہ کریں۔

اے ایمان والو، ان ستھری چیزوں کو حرام نہ ٹھہراؤ جو اللہ نے تمھارے لئے حلال کی ہیں اور حد سے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا، اور اللہ نے تم کو جو حلال چیزیں دی ہیں ان میں سے کھاؤ۔ اور اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان لائے ہو۔ اللہ تم سے تمھاری بے معنی قسموں پر گرفت نہیں کرتا۔ مگر جن قسموں کو تم نے مضبوط باندھا ان پر وہ ضرور تمھاری گرفت کرے گا۔ ایسی قسم کا کفارہ ہے دس مسکینوں کو اوسط درجہ کا کھانا کھلانا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا کپڑا پہنا دینا یا ایک گردن آزاد کرنا۔ اور جس کو میسر نہ ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ یہ کفارہ ہے تمھاری قسموں کا جب کہ تم قسم کھا بیٹھو۔ اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ اس طرح اللہ تمھارے لئے اپنے احکام بیان کرتا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو ۸۹ - ۸۷

بندہ اور خدا کا تعلق ایک زندہ تعلق ہے جو نفسیات کی سطح پر قائم ہوتا ہے۔ یہ تمام تر ایک اندرونی واقعہ ہے۔ مگر مذہب کے زوال کے زمانہ میں جب یہ اندرونی تعلق کمزور پڑتا ہے تو لوگوں میں یہ ذہن ابھرتا ہے کہ اس کو خارجی ذرائع سے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ انھیں میں سے دنیوی لذتوں کو چھوڑنا بھی ہے جس کو رہبانیت کہا جاتا ہے۔ یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ مادی چیزوں سے دوری آدمی کو خدا سے قریب کرنے کا باعث بنے گی۔ صحابہ میں سے بعض افراد اس قسم کے رہبانی خیالات سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے ارادہ کیا کہ وہ گوشت نہ کھائیں۔ راتوں کو نہ سوئیں۔ اپنے آپ کو خصی کرالیں اور گھروں کو چھوڑ کر درویشی کی زندگی اختیار کرلیں۔ حتیٰ کہ بعض نے اس کی قسمیں بھی کھالیں۔ اس پر انھیں منع کیا گیا اور کہا گیا کہ حلال کو حرام کرنے سے کوئی شخص خدا کی قربت حاصل نہیں کرسکتا۔ آدمی جو کچھ حاصل کرتا ہے فطرت کے حدود میں رہ کر حاصل کرتا ہے نہ کہ اس سے آزاد ہو کر۔

اسلام کے مطابق اصل "رہبانیت" تقویٰ اور شکر ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی خدا کی منع کی ہوئی چیزوں سے بچے۔ اس کے اندر یہ خواہش ابھرتی ہے کہ ایک حرام چیز سے لذت حاصل کرے مگر وہ خدا کے ڈر سے رک جاتا ہے۔ کسی کے اوپر غصہ آجاتا ہے اور وہ چاہنے لگتا ہے کہ اس کو تہس نہس کردے مگر خدا کا ڈر اسے اپنے بھائی کے خلاف تخریبی کارروائی سے روک دیتا ہے۔ اس کا دل کہتا ہے کہ بے قید زندگی گزارے مگر خدا کی پکڑ کا اندیشہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے کو خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں کا پابند بنالے۔ یہی معاملہ شکر کا ہے۔ آدمی کو کوئی دنیوی چیز حاصل ہوتی ہے۔ صحت، دولت، عہدہ، ساز وسامان، مقبولیت کا کوئی حصہ اس کو ملتا ہے۔ مگر وہ خود پسندی اور گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ ہر چیز کو خدا کا عطیہ سمجھ کر اس کے احسان کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ تواضع اور ممنونیت کے جذبات میں ڈھل جاتا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو آدمی کو خدا سے جوڑتی ہیں۔ خدا سے ڈرنے اور اس کا شکر ادا کرنے سے آدمی اس کی قربت حاصل کرتا ہے۔ مادی چیزوں سے دوری یقیناً مطلوب ہے۔ مگر وہ ذہنی وقلبی دوری ہے نہ کہ جسمانی دوری۔

اے ایمان والو، شراب اور جوا اور تھان اور پانسے سب گندے کام ہیں شیطان کے۔ پس تم ان سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے۔ تو کیا تم ان سے باز آؤ گے۔ اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور بچو۔ اگر تم اعراض کرو گے تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان پر اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جو وہ کھا چکے۔ جب کہ وہ ڈرے اور ایمان لائے اور نیک کام کیا۔ پھر ڈرے اور ایمان لائے پھر ڈرے اور نیک کام کیا۔ اور اللہ نیک کام کرنے والوں کے ساتھ محبت رکھتا ہے ۹۳-۹۰

شراب اور جوا اور وہ آستانے جو خدا کے سوا کسی دوسرے کو پوجنے یا کسی اور کے نام پر نذر اور قربانی چڑھانے کے لئے ہوں اور پانسہ یعنی فال گیری اور قرعہ اندازی کے وہ طریقے جن میں غیر اللہ سے استعانت کا عقیدہ شامل ہو، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں انسان کو ذہنی و عملی پستی کی طرف لے جاتی ہیں۔ شراب آدمی کے اندر لطیف انسانی احساسات کو ختم کر دیتی ہے اور جوا بے غرضی کی نفسیات کے لئے قاتل ہے۔ اسی طرح تھان اور پانسے وہ چیزیں ہیں جن کی بنیاد یا تو سطحی جذبات پر قائم ہوتی ہے یا توہماتی خیالات پر۔

اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان اللہ کی یاد کرنے والا اور اس کی عبادت کرنے والا بن جائے۔ وہ خدا کی اور اس کے پیغمبر کی اطاعت میں اپنے کو ڈال دے۔ ان افعال کے لئے آدمی کا سنجیدہ ہونا ضروری ہے۔ مگر مذکورہ چیزیں آدمی کے اندر سے سب سے زیادہ جو چیز ختم کرتی ہیں وہ سنجیدگی ہی ہے۔ اسلام وہ انسان بنانا چاہتا ہے جو حقیقتوں کا ادراک کرے، جب کہ شراب آدمی کو حقیقتوں سے غافل کر دینے والی چیز ہے۔ اسلام کا مطلوب انسان وہ ہے جو مادیت سے بلند ہو کر جیے، جب کہ جوا آدمی کو مجرمانہ حد تک مادیت کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اسلام وہ انسان بنانا چاہتا ہے جو واقعات کی بنیاد پر اپنے کو کھڑا کرے، جب کہ آستانے اور پانسے انسان کو توہمات کی وادیوں میں گم کر دیتے ہیں۔

شراب بڑھی ہوئی بے حسی پیدا کرتا ہے اور جوا بڑھی ہوئی خود غرضی۔ اور یہ دونوں چیزیں باہمی فساد کی جڑ ہیں۔ جو لوگ بے حس ہو جائیں وہ دوسرے کی عزت کو عزت اور دوسرے کی چیز کو چیز نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگ ظلم، بے انصافی، دوسرے کو ناحق ستانے میں آخری حد تک جری ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جوا استحصال اور خود غرضی کی بدترین صورت ہے جب کہ ایک آدمی یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ بہت سے لوگوں کو لوٹ کر اپنے لئے ایک بڑی کامیابی حاصل کرے۔ شرابی آدمی دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرنے سے عاری ہوتا ہے اور جوئے باز کے لئے دوسرا آدمی صرف استحصال کا موضوع ہوتا ہے، ان خصوصیات کے لوگ جس معاشرہ میں جمع ہو جائیں وہاں آپس کی بے اعتمادی، ایک دوسرے سے شکایات، باہمی ٹکراؤ اور دشمنی کے سوا اور کیا چیز پرورش پائے گی۔

اے ایمان والو، اللہ تمھیں اس شکار کے ذریعہ سے آزمائش میں ڈالے گا جو بالکل تمھارے ہاتھوں اور تمھارے نیزوں کی زد میں ہوگا تاکہ اللہ جانے کہ کون شخص اس سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔ پھر جس نے اس کے بعد زیادتی کی تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اے ایمان والو، شکار کو نہ مارو جبکہ تم حالتِ احرام میں ہو۔ اور تم میں سے جو شخص اس کو جان بوجھ کر مارے تو اس کا بدلہ اسی طرح کا جانور ہے جیسا کہ اس نے مارا ہے جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے اور یہ نذرانہ کعبہ پہنچایا جائے۔ یا اس کے کفارہ میں چند محتاجوں کو کھانا کھلانا ہوگا۔ یا اس کے برابر روزے رکھنے ہوں گے، تاکہ وہ اپنے کئے کی سزا چکھے۔ اللہ نے معاف کیا جو کچھ ہو چکا۔ اور جو شخص پھرے گا تو اللہ اس سے بدلہ لے گا۔ اور اللہ زبردست ہے بدلہ لینے والا ہے ۹۵-۹۴

حج یا عمرہ کے لئے یہ قاعدہ ہے کہ کعبہ پہنچنے سے پہلے مقررہ مقامات سے احرام باندھ لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کعبہ تک کے سفر میں جانور یا چڑیاں سامنے آتی ہیں جن کو بآسانی شکار کیا جا سکتا ہو۔ مگر ایسے شکار کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ آدمی خواہ خود شکار کرے یا کسی دوسرے کو شکار کرنے میں مدد دے، دونوں چیزیں احرام کی حالت میں ناجائز ہیں۔ روایات کے مطابق یہ آیت حدیبیہ کے سفر میں اتری جب کہ مسلمانوں نے عمرہ کے ارادہ سے احرام باندھ رکھا تھا۔ اس وقت چڑیاں اور جانور کثیر تعداد میں اتنے قریب پھر رہے تھے کہ بآسانی انھیں تیر یا نیزے سے مارا جا سکتا تھا۔ مسلمان اس وقت اپنی عادت اور ضرورت کے تحت چاہتے بھی تھے کہ ان کا شکار کریں۔ مگر حکم اترتے ہی ہر ایک نے اپنا ہاتھ روک لیا ——— یہ حکم جو احرام کی حالت میں جانوروں کے بارے میں دیا گیا ہے وہی روزمرہ کی زندگی میں عام انسانوں کے ساتھ مطلوب ہے۔

اس حکم کا اصل مقصد یہ ہے کہ "اللہ جان لے کہ کون ہے جو اللہ کو دیکھے بغیر اللہ سے ڈرتا ہے"۔ دنیا میں انسان کو رکھ کر خدا اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ اب وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ لوگوں میں کون اتنا حقیقت شناس ہے کہ بظاہر خدا کو نہ دیکھتے ہوئے بھی اس طرح رہتا ہے جیسے کہ وہ اس کو اس کی تمام طاقتوں کے ساتھ دیکھ رہا ہے اور کون اتنا غافل ہے کہ خدا کو اپنے سامنے نہ پاکر بےخوف ہو جاتا ہے اور من مانی کارروائیاں کرنے لگتا ہے۔ اس کا تجربہ حج کے سفر میں چند دن اور انسانی تعلقات میں روزانہ ہوتا ہے۔ ایک آدمی کسی کی زد میں اس طرح آتا ہے کہ اس کے لئے بالکل ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اس کی جان پر حملہ کرے۔ وہ اس کو مالی نقصان پہنچائے۔ وہ اس کے بارے میں ایسی بات کہے جس سے اس کی رسوائی ہوتی ہو۔ اب ایک شخص وہ ہے جو اس طرح قابو پانے کے باوجود خدا کے ڈر سے اپنی زبان اور اپنے ہاتھ کو اس کے معاملہ میں روک لیتا ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جو کسی پر قابو پاتے ہی اس کو ذلیل کرتا ہے اور اس کو اپنی طاقت کا نشانہ بناتا ہے۔ ان میں سے پہلے شخص نے یہ ثابت کیا کہ وہ دیکھے بغیر اللہ سے ڈرتا ہے اور دوسرے نے اپنے بارے میں اس کے برعکس حالت کا ثبوت دیا۔ پہلے کے لئے خدا کے یہاں بےحساب انعامات ہیں اور دوسرے کے لئے دردناک عذاب۔

تمھارے لئے دریا کا شکار اور اس کا کھانا جائز کیا گیا، تمھارے فائدہ کے لئے اور قافلوں کے لئے۔ اور جب تک تم احرام میں ہو خشکی کا شکار تمھارے اوپر حرام کیا گیا۔ اور اللہ سے ڈرو جس کے پاس تم حاضر کئے جاؤ گے۔ اللہ نے کعبہ، حرمت والے گھر، کو لوگوں کے لئے قیام کا باعث بنایا۔ اور حرمت والے مہینوں کو اور قربانی کے جانوروں کو اور گلے میں پٹے پڑے ہوئے جانوروں کو بھی، یہ اس لئے کہ تم جانو کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ جان لو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے اور بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ رسول پر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔ کہو کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں ہو سکتے، اگرچہ ناپاک کی کثرت تم کو بھلی لگے۔ پس اللہ سے ڈرو اے عقل والو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ۹۶-۱۰۰

حالتِ احرام میں شکار حرام ہے۔ مگر جو لوگ دریا یا سمندر سے بیت اللہ کا سفر کر رہے ہوں ان کے لئے جائز ہے کہ وہ پانی میں شکار کریں اور اس کو کھائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شکار کی یہ ممانعت اس کے اندر کسی ذاتی حرمت کی بنا پر نہ تھی بلکہ محض "آزمائش" کے لئے تھی۔ انسان کو آزمانے کے لئے اللہ نے علامتی طور پر کچھ چیزیں مقرر کر دیں۔ اس لئے جہاں شارع نے محسوس کیا کہ جو چیز آزمائش کے لئے تھی وہ بندوں کے لئے غیر ضروری مشقت کا سبب بن جائے گی وہاں قانون میں نرمی کر دی گئی۔ کیوں کہ سمندر کے سفر میں اگر زادِ راہ نہ رہے تو آدمی کے لئے اپنی زندگی کو باقی رکھنے کی اس کے سوا اور صورت نہیں رہتی کہ وہ آبی جانوروں کو اپنی خوراک بنائے۔

کعبہ اسلام اور ملت اسلام کا دائمی مرکز ہے۔ کعبہ کی طرف رخ کرنے کو نماز کی شرط ٹھہرا کر اللہ نے دنیا کے ایک ایک مسلمان کو کعبہ کی مرکزیت کے ساتھ جوڑ دیا۔ پھر حج کی صورت میں اس کو اسلام کا بین اقوامی اجتماع گاہ بنا دیا۔ زیارت کعبہ کے ذیل میں جو شعائر مقرر کئے گئے ہیں ان کے احترام کی وجہ ان کا کوئی ذاتی تقدس نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آدمی کے امتحان کی علامت ہیں۔ بندہ جب ان شعائر کے بارے میں اللہ کے حکم کو پورا کرتا ہے تو وہ اپنے ذہن میں اس حقیقت کو تازہ کرتا ہے کہ اللہ اگرچہ بظاہر دکھائی نہیں دیتا مگر وہ زندہ موجود ہے۔ وہ حکم دیتا ہے وہ بندوں کی نگرانی کرتا ہے۔ وہ ہماری تمام حرکتوں سے باخبر ہے۔ یہ احساسات آدمی کے اندر اللہ کا ڈر پیدا کرتے ہیں اور اس کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ زندگی کے مختلف مواقع پر اللہ کا سچا بندہ بن کر رہ سکے۔

انسان کی یہ کمزوری ہے کہ جس طرف بھیڑ ہو، جدھر ظاہری ساز و سامان کی کثرت ہو اسی کو اہم سمجھ لیتا ہے۔ مگر خدا کے نزدیک ساری اہمیت صرف کیفیت کی ہے۔ مقدار کی اس کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ جو لوگ "کثرت" کی طرف دوڑیں اور "قلت" کو نظر انداز کر دیں وہ اپنے خیال سے بڑی ہوشیاری کر رہے ہیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ انتہائی نادان ہیں۔ کامیاب وہ ہے جو خدا کے ڈر کے تحت اپنا رویہ متعین کرے نہ کہ مادی مصالح یا دنیوی اندیشوں کے تحت۔

آزمائش کا قانون

کوئی آدمی حقیقی معنوں میں مومن اور مسلم ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ فتنہ (آزمائش) کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اللہ کو اگرچہ ہر ایک کے دل کا حال معلوم ہے مگر اللہ کی سنت یہ ہے کہ آزمائش کے حالات پیدا کرکے ہر آدمی کے اندر کو باہر لایا جائے تاکہ اللہ آخرت میں اس کے بارے میں جو فیصلہ کرے اس سے انکار کی مجال کسی کو نہ ہو۔

آزمائش کا مطلب ایسی صورت حال آدمی کے سامنے لانا ہے جہاں حسن عمل کے تمام اضافی اسباب حذف ہو گئے ہوں، صرف ایک ہی سبب (اللہ کا ڈر) باقی رہ گیا ہو۔ اسی لئے معمول کے حالات یا روزمرہ کے عمل میں آدمی کی آزمائش نہیں ہو سکتی۔ آزمائش کے لئے ضروری ہے کہ غیر معمولی حالات سامنے لائے جائیں۔

اگر یہ دیکھنا ہو کہ آپ خوش اخلاق ہیں یا نہیں، تو اس کا تجربہ ایک ایسے آدمی کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا جو آپ سے نیازمندی کی باتیں کرتا ہو۔ کیوں کہ نیازمندی دکھانے والے کے ساتھ تو ہر آدمی خوش اخلاقی ہی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اسی طرح اس کا تجربہ ایک طاقت ور آدمی کے ذریعہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ طاقتور شخصیت کے سامنے ہر آدمی خوش اخلاق بن جاتا ہے۔ کسی کی خوش اخلاقی کو جانچنے کا ذریعہ ایک ایسا شخص ہی بن سکتا ہے جو کمزور اور معمولی آدمی ہو اور اسی کے ساتھ وہ ایسے انداز میں کلام کرے جو ناگواری پیدا کرنے والا ہو۔

اسی طرح کسی کی انسانیت دوستی کی جانچ اس طرح نہیں ہو سکتی کہ ایک شان دار اجلاس کیا جائے اور اس کے بعد اس آدمی سے کہا جائے کہ سجے ہوئے اسٹیج پر کھڑے ہو کر تم انسانیت کے موضوع پر ایک تقریر کرو۔ کسی کی انسانیت دوستی کی جانچ اس وقت ہوتی ہے جب ایک بے قیمت آدمی اس کے دروازے پر پہنچتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ میں فلاں مصیبت میں پھنس گیا ہوں تم انسانیت کے ناتے میری مدد کرو۔ کوئی شخص فیاض ہے یا نہیں اس کا اندازہ اس وقت نہیں ہوتا جب ایک شان دار قومی مد سامنے آئے اور اس میں پیسہ دے کر لوگ آناً فاناً شہرت و عزت کی منزلیں طے کر رہے ہوں۔ آدمی کی فیاضی کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب اس کو ایک ایسی خاموش مد میں پیسہ دینا ہو جس میں اخباری شہرت کا کوئی موقع نہیں۔ کسی شخص کے انصاف کا حال اس وقت معلوم نہیں ہوتا جب کہ متعلقہ فریق سے تعلقات خوش گوار ہوں بلکہ آدمی کی انصاف پسندی یا بے انصافی اس وقت کھلتی ہے جب کہ دونوں فریقوں کے درمیان تلخی پیدا ہو گئی ہو اور انصاف کرنا بظاہر اپنے حریف کو فائدہ پہنچانے کے ہم معنی بن گیا ہو۔ آدمی اللہ سے ڈرتا ہے یا نہیں اس کا حقیقی اندازہ ان اعمال میں نہیں ہوتا جو آدمی انسانوں سے دور تسبیح و نوافل کی صورت میں کرتا ہے اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس کا سابقہ انسانوں سے پڑے اور ایک شخص کے معاملہ میں اللہ سے ڈرنا اس قیمت پر ہو کہ آدمی اپنی انا کو کچلے اور اپنی مصلحتوں کو برباد کرے ——— آدمی معمول کے حالات میں خدا پرستی والے عمل کرتا ہے۔ مگر خدا جب غیر معمولی مواقع پیدا کرکے اس کی خدا پرستی کو جانچنا چاہتا ہے تو عین اس وقت وہ خدا پرستی کا ثبوت دینے میں ناکام ہو جاتا ہے۔

آخرت پسندی

مومن وہ ہے جس کی زندگی کا رُخ آخرت کی طرف ہو جائے۔ اس کی یادوں میں آخرت سمائی ہوئی ہو۔ وہ اپنی سرگرمیوں میں سب سے زیادہ آخرت کا لحاظ کرتا ہو۔ تعلقات اور معاملات میں اس کو ہمیشہ آخرت یاد رہتی ہو۔ کسی سے بگاڑ اور اختلاف ہو جائے تب بھی وہ اس کے ساتھ وہی معاملہ کرے جو آخرت کے اعتبار سے اس کو کرنا چاہئے۔ وہ فائدوں اور مصلحتوں پر چلنے کے بجائے جنت اور جہنم کو سوچ کر اپنی راہ بناتا ہو۔ جب کوئی حق اس کے سامنے آئے تو وہ یہ خیال کرکے اس کو مان لے کہ دنیا میں اگر نہ مانا تو آخرت کے دن اس کو ماننا ہوگا اور آخرت کا ماننا صرف رسوائی کو بڑھانے والا ہوگا۔ وہ اپنی کامیابی اور ناکامی اور اپنی عزت اور ذلت کو آخرت کے اعتبار سے جانچتا ہو۔ اس کی زندگی آخرت رخی زندگی ہو نہ کہ دنیا رخی زندگی۔

تعمیر

دنیا کے معاملات میں مومن کا طریقہ تعمیری طریقہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو خود اپنی مثبت جدوجہد کی بنیاد پر کھڑی کرتا ہے۔ وہ احتجاج اور مطالبہ پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنی خداداد صلاحیتوں پر بھروسہ کرتا ہے۔ وہ نفرت اور غصہ کا جواب محبت اور سنجیدگی سے دیتا ہے۔ وہ اختلاف کے مواقع پر اتحاد کی راہیں تلاش کرتا ہے۔ اس کو اپنی تعمیر سے دلچسپی ہوتی ہے نہ کہ دوسروں کی تخریب سے۔ جو کچھ دوسروں کے پاس ہے وہ اس کی ہوس نہیں کرتا بلکہ جو کچھ اس کے اپنے پاس ہے اس کی بنیاد پر اپنا مستقبل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

دعوت الی اللہ

مومن کی تحریک خدا کی طرف پکارنے کی تحریک ہوتی ہے۔ خدا نے ہم کو بنایا، وہ ہم کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ وہی ہے جو ہماری ضروریات کا سامان کرتا ہے۔ اس لئے ہمارا قلبی تعلق سب سے زیادہ خدا سے ہونا چاہئے۔ درخت، پانی، چڑیاں، ہوائیں اور سورج چاند، اس دنیا کی سب چیزیں خدا کے مقررہ نقشہ پر چل رہی ہیں، ہم کو بھی یہاں اسی نقشہ کے مطابق زندگی گزارنا چاہئے۔ خدا نے اپنے رسول بھیجے اور اپنی کتاب اتاری تاکہ ہم ان سے رہنمائی حاصل کریں، ہم کو چاہئے کہ ہم رسول اور رسول کی لائی ہوئی کتاب کو اپنی زندگی میں رہنما مقام عطا کریں۔ خدا اپنے منصوبہ کے مطابق ایک روز ظاہر ہوگا اور موجودہ دنیا کو توڑ کر دوسری دنیا بنائے گا جہاں اس کے نافرمان بندوں کے لئے جہنم ہوگی اور اس کے فرماں بردار بندوں کے لئے جنت۔ ہم کو چاہئے کہ ہم ایسی زندگی گزاریں کہ آنے والے دن میں ہمارا شمار اس کے فرماں برداروں میں ہو نہ کہ نافرمان بندوں میں ——— یہی زندگی کی اصل حقیقت ہے، مومن خود بھی اپنے آپ کو اس کے مطابق بناتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کے مطابق بننے کی دعوت دیتا ہے۔

جہنم کا خطرہ

خدا نے انسان کو اس کی بناوٹ کے اعتبار سے جنتی نفسیات کے ساتھ پیدا کیا۔ اس کے بعد اس کو موجودہ دنیا میں ڈال دیا جہاں ایسے حالات ہیں جو آدمی کے اندر جہنمی نفسیات کو ابھارتے ہیں۔ اب جو شخص اسفل سافلین میں رہتے ہوئے اپنے کو احسن تقویم کی سطح پر لے جائے، بالفاظ دیگر جہنمی نفسیات کو ابھارنے والے ماحول میں دوبارہ اپنے اندر چھپی ہوئی جنتی نفسیات کو بیدار کرے تو وہی وہ شخص ہے جو مرنے کے بعد اللہ کے پڑوس میں اور اس کی نعمتوں میں جگہ پائے گا۔ باقی لوگ دھوئیں اور آگ کی دنیا میں عذاب سہنے کے لئے چھوڑ دئے جائیں گے (التین)

موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس لئے اس کو اسی ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ یہاں بار بار آدمی کے لئے آزمائشی حالات پیدا ہوں۔ یہاں نفع اور نقصان کے معاملات ہیں جو آدمی کے اندر حرص، طمع اور خود غرضی کے احساسات ابھارتے ہیں۔ یہاں سطحی دل چسپیاں ہیں جو آدمی کو شہوت پرستی، نشہ بازی اور لذتیت کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہاں ایک آدمی اور دوسرے آدمی کا مقابلہ پیش آتا ہے جس کی وجہ سے آدمی کے اندر خود پرستی اور انانیت کا شیطان جاگتا ہے۔ یہاں مفادات کا ٹکراؤ ہے جس کی وجہ سے غصہ، نفرت اور کمینہ پن کے جذبات بھڑکتے ہیں۔ یہی موجودہ دنیا کا "اسفل سافلین" ہونا ہے۔ آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے اوپر اٹھائے اور اپنے کو "احسن تقویم" کی سطح پر لے جائے جو باعتبار پیدائش اس کی حقیقی سطح ہے۔

ایک پھل اندر سے اچھا ہے یا خراب، اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب کہ اسے توڑا جائے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ کوئی انسان جنتی نفسیات میں جی رہا ہے یا جہنمی نفسیات میں، اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب کہ اس کی ہستی کو توڑا جائے۔ جب آدمی کے ساتھ کسی قسم کی ناموافق صورت حال پیش آتی ہے تو اس وقت اس کی ہستی ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسے موقع پر آدمی جو رد عمل ظاہر کرتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنتی تقویم کی سطح پر تھا یا جہنمی تقویم کی سطح پر۔ جب دو آدمیوں کے درمیان روپیہ یا جائداد کا جھگڑا کھڑا ہوتا ہے۔ جب دو صاحب معاملہ افراد کے درمیان کوئی کھٹ پٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ جب دو الگ الگ خیال رکھنے والوں کے درمیان رائے کا اختلاف ہو جاتا ہے۔ جب ایک منصب کے دو دعویداروں کے درمیان ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے تو یہی وہ مواقع ہوتے ہیں جب کہ یہ پتہ چلتا ہے کہ آدمی حقیقت کے اعتبار سے کیا ہے۔ ایسے مواقع پر جو شخص نفرت، خود غرضی، بے انصافی اور انانیت کا مظاہرہ کرے وہ اپنے اس عمل سے ثابت کرتا ہے کہ وہ جہنمی نفسیات میں جی رہا تھا، وہ ابلیس اور شیطان کا پڑوسی تھا۔ اس کے برعکس جس شخص کا رد عمل ان مواقع پر محبت، بے غرضی، انصاف پسندی اور تواضع کی صورت میں ظاہر ہو وہ ثابت کر رہا ہے کہ وہ جنتی نفسیات میں جی رہا ہے، اس کے روز و شب خدا اور اس کے فرشتوں کے پڑوس میں گزرتے ہیں۔ جو شخص دنیا میں شیطان کا پڑوسی ہے، آخرت میں بھی اس کو شیطان ہی کا پڑوس حاصل ہوگا اور جو شخص دنیا میں خدا اور فرشتوں کا پڑوسی ہے، وہ آخرت میں بھی خدا اور فرشتوں کے پڑوس میں رہے گا۔

موت کے دروازہ پر

موت کا مرحلہ سب سے زیادہ یقینی مرحلہ ہے جس سے آدمی کو لازماً گزرنا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی کو زندگی نہ ملے۔ مگر جس کو زندگی ملی اس کے لئے موت کا آنا لازمی ہے۔ ہر آدمی جو زندہ ہے وہ ایک روز مرے گا۔ ہر آدمی جو دیکھتا اور بولتا ہے یقیناً ایک روز اس کی آنکھ بے نور ہوگی اور اس کا بولنا بند ہو جائے گا۔ ہر آدمی پر وہ وقت آتا ہے جب کہ وہ موت کے دروازہ پر کھڑا کر دیا جائے۔ اس وقت اس کے پیچھے دنیا ہوگی اور اس کے آگے آخرت۔ وہ ایک ایسی دنیا کو چھوڑ رہا ہوگا جہاں وہ دوبارہ کبھی نہیں آئے گا اور ایک ایسی دنیا میں داخل ہو رہا ہوگا جس سے اس کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ وہ اپنے عمل کے میدان سے ہٹا کر وہاں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ اپنے عمل کا ابدی انجام بھگتتا رہے۔

زندگی ایک بے اعتبار چیز ہے، جب کہ موت بالکل یقینی ہے۔ ہم زندہ صرف اس لئے ہیں کہ ابھی ہم مرے نہیں ہیں اور موت وہ چیز ہے جس کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ ہم ہر لمحہ موت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہم زندگی کے مقابلہ میں موت سے زیادہ قریب ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں حالاں کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ مرے ہوئے ہیں۔ وہ موت جس کا وقت مقرر نہ ہو، جو ابھی اگلے لمحہ آسکتی ہو وہ گویا ہر وقت آرہی ہے اس کے متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ آچکی ہے، بجائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ وہ آنے والی ہے۔ اسی لئے حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اپنے آپ کو قبر والوں میں شمار کرو (عد نفسک من اهل القبور)

موت ہر چیز کو باطل کر دیتی ہے، وہ ہماری زندگی کا سب سے زیادہ بھیانک واقعہ ہے۔ تاہم موت اگر صرف زندگی کا خاتمہ ہوتی تو وہ زیادہ بھیانک نہیں تھی۔ موت کا مطلب اگر صرف یہ ہوتا کہ اب آئندہ کے لئے اس انسان کا وجود نہ رہے گا جو چلتا تھا اور جو دیکھتا اور سنتا تھا تو اپنی ساری ہولناکیوں کے باوجود یہ صرف ایک وقتی حادثہ تھا نہ کہ کوئی مستقل مسئلہ۔ مگر اصل مشکل یہ ہے کہ موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں۔ وہ ایک نئی اور ابدی زندگی کا آغاز ہے۔ موت کا مطلب اپنے ابدی انجام کی دنیا میں داخل ہونا ہے۔

ہر آدمی زندگی سے موت کی طرف سفر کر رہا ہے۔ کسی کا سفر دنیا کی خاطر ہے اور کسی کا آخرت کی خاطر۔ کوئی سامنے کی چیزوں میں جی رہا ہے کوئی چھپی ہوئی چیزوں میں۔ کوئی اپنی خواہش اور انا کی تسکین کے لئے دوڑ دھوپ کر رہا ہے اور کسی کو خدا کے خوف اور خدا کی محبت نے بے چین کر رکھا ہے۔ دونوں قسم کے لوگ شام کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی تھکان کو مٹائیں اور اگلے دن دوبارہ صبح کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی پسند کی دنیا میں دوبارہ سرگرم ہو جائیں۔ موجودہ دنیا میں دونوں بظاہر یکساں نظر آتے ہیں۔ مگر موت کے بعد آنے والی منزل کے اعتبار سے دونوں کا حال یکساں نہیں۔ جو شخص خدا اور آخرت میں جی رہا ہے وہ اپنے کو بچا رہا ہے اور جو شخص دنیا کی دلچسپیوں اور اپنے نفس کی خواہشوں میں جی رہا ہے وہ اپنے کو ہلاک کر رہا ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ

ہر آدمی صبح کرتا ہے پھر وہ اپنے کو بیچتا ہے، پھر ان میں سے کوئی اپنے کو رہا کرتا ہے اور کوئی اپنے کو ہلاک کر دیتا ہے (کل الناس یغدو فبائع نفسہ فمعتقہا او موبقہا)

آج لوگوں کے پاس الفاظ ہیں جن کو وہ بے تکان دہرا رہے ہیں۔ مگر ایک وقت آنے والا ہے جب کہ ان کے الفاظ چھن چکے ہوں گے۔ ان کو اپنا ہر بول بالکل بے قیمت نظر آئے گا۔ وہاں کوئی سننے والا نہ ہوگا جو ان کے الفاظ کو سنے۔ کوئی پریس نہ ہوگا جو ان کے الفاظ کو چھاپے۔ کوئی لاؤڈ اسپیکر نہ ہوگا جو ان کے الفاظ کو فضا میں بکھیرے۔ ان کی خوش خیالیوں کا محل گر چکا ہوگا۔ وہ حسرت و یاس کی تصویر بنے ہوئے اپنے چاروں طرف دیکھیں گے اور کچھ نہ کر سکیں گے۔ اس وقت ان کو نظر آجائے گا کہ دنیا میں حق کا انکار کرنے کے لئے وہ جن الفاظ کا سہارا لئے ہوئے تھے وہ کس قدر بے قیمت تھے۔ یہ دنیا چونکہ امتحان کی دنیا ہے اس لئے یہاں الفاظ ہر معنی کو قبول کر لیتے ہیں، ایک ناحق بات کو بھی یہاں شاندار الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ مگر موت کے بعد جو دنیا آئے گی وہاں صرف سچی بات بولنا ممکن ہوگا۔ وہاں الفاظ کسی غلط بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیں گے۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ موت کو بہت زیادہ یاد کرو جو لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے (اکثروا ذکر ھادم اللذات) یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی اگر موت کو یاد کرتا رہے تو اس کے لئے دنیا کی وہ تمام چیزیں بالکل بے حقیقت ہو جائیں جن کی خاطر وہ ظلم اور بے انصافی کرتا ہے اور اپنے لئے جہنم کی آگ میں جلنے کا خطرہ مول لیتا ہے۔ جس مال کو آدمی اپنا سب کچھ سمجھتا ہے اور اس کے سمیٹنے میں اپنی ساری طاقت لگا دیتا ہے، وہ اس کو برت نہیں پاتا کہ موت آجاتی ہے اور اس کو اس کے کمائے ہوئے مال سے جدا کر دیتی ہے۔ اگر آدمی کے سامنے یہ حقیقت واضح ہو تو وہ مال کے پیچھے اپنے کو دیوانہ نہ بنائے۔ آدمی کو کسی سے شکایت ہو جاتی ہے اور وہ اس کو مٹانے اور اس کو برباد کرنے میں لگ جاتا ہے۔ مگر ابھی وہ اپنے تخریبی منصوبہ کو پورا نہیں کر پاتا کہ موت اس کے اور اس کے دشمن کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے دشمن کو اس کے حال میں چھوڑ کر اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ اگر یہ حقیقت آدمی کے ذہن میں تازہ ہو تو وہ کبھی کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے۔ آدمی کے سامنے ایک سچائی آتی ہے مگر وہ اس کا اعتراف نہیں کرتا کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے اس کا اعتراف کر لیا تو وہ بڑائی کے مقام سے نیچے آجائے گا، اس کا بنا بنایا ڈھانچہ ٹوٹ کر منتشر ہو جائے گا۔ مگر سچائی کے انکار کے بعد اس پر چند دن بھی نہیں گزرتے کہ موت اس کی بڑائی کو ختم کر دیتی ہے اور اس کا سارا نقشہ درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر وہ موت سے پہلے اس ہونے والے واقعہ کو یاد کرے تو کبھی ایسی سچائی کے انکار کی جرأت نہ کرے جس کو چند لمحہ بعد اس کو بہر حال تسلیم کرنا ہے۔

ایک ایسا گھر جو کل جل کر تباہ ہو جانے والا ہو اس کو کوئی نہیں خریدتا۔ ایک ایسا شہر جو اگلے لمحہ بھونچال کی زد میں آنے والا ہو اس میں کوئی داخل نہیں ہوتا۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ موت کے عظیم تر بھونچال کے معاملہ میں ہر آدمی یہی غلطی کر رہا ہے۔

رسول اللہ ؐ کی تواضع

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ سے زیادہ محبوب ہمارے لئے کوئی نہ تھا۔ مگر جب وہ ہمارے پاس آتے تو ہم آپ کے لئے کھڑے نہ ہوتے۔ کیوں کہ ہم جانتے تھے کہ آپ اس کو پسند نہیں کرتے تھے (مسلم)

ضرورت سے زیادہ چیزوں کے عادی نہ بنو

عبداللہ بن شریک اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں، علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے لئے فالودہ لایا گیا اور ان کے سامنے رکھ دیا گیا۔ آپ نے فرمایا: تو بڑی اچھی خوشبو والا ہے۔ تیرا رنگ بھی اچھا ہے۔ اور تیرا ذائقہ بھی اچھا۔ مگر میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو اس چیز کا عادی بناؤں جس کا عادی میں نہیں ہوں (ولکن اکرہ ان اعود نفسی مالم تعتدہ، حلیۃ الاولیاء جلد ا صفحہ ۸۱)

فخر کی نفسیات میں مبتلا ہونے والا خدا کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے

ابونعیم نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے ایک بار ایک نیا کُرتا پہنا۔ میں اس کو دیکھتی تھی اور خوش ہوتی تھی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم کیا دیکھ رہی ہو۔ اللہ تمہاری طرف دیکھنے والا نہیں (ما تنظرین، ان اللہ لیس بناظر الیک) میں نے کہا کیوں۔ فرمایا کیا تم کو معلوم نہیں کہ بندے کے اندر جب دنیا کی زینت سے احساس فخر پیدا ہوتا ہے تو اس کا رب اس سے ناراض ہو جاتا ہے جب تک کہ وہ بندہ اس زینت کو چھوڑ نہ دے۔ عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے اس کرتے کو اتارا اور اس کو صدقہ کر دیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: شاید تمہارا یہ صدقہ تمہارے لئے کفارہ بن جائے (عسی ذلک ان یکفر عنک، حلیۃ الاولیاء جلد ا)

غصہ پر قابو رکھنا سب سے بڑی بہادری ہے

عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگ پہلوان کس کو سمجھتے ہو۔ لوگوں نے کہا۔ وہ شخص جو لوگوں کو کشتی میں پچھاڑ دے۔ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے (ولکنہ الذی یملک نفسہ عند الغضب (مسلم)

سب کچھ کر کے بھی یہی سمجھنا کہ کچھ نہیں کیا

عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر مغیرہ بن شعبہ رضؓ کے مجوسی غلام ابولولو نے قاتلانہ حملہ کیا۔ مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ آپ نے دودھ منگا کر پیا تو دودھ کی سفیدی زخموں کے راستہ سے بہہ پڑی۔ آپ نے فرمایا: واللہ لو ان لی طلاع الارض ذھبا لافتدیت بہ من عذاب اللہ من قبل ان اراہ (خدا کی قسم اگر میرے پاس زمین کے برابر سونا ہوتا تو میں اللہ کے عذاب سے بچنے کے لئے اسے فدیہ دے دیتا قبل اس کے کہ میں اسے دیکھوں)۔ عبداللہ بن عباس نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لئے دعا کی کہ اللہ آپ کے ذریعہ دین کو اور مسلمانوں کو طاقت دے جب کہ مسلمان مکہ میں حالت خوف میں تھے۔ آپ اسلام لائے۔ آپ کا اسلام باعث قوت ہوا۔ آپ کے ذریعہ اسلام کو سربلندی ملی۔ آپ نے ہجرت کی اور آپ ہر غزوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ پھر رسول اللہ علیہ وسلم کی وفات

ہوئی اور وہ آپ سے راضی تھے۔ پھر آپ خلیفہ اول کے مشیر اور مددگار رہے اور ان کی وفات ہوئی اور وہ آپ
سے راضی تھے۔ پھر آپ مسلمانوں کے امیر مقرر ہوئے۔ اللہ نے آپ کے ذریعہ شہروں کو آباد کیا، دولت کی بہتات
کر دی، آپ کے ذریعہ اسلام کے دشمنوں کا خاتمہ کیا۔ پھر شہادت پر آپ کا خاتمہ لکھ دیا۔ پس مبارک ہو" عمر رضی اللہ
عنہ نے فرمایا: "اس نے دھوکا کھایا جو تم لوگوں کے دھوکہ میں آگیا" پھر فرمایا: اے عبداللہ! کیا تم قیامت کے دن
میرے لئے گواہی دو گے" انھوں نے کہا ہاں۔ پھر اپنے لڑکے سے کہا: اے عبداللہ! میرا چہرہ زمین پر رکھ دو۔ وہ حضرت
عمر کا سر اپنی ران پر لئے ہوئے تھے۔ انھوں نے ران سے اٹھا کر پنڈلی پر رکھ لیا۔ حضرت عمر نے کہا: "تم میرا رخسار زمین
سے ملا دو" انھوں نے ایسا ہی کیا۔ حضرت عمر نے کہا: عمر! خرابی ہے تیری اور تیری ماں کی اگر اللہ نے تجھے معاف نہ کیا
(ویلک وویل امک یا عمر! ان لم یغفر اللہ لک (طبرانی) اس کے بعد آپ کی وفات ہوگئی۔

ہر حال میں عبدیت پر قائم رہنا

امام نسائی اور امام احمد نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ غزوۂ بدر کے سفر
میں ہر تین آدمی کے درمیان ایک اونٹ تھا۔ لوگ باری باری سوار ہوتے تھے۔ یہی حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا
تھا۔ آپ کے ساتھ دوسرے دو آدمی ابولبابہ رض اور علی بن ابی طالب رض تھے۔ ان دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
کہا: ارکب حتی نمشی عنک (آپ سوار رہیے۔ ہم آپ کے بدلے پیدل چلیں گے) آپ نے فرمایا: تم دونوں مجھ سے زیادہ
طاقت ور نہیں ہو اور نہ مجھ کو تم سے کم ثواب کی ضرورت ہے (ما انتما باقوی منی ولا انا باغنی عن الاجر منکما
(البدایہ والنہایہ جلد ۳)

تکلف کے بجائے ضرورت کا لحاظ کرنا

ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے تو آپ نے ابوایوب انصاری کے گھر میں قیام فرمایا۔ ان کے
گھر کے اوپر ایک کوٹھا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیچے کے حصہ میں ٹھہرے اور حضرت ابوایوب اپنے گھر
والوں کے ساتھ اوپر تھے۔ ان کو یہ بات ناگوار ہوئی کہ رسول نیچے ہوں اور وہ اوپر ہوں۔ انھوں نے کہا: اے خدا کے
رسول! آپ اوپر کے حصہ میں قیام کریں۔ ہم لوگ نیچے رہیں گے۔ آپ نے فرمایا: اس کا خیال مت کرو میرے لئے نیچے کا قیام
زیادہ بہتر ہے۔ کیوں کہ ملاقات کے لئے آنے والوں کو اس میں زیادہ آسانی ہوگی (سیرت ابن کثیر، جلد ۲)

جانوروں پر مہربانی

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ ایک مقام پر
ہم نے پڑاؤ ڈالا۔ وہاں ایک چڑیا تھی۔ اس کے دو بچے تھے۔ ہم نے بچوں کو پکڑ لیا۔ چڑیا بولنے اور پر پھڑپھڑانے لگی۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ کس نے اس چڑیا کو تکلیف دی ہے۔ اس کے بچے کو اسے لوٹا دو۔
اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ چیونٹیوں کے گھر کو جلایا گیا ہے۔ آپ نے پوچھا۔ کس نے اس کو جلایا ہے۔
ہم نے جواب دیا کہ ہم لوگوں نے جلایا ہے۔ آپ نے فرمایا: آگ کے رب کے سوا کسی اور کے لئے آگ کا عذاب دینا جائز نہیں۔

(انه لا ینبغی ان یعذب بالنار الا رب النار (مسلم)

کسی کھانے کو حقیر نہ سمجھے

امام بیہقی نے حضرت امین سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جابر رضی اللہ عنہ کے یہاں کچھ مہمان آئے۔ آپ ان کے سامنے روٹی اور سرکہ لائے اور کہا کہ اس کو کھائیے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "کیا ہی بہترین سالن ہے سرکہ" نیز آپ نے فرمایا: ہلاکت ہے اس قوم کے لئے جو اس چیز کو حقیر سمجھے جو اس کے سامنے پیش کی گئی ہو (ھلاک بالقوم ان یحتقروا ماقدم الیھم (کنز العمال جلد ۵)

کبر کا رویہ اللہ کو پسند نہیں

ابو نعیم نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ میرے پاس ایک مسکین عورت آئی۔ اس کے پاس کوئی چیز تھی جو وہ مجھ کو دینا چاہتی تھی۔ مجھے اس پر رحم آیا اور میں نے اس کا ہدیہ لینا پسند نہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: تم اس کے ہدیہ کو قبول کر لیتیں اور اس کو کچھ بدلہ دے دیتیں: میرا خیال ہے کہ تم نے اس کو حقیر سمجھا۔ اے عائشہ! تواضع اختیار کر۔ کیوں کہ اللہ تواضع کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور متکبرین سے بغض رکھتا ہے۔ (فاری انک حقرتیھا فتواضعی یا عائشۃ۔ فان اللہ یحب المتواضعین ویبغض المستکبرین (حلیۃ الاولیاء، جلد ۴)

شان ظاہر کرنے کے لئے دعوت کا اہتمام پسندیدہ نہیں

احمد اور ابن المبارک نے حمید بن نعیم سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عمر بن خطاب اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما کو کھانے کی ایک دعوت میں بلایا گیا جس کو انھوں نے قبول کر لیا۔ جب وہ دونوں اس کے لئے جانے لگے تو عمر رض نے عثمان رض سے کہا: میں اس کھانے کے لئے چل رہا ہوں۔ مگر مجھ کو پسند تھا کہ میں اس میں نہ جاتا۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کس لئے۔ انھوں نے فرمایا: مجھے اندیشہ ہے کہ یہ فخر و نمائش کے لئے کیا گیا ہو (خشیت ان یکون مباھاۃ" کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۶۶)

تواضع سے بلندی پیدا ہوتی ہے

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی مال صدقہ دینے سے کم نہیں ہوتا۔ معافی صرف بندہ کی عزت کو بڑھاتی ہے اور تواضع سے ہمیشہ آدمی کا درجہ بلند ہوتا ہے (مانقصت صدقۃ من مال وما زاد اللہ عبدا بعفو الا عزا وما تواضع احد للہ الا رفعہ اللہ، مسلم)

رسول نے اپنا ہاتھ چومنے کی اجازت نہ دی

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دکان دار کے یہاں سے کپڑا خریدا۔ خریداری سے فارغ ہو کر جب آپ اٹھنے لگے تو دکان دار نے بڑھ کر آپ کے ہاتھ کو بوسہ دینا چاہا آپ نے فوراً اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور فرمایا: یہ کام وہ ہے جس کو عجمی لوگ اپنے بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں مگر میں بادشاہ نہیں ہوں۔ میں صرف تم میں سے ایک آدمی ہوں (ھذا تفعلہ الاعاجم بملوکھا ولست بملک انما انا رجل منکم)

حق کے ساتھ تحقیر کا معاملہ کرنا کبر ہے

ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کبر کا تذکرہ ہوا تو آپ نے اس کے بارے میں سخت الفاظ کہے پھر یہ آیت پڑھی: ان اللہ لا یحب کل مختال فخور (اللہ کسی خود پسند اور بڑائی کرنے والے شخص کو پسند نہیں کرتا) اس موقع پر ایک شخص نے کہا: خدا کی قسم اے خدا کے رسول میں اپنے کپڑے دھوتا ہوں تو مجھے اس کی سفیدی پسند آتی ہے۔ مجھے اپنے جوتے کا تسمہ پسند آتا ہے۔ مجھے اپنے کوڑے کا نشکن اچھا معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ کبر نہیں۔ کبر تو یہ ہے کہ تم حق کی ناقدری کرو اور لوگوں کو حقیر جانو (انما الکبر ان تسفه الحق وتغمط الناس، تفسیر ابن کثیر جلد ثالث، صفحہ ۶۷)

لوگوں کے درمیان امتیاز کے بغیر بیٹھنا

عبد اللہ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے یہاں آئے۔ میں نے چمڑے کا ایک تکیہ آپ کو پیش کیا جس میں چھال بھری ہوئی تھی۔ آپ زمین پر بیٹھ گئے اور تکیہ میرے اور آپ کے درمیان پڑا رہا (دخل علی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فالقیت له وسادة من ادم حشوها لیف فجلس علی الارض وصارت الوسادة بینی وبینه، الادب المفرد صفحہ ۱۷۲)

معمولی آدمی کی بات پر بھی پوری توجہ دو

ابو رفاعہ تمیم بن اسید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ میں اپنے وطن سے چل کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ میں پہنچا تو آپ خطبہ دے رہے تھے۔ میں نے کہا: اے خدا کے رسول، میں ایک مسافر آدمی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم دین کیا ہے۔ میں آپ سے دین کی بابت پوچھنے آیا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف آئے اور خطبہ چھوڑ دیا۔ میرے پاس آکر آپ بیٹھ گئے اور اللہ نے جو کچھ آپ کو بتایا تھا وہ مجھ کو بتانا شروع کیا۔ مجھ کو بتانے کے بعد واپس ہوئے اور دوبارہ اپنے خطبہ کو مکمل کیا۔ (مسلم)

بڑوں کے آگے چلنا گستاخی نہیں ہے

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اونٹنی تھی جس کا نام عضبا رتھا۔ کوئی اپنا اونٹ اس سے آگے نہیں بڑھاتا تھا۔ ایک دن ایک دیہاتی آیا۔ وہ ایک چھوٹی اونٹنی پر سوار تھا۔ اس کی اونٹنی آپ کی اونٹنی سے آگے بڑھ گئی۔ مسلمانوں پر یہ بات شاق گزری۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا اندازہ ہوا تو آپ نے فرمایا: اللہ نے اس کا ذمہ لیا ہے کہ دنیا کی جو چیز بھی اونچی ہوگی اس کو نیچا کرے گا (حق علی اللہ ان لا یرتفع شیئ من الدنیا الا وضعه، بخاری)

جو اپنے کو چھوٹا جانے وہی اللہ کے نزدیک بڑا ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اس کو بلند کرتا ہے۔ وہ اپنے جی میں اپنے کو حقیر سمجھتا ہے مگر لوگوں کے نزدیک وہ بڑا ہوتا ہے (مختصر تفسیر ابن کثیر، جلد ثانی، صفحہ ۳۷۷)

اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ ماحول کے اندر اس کا غلبہ قائم رہے۔ عمومی طور پر ایسی ذہنی فضا بن جائے کہ دین اور خدا کی بات ہلکی بات نہ رہے بلکہ وہ لوگوں کو بھاری بھرکم بات نظر آئے۔

ذہنی غلبہ کی یہ فضا اسلام دو طریقوں سے حاصل کرتا ہے۔ ایک سیاسی قوت۔ دوسرے، عقلی استدلال۔ اگر کسی علاقے میں اسلام کا سیاسی اقتدار قائم ہو جائے تو خواہ حکومت مذہبی معاملات میں غیر جانب دار ہی کیوں نہ ہو، اسلام کے حق میں ذہنی غلبہ کی ایک فضا خود بخود قائم ہو جاتی ہے۔ ہندستان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آٹھ نو سو برس کی حکومت کے باوجود یہاں کے مسلم حکمرانوں نے کبھی اشاعت دین کی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ اس غلطی کے لئے میں انھیں معذور قرار دینے کا وکیل نہیں بن سکتا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ مسلم اقتدار نے عمومی غلبہ کی جو فضا پیدا کی، وہ تبلیغ دین کی غیر سرکاری کوششوں میں مددگار ثابت ہوئی۔ جب اس علاقے کو خراسان اور ماوراء النہر کے سیاسی حوصلہ مندوں نے فتح کیا تو اسی کے ساتھ بخارا، بلخ، سمرقند خوارزم، عراق اور ایران کے علماء قطار در قطار یہاں آنا شروع ہوئے۔ ابتداءً ملتان اور لاہور کے علاقے ان کا مرکز بنے۔ اس کے بعد جب ۶۰۷ھ میں سلطان شمس الدین التمش نے دہلی کو دارالسلطنت بنایا تو ہر طرف سے علماء سمٹ سمٹ کر دہلی میں جمع ہونے لگے۔ اس طرح حکومت کے براہ راست تعاون کے بغیر، مگر اسلام کے سیاسی غلبہ کی عمومی فضا میں، تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کے وہ سارے کارنامے انجام پائے جن کا نتیجہ آج ہم اس برصغیر میں ۲۰ کروڑ مسلمانوں کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔

ذہنی غلبہ کی اس فضا کے لئے سیاسی غلبہ ناگزیر نہیں، وہ عقلی استدلال کے ذریعہ بھی پیدا ہوتی ہے حتیٰ کہ عقلی بنیادوں پر مبنی ذہنی فضا اتنی وسیع اور قوی شکل اختیار کر سکتی ہے کہ سیاسی غلبہ سے پیدا ہونے والی فضا پر بھی بھاری ثابت ہو۔ یہاں مثال کے طور پر مغربی قوموں کی موجودہ سائنس کا نام لیا جا سکتا ہے مغربی قوموں کا سیاسی اقتدار آج ایشیا اور افریقہ سے تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ مگر مغربی قوموں نے دماغی علوم میں جو برتری حاصل کی ہے، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ آج بھی آزاد شدہ ممالک پر ان کا مکمل ذہنی غلبہ قائم ہے۔ کسی چیز یا کسی نظریے کا "فارن" ہونا اس کی بہتری کا ایسا ثبوت ہے جو بلا بحث تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ بن گیا ہے کہ جو چیز مغرب سے آئے وہ ضرور معیاری ہوگی۔ حالاں کہ صرف چند سو برس پہلے مغربی سائنس کی یہ حیثیت نہیں تھی۔ کیمسٹری، قدیم طرز کے کیمیا دانوں کے ہاتھ میں تانبے پیتل کو سونا بنانے کا ایک خبط تھا اور فلکیات پرانے نجومیوں کے ہاں لوگوں کو مستقبل کی بات بتا کر ان کو لوٹنے کی ایک بدنام تدبیر تھی۔

ذہنی مرعوبیت اور تصوراتی غلبہ کی یہ فضا جب کسی تحریک کے حق میں پیدا ہو جائے تو بہت سی مصنوعی اور غیر ضروری رکاوٹیں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں اور تحریک کی توسیع و ترقی کا کام ایک موافق فضا میں ہونے لگتا ہے۔ ذہنی غلبہ کی فضا کی مثال پختہ سڑک کی ہے۔ اگر آپ اپنی گاڑی ناہموار بیابان میں چلا رہے ہوں تو طرح طرح کی زحمتیں پیش آتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ کو ایک بنی بنائی پختہ سڑک مل جائے تو سفر نہایت تیزی

اور آسانی سے ہونے لگے گا۔

علم کلام کا ایک کام اسی قسم کی ذہنی فضا پیدا کرنا ہے ــــــ علوم کا ایسا مطالعہ کہ وہ اسلامی عقائد کے مؤید نظر آنے لگیں۔ تاریخ کی ایسی نقشہ کشی جس میں اسلام اپنی واقعی جگہ پالے۔ حقائق کائنات کی ایسی تعبیر جس سے اسلام کی تصدیق وتصویب ہو۔ اسلامی صداقتوں کا ایسے انداز اور ایسے دلائل کے ساتھ اظہار جو وقت کے ذہن پر عظیم سوالیہ نشان بن کر مسلط ہو جائے۔ غرض برتر علمی تدوین اور اعلیٰ استدلال کے ذریعہ لوگوں کے طرز فکر پر اس طرح چھا جانا کہ ان کی عقل کو نظر آنے لگے کہ اسلام کے سوا کوئی چیز حقیقت کے خانے میں بیٹھ ہی نہیں رہی ہے۔ جہاں اسلام کا احترام دلوں میں جگہ پا چکا ہو وہاں دعوت اسلام کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے اور یہ ایک طاقتور علم کلام کا نہایت اہم فائدہ ہے۔

واضح ہو کہ "اقامت دین" اور "غلبۂ دین" دونوں ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ اقامت دین کا تعلق تمام تر فرد سے ہے۔ دین کو قائم کرو (شوریٰ) کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایک شخص کو جس دین کا حامل بننا ہے اس کا وہ حامل بنے۔ ہر آدمی اپنی زندگی کو دینی زندگی بنائے۔ اللہ سے ڈرنا، اللہ سے محبت کرنا، اللہ کا پرستار بن جانا، روز وشب کی زندگی میں اللہ کو یاد کرتے ہوئے معاملہ کرنا۔ اپنے تمام معاملات کو آخرت کی بنیادوں پر قائم کرنا۔ یہی ہر فرد کا دین ہے اور اس دین پر اپنی انفرادی زندگی میں پوری طرح قائم ہو جانے کا نام اقامت دین ہے۔

غلبہ دین سے مراد ہے کسی ماحول میں اسلام کی سیاسی یا غیر سیاسی بالاتری قائم ہو جانا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں مصر میں اہل اسلام کی سیاسی برتری قائم ہو گئی تھی۔ مگر ملک کا قانون اس کے باوجود وہی تھا جو مشرک بادشاہ کے زمانہ سے چلا آرہا تھا۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حبش میں نہ سیاسی اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اور نہ وہاں کا قانون اسلام کا قانون تھا۔ مگر مسلمانوں کی نظریاتی اور اخلاقی برتری نے مسلمانوں کو وہاں یہ مقام دے دیا تھا کہ وہ عزت کے ساتھ وہاں رہیں اور آزادی کے ساتھ اپنے دین کی تبلیغ کریں۔ یہ چیز اتنی کافی سمجھی گئی کہ مسلمانوں نے حبش کے علاقہ میں کبھی فوج کشی نہ کی۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں مسلمانوں کے زیر اقتدار علاقہ میں یہ غلبہ مسلمانوں کو اپنی کامل صورت میں حاصل رہا۔

اقامت دین اور غلبہ دین کو اگر ہم معنی قرار دیا جائے تو اس سے زبردست خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک طرف یہ کہ اقیموا الدین کے حکم سے اصلاح خویش کا جو جذبہ بھڑکنا چاہئے وہ نہیں بھڑکتا۔ کیونکہ اب اس حکم کا رخ اپنے بجائے دوسروں کی طرف ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ کہ مسلم ملکوں میں جہاں اسلام کے حق میں غلبہ کی فضا موجود ہے اس کو استعمال کر کے اسلام کے لئے تعمیری اور دعوتی کام کرنے کا شوق نہیں ابھرتا بلکہ سارا زور اس پر صرف ہونے لگتا ہے کہ مسلم حکمرانوں کو تخت سے بے دخل کرو کیونکہ وہ اسلام کے اجتماعی قانون کے نفاذ کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بڑی بڑی کوششیں اس طرح ضائع ہو جاتی ہیں کہ ان سے نہ اقامت دین کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور نہ غلبۂ دین کا۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ یک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

نئے اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

- **دین کیا ہے** — صفحات ۳۲ قیمت ۱/۵۰ روپے
- **تجدیدِ دین** — صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- **مذہب اور جدید چیلنج** — صفحات ۲۲۴ قیمت ۱۳/۵۰ روپے
- **تعمیرِ ملت** — صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- **الاسلام** — صفحات ۱۷۶ قیمت ۱۲/- روپے
- **اسلام دینِ فطرت** — صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- **ظہورِ اسلام** — صفحات ۲۰۰ قیمت ۱۲/- روپے
- **زلزلۂ قیامت** — صفحات ۶۴ قیمت ۳/- روپے
- **اسلامی دعوت** — صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- **تاریخ کا سبق** — صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- **عقلیاتِ اسلام** — صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- **قرآن کا مطلوب انسان** — صفحات ۸۰ قیمت ۴/۵۰ روپے
- **مذہب اور سائنس** — صفحات ۷۲ قیمت ۴/-
- **پیغمبرِ اسلام** — صفحات ۴۸ قیمت ۲/-
- **سبق آموز واقعات** — صفحات ۴۸ قیمت ۲/-

مکتبہ الرسالہ جمعیت بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

REGD R. N. NO. 28822/76
REGD. D. (D) NO. 532

September 1980
Issue No. 46

AL-RISALA MONTHLY

AMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خان

اکتوبر ۱۹۸۰
شمارہ ۴۷

جمعیۃ بلڈنگ ، قاسم جان اسٹریٹ ، دھلی ۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک پکار

الرسالہ کی مطبوعہ قیمت دو روپے ہے۔ ایجنسی میں کمیشن اور پوسٹیج وغیرہ کا خرچ نکالنے کے بعد عملاً ادارہ کو فی پرچہ صرف ایک روپیہ ملتا ہے۔ موجودہ مہنگائی کے زمانہ میں یہ سراسر خسارہ کی صورت ہے۔ مگر الرسالہ جس تعمیری اور اصلاحی مقصد سے نکالا گیا ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس کی قیمت میں اضافہ نہ کیا جائے۔ اب اگر قیمت میں اضافہ نہ کیا جائے تو اس مسلسل خسارہ کو پورا کرنے کی صورت کیا ہو۔ اس کی سب سے بہتر صورت وہی ہے جو جدید دور میں تمام منظم مذاہب اختیار کرتے ہیں۔ یعنی اعانتی رقم (سب سڈی) کے ذریعہ اس کو پورا کرنا۔ الرسالہ کے ہمدرد اور صاحب استطاعت افراد سے ہماری اپیل ہے کہ وہ اس مد میں مسلسل اتنی رقم دیں جس سے خسارہ کی تلافی ہو سکے اور رسالہ موجودہ قیمت پر نکلتا رہے —— واضح ہو کہ اس مد میں اعانت کے علاوہ زکوٰۃ و صدقات وغیرہ کی رقمیں بھی دی جا سکتی ہیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

اسلام زندگی کا ضمیمہ نہیں

پانی کے گلاس میں پتھر کا ایک ٹکڑا ڈالیں تو وہ اس کے اندر اتر کر ایک کنارے بیٹھ جائے گا۔ وہ پانی میں ہوگا مگر پانی سے الگ ہوگا۔ پتھر پتھر رہے گا اور پانی پانی۔ مگر اسی گلاس میں جب آپ رنگ ڈالتے ہیں تو رنگ اور پانی دونوں مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اب پانی رنگ سے الگ نہیں ہوتا بلکہ دونوں اس طرح مل جاتے ہیں کہ باہر سے دیکھنے والا ان میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا۔

اسلام کا معاملہ اور آدمی کا معاملہ پتھر اور پانی جیسا معاملہ نہیں ہے بلکہ وہ رنگ اور پانی جیسا معاملہ ہے۔ مسلمانوں کی زندگی میں اسلام ایک علیحدہ ضمیمہ کی طرح نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کی پوری ہستی میں سما جاتا ہے۔ وہ اس کے جذبات میں شامل ہو کر اس کے دل کی دھڑکن بن جاتا ہے۔ وہ اس کی سوچ میں اس طرح داخل ہوتا ہے کہ اس کا ذہن اسی کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔ اسلام اس کی آنکھ بن جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے۔ وہ اس کی زبان بن جاتا ہے جس سے وہ بولتا ہے۔ وہ اس کا ہاتھ پاؤں بن جاتا ہے جس کے تحت وہ دنیا میں اپنی تمام کارروائیاں کرتا ہے۔ اسلام وہی ہے جو آدمی کے اوپر اس طرح چھا جائے کہ اس کی کوئی چیز اس سے باہر نہ رہے۔ اس کے ہر بول میں اسلام کی جھلک ہو۔ اس کا ہر عمل اسلام کے رنگ میں رنگا ہوا ہو۔

جو اسلام پانی میں پتھر کی طرح رہے وہ اسلام نہیں ہے۔ اسلام وہی ہے جو پانی کے اندر رنگ کی طرح گھل جائے۔ آدمی کو کسی سے محبت ہو تو اس کا پورا وجود اس سے محبت کرتا ہے۔ اس کو کسی سے نفرت ہو تو اس کا پورا وجود اس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص اسلام کو حقیقی معنوں میں اپناتا ہے تو وہ اس کے پورے وجود کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ وہ کہیں بھی اسلام سے الگ نہیں ہوتا اور نہ اسلام اس سے۔

مشینی ذہانت

کمپیوٹر ایک قسم کی مشین ہے جس کو انتہائی طویل اور پیچیدہ حسابات کے حل کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ہزاروں ریاضی داں مل کر جس حساب کو کئی دن میں حل کریں گے اس کو ایک کمپیوٹر حد درجہ صحت کے ساتھ ایک سکنڈ سے بھی کم عرصہ میں حل کر دیتا ہے۔ کمپیوٹر کے یہ کارنامے دیکھ کر بہت سے لوگوں نے سمجھا کہ اب سائنس اپنی ترقی کے اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ وہ "مشینی دماغ" کو تیار کر سکے۔ اس کا مطلب صرف یہی نہیں تھا کہ ایک چیز جو ابھی تک صرف قدرت کے کارخانہ میں بنتی تھی وہ انسانی کارخانوں میں تیار ہونے لگے گی۔ اس کا ایک فلسفیانہ پہلو بھی تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ کائنات کے نظام کے لئے کسی شعوری وجود کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ ایک مشینی دماغ جس طرح نہایت صحت کے ساتھ مختلف واقعات کو رونما کر سکتا ہے اسی طرح کائنات کا مشینی کارخانہ بھی، اپنے مشینی نظام کے تحت خود بخود چلا جا رہا ہے، اس سے ماورا کوئی شعوری ہستی نہیں جو اس کو چلانے والی ہو۔ تاہم گہرے مطالعہ اور تجربہ نے اس خوش فہمی کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ ایک ماہر نے لکھا ہے:

The question of artificial intelligence remains mainly unresolved. It is easy for instance, to design a computor which will learn as it goes along and thus come closer and closer to the brain. Nevertheless the lead must come from biological, and not mechanical, intelligence. Thus all these instruments radio-telescope, accelerators, spectrometers, computors- are merely adjuncts to the human brain.

مصنوعی ذہانت کا مسئلہ بنیادی طور پر ابھی تک غیر حل شدہ ہے۔ مثال کے طور پر یہ آسان ہے کہ ایک ایسا کمپیوٹر بنایا جائے جو قریب قریب وہی کچھ کرنا سیکھ لے جو انسان کا دماغ کرتا ہے۔ تاہم اس کمپیوٹر کو رہنمائی دینا پھر بھی حیاتیاتی ذہانت کا کام رہے گا نہ کہ کسی مشینی ذہانت کا۔ اس طرح کمپیوٹر کی قسم کے تمام اوزار محض انسانی دماغ کے لاحقے ہیں (ٹائمس آف انڈیا ۲۷ فروری ۱۹۸۰)

مشینی ذہانت کے بارے میں اس تجربہ نے ان لوگوں کو سخت مایوس کیا ہے جو یہ امید قائم کئے ہوئے تھے کہ انسان کو بھی اسی طرح ایک خود کار قسم کا مشینی حیوان ثابت کیا جا سکتا ہے، اور پھر خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ مگر مشینی انسان کا اپنی کارکردگی کے لئے زندہ انسان کا محتاج ہونا ثابت کرتا ہے کہ انسان کی ہستی کی توجیہہ ایک بالاتر ہستی کو مانے بغیر ممکن نہیں۔ زندہ انسان کے بغیر مشینی انسان کا کوئی وجود نہیں، اسی طرح خدا کو تسلیم کئے بغیر انسان کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مشینی ارتقا اپنے آپ تخلیقی ارتقار کی تردید کر رہا ہے۔

عمل کے درجے ہیں

ابو امامہ صُدی بن عجلان الباہلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے نزدیک دو قطروں اور دو نشانات سے زیادہ محبوب کوئی چیز نہیں۔ آنسو کا قطرہ جو اللہ کے ڈر سے نکلا ہو اور خون کا قطرہ جو اللہ کی راہ میں بہے۔ اور دو نشانات میں سے ایک نشان وہ ہے جو اللہ کی راہ میں لگے اور دوسرا نشان وہ ہے جو اللہ کے فرائض میں سے کسی فرض کی ادائگی میں پڑا ہو (لیس شیئ احبَّ الی اللہِ تعالیٰ من قطرتینِ واثرین۔ قطرۃِ دُموعٍ من خشیۃِ اللہ وقطرۃِ دمٍ تہراقُ فی سبیلِ اللہ۔ واما الاثرانِ فاثرٌ فی سبیلِ اللہ تعالیٰ واثرٌ فی فریضۃٍ من فرائضِ اللہ تعالیٰ، رواہ الترمذی)

ہر عمل کے درجے ہوتے ہیں۔ آدمی کسی عمل میں جتنا زیادہ اپنے آپ کو شامل کرے، اس کو کرنے کے لئے اسے جتنا زیادہ مشقت برداشت کرنی پڑے اتنا ہی اس عمل کا درجہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ کوئی عمل محض اپنے ظاہر کے اعتبار سے خدا کے یہاں درجہ والا نہیں بنتا بلکہ اس نفسیاتی حالت کے اعتبار سے بنتا ہے جس کے تحت کسی نے اس عمل کو انجام دیا ہے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ انسان کے عمل کی نیکی بڑھتی ہے۔ یہاں تک کہ دس گنا سے سات سو گنا تک پہنچ جاتی ہے (کل عملِ ابنِ آدمَ یُضاعفُ الحسنۃُ بعشرِ امثالھا الی سبعمائۃِ ضِعفٍ، مسلم)

یہی معاملہ مذکورہ چیزوں کا بھی ہے۔ خواہ آنسو یا خون کا قطرہ ہو یا کوئی عبادتی نشان، اس کے بھی درجات ہیں۔ اور درجات کے لحاظ سے ان کا ثواب بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایک آنسو وہ ہے جو جلسۂ عام میں کسی کی آنکھ سے نکلتا ہے۔ یقیناً اس کا بھی ثواب ہے۔ مگر وہ آنسو جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرکے آنکھوں سے ٹپک پڑے اس کا درجہ اور بھی زیادہ ہے۔ ایک آنسو وہ ہے جو مشکلات ومصائب کے وقت نکلتا ہے۔ اس پر بھی آدمی کو ثواب ملے گا مگر اس آنسو کا درجہ اور بھی زیادہ بڑا ہے جو کامیابیوں کو دیکھ کر رازقِ حقیقی کے لئے نکل پڑے۔ ایک آنسو وہ ہے جو اپنے مسائل ومعاملات کو سوچ کر نکلتا ہے۔ اس کا بھی ثواب ہے۔ مگر ان آنسوؤں کے درجہ کا کون اندازہ کرسکتا ہے جو اللہ کی دنیا میں اللہ کی کاریگری کو دیکھ کر ایک بندہ کی آنکھ سے بہہ پڑتے ہیں۔

یہی معاملہ "خون" کا ہے۔ ایک خون کا قطرہ وہ ہے جو فوری مقابلہ کے وقت چوٹ کھا کر

آدمی کے جسم سے نکلتا ہے۔ یقیناً اللہ کے یہاں اس کا ثواب ہے۔ مگر اللہ کا ایک بندہ جب اللہ کی راہ میں برسہا برس تک مشقتیں اٹھاتے ہوئے اپنے خون کو خشک کرتا ہے تو اس کا ثواب اور بھی زیادہ ہے۔ ظالموں کا ایک گروہ آدمی کے جان ومال پر حملہ کرتا ہے اور وہ اس کے دفاع میں اپنے جسم کو زخمی کرلیتا ہے یا شہید ہوجاتا ہے تو اس خون بہانے کا بھی ثواب ہے۔ مگر جب اللہ کا ایک بندہ یہ سوچ کر تڑپ اٹھتا ہے کہ لوگ جہنم کی طرف چلے جارہے ہیں اور لوگوں کو جہنم سے بچانے کی جدوجہد میں وہ اپنے جسم کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ دیتا ہے تو یہ اتنا بڑا عمل ہوتا ہے کہ اس کی بڑائی کو ناپنے کے لئے سارے گز چھوٹے ہوجاتے ہیں اور اس کو تولنے کے لئے سارے ترازو ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔

یہی معاملہ "نشان" کا بھی ہے۔ ایک نشان یہ ہے کہ ایک جنگ پیش آئی۔ آدمی اس میں کود پڑا اور لڑائی کے نتیجہ میں اس کے جسم پر کتنے یا زخم لگنے کا کوئی مستقل نشان پڑ گیا۔ یا ایک شخص اللہ کی عبادت میں مصروف ہوتا ہے اور سجدہ کی کثرت سے اس کی پیشانی پر نشان پڑ جاتا ہے۔ یقیناً ایسے نشانات کا بھی خدا کے یہاں ثواب ہے۔ مگر ایک شخص وہ ہے جو دیکھتا ہے کہ خدا کی دنیا میں بے شمار ہنگامے جاری ہیں لیکن خدا کے دین کی گواہی نہیں دی جارہی ہے۔ وہ بیتابانہ خدا کا گواہ بن کر کھڑا ہوجاتا ہے۔ اس کے دوست اور رشتہ دار اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، اس کے فائدوں اور مصلحتوں کا ڈھانچہ درہم برہم ہوجاتا ہے۔ اس کو بے عزت کیا جاتا ہے، اس کو زخم پہنچائے جاتے ہیں، اس کی معاشیات کو اجاڑا جاتا ہے۔ اذیتوں پر صبر کرتے کرتے اس کا سینہ چھلنی ہوجاتا ہے۔ اس کا سکون غارت ہوجاتا ہے۔ اس کے حوصلوں اور تمناؤں کی دنیا ویران ہوجاتی ہے۔ وہ جیتے جی قبر میں دفن ہوجاتا ہے۔ پھر بھی وہ اللہ کے راستہ کو نہیں چھوڑتا، پھر بھی وہ اللہ کی گواہی کے مقام سے نہیں ہٹتا۔

ایسے شخص پر بھی "نشانات" پڑتے ہیں۔ اس کی جوانی قبل از وقت بڑھاپے میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اس کا شاداب جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کا پھول سا چہرہ گرد وغبار میں اٹ جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں آنسو بہاتے بہاتے بے رونق ہوجاتی ہیں۔ وہ دنیا پرستوں کی نظر میں ایک برباد شدہ انسان کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ زخم اور یہ نشانات مذکورہ زخموں اور نشانات سے مختلف ہوتے ہیں، بہت سے لوگوں کو وہ دکھائی بھی نہیں دیتے۔ مگر اللہ کی نظر میں ان کا درجہ اتنا زیادہ ہے کہ سارے زمین وآسمان اور انھیں کے بقدر ایک اور زمین وآسمان بھی ان کی قیمت نہیں ہوسکتے۔

ایک تجارتی راز

محلہ میں کئی مسلم ہوٹل ہیں۔ میں دس سال سے ان کو دیکھ رہا ہوں۔ مگر ان میں صرف ایک ہوٹل ایسا ہے جو اس مدت میں مسلسل ترقی کرتا رہا ہے۔ باقی تمام ہوٹل جہاں دس سال پہلے تھے وہیں آج بھی پڑے ہوئے ہیں۔ ترقی کرنے والے ہوٹل کے مالک سے میں نے ایک روز پوچھا کہ آپ کی ترقی کا راز کیا ہے۔ "بالکل سادہ" انھوں نے جواب دیا "جو چیز دوسرے ہوٹل والے کیلو میں خریدتے ہیں اس کو ہم بوروں میں خریدتے ہیں۔ ہر خریداری کے وقت ہم پورے بازار کو دیکھتے ہیں اور جو چیز جہاں کفایت سے ملتی ہے اس کو وہاں سے لیتے ہیں۔ زیادہ مقدار اور نقد خریداری کی وجہ سے چیز ہم کو اور بھی سستی پڑجاتی ہے"
اس کے بعد انھوں نے ہنس کر کہا "گاہک سے نہیں کمایا جاتا، بازار سے کمایا جاتا ہے"

عام طور پر دوکان داروں کا یہ حال ہے کہ جو گاہک سامنے آجائے بس اس کی جیب سے زیادہ سے زیادہ پیسے نکال لینے کو دکان داری سمجھتے ہیں۔ یہ دکان داری نہیں لوٹ ہے اور جس دکان دار کے بارے میں مشہور ہوجائے کہ وہ "لوٹتا ہے" اس کے یہاں کون خریداری کے لئے جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے دکان دار زیادہ ترقی نہیں کرپاتے۔ دکان داری کا زیادہ اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ مال کی خریداری کے وقت آپ کوشش کریں کہ آپ کو کم قیمت میں مال ملے تاکہ عام نرخ سے گاہک کو دینے کے بعد بھی آپ کو زیادہ فائدہ حاصل ہو۔

یہ اصول ہر قسم کے کاروبار کے لئے صحیح ہے۔ ہر کاروبار میں ایسا ہوتا ہے کہ دکان دار اپنے گاہک کے ہاتھ جو چیز بیچتا ہے اس کو وہ خود کہیں سے خرید کر لاتا ہے۔ یہ خریداری خواہ ایک مرحلہ میں ہو یا کئی مرحلوں میں، اس کی ہمیشہ کئی صورتیں ہیں۔ اکثر دکان دار مشقت اور دوڑ بھاگ سے بچنے کے لئے کسی آسان یا قریبی ذریعہ سے اپنی ضرورت کا سامان حاصل کرلیتے ہیں۔ لیکن اگر دوڑ بھاگ کی جائے اور محنت سے کام لیا جائے تو وہی چیز نسبتاً کم قیمت میں حاصل کی جاسکتی ہے جس کو دوسرا شخص محنت سے بچنے کی خاطر زیادہ قیمت میں حاصل کررہا ہے۔

عام دکان دار ہمیشہ اپنی محنت کی کمی کو گاہک کی جیب سے زیادہ وصول کرکے پورا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس قسم کی تجارت کبھی آدمی کو بڑی ترقی تک نہیں پہنچاتی۔ بہترین تجارتی گُر یہ ہے کہ گاہک کو ممکن حد تک مناسب نرخ پر چیزیں فراہم کی جائیں اور گاہک کے ہاتھ تک پہنچنے سے پہلے کا جو مرحلہ ہے اس میں زیادہ سے زیادہ کمانے کی کوشش کی جائے۔ زیادہ کمائی بازار سے کی جائے نہ کہ گاہک سے (۱۷ اگست ۱۹۸۰)

خرچ سے اضافہ

مسٹر رام رتن کپلا (پیدائش ۱۹۱۸) نے ۱۹۳۷ میں پندرہ روپیہ ماہوار کی ایک ملازمت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اب دہلی میں نرائنا انڈسٹریل ایریا میں ان کی فیکٹری ہے اور آصف علی روڈ پر بہت بڑا شوروم ہے۔ انھوں نے اپنے ابتدائی دور کا ایک واقعہ اس طرح بتایا۔

یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے جب کہ میں ایک میکینک کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ میں نے کافی محنت سے کام کیا اور دھیرے دھیرے ۲۵ ہزار روپئے بنک میں جمع کر لئے میں بہت خوش تھا کہ میں نے کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ راولپنڈی کے ایک بزرگ "خواجہ صاحب" انھیں دنوں میرے پاس آئے۔ ہمارے ان کے درمیان بہت پرانے مراسم تھے۔ میں ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ انھوں نے مجھ سے میرے کام کے بارے میں پوچھا۔ میں نے فخر کے ساتھ انھیں بتایا کہ میں نے ۲۵ ہزار روپیہ بچا لیا ہے جو بنک میں جمع ہے۔ مجھے امید تھی کہ وہ مجھ کو شاباش دیں گے اس کے برعکس انھوں نے مجھ کو لعنت ملامت کی اور کہا کہ تم نے اپنا وقت خراب کیا، تم کو شرم آنی چاہئے کہ تمھارے پاس ۲۵ ہزار روپیہ بے کار پڑا ہوا ہے، صرف اس لئے کہ بنک کا سود ملتا رہے۔ اگر تم یہ بتاتے کہ میرے اوپر بنک کا قرض ہے تو البتہ مجھے خوشی ہوتی۔ تم فوراً بمبئی جاؤ کلکتہ جاؤ۔ وہاں جاکر کاروبار دیکھو، ایجنسی لو، روپیہ کو کام میں لاؤ۔

شری رام رتن کپلا نے بتایا کہ اس کے بعد میں ۴۶ - ۱۹۴۵ میں بمبئی گیا۔ وہاں ریفریجریٹر بنانے والی بڑی کمپنیوں کی ایجنسیاں لیں۔ اس کے بعد ہمارا کاروبار خوب بڑھا۔ کافی پیسہ ہاتھ آیا۔ اس کے بعد میں نے بارہ روپیہ ماہوار کا گیرج چھوڑ دیا اور ایک ہزار روپیہ ماہوار کرایہ پر موجودہ شوروم لیا۔

خدا نے اپنی دنیا کا نظام کچھ اس طرح بنایا ہے کہ یہاں خرچ کرنے سے اضافہ ہوتا ہے۔ آپ چند دانے "خرچ" کرتے ہیں تو کھیت اس کے بدلے میں آپ کو ہزاروں دانے لوٹاتا ہے۔ کاروبار میں آدمی روپیہ لگاتا ہے تو وہ کئی گنا زیادہ ہو کر اس کی طرف واپس آتا ہے۔ معاشرہ میں صدقات و خیرات کی صورت میں جو خرچ کیا جاتا ہے وہ بھی اس طرح اضافہ ہو کر آدمی کی طرف لوٹتا ہے کہ اس سے سماج میں باہمی اعتماد، ایک دوسرے کا لحاظ، حقوق کی ادائگی، دوسرے کے معاملہ کو اپنا معاملہ سمجھنا جیسے احساسات پرورش پاتے ہیں اور وہ بے شمار صورتوں میں خود دینے والے کو نفع پہنچاتے ہیں

آخرت کے لئے خرچ کا معاملہ بھی یہی ہے۔ اگر آپ آخرت کی راہ میں خرچ کریں تو وہ دس گنا سے سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی صورت میں آپ کی طرف لوٹایا جائے گا۔ آخرت کی راہ میں خرچ سے جو اضافہ ہوتا ہے وہ سب سے بڑا اضافہ ہے، کیونکہ وہ نہ صرف مقدار میں زیادہ ہے بلکہ وہ دائمی بھی ہے۔ آخرت کے سوا کوئی دوسرا اضافہ دائمی نہیں۔

اختلاف کے باوجود

"مجھے اپنی زندگی کے دو واقعات یاد آتے ہیں" مولانا عبدالرحیم بڈیڈوی (ہریانہ) نے کہا۔ ۵۳-۱۹۵۲ میں جب کہ میں مدرسہ سبحانیہ دہلی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میرے ساتھ یوپی کے ایک طالب علم عبدالقیوم صاحب رہتے تھے۔ وہ اپنے روپے میرے پاس امانتاً رکھتے تھے جن کو میں ان کی اجازت سے خود اپنی ضرورت کے لئے بھی استعمال کرتا تھا۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ کسی بات پر ان سے میری لڑائی ہو گئی۔ عبدالقیوم صاحب کے دوستوں نے ان کو اکسایا کہ — "عبدالرحیم نے تمھارے ساتھ زیادتی کی ہے تم ان سے اپنا سب روپیہ مانگ لو" لوگوں نے بہت کہا مگر وہ اس کے لئے راضی نہ ہوئے۔ انھوں نے کہا: ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ لڑائی الگ چیز ہے اور روپیہ الگ چیز۔ میں لڑائی کی وجہ سے ان سے اپنے روپیہ کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

دوسرا واقعہ میوات کا ہے۔ ۱۹۵۹ میں میں گلپاڑہ (ضلع بھرت پور) کے مدرسہ میں تدریسی خدمت انجام دے رہا تھا۔ وہاں کے ایک میو حاجی دراب خاں سے میری اکثر لڑائی رہتی تھی۔ اسی دوران میں ایک بار مدرسہ کے لئے چندہ کی مہم چلی۔ کچھ لوگ گھوم کر گاؤں کے ایک ایک گھر تک پہنچے اور مدرسہ کی امداد کے لئے کہا۔ کسی نے ۲۰ سیر اناج لکھوایا، کسی نے ۴۰ سیر۔ سب سے زیادہ جس نے لکھوایا وہ ایک من غلہ تھا۔ میں بھی وفد میں شامل تھا۔ لوگ حاجی دراب خاں کے گھر کی طرف چلے تو مجھے ایسا لگا کہ یہ لوگ بے کار ان کے یہاں جا رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے مدرسہ کے ساتھ کب تعاون کریں گے جس میں ان کا ایک مبغوض شخص کام کرتا ہو۔ ہم لوگ ان کے گھر پہنچے اور مدرسہ کے لئے کہا۔ انھوں نے پوچھا کہ لوگوں نے کتنا کتنا لکھوایا ہے۔ ہر ایک کی مقدار بتائی گئی جس میں سب سے زیادہ اس کا غلہ تھا جس نے ایک من لکھوایا تھا۔ انھوں نے کہا "میری طرف سے سوا من لکھ لو" اس کے بعد بولے: اگرچہ میری اس مولوی سے لڑائی ہے۔ مگر مدرسہ سے میری کوئی لڑائی نہیں۔ مولوی سے لڑائی کے باوجود میں مدرسہ کی مدد کروں گا۔

زندہ آدمی اختلاف کو اسی دائرہ میں رکھتا ہے جس دائرہ میں اختلاف پیدا ہوا ہے، اس سے باہر اس کو نہیں لے جاتا۔ کسی سے ذاتی اختلاف ہو تو اس کی بنا پر اس کے ادارہ کی جڑ کھودنے کے درپے نہیں ہوتا۔ کسی سے ایک مسئلہ میں اختلاف ہو تو اس کو سارے مسائل میں اپنا مخالف نہیں سمجھ لیتا۔ کسی سے نظریاتی اختلاف ہو تو اس کی وجہ سے ایسا نہیں کرتا کہ اس کو بے عزت کرے یا اس کی معاشیات کو برباد کرنے لگے۔ زندہ آدمی حد کے اندر رہنے والا ہوتا ہے نہ کہ حد سے گزر جانے والا۔

مومن کے صبح و شام

مسلمان سویرے بستر سے اٹھتا ہے تو اس کی زبان پر یہ دعا ہوتی ہے کہ خدایا تیرا شکر ہے، تو نے مجھے سلایا اور تو نے مجھے بیدار کیا۔ وہ پاک صاف ہو کر فجر کی نماز کے لئے مسجد پہنچتا ہے تاکہ اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مل کر خدا کی خدائی اور اس کے مقابلہ میں اپنی بندگی کا اعتراف کرے۔ وہ قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر معلوم کرتا ہے کہ اس کا رب اس سے کیا چاہتا ہے۔ اس کے بعد وہ زندگی کی سرگرمیوں میں لگ جاتا ہے۔ دن کے دوران میں اس پر تین نمازوں کے اوقات آتے ہیں۔ ظہر، عصر اور مغرب۔ ہر نماز کے وقت وہ اپنا کام چھوڑ کر اپنے اللہ کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں پہلی حیثیت خدا کو دیتا ہے نہ کہ کسی اور کو۔

جب اس کو بھوک لگتی ہے اور وہ کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے تو اس کا بال بال خدا کے شکر میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدایا تو نے کیسا عجیب پانی بنایا جس سے میں اپنی پیاس بجھاؤں اور کیسا عجیب رزق اتارا جس سے میں اپنی بھوک مٹاؤں۔ جب اس کو کوئی کامیابی ہوتی ہے تو وہ اس کو خدا کی طرف سے سمجھ کر شکر ادا کرتا ہے۔ کوئی ناکامی ہوتی ہے تو اپنی غلطی کا نتیجہ سمجھ کر اللہ سے تلافی کی دعا کرتا ہے۔ جب کسی سے اس کا سابقہ پیش آتا ہے تو وہ اس سے یہ سمجھ کر معاملہ کرتا ہے کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے اور ایک روز اس سے پوری زندگی کا حساب لے گا۔ اس طرح رات آجاتی ہے۔ اب وہ اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر دوبارہ اپنے کو پاک صاف کرتا ہے اور رات کی آخری نماز پڑھ کر سو جاتا ہے۔ سوتے ہوئے اس کی زبان پر یہ دعا ہوتی ہے: خدایا تیرے ہاتھ میں میری زندگی ہے اور تیرے ہاتھ میں میری موت ہے۔ مجھ کو معاف فرما اور مجھ کو اپنی رحمتوں کے سایہ میں داخل فرما۔

مسلمان اپنی زندگی کا نظام خدا کو سامنے رکھ کر بناتا ہے نہ کہ خدا سے آزاد ہو کر۔

اسی سے تعمیر دنیا بھی

ایک مرتبہ مجھے مسلم نوجوانوں کے ایک اجتماع میں بلایا گیا۔ میں نے وہاں آخرت کے موضوع پر کچھ باتیں عرض کیں۔ میں نے کہا کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈرے اور آخرت کی فکر رکھتے ہوئے زندگی گزارے۔ میں اپنی بات پوری کر کے چپ ہوا تو ایک نوجوان نے کہا "یہ تو خیر ٹھیک ہے، اب اصل بات شروع کیجئے" ان کو کسی نے بتایا تھا کہ میں "تعمیر ملت" کے موضوع پر کچھ باتیں پیش کروں گا۔ "آخرت" کا وعظ سن کر انھیں محسوس ہوا کہ میں نے اصل بات نہیں کہی، میں نے مسلمانوں کے دنیوی مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔

میں نے کہا کہ دنیا کی تعمیر آخرت کی تعمیر سے الگ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تعمیر آخرت ہی میں تعمیر دنیا کا راز بھی چھپا ہوا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ دنیا کی تعمیر کے لئے مسلمانوں کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ وہ ایک باشعور قوم بنیں۔ دوسرے یہ کہ انھیں اقتصادی خوش حالی حاصل ہو۔ تیسرے یہ کہ وہ ایک طاقتور قوم ہوں۔ اور یہ تینوں چیزیں آخرت کے عقیدہ سے کمال درجہ میں حاصل ہوتی ہیں۔

۱۔ آخرت کا عقیدہ انسانی شعور کو بیدار کرنے کی سب سے زیادہ کامیاب تدبیر ہے۔ آخرت پسندی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی غیبی حقیقتوں کے بارے میں حد درجہ حساس ہو جائے۔ جس آدمی کا شعور اتنا بیدار ہو کہ وہ نہ دکھائی دینے والی چیزوں کو دیکھنے لگے وہ دکھائی دینے والی چیزوں کو اور بھی زیادہ دیکھنے والا بن جائے گا۔ آخرت کوئی رسمی عقیدہ نہیں، وہ انسان کے شعور کو آخری حد تک جگا دینے والی سب سے بڑی انقلابی تدبیر ہے۔ آخرت کے عقیدہ سے سنجیدگی اور احتیاط پیدا ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کو سوچنے والا اور حقیقت پسند انسان بناتا ہے۔ ایسا آدمی ہر معاملہ کو اس کے انجام کے اعتبار سے دیکھتا ہے۔ وہ چیزوں کو ان کی اصلیت اور واقعیت کے اعتبار سے جانچنے لگتا ہے نہ کہ محض ان کی ظاہری صورت کے اعتبار سے۔ یہ باتیں جس کے اندر پیدا ہو جائیں وہ سب سے زیادہ باشعور انسان بن جاتا ہے، وہ دنیا سے لے کر آخرت تک تمام چیزوں کو خدائی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔

اس کی بہترین واقعاتی مثال صحابہ کرام کا گروہ ہے۔ انھوں نے مشکل ترین حالات میں دعوت اسلامی کے کام کو منظم کیا اور قدیم آباد دنیا کے بڑے حصہ کو نہ صرف مسلمان بنایا بلکہ ان کی زبان اور تہذیب تک کو بدل ڈالا۔ یہ سب کام وہ کبھی نہیں کر سکتے تھے اگر وہ شعور کی اعلیٰ سطح پر نہ پہنچ گئے ہوتے۔

۲۔ اقتصادی ترقی ہمیشہ دو چیزوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ محنت اور دیانت داری۔ اور آخرت کے عقیدہ سے یہ دونوں چیزیں کمال درجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ آخرت کا عقیدہ آدمی کے دل میں یہ بات بٹھا دیتا ہے کہ عمل کئے بغیر کسی کو کوئی انعام نہیں مل سکتا۔ آخرت کا عقیدہ آدمی کو بتاتا ہے کہ خدا کے یہاں صرف سچائی اور اخلاص کی قیمت ہے،

جھوٹ اور فریب کی اس کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ اس طرح جو شخص حقیقی معنوں میں آخرت پسند ہو جائے وہ اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر محنتی اور دیانت دار بن جاتا ہے۔ اور جس شخص کے اندر یہ دونوں خصوصیات پیدا ہو جائیں وہ صفر سے آغاز کرکے بھی بڑی بڑی ترقیاں حاصل کر سکتا ہے۔ اقتصادیات کی دنیا میں کسی کے لئے سب سے بڑا سرمایہ محنت اور دیانت داری ہے اور یہ دونوں چیزیں آخرت کے عقیدہ کا براہ راست نتیجہ ہیں۔ جس شخص کے اندر آخرت کا احساس ہوگا اس کے اندر لازمی طور پر محنت بھی ہوگی اور دیانت داری بھی۔

اس کی ایک واضح مثال صحابہ و تابعین کا گروہ ہے۔ یہ لوگ اپنے وطن سے بے سروسامانی کی حالت میں نکلے۔ مادی وسائل کے اعتبار سے کوئی چیز ان کے پاس نہ تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے وقت کی تجارتوں پر قبضہ کر لیا، وہ ایشیا اور افریقہ سے لے کر یورپ تک کی منڈیوں پر چھا گئے۔ ان کی اس اقتصادی کامیابی کا راز یہی دو چیزیں تھیں ——— محنت اور دیانت داری۔

۳۔ کسی قوم کی طاقت کا سب سے بڑا ذریعہ اتحاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اتحاد کا دوسرا نام طاقت ہے اور اختلاف کا دوسرا نام کمزوری۔ کسی گروہ کے افراد میں جب اتحاد ٹوٹتا ہے تو اس کی وجہ کیا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہوتی ہے اور وہ افراد کی انانیت ہے۔ اگر ہر فرد میں تواضع آجائے، ہر آدمی اپنی "انا" کو ختم کر چکا ہو تو وہاں اختلاف کا سرے سے خاتمہ ہو جائے گا۔ اور آخرت کا عقیدہ سب سے زیادہ یہی چیز پیدا کرتا ہے۔ جس شخص کے دل میں خدا کی ہیبت اور آخرت کا فکر بیٹھ جائے اس کے اندر سے گھمنڈ اور بڑائی کے تمام احساسات نکل جاتے ہیں۔ خدا کی پکڑ کا اندیشہ اس کو ایک بے "میں" والا انسان بنا دیتا ہے۔ یہی کیفیت اتحاد کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔ جس قوم کے افراد سے گھمنڈ اور انانیت نکل جائے ان کے اندر سے گویا اختلاف کی جڑ ختم ہو گئی۔ ایسے لوگ سب سے زیادہ متحد قوم بن جاتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا میں اتحاد سے بڑی کوئی دوسری طاقت نہیں۔

اس کی واقعاتی مثال اسلام کی تاریخ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں جو لوگ تیار ہوئے وہ بہت زیادہ اللہ سے ڈرنے والے اور آخرت کی فکر کرنے والے تھے۔ چنانچہ ان ابتدائی مسلمانوں میں بے پناہ اتحاد پایا جاتا تھا۔ اسی اتحاد کی طاقت سے انھوں نے اپنے سے زیادہ طاقت ور اور اپنے سے زیادہ سامان والے دشمنوں کو مغلوب کر لیا۔ مگر بعد کے دور میں جو لوگ اسلام کی صفوں میں شامل ہوئے ان میں آخرت کا عقیدہ اتنا گہرا اور اتنا زندہ نہ تھا۔ چنانچہ ہر ایک یہ چاہنے لگا کہ اس کی بات مانی جائے، اس کی بڑائی تسلیم کی جائے، اس کے نتیجہ میں ایسا اختلاف پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی طاقت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ وہ لوگ جو اب تک کفر و شرک کا زور توڑنے میں لگے ہوئے تھے وہ خود آپس میں ایک دوسرے کو برباد کرنے میں لگ گئے۔

اسلامی اخلاق

اسلامی اخلاق دوسرے لفظوں میں خدائی اخلاق ہے۔ یعنی بندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں اسی فیاضی اور وسعت کا معاملہ کرنا جو معاملہ ان کا خدا ان کے ساتھ کر رہا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور اگر تم معاف کردو اور درگزر کرو اور بخش دو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے (تغابن ۱۴) یعنی جب کسی سے تلخی یا ان بن ہو جائے تو تم وہ انداز اختیار کرو جو خدا کا انداز ہے۔ خدا آدمی کی غلطی کو معاف کرتا ہے اور کسی کی غلطی کی وجہ سے اپنی مہربانیاں اس سے اٹھا نہیں لیتا۔ یہی حال تمہارا ہونا چاہئے۔ تمہارے بارے میں کوئی شخص ایسی بات کہہ دے جس سے تم کو تکلیف پہنچ جائے، کوئی ایسا سلوک کرے جو تمہارے لئے شکایت کا باعث ہو تو محض اس وجہ سے تم اس کی طرف سے اپنے دل کو برا نہ کر لو بلکہ غلطی کو نظر انداز کرکے اور شکایت کو بھلا کر اس سے معاملہ کرو۔

اسلامی اخلاقیات ایک لفظ میں وسعت ظرف کی اخلاقیات کا نام ہے۔ عام طور پر لوگوں کا اخلاق اِس کے تابع ہوتا ہے کہ کسی نے ان کے بارے میں کیا کہا ہے اور کیا کیا ہے۔ مسلمان وہ ہے جو کسی نے کیا کہا اور کسی نے کیا کیا جیسی باتوں سے اوپر اٹھ کر لوگوں سے معاملہ کرے۔ اس کا اخلاق خدا کے حکم کے تحت بنا ہو نہ کہ ردعمل کی نفسیات کے تحت۔

اسلامی اخلاق کا اعلیٰ معیار یہ ہے کہ آدمی دوسرے کو نفع پہنچانے والا بنے، وہ دوسروں کے کام آئے۔ اور اگر کوئی شخص یہ طاقت نہیں رکھتا کہ وہ دوسرے کو نفع پہنچائے تو آخری درجہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو اپنی برائی سے بچائے۔ اس کی زبان اور اس کے ہاتھ پاؤں سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں۔ اس کے بعد اسلامی اخلاق کا کوئی درجہ نہیں۔

سچائی کا اعتراف

سچائی دنیا میں خدا کی نمائندہ ہے۔ سچائی کو نہ ماننا خدا کو نہ ماننا ہے۔ خدا کی زمین پر سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ آدمی کے سامنے ایک سچائی آئے اور وہ اس کا اعتراف نہ کرے۔ ہر سچائی خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس لئے جس نے سچائی کو نہیں مانا اس نے خدا کو نہیں مانا۔

سچائی کوئی اجنبی چیز نہیں۔ وہ آدمی کی فطرت میں گندھی ہوئی ہے۔ وہ آدمی کے لئے ایک جانی پہچانی چیز ہے۔ پھر آدمی اس کا اعتراف کیوں نہیں کرتا۔ اس کی وجہ نفسیاتی رکاوٹیں ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سچائی کو ماننے میں دنیوی مصلحتوں کا نظام ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ کبھی اعتراف کرنا آدمی سے یہ قیمت مانگتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اونچے مقام سے اتارنے پر راضی ہو جائے۔ کبھی سچائی کو ماننے میں یہ وجہ مانع ہو جاتی ہے کہ جو شخص سچائی کو پیش کر رہا ہے وہ ایک معمولی آدمی ہے یا اس سے کوئی ذاتی کدورت پیدا ہو گئی ہے۔ اس قسم کی نفسیاتی رکاوٹیں آدمی کے ذہن پر غلبہ پا لیتی ہیں۔ وہ ایک ایسی چیز کا انکار کر دیتا ہے جس کے بارے میں اگر وہ سنجیدہ ہو کر سوچے تو اس کا دل گواہی دے کہ بلاشبہ وہ حقیقت ہے۔

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں خدا خود سامنے نہیں آتا۔ یہاں وہ سچائی کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ دنیا میں آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ خدا کو سچائی کے لباس میں دیکھ لے اور اس کے آگے گر پڑے۔ ہر بار جب کوئی سچائی ظاہر ہو تو گویا خدا نے اپنا جلوہ دکھایا۔ اس وقت جو شخص عناد اور گھمنڈ اور مصلحت پرستی میں پڑ کر سچائی کو نظرانداز کر دے اس نے خدا کو نظرانداز کیا۔ اس نے خدا کو نہ پہچانا۔ اس نے اپنے آپ کو خدا سے بڑا سمجھا۔ اس نے اپنے تقاضوں کو خدا کے تقاضے پر ترجیح دی۔ ایسا شخص آخرت میں سب سے زیادہ بے سہارا ہوگا۔ کیونکہ اس دن خدا اس کو نظرانداز کر دے گا۔ اور جس کو خدا نظرانداز کر دے اس کے لئے زمین و آسمان میں کوئی ٹھکانا نہیں۔

الفاظ کی طاقت

امام حسن بصری (م ۱۱۰ھ) اور حجاج بن یوسف (م ۹۵ھ) کا زمانہ ایک ہی تھا۔ حسن بصری کی صاف گوئی حجاج کو بہت تکلیف پہنچاتی تھی۔ اس نے طے کیا کہ حسن بصری کو قتل کرا دے۔ چنانچہ اس نے حسن بصری کو اپنے دربار میں بلایا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ ان کو زندہ واپس نہیں جانے دے گا۔ میمون بن مہران بتاتے ہیں کہ حسن بصری جب دربار میں داخل ہوئے اور حجاج کے سامنے کھڑے ہوئے تو یہ گفتگو ہوئی: حسن بصری نے کہا اے حجاج، تمھارے اور آدم کے درمیان کتنے باپ ہیں۔ حجاج نے جواب دیا کہ بہت۔ حسن بصری نے کہا کہ اب وہ کہاں ہیں۔ حجاج نے کہا کہ وہ مر گئے۔ حسن بصری کا مطلب یہ تھا کہ جہاں تم مجھ کو پہنچانا چاہتے ہو اسی راستہ پر تم خود بھی تیزی سے جا رہے ہو۔ حجاج اگرچہ ایک ظالم حکمراں تھا۔ مگر یہ الفاظ سن کر اس نے سر جھکا لیا۔ اس کے بعد حسن بصری محفوظ حالت میں دربار سے باہر نکل آئے (فلما قام الحسن بین یدی الحجاج قال له یا حجاج کم بینک وبین آدم من اب۔ قال کثیر۔ قال فاین هم۔ قال ماتوا۔ ثم نکس الحجاج راسه وخرج الحسن لم یمسسه منه سوء)

اس پل پر یا اُس پل پر

ملک شاہ سلجوقی کی شاہی سواری ایک روز ایک پل سے گزر رہی تھی۔ ایک بڑھیا وہاں آکر کھڑی ہو گئی۔ بادشاہ اس کے قریب پہنچا تو بڑھیا نے پکار کر کہا: اے بادشاہ بتا میرا اور تیرا انصاف اِس پل پر ہوگا یا اُس پل (صراط) پر۔ ملک شاہ پر اس جملہ کا بے حد اثر ہوا۔ وہ گھبرا کر سواری سے اتر پڑا اور کہا: ماں، اُس پل پر کس کی ہمت ہے کہ کھڑا ہو سکے۔ بہتر ہے کہ میرا اور تمھارا احساب اسی پل پر ہو جائے۔ اس کے بعد بڑھیا نے بتایا کہ سپاہیوں نے اس کی گائے پکڑ کر ذبح کر دی ہے، میں تم سے اس ظلم کا انصاف چاہتی ہوں۔ ملک شاہ سلجوقی وہیں ٹھہر گیا اور معاملہ کی تحقیق شروع کر دی۔ جب ثابت ہو گیا کہ بڑھیا کی شکایت صحیح ہے تو اس نے اسی وقت مجرموں کو سزا دی۔ اس کے بعد اس نے بڑھیا سے معافی مانگی اور گائے کی اصل قیمت سے بہت زیادہ معاوضہ دے کر بڑھیا کو راضی کیا۔

کتے سے بھی زیادہ برا

تاتاری جب بغداد کی سلطنت پر غالب آگئے تو ان کے اندر احساس برتری پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے بہت اونچا سمجھنے لگے۔ ایک تاتاری شہزادہ ایک بار گھوڑے پر سوار ہو کر شکار کے لئے جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا کتا بھی تھا۔ راستہ میں ایک مسلمان بزرگ ملے۔ اس نے مسلمان بزرگ کو اپنے پاس

بلایا اور کہا: "تم اچھے ہو یا میرا کتا" مسلمان بزرگ نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا: اگر میرا خاتمہ ایمان پر ہو تو میں اچھا ورنہ تمھارا کتا اچھا" یہ جملہ اس وقت اتنا مؤثر ثابت ہوا کہ تاتاری شہزادہ کا دل ہل گیا۔ وہ اس "ایمان" کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا جس پر آدمی کا خاتمہ نہ ہو تو وہ کتے سے بدتر ہو جاتا ہے۔ اس تلاش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر وہ مسلمان ہو گیا۔

غریبی کا مطلب بے وقوفی نہیں

کچھ معزز لوگ ایک مقام پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے اتنے میں ایک بھکاری عورت آئی۔ اس نے سوال کیا مگر کسی نے اس کو جواب نہ دیا۔ اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ اب بھی کسی نے اس کو جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی، لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اس سے زیادہ ضروری گفتگو میں مصروف ہیں کہ ایک بھکاری عورت کا جواب دیں۔ بھکاری عورت اس کے باوجود بار بار اپنے سوال کو دہراتی رہی۔ مجلس میں ایک معزز بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کو اس مسلسل مداخلت پر غصہ آگیا۔ انھوں نے سخت لہجہ میں کہا: "بڑی بے وقوف معلوم ہوتی ہے" عورت نے یہ سنا تو بولی: "بابا غریب آدمی بے وقوف ہی ہوتے ہیں" یہ کہا اور چلی گئی۔ اس واقعہ کے بعد مذکورہ بزرگ اکثر کہا کرتے تھے: "اس بھکاری عورت نے مجھ کو جو جواب دیا اس سے زیادہ سخت جواب مجھ کو ساری زندگی میں کسی نے نہیں دیا"

غم آدمی کو گہرا بنا دیتا ہے

اسی طرح ایک مجلس تھی۔ عمدہ قالین پر کچھ خوش پوش اور معزز افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک آدمی پھٹے حال آیا۔ وہ بلا اجازت مجلس میں بیٹھ گیا۔ ایک صاحب نے اس کو منع کیا کہ یہاں مت بیٹھو۔ بار بار منع کرنے کے بعد بھی جب وہ نہ مانا تو انھوں نے اس کو پکڑ کر مجلس سے اٹھا دیا اور کہا "جا اپنا کام کر" وہ اٹھا اور یہ کہتا ہوا چلا گیا: "ایک ہی راستہ سے آئے ہیں، ایک ہی راستہ سے جائیں گے دونوں" آدمی کا یہ جملہ اتنا مؤثر ثابت ہوا کہ اس کے بعد مجلس کا رنگ بدل گیا۔ لوگ خاموش ہو گئے اور تھوڑی دیر بعد اٹھ اٹھ کر چلے گئے۔

کبھی آدمی کی زبان سے ایک جملہ نکلتا ہے مگر وہ جملہ محض کچھ الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ سننے والے کے دل میں برچھی کی طرح چبھتا ہے۔ وہ آدمی کو تیر اور تلوار کے بغیر ذبح کر دیتا ہے۔ مگر برچھی کی مانند چبھنے والے جملے صرف انھیں لوگوں کی زبان سے نکلتے ہیں جو اس سے پہلے اپنے سینہ میں برچھی چبھا چکے ہوں۔

اللہ کا رسول

کارخانہ سے ایک مشین بن کر نکلتی ہے تو اس کے ترکیب استعمال کا کاغذ بھی ساتھ رکھ دیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ایک انجینئر آتا ہے جو عملاً کرکے دکھا دے کہ مشین کو کس طرح چلانا چاہئے۔ انسان بھی ایک زیادہ پیچیدہ قسم کی زندہ مشین ہے۔ وہ پیدا ہو کر اچانک اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں کسی پہاڑ کے اوپر یہ لکھا ہوا نہیں کہ یہ دنیا کیا ہے اور یہاں اس کو کس طرح رہنا چاہئے۔ دنیا کی تعلیم گاہوں میں ایسے انجینئر بھی تیار نہیں ہوتے جو زندگی کے راز کو جانیں اور انسان کے لئے عملی رہنما کا کام دے سکیں۔

اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے خدا نے اپنے رسول بھیجے۔ ہر رسول اپنے ساتھ اللہ کا کلام لایا۔ اس کلام کے ذریعہ خدا نے انسان کو بتایا کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے اور آدمی کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ اسی کے ساتھ رسول تمام انسانوں کے لئے خدا پرستانہ زندگی کا نمونہ تھے۔ آدمی کن جذبات و خیالات کے ساتھ جئے۔ وہ اپنے رب کو کس طرح یاد کرے۔ انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے وہ لوگوں کے ساتھ کس طرح معاملہ کرے۔ اس کی دوستی اور دشمنی کی بنیاد کیا ہو۔ غرض ہر آدمی صبح سے شام تک جو زندگی گزارتا ہے اس کا عملی نمونہ اس کو رسول کی زندگی میں مل جاتا ہے۔

خدا نے اگرچہ ہر آدمی کی فطرت میں حق اور ناحق کی تمیز رکھ دی ہے۔ زمین و آسمان میں بے شمار نشانیاں پھیلا دی ہیں جس سے آدمی سبق حاصل کر سکے۔ تاہم اسی کے ساتھ خدا نے انسانوں کی زبان میں اپنی کتاب بھی اتاری اور انسانوں میں سے اپنے کچھ بندوں کو منتخب کرکے اپنا رسول مقرر کیا تاکہ ہدایت اور گمراہی کو سمجھنے میں آدمی کے لئے کوئی شبہ باقی نہ رہے۔

اے ایمان والو، ایسی باتوں کے متعلق سوال نہ کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تم کو گراں گزریں۔ اور اگر تم ان کے متعلق سوال کرو گے ایسے وقت میں جب کہ قرآن اتر رہا ہے تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔ اللہ نے ان سے درگزر کیا۔ اور اللہ بخشنے والا، تحمل والا ہے۔ ایسی ہی باتیں تم سے پہلے ایک جماعت نے پوچھیں۔ پھر وہ ان کے منکر ہو کر رہ گئے۔ اللہ نے بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام (بتوں کے نام پر چھوڑے ہوئے جانور) مقرر نہیں کئے۔ مگر جن لوگوں نے کفر کیا وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ان میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ اتارا ہے اس کی طرف آؤ اور رسول کی طرف آؤ تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا ہے۔ کیا اگرچہ ان کے بڑے نہ کچھ جانتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں۔ اے ایمان والو، تم اپنی فکر رکھو۔ کوئی گمراہ ہو تو اس سے تمہارا کچھ نقصان نہیں اگر تم ہدایت پر ہو۔ تم سب کو اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے پھر وہ تم کو بتا دے گا جو کچھ تم کر رہے تھے ۱۰۵-۱۰۱

روایات میں آتا ہے کہ جب حج کا حکم آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: اے لوگو تم پر حج فرض کیا گیا ہے۔ یہ سن کر قبیلہ بنی اسد کا ایک شخص اٹھا اور کہا: اے خدا کے رسول کیا ہر سال کے لئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر سخت غضب ناک ہوئے اور فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر میں کہہ دیتا ہاں تو ہر سال کے لئے فرض ہو جاتا اور جب فرض ہو جاتا تو تم لوگ ہر سال اس کو کر نہ پاتے اور پھر تم کفر کا ارتکاب کرتے۔ بس جو میں چھوڑ دوں اس کو تم بھی چھوڑ دو۔ جب میں کسی چیز کا حکم دوں تو اس کو کرو اور جب میں کسی چیز سے روکوں تو اس سے رک جاؤ (تفسیر ابن کثیر)

غیر ضروری سوالات میں پڑنے کی ممانعت جو نزول قرآن کے وقت تھی وہی آج بھی مطلوب ہے۔ آج بھی صحیح طریقہ یہ ہے کہ جو حکم جس طرح دیا گیا ہے اس کو اسی طرح رہنے دیا جائے۔ غیر ضروری سوالات قائم کرکے اس کی حدود و قیود کو بڑھانے کی کوشش نہ کی جائے۔ جو حکم مجمل صورت میں ہے اس کو مفصل بنانا، جو مطلق ہے اس کو مقید کرنا اور جو چیز غیر معین ہے اس کو معین کرنے کے درپے ہونا دین میں ایسا اضافہ ہے جس سے اللہ اور رسول نے منع فرمایا ہے۔

کسی قوم کے جو گزرے ہوئے بزرگ ہوتے ہیں، زمانہ گزرنے کے بعد وہ مقدس حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ اکثر گمراہیاں انھیں گزرے ہوئے لوگوں کے نام پر ہوتی ہیں۔ حتی کہ اگر وہ بکری اور اونٹ کی تعظیم کا رواج قائم کر گئے ہوں تو اس کو بھی بعد کے لوگ سوچے سمجھے بغیر دہراتے رہتے ہیں۔ جس بگاڑ کی روایات ماضی کے تقدس پر قائم ہوں اس کی جڑیں اتنی گہری جمی ہوئی ہوتی ہیں کہ اس سے لوگوں کو ہٹانا سخت دشوار ہوتا ہے۔ اس قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے اوپر اٹھنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی کے اندر واقعی معنوں میں یہ یقین پیدا ہو جائے کہ بالآخر اس کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ ایسا شخص آج ہی اس حقیقت کو مان لیتا ہے جس کو موت کے بعد ہر آدمی ماننے پر مجبور ہوگا مگر اس وقت کا ماننا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

اے ایمان والو، تمھارے درمیان گواہی وصیت کے وقت، جب کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے، اس طرح ہے کہ دو معتبر آدمی تم میں سے گواہ ہوں۔ یا اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور وہاں موت کی مصیبت پیش آجائے تو تمھارے غیروں میں سے دو گواہ لے لئے جائیں۔ پھر اگر تم کو شبہ ہو جائے تو دونوں گواہوں کو نماز کے بعد روک لو اور وہ دونوں خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ ہم کسی قیمت کے عوض اس کو نہ بیچیں گے خواہ کوئی قرابت دار ہی کیوں نہ ہو۔ اور نہ ہم اللہ کی گواہی کو چھپائیں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بے شک ہم گنہ گار ہوں گے۔ پھر اگر پتہ چلے کہ ان دونوں نے کوئی حق تلفی کی ہے تو ان کی جگہ دو اور شخص ان لوگوں میں سے کھڑے ہوں جن کا حق پچھلے دو گواہوں نے مارنا چاہا تھا۔ وہ خدا کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ برحق ہے اور ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔ اگر ہم ایسا کریں تو ہم ظالموں میں سے ہوں گے۔ یہ قریب ترین طریقہ ہے کہ لوگ گواہی ٹھیک دیں۔ یا اس سے ڈریں کہ ہماری قسم ان کی قسم کے بعد الٹی پڑے گی۔ اور اللہ سے ڈرو اور سنو۔ اللہ نافرمانوں کو سیدھی راہ نہیں چلاتا

۱۰۶ — ۱۰۸

ایک آدمی سفر کرتا ہے اور اس کے ساتھ مال ہے۔ راستہ میں اس کی موت کا وقت آجاتا ہے۔ اب اگر وہ اپنے قریب دو مسلمان پائے تو ان کو اپنا مال دے دے اور اس کے بارے میں انھیں وصیت کر دے۔ اگر دو مسلمان بروقت نہ ملیں تو غیر مسلموں میں سے دو آدمی کے ساتھ یہی معاملہ کرے۔ یہ دو صاحبان مال لاکر اس کو وارثوں کے حوالے کریں۔ اس وقت وارثوں کو اگر ان کے بیان کے بارے میں شبہ ہو جائے تو کسی نماز کے بعد مسجد میں ان گواہوں کو روک لیا جائے۔ یہ دونوں شخص عام مسلمانوں کے سامنے قسم کھائیں کہ انھوں نے مرنے والے کی طرف سے جو کچھ کہا صحیح کہا۔ اگر وارث اس کے حلفیہ بیان پر مطمئن نہ ہوں تو وارثوں میں سے دو آدمی اپنی بات کے حق میں قسم کھائیں اور پھر ان کی قسم کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے۔ وارثوں کو یہ حق دینا گویا ایک ایسا روک قائم کرنا ہے کہ کوئی خیانت کرنے والا خیانت کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔

شریعت میں ایک مصلحت یہ ملحوظ رکھی گئی ہے کہ روزمرہ کے معاملات میں ایسے احکام دئے جائیں جو آدمی کی وسیع تر زندگی کے لئے سبق ہوں۔ کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کے مال کا حق داروں تک پہنچنا ایک خاندانی اور معاشی معاملہ ہے۔ مگر اس کو دو اہم باتوں کی تربیت کا ذریعہ بنا دیا گیا۔ ایک یہ کہ لوگوں میں یہ مزاج بنے کہ معاملات میں وہ تعلق اور رشتہ داری کا لحاظ نہ کریں بلکہ صرف حق کا لحاظ کریں۔ وہ یہ دیکھیں کہ حق کیا ہے نہ یہ کہ بات کس کے موافق جا رہی ہے اور کس کے خلاف۔ دوسرے یہ کہ ہر بات کو خدا کی گواہی سمجھنا۔ کوئی بات جو آدمی کے پاس ہے وہ خدا کی ایک امانت ہے۔ کیونکہ آدمی نے اس کو خدا کی دی ہوئی آنکھ سے دیکھا اور خدا کے دئے ہوئے حافظہ میں اس کو محفوظ رکھا۔ اور اب خدا کی دی ہوئی زبان سے وہ اس کے متعلق اعلان کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں یہ امانت میں خیانت ہوگی کہ آدمی بات کو اس طرح نہ بیان کرے جیسا کہ اس نے دیکھا اور جس طرح اس کے حافظہ نے اس کو محفوظ رکھا۔

جس دن اللہ پیغمبروں کو جمع کرے گا پھر پوچھے گا تم کو کیا جواب ملا تھا۔ وہ کہیں گے ہمیں کچھ علم نہیں، چھپی ہوئی باتوں کو جاننے والا تو ہی ہے۔ جب اللہ کہے گا اے عیسیٰ بن مریم میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری ماں پر کیا جب کہ میں نے روح پاک سے تمہاری مدد کی۔ تم لوگوں سے کلام کرتے تھے گود میں بھی اور بڑی عمر میں بھی۔ اور جب میں نے تم کو کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دی۔ اور جب تم مٹی سے پرندہ جیسی صورت میرے حکم سے بناتے تھے پھر اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتی تھی۔ اور تم اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے۔ اور جب تم مُردوں کو میرے حکم سے نکال کھڑا کرتے تھے۔ اور جب میں نے بنی اسرائیل کو تم سے روکا جب کہ تم ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تو ان کے منکروں نے کہا یہ تو بس ایک کھلا ہوا جادو ہے ۱۱۰-۱۰۹

پیغمبروں پر جو لوگ ایمان لائے، بعد کے زمانہ میں سب کے اندر بگاڑ پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنے طور پر ایک دین بنایا اور اس کو اپنے پیغمبر کی طرف منسوب کر دیا۔ اس کے باوجود ہر گروہ اپنے آپ کو اپنے پیغمبر کی امت شمار کرتا رہا۔ حالانکہ پیغمبر کی اصل تعلیمات سے ہٹنے کے بعد اس کا پیغمبر سے کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔ یہود اپنے کو حضرت موسیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور عیسائی اپنے کو حضرت عیسیٰ کی طرف۔ حالاں کہ ان کے مروجہ دین کا خدا کے ان پیغمبروں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ حقیقت موجودہ امتحان کی دنیا میں چھپی ہوئی ہے۔ مگر قیامت کے دن وہ کھول دی جائے گی۔ اس دن خدا تمام پیغمبروں کو اور اسی کے ساتھ ان کی امتوں کو جمع کرے گا۔ اس وقت امتوں کے سامنے ان کے پیغمبروں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنی امتوں کو کیا تعلیم دی اور امتوں نے تمہاری تعلیمات کو کس طرح اپنایا۔ اس طرح ہر امت پر اس کے پیغمبر کی موجودگی میں واضح کیا جائے گا کہ اس نے خدا کے دین کے معاملہ میں اپنے پیغمبر کی کیا کیا خلاف ورزی کی ہے اور کس طرح خود ساختہ دین کو ان کی طرف منسوب کیا ہے۔

انھیں پیغمبروں میں سے ایک مثال حضرت عیسیٰ کی ہے جو خاتم النبیین اور آپ سے پہلے کے انبیاء کی درمیانی کڑی ہیں۔ حضرت عیسیٰ کو انتہائی خصوصی معجزے دئے گئے۔ آپ پر ایمان لانے والے بہت کم تھے اور آپ کے مخالفین (یہود) کو ہر طرح کا دنیوی زور حاصل تھا۔ اس کے باوجود وہ حضرت عیسیٰ کا کچھ نقصان نہ کر سکے اور نہ آپ کے ساتھیوں کو ختم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان معجزات کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ لوگ آپ کے لائے ہوئے دین کو مان لیتے۔ مگر عملاً یہ ہوا کہ آپ کے مخالفین نے یہ کہہ کر آپ کو نظر انداز کر دیا کہ وہ جو معجزے دکھا رہے ہیں وہ سب جادو کا کرشمہ ہے۔ اور جو لوگ آپ پر ایمان لائے انھوں نے بعد کے زمانہ میں آپ کو خدائی کا درجہ دے دیا۔ قیامت کے دن آپ کی پیروی کا دعویٰ کرنے والوں کے سامنے یہ حقیقت کھول دی جائے گی کہ حضرت عیسیٰ نے جو کمالات دکھائے وہ سب خدا کے حکم سے تھے۔ آپ کے دشمنوں نے آپ کو جن خطرات میں ڈالا ان سے بھی اللہ ہی نے آپ کو بچایا۔ جب صورت حال یہ تھی اور حضرت عیسیٰ خود سامنے کھڑے ہو کر اس کی تصدیق کر رہے ہیں تو اب ان کے امتی بتائیں کہ انھوں نے آپ کی طرف جو دین منسوب کیا وہ کس نے انھیں دیا تھا۔

اور جب میں نے حواریوں کے دل میں ڈال دیا کہ مجھ پر ایمان لاؤ اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تو انھوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم فرماں بردار ہیں۔ جب حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ ابن مریم، کیا تمھارا رب یہ کرسکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے ایک خوان اتارے۔ عیسیٰ نے کہا اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہم یہ جان لیں کہ تو نے ہم سے سچ کہا اور ہم اس پر گواہی دینے والے بن جائیں۔ عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی کہ اے اللہ، ہمارے رب، تو آسمان سے ہم پر ایک خوان اتار جو ہمارے لئے ایک عید بن جائے، ہمارے اگلوں کے لئے اور ہمارے پچھلوں کے لئے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو۔ اور ہم کو عطا کر، تو ہی بہترین عطا کرنے والا ہے۔ اللہ نے کہا میں یہ خوان ضرور تم پر اتاروں گا۔ پھر اس کے بعد تم میں سے جو شخص منکر ہوگا اس کو میں ایسی سزا دوں گا جو دنیا میں کسی کو نہ دی ہوگی ۱۱۵ - ۱۱۱

لوگوں کو حق کی طرف پکارنے کا کام اگرچہ داعی انجام دیتا ہے مگر پکار پر لبیک کہنا ہمیشہ خدا کی توفیق سے ہوتا ہے۔ دعوت کی صداقت کو دلائل سے جان لینے کے بعد بھی بہت سی رکاوٹیں باقی رہتی ہیں جو آدمی کو اس کی طرف بڑھنے نہیں دیتیں ——— داعی کا ایک عام انسان کی صورت میں دکھائی دینا، یہ اندیشہ کہ دعوت قبول کرنے کے بعد زندگی کا بنا بنایا ڈھانچہ ٹوٹ جائے گا، یہ سوال کہ اگر یہ سچائی ہے تو فلاں فلاں بڑے لوگ کیا سچائی سے محروم تھے، وغیرہ۔ یہ ایک انتہائی نازک موڑ ہوتا ہے جہاں آدمی فیصلہ کے کنارے پہنچ کر بھی فیصلہ نہیں کرپاتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں خدا اس کی مدد کرتا ہے۔ جس شخص کے اندر وہ کچھ خیر دیکھتا ہے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو شبہ کی سرحد پار کرا دیتا ہے اور اس کو یقین کے دائرہ میں داخل کر دیتا ہے۔

خدا کی طرف سے ہر وقت انسان کو رزق فراہم کیا جارہا ہے۔ حتی کہ پوری زمین انسان کے لئے رزق کا دسترخوان بنی ہوئی ہے۔ مگر مومنین مسیح نے آسمان سے طعام اتارنے کا مطالبہ کیا تو ان کو سخت تنبیہ کی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام حالات میں ہم کو جو رزق ملتا ہے وہ اسباب کے پردہ میں مل رہا ہے۔ جب کہ مومنین مسیح کا مطالبہ یہ تھا کہ اسباب کا پردہ ہٹا کر ان کا رزق انھیں دیا جائے۔ یہ چیز سنت اللہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ اگر اسباب کا ظاہری پردہ ہٹا دیا جائے تو امتحان کس بات کا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ کھیت سے لہلہاتی ہوئی فصل کا پیدا ہونا یا مٹی کے اندر سے ایک شاداب درخت کا نکل کر کھڑا ہو جانا بھی اسی طرح معجزہ ہے جس طرح بادلوں میں ہو کر کسی خوان کا ہماری طرف آنا۔ مگر ان واقعات کا معجزہ ہونا ہم کو اس لئے نظر نہیں آتا کہ وہ پردہ میں ہو کر ظاہر ہو رہے ہیں۔ آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ پردہ کو پھاڑ کر حقیقت کو دیکھ سکے۔ وہ "زمین" سے نکلنے والے رزق کو "آسمان" سے اترنے والے رزق کے روپ میں پالے۔ اگر کوئی شخص یہ مطالبہ کرے کہ میں دیکھ کر مانوں گا تو گویا وہ کہہ رہا ہے کہ امتحان سے گزرے بغیر میں خدا کی رحمت میں داخل ہوں گا۔ حالاں کہ خدا کی سنت کے مطابق ایسا ہونا ممکن نہیں۔

اور جب اللہ پوچھے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا کے سوا معبود بنالو۔ وہ جواب دیں گے کہ تو پاک ہے، میرا یہ کام نہ تھا کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے یہ کہا ہوگا تو تجھ کو ضرور معلوم ہوگا۔ تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے۔ بے شک تو ہی ہے چھپی باتوں کا جاننے والا۔ میں نے ان سے وہی بات کہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا۔ یہ کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب ہے اور تمہارا بھی۔ اور میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا۔ پھر جب تو نے مجھ کو اٹھالیا تو ان پر تو ہی نگراں تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔ اگر تو ان کو سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو معاف کر دے تو تو ہی زبردست ہے حکمت والا ہے۔ اللہ کہے گا آج وہ دن ہے کہ سچوں کو ان کا سچ کام آئے گا۔ ان کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ۱۱۶-۱۲۰

قیامت جب آئے گی تو حقیقتیں اس طرح کھل جائیں گی کہ آدمی بغیر بتائے ہوئے یہ جان لے گا کہ سچ کیا ہے اور غلط کیا۔ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے کہ ساری طاقتیں صرف ایک اللہ کو حاصل ہیں۔ خالق اور مالک، معبود اور مطلوب ہونے میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں۔ اس کے سوا کسی کو نہ کوئی طاقت حاصل ہے اور نہ اس کے سوا کوئی اس قابل ہے کہ اس کی عبادت و اطاعت کی جائے۔ ایسی حالت میں جب خدا اپنے پیغمبروں سے پوچھے گا کہ میں نے تم کو کیا پیغام دے کر دنیا میں بھیجا تھا تو یہ ایک ایسی بات کا پوچھنا ہوگا جو پہلے ہی لوگوں کے لئے معلوم شدہ بن چکی ہوں گی۔ اس سوال کا جواب اس وقت اتنا کھلا ہوا ہوگا کہ کسی کے بولے بغیر قیامت کا پورا ماحول اس کا جواب پکار رہا ہوگا۔ یہ سوال و جواب محض لوگوں کی رسوائی میں اضافہ کرنے کے لئے ہوگا۔ وہ اس لئے ہوگا کہ پیغمبروں کے سامنے کھڑا کرکے لوگوں پر واضح کیا جائے کہ پیغمبروں کے نام پر جو دین تم نے بنا رکھا تھا وہ ان کی حقیقی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا

یہ دنیا امتحان کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس لئے یہاں ہر ایک کو آزادی ہے۔ یہاں آدمی خدا اور رسول کی طرف ایسا دین منسوب کرکے بھی پھل پھول سکتا ہے جس کا خدا اور رسول سے کوئی تعلق نہ ہو۔ یہاں فرضی امیدوں اور جھوٹی آرزوؤں پر بھی جنت کو اپنا حق ثابت کیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ ممکن ہے کہ آدمی اپنی قیادت کے ہنگامے کھڑے کرے اور یہ ثابت کرے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہی عین خدا کا دین ہے۔ مگر قیامت میں اس قسم کی کوئی چیز کام آنے والی نہیں۔ قیامت میں جو چیز کام آئے گی وہ صرف یہ کہ آدمی خدا کی نظر میں سچا ثابت ہو۔ آسمانی کتاب کی حامل قوموں کا امتحان یہ نہیں ہے کہ وہ ایمان کی دعوے دار بنتی ہیں یا نہیں۔ ان کا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنے دعویٔ ایمان کو سچا ثابت کرتی ہیں یا نہیں۔

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیوں اور روشنی کو بنایا۔ پھر بھی منکر لوگ دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھہراتے ہیں۔ وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر ایک مدت مقرر کی اور مقررہ مدت اسی کے علم میں ہے۔ پھر بھی تم شک کرتے ہو۔ اور وہی اللہ آسمانوں میں ہے اور وہی زمین میں۔ وہ تمھارے چھپے اور کھلے کو جانتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو ۳-۱

آسمان اور زمین کا نظام اپنی ساری وسعتوں کے باوجود اتنا مربوط اور اتنا وحدانی ہے کہ وہ پکار رہا ہے کہ اس کا خالق اور منتظم ایک خدا کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ پھر زمین و آسمان کی یہ کائنات اپنے پھیلاؤ اور اپنی حکمت و معنویت کے اعتبار سے ناقابل قیاس حد تک عظیم ہے۔ سورج کے روشن کرہ کے گرد خلا میں زمین کی حد درجہ منظم گردش اور اس سے زمین کی سطح پر روشنی اور تاریکی اور دن اور رات کا پیدا ہونا انسان کے تمام قیاس و گمان سے کہیں زیادہ بڑا واقعہ ہے۔ اب جو خدا اتنے بڑے کائناتی کارخانہ کو اتنے باکمال طریقہ پر چلا رہا ہے اس کی ذات میں وہ کون سی کمی ہوسکتی ہے جس کی تلافی کے لئے وہ کسی کو اپنا شریک ٹھہرائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری دنیا اور اس کے اندر قائم شدہ حیرت ناک نظام خود ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا خدا صرف ایک ہے اور یہی نظام اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ یہ خدا اتنا عظیم الشان ہے کہ اس کو اپنی تخلیق اور انتظام میں کسی مددگار کی ضرورت نہیں۔

موجودہ دنیا کی عمر محدود ہے۔ یہاں دکھ سے خالی زندگی ممکن نہیں۔ یہاں ہر خوش گواری کے ساتھ ناخوش گواری کا پہلو لگا ہوا ہے۔ یہاں شر کو خیر سے اور خیر کو شر سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی حالت میں آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخرت کی ابدی دنیا جو ہر قسم کے حزن (فاطر ۳۴) سے خالی ہوگی کیسے بن جائے گی۔ اگر کسی اور مادہ سے آخرت کی دنیا بننے والی ہو تو انسان اس سے واقف نہیں اور اگر اسی دنیا کے مادہ سے وہ دوسری دنیا بننے والی ہے تو اس دنیا کے اندر اس قسم کی ایک کامل دنیا کو وجود میں لانے کی صلاحیت نہیں۔

مگر سوال کرنے والے کا خود اپنا وجود ہی اس سوال کا جواب دینے کے لئے کافی ہے۔ انسان کا جسم پورا کا پورا مٹی (زمینی اجزاء) سے بنا ہے، مگر اس کے اندر ایسی منفرد صلاحیتیں ہیں جن میں سے کوئی صلاحیت بھی مٹی کے اندر نہیں۔ آدمی سنتا ہے، وہ بولتا ہے، وہ سوچتا ہے، وہ طرح طرح کے حیرت ناک عمل انجام دیتا ہے۔ حالانکہ وہ جس مٹی سے بنا ہے وہ اس قسم کا کوئی بھی عمل انجام نہیں دے سکتی۔ زمینی اجزاء سے حیرت انگیز طور پر ایک غیر زمینی مخلوق بن کر کھڑی ہوگئی ہے۔ یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو ہر روز آدمی کے سامنے آرہا ہے۔ ایسی حالت میں کیسی عجیب بات ہے کہ آدمی آخرت کے واقع ہونے پر شک کرے۔ اگر مٹی سے جیتا جاگتا انسان نکل سکتا ہے۔ اگر مٹی سے خوشبودار پھول اور ذائقہ دار پھل برآمد ہوسکتے ہیں تو ہماری موجودہ دنیا سے ایک اور زیادہ کامل اور زیادہ معیاری دنیا کیوں ظاہر نہیں ہوسکتی۔

اور ان کے رب کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی ان کے پاس آتی ہے وہ اس سے اعراض کرتے ہیں۔ چنانچہ جو حق ان کے پاس آیا ہے اس کو بھی انھوں نے جھٹلا دیا۔ پس عنقریب ان کے پاس اس چیز کی خبریں آئیں گی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا۔ ان کو ہم نے زمین میں جمادیا تھا جتنا تم کو نہیں جمایا۔ اور ہم نے ان پر آسمان سے خوب بارش برسائی اور ہم نے نہریں جاری کیں جو ان کے نیچے بہتی تھیں پھر ہم نے ان کو ان کے گناہوں کے باعث ہلاک کر ڈالا۔ اور ان کے بعد ہم نے دوسری قوموں کو اٹھایا ۴-۶

خدا اور آخرت کی دعوت جو خدا کی براہ راست تائید سے اٹھی ہو اس کے ساتھ واضح علامتیں ہوتی ہیں جو اس بات کا اعلان کر رہی ہوتی ہیں کہ یہ ایک سچی دعوت ہے اور خدا کی طرف سے ہے —— اس کا اس فطرت کے انداز پر ہونا جس پر خدا کی ابدی دنیا کا نظام قائم ہے۔ اس کا ایسے دلائل کی بنیاد پر اٹھنا جس کا توڑ کسی کے لئے ممکن نہ ہو۔ اس کی پشت پر ایسے داعی کا ہونا جس کی سنجیدگی اور اخلاص پر شبہ نہ کیا جا سکتا ہو۔ اس کے ساتھ ایسے تائیدی واقعات کا وابستہ ہونا کہ مخالفین اپنی برتر قوت کے باوجود اس کے خلاف اپنے تخریبی منصوبوں میں کامیاب نہ ہوئے ہوں۔ اس طرح کے واضح قرائن ہیں جو اس کے برحق ہونے کی طرف کھلا اشارہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود انسان اس پر یقین نہیں کرتا اور اس کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام تائیدی قرائن اپنی ساری وضاحت کے باوجود ہمیشہ اسباب کے پردہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ آدمی کے سامنے جب یہ قرائن آتے ہیں تو وہ ان کو مخصوص اسباب کی طرف منسوب کر کے انھیں نظر انداز کر دیتا ہے، اس کا ذہن اعتراف کے رخ پر چلنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دعوت اگر خدا کی طرف سے ہوتی تو خدا اور فرشتے برہنہ صورت میں اس کے ساتھ موجود ہوتے۔ حالانکہ یہ خیال سراسر باطل ہے۔ کیونکہ خدا اور فرشتے جب برہنہ صورت میں سامنے آجائیں تو وہ فیصلہ کا وقت ہوتا ہے نہ کہ دعوت اور تبلیغ کا۔

جن لوگوں کو زمین میں جماؤ حاصل ہو، جنھوں نے اپنے لئے معاشی ساز و سامان جمع کر لیا ہو، جن کو اپنے آس پاس عظمت و مقبولیت کے مظاہر دکھائی دیتے ہوں وہ ہمیشہ غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے گرد جمع شدہ چیزوں کے مقابلہ میں ان چیزوں کو حقیر سمجھ لیتے ہیں جو داعی حق کے گرد خدا نے جمع کی ہیں۔ ان کی یہ خود اعتمادی اتنا بڑھتی ہے کہ وہ خدا کی طرف سے بھی بے خوف ہو جاتے ہیں۔ وہ داعی حق کی اس تنبیہ کا مذاق اڑانے لگتے ہیں کہ تمھاری سرکشی جاری رہی تو تمھاری مادی ترقیاں تم کو خدا کی پکڑ سے نہ بچا سکیں گی۔ داعی حق کو ناچیز سمجھنا ان کی نظر میں داعی کی تنبیہات کو بھی ناچیز بنا دیتا ہے۔ ماضی کے وہ تاریخی واقعات بھی ان کو سبق دینے کے لئے کافی ثابت نہیں ہوتے جب کہ بڑے بڑے مادی استحکام کے باوجود خدا نے لوگوں کو اس طرح مٹا دیا جیسے ان کی کوئی قیمت ہی نہ تھی —— زمین میں بار بار ایک قوم کا گرنا اور دوسری قوم کا ابھرنا ظاہر کرتا ہے کہ یہاں مکافات کا قانون نافذ ہے۔ مگر آدمی سبق نہیں لیتا۔ پچھلے لوگ دوبارہ اسی عمل کو دہراتے ہیں جس کی وجہ سے اگلے لوگ برباد ہو گئے۔

اور اگر ہم تم پر ایسی کتاب اتارتے جو کاغذ میں لکھی ہوئی ہوتی اور وہ اس کو اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے تب بھی انکار کرنے والے یہ کہتے کہ یہ تو ایک کھلا ہوا جادو ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو معاملہ کا فیصلہ ہو جاتا پھر انھیں کوئی مہلت نہ ملتی۔ اور اگر ہم کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے تو اس کو بھی آدمی بناتے اور ان کو اسی شبہ میں ڈال دیتے جس میں وہ اب پڑے ہوئے ہیں۔ اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو ان میں سے جن لوگوں نے مذاق اڑایا ان کو اس چیز نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ کہو، زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا　　۱۱-۷

دنیا میں آدمی کی گمراہی کا سبب یہ ہے کہ یہاں اس کو حق کے انکار کی پوری آزادی ملی ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ اس کو یہ موقع بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے انکار کی خوبصورت توجیہہ کرسکے۔ امتحان کی اس دنیا میں اتنی وسعت ہے کہ یہاں الفاظ ہر اس مفہوم میں ڈھل جاتے ہیں جس میں انسان ان کو ڈھالنا چاہے۔ داعی اگر ایک عام انسان کے روپ میں ظاہر ہو تو آدمی اس کو یہ کہہ کر نظر انداز کرسکتا ہے کہ یہ ایک شخص کا قیادتی حوصلہ ہے نہ کہ کوئی حق و صداقت کا معاملہ۔ اسی طرح اگر آسمان سے کوئی لکھی لکھائی کتاب اتر آئے تو اس کو رد کرنے کے لئے بھی وہ یہ الفاظ پالے گا کہ یہ تو ایک جادو ہے۔

مکہ کے لوگ کہتے تھے کہ پیغمبر اگر خدا کی طرف سے اس کی پیغام بری کے لیے مقرر کیا گیا ہے تو اس کے ساتھ خدا کے فرشتے کیوں نہیں جو اس کی تصدیق کریں۔ اس قسم کی باتیں آدمی اس لئے کہتا ہے کہ وہ دعوت کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ سنجیدہ ہو تو اس کو فوراً معلوم ہو جائے کہ یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ امتحان اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ غیبی حقیقتوں پر پردہ پڑا ہوا ہو۔ اگر غیبی حقیقتیں کھل جائیں اور خدا اور اس کے فرشتے سامنے آجائیں تو پھر پیغمبری اور دعوت رسانی کا کوئی سوال ہی نہ ہوگا۔ کیوں کہ اس کے بعد کسی کو یہ جرأت ہی نہ ہوگی کہ وہ حقائق کا انکار کرسکے ــــــــ موجودہ دنیا میں لوگ اپنی ظاہر پرستی کی وجہ سے خدا کے داعی کو اس کی باتوں کی عظمت میں نہیں دیکھ پاتے، وہ اس کا اندازہ صرف اس کے ظاہری پہلو کے اعتبار سے کرتے ہیں اور ظاہری اعتبار سے غیر اہم پاکر اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ خدا کے داعی کا معاملہ ان کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک معمولی آدمی اچانک اٹھ کر بہت بڑی حیثیت کا دعویٰ کرنے لگے۔

اس دنیا میں دعوت رسانی کا سارا معاملہ خدا کے قانون التباس کے تحت ہوتا ہے۔ یہاں حق کے اوپر ایک شبہ کا پہلو رکھا گیا ہے تاکہ آدمی اقرار کے دلائل کے ساتھ کچھ انکار کے وجوہ بھی پاسکتا ہو۔ آدمی کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ اس شبہ کے پردے کو پھاڑ کر اپنے کو یقین کے مقام پر پہنچائے۔ وہ شبہ کے پہلوؤں کو حذف کرکے یقین کے پہلوؤں کو لے لے۔ آدمی کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ دیکھے بغیر مانے۔ جب حقیقت کو دکھا دیا جائے تو پھر ماننے کی کوئی قیمت نہیں۔

پوچھو کہ کس کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ کہو سب کچھ اللہ کا ہے۔ اس نے اپنے اوپر رحمت لکھ لی ہے۔ وہ ضرور تم کو جمع کرے گا قیامت کے دن، اس میں کوئی شک نہیں۔ جن لوگوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا وہی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ ٹھیرتا ہے رات میں اور جو کچھ دن میں۔ اور وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ کہو، کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو مددگار بناؤں جو بنانے والا ہے آسمانوں اور زمین کا۔ اور وہ سب کو کھلاتا ہے اور اس کو کوئی نہیں کھلاتا۔ کہو مجھ کو حکم ملا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا بنوں اور تم ہرگز مشرکوں میں سے نہ بنو۔ کہو اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں جس شخص سے وہ اس روز ہٹا لیا گیا اس پر اللہ نے بڑا رحم فرمایا اور یہی کھلی کامیابی ہے　۱۲—۱۶

انسان کھلے ہوئے حق کا انکار کرتا ہے۔ وہ طاقت پا کر دوسروں کو ذلیل کرتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کو اپنے ظلم کا نشانہ بناتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا انسان کو اس دنیا میں مطلق اقتدار حاصل ہے۔ کیا یہاں اس کا کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ کیا خدا کے یہاں تضاد ہے کہ اس نے بقیہ دنیا کو رحمت و معنویت سے بھر رکھا ہے اور انسان کی دنیا کو ظلم اور بے انصافی سے۔ ایسا نہیں ہے۔ جو خدا زمین و آسمان کا مالک ہے وہی خدا اس مخلوق کا مالک بھی ہے جو دن کو متحرک ہوتی ہے اور راتوں کو قرار پکڑتی ہے۔ خدا جس طرح بقیہ کائنات کے لئے سراپا رحمت ہے اسی طرح وہ انسانوں کے لئے بھی سراپا رحمت ہے۔ فرق یہ ہے کہ بقیہ دنیا میں خدا کی رحمتوں کا ظہور اول دن سے ہے اور انسان کی دنیا میں اس کی رحمتوں کا کامل ظہور قیامت کے دن ہوگا۔

انسان ارادی مخلوق ہے اور اس سے ارادی عبادت مطلوب ہے۔ اسی سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو لوگ اپنے ارادہ کا صحیح استعمال نہ کریں وہ اس قابل نہیں کہ ان کو خدا کی رحمتوں میں حصہ دار بنایا جائے۔ کیوں کہ انھوں نے اپنے مقصد تخلیق کو پورا نہ کیا۔ آزمائشی مدت پوری ہونے کے بعد سارے لوگ ایک نئی دنیا میں جمع کئے جائیں گے۔ اس دن خدا اسی طرح دنیا کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے گا جس طرح آج وہ بقیہ کائنات کا انتظام اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ اس روز خدا کا انصاف کا ترازو کھڑا ہوگا۔ اس دن وہ لوگ سرفراز ہوں گے جنھوں نے حقیقت واقعہ کا اعتراف کرکے اپنے کو خدائی اطاعت میں دے دیا۔ اور وہ لوگ گھاٹے میں رہیں گے جنھوں نے حقیقت واقعہ کا اعتراف نہیں کیا اور خدا کی دنیا میں سرکشی اور ہٹ دھرمی کے طریقے پر چلتے رہے۔

انسان جب بھی سرکشی کرتا ہے کسی برتے پر کرتا ہے۔ مگر جن چیزوں کے برتے پر انسان سرکشی کرتا ہے ان کی اس کائنات میں کوئی حقیقت نہیں۔ یہاں ہر چیز بے طاقت ہے، زور والا صرف ایک خدا ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اس لئے فیصلہ کے دن وہی شخص بامراد ہوگا جس نے حقیقی سہارے کو اپنا سہارا بنایا ہوگا، جس نے حقیقی دین کو اپنی زندگی کے دین کی حیثیت سے اختیار کیا ہوگا۔

اور اگر اللہ تجھ کو کوئی دکھ پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں۔ اور اگر اللہ تجھ کو کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اسی کا زور ہے اپنے بندوں پر۔ اور وہ حکمت والا سب کی خبر رکھنے والا ہے۔ تم پوچھو کہ سب سے بڑا گواہ کون ہے۔ کہو اللہ، وہ میرے اور تمھارے درمیان گواہ ہے اور مجھ پر یہ قرآن اترا ہے تاکہ میں تم کو اس سے خبردار کر دوں اور اس کو جسے یہ پہنچے۔ کیا تم اس کی گواہی دیتے ہو کہ خدا کے ساتھ کچھ اور معبود بھی ہیں۔ کہو، میں اس کی گواہی نہیں دیتا۔ کہو، وہ تو بس ایک ہی معبود ہے اور میں بری ہوں تمھارے شرک سے ۱۷-۱۹

ہمارے سامنے جو عظیم کائنات پھیلی ہوئی ہے اس کے مختلف اجزاء باہم اتنے زیادہ مربوط ہیں کہ یہاں کسی ایک واقعہ کو ظہور میں لانے کے لئے بھی پوری کائنات کی مساعدت ضروری ہے۔ اس بنا پر کوئی بھی انسان کسی واقعہ کو ظہور میں لانے پر قادر نہیں۔ کیوں کہ کوئی بھی انسان کائنات کے اوپر قابو یافتہ نہیں۔ یہاں ایک چھوٹی سی چیز بھی اس وقت وقوع میں آتی ہے جب کہ بے شمار عالمی اسباب اس کی پشت پر جمع ہو گئے ہوں۔ اور خدا کے سوا کوئی نہیں جو ان اسباب پر حکمراں ہو۔ کائناتی اسباب کے درمیان آدمی صرف ایک حقیر ارادہ کا مالک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی کو کوئی سکھ ملے یا کسی کو کوئی دکھ پہنچے، دونوں ہی براہ راست خدا کی اجازت کے تحت ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں کسی کا یہ سوچنا بھی حماقت ہے کہ وہ کسی کو آباد یا برباد کر سکتا ہے۔ اور یہ بات بھی مضحکہ خیز حد تک بے معنی ہے کہ خدا کے سوا کوئی بھی ہے جس سے آدمی ڈرے یا خدا کے سوا کوئی ہے جس سے وہ اپنی امیدیں وابستہ کرے۔

دنیا میں اہل حق اور اہل باطل کے درمیان جو کشمکش جاری ہے اس میں فیصلہ کن چیز صرف خدا کی کتاب ہے۔ خدا کے سوا کسی کو حقائق کا علم نہیں، اور خدا کے سوا کسی کو کسی قسم کا زور حاصل نہیں۔ اس لئے خدا ہی وہ ہستی ہے جو اس جھگڑے میں واحد ثالث ہے۔ اور خدا نے قرآن کی صورت میں یہ ثالث لوگوں کے درمیان رکھ دیا ہے اب آدمی کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ اگر وہ قرآن کی صداقت سے بے خبر ہے تو وہ تحقیق کرکے جانے کہ کیا واقعۃً وہ خدا کی کتاب ہے۔ اور جب وہ جان لے کہ وہ فی الواقع خدا کی کتاب ہے تو اس کو لازماً اس کے فیصلہ پر راضی ہو جانا چاہئے۔ جو آدمی قرآن کے فیصلہ پر راضی نہ ہو وہ یہ خطرہ مول لے رہا ہے کہ آخرت میں رسوائی اور عذاب کی قیمت پر اس کو اس کے فیصلہ پر راضی ہونا پڑے۔

قرآن اس لئے اتارا گیا ہے کہ فیصلہ کا وقت آنے سے پہلے لوگوں کو آنے والے وقت سے ہوشیار کر دیا جائے۔ رسول نے یہی کام اپنے زمانہ میں کیا اور آپ کی امت کو یہی کام آپ کے بعد قیامت تک انجام دینا ہے۔ قرآن اس بات کی پیشگی اطلاع ہے کہ آخرت کی ابدی دنیا میں لوگوں کا خدا لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہے۔ پہنچانے والے اس وقت اپنی ذمہ داری سے سبک دوش ہو جاتے ہیں جب کہ وہ اس کو پوری طرح لوگوں تک پہنچا دیں مگر سننے والے خدا کے یہاں اس وقت سبک دوش ہوں گے جب کہ وہ اس کو مانیں اور اس کو اپنی عملی زندگی میں اختیار کریں۔ داعی کی ذمہ داری "تبلیغ" پر ختم ہوتی ہے اور مدعو کی ذمہ داری "اطاعت" پر۔

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ جن لوگوں نے اپنے کو گھاٹے میں ڈالا وہ اس کو نہیں مانتے۔ اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر بہتان باندھے یا اللہ کی نشانیوں کو جھٹلائے۔ یقیناً ظالموں کو فلاح نہیں ملتی۔ اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے پھر ہم کہیں گے ان شریک ٹھہرانے والوں سے کہ تمھارے وہ شریک کہاں ہیں جن کا تم کو دعویٰ تھا۔ پھر ان کے پاس کوئی فریب نہ رہے گا مگر یہ کہ وہ کہیں گے کہ اللہ اپنے رب کی قسم، ہم شرک کرنے والے نہ تھے۔ دیکھو یہ کس طرح اپنے آپ پر جھوٹ بولے اور کھوئی گئیں ان سے وہ باتیں جو وہ بنایا کرتے تھے ۲۰-۲۴

حقیقت آدمی کے لئے جانی پہچانی چیز ہے۔ کیونکہ وہ آدمی کی فطرت میں پیوست ہے اور کائنات میں ہر طرف خاموش زبان میں بول رہی ہے۔ یہود و نصاریٰ کا معاملہ اس باب میں اور بھی زیادہ آگے تھا۔ کیونکہ ان کے انبیاء اور ان کے صحیفے ان کو قرآن اور پیغمبر آخر الزماں کے بارے میں صاف لفظوں میں پیشگی خبر دے چکے تھے، حتیٰ کہ ان کے لئے اسے جاننا ایسا ہی تھا جیسا اپنے بیٹے کو جاننا۔

اس قدر کھلا ہوا ہونے کے باوجود انسان کیوں حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی وجہ وقتی نقصان کا اندیشہ ہے۔ حقیقت کو ماننا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی اپنے کو بڑائی کے مقام سے اتارے، وہ تقلیدی ڈھانچہ سے باہر آئے، وہ ملے ہوئے فائدوں کو ترک کرے۔ آدمی یہ قربانی دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا اس لئے وہ حق کو بھی قبول نہیں کرتا۔ وقتی فائدے کی خاطر وہ اپنے کو ابدی گھاٹے میں ڈال دیتا ہے۔

اپنے اس موقف پر مطمئن رہنے کے لئے مزید یہ بات اس کو دھوکے میں ڈالتی ہے کہ وہ امتحان کی اس دنیا میں ہمیشہ اپنے موافق توجیہات پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ سچائی کے حق میں ظاہر ہونے والے دلائل کو رد کرنے کے لئے جھوٹے الفاظ پالیتا ہے۔ حتیٰ کہ یہاں اس کو یہ آزادی بھی حاصل ہے کہ حقیقت کی خود ساختہ تعبیر کرکے یہ کہہ سکے کہ سچائی عین وہی ہے جس پر میں قائم ہوں۔

جب بھی آدمی خدا کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کو اپنا مرکز توجہ بناتا ہے تو دھیرے دھیرے ان چیزوں کے گرد تائیدی باتوں کا طلسم تیار ہو جاتا ہے۔ وہ موہوم آرزوؤں اور جھوٹی تمناؤں کا ایک خود ساختہ ہالہ بنالیتا ہے جو اس کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ اس نے بڑے مضبوط سہارے کو پکڑ رکھا ہے۔ مگر قیامت میں جب تمام پردے پھٹ جائیں گے اور آدمی دیکھے گا کہ خدا کے سوا تمام سہارے بالکل جھوٹے تھے تو اس کے سامنے اس کے سوا کوئی راہ نہ ہوگی کہ وہ خود اپنی کہی ہوئی باتوں کی تردید کرنے لگے۔ گویا اس قسم کے لوگ اس وقت خود اپنے خلاف جھوٹے گواہ بن جائیں گے۔ دنیا میں وہ جن چیزوں کے حامی بنے رہے اور جن سے منسوب ہونے کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے رہے، آخرت میں خود ان کے منکر ہو جائیں گے۔ انھوں نے عقائد اور توجیہات کا جو جھوٹا قلعہ کھڑا کیا تھا وہ اس طرح ڈھ جائے گا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

اور ان میں بعض لوگ ایسے ہیں جو تمھاری طرف کان لگاتے ہیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دئے ہیں کہ وہ اس کو نہ سمجھیں۔ اور ان کے کانوں میں بوجھ ہے۔ اگر وہ تمام نشانیاں دیکھ لیں تب بھی ان پر ایمان نہ لائیں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ تمھارے پاس تم سے جھگڑنے آتے ہیں تو وہ منکر کہتے ہیں کہ یہ تو بس پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ وہ لوگوں کو روکتے ہیں اور خود بھی اس سے الگ رہتے ہیں۔ وہ خود اپنے کو ہلاک کر رہے ہیں مگر وہ نہیں سمجھتے۔ اور اگر تم ان کو اس وقت دیکھو جب وہ آگ پر کھڑے کئے جائیں گے اور کہیں گے کہ کاش ہم پھر بھیج دئے جائیں تو ہم اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ہم ایمان والوں میں سے ہو جائیں۔ اب ان پر وہ چیز کھل گئی جس کو وہ اس سے پہلے چھپاتے تھے۔ اور اگر وہ واپس بھیج دئے جائیں تو وہ پھر وہی کریں گے جس سے وہ روکے گئے تھے۔ اور بے شک وہ جھوٹے ہیں ۲۵ — ۲۸

موجودہ امتحان کی دنیا میں آدمی کو یہ موقع حاصل ہے کہ وہ ہر بات کی مفید مطلب توجیہہ کر سکے۔ اس لئے جو لوگ تعصب کا ذہن لے کر بات کو سنتے ہیں ان کا حال ایسا ہوتا ہے جیسے ان کے کان بند ہوں اور ان کے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہوں۔ وہ سن کر بھی نہیں سنتے اور بتانے کے بعد بھی نہیں سمجھتے۔ دلائل اپنی ساری وضاحت کے باوجود ان کو مطمئن کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ جو کچھ سنتے ہیں مجادلہ کے ذہن سے سنتے ہیں نہ کہ نصیحت کے ذہن سے۔ ان کے اندر بات کو سننے اور سمجھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی بات کا اصل پہلو ان کے ذہن کی گرفت میں نہیں آتا۔ اس کے برعکس ہر بات کو الٹی شکل دینے کے لئے انھیں کوئی نہ کوئی چیز مل جاتی ہے۔ دلائل ان کے ذہن کا جز نہیں بنتے۔ اپنے مخالفانہ ذہن کی وجہ سے وہ ہر بات میں کوئی ایسا پہلو نکال لیتے ہیں جس کو غلط معنی دے کر وہ اپنے آپ کو بدستور مطمئن رکھیں کہ وہ حق پر ہیں۔

جو لوگ یہ مزاج رکھتے ہوں ان کے لئے تمام دلائل بے کار ہیں۔ کیونکہ امتحان کی اس دنیا میں کوئی بھی دلیل ایسی نہیں جو آدمی کو اس سے روک دے کہ وہ اس کی تردید کے لئے کچھ خود ساختہ الفاظ نہ پائے۔ اگر کوئی دلیل نہ ملی ہو تب بھی وہ حقارت کے ساتھ یہ کہہ کر اس کو نظر انداز کر دے گا: "یہ کون سی نئی بات ہے۔ یہ تو وہی پرانی بات ہے جو ہم بہت پہلے سے سنتے چلے آرہے ہیں" اس طرح آدمی اس کی صداقت کو مان کر بھی اس کو رد کرنے کا ایک بہانہ پالے گا۔ ایسے لوگ خدا کے نزدیک دہرا مجرم ہیں۔ کیونکہ وہ نہ صرف خود حق سے رکتے ہیں بلکہ ایک خدائی دلیل کو غلط معنی پہنا کر عام لوگوں کی نظر میں بھی اس کو مشکوک بناتے ہیں جو اتنی سمجھ نہیں رکھتے کہ باتوں کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ کر سکیں۔

دنیا کی زندگی میں اس قسم کے لوگ خوب بڑھ بڑھ کر باتیں کرتے ہیں۔ دنیا میں حق کا انکار کر کے آدمی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس لئے وہ غلط فہمی میں پڑا رہتا ہے۔ مگر قیامت میں جب اس کو آگ کے اوپر کھڑا کر کے پوچھا جائے گا تو ان پر ساری حقیقتیں کھل جائیں گی۔ اچانک وہ ان تمام باتوں کا اقرار کرنے لگے گا جن کو وہ دنیا میں ٹھکرا دیا کرتا تھا۔

اور کہتے ہیں کہ زندگی تو بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے۔ اور ہم پھر اٹھائے جانے والے نہیں۔ اور اگر تم اس وقت دیکھتے جب کہ وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے۔ وہ ان سے پوچھے گا: کیا یہ حقیقت نہیں ہے، وہ جواب دیں گے ہاں، ہمارے رب کی قسم، یہ حقیقت ہے۔ خدا فرمائے گا۔ اچھا تو عذاب چکھو اس انکار کے بدلے جو تم کرتے تھے۔ یقیناً وہ لوگ گھاٹے میں رہے جنھوں نے اللہ سے ملنے کو جھٹلایا۔ یہاں تک کہ جب وہ گھڑی ان پر اچانک آئے گی تو وہ کہیں گے ہائے افسوس، اس باب میں ہم نے کیسی کوتاہی کی اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ دیکھو، کیسا برا بوجھ ہے جس کو وہ اٹھائیں گے اور دنیا کی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے اور آخرت کا گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ رکھتے ہیں، کیا تم نہیں سمجھتے ۳۲-۲۹

جب بھی کوئی آدمی حق کا انکار کرتا ہے یا نفس کی خواہشات پر چلتا ہے تو ایسا اس بنا پر ہوتا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر دنیا میں نہیں رہتا کہ مرنے کے بعد وہ دوبارہ اٹھایا جائے گا اور مالک کائنات کے سامنے حساب کتاب کے لئے کھڑا کیا جائے گا۔ دنیا میں آدمی کو اختیار ملا ہوا ہے جس کو وہ بے روک ٹوک استعمال کرتا ہے۔ اس کو مال و دولت اور دوست اور ساتھی حاصل ہیں جن پر وہ بھروسہ کرسکتا ہے۔ اس کو عقل ملی ہوئی ہے جس سے وہ سرکشی کی باتیں سوچے اور اپنے ظالمانہ عمل کی خوبصورت توجیہہ کرسکے۔ یہ چیزیں اس کو دھوکے میں ڈالتی ہیں۔ وہ خدا کے سوا دوسری چیزوں پر جھوٹا بھروسہ کرلیتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ جیسا میں آج ہوں دنیا ہی میں ہمیشہ رہوں گا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ دنیا میں اس کو جو کچھ ملا ہوا ہے وہ بطور امتحان ہے نہ کہ بطور استحقاق۔

اس قسم کی زندگی خواہ وہ آخرت کا انکار کرکے ہو یا انکار کے الفاظ بولے بغیر ہو، آدمی کا سب سے بڑا جرم ہے۔ جن دنیوی چیزوں کو آدمی اپنا سب کچھ سمجھ کر ان پر ٹوٹتا ہے۔ آخر کس حق کی بنا پر وہ ایسا کر رہا ہے۔ آدمی جس روشنی میں چلتا ہے اور جس ہوا میں سانس لیتا ہے اس کا کوئی معاوضہ اس نے ادا نہیں کیا ہے۔ وہ جس زمین سے اپنا رزق نکالتا ہے اس کا کوئی بھی جزء اس کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ وہ تمام پسندیدہ چیزیں جن کو حاصل کرنے کے لئے آدمی دوڑتا ہے ان میں سے کوئی چیز نہیں جو اس کی اپنی ہو۔ جب یہ چیزیں انسان کی پیدا کی ہوئی نہیں ہیں تو جو ان تمام چیزوں کا مالک ہے کیا اس کا آدمی کے اوپر کوئی حق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی کا موجودہ دنیا کو استعمال کرنا ہی لازم کردیتا ہے کہ وہ ایک روز اس کے مالک کے سامنے حساب کے لئے کھڑا کیا جائے۔

جو لوگ دنیا کو خدا کی دنیا سمجھ کر زندگی گزاریں ان کی زندگی تقویٰ کی زندگی ہوتی ہے۔ اور جو لوگ اس کو خدا کی دنیا نہ سمجھیں ان کی زندگی لہو و لعب کی زندگی ہوتی ہے۔ لہو و لعب کی زندگی چند روز کا تماشا ہے جو مرنے کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ اور تقویٰ کی زندگی خدا کے ابدی اصولوں پر قائم ہے اس لئے وہ ابدی طور پر آدمی کا سہارا بنے گی۔ موجودہ دنیا میں آدمی ان حقیقتوں کا انکار کرتا ہے مگر امتحان کی آزادی ختم ہوتے ہی وہ اس کا اقرار کرنے پر مجبور ہوگا اگرچہ اس وقت کا اقرار اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔

ہم کو معلوم ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس سے تم کو رنج ہوتا ہے۔ یہ لوگ تم کو نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی نشانیوں کا انکار کر رہے ہیں۔ اور تم سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا تو انھوں نے جھٹلائے جانے اور تکلیف پہنچانے پر صبر کیا یہاں تک کہ ان کو ہماری مدد پہنچ گئی۔ اور اللہ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ اور پیغمبروں کی کچھ خبریں تم کو پہنچ ہی چکی ہیں۔ اور اگر ان کی بے رخی تم پر گراں گزر رہی ہے تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے لئے کوئی نشانی لے آؤ۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ پس تم نادانوں میں سے نہ بنو۔ قبول تو وہی لوگ کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور مُردوں کو اللہ اٹھائے گا پھر وہ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے ۳۶-۳۳

ابوجہل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے محمد، خدا کی قسم ہم تم کو نہیں جھٹلاتے۔ یقیناً تم ہمارے درمیان ایک سچے آدمی ہو۔ مگر ہم اس چیز کو جھٹلاتے ہیں جس کو تم لائے ہو۔ مکہ کے لوگ جو ایمان نہیں لائے وہ آپ کو ایک اچھا انسان مانتے تھے۔ مگر کسی کے متعلق یہ ماننا کہ اس کی زبان پر حق جاری ہوا ہے اس کو بہت بڑا اعزاز دینا ہے اور اتنا بڑا اعزاز دینے کے لئے وہ تیار نہ تھے۔ آپ کو جب وہ "سچا" یا "ایمان دار" کہتے تو ان کو یہ نفسیاتی تسکین حاصل رہتی کہ آپ ہماری ہی سطح کے ایک انسان ہیں۔ مگر اس بات کا اقرار کہ آپ کی زبان پر خدا کا کلام جاری ہوا ہے آپ کو اپنے سے اونچا درجہ دینے کے ہم معنی تھا۔ اور اس قسم کا اعتراف آدمی کے لئے مشکل ترین کام ہے۔

موجودہ دنیا میں خدا اپنی براہ راست صورت میں سامنے نہیں آتا، وہ دلائل اور نشانیوں کی صورت میں انسان کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے حق کے دلائل کو نہ ماننا یا اس کے حق میں ظاہر ہونے والی نشانیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا گویا خدا کو نہ ماننا اور خدا کے چہرہ کی طرف سے آنکھیں پھیر لینا ہے۔ تاہم ایسا نہیں ہو سکتا کہ خدا مجبور کن معجزات کے ساتھ سامنے آئے۔ مجبور کن معجزات کے جلو میں خدا کی دعوت پیش کی جائے تو پھر اختیار کی آزادی ختم ہو جائے گی اور امتحان کے لئے آزادانہ اختیار کا ماحول ہونا ضروری ہے۔ داعی کو اس بات کا غم نہ کرنا چاہئے کہ اس کے ساتھ صرف دلائل کا وزن ہے، غیر معمولی قسم کی تسخیری قوتیں اس کے پاس موجود نہیں۔ داعی کو اس فکر میں پڑنے کے بجائے صبر کرنا چاہئے۔ دعوت حق کی جدوجہد ایک طرف داعی کے صبر کا امتحان ہوتی ہے اور دوسری طرف مخاطبین کے لئے اس بات کا امتحان کہ وہ اپنے جیسے ایک انسان میں نمائندہ خدا ہونے کی جھلک دیکھیں۔ وہ انسان کے منھ سے نکلے ہوئے کلام میں خدائی کلام کی عظمتوں کو پالیں، وہ مادی زور سے خالی دلائل کے آگے اس طرح جھک جائیں جس طرح وہ زور آور خدا کے آگے جھکیں گے —— زندہ لوگوں کے لئے ساری کائنات نشانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور جنھوں نے اپنے احساسات کو مردہ کر لیا ہو وہ قیامت کے زلزلہ کے سوا کسی اور چیز سے سبق نہیں لے سکتے۔

اور وہ کہتے ہیں کہ رسول پر کوئی نشانی اس کے رب کی طرف سے کیوں نہیں اتری۔ کہو اللہ بے شک قادر ہے کہ کوئی نشانی اتارے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور جو بھی جانور زمین پر چلتا ہے اور جو بھی پرندہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتا ہے وہ سب تمھاری ہی طرح کے انواع ہیں۔ ہم نے لکھنے میں کوئی چیز نہیں چھوڑی ہے۔ پھر سب اپنے رب کے پاس اکٹھے کئے جائیں گے۔ اور جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا وہ بہرے اور گونگے ہیں، تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ جس کو چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے ۳۹-۳۷

ان آیات کے اختصار کو کھول دیا جائے تو پورا مضمون اس طرح ہوگا ——— وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کے ساتھ غیر معمولی نشانی کیوں نہیں جو اس کے پیغام کے برحق ہونے کا ثبوت ہو۔ تو اللہ ہر قسم کی نشانی اتارنے پر قادر ہے۔ مگر اصل سوال نشانی کا نہیں بلکہ لوگوں کی بے علمی کا ہے۔ نشانیاں تو بے شمار تعداد میں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں جب لوگ ان موجود نشانیوں سے سبق نہیں لے رہے ہیں تو کوئی نئی نشانی اتارنے سے وہ کیا فائدہ اٹھا سکیں گے طرح طرح کے چلنے والے جانور اور مختلف قسم کی اڑنے والی چڑیاں جو زمین میں اور فضا میں موجود ہیں وہ تمھارے لئے نشانیاں ہی تو ہیں۔ ان تمام زندہ مخلوقات سے بھی اللہ کو وہی کچھ مطلوب ہے جو تم سے مطلوب ہے۔ اور ہر ایک سے جو کچھ مطلوب ہے وہ خدا نے اس کے لئے لکھ دیا ہے، انسان کو شرعی طور پر اور دوسری مخلوقات کو جبلی طور پر۔ چڑیوں اور جانوروں جیسی مخلوقات خدا کے لکھے پر پورا پورا عمل کر رہی ہیں۔ مگر انسان خدا کے لکھے کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے یہ معاملہ نشانی کا نہیں بلکہ اندھے پن کا ہے، بقیہ تمام مخلوقات جو دین اختیار کئے ہوئے ہیں، انسان کے لئے اس کے سوا کوئی دین اختیار کرنے کا جواز کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن کو عمل کرنا ہے وہ نشانی کا مطالبہ کئے بغیر عمل کر رہے ہیں اور جن کو عمل کرنا نہیں ہے وہ نشانیوں کے ہجوم میں رہ کر نشانیاں مانگ رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کا انجام یہی ہے کہ قیامت میں سب کو جمع کرکے دکھا دیا جائے کہ ہر قسم کے حیوانات کس طرح حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرکے خدا کے راستہ پر چل رہے تھے۔ یہ صرف انسان تھا جو اس سے انحراف کرتا رہا۔

جانوروں کی دنیا مکمل طور پر مطابق فطرت دنیا ہے۔ ان کے یہاں رزق کی تلاش ہے مگر لوٹ اور ظلم نہیں۔ ان کے یہاں ضرورت ہے مگر حرص اور خود غرضی نہیں۔ ان کے یہاں باہمی تعلقات ہیں مگر ایک دوسرے کی کاٹ نہیں۔ ان کے یہاں اونچ نیچ ہے مگر حسد اور غرور نہیں۔ ان کے یہاں ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچتی ہے مگر بغض و عداوت نہیں۔ ان کے یہاں کام ہو رہے ہیں مگر کریڈٹ لینے کا شوق نہیں۔ مگر انسان سرکشی کرتا ہے۔ وہ خدائی نقشہ کا پابند بننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ انسان سے جس چیز کا مطالبہ ہے وہ ٹھیک وہی ہے جس پر دوسرے حیوانات قائم ہیں۔ پھر اس کے لئے معجزہ مانگنے کی کیا ضرورت۔ حیوانات کی صورت میں چلتی پھرتی نشانیاں کیا آدمی کے سبق کے لئے کافی نہیں ہیں جو خدائی طریق عمل کا زندہ نمونہ پیش کر رہی ہیں اور اس طرح پیغمبر کی تعلیمات کے برحق ہونے کی عملی تصدیق کرتی ہیں۔

کہو، یہ بتاؤ کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آئے یا قیامت آجائے تو کیا تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے۔ بتاؤ اگر تم سچے ہو، بلکہ تم اسی کو پکارو گے۔ پھر وہ دور کر دیتا ہے اس مصیبت کو جس کے لئے تم اس کو پکارتے ہو۔ اگر وہ چاہتا ہے۔ اور تم بھول جاتے ہو ان کو جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو ۴۱ — ۴۰

ابوجہل کے لڑکے عکرمہ اسلام کے سخت دشمن تھے۔ وہ فتح مکہ تک اسلام کے مخالف بنے رہے۔ فتح مکہ کے دن بھی انھوں نے ایک مسلمان کو تیر مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ عکرمہ ان اشخاص میں تھے جن کے متعلق فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا تھا کہ جہاں ملیں قتل کر دئے جائیں۔

مکہ جب فتح ہو گیا تو عکرمہ مکہ چھوڑ کر جدہ کی طرف بھاگے۔ انھوں نے چاہا کہ کشتی کے ذریعہ بحر قلزم پار کر کے حبش پہنچ جائیں۔ مگر وہ کشتی میں سوار ہو کر سمندر میں پہنچے تھے کہ تند ہواؤں نے کشتی کو گھیر لیا۔ کشتی خطرہ میں پڑ گئی۔ کشتی کے مسافر سب مشرک لوگ تھے۔ انھوں نے لات اور عزیٰ وغیرہ اپنے بتوں کو مدد کے لئے پکارنا شروع کیا۔ مگر طوفان کی شدت بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ مسافروں کو یقین ہو گیا کہ اب کشتی ڈوب جائے گی۔ اب کشتی والوں نے کہا کہ اس وقت لات وعزیٰ کچھ کام نہ دیں گے۔ اب صرف ایک خدا کو پکارو، وہی تم کو بچا سکتا ہے۔ چنانچہ سب ایک خدا کو پکارنے لگے۔ اب طوفان تھم گیا اور کشتی واپس اپنے ساحل پر آ گئی۔ عکرمہ پر اس واقعہ کا بہت اثر ہوا۔ انھوں نے کہا: خدا کی قسم، دریا میں اگر کوئی چیز خدا کے سوا کام نہیں آ سکتی تو یقیناً خشکی میں بھی خدا کے سوا کوئی دوسری چیز کام نہیں آ سکتی۔ خدایا میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تو نے مجھ کو اس سے نجات دے دی جس میں اس وقت میں پھنسا ہوا ہوں تو میں ضرور محمد کے یہاں جاؤں گا اور اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دوں گا اور مجھے یقین ہے کہ میں ان کو معاف کرنے والا، درگزر کرنے والا اور مہربان پاؤں گا۔ (اللھم لک عھد ان عافیتنی مما انا فیہ ان آتی محمد احتیٰ اضع یدی فی یدہ فلاجدنہ عفوا غفورا کریما، رواہ ابوداؤد والنسائی)

ساری تاریخ کا یہ مشاہدہ ہے کہ انسان نازک لمحات میں خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ شخص بھی جو عام زندگی میں خدا کے سوا دوسروں پر بھروسہ کئے ہو یا سرے سے خدا کو مانتا نہ ہو۔ یہ خدا کے وجود اور اس کے قادر مطلق ہونے کی فطری شہادت ہے۔ غیر معمولی حالات میں جب ظاہری پردے ہٹ جاتے ہیں اور آدمی تمام مصنوعی خیالات کو بھول چکا ہوتا ہے اس وقت آدمی کو خدا کے سوا کوئی چیز یاد نہیں آتی۔ بالفاظ دیگر، مجبوری کے نقطہ پر پہنچ کر ہر آدمی خدا کا اقرار کر لیتا ہے، قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ یہی اقرار اور اطاعت آدمی اس وقت کرنے لگے جب کہ بظاہر مجبور کرنے والی کوئی چیز اس کے سامنے موجود نہ ہو۔

بقیہ حیوانات اپنی جبلت کے تحت حقیقت پسندانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر انسان کو جو چیز حقیقت پسندی اور اعتراف کی سطح پر لاتی ہے وہ خوف کی نفسیات ہے۔ حیوانات کی دنیا میں جو کام جبلت کرتی ہے، انسان کی دنیا میں وہی کام تقویٰ انجام دیتا ہے۔

سیرت کا ایک صفحہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر جب مکہ میں داخل ہوئے تو آپ نے اپنے فوجی سرداروں کو حکم دیا کہ وہ کسی سے جنگ نہ کریں الا یہ کہ کوئی خود ان سے لڑنے کے لئے آجائے (ان لا یقاتلوا الا من قاتلھم) فتح کے بعد آپ نے عمومی طور پر ان سب لوگوں کی معافی کا اعلان کر دیا جنھوں نے آپ کے خلاف سخت ترین جرائم کئے تھے۔ البتہ آپ نے کچھ لوگوں کی بابت فرمایا کہ وہ قتل کر دئے جائیں خواہ وہ کعبہ کے پردے کے نیچے پائے جائیں۔

ابن ہشام وغیرہ نے اپنی سیرت کی کتابوں میں نام بنام ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ عبد اللہ بن سعد : یہ مسلمان ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کاتب وحی مقرر کیا۔ پھر وہ مرتد ہو کر کافروں سے جا ملے۔ فتح مکہ کے بعد جب ان کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قتل کا حکم دیا ہے تو وہ بھاگ کر حضرت عثمان کے پاس پہنچے جو ان کے دودھ شریک بھائی تھے۔ وہ ان کو چھپا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے اور کہا کہ ان کو دوبارہ مسلمان کر لیجئے۔ آپ خاموش رہے۔ حضرت عثمان نے پھر درخواست کی تو آپ نے ان سے بیعت لے لی۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان کے زمانۂ خلافت میں وہ مصر کے حاکم رہے اور افریقہ کی فتح میں ان کا خاص حصہ تھا۔

۲۔ عبد اللہ بن خطل : اس نے پہلے اسلام قبول کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صدقہ وصول کرنے کے لئے بھیجا۔ اس کے ساتھ ایک غلام اور ایک انصاری تھے۔ ایک منزل پر پہنچ کر عبد اللہ بن خطل نے اپنے غلام سے کہا کہ مرغ ذبح کر کے اس کو پکاؤ۔ مگر غلام سو گیا۔ اور وقت پر کھانا تیار نہ کر سکا۔ اس پر ابن خطل کو غصہ آگیا اور اس نے غلام کو مار ڈالا۔ اب اس کو ڈر ہوا کہ اگر میں مدینہ واپس جاتا ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے قصاص لیں گے۔ چنانچہ وہ مرتد ہو کر مکہ چلا گیا اور مشرکین سے مل گیا۔ وہ شاعر تھا اور آپؐ کی ہجو میں اشعار کہا کرتا تھا۔ فتح مکہ کے دن ابن خطل خانہ کعبہ کے پردوں سے لپٹ گیا۔ آپ کو بتایا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہیں جا کر قتل کر دو۔ چنانچہ ابو برزہ اسلمی اور سعید بن حریث نے حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان اس کو قتل کیا۔

۳۔ فرتنیٰ : یہ مذکورہ عبد اللہ بن خطل کی باندی تھی۔ وہ آپ کی ہجو میں اشعار پڑھتی تھی اور مشرکین مکہ کی شراب کی مجلسوں میں گاتی بجاتی تھی۔ آپ نے ابن خطل کے ساتھ اس کے قتل کا بھی حکم دیا اور وہ قتل کر دی گئی۔

۴۔ قُریبہ : یہ بھی عبد اللہ بن خطل کی باندی تھی اور اس کا بھی وہی پیشہ تھا جو فرتنیٰ کا تھا۔ آپ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ مگر اس نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر امن کی درخواست کی۔ اس کو آپ نے امن دے دیا اور وہ مسلمان ہو گئی۔

۵۔ حویرث بن نُقیذ بن وہب : یہ شخص شاعر تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں شعر کہتا تھا،

بالفاظ دیگر استہزاء و تمسخر کی حد تک اسلام کا مخالف تھا۔ حضرت عباس بن مطلب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں، فاطمہ اور ام کلثوم کو لے کر مکہ سے مدینہ روانہ ہوئے۔ حویرث بن نقیذ نے ان کا پیچھا کیا اور ان کے اونٹ کو نیزہ مار کر بھڑکا دیا جس کی وجہ سے دونوں خواتین زمین پر گر پڑیں۔ آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور حضرت علی نے اس کو قتل کر دیا۔

۶۔ مقیس بن صبابہ : اس شخص کا ایک بھائی ہشام بن صبابہ تھا۔ غزوہ ذی قرد کے موقع پر ایک انصاری نے ہشام کو غلطی سے قتل کر دیا۔ اس کے بعد مقیس بن صبابہ مکہ سے مدینہ آیا اور مسلمان ہو گیا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میرے بھائی کی دیت مجھے دلائی جائے جو غلطی سے دشمن سمجھ کر قتل کیا گیا ہے۔ آپ نے اس کی دیت ادا کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد وہ چند دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہا اور پھر اپنے بھائی کے قاتل کو قتل کر کے اچانک مکہ بھاگ گیا اور مرتد ہو گیا۔ آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور نمیلہ بن عبداللہ لیثی نے اس کو قتل کیا۔

۷۔ سارہ : یہ عورت عکرمہ بن ابی جہل کی باندی تھی۔ آپ کی ہجو میں اشعار گایا کرتی تھی اور آپ کا مذاق اڑاتی تھی۔ آپ نے اس کا خون مباح کیا تھا۔ پھر اس نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر امن مانگا تو آپ نے امن دے دیا۔ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ وہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت تک زندہ رہی۔

۸ - ۹ حرث بن ہشام اور زہیر بن ابی امیہ : ان دونوں شخصوں کا خون بھی مباح کر دیا گیا تھا۔ وہ بھاگ کر اپنی ایک رشتہ دار خاتون ام ہانی بنت ابی طالب کے گھر میں داخل ہو گئے۔ حضرت علی ان کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچے اور کہا کہ خدا کی قسم میں ان دونوں کو ضرور قتل کروں گا۔ ام ہانی نے حضرت علی کو روکا اور ان دونوں کو اپنے گھر میں بند کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچیں۔ اور کہا کہ میں نے ان دونوں آدمیوں کو پناہ دی ہے مگر علی ان کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم نے جن کو پناہ دی ہم نے بھی ان کو پناہ دی اور تم نے جن کو امن دیا ہم نے بھی ان کو امن دیا۔ علی رضؓ ان کو قتل نہ کریں۔ چنانچہ وہ دونوں چھوڑ دئے گئے۔

۱۰۔ عکرمہ بن ابی جہل : عکرمہ اپنے باپ کی طرح اسلام کے سخت ترین دشمن تھے۔ ان کا خون بھی آپ نے مباح کر دیا تھا۔ وہ مکہ سے بھاگ کر یمن چلے گئے۔ ان کی بیوی ام حکیم بنت حارث جو مسلمان ہو چکی تھیں۔ انھوں نے اپنے شوہر کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے امان کی درخواست کی۔ آپ نے ان کی امان منظور کر لی۔ اس کے بعد وہ یمن گئیں اور عکرمہ کو مکہ واپس لائیں۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ عکرمہ نے اس کے بعد اسلام کے لئے زبردست جانی و مالی قربانی دی۔ وہ حضرت ابوبکر کی خلافت کے زمانہ میں مرتدین سے لڑتے ہوئے اجنادین کے مقام پر شہید ہوئے۔

۱۱۔ ہبار بن الاسود : اس شخص سے مسلمانوں کو بہت تکلیفیں پہنچی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی زینب زوجہ ابوالعاص ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ جا رہی تھیں۔ ہبار بن اسود نے آپ کے اونٹ کو

نیزہ مارا۔ اس کے بعد اونٹ بدک کر دوڑا تو حضرت زینب اونٹ سے زمین پر گر پڑیں۔ اس وقت وہ حاملہ تھیں۔ ان کا حمل ساقط ہوگیا۔ اس کے بعد وہ آخر عمر تک بیمار رہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہبار کے قتل کا حکم دیا تھا۔ ہبار نے آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر امان طلب کی اور کہا کہ اے خدا کے رسول میری جہالت کو معاف کر دیجئے اور میرا اسلام قبول کر لیجئے۔ آپ نے ان کو معاف کر دیا۔

۱۲۔ وحشی بن حرب: وحشی نے آپ کے چچا حضرت حمزہ کو قتل کیا تھا اور ان کا خون بھی مباح کر دیا گیا تھا۔ وہ اولاً مکہ سے طائف بھاگ گئے۔ پھر مدینہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی غلطی کی معافی چاہتے ہوئے اسلام کی پیش کش کی۔ آپ نے ان کو اسلام میں داخل کر لیا اور ان کو معاف کر دیا۔ وہ حضرت ابوبکر کے زمانہ میں مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے اور جس حربہ سے حضرت حمزہ کو شہید کیا تھا اسی حربہ سے مسیلمہ کذاب کو قتل کیا۔

۱۳۔ کعب بن زہیر: عرب کے مشہور شاعر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار کہا کرتے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر ان کا خون بھی مباح کر دیا گیا۔ وہ مکہ سے بھاگ گئے۔ وہ بعد کو مدینہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگتے ہوئے بیعت کی درخواست کی۔ آپ نے ان کو بیعت کر لیا اور اس کے بعد ان کو اپنی چادر عنایت فرمائی۔

۱۴۔ حارث بن طلاطل: یہ شخص شاعر تھا اور اشعار کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ آپ نے اس کا خون مباح کر دیا اور حضرت علی رضی نے اس کو قتل کیا۔

۱۵۔ عبد اللہ بن زِبعری: یہ عرب کے بڑے شاعروں میں سے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذمت میں ہجویہ اشعار کہا کرتے تھے۔ آپ نے ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ وہ مکہ سے بھاگ کر نجران چلے گئے۔ بعد میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر انھوں نے توبہ کی اور اسلام لائے۔ آپ نے ان کو معاف کر دیا۔

۱۶۔ ہبیرہ بن ابی وہب مخزومی: یہ شخص شاعر تھا اور شعر کہہ کر آپ کا اور آپ کے مشن کا استہزا کیا کرتا تھا۔ آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا۔ وہ مکہ سے بھاگ کر نجران چلا گیا اور وہیں کفر کی حالت میں مر گیا۔

۱۷۔ ہند بنت عتبہ زوجہ ابوسفیان: اس عرب خاتون کو اسلام سے اتنی دشمنی تھی کہ غزوہ احد کے موقع پر انھوں نے حضرت حمزہ کا جگر نکال کر چبایا تھا۔ آپ نے ان کے قتل کا حکم دیا۔ مگر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔ آپ نے ان کو معاف کر دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر گئیں اور تمام بتوں کو توڑ ڈالا اور کہا: خدا کی قسم تمھاری ہی وجہ سے ہم دھوکہ میں تھے۔

اوپر جو تفصیل درج کی گئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد سترہ مردوں اور عورتوں کے قتل کا حکم دیا تھا۔ ان میں سے ہر شخص متعین اور معلوم شخصی جرم کی بنا پر گردن زدنی تھا تاہم ان میں سے جس شخص نے بھی معافی مانگی یا اس کی طرف سے کسی نے معافی کی درخواست کی اس کو آپ نے معاف کر دیا۔

معافی طلب کرنے والوں میں سے کسی کو بھی قتل نہیں کیا گیا۔ سترہ آدمیوں کا خون مباح کیا گیا تھا، ان میں سے گیارہ آدمیوں کو براہ راست یا بالواسطہ معافی طلب کرنے پر معاف کر دیا گیا۔ پانچ آدمی جنھوں نے معافی کی درخواست نہیں کی وہ قتل کر دئے گئے اور ایک آدمی مکہ سے دور بھاگ گیا اور طبعی موت سے اس کا خاتمہ ہوا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بنو مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی جس کا نام فاطمہ تھا۔ اس کے قبیلہ والوں کو ڈر ہوا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ اسامہ بن زید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت قریبی لوگوں میں تھے۔ چنانچہ لوگوں نے اسامہ سے کہا کہ تم رسول اللہ علیہ وسلم سے سفارش کرو کہ ہماری عورت کو چھوڑ دیا جائے۔ حضرت اسامہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فاطمہ مخزومی کی معافی کی درخواست کی۔ یہ سن کر آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا، آپ نے فرمایا: کیا تم اللہ کی حدوں میں سے ایک حد کے لئے مجھ سے سفارش کر رہے ہو (اتکلمنی فی حد من حدود اللہ) اس کے بعد آپ نے لوگوں کو جمع کیا اور تقریر کرتے ہوئے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر میری لڑکی فاطمہ چوری کرتی تو یقیناً میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا (والذی نفس محمد بیدہ لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا) چنانچہ اس عورت کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ اس کے بعد وہ تائب ہو کر ایک صالح خاتون بن گئی (بخاری ومسلم)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی ایک حد کو معاف کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ہے۔ پھر کیوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد لوگوں کو اتنی فراخ دلی کے ساتھ معاف کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام حالت میں کئے جانے والے جرم اور جنگی حالت میں کئے جانے والے جرم میں فرق ہے۔ عام حالات میں کوئی شخص جرم کرے تو اس کا جرم معاف نہیں کیا جا سکتا۔ مگر جنگ ومقابلہ کے دوران دشمن گروہ کے افراد جو جرائم کرتے ہیں وہ اس وقت معاف کر دئے جاتے ہیں جب کہ مذکورہ فرد اطاعت قبول کر کے معافی کا طالب ہو۔ غیر جنگی حالات میں کیا ہوا جرم "حد" پر ختم ہوتا ہے اور جنگی حالات میں کیا ہوا جرم اطاعت اور درخواست معافی پر۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ تمھارے دشمن صلح کی درخواست کریں تو اس کو قبول کر لو، حتی کہ اس وقت بھی جب کہ یہ اندیشہ ہو کہ امان پا کر وہ دھوکہ دیں گے۔ حالاں کہ یہ صلح کی درخواست کرنے والے لوگ وہ تھے جنھوں نے مسلمانوں کے خلاف بدترین قسم کے وحشیانہ جرائم کئے تھے:

وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوکل علی اللہ انه هو السميع العليم۔ وان يريدوا ان يخدعوك فان حسبك اللہ هو الذی ايدك بنصره وبالمومنين (انفال ۶۲ – ۶۱)

اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اس طرف جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ تم کو دھوکا دینا چاہیں تو اللہ تمھارے لئے کافی ہے، وہی ہے جس نے اپنی نصرت سے اور مومنین کے ذریعہ تم کو قوت دی۔

عمل کا آخری درجہ زبان کو روکنا ہے

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی ایک روایت مسند احمد میں نقل ہوئی ہے۔ اس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک اعرابی آیا اور کہا کہ عَلِّمْنِي عَمَلاً يُدْخِلُنِي الجنة (مجھے ایسا عمل بتائیے جو مجھ کو جنت میں لے جائے) آپ نے فرمایا: گردنوں کو آزاد کرو، دودھ والی اونٹنی دوسرے کو دودھ پینے کے لئے دو۔ قطع تعلق کرنے والے سے تعلق جوڑو۔ بھوکے کو کھانا کھلاؤ۔ پیاسے کو پانی پلاؤ۔ لوگوں کو بھلی بات بتاؤ اور بری بات سے روکو۔ آخر میں آپ نے فرمایا: فَاِنْ لَمْ تُطِقْ ذٰلِكَ فَكُفَّ لِسَانَكَ اِلاَّ عَنْ خيرٍ (اگر تم ایسا نہ کر سکو تو اپنی زبان کو روکو اور کلمۂ خیر کے سوا اس سے کچھ نہ نکالو)

دوسرے کی پردہ پوشی خود اپنی پردہ پوشی ہے

حضرت ابوایوب انصاری رض نے ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی۔ مگر بعد کو انھیں اس حدیث کے الفاظ کے بارے میں کچھ شک ہوا۔ اس کے سننے میں عقبہ بن عامر بھی شریک تھے جو مصر جا چکے تھے۔ حضرت ابوایوب انصاری نے اونٹ لیا اور مدینہ سے مصر کے لئے روانہ ہوئے۔ حضرت عقبہ بن عامر کے مکان پر پہنچ کر ان سے ملاقات کی اور کہا کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث بیان کرو جو تم نے مسلمانوں کی پردہ پوشی کے بارے میں سنی تھی۔ اس حدیث کے سننے والوں میں اب میرے اور تمھارے سوا کوئی باقی نہیں ہے۔ انھوں نے وہ حدیث ان کے سامنے دہرائی۔ حدیث یہ تھی: جو شخص کسی رسوائی کی بات پر دنیا میں مومن کی پردہ پوشی کرے گا خدا قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا (من ستر مومنا فی الدنیا علیٰ خزیة سترہ اللہ یوم القیامة، الادب المفرد)

جھوٹ بولنے والا منافق ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: کیا مومن بزدل ہو سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر پوچھا گیا: کیا مومن بخیل ہو سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر پوچھا گیا: کیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی شخص ایک جھوٹ بات کہتا تھا تو اس کی وجہ سے وہ منافق ہو جاتا تھا۔ اور آج میں سنتا ہوں کہ تم میں سے ایک شخص اس طرح کی جھوٹ بات ہر روز دس بار کہتا ہے (ان الرجل کان یتکلم بالکلمة علی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیصیر بها منافقا وانی لا سمعها من احدکم فی الیوم عشر مرات (یعنی الکذب)

توجیہ کے فرق سے بات بدل جاتی ہے

ایک صحابی دعا کرنے لگے تو ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: اللّٰهم ارحمنی ومحمدا ولا ترحم معنا احدا (اے اللہ مجھ پر رحم کر اور محمد پر رحم کر۔ اور ہم دونوں کے ساتھ کسی اور پر رحم نہ کر) ایک شخص صحابی پر الزام لگانا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ رسول کے اصحاب ایک دوسرے سے بغض و حسد رکھتے تھے۔ ان کو یہ پسند نہ تھا کہ

ان کے سوا کسی اور کو خیر میں حصہ نہ ملے۔ مگر مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے کہا: صحابہ حسد اور بغض سے پاک تھے۔ ان کا یہ کلام غلبۂ محبت کے سبب سے تھا نہ کہ حسد کے سبب سے۔

زبان پر قابو رکھئے

قال ابوعمر بلغني عن سهل بن عبد الله التستري انه قال: ما احدث احد في العلم شيئا الا سئل عنه يوم القيامة فان وافق السنة سلم والا فهو العطب (جامع بیان العلم وفضلہ، جزء ثانی، صفحہ ۱۵۰) عبداللہ تستری نے کہا۔ علم دین میں جو شخص کوئی نئی بات کہے گا تو ضرور اس سے قیامت میں اس کی بابت سوال ہوگا۔ اگر اس کی بات سنت کے مطابق ہو تو وہ بچ جائے گا۔ ورنہ اس کے لئے ہلاکت ہے۔

زیادہ بولنا اچھی علامت نہیں

قال نعيم بن حماد قال سمعت ابن عيينة يقول: اجسر الناس على الفتيا اقلهم علما (جامع بیان العلم وفضلہ، جزء ثانی، صفحہ ۱۶۵) ابن عیینہ تابعی نے کہا: فتوی دینے میں سب سے زیادہ جری وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو علم میں سب سے کم ہوں۔

جھوٹا الزام سب سے زیادہ سنگین جرم ہے

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا: آسمان سے زیادہ بھاری کیا چیز ہے۔ فرمایا: کسی بے گناہ پر جھوٹا الزام لگانا۔

برا وہ ہے جو اپنی زبان پر قابو نہ رکھے

عن اسماء بنت يزيد عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الا انبئكم بشراركم قالوا بلى يارسول الله قال المشاؤن بالنميمة المفرقون بين الاحبة الباغون للبراء العيب (احمد)

اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں بتاؤں کہ تم میں برے لوگ کون ہیں۔ لوگوں نے کہا ہاں اے خدا کے رسول۔ فرمایا وہ لوگ جو چغلی کرتے پھریں۔ اور دوستوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے والے اور بے عیب لوگوں میں عیب چاہنے والے۔

کم بولنا اخلاص کی علامت ہے

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے بہتر لوگ نہیں دیکھے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی وفات تک صرف تیرہ مسئلے دریافت کئے جو سب کے سب قرآن میں موجود ہیں۔ (ما رأيت قوما كانوا خيرا من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم، ما سألوه الا عن ثلاث عشرة مسألة حتى قبض، كلهن في القرآن) حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا: صحابہ ہمیشہ صرف وہی بات پوچھتے تھے جو ان کے لئے نفع کی بات ہو۔ (قال ما كانوا يسألون الا عما ينفعهم)

اقامت دین اور تفرق فی الدین

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ اَللّٰهُ يَجْتَبِیْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِیْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ

شوریٰ ۱۳

اللہ نے تمہارے لئے دین سے وہی چیز مقرر کی جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی وحی ہم نے تمہاری طرف کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ قائم رکھو دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو۔ مشرکین کو وہ بات بہت گراں گزرتی ہے جس کی طرف تم ان کو بلاتے ہو۔ اللہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور وہ اپنی طرف اسی کی رہنمائی کرتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔

اقامت کے معنی ہیں سیدھا کرنا۔ قرآن میں یہی لفظ جھکی ہوئی دیوار کو سیدھا کر دینے کے معنی میں آیا ہے (کہف ۷۷) تفرق کے معنی ہیں پھوٹنا، جدا ہونا۔ قرآن میں یہ لفظ ایسے موقع پر استعمال ہوا ہے جب کہ آدمی اصل شاہراہ کو چھوڑ کر کنارے کے ذیلی راستوں میں بھٹک جائے (انعام ۱۵۳) آیت میں الدین سے مراد توحید اور صرف ایک خدا کی عبادت کرنا ہے۔ یہی وہ دین ہے جو تمام نبیوں کو دیا گیا (وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الٰہ الا انا فاعبدون، انبیاء ۲۵) مطلب یہ ہے کہ خدا نے تمام نبیوں کو ایک ہی دین دیا تھا اور وہ توحید کا دین تھا نہ کہ شرک کا دین۔ اس لئے تم اسی دین توحید پر پوری طرح قائم رہو، اس میں شاخیں نکال کر اپنی توجہات کو اِدھر اُدھر نہ پھیرو۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں جو حکم ہے وہ اقامت بمقابلہ عدم اقامت نہیں ہے بلکہ اقامت بمقابلہ تفرق ہے۔ یعنی مطلق طور پر یہ نہیں کہا گیا ہے کہ دین کو قائم کرو اور دین کو قائم کئے بغیر نہ رہو۔ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ "الدین" کو قائم کرو اور "الدین" میں تفرق نہ کرو۔ مطلب یہ ہوا کہ خدا نے جو الدین (اصل دین) اتارا ہے صرف اسی کی اقامت اور پیروی میں لگو، ایسا مت کرو کہ اس اصل دین میں دوسرے دوسرے راستے نکال کر اس میں متفرق ہو جاؤ۔ تمہاری توجہ اصل دین پر لگے نہ کہ متفرق پہلوؤں میں بکھر جائے۔

رمضان کے مہینہ کی ایک شام کو جب کہ راقم الحروف بھوک پیاس سے نڈھال ہو رہا تھا۔ میری زبان سے نکلا: کھانا بھی خدا کی کیسی عجیب نعمت ہے، ایک دن بھی نہ ملے تو آدمی کا برا حال ہو جاتا ہے" یہ سن کر ایک صاحب نے کہا: آج کل لوگ کمزور ہو گئے ہیں۔ ورنہ پہلے زمانہ میں ایک دن کیا چار چار دن لوگ بھوکے

رہ جاتے تھے۔ میں نے کہا ہاں، مگر وہ بھی مستقل بھوکے نہیں رہ سکتے تھے۔ اس واقعہ میں مذکورہ بزرگ کا جملہ اصل بات سے تفرق کی ایک مثال ہے۔ کہنے والے کا منشا اصلاً کھانے کی اہمیت پر زور دینا تھا۔ "ایک دن" کا لفظ اس میں محض اضافی تھا۔ مگر سننے والے نے اسی لفظ کو لے لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بات اپنے رُخ سے ہٹ کر غیر متعلق پہلو کی طرف مڑ گئی۔ موصوف اگر کھانے کے "نعمت" کے پہلو کو ابھارتے تو یہ کہی ہوئی بات کی اقامت ہوتی۔ جب انھوں نے "ایک دن" کے پہلو کو لے کر اس پر تقریر شروع کر دی تو انھوں نے گویا اصل بات سے تفرق کیا۔ وہ شاہراہ کلام سے جدا ہو گئے۔

اب ایک اور مثال لیجئے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان تمام ملکوں میں کسی نہ کسی طاقت کے ظلم کا شکار ہو رہے ہیں۔ کہیں کسی اقتصادی طاقت کا، کہیں کسی اکثریتی طاقت کا، کہیں کسی سیاسی اور فوجی طاقت کا۔ اس مسئلہ کا حقیقی حل صرف اعداد قوت (انفال ۶۰) ہے۔ یعنی مسلمانوں کا طاقت ور ہونا۔ ظلم و زیادتی ہمیشہ بے طاقتی کی سزا ہوتی ہے اور اپنے آپ کو طاقت ور بنا کر ہی اس سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ طاقت ور بنانے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو باشعور بنایا جائے، ان میں باہمی اتحاد پیدا کیا جائے، ان کو جدید فکری اور عملی قوتوں سے مسلح کیا جائے۔ ان پہلوؤں سے تیار ہونے کا نام طاقت ور ہونا ہے اور جو قوم ان چیزوں میں طاقتور ہو جائے اس کے اوپر کوئی ظالم، ظلم کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔ اس کے برعکس دوسرا طریقہ یہ ہے کہ احتجاج اور مطالبات کا لفظی طوفان برپا کیا جائے۔ جلسے جلوس کی دھوم مچائی جائے۔ تقریروں اور تجویزوں کا سیلاب بہایا جائے۔ مگر اس قسم کی تمام چیزیں محض وقتی ہنگامے ہیں جن کا کوئی بھی واقعی فائدہ قوم کو نہیں ملتا۔ ان دونوں طریقوں میں سے پہلا طریقہ ملت کی اقامت کا طریقہ ہے اور دوسرا طریقہ ملت کے مسئلہ سے تفرق کا۔ پہلا کام اصل کام ہے جب کہ دوسرا کام اصل کام کی نسبت سے غیر متعلق ہے، وہ اپنے انجام کے اعتبار سے ملت کے محاذ سے متفرق ہونا ہے نہ کہ ملت کے محاذ پر جدوجہد کرنا۔

ان مثالوں سے اقامت دین اور تفرق فی الدین کا مطلب سمجھا جا سکتا ہے۔ مذکورہ آیت میں "الدین" سے مراد وہ اصل دین ہے جو تمام نبیوں پر اترا۔ یعنی توحید۔ توحید سے مراد ہے —— اللہ کو تنہا خالق اور مالک اور معبود جاننا، اسی پر بھروسہ کرنا، اسی سے ڈرنا اور اسی سے محبت کرنا، اپنے تمام بہترین جذبات کو اسی کی طرف متوجہ کر دینا۔ اپنا سب کچھ صرف اللہ کو بنا لینا۔ اللہ سے یہ وابستگی جب کسی کے اندر حقیقی معنوں میں پیدا ہوتی ہے تو وہی آدمی کی زندگی بن جاتی ہے۔ وہ اس کی پوری زندگی کو کچھ سے کچھ کر دیتی ہے۔ آدمی کا سوچنا، اس کا بولنا، اس کا عمل کرنا، اس کا لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنا، اس کا مختلف حالات میں رد عمل ظاہر کرنا، سب اسی کے تابع ہو جاتے ہیں۔ آدمی اندر سے باہر تک پوری طرح خدا کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔

الدین (توحید) کو اس طرح اپنے اندر سمونے کا نام اقامت دین ہے۔ یہ اقامت دین اولاً فرد کے اپنے اندر متحقق ہوتا ہے اور اس کے بعد حسب حالات اجتماعی زندگی میں ظاہر ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں تفرق فی الدین یہ ہے کہ اصل دین کے ارد گرد غیر متعلق بحثیں نکال کر اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا جائے۔ مثلاً اسلامی عقائد میں خود ساختہ کلامی بحثیں چھیڑنا، اسلامی عبادات میں بطور خود مسائل وضع کر کے فقہی جھگڑے کھڑے کرنا، اسلامی کیفیات پیدا کرنے کے نام پر نئے "روحانی" نصاب بنانا اور لوگوں میں اس کو رواج دینا۔ اسی طرح یہ بھی تفرق فی الدین ہے کہ "توحید" کے علاوہ دوسری دوسری چیزوں کو عنوان بنا کر تحریکیں چلائی جائیں۔ مثلاً خدائی حکومت قائم کرنے کے نام پر، اسلام کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کے نام پر، خیر الامم کو اس کے مقام بلند کی طرف لے جانے کے نام پر، فساد فی الارض اور طاغوتی نظام کو ختم کرنے کے نام پر وغیرہ۔ اقامت دین حقیقی معنوں میں موحد بننے کا نام ہے اور تفرق فی الدین دین کے نام پر دوسری چیزوں میں متفرق ہونے کا۔ قدیم حاملین شریعت اسی قسم کے تفرق میں مبتلا ہو گئے تھے، چنانچہ ان کے بارہ میں کہا گیا :

وما تفرق الذین اوتوا الکتٰب الا من بعد ماجاءتھم البینۃ۔ وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ وذلک دین القیمۃ (البینہ)

اور اہل کتاب واضح دلیل آنے کے بعد ہی دین میں متفرق ہو گئے۔ حالاں کہ ان کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی عبادت کریں دین کو اس کے لئے خالص کر کے، بالکل یک سو ہو کر۔ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور یہی ہے درست دین۔

دین اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے کسی قسم کے خارجی ہنگامے کا نام نہیں ہے بلکہ اللہ کی دنیا میں بسیرا لینے کا نام ہے۔ دین دار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی فطرت کی اس سطح پر جینے لگے جس سطح پر خدا کی دوسری مخلوقات جی رہی ہیں۔ اس کا شعور اللہ سے مل جائے۔ اس کی یادوں میں اللہ بسا ہوا ہو۔ اس کے پرشوق جذبات کا مرکز صرف اللہ بن جائے۔ جب کوئی شخص خدا کو اس طرح پاتا ہے تو وہی اس کا مطلوب و مقصود بن جاتا ہے۔ اس کی سرگرمیوں کا رخ تمام تر خدا کی طرف ہو جاتا ہے۔ اخلاق و معاملات میں وہ وہی کرنے لگتا ہے جو اس کا خدا اس سے چاہتا ہو، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ اپنے جذبات اور اپنی مصلحتوں کو اس کی خاطر قربان کر دینا پڑے۔

قرآن میں یہود و نصاریٰ کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے : اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور ان کو نعمت بھری جنتوں میں داخل کرتے۔ اور اگر وہ قائم کرتے تورات اور انجیل کو اور جو ان کی طرف ان کے رب کے پاس سے اترا تو وہ کھاتے اپنے اوپر سے اور اپنے قدموں کے نیچے سے، ان میں کچھ لوگ سیدھی راہ پر ہیں اور بہت سے ان میں برے کام کر رہے ہیں (مائدہ ۶۶-۶۵) اس آیت میں ایمان و

تقویٰ اور تورات و انجیل کی اقامت دونوں کو ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے لئے آسمانی کتاب کی اقامت کا مطلب یہ تھا کہ وہ ایمان لائیں اور تقویٰ کی زندگی اختیار کریں۔ یہی سورہ شوریٰ میں اقامت دین کا مطلب بھی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی حقیقی معنوں میں اللہ کا مومن بن جائے اور دنیا کی زندگی میں اس سے ڈر کر رہنے لگے۔ صرف ایک اللہ اس کے ذہن کا اثاثہ اور اس کے قلب کا سرمایہ ہو۔ اس کا اللہ سے تعلق اتنا گہرا اور اتنا زندہ ہو کہ وہ اس کے اوپر مستقل نگراں بن جائے۔ پُرسکون حالات ہوں یا جذباتی ہیجان کا وقت ہو، ہر حال میں وہ اللہ سے ڈرے اور ہر معاملہ میں وہ اس کی مرضی کا پابند رہے۔

اقامت دین اصلاً انفرادی طور پر اللہ کے دین پر قائم ہونے کا نام ہے۔ مگر جب بہت سے افراد اللہ کے دین پر قائم ہو جائیں تو حالات کے بقدر اس کے اجتماعی نتائج بھی ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں، ٹھیک ویسے ہی جیسے ایک درخت ہو تو وہ صرف ایک درخت ہے اور بہت سے درخت ہوں تو ان کا باغ بن جاتا ہے۔ تاہم اجتماعی چیزیں اقامت دین کا بالواسطہ نتیجہ ہیں نہ کہ اس کا براہ راست حکم۔

تفرق فی الدین کا مطلب دین سے الگ ہونا نہیں ہے بلکہ دین کی شاہراہ سے الگ ہونا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے قرآن کی ایک آیت پر غور کیجئے۔ قرآن کی سورہ نمبر ۶ میں ارشاد ہوا ہے: "کہو، آؤ میں تم کو سناؤں وہ چیزیں جو تم پر تمھارے رب نے حرام کی ہیں۔ یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تم کو بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی۔ اور بے شرمی کی باتوں کے قریب نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی۔ اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔ یہ باتیں ہیں جن کا اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھ سے کام لو۔ اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریق پر جو بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنی پختگی کو پہنچ جائے۔ اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو، ہم کسی شخص پر اس کے تحمل سے زیادہ بوجھ نہیں رکھتے۔ اور جب بات کہو تو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار کا کیوں نہ ہو۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ ان باتوں کا اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے تاکہ نصیحت پکڑو۔ اور یہی میرا سیدھا راستہ ہے پس تم اسی پر چلو اور دوسری راہوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے جدا کر دیں گی۔ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم بچو (انعام ۵۳-۱۵۲)

اس سے معلوم ہوا کہ دین کی ایک شاہراہ ہے اور اس کے دائیں بائیں بہت سی پگڈنڈیاں نکلتی ہیں۔ مومن وہ ہے جو شاہراہ پر چلے اور اِدھر اُدھر کی پگڈنڈیوں میں نہ کھو جائے۔ دین کی شاہراہ یہ ہے کہ آدمی صرف ایک خدا سے اپنا تعلق جوڑے، خدا کی خدائی میں کسی اور کو شامل نہ کرے۔ یہی توحید ہے۔ یہ توحید جب کسی کے اندر پیدا ہو جائے تو اس کے اندر ایک نیا شعور ابھر آتا ہے۔ وہ اللہ سے ڈرتا ہے اور اسی پر سب سے زیادہ

بھروسہ کرتا ہے۔ اس کا خوف خدا اور اس کا اعتماد علی اللہ اس کی زندگی میں اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے والدین اور یتیموں اور عام انسانوں کے بارے میں حد درجہ محتاط انسان بن جاتا ہے۔ رزق کے معاملہ میں وہ اپنے کو پوری طرح حلال دائرہ میں محدود رکھتا ہے۔ بیہودہ کام کرنا اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ کسی کو دینا ہو یا کسی سے لینا ہو ہر حال میں وہ انصاف پر قائم رہتا ہے۔ اس کی زبان کھلتی ہے تو سچائی کے لئے کھلتی ہے نہ کہ بے جا حمایت یا بے جا مخالفت کے لئے۔ اس کا تعلق باللہ اس کے اور خدا کے درمیان ایک خاموش عہد بن جاتا ہے جس کو وہ کبھی نہ توڑے خواہ اس کے لئے اس کو اپنے آپ پر کتنا ہی جبر کرنا پڑے۔

یہ دین کی شاہراہ پر قائم ہونا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دین کی شاہراہ سے جدا ہونا یہ ہے کہ آدمی مذکورہ چیزوں میں نئی نئی شاخیں نکال کر ان کی دینی اہمیت ثابت کرے اور ان کی طرف دوڑنا شروع کر دے۔ مثلاً اس کا دل اللہ کی کبریائی کے جذبہ سے سرشار نہ ہو البتہ "رجال اللہ" اور "اسلامی شخصیتوں" کے ساتھ والہانہ عقیدت کا اظہار اس کا محبوب مشغلہ بنا ہوا ہو۔ تنہائیوں میں اللہ کے ڈر سے اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے نہ ہوتے ہوں البتہ "لاؤڈ اسپیکر" کی سطح پر وہ خوب اللہ کے نام کی دھوم مچاتا ہو۔ عبادات میں انابت وتضرع پیدا کرنے کا دھیان اس کو نہ ہو البتہ مسائلِ عبادت میں طرح طرح کی موشگافیاں پیدا کرنے کا وہ ماہر بنا ہوا ہو۔ وہ اپنے صاحب معاملہ کے ساتھ انصاف نہ کرے البتہ خارجی دنیا میں عدل وانصاف کا نظام قائم کرنے کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہو۔ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہ ہو البتہ دوسروں کے ظلم وبربریت کا اعلان کرنے میں سب سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہو۔ وہ اپنے پڑوسی کی مدد نہ کرے البتہ دور کے مسائل پر تقریر کرتے سے اس کی زبان کبھی نہ تھکتی ہو۔ اس کا دل اللہ کی یاد سے خالی ہو البتہ ذکر کے نام پر الفاظ کی تکرار کرنے میں لاکھوں کا عدد بھی اس کے لئے ناکافی ثابت ہو رہا ہو۔ اپنی نماز میں خشوع پیدا کرنے کی اسے فکر نہ ہو البتہ مسجدوں کی آرائش وزیبائش کا وہ خوب اہتمام کرتا ہو۔ اپنے کمزور دینی بھائی کے حقوق اس کو یاد نہ آئیں البتہ بڑی بڑی شخصیتوں کے ساتھ اسلامی اخوت کا مظاہرہ کرنا وہ کبھی نہ بھولتا ہو۔ اپنے نفس کو خدا کے آگے جھکانے کا اسے شوق نہ ہو البتہ ساری دنیا کو خدا کے آگے جھکانے کا وہ مجاہد بنا ہوا ہو۔ اس قسم کی تمام صورتیں تفرق فی الدین کی صورتیں ہیں۔ ان کو خواہ جس نام پر بھی کیا جائے اور ان کے ساتھ کیسی ہی خوش فہمیاں وابستہ کی جائیں وہ خدا کے یہاں مقبول دین کی حیثیت سے لکھی نہیں جا سکتیں۔

دین کے راستہ سے متفرق ہونا ایسا ہی ہے جیسے ٹرین کا اپنی پٹری سے اتر جانا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی تجدید ایمان کے نام پر اٹھے اور پھر کلمہ کی تصحیح اور اس کے طلسماتی خواص پر پوری تحریک چلا دے۔ وہ اسلام کو سربلند کرنے کا مدعی ہو اور پھر سیاسی کارروائیوں اور احتجاجی جلسوں کے رخ پر دوڑ پڑے۔ وہ دینی تعلیم کو اپنا مقصد بتائے اور پھر گروہی نزاعات اور تعصبات میں قوم کو الجھا دے۔ وہ احیائے ملت کا اعلان کرے اور پھر تقریر اور بیانات کے لفظی مشغلہ میں مصروف ہو جائے۔

"سیکولر اور جمہوری قوتوں کو منظم کیجئے"
"خیر پسند اور شر بیزار انسانوں کو پکارئے"
"ووٹوں کی طاقت کو دباؤ کی سیاست کے لئے استعمال کیجئے"
"جلسوں اور کانفرنسوں کے ذریعہ اپنی آواز بلند کیجئے"
"اپنے حقوق کے لئے احتجاج اور مطالبات کی دھوم مچائیے"
"ظالمانہ حکومت کو متحدہ طاقت سے اکھاڑ پھینکئے"
"جمعہ کے روز مسجدوں اور مدرسوں میں یوم دعا منائیے"
"لوگوں کے دلوں کے دروازہ پر دستک دیجئے"

ہر روز کاغذ کے لاکھوں ورق اس قسم کے الفاظ سے سیاہ ہو رہے ہیں۔ اور بے شمار لاؤڈ اسپیکر ہر دن ان کو فضا میں بکھیر رہے ہیں۔ مگر ان کوششوں سے اتنا فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا جتنا قوم کی جیب سے ان پر خرچ کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب الفاظ کی پہلوانی ہے اور الفاظ کی پہلوانی کسی قوم کو حقیقت کی دنیا کا سورما نہیں بنا سکتی۔

فرض نماز کا وقت ہو جائے اور مسجد سے آواز بلند ہو: حیّ علی الصلوٰۃ (آؤ نماز کی طرف) تو اس وقت عبادت الٰہی کا مقام مسجد ہوتا ہے۔ ہر شخص کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ مسجد میں آکر اپنے عابد ہونے کا ثبوت دے۔ اس کے برعکس اگر ایک شخص ایسا کرے کہ عین اس وقت مسجد کے باہر میدان میں شامیانہ لگائے اور لاؤڈ اسپیکر پر "فلسفہ عبادت" کے موضوع پر لمبی تقریر شروع کر دے تو یہ اس کے عابد ہونے کا ثبوت نہ ہوگا بلکہ صرف ظالم ہونے کا ثبوت ہوگا۔ کیوں کہ اس وقت کسی کے لئے اپنے عابد ہونے کا ثبوت دینے کا مقام مسجد ہے نہ کہ جلسہ گاہ میں عبادت کے عنوان پر شاندار تقریر۔

اس قسم کی غیر مطلوب عبادت آج لوگوں کے اندر بہت بڑے پیمانہ پر جاری ہے۔ دور کے "مظلومین" کے بارے میں تجویزیں اور بیانات چھپ رہے ہیں۔ حالاں کہ مظلوموں سے ہمدردی کا ثبوت دینے کا مقام سب سے پہلے آدمی کا اپنا پڑوس ہے۔ دوسروں کو انسانیت اور اخلاق کا سبق دینے کے لئے کانفرنسیں منعقد کی جا رہی ہیں۔ حالاں کہ انسانیت دوست اور با اخلاق "حقیقۃً" وہ ہے جو خود اپنے معاملات میں انسانی اور اخلاقی اصولوں کی پیروی کرے۔ ملت کو بچاؤ کا نعرہ ہر ایک لگا رہا ہے مگر فرد کو بچانے اور اس کے حقوق ادا کرنے کی فرصت کسی کو نہیں۔ آدمی اپنے خدا پرست ہونے کا ثبوت وہاں دینا چاہتا ہے جہاں اس کی خدا پرستی ایک شاندار چیز بن کر لوگوں سے خراج تحسین حاصل کرے، حالاں کہ اس کا خدا جہاں اس کی خدا پرستی کا امتحان لینے کے لئے کھڑا ہوا ہے وہ مقامات وہ ہیں جہاں سب کچھ کر کے بھی آدمی کو کوئی عزت اور شہرت حاصل نہیں ہوتی۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت —— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔

دوسری صورت —— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

REGD. R. N. NO. 28822/76
REGD. D. (D) NO. 532

OCTOBER 1980
ISSUE NO. 47

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

آدمی پھول بن کر مہکے اور آفتاب بن کر چمکے ——
کائنات خاموش زبان میں ہر لمحہ یہ پیغام دے رہی ہے

الرسالہ
نومبر ۱۹۸۰ شمارہ ۴۸
جمعیۃ بلڈنگ ، قاسم جان اسٹریٹ ، دہلی ۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اعلان

ہمارے ملک میں مسلمانوں کے لئے فرقہ وارانہ فساد کا مسئلہ، عملی طور پر، سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر رسالہ کے موجودہ شمارہ میں "فسادات کا مسئلہ" نامی پمفلٹ شامل ہے۔ اس پمفلٹ میں اس مسئلہ کو خالص دینی اور تعمیری انداز سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس پمفلٹ کو الگ سے ۳۲ صفحات پر شائع کیا گیا ہے۔

موجودہ حالات کے پیش نظر ضرورت ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے۔ اس پمفلٹ کی قیمت فی نسخہ ایک روپیہ پچھتر پیسے ہے۔ تاہم جو لوگ عمومی تقسیم کے لئے زیادہ تعداد میں خریدیں گے ان کو قیمت میں رعایت دی جائے گی۔

منیجر ماہنامہ الرسالہ

منی آرڈر کوپن پر اپنا پتہ تحریر فرمائیں۔ ہر خط و کتابت کے ساتھ خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیں

اہل یثرب کا اسلام

قدیم یثرب (مدینہ) میں دو عرب قبیلے اوس اور خزرج آباد تھے۔ اسی کے ساتھ وہاں چند یہودی قبیلے بھی تھے۔ یہود نے اوس و خزرج کو باہم لڑا رکھا تھا تاکہ وہ یہود کے مقابلہ میں کمزور رہیں اور ان کی مضبوط جمعیت بننے نہ پائے اور اس طرح یہود کی بالاتری ان کے اوپر قائم رہے۔ ہجرت نبوی سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ قبیلہ خزرج یہودیوں کے ابھارنے سے اوس کے خلاف آمادۂ جنگ ہوگیا۔ قبیلہ اوس کے ایک سردار ابو الحیسر انس بن رافع چند آدمیوں کو لے کر مکہ آئے تاکہ اپنے حریف کے مقابلہ میں قریش کی مدد حاصل کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی آمد کا علم ہوا تو آپ ان کے پاس گئے اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی۔ ان کے وفد کے ایک نوجوان ایاس بن معاذ اس سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ خدا کی قسم اس سے بہتر ہے جس کے لئے تم آئے ہو (ھذا واللہ خیر مما جئتم بہ) مگر ان کے ساتھیوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی۔ ابو الحیسر انس بن رافع نے اپنے ہاتھ میں مٹی لے کر ایاس بن معاذ کے چہرہ پر پھینکی اور کہا: ان باتوں کو رہنے دو، میری زندگی کی قسم ہم تو اس کے علاوہ کسی اور کام کے لئے آئے ہیں (دعنا منك فلعمری لقد جئنا لغیر ھذا)

اوس کا وفد اسلام قبول کئے بغیر یثرب واپس چلا گیا۔ اس کے بعد اوس اور خزرج کے درمیان وہ جنگ ہوئی جو جنگ بُعاث کے نام سے مشہور ہے۔ اس وقت دونوں قبیلوں کے درمیان دشمنی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ دوسرے قبیلہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے۔ اس جنگ میں پہلے خزرج نے اوس کو شکست دی۔ اس کے بعد اوس نے اپنے سردار ابو اسید کی قیادت میں خزرج کو شکست دی۔ دونوں نے باری باری ایک دوسرے کو زبردست نقصانات پہنچائے۔ حتیٰ کہ ایک نے دوسرے کے باغات اور مکانات جلا ڈالے۔ دونوں عرب قبیلے خود ہی اپنے ہاتھوں کمزور ہو کر رہ گئے۔

اس جنگ کا فائدہ براہ راست یہود کو پہنچا۔ انھوں نے یثرب میں برتری کا مقام حاصل کر لیا۔ جب جذبات ٹھنڈے ہوئے تو دونوں قبائل کے سنجیدہ لوگوں کو احساس ہوا کہ انھوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اپنے کو خود اپنے ہاتھوں ہلاک کر کے دشمن کو موقع دے دیا کہ وہ ان کے اوپر غلبہ حاصل کرے۔ دونوں قبیلوں کے باشعور لوگوں نے طے کیا کہ وہ اپنے اختلافات کو بھول جائیں اور مشترکہ طور پر اپنا ایک بادشاہ مقرر کرلیں جو ان کے معاملات کا نظم کرے۔ اس کے لئے عبد اللہ بن ابی خزرجی کا انتخاب ہوا جو ایک صاحب شخصیت آدمی تھا اور اپنے اندر قائدانہ اوصاف رکھتا تھا۔ عین اسی زمانہ میں یہ واقعہ ہوا کہ قبیلہ خزرج کے کچھ لوگوں نے

کعبہ کی زیارت کے ارادہ سے مکہ کا سفر کیا۔ یہاں ان کی ملاقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔ آپ نے ان کو بتایا کہ میں خدا کا نبی ہوں، تم لوگ میری دعوت کو قبول کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے بعد معاً ان کو یاد آیا کہ یہود بہت دنوں سے ان سے کہا کرتے تھے کہ ایک نبی غلبہ والا ظاہر ہونے والا ہے۔ ہم اس کے ساتھ ہو کر تم کو شکست دیں گے اور تمھارے اوپر اپنا غلبہ قائم کریں گے۔ یثرب والوں نے کہا: اے لوگو، خدا کی قسم یہ تو وہی نبی ہیں جن کی خبر تم کو یہود دیتے تھے۔ دیکھو، وہ تم سے پہلے اس کی طرف سبقت نہ کرنے پائیں۔ چنانچہ انھوں نے آپ کی دعوت قبول کر لی۔ انھوں نے مزید کہا: ہم اپنی قوم کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ ان میں جتنا شر و عداوت ہے اتنا کسی اور قوم میں نہیں۔ شاید اللہ آپ کے ذریعہ ان کو متحد کر دے۔ ہم واپس جا کر اس دین کو ان کے سامنے پیش کریں گے جس کو ہم نے قبول کر لیا ہے۔ اگر اللہ نے ان کو اس دین پر جمع کر دیا تو آپ سے زیادہ اس ملک میں کوئی طاقت ور نہ ہوگا (سیرۃ ابن ہشام، جزء ثانی، صفحہ ۳۸)

تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے بعد یثرب کے لوگ جوق در جوق اسلام لائے۔ وہ اسلام کے انصار (مددگار) بن گئے۔ ان کی قربانی اور تعاون سے اسلام کو عرب میں غلبہ حاصل ہوا۔

یثرب کے لوگوں نے ہجرت سے پانچ سال پہلے آپ کی دعوت کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ مگر پانچ سال بعد یہی لوگ آپ کے مومن بن گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلی ملاقات کے وقت ان کے ذہن میں جنگ کے خیالات بھرے ہوئے تھے۔ وہ سارے معاملہ کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے کہ ان کا ایک دشمن ہے اور اس دشمن کو انھیں شکست دینا ہے۔ ان کی نفسیات پر جنگ کے مسائل چھائے ہوئے تھے۔ اس ذہنی پس منظر میں خدا اور آخرت کی باتیں انھیں غیر متعلق بلکہ تباہ کن معلوم ہوتی تھیں۔ ان کو ایسا نظر آتا تھا گویا ان کو اصل محاذ سے ہٹایا جا رہا ہے۔ مگر جب جنگ بعاث میں ساری طاقت خرچ کرنے کے بعد ان کے حصہ میں صرف تباہی آئی۔ حتی کہ یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ یہود ان کو لڑا کر ان کی عرب نسل کا خاتمہ کر دیں گے تو ان کا ذہن بدلنا شروع ہو گیا۔ اب وہ معاملہ کو جنگ سے وسیع تر دائرہ میں رکھ کر دیکھنے لگے۔ اب وہ جنگ کے بجائے امن، اختلاف کے بجائے اتحاد کی اصطلاحوں میں سوچنے لگے۔ ان کو نظر آیا کہ اصل مسئلہ اوس و خزرج کا نہیں بلکہ اوس و خزرج کے مقابلہ میں یہود کا ہے۔ اس کا حل انھیں یہ نظر آیا کہ ان کا ایک عقیدہ ہو جو قبائلی تفریق کو ختم کرے اور ان کے لیے نظریاتی اتحاد کی بنیاد فراہم کرے اور اسی کے ساتھ ایک شخصیت ہو جو ان کو باہم جوڑے اور ان کی مشترکہ قائد بن سکے۔ یہ دونوں چیزیں (نظریہ اور شخصیت) انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں مل گئیں اور انھوں نے لپک کر اس کو قبول کر لیا۔ اسی لیے حضرت عائشہؓ نے فرمایا بعاث کی جنگ ایک ایسی جنگ تھی جس کو اللہ نے اپنے رسول کی تائید کے لئے فراہم کیا تھا (کان یوم بعاث یوما قدمہ اللہ تعالیٰ لرسولہ)

اپنے اعمال کو بے حقیقت سمجھو

سعید بن جبیر تابعی سے کسی نے پوچھا: سب سے بڑا عبادت گزار کون ہے۔ جواب دیا: وہ شخص جو گناہوں میں مبتلا تھا پھر اس نے توبہ کی۔ پس توبہ اس کے بعد کا یہ حال رہا کہ جب اس نے اپنے گناہ یاد کیا تو اس کے مقابلہ میں اپنے اعمال کو بے حقیقت جانا (صفوۃ الصفوۃ)

سب سے بڑا عمل وہ ہے جس کی خاطر اپنے اوپر جبر کرنا پڑے

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمام اعمال میں تین عمل سب سے زیادہ سخت ہیں۔ اپنی ذات کے معاملہ میں لوگوں کے ساتھ انصاف کرنا، اپنے مال سے اپنے بھائیوں کی مدد کرنا اور ہر حال میں اللہ کو یاد کرنا (اشد الاعمال ثلاث: انصاف الناس من نفسك، ومواساۃ الاخوان من مالك، وذكر الله على كل احوالك)

کسی پہلو سے دین کے کام آجانا جنت کے استحقاق کے لئے کافی نہیں

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جنگ حنین میں ایک شخص نے حصہ لیا اور پوری قوت سے لڑتا رہا۔ بالآخر اس کے انتقال کی خبر پھیل گئی۔ لوگوں کے درمیان اس کی بہادری کے چرچے ہوئے۔ لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ اس نے ضرور شہادت کا درجہ پایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا: وہ دوزخیوں میں سے ہے (هو من اهل النار) لوگوں کو اس کی جان بازی اور بہادری کی وجہ سے آپ کی بات پر شبہ ہونے لگا۔ آپ نے فرمایا جاؤ تحقیق کرو کہ وہ کس طرح مرا ہے۔ لوگوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ زخمی ہو کر گرا تھا۔ اسی حالت میں پڑا تھا۔ جب رات ہوئی تو زخموں کی تاب نہ لاکر اس نے خودکشی کر لی۔ اس طرح تصدیق ہوگئی کہ وہ شہید نہیں ہوا بلکہ حرام موت مرا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی گئی تو آپ نے فرمایا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ پھر آپ نے حضرت بلال رض سے کہا کہ جاؤ لوگوں میں یہ اعلان کر دو کہ جنت میں صرف وہی شخص داخل ہوگا جو واقعی مسلم ہے۔ اور اس دین کی مدد اللہ تعالیٰ فاجر آدمی کے ذریعہ بھی کرتا ہے (لا يدخل الجنة الا نفس مسلمة وان الله ليؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر، بخاری)

اپنے عمل کو بے قیمت سمجھنا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کسی نے کہا کہ آپ کی بڑی دینی خدمات ہیں۔ آپ کا درجہ اللہ کے یہاں بڑا ہوگا۔ انھوں نے کہا: كفافا لا لي ولا علي۔ یعنی معاملہ اگر برابر سرابر ہو جائے تو یہی بہت ہے۔

دنیوی ترقی دیکھ کر ساتھ دینا نفاق ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ آئے تو عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے آپ کے اور آپ کے مشن کے خلاف طرح طرح کی فتنہ انگیزیاں کیں اور اسلام کا راستہ روکنے کے لئے تمام ممکن تدبیریں کرتے رہے۔ مگر اس کے بعد جب بدر کی لڑائی پیش آئی اور اس میں قریش کے بڑے بڑے سردار ختم ہو گئے تو عبد اللہ بن ابی اور

کرتا ہوں کہ وہ تم کو معاف کر دے (یا ھذا ان کان ما قلتہ فی حقا فانا اسأل اللہ ان یغفر لی، وان کان ما قلتہ فی باطلا فانا اسأل اللہ ان یغفر لک)

اپنے گناہوں کو دیکھو نہ کہ دوسروں کے گناہوں کو

حضرت ربیع بن خیثمہ کبھی کسی کو برا نہیں کہتے تھے۔ ایک بار انھوں نے فرمایا: لوگوں کا عجیب حال ہے۔ وہ دوسروں کے گناہوں پر تو خدا سے ڈرتے ہیں۔ لیکن خود اپنے گناہوں کی جانب سے بے خوف ہیں (طبقات ابن سعد)

خدا اور رسول کی بات کے آگے جھک جانا

ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ اچھے کھانے کا شوق رکھتے تھے۔ ایک روز عمدہ کھانا خوب سیر ہو کر کھایا اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ آپ کے پاس بیٹھے تھے کہ حضرت ابو جحیفہ کو ڈکار آگئی۔ آپ نے سنا تو فرمایا: جو لوگ دنیا میں سب سے زیادہ آسودہ ہیں، قیامت میں وہی سب سے زیادہ بھوکے ہوں گے (اکثرھم شبعا فی الدنیا اکثرھم جوعا یوم القیامۃ) حضرت ابو جحیفہ پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ اس کے بعد انھوں نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔

جنتی وہ ہے جس کا دل بغض سے خالی ہو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اس پہاڑی راستہ سے ایک جنتی شخص آرہا ہے۔ اتنے میں ایک مسلمان اس راستہ سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ کچھ لوگ اس سے ملے اور پوچھا کہ تم کیا عمل کرتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھارے بارے میں جنتی ہونے کی خبر دی، اس نے جواب دیا: میرے پاس کوئی خاص عمل نہیں۔ البتہ میں اپنے دل میں کسی مسلمان کے خلاف کسی قسم کا کینہ نہیں رکھتا۔

دوسروں کی اصلاح کرنا اور اپنی اصلاح قبول کرنے کے لئے تیار رہنا

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے تو آپ نے اپنے خطبہ میں فرمایا: لوگو، تمھارا معاملہ میرے سپرد کیا گیا ہے حالاں کہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ میرے نزدیک کمزور آدمی تم میں سب سے زیادہ طاقت ور ہے جب تک کہ میں اس کا حق اس کو نہ دلوا دوں۔ اور میرے نزدیک طاقت ور آدمی تم میں سب سے زیادہ کمزور ہے جب تک میں اس سے حق وصول نہ کر لوں۔ لوگو، میں صرف تمھارے ایک آدمی کی طرح ہوں۔ جب تم مجھ کو دیکھو کہ میں سیدھی راہ پر ہوں تو میری پیروی کرو اور اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھ کو سیدھا کر دو (یا ایھا الناس انی قد ولیت امورکم ولست بخیر منکم وان اقواکم عندی الضعیف حتی آخذ لہ بحقہ وان اضعفکم عندی القوی حتی آخذ منہ الحق۔ یا ایھا الناس ما انا الا کاحد کم فاذا رأیتمونی قد استقمت فاتبعونی وان زغت فقومونی)

عمل کا آخری درجہ یہ ہے کہ آدمی کسی کو نقصان نہ پہنچائے

یحیٰی بن معاذ رازی نے کہا: مسلمان بھائی کو اگر تم فائدہ نہ پہنچا سکو تو اس کو نقصان بھی نہ پہنچاؤ (وان لم تنفعہ فلا تضرہ)

حکمراں کے مقابلہ میں

ایک صاحب نے کہا: آپ کی تحریروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ظالم حکمرانوں کے خلاف بغاوت کو صحیح نہیں سمجھتے۔ حالاں کہ حدیث میں آیا ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کہنا سب سے افضل جہاد ہے (افضل الجہاد کلمة عدل عند سلطان جائر، ابو داؤد، ابن ماجہ، ترمذی) میں نے کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ مگر حدیث میں جس چیز کو افضل جہاد بتایا گیا ہے وہ عدل وانصاف کی ایک بات کہنا ہے نہ کہ حکمراں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی مہم چلانا۔ ظالم حکمراں کے سامنے انصاف کی بات کہنا بلاشبہ ایک بہت بڑی بھلائی ہے۔ مگر کسی قائم شدہ مسلم حکومت کو "ظالم" قرار دے کر اس کو ختم کرنے کی تحریک چلانا سراسر باطل ہے جس کا شریعت اسلامی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر صحابہ سے لے کر اب تک تمام علماء کا اجماع رہا ہے۔

سعید بن جبیر تابعی کہتے ہیں۔ میں نے عبد اللہ بن عباس رض سے پوچھا۔ کیا میں بادشاہ کو بھلائی کا حکم دوں اور برائی سے روکوں۔ صحابی نے جواب دیا: اگر تم کو یہ ڈر ہو کہ بادشاہ تم کو قتل کر دے گا تو نہیں۔ میں نے دوبارہ پوچھا، انھوں نے پھر یہی جواب دیا۔ میں نے تیسری بار پوچھا، انھوں نے پھر یہی جواب دیا اور کہا، اگر تم کو ایسا کرنا ہی ہو اور اس کے سوا چارہ نہ ہو تو تنہائی میں اس کو نصیحت کرو (قال سعید بن جبیر قلت لابن عباس آمر السلطان بالمعروف وانہاہ عن المنکر قال ان خفت ان یقتلک فلا۔ ثم عدت فقال لی مثل ذلک۔ ثم عدت فقال لی مثل ذلک، وقال ان کنت لابد فاعلا ففیما بینک وبینہ، جامع العلوم والحکم)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکمراں کی برائی کے اعلان کے سلسلے میں ہماری حدود کیا ہیں۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اس کو قتل وقتال اور ایک دوسرے کو مٹانے کے مرحلہ تک نہ جانے دیا جائے۔ کوئی داعی مسلم حکمراں کو فنا کرنے کا منصوبہ بنائے یا مسلم حکمراں داعیوں کی جماعت کو فنا کرنا چاہے، دونوں حالتوں میں مسلمانوں میں باہمی قتل وخون کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی بھی ایسی تحریک جو لوگوں کو باہمی قتل وخون تک پہنچائے سراسر باطل ہے۔ ہر مسلمان کے لئے دوسرے مسلمان کی جان اور مال اور آبرو حرام ہے اور کسی بھی حال میں کسی مسلمان کو اجازت نہیں کہ ان کو اپنے لئے جائز کرے۔ اس لئے مسلم حکمراں کی اصلاح کا کام لازمی طور پر صرف کہنے یا اعلان کرنے کی حد تک محدود رہنا چاہئے۔ اور اس کا بھی زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے تنہائی میں کہا جائے۔ یعنی مصلح اور حکمراں دونوں تنہائی میں بیٹھیں اور مصلح خیر خواہی اور دلسوزی کے انداز میں اس کی برائی پر اس کو نصیحت کرے۔

مذکورہ بزرگ نے اس کے بعد اپنے نقطۂ نظر کے حق میں دوسری مشہور حدیث کا حوالہ دیا جو مسلم نے

ان الفاظ میں نقل کیا ہے: ابو سعید خدری رضی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا:
تم میں سے جو شخص برائی کو دیکھے تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کو ہاتھ سے روک دے۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے اس کو برا کہے۔ اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے اس کو برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے (من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه وذلك اضعف الايمان) بعض لوگوں نے کہا کہ اس حدیث میں یہ کہاں ہے کہ ظالم حکمران کو اقتدار سے بے دخل کرو۔ یہ حدیث تو سادہ طور پر مسلم معاشرہ کے اندر افراد کی عمومی ذمہ داری کو بتاتی ہے۔ مسلم معاشرہ میں ہر مسلمان کو اس طرح رہنا چاہیے کہ جب وہ اپنے کسی بھائی کو برائی کرتے دیکھے تو اس کو بقدر استطاعت روکے۔ اس کا کسی قسم کی انقلابی سیاست سے کوئی تعلق [illegible]

روزانہ کا مشاہدہ ہے کہ جب ایک آدمی کو کسی آدمی سے شکایت ہو جاتی ہے۔ جب کسی کا مفاد دوسرے سے ٹکراتا ہے۔ جب کبھی کسی کے لئے کسی کے مقابلہ میں "انا" کا سوال پیدا ہو جاتا ہے تو آدمی اس وقت ظلم اور بے انصافی پر اتر آتا ہے۔ جب طاقتور پڑوسی کمزور پڑوسی کی تخریب کے منصوبے بناتا ہے۔ صاحب مکان اپنے کرایہ دار کی خامی دریافت کرنے کی سازشیں کرتا ہے۔ مالک اپنے ملازم کی معاشیات کو برباد کر دینا چاہتا ہے۔ جائداد کا ایک وارث کسی کا حق دینے پر راضی نہیں ہوتا۔ ایک ادارہ اپنے کارکن کو ذلیل کر کے نکال دیتا ہے۔ ایک شخص اپنے دوست اور رشتہ دار کا دشمن بن جاتا ہے۔ ایک لیڈر اپنے اوپر تنقید کرنے والے کو رسوا کر دینا چاہتا ہے۔ ایک کمانے والا اپنے نہ کمانے والے رشتہ دار کو ذلیل کرتا ہے۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے اور ہر بستی اور ہر محلہ میں اس قسم کے واقعات ہر روز دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہی وہ سماجی برائی ہے جس کے خلاف سرگرم ہونے کی مذکورہ بالا حدیث میں تلقین کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی دیکھے کہ اس کے قریب ایک آدمی برائی کر رہا ہے یا کسی بندۂ خدا کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا رہا ہے تو اس معاملہ میں وہ غیر جانبدار نہ ہو جائے بلکہ بقدر استطاعت اس میں اپنے کو شریک کرے۔ اس کو اس وقت تک چین نہ آئے جب تک وہ اپنے بھائی کے خلاف ہونے والی برائی کو ختم ہوتا ہوا نہ دیکھ لے۔ [illegible]

سیاسی تصادم سے بچنے کا مطلب ظلم سے سمجھوتہ نہیں ہے بلکہ اپنی قوتوں کو زیادہ نتیجہ خیز کام میں لگانا ہے۔ اپنی ذاتی زندگی کو خدا پرستی اور انصاف پر قائم کرنا، لوگوں کو موت اور آخرت کے مسئلہ سے ہوشیار کرنا، تعمیری میدان میں اپنے کو مستحکم بنانا، اپنے اندر اتحاد و اتفاق پیدا کرنا، یہ وہ کام ہیں جن کا کرنا ہر حال میں ممکن رہتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ لوگ اپنے عمل کا آغاز یہاں سے کریں۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ جو نہیں ملنے والا ہے اس کو پانے کی کوشش میں وہ بھی ہاتھ سے چلا جائے جو ہر وقت مل سکتا ہے [illegible]

فسادات کا مسئلہ

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ   جمعیۃ بلڈنگ   قاسم جان اسٹریٹ   دہلی ۶

سال اشاعت ۱۹۸۰   قیمت ایک روپیہ پچھتر پیسے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کسی کے گھر میں آگ لگ جائے تو وہ اس کو بجھانے کے لئے فوراً حرکت میں آجاتا ہے۔ تاہم ایسے موقع پر حرکت میں آنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ اس دنیا کے مالک نے آگ بجھانے کا جو اصول مقرر کیا ہے اس کے مطابق آگ بجھانے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے یہ کہ جوش میں آکر کوئی خود ساختہ حرکت شروع کر دی جائے۔ انسان آزاد ہے کہ دونوں میں سے جو عمل چاہے اختیار کرے۔ مگر یہ یقینی ہے کہ دونوں کا انجام اس دنیا میں یکساں نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے جس آگ کو بجھانے کے لئے پانی چھڑکنے کا قانون مقرر کیا ہے اس کو آپ پٹرول چھڑک کر نہیں بجھا سکتے۔ ایسی ہر کوشش صرف اپنی مصیبت میں اضافہ کے ہم معنی ہوگی۔

یہی معاملہ زندگی کے دوسرے مسائل کا بھی ہے، خدا نے اپنی دنیا میں کامیابی کا راز اگر صبر میں رکھا ہے تو آپ اس کو جلد بازی کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے۔ خدا نے اگر ایک واقعی نتیجہ کو عملی جدوجہد سے وابستہ کر دیا ہے تو آپ تقریروں اور بیانات کی دھوم مچا کر اس نتیجہ کو اپنے لئے برآمد نہیں کر سکتے۔ خدا نے اس دنیا کے مسائل کا حل اگر حقیقت پسندانہ طریق عمل میں رکھا ہے تو آپ جذباتیت کے طریقہ پر چل کر اپنے مدعا کو نہیں پا سکتے۔ خدا نے اگر افراد کی خاموش تعمیر میں اصلاح کا راز رکھا ہے تو آپ اجتماعی شور و غل کے ذریعہ اصلاح کے مقصد تک نہیں پہنچ سکتے۔ خدا اگر یہ چاہتا ہے کہ آدمی اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اپنا کام بنائے تو آپ دوسروں کو ملزم ثابت کر کے اپنا کام نہیں بنا سکتے۔ خدا نے اپنے قائم کئے ہوئے نظام میں اگر یہ اصول مقرر کیا ہو کہ جو لوگ پھول کے مالک بننا چاہتے ہیں وہ کانٹوں سے اپنا دامن بچا کر پھول کو حاصل کرنے کی کوشش کریں تو آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ ایک ایک کانٹے سے الجھیں اور اس کے باوجود تر و تازہ پھول آپ کے حصہ میں آجائے۔

زندگی کی سب سے زیادہ تلخ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی بنائی ہوئی دنیا میں نہیں ہیں بلکہ خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں ہیں۔ ہم دنیا میں قائم کئے ہوئے خدائی نظام سے موافقت کر کے تو سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں مگر اس کے مقررہ نظام سے ہٹ کر کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لئے یہاں ہر انسان کو آزادی حاصل ہے۔ مگر یہ آزادی صرف عمل کی آزادی ہے نہ کہ نتیجہ برپا کرنے کی۔ ہم بلاشبہ آزاد ہیں کہ جو چاہیں کریں مگر ہم کو یہ قدرت نہیں دی گئی ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق جو نتیجہ چاہیں ظاہر کر دیں۔ ہم آزاد ہیں کہ دریا میں چھلانگ لگائیں یا نہ لگائیں۔ لیکن اگر ہم کو تیرنا نہیں آتا اور ہم گہرے دریا میں چھلانگ لگا دیتے ہیں تو ہم کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ اپنے کو ڈوبنے سے بچا لیں۔ یاد رکھئے یہ دنیا کسی عذر کو قبول کرنے کے لئے سب سے زیادہ بے رحم واقع ہوئی ہے، خواہ ہم نے اپنے عذر کو کتنے ہی شاندار الفاظ میں مرتب کر رکھا ہو۔

وحید الدین ۷ اکتوبر ۱۹۸۰

بے برداشت نہ ہو

قرآن کی سورہ نمبر ۳۰ کی آخری آیت میں ارشاد ہوا ہے پس تم صبر کرو، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اور تم کو بے برداشت نہ کر دیں وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے (فاصبر ان وعد اللہ حق ولا یستخفنک الذین لا یوقنون، روم)

زمین سے ایک پھل دار درخت کا پودا اگتا ہے۔ قانون قدرت کے مطابق اس میں دسویں سال پھل لگنے والا ہے۔ اب اگر کچھ لوگ جلد بازی کریں اور پودا نکلنے کے چند ماہ بعد ہی اس کا پھل لینا چاہیں تو وہ اپنی جلد باز کارروائیوں سے درخت کو برباد کر دیں گے اور اس کا قدرتی امکان بروئے کار آنے سے رہ جائے گا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ سماجی زندگی میں ظاہر ہونے والے واقعات کا بھی ہے۔ اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اہل حق کو عزت اور غلبہ دے گا۔ مگر درخت کی طرح اس غلبہ کے ظہور کا بھی ایک قانون ہے۔ اگر اس قانون کی رعایت نہ کی جائے اور وقت سے پہلے اس کو پانے کی خواہش کی جائے تو یہ ایسی نادانی ہوگی جس سے غلبہ تو نہیں ملے گا البتہ اس کے امکانات برباد ہو کر رہ جائیں گے۔

خدا کی طرف سے جو غلبہ کا وعدہ ہے وہ اس بنیاد پر ہے کہ اہل حق اپنے حصہ کا کام کر دیں ——— وہ اپنے آپ کو خدا کے دین پر قائم کریں، وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں۔ وہ ممکن دائروں میں اپنے آپ کو مستحکم بنائیں۔ اسی کے ساتھ وہ فریق ثانی کو حق کی دعوت دیں۔ وہ دعوت کے تمام حکیمانہ تقاضوں کا اہتمام کرتے ہوئے اس کو اتمام حجت کے مرحلہ تک پہنچائیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو خدا کے یہاں کسی گروہ کا یہ استحقاق ثابت کرتی ہیں کہ وہ ان کو غالب کرے اور ان کے مقابلہ میں ان کے حریف کو مغلوب کر دے۔

جب اہل حق کے درمیان یہ تمام کام جاری ہوتے ہیں تو فریق ثانی کی طرف سے بار بار اشتعال انگیزیاں کی جاتی ہیں۔ ذہنی اور عملی پہلوؤں سے ایسی باتیں پیش آتی ہیں جو اہل حق کو بھڑکا دینے والی ہوں۔ یہ بڑا نازک وقت ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر اگر اہل حق کی شانتی بھنگ ہو جائے اور وہ فریق ثانی کے چھیڑے ہوئے فتنوں میں اپنے آپ کو الجھا دیں تو اصل کام رک جاتا ہے اور دونوں فریقوں کے درمیان دوسرے غیر متعلق امور پر لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی لڑائی کا آخری فیصلہ ہمیشہ اہل حق کے خلاف ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کا غلبہ خدا کی مدد سے ہوتا اور انھوں نے اصل کام کو نامکمل حالت میں چھوڑ کر غلبہ کا استحقاق کھو دیا۔ انھوں نے "بے برداشت" ہو کر خدا کی نافرمانی کی اور خدا کی نافرمانی کرنے والوں کو کبھی خدا کی نصرت نہیں پہنچتی۔

بے برداشت ہونے کی بہت سی صورتیں ہیں۔ مثلاً اعلیٰ مقصد کی خاطر چھوٹے نقصانات کو برداشت

نہ کرنا اور ان کے لیے الجھانا۔ جذباتی ٹھیس پہنچنے والے معاملات کو نظر انداز نہ کرنا اور اپنے کو ان میں الجھا لینا۔ سماجی اور معاشی مسائل میں خود تعمیری کے اصول پر عمل نہ کرنا اور مطالبہ اور احتجاج کی سیاست میں اپنے کو مشغول کر لینا۔ اپنے افراد میں کردار کی طاقت پیدا کرنے سے پہلے بڑے بڑے اقدامات کرنے لگنا۔ اجتماعی زندگی میں پیش آنے والی فطری زیادتیوں کو غیر ضروری اہمیت دینا اور ان کی خاطر تصادم چھیڑ دینا۔ دوسروں سے غیر حقیقی توقعات قائم کرنا اور جب وہ توقعات پوری نہ ہوں تو جھنجھلا کر ان سے مڈبھیڑ شروع کر دینا۔ انسانی کمزوریوں کی رعایت نہ کرنا اور کسی کے اندر ایک بشری کمزوری پاکر اس کو اچھالنا اور اس کی بنیاد پر ہنگامہ آرائی کرنا۔ سیاسی حکمرانوں سے مفاہمت نہ کرنا اور قبل از وقت ان سے ٹکرا جانا۔ وغیرہ

"بے برداشت نہ ہو جاؤ" کا اصول حد درجہ حکمت پر مبنی ہے۔ اس کی خلاف ورزی کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ نہ ملے ہوئے مواقع کی حرص میں ملے ہوئے مواقع بھی برباد ہو جاتے ہیں۔ ایک حکمراں جو غیر سیاسی دائرہ میں کام کرنے کا موقع دے رہا ہے، اس کو سیاسی اقتدار سے بے دخل کرنے کی مہم چلائی جانے لگے تو وہ غیر ضروری طور پر اہل حق کو اپنا حریف سمجھ لیتا ہے اور حکومتی قوت سے کام لے کر انھیں کچل ڈالتا ہے۔ فریق ثانی اگر زور آور حیثیت رکھتا ہے اور اس کے افراد سے بعض زیادتیاں سرزد ہوتی ہیں اور ان کو برداشت نہیں کیا جاتا تو اس کے بعد عمومی سطح پر ایسے فسادات برپا ہوتے ہیں کہ پوری زندگی تہس نہس ہو جاتی ہے اور کسی بھی قسم کا کوئی تعمیری کام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ جب بھی آدمی کوئی کام شروع کرتا ہے تو فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں مختلف لوگوں کی طرف سے شکایت اور نقصانات سامنے آتے ہیں۔ آدمی اگر ہر شکایت اور ہر نقصان کو اہمیت دے اور اس کی بنیاد پر لوگوں سے لڑنا شروع کر دے تو اصل کام رک جائے گا اور بس لڑائی جھگڑے باقی رہیں گے۔

دوسرے یہ کہ بالفرض ان تمام نادانیوں کے باوجود اہل حق کو غلبہ دے دیا جائے تو عدم تیاری کی کی بنا پر وہ اس کو سنبھال نہ سکیں گے۔ اگر کسی گروہ میں اتحاد نہ ہو تو غلبہ پانے کے بعد وہ آپس میں لڑنا شروع کر دیں گے، جو ٹکراؤ پہلے حق پرستوں اور باطل پرستوں کے درمیان جاری تھا وہ خود حق پرستوں کے اپنے درمیان ہونے لگے گا۔ اگر ان کے افراد میں کردار پیدا نہ ہوا ہو اور انھیں اقتدار پر قبضہ مل جائے تو وہ اصلاح کے بجائے صرف فساد کا سبب بنیں گے اور نتیجۃً حق کے بارے میں ایسی بدگمانیاں پیدا ہوں گی کہ لوگ اس کو ایک قابل نفرت چیز سمجھنے لگیں۔ اگر انھوں نے اپنے اندر یہ مزاج پختہ نہیں کیا ہے کہ ان کے نزدیک ساری اہمیت حق کی ہے باقی تمام چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں تو وہ غلبہ پاکر غیر ضروری سرگرمیوں میں مشغول ہو جائیں گے اور سماج کو نئے نئے مسائل میں الجھا کر رکھ دیں گے۔ اگر انھوں نے اپنے آپ کو انتقام

کی نفسیات سے بلند نہیں کیا ہے تو اقتدار پانے کے بعد وہ اپنے سابق دشمنوں کو ہلاک کرنا شروع کر دیں گے۔ حتیٰ کہ فوج اور انتظامیہ کے اعلیٰ تربیت یافتہ افراد کو ختم کر کے ملک کو اتنا کمزور کر دیں گے کہ ملک کو سنبھالنا ہی ناممکن ہو جائے۔ اگر انھوں نے اپنے اندر برداشت کی قوت پیدا نہیں کی ہے تو وہ ہر اس شخص یا گروہ سے لڑائی چھیڑ دیں گے جس سے ان کے نفس کو چوٹ لگے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام کے غلبہ کے باوجود اسلام کا اصل کام (بندگان خدا کو خدا سے جوڑنا) بدستور اَن ہوا پڑا رہ جائے گا۔ جو شخص جذبات سے بے قابو ہو جائے وہ ایک خرابی کو مٹانے کے نام پر ایسا اقدام کرے گا جس سے کئی شدید تر خرابیاں پیدا ہو جائیں۔

جب بھی کسی کی طرف سے ناپسندیدہ بات سامنے آتی ہے تو آدمی صرف ایک بات سوچتا ہے: یہ مخالف ہے، اس کو کچل ڈالو۔ مگر یہ انسان کا بہت ناقص اندازہ ہے۔ خدا نے انسانی نفسیات میں بے حد لچک رکھی ہے۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسان ایک حالت پر قائم نہیں رہتا بلکہ بدلتا رہتا ہے۔ اور برداشت کا مطلب اسی انسانی امکان کا انتظار کرنا ہے۔ شریعت میں صابرانہ طریق کار کی تلقین اسی لئے کی گئی ہے کہ اس آنے والے وقت کو آنے کا موقع دیا جائے جب کہ "آج" کے انسان کے اندر چھپا ہوا "کل" کا انسان برآمد ہو جائے۔

بہت تھوڑے لوگ ہوتے ہیں جو فی الواقع سوچ سمجھ کر کسی چیز کے مخالف بنتے ہیں۔ بیشتر لوگوں کی مخالفت محض اضافی اسباب کی بنا پر ہوتی ہے۔ کبھی ایک آدمی محض غلط فہمی کی بنا پر کسی چیز کا مخالف بن جاتا ہے۔ کبھی وقتی تقاضے کسی شخص کو آپ کے بالمقابل محاذ میں کھڑا کر دیتے ہیں کبھی حیثیت اور منصب کے مصنوعی مسائل آدمی پر اتنا غالب آتے ہیں کہ وہ کسی بات کے اعتراف سے رک جاتا ہے۔ کبھی کسی کے اختلاف کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ معاملہ کو ایک رخ سے دیکھ رہا ہے اور آپ اس کو دوسرے رخ سے دیکھ رہے ہیں۔ اس قسم کے اختلافات حقیقی اختلافات نہیں ہوتے۔ وہ محض حالات کے تابع ہوتے ہیں اور حالات کے بدلنے کے ساتھ ہمیشہ بدل جاتے ہیں۔

تاہم کچھ مخالفین ایسے ہوتے ہیں جو اپنی مخالفت میں جارحیت کی حد تک جاتے ہیں۔ وہ سازش کرتے ہیں، وہ تخریب کی کارروائیاں کرتے ہیں۔ اور امتحان کی اس دنیا میں بہر حال ان کو بھی اسی طرح عمل کی آزادی حاصل ہے جس طرح کسی دوسرے کو حاصل ہے۔ ایسے لوگوں سے مقابلہ کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ جھنجھلاہٹ کے بجائے صبر اور حکمت کے ساتھ اپنا راستہ نکالا جائے۔ کسی گروہ کی بے صبری اور غیر دانش مندی اس کے دشمن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ سب سے زیادہ نادان وہ ہے جو خود اپنی طرف سے دشمن کو یہ ہتھیار فراہم کر دے۔

چھوٹے شر کو نظر انداز کرو

اخرج الطبرانی فی الاوسط عن ابی جعفر الخطمی ان جدہ عمیر بن حبیب بن حماشۃ و کان قد ادرک النبی صلی اللہ علیہ وسلم عند احتلامہ اوصی ولدہ فقال : یابنی ایاک ومجالسۃ السفہاء فان مجالستھم داء ومن یحلم عن السفیہ یسر ومن یجبہ یندم ومن لا یرضی بالقلیل مما یاتی بہ السفیہ یرضی بالکثیر۔ واذا اراد احدکم ان یامر بالمعروف او ینھی عن المنکر فلیوطن نفسہ علی الصبر علی الاذی ویثق بالثواب من اللہ تعالی فانہ من وثق بالثواب من اللہ عز وجل لم یضرہ مس الاذی

حضرت عمیر بن حبیب بن حماشہ جنھوں نے اپنی بلوغت کے زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پالیا تھا، اپنے لڑکے کو وصیت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ اے میرے بیٹے، نادانوں کی صحبت سے بچو کیونکہ ان کی صحبت میں بیٹھنا بیماری ہے۔ اس کو خوشی ملی جس نے نادان آدمی سے درگزر کیا۔ اور وہ شخص پچھتایا جس نے اس سے دوستی کی۔ اور جو شخص نادان کے چھوٹے شر پر راضی نہ ہو، اس کو نادان کے بڑے شر پر راضی ہونا پڑے گا اور جب تم میں سے کوئی شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرنا چاہے تو اپنے آپ کو تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار کرے اور اللہ سے ثواب ملنے پر بھروسہ کرے۔ کیونکہ جو شخص اللہ سے ثواب ملنے پر بھروسہ کرے گا اس کو تکلیف کا پہنچنا نقصان نہ دے گا۔

ایک نادان شخص اگر کسی کی طرف کنکری پھینکے تو اس کا فوری تاثر یہ ہوتا ہے کہ اس کا بھرپور جواب دیا جائے۔ حالانکہ نادان کی کنکری کا زیادہ بہتر جواب اس کو برداشت کرلینا ہے۔ "کنکر" کو برداشت کرکے آپ معاملہ کو "پتھر" تک پہنچنے سے روک دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی نادان کے شر کو برداشت نہ کرنا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ بالآخر اس سے زیادہ بڑے شر کو برداشت کرنے پر اپنے کو راضی کیا جائے۔

ایک فرقہ کا پہلوان دوسرے فرقہ کے زیر انتظام اکھاڑے میں اس فرقہ کے پہلوان سے کشتی لڑتا ہے۔ کشتی کے خاتمہ پر پہلے فرقہ کے پہلوان کو شکایت ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ دھاندلی کی گئی ہے۔ ایسی حالت میں زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ اس دھاندلی کو برداشت کرے اور اگلے سال اتنی زیادہ تیاری کے ساتھ مقابلہ کے میدان میں اترے کہ وہ دھاندلی کی حد کو پار کرچکا ہو۔ اس کے برعکس اگر اس نے دھاندلی کو برداشت نہ کیا اور دھاندلی کا بدلہ لینے کے لئے دوسرے فرقہ کے پہلوان کو قتل کرنے کی کوشش کی تو اس کے نتیجہ میں ایسا فساد رونما ہوگا جو اس فرقہ کی پوری بستی کو ویران کردے گا۔ اکھاڑے کی دھاندلی نہ برداشت کرنے کی

قیمت معاشی بربادی، سماجی ذلت اور جانوں کی ہلاکت کی صورت میں دینی پڑے گی۔ اسی طرح مثلاً ایک فرقہ کے لوگ اپنی عبادت گاہ میں سالانہ عبادت ادا کر رہے ہیں۔ اس موقع پر دوسرے فرقہ کا گندا جانور چھوٹ کر عبادت گزاروں کی صف میں داخل ہوجاتا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک تکلیف دہ بات ہے۔ لیکن اگر اس تکلیف کو برداشت کر لیا جائے تو صرف ایک وقتی اور معمولی واقعہ پر اس کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اس کے برعکس اگر اس کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کی جائے تو اس کے بعد ایسا فساد برپا ہوگا جو کتنی ہی بستیوں کو خاکستر بنادے گا اور اتنے زیادہ نقصانات سامنے آئیں گے جن کی تلافی برسہابرس تک بھی نہ ہوسکے۔ ایک عبادت گاہ ہے۔ اس کے پاس سے دوسرے فرقہ کے لوگ باجابجاتے ہوئے گزرے اور اس سے عبادت کرنے والوں کو تکلیف پہنچی۔ اگر اس کو برداشت کر لیا جائے تو وقتی تکلیف کے بعد صورت حال معمول پر آجائے گی۔ لیکن اگر عبادت کرنے والے اس پر بگڑ جائیں اور جلوس پر پابندی لگانے کی کوشش کریں تو اس کے جواب میں ضد اور عناد ابھرے گا جو بالآخر لڑائی اور فساد کی صورت اختیار کرے گا۔ جن لوگوں نے چند منٹ کے باجے کا سننا برداشت نہیں کیا تھا انھیں آگ اور خون کا منظر دیکھنے کو برداشت کرنا پڑے گا۔

آدمی بہت جلد اس کے لئے تیار ہوجاتا ہے کہ وہ دوسروں کو بھلائی کا حکم دے اور اس کو برائی سے روکے۔ کیوں کہ دوسروں کے ساتھ ایسا کرنے میں اس کی انا کے لئے تسکین ہے۔ اس سے نفس کو یہ لذت ملتی ہے کہ میں حق پر ہوں اور دوسرا میرے مقابلہ میں ناحق پر ہے۔ مگر بھلائی کا وعظ کہنا اور برائی سے روکنا صرف اس شخص کے لئے جائز ہے جو اس کے تقاضے کو اپنانے کے لئے تیار ہو۔ اور اس کا تقاضا تکلیفوں پر صبر کرنا ہے۔ جب بھی ایک آدمی دوسرے کو ٹوکے گا اور اس کے اوپر تنقید کرے گا تو لازماً ایسا ہوگا کہ وہ شخص برہم ہوگا۔ ایسے موقع پر ٹوکنے والے کو برف کی طرح نرم ہوجانا چاہئے۔ اگر وہ خود بھی اس کے جواب میں برہم ہوجائے تو وہ برائی سے ٹوکنے والا نہیں ہے بلکہ وہ ایک برائی کو دو برائی کرنے کا مجرم ہے جو خدا کے یہاں کسی حال میں قابل معافی نہیں۔

وعظ و نصیحت کے جواب میں پیش آنے والی تکلیفوں پر برہم ہونے سے وہی شخص بچ سکتا ہے جس نے وعظ و نصیحت کا کام تمام تر اللہ کی خاطر شروع کیا ہو۔ جس اللہ سے وہ دوسرے کو ڈرا رہا ہے جب وہ خود اس سے ڈرنے والا بن چکا ہے تو وہ ایسا کام کیوں کر کرسکتا ہے جو صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو اللہ سے بے خوف ہوچکے ہوں۔ جو شخص انسانوں کی طرف سے آنے والی تکلیفوں پر بگڑتا ہے وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ اپنے عمل کا بدلہ انسانوں سے چاہتا تھا۔ اور جب انسانوں کی طرف سے بدلہ نہیں ملا تو وہ بگڑ گیا۔ مگر جو آدمی اپنے عمل کا بدلہ اللہ سے لینے کا امیدوار ہو وہ اس کی بالکل پروا نہیں کرسکتا کہ لوگ اس کے کام کی تعریف کر رہے ہیں یا تنقید۔

آپ مشتعل نہیں ہوئے

۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں خواب دیکھا کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ عمرہ کر رہے ہیں۔ صحابہ کو آپ نے یہ خواب بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے کہ چھ سال کے بعد اب مکہ جانے اور حرم کی زیارت کرنے کا موقع ملے گا۔ اس خواب کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ چودہ سو اصحاب بھی آپ کے ساتھ ہو گئے۔ غدیر اشطاط کے مقام پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ قریش آپ کے سفر کی خبر پاکر سرگرم ہو گئے ہیں۔ انھوں نے ایک لشکر جمع کیا ہے اور عہد کیا ہے کہ آپ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔

کعبہ کی زیارت سے کسی کو روکنا عرب روایات کے بالکل خلاف تھا۔ مزید یہ کہ آپ اشارۂ خداوندی کے تحت یہ سفر کر رہے تھے۔ مگر اس کے باوجود آپ اس خبر کو سن کر مشتعل نہیں ہوئے۔ آپ کے جاسوس نے بتایا کہ خالد بن ولید دو سو سواروں کو لے کر مقام غمیم تک پہنچ گئے ہیں تاکہ آپ کا راستہ روکیں۔ یہ خبر سن کر آپ نے یہ کیا کہ معروف راستہ کو چھوڑ دیا اور ایک غیر معروف اور دشوار گزار راستہ سے چل کر حدیبیہ تک پہنچ گئے تاکہ خالد سے ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔ اس واقعہ کو ابن ہشام نے جن الفاظ میں نقل کیا ہے وہ یہ ہیں:

قال من رجل یخرج بنا علی طریق غیر طریقهم التی هم بها۔ قال رجل انا یا رسول اللہ۔ فقال فسلك بهم طریقا وعراً اجرل بین شعاب فلما خرجوا منه وقد شق ذلك علی المسلمین وافضوا الی ارض سهلة عند منقطع الوادی قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم للناس قولوا نستغفر اللہ ونتوب الیه فقالوا ذلك۔ فقال واللہ انها للحطة التی عرضت علی بنی اسرائیل فلم یقولوها (جزء ۳ صفحہ ۳۵۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کون شخص ہے جو ہم کو ایسے راستہ سے لے جائے جو ان کے راستہ سے مختلف ہو۔ ایک شخص نے کہا کہ میں اے اللہ کے رسول۔ چنانچہ وہ لوگوں کو لے کر ایسے راستہ پر چلا جو سخت دشوار اور پتھریلا تھا اور پہاڑی راستوں سے گزرتا تھا۔ جب لوگ اس راستہ کو طے کر چکے اور مسلمانوں کو اس پر چلنا بہت شاق گزرا تھا اور وہ وادی کے ختم پر ایک ہموار زمین میں پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے کہا کہ کہو ہم اللہ سے مغفرت مانگتے ہیں اور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ لوگوں نے اسی طرح کہا۔ آپ نے فرمایا: خدا کی قسم یہی حِطّہ ہے جو بنی اسرائیل کو پیش کیا گیا تھا۔ مگر انھوں نے نہیں کہا۔

حطہ کا مطلب توبہ اور بخشش ہے۔ اس صبر آزما موقع پر توبہ و استغفار کرانا ظاہر کرتا ہے کہ خدا کے بتائے ہوئے صابرانہ طریق کار کا آدمی کو اس قدر زیادہ پابند ہونا چاہئے کہ اس راہ پر چلتے ہوئے جو کمزوری یا جھنجھلاہٹ پیدا ہو اس کو بھی آدمی گناہ سمجھے اور اس کے لئے خدا سے معافی مانگے۔ اس کو خدا کے طریقہ پر راضی رہنا چاہئے نہ کہ وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر خود ساختہ طریقے نکالنے لگے۔

حدیبیہ کا مقام مکہ سے ۹ میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں آپ ٹھہر گئے تاکہ حالات کا جائزہ لے سکیں۔ حدیبیہ سے آپ نے خراش بن امیہ خزاعی کو ایک اونٹ پر سوار کرکے اہل مکہ کے پاس بھیجا کہ ان کو خبر کر دیں کہ ہم صرف بیت اللہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں، جنگ کے لئے نہیں آئے ہیں۔ جب وہ مکہ پہنچے تو اہل مکہ نے ان کے اونٹ کو ذبح کر ڈالا اور خود حضرت خراش کو بھی قتل کرنے کے لئے دوڑے۔ مگر وہ کسی طرح بچ کر واپس آگئے۔ پھر آپ نے حضرت عثمان کو یہ پیغام لے کر مکہ بھیجا کہ تم لوگ مزاحمت نہ کرو، ہم عمرہ کے مراسم ادا کرکے خاموشی سے واپس چلے جائیں گے۔ اہل مکہ نے حضرت عثمان کو بھی روک لیا۔ پھر مکرز بن حفص پچاس آدمیوں کو لے کر رات کے وقت حدیبیہ پہنچا اور مسلمانوں کے پڑاؤ پر تیر اور پتھر برسانے لگا۔ مکرز کو گرفتار کر لیا گیا۔ مگر اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اس کو بلا شرط چھوڑ دیا گیا۔ اسی طرح مقام تنعیم کی طرف سے ۸۰ آدمی صبح سویرے آئے اور عین نماز کے وقت مسلمانوں پر چھاپہ مارا۔ یہ لوگ بھی پکڑ لئے گئے۔ مگر آپ نے ان کو بھی غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔

اس کے بعد قریش سے طویل مذاکرات کے بعد دونوں فریقوں کے درمیان صلح ہوئی۔ مگر یہ صلح ظاہر بینوں کے لئے سراسر قریش کی فتح اور مسلمانوں کی شکست کے ہم معنی تھی۔ مسلمان یہ سمجھے ہوئے تھے کہ وہ بشارت الٰہی کے تحت عمرہ کرنے کے لئے مکہ جا رہے ہیں مگر جو صلح ہوئی اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس شرط پر راضی ہو گئے کہ وہ عمرہ کئے بغیر حدیبیہ سے واپس چلے جائیں۔ اگلے سال وہ عمرہ کے لئے آئیں مگر صرف تین دن مکہ میں ٹھہریں اور اس کے بعد خاموشی سے واپس چلے جائیں۔ اس طرح کی ذلت آمیز دفعات مسلمانوں کو مشتعل کرنے کے لئے بالکل کافی تھیں۔ مگر آپ نے بظاہر شکست کے باوجود تمام دفعات کو منظور کر لیا۔

قریش نے اس موقع پر آپ کے ساتھ جو کچھ کیا آپ کو اشتعال دلانے کے لئے کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح آپ کو مشتعل کرکے آپ کی طرف سے کوئی جارحانہ اقدام کرا دیں تاکہ قریش کے لئے آپ سے لڑنے کا جواز نکل آئے۔ حرم کی زیارت سے روکنا یوں بھی عرب روایات کے خلاف تھا۔ مزید یہ کہ یہ ذوقعدہ کا مہینہ تھا جو عربوں میں حرام مہینہ شمار ہوتا تھا۔ اس میں جنگ ناجائز سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے اہل مکہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے اوپر جارحیت کی ذمہ داری ڈال کر ان سے جنگ کی جائے۔ مسلمان اس وقت کم تعداد میں تھے۔ ان کے پاس سامان جنگ نہیں تھا۔ وہ مرکز مدینہ سے ڈھائی سو میل دور اور دشمن کے مرکز (مکہ) کی عین سرحد پر تھے۔ قریش کے لئے بہترین موقع تھا کہ آپ کے اوپر بھرپور وار کرکے آپ کے خلاف اپنے دشمنانہ حوصلوں کو پورا کر سکیں۔ اسی لئے انھوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح آپ مشتعل ہو کر لڑ پڑیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر شرارت کو نظر انداز کرتے رہے اور کسی طرح اشتعال کی نوبت نہ آنے دی۔

یہ معاملہ اتنا سنگین تھا کہ حضرت ابوبکر کے سوا صحابہ کرام میں سے کوئی شخص نہ تھا جو یہ محسوس نہ کر رہا ہو کہ ہم ظالم کے آگے جھک گئے ہیں اور اپنے کو توہین آمیز شرائط پر راضی کر لیا ہے۔ قرآن میں جب اس معاہدہ کے

بارے میں آیت اتری کہ یہ فتح مبین ہے تو صحابہ نے کہا: کیا یہ فتح ہے۔ ایک مسلمان نے کہا: یہ کیسی فتح ہے کہ ہم بیت اللہ جانے سے روک دئے گئے۔ ہماری قربانی کے اونٹ آگے نہ جا سکے۔ خدا کے رسول کو حدیبیہ سے واپس آنا پڑا۔ ہمارے مظلوم بھائی (ابو جندل اور ابو بصیر) کو اس صلح کے تحت ظالموں کے حوالے کر دیا گیا۔ وغیرہ۔ مگر اسی ذلت آمیز صلح کے ذریعہ خدا نے فتح عظیم کا دروازہ کھول دیا۔

یہ معاہدہ بظاہر دشمن کے آگے جھک جانا تھا۔ مگر حقیقۃً وہ اپنے کو مضبوط اور مستحکم بنانے کا وقفہ حاصل کرنا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے تمام مطالبات منظور کر کے ان سے صرف ایک یقین دہانی لے لی۔ یہ کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان دس سال تک کوئی لڑائی نہ ہوگی۔ اب تک یہ تھا کہ مسلسل حالت جنگ کی وجہ سے تبلیغ و تعمیر کا کام رکا ہوا تھا۔ آپ نے حدیبیہ سے لوٹ کر فوراً دعوت و تبلیغ کا کام عرب اور اطراف عرب میں تیزی سے شروع کر دیا۔ ابتدائی زمین پہلے تیار ہو چکی تھی۔ پر امن حالات نے جو موقع دیا اس میں دعوت کا کام تیزی سے پھیلنے لگا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اسلام قبول کرنے لگے۔ عرب قبائل ایک کے بعد ایک اسلام میں داخل ہونے لگے۔ عرب کے باہر ملکوں میں اسلام کی دعوت پھیلائی جانے لگی۔ مشرکین مکہ کی طرف سے مامون ہو کر آپ نے خیبر کے یہودیوں کے خلاف کارروائی کی اور ان کا خاتمہ کر دیا۔ دعوتی سرگرمیوں کے ساتھ داخلی استحکام اور تیاری کا کام بہت بڑے پیمانہ پر ہونے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صلح کے صرف دو سال بعد اسلام اتنا طاقت ور ہو گیا کہ قریش نے لڑے بھڑے بغیر ہتھیار ڈال دئے۔ جس مکہ سے توہین آمیز واپسی پر اپنے کو راضی کر لیا گیا تھا اسی مکہ میں اس واپسی سے فاتحانہ داخلہ کا راستہ نکل آیا۔

آج لوگوں کا حال یہ ہے کہ حریف کی طرف سے کوئی ناخوش گوار بات پیش آئے تو فوراً بھڑک اٹھتے ہیں اور اس سے لڑ جاتے ہیں۔ اور جب بے فائدہ لڑائی کے نقصانات بتائے جائیں تو کہتے ہیں کہ ہم خود سے نہیں لڑے۔ ہمارے خلاف سازش کر کے ہم کو جنگ میں الجھایا گیا۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ نہ لڑنا حقیقۃً اسی کا نام ہے کہ کوئی لڑنے آئے تو آپ نہ لڑیں۔ نہ لڑنا یہ ہے کہ لوگ لڑنے آئیں پھر بھی آپ ان سے نہ لڑیں۔ لوگ آپ کو اشتعال دلائیں مگر آپ مشتعل نہ ہوں۔ لوگ آپ کے خلاف سازشیں کریں مگر اپنی خاموش تدبیروں سے آپ ان کی سازش کو ناکام بنا دیں۔ لوگ آپ کے خلاف اپنے دلوں میں دشمنی لئے ہوئے ہوں تب بھی آپ ان کی دشمنی کو عمل میں آنے نہ دیں۔

زندگی کا اصل راز حریف سے لڑنا نہیں ہے۔ زندگی کا راز یہ ہے کہ لڑائی سے بچ کر اپنے آپ کو اتنا طاقت ور بنایا جائے کہ لڑائی کے بغیر محض دبدبہ سے حریف ہتھیار ڈال دے۔ جو لوگ مشتعل ہو کر لڑنا جانیں اور خاموش ہو کر تیاری کرنا نہ جانیں ان کے لئے یہاں صرف بربادی کا انجام ہے۔ ناممکن ہے کہ خدا کی دنیا میں وہ کامیاب ہو سکیں۔ کیسی عجیب بات ہے، جو کامیابی پیغمبر نے نہ ٹکرانے کی پالیسی اختیار کر کے حاصل کی اس کو ہم ٹکرانے کا طریقہ اختیار کر کے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پھر بھی ہمارا یقین ہے کہ ہم رسول خدا کے امتی ہیں اور آپ ضرور خدا کے یہاں ہماری شفاعت فرمائیں گے۔

حلف الفضول

زمانۂ جاہلیت میں عرب کے کچھ لوگوں نے ایک باہمی معاہدہ کیا تھا جس کو حلف الفضول کہا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کا مقصد لوٹ کھسوٹ اور ظلم کو روکنا تھا۔ اس معاہدہ میں شریک ہونے والوں کے نام تھے فضل بن فضالہ، فضل بن وداعہ اور فضیل بن حارث۔ چنانچہ انھیں کے نام پر اس معاہدہ کا نام حلف الفضول (فضل والوں کا معاہدہ) پڑ گیا۔ یہ معاہدہ ابتدائی بانیوں تک زندہ رہا۔ ان کے مرنے کے بعد صرف ان کا نام رہ گیا۔ زبیر بن عبدالمطلب نے اپنے بعض اشعار میں اس معاہدہ کا ذکر اس طرح کیا ہے (الروض الانف از سہیلی)

إنّ الفُضولَ تحالفوا وتعاقدوا — ان لا یُقیمَ ببطنِ مکّةَ ظالمُ

أمرٌ علیہ تعاهدوا وتواثقوا — فالجارُ والمعترُّ فیهم سالمُ

فضل نامی افراد نے باہم معاہدہ کیا اور عہد باندھا کہ مکہ میں کوئی ظالم نہ رہنے پائے گا

انھوں نے اس بات پر باہم عہد باندھا اور اقرار کیا۔ پس مکہ میں پردیسی اور ضرورت سے آنے والا سب محفوظ ہیں

واقعہ فیل کے بعد عرب میں ایک باہمی جنگ ہوئی جس کو حرب الفجار (حرام مہینوں میں کی جانے والی جنگ) کہا جاتا ہے۔ اس جنگ کے بعد دوبارہ عرب میں بدامنی بڑھ گئی۔ اسی زمانہ میں یہ واقعہ ہوا کہ یمن کے قبیلہ زبید کا ایک شخص کچھ تجارتی سامان لے کر مکہ آیا۔ قریش کے ایک سردار عاص بن وائل سہمی نے اس کا سامان خرید لیا مگر اس کی مطلوبہ قیمت نہیں ادا کی۔ مذکورہ یمنی تاجر نے مکہ والوں سے فریاد کی۔ اس نے کچھ اشعار کہے اور ان کے ذریعہ عام لوگوں تک اپنی شکایت پہنچائی۔ اس واقعہ نے مکہ کے کچھ دردمند لوگوں کو چوکنا کر دیا۔ زبیر بن عبدالمطلب کی تحریک پر بنو ہاشم اور بنو تیم کے لوگ عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے تاکہ صورت حال کے بارے میں مشورہ کریں۔ انھوں نے حلف الفضول کی از سر نو تجدید کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے باہمی عہد کے ذریعہ اپنے کو پابند کیا کہ وہ مظلوم کا ساتھ دیں گے اور ظالم سے اس کا حق دلا کر رہیں گے (تعاقدوا باللہ لیکونن مع المظلوم حتی یؤدی الیہ حقہ) اس عہد کے بعد وہ لوگ عاص بن وائل کے پاس گئے۔ اس سے مذکورہ شخص کا سامان چھینا اور اس کو اس کے مالک کے حوالے کیا۔

یہ معاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی عمر میں ہوا تھا۔ وہ اگرچہ عربوں کا ایک معاہدہ تھا مگر آپ نے اس کی تصدیق فرمائی۔ اس کی بابت آپ کے یہ الفاظ سیرت کی کتابوں میں نقل کئے گئے ہیں:

لقد شهدت فی دار عبد اللّٰہ بن جدعان حلفا لو دعیت بہ فی الاسلام لاجبت تحالفوا ان یردوا الفضول علی اهلها وان لا یعز ظالم مظلوما (سیرت ابن کثیر)

میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں ہونے والے معاہدہ میں شریک تھا۔ اگر اسلام کے بعد بھی مجھے اس میں بلایا جاتا تو میں ضرور اس میں شریک ہوتا۔ انھوں نے اس بات کا عہد کیا تھا کہ وہ حقدار تک اس کا حق پہنچائیں گے اور یہ

کہ کوئی ظالم کسی مظلوم پر غالب نہ آسکے گا۔

ابن ہشام نے اس ذیل میں بعض واقعات نقل کئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حلف الفضول کا ذہنی اثر بعد کے عربوں میں بھی باقی تھا۔ ولید بن عتبہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان کے بھتیجے تھے۔ حضرت معاویہ نے ان کو مدینہ کا امیر بنایا تھا۔ اسی زمانہ میں ولید بن عتبہ اور حضرت حسین بن علی رض کے درمیان ایک جائداد کا جھگڑا ہوا جو کہ ذوالمروہ نامی گاؤں میں تھی۔ ولید نے طاقت کے زور پر اس پر قبضہ کرنا چاہا۔ حضرت حسین نے فرمایا:

احلف باللہ لتُنصِفَنّی من حقی او لآخُذنّ سیفی ثم لا قُومَنّ فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم لَاَدْعُوَنّ بحلف الفضول

میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم کو میرے حق کے معاملہ میں انصاف کرنا ہوگا ورنہ میں اپنی تلوار لوں گا اور مسجد نبوی میں کھڑا ہو جاؤں گا اور حلف الفضول کے نام پر پکاروں گا۔

عبداللہ بن زبیر جو اس وقت وہاں موجود تھے انھوں نے بھی یہی بات کہی۔ انھوں نے کہا: میں بھی خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر حسین اس کے لئے پکاریں گے تو میں اپنی تلوار لوں گا اور ان کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں گا یہاں تک کہ ان کا حق ان کو دیا جائے یا ہم دونوں ایک ساتھ قتل ہو جائیں۔ یہ بات مسور بن مخرمہ زہری کو پہنچی تو انھوں نے بھی اسی طرح کہا۔ اسی طرح یہ بات عبدالرحمٰن بن عثمان تیمی کو پہنچی تو انھوں نے بھی ایسا ہی کہا۔ جب ولید بن عتبہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے حضرت حسین کو ان کا حق ادا کر دیا (سیرۃ ابن ہشام، جزء اول، ۱۴۶)

اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہوا کہ بدامنی اور فساد کے مسئلہ کے حل کے لئے اسلام کا مصدقہ طریقہ حلف الفضول کا طریقہ ہے۔ یعنی معاشرہ کے ذمہ دار افراد کا خدا کے سامنے عہد باندھ کر اپنے آپ کو اس کا پابند کرنا کہ جب بھی کوئی ایسا واقعہ ہوگا کہ ایک شخص دوسرے شخص پر ظلم کر رہا ہو تو وہ فوراً دوڑ کر موقع پر پہنچیں گے، مظلوم کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ بنائیں گے۔ وہ اپنی ساری قوت اور ساری کوشش صرف کر کے ظالم کو مجبور کریں گے کہ وہ اپنے ظلم سے باز آئے اور مظلوم کو اس کا حق ادا کرے۔

آج ہر بستی میں یہ صورت حال ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ستاتا ہے۔ کوئی کسی کو ذلیل کرنے پر تلا ہوا ہے، کوئی کسی کے اوپر جھوٹا مقدمہ قائم کئے ہوئے ہے۔ کوئی کسی کا مال ہڑپ کر لینا چاہتا ہے۔ غرض جس کو ذرا بھی کوئی طاقت یا موقع ہاتھ آتا ہے تو وہ اس کوشش میں لگ جاتا ہے کہ کمزور کو دبائے اور ظالمانہ طریقہ پر دوسرے کے حقوق کو غصب کرے۔ اس قسم کے واقعات ہر بستی میں اور ہر محلہ میں ہو رہے ہیں۔ مگر تمام لوگ غیر جانب دار بنے رہتے ہیں حتیٰ کہ ذمہ دار افراد بھی ان معاملات میں کوئی دخل نہیں دیتے۔ کسی کو اگر اصلاح امت یا خدمت قوم کا شوق ہوتا ہے تو وہ جلسوں اور تقریروں کا مشغلہ شروع کر دیتا ہے۔ حالانکہ اصل کام مظلوموں کی عملی دادرسی ہے نہ کہ مظلوموں کے نام پر جلسہ کرنا اور اس میں الفاظ کے دریا بہانا۔ مظلوموں کے نام پر جلسے کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص زخمی ہو جائے اور آپ اس کو اسپتال لے جانے کے بجائے ایک "شاندار زخمی کانفرنس" منعقد کرنے کے لئے دوڑ پڑیں۔

جب لوگ پکار پر دوڑ پڑتے تھے

اسلام سے پہلے عرب میں جو شعراء پیدا ہوئے ان کو جاہلی شعراء کہا جاتا ہے۔ ایک جاہلی شاعر اس زمانہ کے ایک عرب قبیلہ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

لا یسألون اخاھم حین یندبھم　　　فی النائبات علی ماقال برھانا

یعنی ان کے بھائی پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے اور وہ ان کو مدد کے لئے پکارتا ہے تو وہ اس سے اس کی دلیل نہیں پوچھتے۔ بلکہ فوراً اس کی مدد کے لئے دوڑ پڑتے ہیں۔ زمانۂ جاہلیت کے عرب میں اس کو شرافت کی خاص پہچان سمجھا جاتا تھا۔ اسی زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص سے کچھ لوگوں کی دشمنی ہوگئی۔ ایک روز ان لوگوں نے اس شخص کو اکیلے میں پالیا۔ وہ لوگ دوڑے کہ اس کو مار ڈالیں۔ وہ آدمی بھاگا۔ بھاگتے ہوئے اس کو ایک بدو کا خیمہ ملا۔ وہ خیمہ میں گھس گیا اور کہا کہ مجھے بچاؤ۔ بدو عرب نے اس کو خیمہ کے اندر بٹھایا اور خود خیمہ کے دروازے پر تلوار لے کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے دشمن جب وہاں پہنچے تو اس نے کہا: میں نے اس آدمی کو پناہ دی ہے، اب اگر تم اس کو پکڑنا چاہتے ہو تو پہلے تم کو میری تلوار کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ مجھ کو ختم کرنے کے بعد ہی تم اس کو پا سکتے ہو۔

عباسی خلافت کے زمانہ میں ایک شخص نے بغاوت کی۔ اس کا نام بابک خرمی تھا۔ اس نے موصل کے علاقہ میں اپنی بڑی طاقت بنالی۔ خلیفہ معتصم باللہ (۲۲۷-۱۸۰ھ) نے اس کی سرکوبی کے لئے ایک بڑی فوج بھیجی۔ بابک خرمی جب مسلمانوں کے لشکر کے محاصرہ میں آکر تنگ ہوا تو اس نے یہ تدبیر کی کہ اس نے اس وقت کے رومی بادشاہ نوفل بن میکائیل (قیصر روم) کو ایک خفیہ خط بھیجا جو اپنی سلطنت کا بڑا حصہ کھو کر ترکی کے علاقہ میں مقیم تھا۔ بابک نے اس کو لکھا کہ معتصم باللہ نے اس وقت اپنی تمام فوجیں میرے مقابلہ پر روانہ کر دی ہیں۔ بغداد اور سامرہ فوجوں سے خالی ہو گئے ہیں۔ تمھارے لئے بہترین موقع ہے کہ تم خلافت بغداد پر حملہ کرکے ان سے اپنی سابق سلطنت چھین لو۔ شاہ روم اپنی ایک لاکھ فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ سب سے پہلے اس نے زبطرہ پر شب خون مارا جو ترکی کی سرحد پر واقع تھا۔ وہاں کے مردوں کو قتل کیا اور بچوں اور عورتوں کو گرفتار کرکے لے گیا۔

یہ ۲۹ ربیع الثانی ۲۲۳ھ کا واقعہ ہے۔ ایک شخص زبطرہ کے حادثہ کی خبر لے کر معتصم باللہ کے پاس بغداد پہنچا۔ واقعات بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ ایک عرب عورت کو رومیوں نے پکڑا اور اس کو کھینچ کر لے جانے لگے تو اس نے پکارا وامعتصماہ (ہائے معتصم) معتصم باللہ اس وقت مجلس طرب میں تھا۔ مگر

جیسے ہی اس نے یہ خبر سنی لبیک لبیک کہتا ہوا فوراً وہ اپنے تخت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کہا کہ میں اس وقت تک آرام نہیں کروں گا جب تک عرب خاتون کی مدد نہ کرلوں۔ وہ اپنے محل پر چڑھا اور اس کے اوپر کھڑا ہو کر پکارا الرحیل الرحیل (کوچ، کوچ) اس کے بعد وہ گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا اور کوچ کا نقارہ بجا دیا۔ لشکر اور سرداران لشکر گروہ در گروہ آکر اس کے ساتھ شریک ہو گئے۔ وہ اس معاملہ میں اتنا سنجیدہ تھا کہ قاضی اور گواہ بلا کر اس نے وصیت لکھوائی کہ اگر میں جنگ سے واپس نہ آؤں تو میرا اثاثہ کس طرح تقسیم کیا جائے۔

معتصم باللہ اپنے لشکر کے ساتھ زبطرہ پہنچا تو رومی وہاں سے بھاگ کر اپنے قلعہ بند شہر عموریہ جا چکے تھے۔ معتصم باللہ آگے بڑھا اور اپنی فوجوں کو لے کر رومی علاقہ (ترکی) میں داخل ہو گیا۔ اس نے عموریہ کا محاصرہ کرلیا۔ ۵۵ روز کے محاصرہ کے بعد رومی فوجوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ معتصم باللہ نے عموریہ کی تمام شاہی اور فوجی تعمیرات کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا۔ قیصر روم نوفل نے بھاگ کر قسطنطنیہ میں پناہ لی۔ معتصم باللہ نے عرب خاتون کو رومی قید سے آزاد کرایا اور اس کو اس کے گھر پہنچا دیا۔

کسی معاشرہ میں "فساد" نہ ہونے کی سب سے بڑی ضمانت یہ ہے کہ اس کے افراد مظلوم کی پکار پر دوڑ پڑیں۔ اس کے برعکس جہاں لوگوں کو مظلوم کی پکار سے دلچسپی نہ ہو، وہ صرف اس وقت بیان اور تقریر کا کرشمہ دکھانے کے لئے باہر آئیں جب کہ اس کے اندر اخباری اہمیت (نیوز ویلیو) پیدا ہو چکی ہو، ایسے معاشرہ میں ہر وقت فساد کے اسباب پرورش پاتے رہتے ہیں اور موقع پاتے ہی پھوٹ پڑتے ہیں۔ آج لوگوں میں انفرادیت اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ایک شخص خواہ کتنا ہی پکارے، کوئی اس کی مدد کے لئے نہیں دوڑتا۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی اس کی مدد کے لئے اپنے اندر کوئی تڑپ نہیں پاتے جو بے انصافی کے خاتمہ کے عنوان پر اپنی تحریکیں چلا رہے ہیں۔ لوگ ظلم اور بے انصافی کے نام پر تقریریں کرتے ہیں۔ مگر جب ایک واقعی مظلوم ان کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو وہ حیرت انگیز طور پر پاتا ہے کہ ان مقرر لیڈروں کو اس کی مدد پر پہنچنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

موجودہ فرقہ وارانہ فساد کا کم از کم ایک جزئی سبب یہ بھی ہے۔ ایک مقام پر ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کو ستایا۔ اس نے اپنی قوم کے لیڈروں کو مدد کے لئے پکارا۔ مگر کوئی ایک شخص بھی اس کی مدد پر نہ اٹھا۔ اس واقعہ کا اس پر اس قدر شدید ردعمل ہوا کہ مسلمانوں سے اس کو نفرت ہو گئی۔ اس نے ایک سازش کر کے اپنے مقام پر ایک فرقہ وارانہ فساد کرا دیا۔ اور جب فساد کا ہنگامہ شروع ہوا تو اس کے دوران اس نے ان لوگوں کے گھر جلا ڈالے جن سے اس کو شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ کسی معاشرہ کا سب سے بڑا فساد باہمی بے اعتمادی ہے اور انفرادی ظلم پر نہ دوڑنا معاشرہ کے اندر برائی پیدا کرتا ہے۔

پتھر سے پانی

روس کے کچھ ماہرین نے تجربہ کرکے بتایا ہے کہ پتھر کو نچوڑ کر اس سے پانی نکالا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ زمین کے چند میٹر نیچے سے پتھر کی چٹان کا ایک ٹکڑا کاٹ کر نکالئے اور اس کو دھات کے گلاس میں رکھئے۔ پھر اس کے اوپر دس ٹن فی مربع سنٹی میٹر کے حساب سے دباؤ ڈالئے۔ اس کے بعد پتھر سے پیالی پانی سے قطرے ٹپکنا شروع ہو جائیں گے۔

یہ قدرت کی ایک نشانی ہے جو ہم کو سبق دیتی ہے کہ اس دنیا میں ہمارے لئے کیا کیا امکانات رکھ دئے گئے ہیں۔ "پتھر" ایک خشک چیز ہے۔ مگر پتھر جیسی خشک چیز بھی اس وقت پانی ٹپکانے لگتی ہے جب کہ اس کو استعمال کیا جائے اور اس کے ساتھ وہ عمل کیا جائے جو مطلوب ہے۔ ایک مسلمان نے شہر میں اپنا مکان بنایا۔ ان کے قریب ہی ایک اور شخص نے گھر بنایا جو کہ دوسرے فرقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ایک ٹھیکہ دار آدمی تھا اور بہت تیز تھا۔ مسلمان کے گھر اور ٹھیکہ دار کے گھر کے درمیان ایک زمین تھی جس کے بارے میں دونوں میں جھگڑا شروع ہو گیا ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ یہ زمین میری ہے۔ ٹھیکہ دار نے دیکھا کہ وہ تنہا اپنا مطالبہ منوانے میں کامیاب نہیں ہو رہا ہے، وہ شہر کے فرقہ پرست عناصر کے پاس گیا اور ان کو خوب ورغلایا۔ یہاں تک کہ ایک روز فرقہ پرستوں کی ایک بھیڑ مسلمان کے مکان کے سامنے جمع ہو گئی اور شر انگیز نعرے لگانے لگی۔

مسلمان اپنے گھر سے باہر نکلا تو صورت حال کا اندازہ کرنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ یہ لوگ شر پسندی پر آمادہ ہیں اور اگر ذرا سی بھی کوئی اشتعال انگیز بات ہوئی تو جلانے اور پھونکنے کی سطح پر اتر آئیں گے۔ اس نے کہا، آپ میں نمائندہ کون لوگ ہیں، وہ باہر آ جائیں تاکہ ان سے بات کی جا سکے۔ چنانچہ چار پانچ لیڈر قسم کے آدمی سامنے آگئے۔ مسلمان ان کو اپنے دفتر میں لے گیا۔ جب وہ لوگ سکون کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھ گئے تو اس نے کہا کہ بات بہت مختصر سی ہے اور اس کا فیصلہ بہت آسانی سے ہو سکتا ہے۔ پھر اس نے کہا کہ دیکھئے زمین کاغذ پر ہوتی ہے زمین کا فیصلہ کاغذ کو دیکھ کر کیا جاتا ہے، جو کاغذات میرے پاس ہیں وہ میں آپ کو دے دیتا ہوں۔ اور جو کاغذات ٹھیکہ دار صاحب کے پاس ہیں وہ بھی آپ ان سے لے لیں۔ آپ دونوں کاغذات کو دیکھ لیجئے۔ اس کے بعد آپ جو فیصلہ کریں وہی مجھ کو منظور ہے، یہ سنتے ہی فرقہ پرست لیڈروں کا ذہن بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ ہر ایک نے کہا کہ "یہ تو بہت معقول آدمی ہے۔ یہ سارا فیصلہ خود ہمارے حوالے کر رہے ہیں" اس کے بعد انھوں نے چند دن کاغذات دیکھنے میں گزارے اور بالآخر خود مسلمان کے حق میں زمین کا فیصلہ کر دیا ——— فرقہ پرست عناصر ابتداءً پتھر تھے۔ مگر مسلمان نے جب ان کے اوپر معقولیت کا دباؤ ڈالا تو پتھر سے پانی ٹپکنا شروع ہو گیا۔

صبر کا طریقہ

فساد کا کوئی سبب پیدا ہو تو اس وقت ایک طریقہ صبر کا ہے اور دوسرا طریقہ اشتعال کا۔ ایسے موقع پر مشتعل ہونا فساد کو بڑھاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ذہن کو قابو میں رکھ کر سوچا جائے اور صبر کا طریقہ اختیار کیا جائے تو مسئلہ جہاں تھا وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں ہم چند واقعات لکھتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ صبر کا طریقہ اختیار کرنا کس طرح فساد کی آگ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔

۱۔ غالباً ۱۹۷۳ کی بات ہے۔ دار العلوم ندوہ (لکھنو) کے قریبی محلہ میں ایک غیر مسلم کی گائے تھی۔ ایک مقامی مسلمان نے کسی وجہ سے گائے کو مارا۔ اتفاق سے چوٹ کسی نازک مقام پر لگ گئی اور گائے مر گئی۔ غیر مسلم حضرات کو جب معلوم ہوا کہ ان کی گائے ایک مسلمان نے مار ڈالی ہے تو پورے علاقہ میں اشتعال پیدا ہو گیا۔ سیکڑوں کی تعداد میں غیر مسلم لوگ جمع ہو گئے۔ سب سے قریبی مسلم مرکز ندوہ تھا۔ وہ لوگ ندوہ میں گھس آئے اور اشتعال انگیز نعرے لگانے لگے۔

یہ بڑا نازک وقت تھا۔ اندیشہ تھا کہ وہ لوگ ندوہ کو آگ لگا دیں اور پھر سارے شہر میں فساد برپا ہو جائے۔ ندوہ کے ذمہ داروں نے اس موقع پر مشورہ کیا۔ طے ہوا کہ اس مشتعل مجمع کو ٹھنڈا کرنے کی تدبیر صرف یہ ہے کہ گائے کے قاتل کو مجمع کے حوالے کر دیا جائے۔ اگرچہ یہ ایک خطرناک کام تھا مگر شہر کو آگ اور خون سے بچانے کی کوئی دوسری تدبیر ممکن نہ تھی۔ چنانچہ ذمہ دار حضرات مذکورہ مسلمان کے پاس گئے جو غالباً ندوہ کے ایک کمرہ میں چھپا ہوا تھا۔ اس سے کہا کہ اس وقت ندوہ اور سارا شہر خطرہ میں ہے۔ مگر ان کا سارا غصہ تمہاری وجہ سے ہے۔ اگر وہ تم کو پا جائیں تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اگرچہ یہ تمہارے لئے ایک خطرہ کی بات ہے۔ تاہم امید ہے کہ اللہ کی مدد حاصل ہوگی اور تم کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ آخر کار وہ راضی ہو گیا۔ اور نکل کر مجمع کے سامنے آگیا۔ اس نے کہا کہ آپ کی گائے میں نے ماری ہے اس لئے آپ میرے ساتھ جو چاہیں کریں۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ میں نے مارنے کی نیت سے نہیں مارا تھا بلکہ اس کو بھگانے کے لئے مارا تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ وہ مر گئی۔ مجمع نے جب گائے کے قاتل کو دیکھا اور اس کی باتیں سنیں تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ لوگ جو ندوہ کو پھونکنے اور اور شہر کی مسلم آبادی کو ویران کرنے پر تلے ہوئے تھے وہ صرف اتنی سی بات پر راضی ہو گئے کہ گائے کا قاتل گائے کی قیمت ادا کر دے۔ قیمت فوراً ادا کر دی گئی اور مسئلہ اسی وقت ختم ہو گیا۔

۲۔ فیروز جھرکا ضلع گوڑ گاؤں (ہریانہ) کا ایک قصبہ ہے۔ قصبہ میں تقریباً تمام دکانیں غیر مسلم حضرات کی ہیں۔ مگر اطراف کے تمام دیہاتوں میں مسلمانوں (میووں) کی اکثریت ہے۔ فیروز پور کے بازار میں زیادہ تر یہی مسلمان خریداری کرتے ہیں۔ ۱۹۸۰ کے آغاز میں یہ واقعہ ہوا کہ ایک غیر مسلم خاندان کی لڑکی گھر سے غائب ہو گئی۔ لوگوں کو شبہ ہوا کہ کچھ مسلم نوجوانوں نے ایسا کیا ہے۔ چنانچہ غیر مسلم حضرات نے کافی شور و غل کیا۔ پولس میں رپورٹ کر کے کچھ مسلمانوں کو گرفتار کرایا۔

ایک روز احتجاجی ہڑتال کی۔ بسوں کو روک کر مسلم مسافروں کو پریشان کرنا شروع کیا۔ ہندی اخبارات میں اغوا کی رپورٹ شائع کرائی۔ اس طرح کے واقعات نے علاقہ میں سخت اشتعال پیدا کر دیا۔ اور اندیشہ ہو گیا کہ کسی بھی دن فساد برپا ہو جائے اور اس کے بعد سارا علاقہ آگ اور خون کی نذر ہو جائے۔

اس علاقہ میں مسلمانوں کی پنچایت قائم ہے اور اہم قومی مسائل پر پنچایتی فیصلہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ پنچایت کا اعلان ہوا تاکہ باہمی مشورہ سے اقدام کا فیصلہ کیا جائے۔ ایک خاص تاریخ کو علاقہ کے چودھری اور ذمہ دار مسلمان کئی سو کی تعداد میں فیروز پور کے پاس ایک مقام پر جمع ہوئے۔ کئی گھنٹہ کی گفتگو کے بعد بالآخر بائیکاٹ کا فیصلہ ہوا۔ طے ہوا کہ مسلمان کوئی براہ راست کارروائی نہ کریں۔ بس خاموشی سے یہ کریں کہ غیر مسلم دوکان داروں کے یہاں سے خریداری کرنا بالکل بند کر دیں۔ کچھ لوگ نگراں مقرر ہوئے جو بازار کے تمام راستوں پر بیٹھیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ کوئی مسلمان خریداری کے لئے غیر مسلم دکان داروں کے یہاں نہ جائے۔

اگلے دن سے بائیکاٹ شروع ہو گیا۔ میووں کے نزدیک برادری کے فیصلہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، اس لئے بائیکاٹ کا فیصلہ صد فی صد کامیاب رہا۔ فیروز پور کا بازار نیز اطراف کے بازار جو روزانہ بھرے رہتے تھے، بالکل سونے ہو گئے۔ دکان دار سارے دن بے کار رہنے لگے۔ ابھی بائیکاٹ کو صرف تین دن گزرے تھے کہ غیر مسلم دکاندار چیخ اٹھے۔ غیر مسلم دکان داروں نے باہم مشورہ کر کے علاقہ کے ذمہ دار مسلمانوں کو بلایا اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کی ایک مشترکہ پنچایت کی۔ غیر مسلم حضرات نے کہا کہ ہم آپ کے بھائی ہیں۔ جو کچھ ہوا اس کو بھول جائیے اور ہماری کوتاہی معاف کیجئے اور بائیکاٹ کو ختم کر دیجئے۔ مسلمانوں نے اس پیش کش کو قبول کر لیا اور چوتھے دن بائیکاٹ ختم ہو گیا اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف جو کارروائیاں کی جا رہی تھیں وہ بھی ختم ہو گئیں۔

۳۔ علی گڑھ یونیورسٹی کیمپس میں ستمبر ۱۹۸۰ میں یہ واقعہ ہوا کہ ہادی حسن ہال کے پیچھے ایک جھاڑی میں دوسرے فرقہ سے تعلق رکھنے والے چار آدمی ایک سور کاٹ رہے تھے۔ بظاہر ان کا منصوبہ یہ تھا کہ سور کے ٹکڑے یونیورسٹی میں پھینک کر وہاں کے مسلمانوں کو مشتعل کر دیا جائے اور اس طرح بہانہ پیدا کر کے یونیورسٹی کے علاقہ میں فساد کیا جائے۔ اتفاق سے کچھ مسلم طلبا نے اس کو دیکھ لیا۔ انھوں نے فوراً یونیورسٹی پراکٹر کو مطلع کیا۔ پراکٹر نے اسی وقت پولس کو ٹیلی فون کیا۔ پولس اطلاع ملتے ہی فوراً پہنچ گئی اور چاروں آدمیوں کو عین موقع پر گرفتار کر لیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لوگوں کی یہی دانش مندی تھی جس کی وجہ سے ایسا ہوا کہ ۸۰-۱۹۷۹ میں علی گڑھ میں مہینوں تک فساد کا سلسلہ جاری رہا مگر سارا فساد شہر کے علاقہ میں ہوا اور ریلوے لائن کے دوسری طرف یونیورسٹی کا وسیع علاقہ بالکل محفوظ رہا۔ علی گڑھ کا یہ تجربہ بتاتا ہے کہ ہر تخریبی سازش کو دانش مندی کے ذریعہ غیر موثر بنایا جا سکتا ہے۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ فساد کے اسباب مکمل طور پر پیدا ہونے کے باوجود اس کا مکمل طور پر خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ کوئی واقعہ خواہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو ہمیشہ اس کے اندر اس کی کاٹ کے اسباب بھی موجود ہوتے ہیں۔ اور یہ ممکن ہوتا ہے کہ ان کو استعمال کر کے اس کو غیر موثر بنا دیا جائے۔ مگر اس امکان کو استعمال

کرنے کی لازمی شرط صبر ہے۔ واقعہ خواہ کتنا ہی خلاف مزاج ہو مگر دانش مندی یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر آدمی مشتعل نہ ہو۔ مشتعل آدمی کی عقل کھو جاتی ہے۔ وہ کسی معاملہ کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ اس لئے وہ اس کو دفع کرنے کی صحیح منصوبہ بندی بھی نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد انتہائی ضروری ہے کہ آدمی مشورہ کرے۔ مشورے سے بیک وقت دو فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں کئی آدمیوں کی سوچ اور تجربات شامل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے معاملہ کو زیادہ وسعت کے ساتھ سمجھنا ممکن ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں متاثر ذہن کے ساتھ غیر متاثر ذہن کی رائے بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اس لئے جو فیصلہ ہوتا ہے وہ ٹھنڈے ذہن سے سوچا سمجھا فیصلہ ہوتا ہے نہ کہ مغلوب ذہن کے تحت کیا ہوا فیصلہ۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ یک طرفہ الزام بازی کا طریقہ ہرگز اختیار نہ کیا جائے۔ بلکہ فیاضی کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا جائے۔ انسان کی یہ نفسیات ہے کہ اگر وہ دیکھتا ہے کہ مقابل کا آدمی اپنی غلطی کو نہیں مان رہا ہے تو اس کے متعلق اس کے اندر انتقام کے جذبات امنڈتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر آدمی دیکھے کہ اس کا حریف اپنی غلطی کو کھلے دل سے مان رہا ہے تو اچانک اس کے اندر رحم اور عفو کے جذبات امنڈ آتے ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ غلطی کا اعتراف کر کے اس نے اپنی سزا آپ دے لی ہے، اب میں مزید سزا اسے کیا دوں

یہ بھی حد درجہ ضروری ہے کہ قانون کو کبھی اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش نہ کی جائے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں باقاعدہ قانون کی حکومت قائم ہو وہاں قانون اپنے ہاتھ میں لینا اپنے کو مجرم کی صف میں کھڑا کرنا ہے۔ قانون اپنے ہاتھ میں لے کر آدمی اپنے آپ کو بیک وقت دو فریقوں کا مدمقابل بنا لیتا ہے۔ ایک وہ شخص جس نے کوئی شر کیا تھا، اور دوسرے ملک کا انتظامیہ۔ اس کے برعکس اگر آپ معاملہ کو فوراً انتظامی ذمہ داروں کے حوالے کر دیں تو آپ درمیان سے ہٹ جاتے ہیں۔ اب سارا معاملہ شر پسند اور انتظامیہ کے درمیان ہو جاتا ہے۔

آخری ضروری چیز اتحاد ہے۔ کوئی بھی اجتماعی تدبیر اجتماعی طاقت ہی سے کامیاب ہوتی ہے اور اتحاد ہی کا دوسرا نام اجتماعی طاقت ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بخوبی سمجھ لینا چاہئے کہ اتحاد اس طرح کبھی نہیں ہوتا کہ تمام لوگوں کی رائیں ایک ہو جائیں۔ ایسا اتحاد موجودہ دنیا میں ممکن نہیں۔ اتحاد دراصل اختلاف رائے کے باوجود متحد ہونے کا نام ہے نہ کہ اختلاف رائے نہ ہونے پر متحد ہونے کا۔ اگر ہم اپنے حریف کے مقابلہ میں موثر بننا چاہتے ہیں تو ہم کو رائے کی قربانی دینے پر تیار ہونا پڑے گا۔ رائے کی قربانی ہی پر اتحاد قائم ہوتا ہے اور جہاں اتحاد موجود ہو وہاں کسی شریر کی شرارت کا کوئی گزر نہیں۔

تدبیر وہی ہے جو خاموش تدبیر ہو۔ کسی ناخوش گوار صورت حال کے پیش آنے کے بعد جب آدمی شور وغل کرنے لگے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جذبات سے مغلوب ہو گیا ہے۔ اور جذبات سے مغلوب انسان کبھی کوئی گہری تدبیر سوچ نہیں سکتا۔ گہری تدبیر گہرے غور و فکر سے حاصل ہوتی ہے، جب کہ شور وغل آدمی کو اس قابل ہی نہیں رکھتا کہ وہ کسی معاملہ میں گہرائی کے ساتھ غور کر سکے۔

قدرت کا سبق

جانوروں کے دو سب سے بڑے مسئلے ہیں۔ غذا اور دفاع۔ جانوروں میں ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں اور ہر جانور کو مستقل طور پر اپنے بچاؤ کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ جانوروں میں اپنے بچاؤ کے جو طریقے رائج ہیں وہ انسان کے لئے بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ حیوانات کا طریقہ در اصل قدرت کا طریقہ ہے۔ حیوانات جو کچھ کرتے ہیں اپنی جبلت کے تحت کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر، وہ براہ راست قدرت کے سکھائے ہوئے ہیں۔ جانور گویا قدرت کے مدرسہ میں تربیت پائے ہوئے طالب علم ہیں۔ ان کا عمل قدرت کا بتایا ہوا سبق ہے۔ ان کے طریق کار کو پیدا کرنے والے کی تصدیق حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ ہاتھی اور شیر جنگل کے دو سب سے بڑے جانور ہیں۔ اگر دونوں میں ٹکراؤ ہو جائے تو یہ ٹکراؤ دونوں کے لئے مہلک ہوتا ہے، ہاتھی اور شیر دونوں اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ ایک دوسرے سے کترا کر نکل جائیں۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ دونوں یہ نوبت آنے دیں کہ ان کے درمیان براہ راست جنگ شروع ہو جائے۔ دو ایسے حریفوں کی جنگ جن میں دونوں میں سے کوئی دوسرے کو فنا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو ہمیشہ دو طرفہ تباہی پر ختم ہوتی ہے۔ اور شیر اور ہاتھی اپنی زندگی میں اس کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہیں۔

۲۔ یہی معاملہ سانڈ کا ہے۔ دو سانڈ (بھینسے یا بیل) اگر ایک دوسرے سے لڑ جائیں تو اس کا بہت کم امکان ہے کہ ایک دوسرے کو ختم کر دے۔ سانڈ ایسے بے فائدہ ٹکراؤ سے بچنے کے لئے یہ تدبیر کرتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے حدود بانٹ لیتے ہیں۔ دو سانڈ ایک علاقہ میں پہنچ جائیں تو چلتے چلتے جب کسی مقام پر دونوں کی مڈبھیڑ ہوتی ہے تو دونوں ایک دوسرے کو سینگ مار کر علامتی طور پر اظہار کرتے ہیں کہ یہاں سے ایک طرف تمہارا علاقہ ہے اور یہاں سے دوسری طرف میرا علاقہ۔ اس علامتی ٹکراؤ کے بعد دونوں اپنے پیچھے کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور اس کے بعد دونوں مکمل طور پر اس سرحدی تقسیم کی پابندی کرتے ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ دو سانڈ آپس میں لڑ جائیں۔

۳۔ آپ نیلی گھوڑی یا بیر بہوٹی کو چھوئیں تو وہ پاؤں سمیٹ کر بے حس و حرکت زمین پر پڑ جائے گی۔ بہت سے جانوروں کے لئے اپنے دشمن سے بچنے کا یہ آسان طریقہ ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ دشمن سر پر آگیا ہے اور اس سے بھاگنا ممکن نہیں ہے تو وہ اپنے کو بے حس و حرکت بنا لیتے ہیں۔ ان کا دشمن ان کو دیکھتا ہے مگر وہ مردہ سمجھ کر ان کو چھوڑ دیتا ہے۔ وہ اپنے کو غیر موجود ظاہر کر کے اپنے کو دشمن سے بچا لیتے ہیں اور جب دشمن ہٹ جاتا ہے تو بھاگ جاتے ہیں۔

۴۔ جو جانور بلوں کے اندر رہتے ہیں ان کے لئے ہمیشہ یہ خطرہ ہوتا ہے کہ ان کا دشمن ان کی بل کے اندر گھس جائے اور دشمن سے وہ اس طرح گھر جائیں کہ بل کے محدود رقبہ کی وجہ سے وہ بھاگ نہ سکیں۔ چنانچہ بل والے جانور ہمیشہ اپنی بل میں ایک عقبی گزرگاہ رکھتے ہیں جو ہنگامی حالات میں کام آسکے۔ جب بھی کوئی جانور دیکھتا ہے کہ سامنے کے سوراخ سے اس کا دشمن اس کے گھر میں گھس آیا ہے، وہ پیچھے کے سوراخ سے نکل کر باہر بھاگ جاتا ہے اور

دشمن کی زد سے اپنے کو بچا لیتا ہے۔

۵۔ ایک بہت چھوٹا کیڑا ہے۔ وہ اپنے حریف کیڑے کو ختم کرنے کے لئے بہت دلچسپ طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنے حریف کیڑے کے جسم میں اپنا ڈنک چبھاتا ہے جو انجکشن کی سوئی کی مانند ہوتا ہے یعنی نکیلا اور اندر سے سوراخ دار۔ وہ نہایت پھرتی سے اپنے بے حد چھوٹے انڈے کو اس کے جسم میں داخل کر دیتا ہے۔ یہ انڈا جو در اصل زندہ بچے کی ابتدائی صورت ہوتی ہے، اپنے میزبان جانور کے جسم کا اندرونی حصہ کھاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ لاروا (چھوٹے بچہ) کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اب یہ لاروا باہر نکلنے کے لئے زور کرتا ہے۔ میزبان جانور کے لئے یہ سخت ترین لمحہ ہوتا ہے مگر وہ ایک ایسے دشمن کے مقابلہ میں اپنے کو بے بس پاتا ہے جو خود اس کے پیٹ میں گھسا ہوا ہو۔ اس طرح لاروا اندر کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے میزبان جانور کے جسم کو پھاڑ کر باہر آ جاتا ہے۔ یہ عمل اتنا شدید ہوتا ہے کہ اس کے بعد میزبان جانور کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

قدرت کے تربیت یافتہ حیوانات میں بچاؤ کے جو طریقے رائج ہیں وہی انسان کے لئے بھی پوری طرح کار آمد ہیں۔ انسان کے لئے بھی اپنے حریف کے مقابلہ میں بہترین تدبیر یہ ہے کہ وہ براہ راست تصادم سے بچے اور کترا کر نکلنے کی کوشش کرے۔ حریف کو کبھی یہ محسوس کرنے کا موقع نہ دیا جائے کہ آپ اس کے دائرہ میں مداخلت کر رہے ہیں۔ اگر حریف کا سامنا ہو جائے تو اس کے مقابلہ میں اپنے کو غیر فعال ظاہر کر کے اپنے کو اس کی زد سے ہٹایا جائے یا اپنے دائرہ میں سمٹ کر اس کو یہ احساس دلایا جائے کہ میری وجہ سے تمہارا کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں۔ اسی کے ساتھ ایسی تدبیروں کا اہتمام کیا جائے جن کے ذریعہ ہنگامی حالات میں دشمن کا وار خالی دیا جا سکے۔ اور اگر حریف کے خلاف کارروائی کرنا ضروری ہو تو بہترین طریقہ یہ ہے کہ حریف کے اپنے "جسم" میں اس کا ایک "عدو" داخل کر دیا جائے جس کی غذا حریف کا جسم ہو۔ وہ اس کو خاموشی کے ساتھ کھاتا رہے، یہاں تک کہ اندر ہی اندر دشمن کا خاتمہ کر دے۔

جانوروں نے اپنے بچاؤ کے یہ اصول خود نہیں بنائے، وہ ان کو خدا نے سکھائے ہیں۔ ان طریقوں کو خداوندی تصدیق حاصل ہے۔ پھر یہ کہ جانوروں کی دنیا میں اس قسم کی دفاعی تدبیریں کسی "بزدلی" کی بنا پر نہیں ہیں بلکہ خالص حقیقت پسندی کی بنا پر ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ غیر ضروری ٹکراؤ سے بچ کر اپنی "خود تعمیری" کے عمل کو جاری رکھا جائے۔ کوئی جانور چارہ کی تلاش میں جا رہا ہے۔ کوئی اپنے جوڑے سے ملنے کے لئے سفر کر رہا ہے۔ کوئی اپنا گھر بنانے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ کسی کو اپنے بچوں کی پرورش کرنے کے لئے موقع درکار ہے۔ ایسی حالت میں اس کی اپنے دشمن سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ اب اگر جانور اپنے حریف سے لڑائی شروع کر دے تو اس کا اپنی تعمیر کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جانور حریف کے براہ راست تصادم سے گریز کرتا ہے، الّا یہ کہ وہ مجبوراً اس میں گرفتار ہو جائے۔ وہ اپنے تعمیری کام کو جاری رکھنے کی خاطر تصادم سے بچ کر نکل جاتا ہے ——— یہ طریقہ جو حیوانات جبلت کے تحت اختیار کرتے ہیں وہی انسان کو شعوری طور پر انجام دینا ہے۔

فسادات کا مسئلہ

فرقہ وارانہ فسادات کا مسئلہ ہمارے قائدین کی سب سے زیادہ توجہ کا مرکز رہا ہے۔ پچھلے ۲۵ سال میں ہماری قیادت نے جس واحد مسئلہ پر سب سے زیادہ توجہ دی ہے وہ یہی مسئلہ ہے۔ ہر بار جب کوئی فساد ہوتا ہے تو مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ تقریریں کی جاتی ہیں۔ بیانات جاری ہوتے ہیں۔ ریلیف فنڈ قائم ہوتے ہیں۔ غرض سرگرمیوں کا ایک طوفان امڈ پڑتا ہے۔ ان فسادات کے سلسلہ میں ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ اگر یہی ہو جواب تک ہوتا رہا ہے تو یہ کام اس ملک میں اتنے بڑے پیمانہ پر ہو چکا ہے کہ اب تک فسادات کا خاتمہ ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر عملی صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ موجودہ کوششوں کی یہ ناکامی آخری طور پر ثابت کر رہی ہے کہ یہ مسئلہ کا حل نہیں۔ اگر وہ اس کا حل ہوتا تو ۲۵ سال کی مدت کافی تھی کہ اس کا کوئی مفید مطلب نتیجہ برآمد ہو۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ ہم اس معاملہ پر از سر نو غور کریں اور اپنے طریق عمل کو دوبارہ نئے ڈھنگ سے مرتب کریں۔

فسادات کا پس منظر

ہمارے ملک میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں، عام طور پر ان کے آغاز میں ایک چھوٹا سا واقعہ ہوتا ہے۔ ایک چھوٹے واقعہ پر ہیبت ناک فساد کا پیدا ہو جانا اتفاقاً نہیں ہوتا۔ اس کے تاریخی اور نفسیاتی اسباب ہیں۔ ہم خواہ اس کو مانیں یا نہ مانیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ پڑوسی قوم میں ہمارے خلاف مستقل طور پر ایک حریفانہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب تقسیم کی سیاست ہے۔ ملک کی تقسیم بجائے خود برادرانِ وطن کو مشتعل کرنے کے لئے کافی تھی۔ مزید یہ کہ تقسیم اس ڈھنگ سے ہوئی کہ تقسیم ہو کر بھی بہت سے نازک مسائل غیر حل شدہ حالت میں باقی رہ گئے۔ اس طرح کے مختلف تاریخی اسباب ہیں جنھوں نے برادران وطن کو مسلسل طور پر ہمارے خلاف مشتعل کر رکھا ہے۔ گویا ایک لاوا ہے جو دلوں میں چھپا ہوا ہے اور کوئی موقع پاتے ہی اچانک پھٹ پڑتا ہے۔

مجھے تسلیم ہے کہ کوئی شخص معقول بنیادوں پر یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ تقسیم کی تحریک خود بھی فریق ثانی کے کسی عمل کا ردعمل تھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس دعوے کا عملی فائدہ کیا ہے۔ اس قسم کے دعوے کی اہمیت اس وقت ہوتی ہے جب کہ کسی مسئلہ کا صرف منطقی تجزیہ کرنا مقصود ہو، آدمی کے حقیقی معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ مگر جب کوئی معاملہ فوری زندگی کا معاملہ بن جائے تو ہر عقل مند آدمی کا یہ طریقہ ہے کہ وہ منطقی سلسلہ کو توڑ کر عملی پہلو کو سامنے رکھتا ہے تاکہ وہ اپنے عملی اقدام کے بارے میں کوئی فیصلہ لے سکے۔ دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرانے کی بحث کو اگر لمبا کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اپنے اقدام کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکیں گے اور اصل مسئلہ بدستور اپنی جگہ باقی رہے گا۔ چھری اگر خربوزہ کی سطح تک پہنچ چکی ہو تو اس وقت منطق کی عدالت میں چھری کو ملزم ٹھہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایسے وقت میں اپنے کو فریق ثانی کی زد سے ہٹانے کا سوال ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کی دنیا میں فریق ثانی کو ذمہ دار ثابت کرنے کا۔ یہ ایک معلوم اور مسلّم حقیقت ہے کہ کبھی منطقی تقاضے کے مقابلہ میں عملی پہلو زیادہ اہم ہوتا ہے، اور زیر بحث معاملہ میں صورت حال بلاشبہ یہی ہے۔

شہر کی ایک عمارت میں ایک مسلمان نے نیچے کا حصہ کرایہ پر لیا۔ کچھ دن کے بعد اس نے محسوس کیا کہ چھت ٹپک رہی ہے۔ اوپر کے حصہ میں جو صاحب رہتے تھے ان کا غسل خانہ ٹپکنے لگا تھا۔ مستقل پانی کا ٹپکنا ایک مصیبت تھا۔ مزید یہ کہ یہ گندا پانی تھا کیونکہ غسل خانہ اور بیت الخلا دونوں ایک ساتھ ملے ہوئے تھے۔ نیچے والے نے اوپر والے سے کہا تو انھوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ اس کے بعد اس نے محلہ والوں سے کہا اور اپنی مصیبت ان کو دکھائی۔ مگر انھوں نے بھی کوئی دردمندی ظاہر نہ کی۔ ایک شخص نے کہا "بھائی، ہمارے شہر کا رواج تو یہ ہے کہ جس کے سر پر ٹپکے وہ بنوائے"۔ کرایہ دار نے کہا کہ یہ تو کوئی بات نہیں۔ اصول یہ ہونا چاہئے کہ "جو ٹپکائے وہ بنوائے" مگر اس نے محسوس کیا کہ اس کے دلائل بے زور ثابت ہو رہے ہیں۔ یہ سارے لوگ مسلمان تھے۔ اس نے قرآن وحدیث کے احکام سنائے مگر قرآن وحدیث کے الفاظ بھی ان کے دل کو پگھلانے کے لئے کافی ثابت نہ ہوئے۔ کچھ دوستوں نے مشورہ دیا کہ تم ان کے خلاف نوٹس دو اور مقدمہ قائم کرو۔ مگر اس نے غور کیا تو مقدمہ کے اخراجات اور اس کی مدت اتنی زیادہ تھی کہ عملاً اس کے لئے اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ بالآخر اس نے اپنے پاس سے خرچ کرکے خود اس کو بنوا دیا۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذاتی معاملہ میں آدمی کیا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ ذاتی معاملہ میں ہر آدمی یہ کرتا ہے کہ وہ اس بحث میں نہیں پڑتا کہ کون صحیح ہے اور کون غلط۔ وہ جانتا ہے کہ موجودہ دنیا میں دلیل سے زیادہ کمزور کوئی چیز نہیں۔ دلیل سے خواہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر کسی کو ملزم ثابت کر دیا جائے عملاً اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ آج کی دنیا میں کوئی ایسا نہیں ہے جو دلیل کے آگے اپنے کو جھکا دے۔ اس سلسلہ میں مسلمان اور غیر مسلمان حتیٰ کہ دین دار اور بے دین کا بھی کوئی فرق نہیں۔ یہ بات اپنے ذاتی معاملہ میں ہر شخص جانتا ہے۔ اس لئے جب کوئی ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر "پانی اپنے سر ٹپکتا ہے" تو وہ فوراً جان لیتا ہے کہ دلیل اور بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اپنے آپ پر ذمہ داری لیتے ہوئے فوراً یہ کرتا ہے کہ معاملہ کو خود درست کر لیتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ زندگی کا یہی سادہ اصول ملت کے معاملہ میں کوئی شخص اپنانے کے لئے تیار نہیں۔ ملت کا سوال آتے ہی ہر شخص اس کوشش میں لگ جاتا ہے کہ وہ فریق ثانی کو ملزم ثابت کرے۔ یہ سنگین واقعہ بھی لوگوں کے جوش میں کوئی کمی نہ کر سکا کہ ۳۰ سالہ کوشش کے باوجود ابھی تک اس طریق عمل کا کوئی فائدہ نہیں نکلا۔

یہ صورت حال اتفاقاً نہیں۔ اس کے گہرے اسباب ہیں۔ دوسرے کو ملزم ٹھہرانا سب سے آسان کام ہے اور خود ذمہ داری قبول کرنا اس کے مقابلہ میں انتہائی مشکل ہے۔ دوسرے کو ملزم ٹھہرانا ہو تو الفاظ بول کر ذمہ داری ادا ہو جاتی ہے۔ مگر جب آدمی خود ذمہ داری قبول کرے تو پھر عمل اور جدوجہد کے طویل تقاضے سامنے آجاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے قائدین صرف الفاظ بول کر قیادت کا کریڈٹ لینا چاہتے ہیں۔ وہ کچھ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اگر وہ فی الواقع کرنے کی تڑپ رکھتے تو ان کا انداز بالکل دوسرا ہوتا۔

زندگی کا راز یہ ہے کہ حالات کے اندر موجود عوامل کو استعمال کیا جائے۔ اور حالات کے غیر معمولی بگاڑ کے باوجود یہاں ایسے عوامل موجود ہیں جن کو ہم اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دو فریقوں کے درمیان

خواہ کتنی ہی تلخ یادیں ہوں، زندگی کے روزمرہ کے مسائل ان پر غالب آجاتے ہیں۔ برادران وطن کے معاملہ میں اس عامل کی اور بھی زیادہ اہمیت ہے۔ کیونکہ "زر" ان کے نزدیک معبود کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کا ہر آدمی سب سے زیادہ جس چیز کو پانا چاہتا ہے وہ دولت ہے۔ ان کی خوش قسمتی سے ملک میں دولت حاصل کرنے کے تمام بڑے ذرائع پر ان کا مکمل قبضہ ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ خود مسلمان ان کی دولت کی فراہمی کے عمل میں ایک معاون پرزہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ یہ اس ملک میں فساد کے خلاف سب سے بڑا روک ہے۔ کیونکہ فساد کاروبار کے سارے نظام کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ پھر جن لوگوں کا اصل مقصد پیسہ کمانا ہو وہ اپنے ملے ہوئے مقصد کو خود اپنے ہاتھوں ویران کرنا کیوں پسند کریں گے۔

مرادآباد کی مثال لیجئے جہاں اگست ۱۹۸۰ میں بھیانک فساد ہوا۔ مرادآباد ایک صنعتی شہر ہے، یہاں سے سالانہ تقریباً ۶۰ کروڑ روپے کا سامان تیار ہو کر باہر جاتا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ سامان بنانے کا کام سب کا سب مسلمان کرتے ہیں۔ مگر کاروبار عملاً دوسرے فرقہ کے ہاتھ میں ہے۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ خام مال کی سپلائی اور تیار شدہ سامان کی فروخت دونوں کام کا تقریباً ۹۰ فی صد حصہ دوسرے فرقہ کے قبضہ میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ کارخانوں میں دھوئیں اور گندگی کے درمیان ساری مشقت مسلمان اٹھاتے ہیں اور دوسرا فرقہ ان کی محنت کے بل پر کروڑوں روپے کما رہا ہے۔ ایک زر پرست قوم کو اس کا مطلوب جب اتنے شاندار طریقہ پر مل رہا ہو تو وہ آخر فساد کیوں چاہے گی۔ وہ بازار کو ویران کر کے اپنے ملتے ہوئے فائدہ کو بھنگ کس لئے کرے گی۔

اس کے باوجود اس ملک میں فساد ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۷ سے لے کر اب تک تقریباً ۱۰ ہزار فسادات ہو چکے ہیں۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ وہ یہ کہ ہر آدمی دو آدمی ہوتا ہے۔ ایک غصہ دلانے سے پہلے، دوسرا غصہ دلانے کے بعد۔ بظاہر سیدھا سادا آدمی بھی غصہ میں آنے کے بعد بھیڑیا بن جاتا ہے۔ یہ فرق ہر آدمی میں پایا جاتا ہے۔ پھر جب کسی اشتعال انگیز واقعہ کے بعد اس شخص یا گروہ کا "دوسرا انسان" جاگ اٹھے جس کے اندر فریق ثانی کے لئے پہلے سے نفرت کے اسباب چھپے ہوئے تھے اور وہ اس کے مقابلہ میں طاقتور بھی ہو تو اس کے بعد وہ جو کچھ کرے گا وہ وہی ہوگا جس کا نمونہ ہم پچھلے ۳۵ سال سے دیکھ رہے ہیں۔

زر پرستی آدمی کے اندر انفرادیت پیدا کرتی ہے۔ اس لئے ایک شخص کی طرف سے کسی کے خلاف ابتدائی اشتعال کا واقعہ پیش آنے کے بعد بھی شاید ایسا نہ ہوتا کہ ایک فرقہ میں عمومی سطح پر اشتعال و انتقام کی فضا پیدا ہو جائے۔ مگر یہاں بقیہ کمی کو سیاسی لیڈر پوری کر دیتے ہیں۔ ہر بار جب الیکشن ہوتا ہے تو فطری طور پر کوئی جیتتا ہے اور کوئی ہارتا ہے۔ اب جو ہارنے والے لیڈر ہیں وہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ کوئی موقع ملے تو اس کو ہوا دے کر عمومی فساد کرا دیں۔ تاکہ ایک طرف جیتی ہوئی حکمراں پارٹی کو بدنام کیا جائے اور دوسری طرف ان ووٹروں کو سزا دی جائے جنھوں نے ان کو ووٹ نہیں دیا۔ اور بدقسمتی سے یہ "ووٹ نہ دینے والے" اکثر مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ اگر ہر فساد نہیں تو اکثر فساد کے پیچھے یہی الیکشنی سیاست کارفرما ہوتی ہے۔ ایک ایسا ملک جہاں لوگ اپنی مرضی کے خلاف فیصلہ قبول کرنے پر راضی نہ ہوں،

وہاں [illegible] مسئلہ کو ختم نہیں کرتا بلکہ مسئلہ کو نئی صورت میں زندہ رکھنے کا سبب بن جاتا ہے۔

فساد کیسے ہوتا ہے

کوئی فساد کس طرح شروع ہوتا ہے اور وہ کس طرح بڑھتا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے علی گڑھ اور مرادآباد کے فساد کی مثال لیجئے۔ علی گڑھ میں ہر سال دنگل ہوتا ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں حصہ لیتے ہیں۔ اگست ۱۹۷۸ کے دنگل میں مسلم پہلوان کو یہ شکایت ہوئی کہ اس کے ساتھ دھاندلی کی گئی ہے۔ اس کی شکایت کا خاص نشانہ سریش بھورے تھا جس سے اس کی پہلے سے بھی رقابت چلی آرہی تھی۔ دنگل کی شکایت کے بعد مسلمان پہلوان نے طے کرلیا کہ سریش بھورے سے انتقام لینا ہے۔ وہ اور اس کے ساتھی اسی فکر میں رہے۔ یہاں تک کہ ۳ اکتوبر ۱۹۷۸ کی شام کو انصار احمد اور اس کے ساتھی سریش بھورے کو اکیلا پا گئے۔ انھوں نے اس کے اوپر چھرے سے حملہ کیا۔ سریش بھورے کو سخت زخمی حالت میں اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں اس نے اپنے قاتلوں کے بارے میں نام زد بیان درج کرایا۔ وہ زخم سے جانبر نہ ہو سکا اور ۵ اکتوبر ۱۹۷۸ کو مرگیا۔

سریش بھورے کا مرنا شہر کے ہارے ہوئے فرقہ پرست لیڈروں کو سنہری موقع ملنا تھا۔ انھوں نے سریش بھورے کا جلوس نکالا اور نعرہ لگایا کہ "خون کا بدلہ خون" انھوں نے اپنی اشتعال انگیز تقریروں سے پورے شہر کی فضا خراب کردی۔ یہاں تک کہ وہ فساد شروع ہوا جس نے علی گڑھ کو خاکستر بنا دیا۔

اب مرادآباد کو لیجئے۔ ۱۹۸۰ کے آغاز میں یوپی اسمبلی کا جو الکشن ہوا اس میں کانگریس آئی کے امیدوار حافظ محمد صدیق بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ جن سنگھ (بھارتیہ جنتا پارٹی) کے امیدوار ڈاکٹر ہنس راج چوپڑہ کو اتنے کم ووٹ ملے کہ ان کی ضمانت ضبط ہوگئی۔ حافظ محمد صدیق کو نہ صرف مسلمانوں کے ووٹ ملے بلکہ ہندوؤں کی بھی ایک بڑی تعداد نے ان کو ووٹ دیا۔ ہارے ہوئے سیاست دانوں کو اس واقعہ کا شدید غم تھا۔ وہ کسی موقع کی تلاش میں تھے۔ ان کی خوش قسمتی سے جلد ہی ان کو یہ موقع ہاتھ آگیا۔ ۲۷ جولائی ۱۹۸۰ کو سرائے کشن لال میں مہتروں کی ایک بارات جارہی تھی۔ یہ شام کا وقت تھا اور مغرب کی اذان ہونے والی تھی۔ بارات کے ساتھ ان کے رواج کے مطابق ناچ اور باجا بھی تھا۔ اس وقت چند مسلمانوں نے آگے بڑھ کر بارات کو روکا اور کہا کہ مسجد کے پاس شور بند کرو اور بارات کو دوسرے راستہ سے لے جاؤ۔ بارات والے اس کے لئے راضی نہ ہوئے۔ اس پر تکرار ہوگئی۔ یہاں تک کہ باقاعدہ لڑائی شروع ہوگئی۔ اس لڑائی میں مزید مسلمان شریک ہوگئے۔ وہ مہتروں کا پیچھا کرتے ہوئے ایک فرلانگ کے فاصلہ پر مہتر بستی تک گئے، وہاں انھوں نے مہتروں کو مارا اور مکانات کو آگ لگائی۔

اب ڈاکٹر ہنس راج چوپڑہ اور ان کے جیسے دوسرے لوگوں کی باری تھی۔ انھوں نے مرادآباد اور اطراف مرادآباد میں اشتعال انگیز تقریریں کرکے فضا کو انتہائی حد تک مکدر کردیا۔ اس کے بعد ۱۳ اگست ۱۹۸۰ عید کا دن تھا۔ اس دن عیدگاہ میں سور کے داخلہ سے مسلمان مشتعل ہوگئے اور انھوں نے پولس پر پتھر مارے۔ فضا تیار تھی۔ اس کے فوراً بعد مکمل پیمانہ پر فساد شروع ہوگیا۔ اور مرادآباد کی مسلم آبادی خاک و خون کی نذر ہوکر رہ گئی۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں

اب دیکھئے کہ اس معاملہ میں قرآن وحدیث کی رہنمائی کیا ہے۔ قرآن میں یہود کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ خدا ان پر غضب ناک ہوا (اور ان پر دنیوی سزائیں بھیجیں) ایسا اس لئے ہوا کہ وہ اپنے درمیان برائی کرنے والے کو برائی سے نہ روکتے تھے (کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ، مائدہ ۷۹) حدیث میں اس کی مزید وضاحت ہے۔ ایک حدیث ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَاُوا الظَّالِمَ فَلَمْ یَاْخُذُوا عَلٰی یَدَیْہِ اَوْشَکَ اَنْ یَعُمَّھُمُ اللّٰہُ بِعِقَابٍ مِنْہُ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

لوگ جب ظلم کرنے والے کو دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ ان پر اپنی سزا کو عام کر دے۔

اس سے معلوم ہوا کہ "اجتماعی فساد" کا سبب ہمیشہ "انفرادی فساد" ہوتا ہے۔ اس لئے اجتماعی فساد کو روکنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ انفرادی فساد کو روکا جائے۔ اس ہدایت کے مطابق مسلم معاشرہ کو اتنا زندہ اور چوکنا رہنا چاہئے کہ اس کا کوئی آدمی اگر کوئی شرارت کرے تو فوراً آس پاس کے لوگ جاگ اٹھیں اور ابتدا ہی میں شریر کا ہاتھ پکڑ لیں۔ معاشرہ کا کوئی فرد اگر کسی آدمی کے ساتھ برائی کرے تو بقیہ لوگ غیر جانب دار بن کر نہ رہ جائیں بلکہ وہ فوراً موقع پر پہنچیں اور برائی کرنے والے آدمی اور اس کی برائی کے درمیان حائل ہو جائیں۔ اگر وہ اس ابتدائی موقع پر بے تعلق ہو کر بیٹھ جائیں گے تو اس کے بعد یہ ہوگا کہ ایک آدمی کی شرارت ایسے عمومی فتنے برپا کرے گی جس کی لپیٹ میں پوری قوم آجائے گی۔

مذکورہ اسلامی ہدایت براہ راست طور پر آج کل کے فسادات پر چسپاں ہوتی ہے۔ مسلمان اپنی بڑھی ہوئی جذباتیت کی وجہ سے اکثر یہ غلطی کرتے ہیں کہ ایک معمولی بات کو برداشت نہیں کر پاتے اور دوسرے سے لڑ جاتے ہیں۔ یہ "دوسرا" اگر خود اپنی قوم کا آدمی ہے تو اس کا نقصان اکثر ایک آدمی یا ایک خاندان تک محدود رہتا ہے۔ لیکن یہ دوسرا آدمی اگر دوسرے فرقہ سے تعلق رکھتا ہو تو ایک مسلمان کی جذباتی کارروائی فوراً پوری قوم کو مشتعل کر دیتی ہے۔ موقع پرست لیڈر اشتعال انگیز تقریریں کر کے اس کو فرقہ وارانہ مسئلہ بنا دیتے ہیں۔ اور اس کے بعد ایسا فساد برپا ہوتا ہے جو پوری کی پوری آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے —— علی گڑھ اور مرادآباد کا مذکورہ واقعہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعات اس کا عملی ثبوت ہیں۔

چونکہ فسادات اکثر اُن مقامات پر ہوتے ہیں جہاں مسلمان اقتصادی اعتبار سے نسبتاً بہتر ہیں۔ اس لئے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ مسلمانوں کی اقتصادیات کو برباد کرنے کی منظم سازش کے تحت ہو رہا ہے۔ حالانکہ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ مسلمان جن مقامات پر بہتر حیثیت میں ہیں وہیں وہ جذباتی حرکتیں بھی زیادہ کرتے ہیں۔ کسی آدمی کو پرجوش کارروائی کرنے کے لئے ہمیشہ سماجی پشت پناہی درکار ہوتی ہے اور یہ سماجی پشت پناہی ان مقامات کے مسلمانوں کو بآسانی مل جاتی ہے جہاں مسلمان اقتصادی اعتبار سے بہتر ہوں۔ مسلمانوں کے آپس کے جھگڑے اور اختلافات بھی

انھیں مقامات پر زیادہ ہوتے ہیں جہاں انھیں کسی قدر معاشی اعتماد حاصل ہے۔ اسی طرح مسلمان اور غیر مسلمان کا تصادم بھی اکثر انھیں مقامات پر پیش آتا ہے جہاں مسلمان عددی اور اقتصادی اعتبار سے اپنے کو محفوظ سمجھتے ہوں۔

مذکورہ اسلامی ہدایت کی روشنی میں دیکھئے تو فساد کے خلاف ہماری موجودہ تمام سرگرمیاں بالکل عبث قرار پاتی ہیں۔ کیونکہ یہ ہدایت ربانی کے خلاف ہیں۔ خدا اور رسول کا حکم ہے کہ اپنے آدمی کو ابتدائی شرارت کے وقت پکڑو۔ مگر ہمارے تمام قائدین صرف اس وقت متحرک ہوتے ہیں جب کہ فساد بڑھ کر اپنی عمومی بربادی تک پہنچ چکا ہو۔ ابتدائی چنگاری دینے والے کا ہاتھ پکڑنے کے لئے کوئی نہیں اٹھتا۔ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ستاتا ہے تو کوئی بھی موقع پر پہنچ کر ظالم مسلمان کا ہاتھ نہیں پکڑتا۔ حالانکہ اس قسم کے مظلوم مسلمان اکثر منفی جذبات کا شکار ہو کر ایسی کارروائیاں کرتے ہیں جس کی سزا پورے معاشرہ کو بھگتنی پڑتی ہے۔ اسی طرح جب ایک غیر مسلم سے شکایت پیدا ہونے پر ایک مسلمان اس کے خلاف تخریبی منصوبہ بناتا ہے۔ جب کچھ مسلمان غیر مسلموں کے سامنے یہ بے معنی مطالبہ لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ہماری نماز کے وقت اپنی عبادت گاہ کی گھنٹیاں نہ بجاؤ یا مسجد کے سامنے سے اپنا جلوس نہ لے جاؤ تو ان مواقع پر مسلمانوں میں سے کوئی نہیں اٹھتا جو ایسے سرپھرے مسلمانوں کو روکے اور ان کو اس قسم کے "برے" افعال سے باز رکھے۔ البتہ جب ایک شخص کی برائی اپنا ردعمل ظاہر کر کے عمومی تباہی تک پہنچ چکی ہوتی ہے تو ساری مسلم قیادت میدان میں آجاتی ہے اور ہر ایک چاہتا ہے کہ وہ دوسرے سے آگے بڑھ جائے۔ یہ طریقہ سراسر اسلامی ہدایت کے خلاف ہے اور جو طریقہ اسلامی ہدایت کے خلاف ہو اس کا کوئی نتیجہ خدا کی اس دنیا میں ظاہر نہیں ہو سکتا۔ خدا چاہتا ہے کہ ہم "انفرادی فساد" کے وقت متحرک ہوں مگر ہمارے تمام لیڈر صرف "اجتماعی فساد" کے وقت متحرک ہوتے ہیں۔ یہ خدا کے بتائے ہوئے راستہ کے بجائے خود ساختہ راستہ پر چلنا ہے اور خود ساختہ راستہ پر چلنا خدا کے غضب کو دعوت دینا ہے نہ کہ خدا کی نصرت کو اپنی طرف کھینچنا۔

ہمارے درمیان بے شمار تحریکیں اور جماعتیں قائم ہیں۔ ہر ایک دعویٰ کرتی ہے کہ اس کا مقصد ہے: فسادات کا سدباب، ملت کا تحفظ، نظام صالح کا قیام، انسانیت کی پیغام رسانی، وغیرہ۔ یہ تحریکیں اور جماعتیں بڑے بڑے جلسے کرتی ہیں، الفاظ کے طوفان برپا کرتی ہیں۔ ان کے میمورنڈم اور بیانات اور تجویزوں سے گدام کے گدام بھر چکے ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ لفظی مہم سے کبھی کوئی عملی واقعہ برآمد نہیں ہوتا، یہ سب کچھ جو کیا جاتا ہے فسادات کے بعد کیا جاتا ہے۔ ابتدائی چنگاری کو بجھانے کے لئے ان میں سے کوئی بھی نہیں دوڑتا۔ حالاں کہ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ ہر جماعت اور تحریک اور تمام اصلاح پسند شخصیتیں اپنے قریبی ماحول میں اپنے بھائیوں کی مسلسل نگرانی کریں۔ جہاں کوئی ایسا واقعہ ہو کہ ایک مسلمان کسی دوسرے پر کسی قسم کی دست درازی کرے، خواہ وہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہو یا مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان، فوراً کچھ لوگ اس آدمی تک پہنچیں۔ علاقہ کے ذمہ دار لوگوں کو جمع کریں اور اس کی شرارت کو وہیں کا وہیں ختم کر دیں۔ مسلمان اگر ابتدائی موقع پر اس حرکت اور حساسیت کا ثبوت دیں جس کا مظاہرہ وہ فساد کے بعد کرتے ہیں تو فساد کی جڑ کٹ جائے اور کبھی اس ملک میں کوئی فساد نہ ہو۔

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ فسادات ہمیشہ سازش کے تحت ہوتے ہیں اور یہ سازش کچھ فرقہ پرست اور فسطائی جماعتیں کرتی ہیں۔ ان جماعتوں کا یہی مشن ہے اور اسی مقصد کے تحت انھوں نے اپنے آدمیوں کو تیار کر رکھا ہے۔ بالفرض یہ بات صحیح ہو تب بھی میں کہوں گا کہ یہ دنیا مقابلہ کی جگہ ہے۔ یہاں بہرحال ایسا ہوگا کہ ایک دوسرے کے خلاف تدبیریں کرے گا۔ اس لئے اصل کام ایسی جماعتوں کا انکشاف کر کے ان کے خلاف چیخ پکار کرنا نہیں ہے بلکہ خاموش منصوبہ کے تحت ان کی کاٹ کے لئے اپنے کو مستعد کرنا ہے۔ تجربہ ثابت کرتا ہے کہ ہر گروہ کے خلاف اس کا حریف تدبیریں کرتا ہے اور ہر تدبیر کو دانش مندی کے ساتھ ختم کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے لئے ہر طرف میدان خالی ہو اور ان کے خلاف کوئی "سازش" کرنے والا کہیں موجود نہ ہو ان کو خدا کی اس دنیا کو چھوڑ کر کوئی دوسری دنیا اپنے لئے بنانی چاہئے۔ کیونکہ خدا نے اپنی دنیا جس قانون کے تحت بنائی ہے وہاں تو یہی ہوگا۔ پیغمبروں کے لئے بھی خدا نے اس معاملہ میں استثنار نہیں رکھا۔ پھر ہمارے لئے استثنار کیسے ہو سکتا ہے۔

سابق اہل کتاب کی مثال

اب اس سلسلہ میں ایک اور آیت کا مطالعہ کیجئے۔ سورہ بقرہ میں یہود کو خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے:
ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم اپنوں کا خون نہ بہاؤ گے اور اپنے لوگوں کو گھر سے بے گھر نہ کرو گے۔ تم نے اس کا اقرار کیا اور تم خود اس کے گواہ ہو۔ پھر تم ہی وہ ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے ہو۔ ان کے خلاف گناہ اور زیادتی کر کے ان کے دشمنوں کی مدد کرتے ہو۔ پھر اگر وہ تمھارے پاس قیدی ہو کر آتے ہیں تو ان کا فدیہ دے کر چھڑاتے ہو۔ حالانکہ ان کا نکالنا ہی تم پر حرام تھا۔ کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور اس کے دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو۔ پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں رسوا ہوں اور آخرت کے دن سخت ترین عذاب کی طرف پھیر دئے جائیں اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو (بقرہ ۸۵-۸۴)

قدیم مدینہ میں دو عرب قبیلے (اوس اور خزرج) آباد تھے۔ اس کے علاوہ کچھ یہودی قبیلے (بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع) تھے جو باہر سے آکر یہاں بس گئے تھے۔ ان یہودی قبائل نے اپنے تعصبات اور قومی اغراض کے تحت عرب قبیلوں سے حلیفانہ تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ عرب قبائل جب باہم لڑتے تو یہودی قبیلے بھی اپنے اپنے مشرک حلیفوں کے ساتھ مل جاتے اور اس طرح دو عرب محاذوں میں شریک ہو کر ایک یہودی قبیلہ دوسرے یہودی قبیلہ سے جنگ کرتا۔ ہجرت نبوی سے چند سال پہلے مدینہ میں جنگ بعاث ہوئی جو مدینہ کے مشرک قبائل کی باہمی جنگ تھی۔ اس جنگ میں یہود کے قبیلہ بنو نضیر اور بنو قریظہ نے اوس کا ساتھ دیا اور بنو قینقاع نے خزرج کا۔ اس طرح اوس اور خزرج کی باہمی جنگ میں خود یہودی بھی باہم ایک دوسرے کے خلاف لڑ پڑے۔

اس قسم کی باہمی مقابلہ آرائی سراسر شریعت الٰہی کے خلاف تھی۔ مگر جب جنگ ختم ہوتی تو دونوں طرف کے یہودی لیڈر "امدادی کام" شروع کر دیتے تاکہ ملت یہود کے لئے جہاد کرنے کا ثواب بھی انھیں مل جائے۔ اس

جاہلانہ معرکہ آرائی میں جب ایک یہودی قبیلے کے لوگ دوسرے قبیلے کے ہاتھ قید ہوجاتے تو مغلوب قبیلہ فدیہ دے کر اپنے دینی بھائیوں کو دشمنوں کے ہاتھ سے چھڑاتا اور اپنے اس عمل کے لئے تورات کے احکام کا حوالہ دیتا جن میں ایک یہودی پر دوسرے یہودی کی مدد کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ حالاں کہ یہ ایسا ہی تھا جیسے ایک شخص کسی مسلمان کو قتل کر دے اور اس کے بعد خدا اور رسول کا نام لے کر اس کی نماز جنازہ ادا کرے۔ قرآن میں اس طرز عمل کی بابت کہا گیا کہ یہ حکم خداوندی کے ایک جزء کو ماننا اور حکم خداوندی کے دوسرے جزء کا انکار کرنا ہے۔ کیوں کہ یہودی خدا کے اس حکم کو تو شوق سے لے رہے تھے کہ ملت یہود کے مظلوموں کی مدد کرو مگر اسی خدا کے اس حکم کو وہ اپنی زندگی سے خارج کئے ہوئے تھے کہ ان راستوں پر مت چلو جو ملت کے اندر باہمی ٹکراؤ پیدا کرتے ہیں اور نتیجۃً ملت کے افراد کو مظلوم بناتے ہیں۔ قرآن میں اعلان کیا گیا کہ حکم الٰہی میں اس طرح کی تقسیم کسی کو اللہ کی نظر میں سزا کا مستحق بناتی ہے نہ کہ انعام کا۔

یہی صورت حال آج خود مسلمانوں میں جاری ہے اور نہ صرف کسی ایک ملک میں بلکہ تمام دنیا کی مسلم اقوام پر چسپاں ہوتی ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں حکومت کی سطح پر حلیفانہ گروہ بندیاں اور جماعتوں کی سطح پر "متحدہ محاذ" کی سیاست براہ راست طور پر وہی چیز ہے جس کی یہود کے سلسلے میں مذمت کی گئی ہے۔ آج ہر جگہ یہ حال ہے کہ مسلمان غیر مسلم قوموں یا غیر اسلامی طاقتوں کے ساتھ مل کر آپس میں ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ مسلم حکومتوں میں کوئی روسی کیمپ سے مل گیا ہے اور غیر روسی کیمپ میں شامل مسلم ملک پر چڑھائی کر رہا ہے اور کوئی امریکی کیمپ سے ملا ہوا ہے اور غیر امریکی کیمپ کے مسلم ملک کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے ہے۔ مسلم جماعتوں کا یہ حال ہے کہ کوئی جماعت سوشلسٹ عناصر سے مل کر غیر سوشلسٹ مسلم جماعتوں کے خلاف برسرپیکار ہے اور کوئی جماعت سیکولر عناصر سے مل کر غیر سیکولر کیمپ کی مسلم جماعتوں کے خلاف تخریبی کارروائیاں جاری کئے ہوئے ہے۔ یہی حال ہمارے ملک میں، خاص طور پر الیکشن کے مواقع پر ہوتا ہے۔ کچھ مسلمان حکمراں سیاسی پارٹی سے مل کر اپوزیشن پارٹیوں اور ان سے اتحاد کرنے والے مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیتے ہیں اور کچھ مسلمان اپوزیشن پارٹیوں سے مل کر حکمراں پارٹی اور اس سے وابستہ مسلمانوں کے خلاف کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس جاہلی جنگ کے نتیجہ میں جب مسلمانوں کی بربادی سامنے آتی ہے تو ان میں سے ہر ایک ملی جہاد کے لئے دوڑتا ہے، ہر ایک امدادی کام میں دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔

ہمارے ملک میں ہونے والے فسادات کم از کم وقتی سبب کی حد تک، اکثر انھیں انتخابی محاذ آرائیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مسلمان ان مواقع پر غیر مسلم پارٹیوں کے ساتھ مل کر دو حصوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک طرف "اوس" کا سیاسی محاذ ہوتا ہے اور دوسری طرف "خزرج" کا سیاسی محاذ۔ کچھ مسلمان ایک طرف کے محاذ میں شامل ہوجاتے ہیں اور کچھ دوسری طرف کے محاذ میں۔ اور پھر دونوں ایک دوسرے کو ہرانے اور نیچا دکھانے کے لئے اپنی ساری طاقت لگا دیتے ہیں۔ جب الکشن کا معرکہ ختم ہوتا ہے تو وہ صرف جیتنے والوں کے لئے ختم ہوتا ہے۔ ہارنے والوں کے لئے وہ دوبارہ نئی صورت میں شروع ہوجاتا ہے۔ اب ہارے ہوئے لیڈر جیتی ہوئی پارٹی کو بے اعتبار ثابت کرنے اور اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے میدان میں نکل آتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہارے ہوئے

یڈر جو کارروائیاں کرتے ہیں انھیں میں سے ایک فرقہ وارانہ فساد بھی ہے۔

اس لحاظ سے دیکھئے تو فرقہ وارانہ فسادات کے بعد مسلم قائدین کی طرف سے کیا جانے والا امدادی کام اور ملی جہاد براہ راست طور پر قرآن کے ان الفاظ کا مصداق ہے کہ افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض (بقرہ ۸۵) یعنی خدا کے اس حکم کی تم کو پروا نہیں کہ تم اغیار کے ساتھ مل کر آپس میں ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی نہ کرو۔ اور جب جاہلانہ محاذ آرائی کے نتیجہ میں فساد رونما ہوتا ہے تو قرآن و حدیث کی تلاوت کرتے ہوئے اعانت مظلومین کے لئے نکل پڑتے ہو۔ یہ حکم خداوندی کی تعمیل نہیں بلکہ سستی لیڈری ہے۔ اور خدا کا انعام کسی کو خدا کے حکم کی تعمیل پر ملتا ہے نہ کہ لیڈرانہ کارروائیوں پر۔

کرنے کا کام

آج مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ فساد یا اغیار کی سازش نہیں ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ فساد اور سازش کو ناکام بنانے کے لئے واقعی طور پر جو کچھ کرنا چاہئے وہ کسی طرح ان کے ذہن کے خانہ میں نہیں بیٹھتا۔ زندگی کے مسائل کا حل خدا نے سنجیدہ غور و فکر اور حقیقت پسندانہ پروگرام میں رکھا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے آج کے مسلمان آخری حد تک دور ہیں۔ وہ ہر دوسرے طریقہ پر بے پناہ سرمایہ اور طاقت خرچ کرنے کے لئے تیار ہیں مگر حقیقت پسندانہ طریقہ کو زیر عمل لانے کے لئے نہ ان کے پاس پیسہ ہے اور نہ وقت۔ آج ان کا حال وہی ہو رہا ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ

(اعراف ۱۴۶ - ۴۷)

اور اگر دیکھیں ساری نشانیاں یقین نہ کریں ان کو۔ اور اگر دیکھیں راہ سنوار کی وہ نہ ٹھہرائیں اس کو راہ اور اگر دیکھیں راہ الٹی اس کو ٹھہرائیں راہ۔ یہ اس واسطے کہ انھوں نے جھوٹ جانیں ہماری آیتیں اور ہو رہے ان سے بے خبر۔ اور جنھوں نے جھوٹ جانیں ہماری آیتیں اور آخرت کی ملاقات ضائع ہوئیں ان کی محنتیں، وہی بدلا پائیں گے جو کچھ عمل کرتے تھے (ترجمہ شاہ عبدالقادر)

جب آدمی جھنجھلاہٹ اور جذباتیت کا شکار ہو جائے تو صرف سطحی باتیں اس کی سمجھ میں آتی ہیں، کوئی گہری بات اس کو اپیل نہیں کرتی۔ یہی آج مسلمانوں کا حال ہے۔ حقیقت پسندانہ طریق کار کے حق میں کتنے ہی کھلے کھلے دلائل دے دئے جائیں۔ مگر وہ ان کے ذہن کا جز نہیں بنتے۔ وہ ایسے راستوں کی طرف تو تیزی سے دوڑ پڑتے ہیں جن کا آخری نتیجہ مزید تباہی کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ مگر ایسے راستے جو کامیابی کی طرف لے جانے والے ہوں، ان کو فلسفیانہ اور دور از کار کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک بے خبر انسان کی طرح وہ کبھی اس دیوار سے سر ٹکراتے ہیں اور کبھی اُس دیوار سے ۔ ان کی کوششیں اپنے نتیجہ کے اعتبار سے مسلسل بے قیمت ہوتی جا رہی ہیں۔ مگر ان کی آنکھ کسی طرح نہیں کھلتی۔ نئے الفاظ

بول کر وہ دوبارہ انھیں سطحی طریقوں کی طرف دوڑ پڑتے ہیں جو بار بار تجربہ کے بعد اپنی ناکامی ثابت کر چکے ہیں۔

اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج کا مسلمان یا تو فراریت کی باتوں کو قبول کرتا ہے یا تصادم کی باتوں کو۔ سارے مسلمان انھیں دو میں سے کسی طریقہ کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ تعمیر و استحکام کا طریقہ کسی طرح ان کے فکری سانچہ میں نہیں بیٹھتا۔ لیکن اگر ہم مزید اپنی قوتیں برباد کرنا نہیں چاہتے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم اپنے اس انداز کو بدلیں اور حقائق کی روشنی میں کوئی نتیجہ خیز پروگرام اپنے لئے بنائیں۔

۱۔ فسادات کو ختم کرنے کے لئے سب سے پہلا ضروری کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو باشعور اور تعلیم یافتہ بنایا جائے تاکہ ان کی جذباتیت ختم ہو، وہ جانیں کہ کس موقع پر انھیں کس قسم کا ردعمل ظاہر کرنا چاہئے۔ فسادات میں مسلمان کروڑوں روپے چندے دیتے ہیں۔ اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ فساد کا آغاز ہمیشہ ان لوگوں کی کسی حرکت سے ہوتا ہے جو جاہل یا بیروزگار ہیں تو اس قسم کی رقم کا بہترین مصرف یہ ہوگا کہ قوم کے جاہل لوگوں کو تعلیم یافتہ بنایا جائے اور جو لوگ بے روزگار ہیں ان کو کسی نہ کسی معاشی کام میں مصروف کر دیا جائے۔ قوم کو مشغول اور باشعور بنا کر زیادہ بہتر طور پر فسادات کا سدباب کیا جا سکتا ہے۔ یہ گویا فساد کو اس زمین سے محروم کرنا ہے جس پر اس کا خاردار درخت اگتا ہے۔

۲۔ ہمارے لکھنے اور بولنے والے آج سب سے زیادہ جس کام میں مصروف ہیں وہ یہ کہ قوم کو جذباتیت کی شراب پلائی جائے اور نتیجۃً عوام کے درمیان سستی مقبولیت حاصل کی جائے۔ یہ سلسلہ قطعاً بند ہو جانا چاہئے۔ اس کے بجائے ہمارے قلم اور زبان کی طاقت کو تمام تر اس مقصد پر لگ جانا چاہئے کہ قوم کے افراد میں صبر اور حقیقت پسندی اور باہمی اتحاد کا جذبہ پیدا ہو۔ کسی قوم کی طاقت کا راز یہ ہے کہ اس کے افراد سنجیدہ انداز میں سوچنا جانتے ہوں نہ یہ کہ ان کو پرشور الفاظ کا مظاہرہ کرنے میں کمال حاصل ہو۔

۳۔ ہر جگہ کے مسلمان اس کو اپنی ذمہ داری سمجھیں کہ جب بھی کوئی شخص شرارت کرے، خواہ وہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہو یا مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان، فوراً موقع پر پہنچ کر شریر کا ہاتھ پکڑ لیا جائے۔ فساد کے اجتماعی سطح پر پھیلنے سے پہلے اس وقت اس کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے جب کہ وہ ابھی انفرادی سطح پر ہوتا ہے اور بآسانی اس کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فسادات ہونے کے بعد شور و غل کرنا جتنا بے معنی ہے اتنا ہی بامعنی یہ ہے کہ فساد سے پہلے انفرادی جھگڑوں اور شکایتوں کو دور کرنے میں طاقت صرف کی جائے۔

۴۔ قوم کے عمل کے جذبہ کو دعوت و تبلیغ کے کام کی طرف موڑنے کی کوشش کی جائے۔ یہ مسلمان اپنے مزاج کے اعتبار سے مجاہدانہ مزاج کا حامل ہوتا ہے۔ یہ ایک مطلوب چیز ہے۔ مگر بدقسمتی سے اس مجاہدانہ مزاج کا استعمال سیاسی شور و غل اور باہمی اختلافات میں ہو رہا ہے۔ اس مجاہدانہ مزاج کے اظہار کا اصل میدان اللہ کے دین کو پھیلانا ہے اور اس کے لئے پرامن جد و جہد کرنا ہے۔ اگر مسلمانوں کے مجاہدانہ مزاج کو دعوت و تبلیغ کی طرف موڑ دیا جائے تو بیشتر لڑائیاں اور اختلافات اسی طرح ختم ہو جائیں گے جیسے ایک بے کار آدمی ادھر ادھر جھگڑتا پھرتا ہو اور اس کے بعد اچانک اس کو ایک اچھا روزگار ہاتھ آ جائے اور وہ ساری خرافات کو ختم کر کے اپنے روزگار میں لگ جائے (۲۶ ستمبر ۱۹۸۰)

سنجیدہ ہونا ضروری ہے

ایک صاحب اپنے بچوں کے لئے بہت سخت تھے۔ ہمیشہ ڈانٹ کر بات کرتے تھے۔ کبھی کسی نے ان کو اپنے بچوں کے ساتھ نرمی سے بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ لڑکے ان سے اس قدر ڈرتے تھے کہ ان کے سامنے کوئی بولنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوتے تو تمام بچے خاموش ہو کر ادھر ادھر دبک جاتے۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ وہ گھر میں داخل ہوئے۔ سیڑھی کوٹھے کر کے جب وہ اپنے مکان کی چھت پر پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کا ایک بچہ بجلی کے پول سے لپٹا ہوا ہے۔ بجلی کے تار میں ایک پتنگ پھنس گئی تھی۔ پتنگ کو حاصل کرنے کے شوق میں لڑکا بارجہ کا سہارا لے کر پول پر چڑھ گیا۔ ابھی اس کا کام پورا نہیں ہوا تھا کہ اس کے باپ آگئے۔ نگاہیں ملتے ہی بچہ سہم گیا مگر بالکل خلاف معمول باپ نے کوئی سخت بات نہیں کہی بلکہ نہایت نرم لہجہ میں بولے "بیٹے تم وہاں کہاں" اس کے بعد انھوں نے محبت کے انداز میں لڑکے کو ترغیب دی کہ وہ آہستہ آہستہ اترے اور بارجہ کا سہارا لے کر دوبارہ گھر میں آجائے۔ بعد کو ایک شخص سے انھوں نے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا: میں نے مسکرا کر اور نرم لہجہ میں اس لئے بات کی کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں اس نازک موقع پر ڈانٹتا ہوں تو وہ گھبرا اٹھے گا اور پول سے چھوٹ کر نیچے سڑک پر جا گرے گا۔ اس نزاکت نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنی عادت کے خلاف بچہ سے میٹھے انداز میں بات کروں۔

یہی مثال ملی مسئلہ پر بھی چسپاں ہوتی ہے۔ اگر آدمی کو صورت حال کی نزاکت کا احساس ہو اور وہ اس کے لئے دردمند ہو تو اس کی دردمندی خود ہی مجبور کرے گی کہ وہ اشتعال کے بجائے برداشت کا طریقہ اختیار کرے، وہ تصادم کے بجائے بچ کر نکلنے کی تدبیر کرے۔ "کون صحیح ہے اور کون غلط"، کی بحث میں پڑنے کے بجائے وہ مسئلہ کے حل کے پہلو پر دھیان دے۔ اور اگر اس کو نزاکت کا احساس نہ ہو تو وہ اپنی عام عادت کے مطابق "بچہ" کو پول پر دیکھ کر بگڑ اٹھے گا خواہ اس کا یہی انجام کیوں نہ ہو کہ لڑکا ۳۰ فٹ کی بلندی سے سڑک پر جا گرے اور اس کی ہڈی پسلی چور ہو جائے۔

ساری تاریخ کا یہ تجربہ ہے کہ جب آدمی کسی معاملہ میں سنجیدہ ہو تو اس کا انداز اور ہوتا ہے اور جب وہ سنجیدہ نہ ہو تو اس کا انداز بالکل دوسرا ہوتا ہے۔ کوئی دلیل اس شخص کے لئے دلیل ہے جو سنجیدہ ہو۔ سنجیدہ آدمی ہی کسی بات کے وزن کو محسوس کرتا ہے۔ سنجیدہ آدمی ہی کسی مسئلہ کی نزاکتوں کو اہمیت دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص سنجیدہ نہ ہو وہ ہر دلیل کی کاٹ کے لئے کچھ نہ کچھ الفاظ بول دے گا۔ ہر قیمتی بات کو سن کر ایک غیر متعلق بحث چھیڑ دے گا۔ اور اگر اس کی بات کا جواب دے کر بات کو ازسرنو واضح کیا جائے تو وہ وضاحت کے خلاف دوبارہ کوئی بحث نکال لے گا۔ اور اصل بات بدستور اس کی گرفت سے دور رہ جائے گی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی دلیل اسی کے لئے دلیل ہے جو اس کو سمجھنا چاہے۔ جو سمجھنا نہ چاہے اس کے لئے کوئی دلیل دلیل نہیں۔

یہ اسلام نہیں

ایک مقام کے کچھ مسلمانوں سے میری ملاقات ہوئی۔ وہاں کچھ دن پہلے ایک چھوٹا سا فرقہ وارانہ فساد ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے ذوق کے مطابق "صبر" کا طریقہ اختیار کرنے کی بات کی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں تو مسلمانوں کی طرف سے کوئی اشتعال کا واقعہ نہیں ہوا تھا۔ دوسری قوم کے لوگ خواہ مخواہ ہم سے لڑ گئے۔ میں نے کہا کہ لڑائی کیسے پیش آئی، انھوں نے قصہ بتاتے ہوئے کہا کہ وہاں ہماری ایک مسجد ہے۔ مسجد سے قریب ہی غیر مسلم بھائیوں کی عبادت گاہ ہے۔ ہم نے مسجد میں اذان کے لئے لاؤڈ اسپیکر لگایا تو انھوں نے بھی اپنے عبادتی مواقع پر گھنٹی بجانی شروع کر دی جس کی آواز مسجد تک آتی تھی۔ ہم نے سنجیدگی کے ساتھ ان سے کہا کہ آپ لوگ ہماری نماز کے اوقات میں گھنٹی نہ بجائیں۔ وہ نہیں مانے۔ جب کئی بار ان سے کہا گیا تو وہ بگڑ گئے۔ اس کے بعد جھگڑا ہو گیا۔

میں نے کہا کہ یہ کون سا شرعی مسئلہ ہے کہ نماز کے اوقات میں کوئی غیر قوم کا آدمی اپنی عبادت گاہ میں گھنٹی نہ بجائے۔ یہ نہ کہیں قرآن میں لکھا ہوا ہے اور نہ حدیث میں ہے اور نہ ہمارے فقہاء میں سے کسی کا یہ مسلک ہے۔ حتیٰ کہ اسلامی حکومت کے پورے زمانہ میں کبھی کسی مسلم حکمراں کی طرف سے یہ ہدایت جاری نہیں کی گئی کہ نماز کے اوقات میں دوسری قوموں کے عبادت خانہ میں ناقوس اور گھنٹیاں نہ بجائی جائیں۔ ایسی حالت میں آپ کیوں اس پر برہم ہوتے ہیں۔ کوئی اگر گھنٹی بجاتا ہے تو بجانے دیجئے۔ اس سے نہ نماز میں کوئی خلل واقع ہوتا اور نہ شریعت نے ہمیں ایسے کسی حکم کا مکلف کیا ہے۔ تاہم مذکورہ بزرگ نے میری بات نہیں مانی، ان کے پاس اگرچہ میری دلیل کا کوئی جواب نہیں تھا مگر وہ اپنی بات کو پُرجوش انداز میں بدستور دہراتے رہے۔

اس ملک کے اکثر فسادات اسی قسم کی باتوں سے شروع ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ جب شریعت نے ہمیں ایسے کسی حکم کا پابند نہیں کیا ہے تو ہم کیوں چاہتے ہیں کہ ہماری مسجد کے سامنے کوئی باجے کا جلوس نہ گزرے۔ کوئی اس کے پاس گھنٹی نہ بجائے۔ اس کی وجہ تمام تر قومی ہے نہ کہ دینی۔ مسلمانوں نے پچھلے سو سال کی سیاست کے نتیجہ میں انھیں چیزوں کو اپنی قومی عظمت کا نشان بنا لیا ہے۔ وہ اس کو اپنی ساکھ کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ مسجد کے پاس ایسا کوئی واقعہ ہو تو وہ اس میں اپنی بے عزتی محسوس کرتے ہیں۔ اور اگر وہ اس کو روکنے میں کامیاب ہو جائیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنی قوم کی عزت کو اونچا کیا۔

یہ سراسر جاہلانہ طریقہ ہے۔ یہ طریقہ ہم کو خدا اور رسول نے نہیں بتایا۔ بلاشبہ یہ ہم کو نفس نے سکھایا ہے۔ نفس چاہتا ہے کہ ہم اپنے مدعو کے خلاف ایسے ہنگامے کرتے رہیں جس سے ہمارے اور دوسروں کے درمیان قومی نفرت تو خوب بڑھے، مگر داعی اور مدعو کے رشتے کبھی قائم نہ ہوں۔ کیونکہ ایسے ماحول میں جہاں داعی اور مدعو کے درمیان شبہ اور نفرت کی فضا قائم ہو وہاں کبھی اسلام کی دعوت کا کام نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کی قومی معرکہ آرائی پر ہم کو اللہ کے یہاں انعام تو کیا ملے گا، البتہ شدید اندیشہ ہے کہ ہم اپنی قومی نادانیوں کو اسلام کا نام دینے کی وجہ سے کہیں خدا کی پکڑ میں نہ جائیں۔

کہو، یہ بتاؤ کہ اللہ اگر چھین لے تمھارے کان اور تمھاری آنکھیں اور تمھارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو اس کو واپس لائے۔ دیکھو ہم کیوں کر طرح طرح سے نشانیاں بیان کرتے ہیں پھر بھی وہ اعراض کرتے ہیں۔ کہو، یہ بتاؤ اگر اللہ کا عذاب تمھارے اوپر اچانک یا علانیہ آجائے تو ظالموں کے سوا اور کون ہلاک ہوگا۔ اور رسولوں کو ہم صرف خوش خبری دینے والے یا ڈرانے والے کی حیثیت سے بھیجتے ہیں۔ پھر جو ایمان لایا اور اپنی اصلاح کی تو ان کے لئے نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو ان کو عذاب پکڑے گا اس لئے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ کہو، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کو جانتا ہوں اور نہ میں تم سے کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے۔ کہو، کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ کیا تم غور نہیں کرتے ۵۰ ـ ۴۶

آدمی کو کان اور آنکھ اور دل جیسی صلاحیتیں دینا ظاہر کرتا ہے کہ اس کا خالق اس سے کیا چاہتا ہے۔ خالق یہ چاہتا ہے کہ آدمی بات کو سنے اور دیکھے، وہ عقلی دلیل سے اس کو مان لے۔ اگر آدمی اپنی ان خداداد صلاحیتوں سے وہ کام نہ لے جو اس سے مقصود ہے تو گویا وہ اپنے کو اس خطرہ میں ڈال رہا ہے کہ اس کو نااہل قرار دے کر یہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں۔ کس قدر محروم ہے وہ شخص جس کو اندھا اور بہرا اور بے عقل بنا دیا جائے۔ کیونکہ ایسا آدمی دنیا میں بالکل ذلیل اور بے قیمت ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر اس سے بھی بڑی محرومی یہ ہے کہ آدمی کے پاس بظاہر کان ہوں مگر وہ حق کو سننے کے لئے بہرے ہو جائیں۔ بظاہر آنکھ ہو مگر وہ حق کو دیکھنے کے لئے اندھی ہو۔ سینہ میں دل موجود ہو مگر وہ حق کو سمجھنے کی استعداد سے خالی ہو جائے۔ چھیننے کی یہ قسم پہلی قسم سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ کیوں کہ وہ آدمی کو آخرت کے اعتبار سے ذلیل اور بے قیمت بنا دیتی ہے جس سے بڑی محرومی کوئی دوسری نہیں۔

آدمی کو انکار حق کے انجام سے ڈرایا جائے تو ڈھیٹ آدمی بے خوفی کا جواب دیتا ہے۔ دنیا میں اپنے معاملات کو درست دیکھ کر وہ سمجھتا ہے کہ خدا کی پکڑ کا اندیشہ اس کے اپنے لئے نہیں ہے۔ حتیٰ کہ جو زیادہ ڈھیٹ ہیں وہ حق کے داعی سے کہتے ہیں کہ تم اگر سچے ہو تو عذاب کو لاکر دکھاؤ۔ وہ نہیں سمجھتے کہ خدا کا عذاب آیا تو وہ خود انھیں کے اوپر پڑے گا نہ کہ کسی دوسرے کے اوپر۔

اللہ کا داعی منذر اور مبشر بن کر آتا ہے۔ بالفاظ دیگر، آدمی کا امتحان خدا کے یہاں جس بنیاد پر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی آگاہی کی زبان میں حق کو پہچانے اور اپنی اصلاح کرے۔ اگر اس نے آگاہی کی زبان میں حق کو نہ پہچانا اور اس کو ماننے کے لئے طلسمات و عجائبات کا مطالبہ کیا تو گویا وہ اندھے پن کا ثبوت دے رہا ہے اور اندھوں کے لئے خدا کی اس دنیا میں بھٹکنے اور برباد ہونے کے سوا کوئی انجام نہیں۔

اور تم اس وحی کے ذریعہ سے ڈراؤ ان لوگوں کو جو اندیشہ رکھتے ہیں اس بات کا کہ وہ اپنے رب کے پاس جمع کئے جائیں گے اس حال میں کہ اللہ کے سوا نہ ان کا کوئی حمایتی ہوگا اور نہ سفارش کرنے والا، شاید کہ وہ اللہ سے ڈریں۔ اور تم ان لوگوں کو اپنے سے دور نہ کرو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اس کی خوشنودی چاہتے ہوئے۔ ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بوجھ تم پر نہیں اور تمھارے حساب میں سے کسی چیز کا بوجھ ان پر نہیں کہ تم ان کو اپنے سے دور کرکے بے انصافوں میں سے ہو جاؤ۔ اور اس طرح ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے سے آزمایا ہے تاکہ وہ کہیں کہ کیا یہی وہ لوگ ہیں جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل ہوا ہے۔ کیا اللہ شکر گزاروں سے خوب واقف نہیں ۵۳-۵۱

نصیحت ہمیشہ ان لوگوں کے لئے کارگر ہوتی ہے جو اندیشہ کی نفسیات میں جیتے ہوں۔ جس کو کسی چیز کا کھٹکا لگا ہوا ہو اسی کو اس کے خطرے سے آگاہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ بے خوفی کی نفسیات میں جی رہے ہوں وہ کبھی نصیحت کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہوتے، اس لئے وہ نصیحت کو قبول کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے۔

بے خوفی کی نفسیات پیدا ہونے کا سبب عام طور پر دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک دنیا پرستی، دوسرے اکابر پرستی۔ جو لوگ دنیا کی چیزوں میں گم ہوں یا دنیا کی کوئی کامیابی پاکر اس پر مطمئن ہوگئے ہوں، حتیٰ کہ انھیں یہ بھی یاد نہ رہتا ہو کہ ایک روز ان کو مرکر خالق و مالک کے سامنے حاضر ہونا ہے، ایسے لوگ آخرت کو کوئی قابل لحاظ چیز نہیں سمجھتے، اس لئے آخرت کی یاد دہانی ان کے ذہن میں اپنی جگہ حاصل نہیں کرتی۔ ان کا مزاج ایسی باتوں کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو آخرت کے معاملہ کو سفارش کا معاملہ سمجھ لیتے ہیں۔ وہ فرض کر لیتے ہیں کہ جن بڑوں کے ساتھ انھوں نے اپنے کو وابستہ کر رکھا ہے وہ آخرت میں ان کے مددگار اور سفارشی بن جائیں گے اور کسی بھی ناموافق صورت حال میں ان کی طرف سے کافی ثابت ہوں گے۔ ایسے لوگ اس بھروسہ پر جی رہے ہوتے ہیں کہ انھوں نے مقدس ہستیوں کا دامن تھام رکھا ہے، وہ خدا کے محبوب و مقبول گروہ کے ساتھ شامل ہیں اس لئے اب ان کا کوئی معاملہ بگڑنے والا نہیں ہے۔ یہ نفسیات ان کو آخرت کے بارے میں نڈر بنا دیتی ہے، وہ کسی ایسی بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے جو آخرت میں ان کی حیثیت کو مشتبہ کرنے والی ہو۔

جو لوگ مصلحتوں کی رعایت کرکے دولت و مقبولیت حاصل کئے ہوئے ہوں وہ کبھی حق کی بے آمیز دعوت کا ساتھ نہیں دیتے۔ کیونکہ حق کا ساتھ دینا ان کے لئے یہ معنی رکھتا ہے کہ اپنی مصلحتوں کے بنے بنائے ڈھانچہ کو توڑ دیا جائے۔ پھر جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ حق کے گرد معمولی حیثیت کے لوگ جمع ہیں تو یہ صورت حال ان کے لئے اور زیادہ فتنہ بن جاتی ہے۔ ان کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا ساتھ دے کر وہ اپنی حیثیت کو گرا لیں گے۔ وہ حق کو حق کی کسوٹی پر نہ رکھ کر اپنی کسوٹی پر دیکھتے ہیں اور جب حق ان کی اپنی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا تو وہ اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اور جب تمھارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لائے ہیں تو ان سے کہو کہ تم پر سلامتی ہو۔ تمھارے رب نے اپنے اوپر رحمت لکھ لی ہے۔ بے شک تم میں سے جو کوئی نادانی سے برائی کر بیٹھے پھر اس کے بعد وہ توبہ کرلے اور اصلاح کرلے تو وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اسی طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کر بیان کرتے ہیں، اور تاکہ مجرموں کا طریقہ ظاہر ہو جائے۔ ۵۴-۵۵

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک قسم کے لوگ وہ تھے جو آپ کی صداقت پر معجزے طلب کرتے رہے۔ دوسرے لوگ وہ تھے جو آیات قرآنی کو سن کر آپ کے مومن بن گئے۔ یہی امتحان ہر زمانہ میں انسان کے ساتھ جاری ہے۔ موجودہ دنیا میں خدا خود سامنے نہیں آتا، وہ داعی کی زبان سے اپنے دلائل کا اعلان کرتا ہے۔ وہ اپنی صداقت کو لفظوں کے روپ میں ڈھال کر انسان کے سامنے لاتا ہے۔ اب جن کی فطرت زندہ ہے وہ انھیں دلائل میں خدا کا جلوہ دیکھ لیتا ہے اور اس کا اقرار کرکے اس کے آگے جھک جاتا ہے۔ اس کے برعکس جنھوں نے اپنی فطرت پر مصنوعی پردے ڈال رکھے ہیں وہ الفاظ کے روپ میں خدا کو پاتے میں ناکام رہتے ہیں۔ وہ خدا کو اس کی استدلالی صورت میں دیکھ نہیں پاتے اس لیے چاہتے ہیں کہ خدا اپنی مشاہداتی صورت میں ان کے سامنے آئے۔ مگر موجودہ امتحان کی دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ یہاں وہی شخص خدا کو پاتا ہے جو خدا کو عالم غیب میں پالے، جو شخص خدا کو عالم شہود میں دیکھنے پر اصرار کرے، اس کا انجام خدا کی اس دنیا میں محرومی کے سوا اور کچھ نہیں۔

جو لوگ اپنی کجی کی وجہ سے حق سے دور رہتے ہیں وہ حق کو قبول کرنے والوں پر طرح طرح کے الزام لگاتے ہیں تاکہ ان کے مقابلہ میں اپنے کو بہتر ثابت کرسکیں۔ ان کو اپنے جرائم نظر نہیں آتے۔ البتہ حق پرستوں سے اگر کبھی کوئی غلطی ہو گئی تو اس کو خوب بڑھا کر بیان کرتے ہیں تاکہ یہ ظاہر ہو کہ جو لوگ اس دعوت کے گرد جمع ہیں وہ قابل اعتبار لوگ نہیں ہیں۔ حالانکہ اصل صورت حال اس کے برعکس ہے۔ جن لوگوں نے ناحق کو چھوڑ کر حق کو قبول کیا ہے انھوں نے اپنے اس عمل سے ایمان و اصلاح کے راستہ پر چلنے کا ثبوت دیا ہے۔ اس طرح وہ خدا کے قانون کے مطابق اس کے مستحق ہو گئے کہ انھیں اصلاح حال کی توفیق ملے اور وہ خدا کی رحمتوں میں اپنا حصہ پائیں۔ اس کے برعکس جو لوگ حق سے دور پڑے ہوئے ہیں وہ اپنے عمل سے ثابت کر رہے ہیں کہ وہ ایمان و اصلاح کا طریقہ اختیار کرنے سے کوئی دل چسپی نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ خدا کی توفیق سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کی ڈھٹائی کبھی ختم نہیں ہوتی اور ڈھٹائی ہی خدا کی اس دنیا میں کسی کا سب سے بڑا جرم ہے۔

خدا نشانیوں کی زبان میں بولتا ہے۔ نشانیاں اس شخص کے لیے کارآمد ہوتی ہیں جو ان کو پڑھنا چاہے۔ اسی طرح ہدایت اسی کو ملے گی جو اس کا طالب ہو۔ جو شخص ہدایت کی طلب نہ رکھتا ہو اس کے لیے اندھیروں میں دنیا میں بھٹکنے کے سوا کوئی دوسرا انجام نہیں۔

کہو، مجھے اس سے روکا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ کہو، میں تمہاری خواہشوں کی پیروی نہیں کر سکتا، اگر میں ایسا کروں تو میں بے راہ ہو جاؤں گا اور میں راہ پانے والوں میں سے نہ رہوں گا۔ کہو، میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور تم نے اس کو جھٹلا دیا ہے۔ وہ چیز میرے پاس نہیں ہے جس کے لئے تم جلدی کر رہے ہو۔ فیصلہ کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ وہی حق کو بیان کرتا ہے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہو، اگر وہ چیز میرے پاس ہوتی جس کے لئے تم جلدی کر رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان معاملہ کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو۔ اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، ان کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ خشکی میں ہے اور جو کچھ سمندر میں ہے اور درخت سے گرنے والا کوئی پتہ نہیں جس کا اس کو علم نہ ہو اور زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ نہیں گرتا اور نہ کوئی تر اور خشک چیز، مگر سب ایک کھلی کتاب میں درج ہے۔ ۵۶ - ۵۹

خدا کے سوا جس چیز کو آدمی معبود کا درجہ دیتا ہے وہ اس کی ایک خواہش ہوتی ہے جس کو وہ واقعہ فرض کر لیتا ہے۔ کبھی اپنی بے عملی کے انجام سے بچنے کے لیے وہ کسی کو خدا کا مقرب یقین کر لیتا ہے جو خدا کے یہاں اس کا مددگار اور سفارشی بن جائے۔ کبھی وہ ایک شخصیت کے حق میں طلسماتی عظمت کا تصور قائم کر لیتا ہے تاکہ اپنے کو اس سے منسوب کر کے اپنے چھوٹے پن کی تلافی کر سکے۔ کبھی اپنی سہل پسندی کی وجہ سے وہ ایسا خدا گھڑ لیتا ہے جو سستی قیمت پر مل جاتا ہے اور معمولی معمولی چیزوں سے جس کو خوش کیا جا سکے۔

مگر اس قسم کی تمام چیزیں محض مفروضات ہیں اور مفروضات کسی کو حقیقت تک نہیں پہنچا سکتے۔ تاہم آدمی اپنی سستی طلب میں کبھی اتنا اندھا ہو جاتا ہے کہ وہ خود ان لوگوں کو چیلنج کرنے لگتا ہے جنھوں نے کائنات کے حقیقی مالک کی طرف اپنے کو کھڑا کر رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ساری بڑائی اگر اسی ایک خدا کے لئے ہے جس کے تم نمائندہ ہو تو ہم جیسے نافرمانوں پر اس کا عذاب نازل کر کے دکھاؤ۔ یہ جرأت ان کو اس لئے ہوتی ہے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ توحید کے داعیوں کے مقابلہ میں ان کے اپنے گرد زیادہ دنیوی رونقیں جمع ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ یہ مادی چیزیں ان کو دنیاداری اور مصلحت پرستی کی بنا پر ملی ہیں اور توحید کے داعی جو ان چیزوں سے خالی ہیں وہ اس لئے خالی ہیں کہ ان کی آخرت پسندی نے ان کو مصلحت پرستی کی سطح پر آنے سے روکے رکھا۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لئے یہاں دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ آدمی کے مادی حالات کیا ہیں۔ بلکہ یہ کہ وہ حقیقی دین پر کھڑا ہوا ہے یا مفروضات اور خوش گمانیوں پر۔ دنیا کا نظام اسی شخص کا ساتھ دے گا جو واقعی دلیل پر کھڑا ہوا ہو۔ جو لوگ مفروضات پر کھڑے ہوئے ہیں ان کا آخری انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ خدا کی اس دنیا میں بالکل بے سہارا ہو کر رہ جائیں۔ جس دنیا کا سارا انتظام محکم قوانین پر چل رہا ہو اس کا آخری انجام خوش خیالیوں کے تابع کیوں کر ہو جائے گا۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

عربی مطبوعات

مولانا وحید الدین خاں کی کتابوں کے بعض عربی ترجمے (مطبوعہ قاہرہ) برائے فروخت مکتبہ الرسالہ میں موجود ہیں:

کتاب	صفحات		قیمت	
۱۔ الاسلام یتحدی	۲۶۳	صفحات	قیمت ۲۰	روپے
۲۔ الدین فی مواجهة العلم	۱۱۲	صفحات	۱۰	روپے
۳۔ حکمة الدین	۸۷	صفحات	۸	روپے
۴۔ الاسلام والعصر الحدیث	۷۷	صفحات	۸	روپے
۵۔ مسئولیات الدعوة	۳۹	صفحات	۲	روپے
۶۔ نحو تدوین جدید للعلوم الاسلامیة	۲۶	صفحات	۲	روپے
۷۔ إمکانات جدیدة للدعوة	۳۴	صفحات	۲	روپے
۸۔ الشریعة الاسلامیة وتحدیات العصر	۳۲	صفحات	۲	روپے
۹۔ المسلمون بین الماضی والحال والمستقبل	۴۲	صفحات	۵	روپے
۱۰۔ نحو بعث إسلامی	۳۲	صفحات	۵۰	پیسے

انسان اپنے آپ کو پہچان

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۲۴ قیمت ۷۵ پیسے

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

کتاب وسنت کا داعی ونقیب
زر تعاون سالانہ پندرہ روپے

دفتر اخبار ترجمان

پوسٹ بکس نمبر 1306 دہلی — ۶

ناشر ... نے ... پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

REGD. R. N. NO. 28822/76
REGD D. (D) NO. 532

November 1980
Issue No. 48

AL-RISALA MONTHLY

:AMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 28

الرسالہ

سرپرست

مولانا وحید الدین خاں

الرسالہ

دسمبر ۱۹۸۰

شمارہ ۹

جمعیتہ بلڈنگ ، قاسم جان اسٹریٹ ، دہلی ۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فسادات کا مسئلہ

کوئی گروہ اپنے کو سراسر مظلوم بتائے اور دوسرے گروہ کو سراسر ظالم قرار دے اور اس صورت حال پر نصف صدی گزر جائے تو یقینی ہے کہ اس کا دعویٰ صحیح نہیں۔ کیونکہ خدا کی اس دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی گروہ اتنی لمبی مدت تک یک طرفہ طور پر دوسرے گروہ کے اوپر ظلم کرتا رہے، پھر بھی خدا اپنے مظلوم بندوں کی مدد پر نہ آئے۔

"فسادات کا مسئلہ" نامی کتاب میں اس مسئلہ پر اسی نقطۂ نظر سے کلام کیا گیا ہے اور انتہائی غیر جذباتی انداز میں قرآن، حدیث، سیرت اور تاریخی واقعات سے اس مسئلہ کو واضح کیا گیا ہے۔ موجودہ حالات کا تقاضا ہے کہ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ لوگوں میں پھیلایا جائے۔

قیمت فی نسخہ دو روپے

مکتبہ الرسالہ جمعیتہ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

المركز الإسلامي للبحوث والدعوة (بدلهي)

نشأت فكرة **المركز الإسلامي للبحوث والدعوة** في نشر التعاليم الإسلامية بأسلوب عصري يخاطب المثقفين المسلمين وغير المسلمين ، وهذا المشروع نتاج سنوات طويلة من الجهود التي قام بها الأستاذ (وحيد الدين خان) ، الباحث والمفكر الإسلامي المعروف في شبه القارة الهندية ، الذي لقيت كتبه إقبالا كبيراً في العالم العربي ، وأحد كتبه « **الإسلام يتحدى** » مقرر في المنهج الدراسي بكل من **جامعة الأزهر وجامعة طرابلس** . وأول مشروع نشري بدأه المركز هو **مجلة (الرسالة) الشهرية باللغة الأوردية** ، التي تقدم دراسات جادة عن الإسلام وقضايا العصر الحديث .

وقد بدأ نشر بعض المقالات المختارة من (الرسالة) في سلسلة كتابية من بيروت بعنوان « **الإسلام والعصر الحديث** » ومن القاهرة ضمن سلسلة « **نحو وعي إسلامي** » .

وفي خطط المركز الإسلامي : نشر الأبحاث والمجلات **وإنشاء جامعة الدراسات القرآنية** بهدف دراسة علوم القرآن الكريم ، وإعداد مجموعة كتب متخصصة في الدعوة الإسلامية بالأسلوب العصري وبمختلف اللغات الحديثة . ومن الكتب التي نشرتها مكتبة الرسالة التابعة للمركز : (**الإسلام**) (١٧٦ صفحة) و (**ظهور الإسلام**) (١٩٩ صفحة) باللغة الأوردية . ومن المنتظر أن تظهر ترجمة كاملة بالعربية والإنجليزية لهذه الكتب خلال سنة ١٩٨١ م ، والمركز يخطط للتوسع في نشاطه حتى يصبح مؤسسة عالمية لنشر الإسلام في الهند وخارجها .

مجلة « الفيصل » (الرياض) محرم ١٤٠١ هـ

اسلامی مرکز، دہلی

سعودی عرب کے ایک ذمہ دار وفد نے ۱۹۸۰ کے آغاز میں ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ انھوں نے ملک کے مختلف اسلامی اداروں کا بچشم خود معائنہ کیا۔ اس سلسلہ میں وفد کے ارکان ۲۱ فروری ۱۹۸۰ کو دفتر الرسالہ (دہلی) میں بھی آئے اور الرسالہ اور اسلامی مرکز کے بارے میں براہ راست معلومات حاصل کیں اور اس کے پروگرام کی بابت تبادلہ خیال کیا۔ واپسی کے بعد وفد کے ایک رکن ڈاکٹر عبد الحلیم عویس (استاد جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ، ریاض) نے مشاہدات سفر قلم بند کئے۔ یہ روداد ریاض کے مشہور ماہوار مجلہ الفیصل میں شائع ہوئی ہے۔ یہاں اسلامی مرکز (دہلی) سے متعلق روداد کے حصہ کا ترجمہ (مطبوعہ محرم ۱۴۰۱ھ) اور اس کا ترجمہ دیا جارہا ہے۔

اسلامی مرکز (برائے تحقیق و دعوت) کا قیام اس لئے ہوا ہے کہ اسلامی تعلیمات کو عصری اسلوب میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے لایا جائے۔ یہ اسلامی منصوبہ استاذ وحید الدین خاں کی سالہا سال کی محنتوں کا نتیجہ ہے جو کہ برصغیر ہند کے مشہور محقق اور اسلامی مفکر ہیں۔ ان کی کتابوں کو عرب دنیا میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ان کی ایک کتاب الاسلام یتحدی (مذہب اور جدید چیلنج) مصر کی جامعہ ازہر اور لیبیا کی جامعہ طرابلس میں درسی نصاب کے طور پر داخل ہے۔

اسلامی مرکز (دہلی) نے اپنے اشاعتی منصوبہ کو الرسالہ کے اجراء سے شروع کیا ہے۔ اس اردو ماہنامہ میں اسلام اور عہد حاضر کے مسائل کے بارے میں اہم مضامین شائع ہورہے ہیں۔ ماہنامہ الرسالہ کے منتخب مقالات کو عربی زبان میں علیحدہ کتابی صورت میں شائع کرنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا ہے۔ الرسالہ کے مضامین کے یہ عربی ترجمے بیک وقت بیروت سے بعنوان الاسلام والعصر الحدیث اور قاہرہ سے نحو بعث اسلامی کے سلسلے کے تحت شائع کئے جارہے ہیں۔

اسلامی مرکز (دہلی) کے منصوبوں میں سے یہ ہے کہ اسلام کے بارے میں رسائل اور کتابیں (جدید عربی اسلوب میں) شائع کی جائیں۔ اس کے علاوہ قرآنی طرز پر ایک درس گاہ کا قیام اس کے منصوبوں میں شامل ہے جس کا مقصد علوم قرآنی کی تعلیم کا انتظام ہوگا۔ اسلامی مرکز اسلام سے متعلق مختلف موضوعات پر تحقیقی کتابوں کا ایک سٹ تیار کرنے کا پروگرام بھی رکھتا ہے جو کہ عہد حاضر کے علمی اسلوب میں ہوں گی اور وقت کی مختلف اہم زبانوں میں شائع کی جائیں گی۔

اسلامی مرکز کے تحت قائم شدہ مکتبہ الرسالہ نے جو کتابیں شائع کی ہیں ان میں سے الاسلام (۲۰۶ صفحات) اور ظہور اسلام (۱۹۹ صفحات) ہیں۔ یہ کتابیں اصلاً اردو زبان میں ہیں۔ توقع ہے کہ ان کتابوں کا مکمل ترجمہ عربی اور انگریزی زبانوں میں ۱۹۸۱ میں شائع ہوجائے گا۔ اسلامی مرکز اپنی سرگرمیوں کو مزید بڑھانا چاہتا ہے تاکہ وہ اسلامی تعلیمات کو ملک کے اندر اور ملک کے باہر پھیلانے کا ایک عالمی اسلامی ادارہ بن جائے۔

اس کا ذہن دوسری دوسری سمتوں میں کام کرنے لگے۔ وہ اس میں غیر ضروری موشگافیاں پیدا کرے۔ وہ دنیوی مفادات اور گردو پیش کی مصلحتوں کو اہمیت دینے لگے۔ یہ دیکھے کہ بات اپنے ذوق کے مطابق ہے یا اپنے ذوق کے خلاف۔ یہ احساس اس کو مغلوب کرلے کہ اگر میں نے اس کو مان لیا تو میں چھوٹا ہو جاؤں گا، وغیرہ۔ ان دونوں راستوں میں سے پہلا راستہ عقل کا راستہ ہے اور دوسرا راستہ گندگی کا راستہ۔ جب کوئی شخص خدا کی دی ہوئی عقل سے کام نہیں لیتا تو گویا وہ شیطان کو اپنے اندر گھسنے کا موقع دے رہا ہے۔ ایسے شخص کو شیطان اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے۔ وہ دلائل سے ثابت شدہ بات کو اس کی نظر میں گھٹاتا ہے اور دوسری دوسری باتوں کو اسے اہم بنا کر دکھاتا ہے۔ شیطان اپنی تمام گندگیوں کے ساتھ اس کے دل و دماغ میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ اس کو فطرت کے سیدھے راستہ سے ہٹا کر خود اپنے بنائے ہوئے ٹیڑھے راستوں میں بھٹکا دیتا ہے۔

خدا کی طرف سے ہدایت کی توفیق اسی شخص کو ملتی ہے جو خدا کے تخلیقی ڈھانچہ کی پیروی کرے۔ خدا کا تخلیقی ڈھانچہ کیا ہے۔ خدا نے ہر آدمی کے اندر ضمیر رکھ دیا ہے جو ہر معاملہ کے وقت اندر سے اشارہ کرتا رہتا ہے کہ کون سا راستہ فطرت کے مطابق ہے اور کون سا فطرت کے خلاف۔ اب خدا کے تخلیقی ڈھانچہ کی پیروی یہ ہوگی کہ جس چیز کے بارے میں آدمی کے ضمیر کے اندر کھٹک پیدا ہو اس کو وہ چھوڑ دے اور جس چیز پر اس کا ضمیر مطمئن ہو اس کو پکڑ لے۔ اسی طرح ہر آدمی کے اندر عقل ہے جو اس بات کو سمجھنے کی خداداد صلاحیت رکھتی ہے کہ کیا چیز ثابت شدہ ہے اور کیا چیز ہے جس کے حق میں کوئی حقیقی ثبوت نہیں۔ اب خدا کے تخلیقی ڈھانچہ کی پیروی یہ ہوگی کہ آدمی ثابت ہونے والی بات کو لے لے اور جس بات کے حق میں ثبوت نہیں ہے اس کو چھوڑ دے۔ اسی طرح ہمارے گرد و پیش خدا کی ایک پوری دنیا ہے جو کامل درجہ صحت کے ساتھ چل رہی ہے۔ جب بھی ہم کسی معاملہ میں کوئی رویہ اختیار کرنا چاہتے ہیں تو کائنات کا نظام خاموش زبان میں بتاتا ہے کہ یہ رویہ اس کے مقررہ نظام کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ اب خدا کے تخلیقی ڈھانچہ کی پیروی یہ ہوگی کہ آدمی جس رویہ کو خدا کی وسیع تر کائنات کے مطابق پائے اس کو اختیار کرے اور جو رویہ اس کے خلاف ہو اس کو چھوڑ دے۔

قرآن اسی حق پرستانہ زندگی کو پانے اور اس پر چلنے کے لئے ایک رہنما کتاب ہے۔ قرآن کارخانۂ عالم کی گائڈ بک ہے۔ اگر آدمی سنجیدہ ہو اور فطرت کی آواز پر دھیان دینے کے لئے تیار ہو تو وہ اس کتاب کی رہنمائی میں ضرور حقیقت کو پالے گا۔ اور جب آدمی سنجیدہ نہ ہو تو الفاظ کی زبان اس پر کام نہیں کرتی۔ ایسا شخص تو اسی وقت جاگتا ہے جب کہ حقیقت پردہ پھاڑ کر عیاناً اس کے سامنے آجائے۔

فطرت سے انحراف

گریٹا گاربو (Greta Garbo) کسی زمانہ میں ہالی وڈ کی مشہور ترین ایکٹریس تھی۔ مگر اب بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے بعد فلمی دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کے پرانے دوست بھی سب کے سب اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۰ کو اس نے اپنی ۷۵ ویں سال گرہ تنہا منائی۔ گریٹا گاربو کے سوانح نگار نے اس سے پوچھا کہ کیا آپ کو اس بات پر افسوس ہے کہ آپ نے شادی نہیں کی جس کی وجہ سے آج آپ کی تنہائیوں کا کوئی ساتھی نہیں۔ گریٹا گاربو نے غم گین لہجہ میں جواب دیا: میرا خیال ہے کہ میرا شادی نہ کرنا ایک غلطی تھی (ہندستان ٹائمس ۲۱ ستمبر ۱۹۸۰)

(Not getting married was a mistake)

خدا نے انسان کو جوڑے کی صورت میں بنایا ہے۔ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے سے مل کر انسانیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ پھر زندگی کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہے کہ اس ملاپ کا مستقل ہونا بھی ضروری ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے خدا نے نکاح کا طریقہ مقرر کیا ہے۔ نکاح ایک مرد اور ایک عورت کو مستقل خاندانی تعلق میں جوڑتا ہے۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے سے جڑ کر خود اپنے تقاضوں کی تکمیل بھی کرتے ہیں اور سماج کے تقاضوں کی بھی۔

مغربی زندگی میں آزادی کے غلط تصور کا یہ نتیجہ ہوا کہ شادی کو بندھن خیال کیا جانے لگا۔ اس کے نتیجہ میں جو آزادانہ زندگی پیدا ہوئی اس نے بے شمار خاندانی اور سماجی مسائل پیدا کر دئے۔ انھیں میں سے ایک وہ ہے جس سے گریٹا گاربو جیسی عورتیں دوچار ہوتی ہیں۔ جوانی کی عمر میں جب کہ ان کے اندر مردوں کے لئے کشش ہوتی ہے وہ ہر جگہ رونق محفل بنی رہتی ہیں۔ ان کو روزانہ ایسے تفریحی پروگرام ملتے رہتے ہیں جن میں مصروف رہ کر وہ اپنے صبح و شام گزارتی رہیں۔ مگر جب عمر زیادہ ہوتی ہے اور وہ جنس مخالف کے لئے اپنی نسوانی کشش کھو دیتی ہیں تو اچانک ان کو معلوم ہوتا ہے کہ ماضی کی تمام سرگرمیاں محض مصنوعی سرگرمیاں تھیں۔ دوستیاں اور تعلقات اس طرح چھوٹ جاتے ہیں جیسے خزاں کے موسم میں درخت کے پتے۔ اس وقت انھیں معلوم ہوتا ہے کہ مستقل وفاداری کو بندھن سمجھنا ان کی کتنی بڑی غلطی تھی۔ ان پر یہ کھلتا ہے کہ اب تک وہ خوابوں کی دنیا میں تھیں۔ ان کی رونقوں سے بھری زندگی اچانک ایک سونے گھر میں تبدیل ہو جاتی ہے جہاں ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہوتی کہ کتے اور بلی پال کر دل بہلاتی رہیں۔ ان کا کوئی رفیق حیات نہیں ہوتا جو خوشی اور غم میں ان کا شریک ہو۔ ان کے سامنے اپنے بچوں کا وہ "باغ" نہیں ہوتا جس کی صورت میں ایک آدمی اپنی ختم ہوتی ہوئی زندگی کے تسلسل کو دیکھ کر مطمئن ہوتا ہے۔ ان کے آس پاس کوئی "اپنا" نہیں ہوتا جس کو اپنی زندگی کا اثاثہ سونپ کر وہ سمجھیں کہ انھوں نے دنیا میں بے کار محنت نہیں کی۔ ان کو گوشت پوست کی کوئی ایسی دنیا نظر نہیں آتی جس کو وہ اپنا سمجھیں اور جو انھیں اپنا سمجھے۔ ایسے لوگ بھری ہوئی کائنات میں بالکل تنہا ہو کر رہ جاتے ہیں اور یقیناً کسی آدمی کے لئے تنہائی سے بڑی کوئی سزا نہیں۔

اختلاف کا نقصان

پندرھویں صدی میں عرب تاجر جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں کی تجارت پر چھائے ہوئے تھے۔ اس زمانہ میں ہندوستان اور بیرونی دنیا کے درمیان تمام بری اور بحری راستوں پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ وہ ان کے ذریعہ نہایت کامیاب تجارت کر رہے تھے۔ مگر سولھویں صدی کے آغاز سے تاریخ بدلنا شروع ہوئی۔ واسکوڈی گاما (۱۴۶۰-۱۵۲۴) نے یورپ اور ہندوستان کے درمیان بحری راستہ دریافت کیا۔ اس کے بعد پرتگالی تاجروں کے قافلے اس علاقہ میں داخل ہونے لگے۔ دھیرے دھیرے انھوں نے ہندوستان کی بیشتر ساحلی تجارت پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں کو اپنی ہوشیاری سے اس علاقہ کی تجارت سے بے دخل کر دیا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کے گرم مسالے بیرونی ملکوں میں بہت اچھی قیمت پر فروخت ہوتے تھے۔ پرتگالی جہاز یہاں سے سیاہ مرچ، دارچینی، لونگ، جادتری وغیرہ قیمتی پیداوار اپنے جہازوں میں بھر بھر کر لے جانے لگے اور مسلمانوں کے پاس صرف ڈلی اور ناریل کی معمولی تجارت رہ گئی۔ مسلمان صرف انھیں چیزوں کی تجارت کر سکتے تھے جن کو پرتگالی لائق اعتنا نہ سمجھتے تھے۔ تمام اہم اور فائدہ بخش چیزوں کی تجارت پرتگالیوں نے اپنے قبضہ میں لے رکھی تھی۔ پرتگالیوں نے اپنی ہوشیاری سے ساحلی راجاؤں کو اپنا مطیع بنا کر بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ اسی طرح ملاکا، اشی، دناسری، وغیرہ خشکی کے راستے انھوں نے عربوں کے لئے بند کر دئے۔ حتیٰ کہ ان کے امان اور ان کے اجازت نامہ کے بغیر کوئی اس علاقہ میں بحری سفر نہیں کر سکتا تھا۔ مسلمانوں کی معمولی تجارت بھی پرتگالی جہازوں کے ذریعہ ہوتی تھی۔

مسلمانوں کی تجارتی کامیابیوں کے جلو میں اس علاقہ میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔ خصوصاً ساحلی علاقے بہت بڑے پیمانہ پر اسلام کی دعوت و تبلیغ کا مرکز بن گئے تھے۔ عین اس وقت اس علاقہ کی سیاست اور اقتصادیات پر پرتگالیوں کا قبضہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اسلامی سرگرمیاں ٹھپ ہو گئیں۔ اسلام کی اشاعت کا کام رک گیا۔ ایک تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔

مسلمانوں کے اوپر پرتگالیوں کی فتح کا راز کیا تھا، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں میں نااتفاقی پھیلی ہوئی تھی۔ جب کہ پرتگالی حد درجہ اتفاق و اتحاد کے ساتھ کام کرتے تھے، سیاح زین الدین نے لکھا ہے:

"پرتگالی بڑے ہوشیار، فریبی اور اپنی مصلحت کے بڑے ماہر ہیں۔ ضرورت کے وقت اپنے دشمنوں کی خوشامد کرنے میں بھی ان کو عار نہیں ہوتا۔ ان میں بڑا اتحاد ہے۔ وہ اپنے سرداروں کے حکم سے کبھی سرتابی نہیں کرتے۔ اپنے دارالحکومت سے دوری کے باوجود ان میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا۔ آج تک یہ سننے میں نہیں آیا کہ انھوں نے اقتدار کے حصول کے لئے اپنے کسی بڑے آدمی کو قتل کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تعداد کی کمی کے باوجود وہ مالابار وغیرہ کے راجاؤں کو اپنا مطیع بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ ان کی فوج اور ان کے سرداروں میں بہت اختلاف ہے۔ ان کا حصول اقتدار کا جذبہ اتنا بڑھا ہوا ہے کہ اس کی خاطر وہ باہم ایک دوسرے کو قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ (تاریخ الحضارۃ العربیہ از محمد کرد علی شامی)

اعلیٰ کردار کی ایک مثال

مشرقی بنگال مسلم دور حکومت میں دہلی کی مرکزی سلطنت کے ماتحت تھا۔ درمیان میں کئی بار ایسا ہوا کہ وہاں کا گورنر مرکز سے باغی ہو کر خود بادشاہ بن بیٹھا۔ انھیں میں سے ایک سلطان غیاث الدین ہے جس نے دہلی کی مرکزی سلطنت سے بغاوت کر کے مشرقی بنگال میں خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔ اس زمانہ میں ڈھاکہ کا شہر وجود میں نہ آیا تھا اور حکومت کا مستقر سونار گاؤں تھا۔ اس مسلمان بادشاہ کا ایک واقعہ ایک انگریز مورخ ایف بی بریڈلے برٹ (Bradley Birt) نے نقل کیا ہے۔ اس کی کتاب DACCA: The Romance of one Eastern Capital کے دوسرے اڈیشن مطبوعہ لندن ۱۹۱۴ میں یہ واقعہ اس طرح درج ہے:

"ایک دن شاہ غیاث الدین تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا۔ اتفاق سے اس کے تیر سے ایک بیوہ عورت کا اکلوتا لڑکا زخمی ہو گیا۔ بیوہ عورت کو معلوم نہ تھا کہ یہ تیر بادشاہ نے چلایا ہے۔ وہ قاضی شرع کے پاس فریاد لے کر گئی۔ قاضی نے اپنی فراست سے اندازہ لگایا کہ یہ تیر بادشاہ کا ہی چلایا ہوا تھا۔ وہ دیر تک مذبذب رہا کہ بادشاہ کے خوف اور خوف خدا میں سے کس کو ترجیح دوں۔ بالآخر خدا کا خوف قاضی صاحب پر غالب آیا اور انھوں نے بادشاہ کو جواب دہی کے لئے اپنی عدالت میں طلب کیا۔ بادشاہ کو جونہی بلاوا پہنچا وہ بلا کسی تامل کے قاضی کی عدالت کی طرف روانہ ہوا۔ لیکن اس نے اپنے کپڑوں میں ایک چھوٹی سی تلوار بھی چھپا لی۔ قاضی صاحب نے عدالت میں بادشاہ کا کسی قسم کا احترام نہیں کیا۔ اور معاملہ کی جانچ کے بعد حکم دیا کہ وہ اس بیوہ عورت کو معقول مالی معاوضہ دے کر اس سے اپنا قصور معاف کرائے بادشاہ نے بے چون و چرا اس حکم کی تعمیل کی اور بیوہ عورت کو ایک بڑی رقم پیش کر کے اس سے اپنا قصور معاف کرایا۔ مقدمہ ختم ہونے کے بعد قاضی صاحب اپنی کرسی عدالت سے اٹھ کر بادشاہ کے قدموں پر گر پڑے۔ بادشاہ نے فوراً انھیں اٹھایا اور وہ تلوار ان کو دکھائی جو وہ اپنے کپڑوں میں چھپائے ہوئے تھا اور کہا کہ یہ تلوار میں اس لئے لایا تھا کہ اگر تم میرے اس مقدمہ میں شریعت کے حکم سے ذرا بھی روگردانی کروگے تو میں تمھارا سر اڑا دوں گا۔ لیکن تم نے شرع کے مطابق فیصلہ صادر کرنے میں میرا کوئی خوف نہیں کیا اس کے لئے تم انتہائی اعزاز کے مستحق ہو (صفحہ ۵۵-۵۶)

شریعت کی پابندی کی یہ مثال قائم کرنے والے بادشاہ کا مقبرہ اس کتاب کی اشاعت کے وقت تک سونار گاؤں میں موجود تھا (صدق جدید ۲۰ مئی ۱۹۸۰)

کسی قوم کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اس کے اندر اس قسم کے زندہ افراد موجود ہوں۔ زندہ افراد کی موجودگی سے قوم زندہ ہوتی ہے اور زندہ افراد نہ ہونے سے قوم مرجاتی ہے۔ زندہ آدمی وہ ہے جو مصلحت کے مقابلہ میں اصول کو اہمیت دیتا ہو۔ جو اپنی غلطی پر عذرات اور توجیہات کا پردہ ڈالنے کے بجائے اس کو مان لیتا ہو۔ جو ذاتی شکایت کو نظر انداز کر دے نہ کہ اس کی بنا پر کسی کو اپنا دشمن سمجھ لے۔ جو اس وقت بھی ایک انسان کی قدر کر سکے جب کہ اس نے اس کے خلاف کارروائی کی ہو۔

اپنے خلاف

۱۹۷۱ میں آسٹریلیا کے وزیر اعظم اور پارلیمنٹری لبرل پارٹی کے صدر مسٹر جان گارٹن تھے۔ پارٹی میں ان کے خلاف شکایت پیدا ہوئی۔ اس کے بعد پارٹی کی پارلیمنٹری باڈی کی میٹنگ ہوئی جو قاعدہ کے مطابق انھیں کی صدارت میں تھی۔ میٹنگ میں ان کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز پیش ہوئی۔ اس وقت حاضر ممبران ۶۶ تھے۔ ووٹ جب لئے گئے تو دونوں طرف ۳۳، ۳۳ ووٹ پڑے۔ یعنی تحریک کے موافق اور مخالف دونوں برابر ہو گئے۔ اب فیصلہ صدر کے ایک زائد ووٹ سے ہونا تھا۔ صدر نے اپنا زائد ووٹ استعمال کیا۔ مگر خود اپنے خلاف۔ اس طرح انھوں نے خود اپنے ہی ووٹ سے شکست کھائی۔ اس کے بعد وہ پارٹی کی صدارت سے علیحدہ ہو گئے اور کہا: جب ممبران کی اتنی بڑی تعداد صدر کے خلاف ہے تو صدر، صدر باقی رہنے کے قابل نہیں۔ (الجمعیۃ ویکلی ۲۰ جولائی ۱۹۷۳)

۲۔ انیسویں صدی کے وسط کی بات ہے۔ پھلواری شریف (بہار) میں دو رئیس رہتے تھے۔ ایک کا نام قاضی غلام امام اور دوسرے کا قاضی مخدوم عالم تھا۔ دونوں رشتہ دار تھے۔ کسی وجہ سے دونوں میں جھگڑا ہو گیا اور مقدمہ بازی کی نوبت آگئی۔ مخدوم عالم سرکاری ملازمت میں تھے۔ اسی دوران ان کا تبادلہ دور کے مقام پر ہو گیا جہاں سے پٹنہ کی عدالت میں تاریخوں پر حاضری سخت مشکل تھی۔ انھوں نے چاہا کہ اپنے مقدمہ کی پیروی کے لئے کسی کو مقرر کر دیں۔ کافی سوچنے کے بعد جب کوئی موزوں آدمی سمجھ میں نہ آیا تو وہ اپنے فریق مخالف قاضی غلام امام کے پاس گئے اور کہا کہ میں تبدیل ہو کر ایسی جگہ جا رہا ہوں کہ مقدمہ کی پیروی خود نہیں کر سکتا۔ یہ تمام کاغذات آپ کے حوالے ہیں۔ اب آپ ہی میری طرف سے مقدمہ کو دیکھیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے قاضی غلام امام کو اپنے مقدمہ کے کاغذات دئے اور سفر پر روانہ ہو گئے۔

قاضی غلام امام کے لئے اس اعتماد کو مجروح کرنا ناممکن تھا جو ان کے فریق نے ان پر کیا تھا۔ انھوں نے مخدوم عالم کے مقدمہ کی پیروی کا کام اپنے ذمہ لیا اور خود اپنے کاغذات کسی دوسرے کے حوالے کر دئے۔ اب صورت یہ ہوئی کہ قاضی غلام امام کے اپنے مقدمہ کی پیروی تو دوسرا شخص کر رہا ہے اور وہ خود اپنے فریق مخالف قاضی مخدوم امام کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کر رہے ہیں۔ اور یہ سب مصنوعی طور پر نہیں بلکہ حقیقی طور پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود ہار گئے اور ان کے مخالف قاضی مخدوم عالم جیت گئے (حسب روایت جعفر شاہ پھلواری، مطبوعہ زندگی ستمبر ۱۹۸۰)

یہ بہادری اور اعلیٰ ظرفی کی بات ہے کہ آدمی اصول کے آگے جھک جائے، نہ کہ وہ اصول کو خود اپنے آگے جھکائے۔ وہ نقصان اور فائدہ اور عزت اور بے عزتی کے خیالات سے اوپر اٹھ کر اصول کے تقاضوں کو اپنا لے۔ اسی طرح یہ آدمی کی بہادری اور اعلیٰ ظرفی ہے کہ اگر اس کا مخالف بھی اس کے اوپر اعتماد کرے تو وہ اس کے اعتماد کو مجروح نہ کرے۔

کام پر انعام

روس کے سابق وزیر اعظم مسٹر خروشچیف اور مسٹر بلگانن ۱۹۵۶ میں ہندستان آئے تھے۔ مسٹر خروشچیف کو بتایا گیا کہ دہلی یونیورسٹی نے طے کیا ہے کہ آپ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دے۔ انھوں نے طنزیہ انداز میں کہا:

In Russia we have to work for it.

روس میں اس کے لئے ہمیں کام پیش کرنا پڑتا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۱۲ جون ۱۹۸۰) کسی قوم کی زندگی کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اس میں خطابات اور مناصب اور اعزازات حقیقی کام کی بنیاد پر دئے جاتے ہوں نہ کہ سیاست اور خوشامد کی بنیاد پر۔ اہلیت کی بنیاد پر جب کسی کو کوئی اعزاز ملتا ہے تو لوگ اس کو ایک ہونے والے واقعہ کی حیثیت سے قبول کر لیتے ہیں۔ لوگوں کے اندر یہ جذبہ ابھرتا ہے کہ ہم بھی اسی طرح محنت کریں تاکہ ہم کو بھی یہ مقام ملے۔ اس کے برعکس جب اہلیت کے بغیر کسی کو کوئی اعزاز دیا جائے تو لوگوں کے اندر اس کا سخت ردعمل ہوتا ہے۔ اب ایک دوسرے کے بارے میں بے اعتمادی کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ محنت کر کے پانے کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ اس کے بجائے اِدھر اُدھر کی تدبیروں سے حاصل کرنے کا جذبہ فروغ پاتا ہے اور بالآخر پورے سماج کی فضا خراب ہو جاتی ہے۔

اہلیت کے بجائے دوسری بنیادوں پر انعام دینے کا رواج خود ہمارے مذہبی اداروں میں بھی چل پڑا ہے۔ آج ایک مذہبی ادارہ میں سب سے بڑی لیاقت نیازمندی ہے اور سب سے بڑی نااہلی یہ ہے کہ آدمی نیازمند بن کر نہ رہتا ہو۔ ایک آدمی اگر اپنے گروپ کا ہے تو اس کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کیا جائے گا اور اگر وہ اپنے گروپ کا نہیں ہے تو اس کے ساتھ تنگ ظرفی کا معاملہ ہوگا۔ کوئی شخص تنقیدی مزاج رکھتا ہو تو ان اداروں میں اس کی کوئی قیمت نہ ہوگی اور جو آدمی ہاں میں ہاں ملاتا ہو وہ ہر قسم کے اعزاز کا مستحق سمجھا جائے گا خواہ وہ کتنا ہی نااہل کیوں نہ ہو۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے تمام اداروں میں علم اور محنت کی فضا ختم ہو گئی ہے۔ جہاں مقام حاصل کرنے کے لئے محنت اور قابلیت غیر اہم چیزیں بن جائیں، وہاں کسی کے اندر محنت اور قابلیت کا شوق کیوں پیدا ہوگا۔ آدمی اسی چیز پر اپنی توجہ لگاتا ہے جس کو وہ اپنے لئے عزت اور ترقی کا زینہ سمجھتا ہو۔ جب عزت اور ترقی محنت اور قابلیت کے بغیر سستی چیزوں کے ذریعہ مل رہی ہو تو کون احمق ہوگا جو سستی چیز کو چھوڑ کر مہنگی چیز کا خریدار بنے۔

بلند اخلاقی کی ایک مثال

۲۷ ستمبر ۱۹۷۳ کی بات ہے۔ پنڈی جوئلرس (چاندنی چوک دہلی) میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ سردار بشن سنگھ ہیں۔ ۲۸۔ بی ساؤتھ ایکسٹنشن پارٹ ۲، نئی دہلی میں رہتے ہیں۔ وہ ضلع راولپنڈی کے باشندے تھے۔ تقسیم کے بعد یہاں چلے آئے۔ راولپنڈی سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر گوجرخاں ایک قصبہ ہے، وہاں ان کی زمینداری تھی۔ اسی کے ساتھ وہ اس وقت آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔

انھوں نے اپنے زمانہ کے انگریز افسران کے بہت سے واقعات بتائے۔ ان میں سے ایک واقعہ مسٹر مارسڈن (Marsdon) کا تھا جو اس وقت راولپنڈی میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ ۱۹۴۳ کا واقعہ ہے، مسٹر مارسڈن سردار صاحب کے قصبہ میں آئے۔ ان کو گوجرخان کی تحصیل کا معائنہ کرنا تھا۔ تحصیل جانے سے پہلے سردار صاحب سے ملاقات ہوئی۔ سردار صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیے۔ مسٹر مارسڈن نے دعوت قبول نہ کی اور وہ تحصیل چلے گئے۔ کچھ دیر بعد دوبارہ مسٹر مارسڈن کی کار سردار صاحب کے مکان کے سامنے رکی۔ وہ باہر نکلے تو سردار صاحب نے کہا: اگر آپ نے میری دعوت قبول کر لی ہوتی تو اتنی دیر میں میں نے کھانا تیار کرا لیا ہوتا اور آپ کھانا کھا کر یہاں سے جاتے۔ انگریز ڈپٹی کمشنر نے اب بھی سردار صاحب کی کھانے کی دعوت قبول نہ کی۔ البتہ اپنی لڑکی کو جو اس وقت ساتھ تھی سردار صاحب کے مکان پر چھوڑ دیا اور کہا کہ یہ کل تک آپ کے یہاں رہے گی۔ آپ جو کچھ کھلانا چاہتے ہیں اس کو کھلائیے۔ سردار صاحب حیرت میں تھے کہ یہ معما کیا ہے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب خود تو ایک وقت کھانے کے لئے تیار نہیں ہیں اور لڑکی کو کئی وقت کے لئے چھوڑے جا رہے ہیں۔ ان کو متعجب دیکھ کر مسٹر مارسڈن نے کہا: اصل بات یہ ہے کہ راولپنڈی میں میرے کچھ عزیز آئے ہوئے ہیں مجھے وہاں پہنچ کر ان کے ساتھ کھانا کھانا ہے، کیونکہ میں ان سے وعدہ کر چکا ہوں۔ مگر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ لوگوں پر یہ تاثر ہو کہ ڈپٹی کمشنر صاحب یہاں آئے اور انھوں نے آپ کے مکان پر کھانا نہیں کھایا۔ اس سے آپ کی عزت پر اثر پڑے گا۔ آپ کی عزت کو بچانے کے لئے میں لڑکی کو آپ کے یہاں چھوڑے جا رہا ہوں:

I want to keep your prestige

بڑا آدمی وہ ہے جو دوسرے کے بارے میں بھی اتنا ہی حساس ہو جتنا کوئی شخص اپنے بارے میں ہوتا ہے۔ جو دوسرے کی بے عزتی کو اپنی بے عزتی سمجھے اور دوسرے کی عزت کو اپنی عزت۔

علم کی واپسی

قدیم ترین زمانہ سے انسانی فکر پر مذہب کا غلبہ تھا۔ اسی کے زیر اثر فلسفہ بنا۔ فلسفہ کا رجحان ہمیشہ یہ رہا کہ عالم کی توجیہہ کسی نہ کسی طرح روح یا نفس کی اصطلاحات میں کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفہ کی بنیاد ہمیشہ تصوریت (Idealism) پر رہی ہے۔ تاہم سائنس کے جدید دور میں ایک خاص عرصہ تک انسانی فکر پر مادیت کا غلبہ ہو گیا۔ قدیم زمانہ میں انسانی فکر کے دو دھارے نہیں تھے۔ مگر موجودہ زمانہ میں انسانی فکر تصوریت اور مادیت کے دو دھاروں میں تقسیم ہو گیا۔ اب موجودہ صدی میں یہ فاصلہ بڑی حد تک ختم ہو گیا ہے۔ وائٹ ہڈ کے الفاظ میں "فلسفہ سائنس سے دور ہو گیا تھا۔ مگر اب ذہن اور مادہ کا فرق جیسے جیسے مٹ رہا ہے، فلسفہ دوبارہ اپنی پرانی اہمیت کی طرف واپس آتا جا رہا ہے" Science and the Modern world,

پروفیسر ہیزن برگ (۷۶–۱۹۰۱) کا شمار جدید طبیعیات کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ "انیسویں صدی کے سائنس دانوں کے نزدیک یہ ممکن تھا کہ نفسیاتی مظاہر کی کوئی توجیہہ دماغ کی طبیعیات اور کیمیا کے ذریعہ کی جا سکے۔ مگر اب کوانٹم نظریہ کے آنے کے بعد اس کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ بلکہ کوانٹم نظریہ کے متعلق یہ کہنا صحیح ہو گا کہ وہ فطرت (Nature) کی کامل خارجی تشریح کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ اس کے بعد ناممکن ہو گیا ہے کہ فلسفہ اور سائنس اپنی متشدد غیر جانب داری (Armed Neutrality) کو برقرار رکھ سکیں۔ ان کو اب یا تو دوست بن جانا چاہئے یا دشمن۔ اور ان کے درمیان دوستی اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ سائنس وہ امتحان پاس کرے جو فلسفہ اس سے اس کے مقدمات کی بابت لے گا:

They cannot be friends unless science can pass the examination which philosophy must set to its premises.

Physics & Philosophy, pp. 95-96

نیوٹن (۲۷–۱۶۴۲) کا ظہور تاریخ میں ایک نئے فکری دور کا آغاز تھا۔ اس کی تحقیق یہ تھی کہ کائنات اپنے متعین قوانین کے تحت عمل کرتی ہے، کچھ طبیعی اسباب ہیں جو واقعات عالم کے پیچھے کارفرما ہیں۔ حتی کہ کائنات کا ماضی، حال اور مستقبل سب علت و معلول کی مسلسل کڑیوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ نیوٹن اگرچہ ذاتی طور پر خدا کو مانتا تھا، مگر بعد کے مفکرین نے کہا کہ جب کائنات کے متعلق معلوم ہو گیا کہ وہ معلوم طبیعی قوانین کے تحت حرکت کرتی ہے تو پھر ایک نامعلوم خدا کو ماننے کی کیا ضرورت۔ اس طرح افکار کی دنیا میں اصول تعلیل (Principle of Causation) کا رواج ہوا جو بعد کو پوری طرح خدا اور مذہب کا بدل سمجھ لیا گیا۔ نیوٹن پہلا شخص ہے جس نے اصول تعلیل کا عملی انطباق طبیعی دنیا پر کیا۔

ڈارون (۱۸۸۲–۱۸۰۹) پر منکشف ہوا کہ یہی اصول تعلیل حیاتیات کی دنیا میں بھی کام کر رہا ہے۔

یعنی انسان کی پیدائش اچانک ایک روز کسی خالق کے حکم سے نہیں ہوئی، بلکہ وہ قوانین ارتقاء کے تحت لمبے عمل کا آخری نتیجہ تھی۔ ڈارون بذات خود اس عملِ ارتقاء کو ایک خالق (Creator) کا منصوبہ سمجھتا تھا۔ مگر بعد کے مفکرین نے خالق کے تصور کو ڈارون کا ذاتی عقیدہ قرار دیا اور نظریہ ارتقاء کو الحاد کی سب سے بڑی دلیل کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا۔ ان کے نزدیک اس دنیا کا خالق "ارتقا" تھا نہ کہ کوئی "خدا"

مارکس (۱۸۱۸ – ۸۳) وہ شخص ہے جس نے اس اصولِ تعلیل کو انسان کی سماجی زندگی پر منطبق کیا اور کہا کہ انسانی سماج اور انسانی تاریخ بھی ایک ناگزیر مادی قانون کے تحت سفر کر رہے ہیں۔ سماجی سفر میں جدلیاتی عمل (Dialectical Process) کی کارفرمائی کا تصور اگرچہ اس نے ہیگل (۱۷۷۰ – ۱۸۳۱) سے لیا تھا جو اس عمل کے پیچھے ایک روح عالم (ورلڈ اسپرٹ) کو مانتا تھا۔ مگر مارکس نے روح عالم کے بجائے معاشی قوانین کو جدلیاتی عمل کا ہیرو قرار دیا اور اس طرح ہیگل کی تصوریت (آئیڈیلزم) کو خالص مادیت (مٹیریلزم) میں بدل ڈالا۔

اس طرح تقریباً ڈیڑھ سو سال کے مسلسل عمل سے وہ فکر بنا جس کو جدید الحاد کہا جاتا ہے۔ اس الحاد کا کہنا تھا کہ اب علمی طور پر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اس کائنات کا خالق اور مالک کوئی خدا نہیں ہے بلکہ اسباب و علل (Cause and Effect) کا ایک طبیعی قانون ہے۔ اسی طبیعی قانون نے لمبے عمل کے بعد عالم کو بنایا۔ اسی قانون کے ذریعہ ارتقائی مراحل سے گزر کر انسان تیار ہوا۔ اور پھر یہی وہ قانون ہے جو سماجی عمل کے اندر کارفرما ہے اور انسانی سماج کو غیر ترقی یافتہ حالت سے ترقی یافتہ حالت کی طرف لے جا رہا ہے۔

مگر بیسویں صدی کے آتے ہی ان خیالات کی علمی بنیاد بالکل ڈھ گئی۔ اس صدی کے آغاز میں پلانک اور آئن سٹائن اور ہیزن برگ اور ڈیراک اور ردرفورڈ نے جو تحقیقات کیں اس کے بعد علم کا وہ پورا ڈھانچہ بدل گیا جس کے تحت مذکورہ ملحدانہ مفروضات قائم کرلئے گئے تھے۔ اب اصول تعلیل کا وہ نظریہ بے بنیاد ثابت ہو گیا جس کو انیسویں صدی میں خدا کا علمی بدل سمجھ لیا گیا تھا۔ برکلے کی تصوریت (آئیڈیلزم) سو برس کی معزولی کے بعد، فلسفہ میں دوبارہ واپس آگئی۔

انیسویں صدی گویا دنیا میں الحاد کی صدی تھی۔ یہی صدی ہے جس میں عالم فطرت کے بارے میں کثرت سے نئے حقائق دریافت ہوئے۔ یہ حقائق اگرچہ بذات خود مذہب سے متصادم نہیں تھے۔ مگر ملحد فلاسفہ نے اپنے تعبیری اضافہ سے ان کے اندر الحادی عناصر ڈھونڈ لئے۔ اب ایک پورا نظام فکر ترتیب دیا گیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ سائنسی دریافتوں نے مذہبی صداقت کی تردید کر دی ہے۔ اب انسان کو فکری یا عملی اعتبار سے مذہب کی کوئی ضرورت نہیں، وہ سب کچھ جو مذہب دیتا تھا یا جس کے لئے مذہب کو ضروری سمجھ لیا گیا تھا، اب انسان اس کو زیادہ بہتر طور پر سائنس کے ذریعہ حاصل کر سکتا ہے۔ مگر بیسویں صدی میں علمی طور پر اس دعوے کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ بعد کی تحقیقات اور بعد کے تجربات نے ایک ایک کر کے ان تمام باتوں کی تردید کر دی جن کی امید سائنس سے قائم کرلی گئی تھی۔

کہا گیا تھا کہ دنیا کے وجود اور اس کی کارکردگی کی توجیہہ کے لئے اب خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ سائنس کی دریافتیں اس کی توجیہہ و تشریح کے لئے بالکل کافی ہیں ۔ مگر جدید معلومات اور تجربات نے انسان کو یہ اقرار کرنے پر مجبور کیا ہے کہ خدا کو مانے بغیر اس دنیا کی توجیہہ ممکن نہیں ۔ حتیٰ کہ خدا اگر موجود نہ ہو تب بھی ہمیں اپنے مسئلہ کے حل کے لئے خدا کو ایجاد کرنا ہوگا :

If God did not exist, it would be necessary to invent Him

کہا گیا تھا کہ حقیقت اعلیٰ کا ادراک کرنے کے لئے انسانی علم سے اوپر کسی علم (الہام) کی ضرورت نہیں ، سائنس تمام حقیقتوں کو جاننے کے لئے بالکل کافی ہے ، مگر آج سائنس داں متفقہ طور پر یہ اعلان کر رہے ہیں کہ سائنس ہم کو حقیقت کا صرف جزئی علم دیتی ہے :

Science gives us but a partial knowledge of reality.

کہا گیا تھا کہ انسان کے اندر ذمہ داری کا احساس اور حق شناسی کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے خدا کا خوف دلانے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ علمی اور تعلیمی ترقی خود بخود اس قسم کا احساس آدمی کے اندر پیدا کر دے گی ۔ مگر تقریباً سو سالہ تجربہ کے بعد آج کا انسان یہ اقرار کر رہا ہے کہ علم اور اخلاقی احساس لازمی طور پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے نہیں ہیں :

Knowlege and moral responsibility are not necessarily interlinked

کہا گیا تھا کہ زندگی کے عیش کے لئے کل کی جنت کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ۔ تمدنی تعمیر کے جدید امکانات جو انسان کی دسترس میں آئے ہیں وہ ہماری اسی زمین کو ہمارے لئے جنت بنا دیں گے ۔ مگر تمدنی ترقیوں کے بعد اس سے پیدا شدہ بے شمار مسائل نے انسان کو اس قدر پریشان کر دیا ہے کہ آج کا خوش نصیب انسان جس کو جدید معنوں میں تمام اسباب عیش حاصل ہیں ، وہ حیران ہو کر کہتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کو جدید معیار کے مطابق خوشگوار بنا لیا مگر اس کے باوجود میں اب بھی خوش نہیں :

My life is pleasant, Yet, I am unhappy

کائنات کی مادی تشریح کی ہر کوشش ناکام ہوگئی ۔ زندگی کو مادی ذرائع سے بامعنی بنانا ممکن نہ ہو سکا ۔ انسان نے خدا کے بغیر جینا چاہا مگر تجربات نے بتایا کہ خدا کے بغیر جینا اس کے لئے مقدر نہیں ۔ ان واقعات نے موجودہ صدی میں ایک نیا فکری انقلاب برپا کیا ہے ۔ علم کا مسافر تھوڑی مدت تک مادیت کی راہوں میں بھٹکنے کے بعد دوبارہ مذہبی حقیقت کی طرف واپس آ رہا ہے ۔ اب یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ خالص علمی اور عقلی اعتبار سے ، انسان خدا پرستانہ زندگی کے سوا کسی اور زندگی پر مطمئن ہو سکے ۔ آج کا انسان ، کم از کم امکانی طور پر ، خدا کے اتنا قریب آگیا ہے کہ اس کے اور خدا کے درمیان مصنوعی بے خبری کے سوا اور کوئی پردہ حائل نہیں

ابراہیمؑ کا ایثار

جدید اثری تحقیقات کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش ۲۱۶۰ ق م میں ہوئی۔ ۱۷۵ سال کی عمر پاکر آپ نے ۱۹۸۵ ق م میں انتقال فرمایا۔ آپ دریائے فرات کے کنارے واقع قدیم شہر ار (UR) میں پیدا ہوئے۔ اس علاقے کو پرانے زمانہ میں بابل کہا جاتا تھا، اب اس کو عراق کہتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی قوم سورج، چاند اور ستاروں کو پوجتی تھی۔ چنانچہ اس نے اس قسم کے تقریباً ۵ ہزار خدا بنا رکھے تھے۔ ان میں سورج اور چاند سب سے بڑے تھے۔ مگر حضرت ابراہیم کو اپنی قوم کے دین سے رغبت نہ ہو سکی۔ انسانی بستیوں کے بگڑے ہوئے ماحول میں اپنے لئے کشش نہ پاکر آپ بستی سے باہر نکل جاتے اور تنہائیوں میں زمین و آسمان کے نظام پر غور کرتے۔ ماحول کے فکری دباؤ سے آزاد ہو کر جب آپ سوچتے تو آپ پر نئی حقیقتوں کے دروازے کھلتے ہوئے نظر آتے۔ آپ آسمان میں یہ منظر دیکھتے کہ چاند چمکتا ہے اور پھر ماند پڑ جاتا ہے۔ ستارے نکلتے ہیں اور پھر ڈوب جاتے ہیں۔ سورج روشن ہوتا ہے اور پھر رات کی تاریکی میں چھپ جاتا ہے۔ ان واقعات پر غور کرنے کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ چیزیں جو عروج و زوال کے قانون میں بندھی ہوئی ہیں وہ خدا نہیں ہو سکتیں۔ خدا تو وہی ہو سکتا ہے جو عروج و زوال کی حد بندیوں سے اوپر ہو۔

یہ آپ کی ایثار و قربانی سے بھری ہوئی زندگی میں پہلا "ایثار" تھا۔ جوانی کی عمر میں آدمی تفریحات میں رہنا پسند کرتا ہے مگر آپ نے خاموش تنہائیوں کو اپنا دوست بنایا۔ اس زمانہ کو آدمی بے فکری میں گزار دیتا ہے مگر اس کو آپ نے سنجیدہ سوچ بچار کی بے قراری کے حوالے دیا۔ اس عمر کو پہنچ کر آدمی مادی لذتوں اور دنیوی ترقیوں کی طرف دوڑتا ہے مگر آپ نے اپنی بہترین گھڑیوں کو حقیقت کی تلاش میں لگا دیا۔ آدمی کے لئے سب سے آسان طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے آباء و اجداد کے مذہب پر چل پڑے مگر آپ نے ایک انقلابی انسان کی طرح رواج کو چھوڑ کر سچائی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ "جو ہو رہا ہے" کے مقابلہ میں آپ نے "جو ہونا چاہئے" کو ترجیح دی۔ یہ بہت بڑا نفسیاتی ایثار تھا۔ ماحول کے خلاف کسی سچائی کو اختیار کرنا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی اس کے سوا سب کچھ چھوڑنے پر اپنے کو راضی کرلے۔ جب آپ نے یہ فیصلہ کیا تو اللہ نے اس کو اس طرح قبول فرمایا کہ آپ پر سچائی کی معرفت کے دروازے کھول دئے اور آپ کو اپنی پیغمبری کے لئے چن لیا۔ یہ خدائی کام آپ کے سپرد ہوا کہ آپ اپنے وقت کے انسانوں کو اصل حقیقت سے آگاہ کردیں۔

اس کے بعد آپ کے ایثار کا دوسرا شدید ترین دور شروع ہوتا ہے۔ آپ کے زمانہ کا حکمراں نمرود (ارنمو) خدائی بادشاہ بن کر لوگوں کے اوپر حکومت کرتا تھا۔ اس زمانہ کے دوسرے بادشاہوں کی طرح نمرود نے عوام میں یہ عقیدہ بٹھا رکھا تھا کہ اس کو حکومت کرنے کا خدائی حق حاصل ہے۔ وہ کہتا تھا کہ سورج سب سے بڑا معبود ہے اور نمرود کا خاندان اس معبود کا دنیوی مظہر ہے۔ سورج جس طرح "آسمانوں پر" حکومت کر رہا ہے اسی طرح سورج کی اولاد ہونے

کی وجہ سے اس کو یہ حق ہے کہ وہ زمین پر بسنے والوں کا حاکم بنے۔

اس اعتبار سے سورج چاند کی پرستش، اس زمانہ میں محض ایک مذہبی عقیدہ نہ تھی بلکہ وہ اس وقت کی سیاست کی اعتقادی بنیاد بھی تھی۔ موجودہ زمانہ کی سیاست کی نظریاتی بنیاد عوامی حاکمیت ہے، اس زمانہ کی سیاست کی نظریاتی بنیاد خدائی حق حکمرانی تھا اور یہ خدائی حق حکمرانی اس شاہی خاندان کے لئے مخصوص سمجھا جاتا تھا جو مفروضہ معبود کی نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ حضرت ابراہیم کا گھرانا اس نظام میں خاص اہمیت رکھتا تھا کیوں کہ آپ کا باپ آذر [Terah] اس زمانہ کے بت سازی کے "کارخانہ" کا مالک تھا اور شاہی بت خانہ میں افسر اعلیٰ کا درجہ رکھتا تھا۔ وقت کے سیاسی نظام میں اس کو بہت اونچی سیاسی حیثیت حاصل تھی۔ اس کا عہدہ اس زمانہ کے لحاظ سے تقریباً وہی تھا جو آج کل کسی ایسی سیاسی پارٹی کے صدر کا ہوتا ہے جو کسی ملک میں حکمراں پارٹی کی حیثیت رکھتی ہو۔

ان حالات میں حضرت ابراہیم کے لئے بنا بنایا کامیابی کا راستہ یہ تھا کہ وہ اپنے باپ کی جگہ بنالیں، وہ قائم شدہ نظام کا ساتھ دے کر اس میں اونچا مقام حاصل کرلیں۔ مگر آپ نے دوبارہ ایثار و قربانی کے راستہ پر چلنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے اپنے باپ آزر سے صاف لفظوں میں کہا: کیا تم ستاروں کو خدا مانتے ہو اور ان کی شکلیں بنا کر ان کو پوجتے ہو۔ یہ ایک کھلی ہوئی گمراہی ہے جس میں میں تم کو اور تمھاری قوم کو دیکھ رہا ہوں (انعام ۷۴)

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے وقت کے ستارہ پرستی کے نظام سے اپنے باپ کی طرح موافقت نہیں کی بلکہ وہ اس کے خلاف داعی اور مصلح بن کر کھڑے ہو گئے۔ جس نظام میں اعلیٰ ترین عہدہ ان کا انتظار کر رہا تھا وہ خود اس نظام کو بدلنے کے علم بردار بن گئے۔ انھوں نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا کہ ناحق کو مان کر اس کے ڈھانچے میں عزت اور ترقی کے خواب دیکھیں بلکہ ناحق کی تردید اور حق کا اعلان کرنے کو انھوں نے اپنی زندگی کا مشن بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گھر سے نکال دئے گئے۔ قوم میں حقیر سمجھے جانے لگے۔ خود بادشاہ وقت بھی آپ کا دشمن بن گیا۔ کیونکہ آپ کی تحریک، اس وقت کے حالات میں بادشاہ کو اس کی سیاسی زمین سے محروم کرنے کے ہم معنی تھی۔

چلتے ہوئے نظام سے بغاوت ہمیشہ اس قیمت پر ہوتی ہے کہ اس نظام کے اندر آدمی ہر قسم کے مواقع سے محروم ہو جائے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم کے اس فیصلہ نے آپ کی پوری زندگی کو ایثار و قربانی کی زندگی بنا دیا۔ آپ گھر سے بے گھر کئے گئے۔ خاندانی جائداد میں آپ کا کوئی حصہ نہ رہا۔ باپ کی جانشینی کے لئے آپ نااہل قرار پائے۔ وقت کے سماج میں آپ کی حیثیت ایک اجنبی انسان کی ہو گئی۔ اُر کی تقریباً تین لاکھ کی آبادی میں کوئی آپ کا ساتھی نہ رہا۔ وقت کی حکومت آپ کو خطرہ کی نظر سے دیکھنے لگی۔ کیونکہ آپ اس کے پھیلائے ہوئے اِس توہماتی عقیدہ کی تردید کرتے تھے کہ سورج چاند خدائی ہستیاں ہیں اور اُن کی طرف سے کسی کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ زمین پر لوگوں کا بادشاہ بن جائے۔

حضرت ابراہیمؑ نے پرسکون زندگی کے اوپر مصیبت کی زندگی کو ترجیح دی۔ انھوں نے عوام کے درمیان مقبولیت کے مقابلہ میں عوام کے درمیان اجنبی بن جانے کو پسند کرلیا۔ وہ عہدہ اور جائداد کو چھوڑ کر خالی ہاتھ ہو جانے پر

فائغ ہو گئے۔ بادشاہ وقت کے دربار میں معزز کرسی پر بیٹھنے کے بجائے انھوں نے یہ خطرہ مول لیا کہ بادشاہ کی نظر میں وہ معتوب ہو جائیں اور حکومت کی طرف سے ان کی پکڑ دھکڑ شروع ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ قوم کے اندر بے عزت کئے گئے۔ پھر آپ کو آگ میں ڈال دیا گیا جس سے اللہ نے آپ کو بچا لیا۔ اس کے بعد آپ کو مجبور کیا گیا کہ آپ عراق کو چھوڑ دیں اور ملک کے باہر چلے جائیں۔

یہاں سے آپ کی زندگی میں ایثار و قربانی کا ایک اور شدید تر مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ ملک کے معزز ترین خاندان کا ایک فرد اس طرح بے سرو سامانی کی حالت میں اپنے وطن سے نکلا کہ اس کے ساتھ صرف اس کی بیوی سارہ تھی اور اس کا بھتیجا لوط۔ تین آدمیوں کا یہ مختصر قافلہ خانہ بدوشوں کی طرح دریائے فرات کے کنارے کنارے سفر کرتا ہوا حاران پہنچا۔ پھر بحر ابیض کے ساحلی علاقوں سے گزرتا ہوا شام اور فلسطین اور مصر تک چلا گیا۔ مگر ان مقامات کے لوگ بھی اسی قسم کے غیر خدائی معبودوں کو ماننے والے تھے جن کو نہ ماننے کے جرم میں آپ کو اپنے وطن سے نکلنا پڑا۔ آخر اللہ کی طرف سے آپ کو یہ حکم ہوا کہ تم حجاز کے بے آب وگیاہ علاقہ میں جاؤ۔ وہاں پتھروں اور خشک پہاڑوں کے درمیان خدا کا ایک گھر بناؤ۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابراہیم جب مکہ آئے تو اس وقت وہاں نہ کوئی آدمی تھا اور نہ پانی (لیس یومئذٍ بمکۃَ احدٌ ولیس بہا ماءٌ، بخاری، کتاب الانبیاء) وقت کے انسانوں نے خدا کو چھوڑ کر خود اپنے بنائے ہوئے معبودوں کی پرستش شروع کر دی تھی۔ تاہم پتھر اور پہاڑ اب بھی اپنی اصل فطری حالت پر باقی تھے۔ اس فطرت کے ماحول میں آپ کو خدا کا گھر بنانے کا حکم ہوا تاکہ کوئی بندہ جو خالص خدا کی عبادت کرنا چاہے وہ یہاں آکر خدا کی عبادت کرے۔ اب حضرت ابراہیم بحر قلزم کے ساحلی علاقوں سے گزرتے ہوئے موجودہ مکہ کے مقام پر پہنچے اور یہاں بیت اللہ کی تعمیر کی۔ وہ شخص جو عزت اور خوش حالی کی گود میں پیدا ہوا تھا اس نے حق کی خاطر تنہائی، مسافرت اور تنگ و دشوار زندگی کو اپنے لئے اختیار کر لیا۔

حضرت ابراہیم ۷۵ سال کی عمر میں عراق سے نکلے تھے۔ ۱۰ سال کی مسافرانہ زندگی کے بعد ۲۰۷۴ ق م میں آپ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام آپ نے اسماعیل رکھا (اسماعیل کے معنی سمیع اللہ کے ہیں) اس وقت آپ کی عمر ۸۶ سال تھی۔ بڑھاپے کی اولادیوں بھی آدمی کے لئے عزیز ہوتی ہے۔ اور آپ کا حال تو یہ تھا کہ تمام دوستوں اور رشتہ داروں نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور اب آپ تمام تر اپنے بیوی بچے کے سہارے پر رہ گئے تھے۔ ایسی حالت میں ہونہار لڑکا آپ کے لئے کتنا زیادہ محبوب ہو گا۔ مگر بیٹا جب بڑا ہوا اور آپ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو ایثار و قربانی کا اور بھی کڑا امتحان سامنے آگیا۔ خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ اپنے آخری سہارے سے بھی دست بردار ہو جاؤ، اپنے بیٹے کو ہماری راہ میں قربان کر دو۔ تورات کے بیان کے مطابق جب قربانی کا حکم ہوا تو اس وقت آپ کے فرزند کی عمر ۱۳ سال تھی۔

حضرت ابراہیم سو سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے کہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں۔ خواب کو عام طور پر ایک تمثیلی چیز سمجھا جاتا ہے۔ آپ اس کو کسی تعبیری مفہوم میں لے سکتے تھے۔ مگر یہ حضرت ابراہیم کے

ایثار و قربانی کے جذبہ کی انتہا تھی کہ آپ نے خواب کی کوئی تاویل نہ کی۔ آپ اس خواب کو اس کی اصلی صورت میں زیر عمل لانے کے لئے تیار ہو گئے۔ مروہ پہاڑی کے مقام پر تاریخ کا وہ انوکھا واقعہ پیش آیا جس کو دیکھنے کے لئے زمین و آسمان رک گئے۔ بوڑھا باپ اپنے محبوب بیٹے کو خود اپنے ہاتھوں سے ذبح کر رہا تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے عین وقت پر مداخلت کر کے حضرت اسماعیل کو ذبح ہونے سے بچا لیا۔ آسمان سے آواز آئی کہ بس تم نے تسلیم و وفاداری کا آخری ثبوت دے دیا۔ بیٹے کے بدلے میں اللہ نے آپ کی طرف سے مینڈھے کی قربانی قبول کر لی۔ اس کے بعد یہ طریقہ مستقل طور پر تمام خدا پرستوں کے لئے مقرر کر دیا گیا۔ حکم ہوا کہ آدمی اپنی قربانی کے علامتی فدیہ کے طور پر ہر سال انھیں تاریخوں میں جانور ذبح کرے جن تاریخوں میں حضرت ابراہیم خدا کے حکم کی تعمیل میں اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔

حضرت ابراہیم کو جو خواب دکھایا گیا اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ آپ اپنے عزیز بیٹے کو دعوت توحید کے مرکز (بیت اللہ) کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ اسی غرض سے حکم ہوا تھا کہ اسماعیل اور ان کی والدہ کو لے جا کر مکہ کی خشک اور سنسان زمین پر بسا دو۔ مگر اس بات کو چھری سے ذبح کرنے کی صورت میں ممثل کیا گیا۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ دین کی خدمت کوئی معمولی چیز نہیں ہے، یہ اپنے آپ کو جیتے جی ذبح کرنا ہے۔ "ذبح" ایثار و قربانی کی آخری انتہا ہے اور ایثار و قربانی کی آخری انتہا پر پہنچ ہی آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ خدا کے دین کی خدمت کر سکے۔

حضرت ابراہیم کا ایثار صرف یہ نہ تھا کہ آپ نے اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کر دیا۔ بیٹے کی قربانی تو ایثار و قربانی کے لمبے سلسلے کی صرف آخری صورت تھی۔ آپ کا ایثار یہ تھا کہ ایسے وقت میں جب کہ لوگ صرف دکھائی دینے والے خداؤں کے لئے اپنی محبتیں اور عقیدتیں وقف کر رہے تھے، آپ نے نہ دکھائی دینے والے خدا کو اپنی محبت و عقیدت کا مرکز بنایا۔ ایسے حالات میں جب کہ ناحق ہر طرح کے مادی دلائل کے زور پر اپنی اہمیت ثابت کر رہا تھا، آپ نے ایک ایسے حق کو پہچانا اور اس کو قبول کر لیا جس کی تائید میں صرف ذہنی دلائل قائم ہو سکتے تھے۔ ایسی فضا میں جب کہ باطل کے ساتھ مصالحت کرنے میں آپ کے لئے عزت و ترقی کے دروازے کھلے ہوئے تھے، آپ نے محض سچائی کی خاطر ایک ایسے غیر مصالحانہ راستہ کو اختیار کر لیا جس میں سختیوں اور مشکلات کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایسے ماحول میں جب کہ لوگ متمدن شہروں میں اقامت کو پسند کر رہے تھے، آپ نے ایک خشک بیابان میں لے جا کر اپنے گھر والوں کو بسا دیا۔ یہ سب کچھ غیر معمولی ایثار و قربانی کے جذبہ کے تحت ہوا۔ ایثار و قربانی کی نفسیات کے بغیر ان میں سے کوئی کام بھی نہیں ہو سکتا تھا ——— خدا پرست بننا اپنے کو ذبح کرنے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے کو ذبح کرنے پر تیار نہ ہو وہ خدا پرست بھی نہیں بن سکتا۔

نوٹ: یہ تقریر ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۰ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

رسول کی پیروی سے

فتح مکہ کے بعد عرب کے قبائل کثرت سے مسلمان ہوئے۔ مگر یہ لوگ زیادہ تر اسلام کا سیاسی غلبہ دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے۔ ان کے اندر وہ ذہنی و فکری انقلاب نہیں آیا تھا جو ابتدائی لوگوں میں آیا تھا۔ اسلام کے بعض احکام، خاص طور پر زکوٰۃ ان کی آزادانہ زندگی کے لئے ناقابل برداشت معلوم ہونے لگی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے چند ماہ پہلے یمن اور نجد کے علاقوں میں ان کے درمیان ایسے لیڈر ابھرے جو اسلام کا ایسا تصور پیش کرتے تھے جس میں زکوٰۃ کو منسوخ کر دیا گیا تھا۔ ان لیڈروں، مثلاً اسود اور مسیلمہ نے اپنی بات کو خدا کی بات ثابت کرنے کے لئے نبوت کا دعویٰ کر دیا تاکہ جس الہامی زبان میں زکوٰۃ کو فرض کیا گیا ہے اسی الہامی زبان میں اس کی فرضیت کو ساقط کیا جا سکے۔ اس قسم کی "نبوت" ان قبائل کی پسند کے عین مطابق ثابت ہوئی جو زکوٰۃ کو اپنے اوپر ایک بوجھ خیال کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے جوق در جوق ان جھوٹے مدعیانِ نبوت کا ساتھ دینا شروع کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ان لوگوں کا حوصلہ اور بڑھا اور یہ فتنہ تیزی سے پھیلنے لگا۔ حتیٰ کہ یہ حال ہوا کہ مکہ، مدینہ اور طائف کے سوا تمام عرب میں بیشتر لوگ باغی ہو گئے۔ اسی کے ساتھ یہ خبریں بھی پھیلنے لگیں کہ یہ لوگ منظم ہو کر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری زمانہ میں جو کام کئے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ آپ نے اسامہ بن زید کی قیادت میں ایک لشکر تیار کیا اور اس کو حکم دیا کہ وہ رومیوں کے مقابلہ کے لئے شام کی طرف جائے جہاں اس سے پہلے موتہ کے مقام پر رومیوں نے اسامہ کے والد حضرت زید کو شہید کیا تھا۔ یہ لشکر روانہ ہو کر ابھی مدینہ کے باہر پہنچا تھا کہ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر ملی اور وہ خلیفہ اول کے حکم کے انتظار میں وہیں ٹھہر گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت صدیق اکبر نے اس لشکر کو آگے روانہ کرنا چاہا تو بیشتر صحابہ نے اختلاف کیا۔ انھوں نے کہا کہ سارا عرب باغی ہو رہا ہے اور کسی بھی وقت مدینہ پر حملہ ہو سکتا ہے۔ ایسی حالت میں لشکر کو مدینہ کے دفاع کے لئے یہاں رکھنا چاہئے نہ کہ ایسے نازک موقع پر اس کو دور بھیج دیا جائے۔ مگر حضرت ابوبکر صدیق نے ایسی کسی رائے کو ماننے سے شدت کے ساتھ انکار کر دیا۔

تمام بڑے بڑے صحابہ اسامہ بن زید رض کی سرداری میں مدینہ کے باہر جمع تھے۔ اس وقت لوگوں کے اندر دو باتیں بحث کا موضوع بنی ہوئی تھیں۔ ایک یہ کہ اتنے نازک موقع پر اسلامی لشکر کا مدینہ سے دور

جانا حکمت کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ اسامہ بن زید ایک غلام کے لڑکے تھے اس لئے بہت سے لوگوں کو ان کی سرداری پر انقباض تھا۔ نیز وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اسامہ ابھی صرف سترہ سال کے نوجوان ہیں اور ان کی ماتحتی میں بڑے بڑے صحابہ ہیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ کسی عمر قریشی کو سردار مقرر کر دیا جائے تو زیادہ بہتر ہو۔

عمر فاروق رضؓ بھی ابتداءً اس لشکر میں شامل تھے، وہ لوگوں کا پیغام لے کر حضرت ابوبکر رضؓ کے پاس روانہ ہوئے۔ حضرت ابوبکر نے پہلی بات سن کر فرمایا: لشکر کی روانگی کے بعد اگر میں مدینہ میں تنہا رہ جاؤں اور درندے مجھ کو پھاڑ کھائیں تب بھی میں ایک ایسے لشکر کی روانگی کو روک نہیں سکتا جس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روانہ فرمایا ہو۔ دوسرے پیغام کو سن کر آپ نے فرمایا "کیا ان کے دلوں میں ابھی تک جاہلی فخر و تکبر کا اثر باقی ہے" یہ کہہ کر آپ اٹھے اور لشکر کو خود رخصت کرنے کے لئے پیدل چل کر لشکر گاہ تک پہنچے۔ اسامہ بن زید کو ان کے لشکر کے ساتھ روانہ کیا، جب اسامہ اپنی سواری پر چلے تو آپ ان کے ساتھ ساتھ باتیں کرتے ہوئے چلنے لگے۔ اسامہ نے کہا کہ یا تو آپ بھی سوار ہو جائیں، یا میں سواری سے اتر جاؤں۔ حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا: نہ میں سوار ہوں گا اور نہ تم کو سواری سے اترنے کی ضرورت ہے۔ یہ خلیفہ اول کی طرف سے گویا لوگوں کے سوال کا عملی جواب تھا۔ خلیفہ کو اسامہ کی رکاب میں چلتے دیکھ کر سب کا انقباض ختم ہو گیا۔

اسامہ کی سرکردگی میں صحابہ کا لشکر رومی علاقہ کی طرف روانہ ہوا تو اس کی خبریں چاروں طرف پھیل گئیں۔ بہت سے مخالفین کے لئے یہ مسلمانوں کے اعتماد کا مظاہرہ بن گیا۔ انھوں نے سوچا کہ مدینہ کی حکومت کے پاس کافی طاقت ہوگی جبھی تو وہ اس نازک وقت میں اتنا بڑا لشکر دارالسلطنت سے دور بھیج رہے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے سوچا کہ مدینہ پر اقدام کرنے میں ہم کو توقف کرنا چاہئے۔ پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ مسلمانوں اور رومیوں کی جنگ کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اگر مسلمانوں کو اس جنگ میں شکست ہوتی ہے تو وہ اور زیادہ کمزور ہو جائیں گے اور اس کے بعد ان کے اوپر اقدام کرنا زیادہ مناسب ہوگا

اسامہ بن زید کے لشکر کو رومیوں کے خلاف مہم میں زبردست کامیابی ہوئی۔ اس مہم میں ان کو چالیس دن لگے۔ اسامہ بن زید اس مہم کی قیادت کے لئے موزوں ترین شخص تھے۔ کیونکہ ان کے باپ زید بن حارثہ کو رومیوں نے موتہ کی جنگ میں شہید کیا تھا اور ان کے دل میں اپنے باپ کا انتقام لینے کا جذبہ بھڑک رہا تھا، اسامہ کی رہنمائی میں اسلامی لشکر انتہائی بے جگری سے لڑا اور رومیوں کو شکست دی۔ اس کے بعد وہ کافی قیدی اور مال غنیمت لے کر مدینہ واپس آئے۔ یہ دیکھ کر باغیوں کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ اور نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ ان کو زیر کر لیا گیا ــــ رسول کی پیروی ان کے لئے دشمنوں پر غلبہ کا ذریعہ بن گئی۔

اللہ کی راہ میں خرچ

آدمی کے پاس جو کچھ ہے خدا کا دیا ہوا ہے۔ آدمی کی زندگی اور اس کا اثاثہ سب کچھ خدا کی بخشش ہے۔ اس بخشش کا شکر یہ ہے کہ اللہ نے جو کچھ آدمی کو دیا ہے وہ اس کو اللہ کے قدموں میں ڈال دے۔ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا اللہ کے لئے اسی حوالگی کی ایک علامت ہے۔

آدمی دنیا میں جو کچھ کماتا ہے اسی لئے کماتا ہے کہ خدا نے اس کو ہاتھ اور پاؤں دئے ہیں جن سے وہ عمل کرے۔ اس کو آنکھ اور زبان دی ہے جس سے وہ دیکھے اور بولے۔ اس کو دماغ دیا ہے جس سے وہ سوچے اور منصوبہ بنائے۔ اسی کے ساتھ خدا نے آدمی کو ایک ایسی دنیا میں رکھا جو پوری طرح اس کے تابع ہے۔ دنیا کی ہر چیز اس طرح بنائی گئی ہے کہ انسان اس کو جس طرح چاہے اپنے کام میں لائے۔ اگر ایسا نہ ہو تو آدمی جسم و دماغ کی تمام طاقتیں رکھتے ہوئے بھی دنیا سے کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے گا۔ اگر گیہوں کا دانہ فصل کی صورت میں نہ اگے بلکہ پتھر کے ٹکڑے کی طرح زمین میں پڑا رہے تو انسان کے لئے زمین سے غلہ حاصل کرنا ناممکن ہو جائے۔ فطرت کی طاقتیں اگر اپنا مقررہ عمل ظاہر نہ کریں تو نہ بجلی پیدا ہو اور نہ کوئی سواری حرکت کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان جو کمائی کرتا ہے وہ براہ راست خدا کا احسان ہوتی ہے۔ اس احسان کا بدلہ یہ ہے کہ آدمی اپنی کمائی کو اللہ کے دین کی راہ میں خرچ کرے۔ وہ اس سے اللہ کے کمزور بندوں کی مدد کرے۔ خدا کی دی ہوئی دولت کو وہ خدا کے بتائے ہوئے طریقوں میں لگائے۔

اللہ کی راہ کا خرچ وہ ہے جو صرف اللہ کے لئے ہو نہ کہ شہرت یا عزت یا بدلہ پانے کے لئے۔ مال کے ذریعہ آدمی اپنے آپ کو دنیا کی مصیبتوں سے بچاتا ہے۔ اللہ کی راہ میں دیا ہوا مال وہ ہے جس کو آخرت کی مصیبتوں سے نجات پانے کے لئے دیا جائے۔

اور وہی ہے جو رات میں تم کو وفات دیتا ہے اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو اس کو جانتا ہے۔ پھر تم کو اٹھا دیتا ہے اس میں تاکہ مقرر مدت پوری ہو جائے۔ پھر اسی کی طرف تمھاری واپسی ہے۔ پھر وہ تم کو باخبر کر دے گا اس سے جو تم کرتے رہے ہو۔ اور وہ غالب ہے اپنے بندوں کے اوپر اور وہ تمھارے اوپر نگراں بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی روح قبض کر لیتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔ پھر سب اللہ، اپنے مالک حقیقی کی طرف واپس لائے جائیں گے۔ سن لو، حکم اسی کا ہے اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے ۶۲-۶۰

خدا نے یہ دنیا اس طرح بنائی ہے کہ وہ ان حقیقتوں کی عملی تصدیق بن گئی ہے جن کی طرف انسان کو دعوت دی جا رہی ہے۔ اگر آدمی اپنی آنکھوں کو بند نہ کرے اور اپنی عقل پر مصنوعی پردے نہ ڈالے تو پوری کائنات اس کو قرآن کی فکری دعوت کا عملی مظاہرہ دکھائی دے گی۔

درخت کے تنہ میں شاخ نکلتی ہے اور شاخ میں پتے۔ مگر دونوں کے جوڑوں میں فرق ہوتا ہے۔ گویا کہ بنانے والے کو معلوم ہے کہ شاخ کو اپنے تنے سے جڑا رہنا ہے اور پتہ کو الگ ہو کر گر جانا ہے۔ اگر شاخ کی جڑ کے مقابلہ میں پتہ کی جڑ میں یہ انفرادی خصوصیت نہ ہو تو پتہ شاخ سے جدا نہ ہو اور درخت کو ہر سال نئی زندگی دینے کا نظام ابتر ہو جائے۔ اسی طرح جب ایک دانہ زمین میں ڈالا جاتا ہے تو زمین میں پہلے سے اس کے لئے وہ تمام ضروری خوراک موجود ہوتی ہے جس سے رزق پا کر وہ بڑھتا ہے اور بالآخر پورا درخت بنتا ہے۔ اب کیسے ممکن ہے کہ جو خدا پتہ اور دانہ تک کے احوال سے باخبر ہو وہ انسانوں کے احوال سے بے خبر ہو جائے (۵۹)

ہماری زمین ساری کائنات میں ایک انوکھا واقعہ ہے۔ یہاں کا نظام استثنائی طور پر انسان جیسی ایک مخلوق کے حسب حال بنایا گیا ہے۔ زمین کے اندر کا ایک بڑا حصہ آگ ہے مگر وہ پھٹ نہیں پڑتا۔ سورج انتہائی صحیح حسابی فاصلہ پر ہے، وہ اس سے نہ دور جاتا ہے اور نہ قریب ہوتا۔ آدمی کو ہر وقت ہوا اور پانی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہوا کو گیس کی شکل میں ہر جگہ پھیلا دیا گیا ہے اور پانی کو رقیق سیال کی صورت میں زمین کے نیچے رکھ دیا گیا ہے۔ اس قسم کے بے شمار انتظامات ہیں جن کو زمین پر مسلسل برقرار رکھا جاتا ہے۔ اگر ان میں معمولی فرق آجائے تو انسان کے لئے زمین پر زندگی گزارنا ناممکن ہو جائے۔

نیند بڑی عجیب چیز ہے۔ آدمی چلتا پھرتا ہے۔ وہ دیکھتا اور بولتا ہے۔ مگر جب وہ سوتا ہے تو اس کے تمام حواس اس طرح معطل ہو جاتے ہیں جیسے زندگی اس سے نکل گئی ہو۔ اس کے بعد جب وہ نیند پوری کر کے اٹھتا ہے تو وہ پھر ویسا ہی انسان ہوتا ہے جیسا کہ وہ پہلے تھا۔ یہ گویا زندگی اور موت کی تمثیل ہے۔ یہ معاملہ ہمارے لئے اس بات کو قابل فہم بنا دیتا ہے کہ آدمی کس طرح مرے گا اور کس طرح وہ دوبارہ زندہ ہو کر کھڑا ہو جائے گا۔ یہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ سارے انسان خدا کے اختیار میں ہیں اور جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ خدا اپنے اختیار کے مطابق انکا فیصلہ کرے۔

ہو، کون تم کو نجات دیتا ہے خشکی اور سمندر کی تاریکیوں سے، تم اس کو پکارتے ہو عاجزی سے اور چپکے چپکے کہ اگر خدا نے ہم کو نجات دے دی اس مصیبت سے تو ہم اس کے شکر گزار بندوں میں سے بن جائیں گے۔ کہو، خدا ہی تم کو نجات دیتا ہے اس سے اور ہر تکلیف سے، پھر بھی تم شرک کرنے لگتے ہو۔ کہو، خدا قادر ہے اس پر کہ تم پر کوئی عذاب بھیج دے تمھارے اوپر سے یا تمھارے پیروں کے نیچے سے یا تم کو گروہ گروہ کرکے ایک کو دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھادے۔ دیکھو، ہم کس طرح دلائل مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں۔ اور تمھاری قوم نے اس کو جھٹلادیا ہے حالاں کہ وہ حق ہے۔ کہو، میں تمھارے اوپر داروغہ نہیں ہوں۔ ہر خبر کے لئے ایک وقت مقرر ہے اور تم جلد ہی جان لوگے　۶۳-۶۷

انسان کو اس دنیا میں جتنی مصیبتیں پیش آتی ہیں اتنی کسی بھی دوسرے جان دار کو پیش نہیں آتیں۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے تاکہ آدمی پر ایسے حالات طاری کئے جائیں جب کہ اس کے اندر سے تمام مصنوعی خیالات ختم ہوجائیں اور آدمی اپنی اصلی فطرت کو دیکھ سکے۔ چنانچہ جب بھی آدمی پر کوئی کڑی مصیبت پڑتی ہے تو وہ یک سو ہوکر خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کے ذہن سے تمام بناوٹی پردے ہٹ جاتے ہیں۔ وہ جان لیتا ہے کہ اس دنیا میں انسان تمام تر عاجز ہے اور ساری قدرت صرف خدا کو حاصل ہے۔ مگر جیسے ہی مصیبت کے حالات ختم ہوتے ہیں وہ بدستور غفلت کا شکار ہوکر ویسا ہی بن جاتا ہے جیسا کہ وہ پہلے تھا۔

شرک کی اصل حقیقت اللہ کے سوا کسی دوسری چیز پر اعتماد کرنا ہے اور توحید یہ ہے کہ آدمی کا سارا اعتماد اللہ پر ہوجائے۔ شرک کی ایک صورت وہ ہے جو بتوں اور دوسرے مظاہر پرستش کے ساتھ پیش آتی ہے۔ اور شکر کے بجائے ناشکری کا رویہ اختیار کرنا بھی شرک ہے۔ شرک کی زیادہ عام صورت یہ ہے کہ آدمی خود اپنے کو بت بنالے، وہ اپنے آپ پر اعتماد کرنے لگے۔ آدمی جب اکڑ کر چلتا ہے تو گویا وہ اپنے جسم و جان پر اعتماد کر رہا ہے آدمی جب اپنی کمائی کو اپنی کمائی سمجھتا ہے تو گویا وہ اپنی قابلیت پر بھروسہ کر رہا ہے۔ آدمی جب ایک حق کو نظر انداز کرتا ہے تو گویا وہ سمجھتا ہے کہ میں جو بھی کروں، کوئی میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ آدمی جب کسی کے اوپر ظلم کرنے میں جری ہوتا ہے تو اس وقت اس کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ میں اس کے اوپر اختیار رکھتا ہوں، اس کے حق میں اپنی من مانی کرنے سے مجھے کوئی روکنے والا نہیں۔ یہ ساری صورتیں گھمنڈ کی صورتیں ہیں اور گھمنڈ خدا کے نزدیک سب سے بڑا شرک ہے۔ کیونکہ یہ اپنے آپ کو خدا کے مقام پر رکھنا ہے۔

آدمی اگر اپنے حال پر سوچے تو وہ گھمنڈ نہ کرے۔ وہ ایسی ہواؤں سے گھرا ہوا ہے جو کسی بھی وقت طوفان کی صورت اختیار کرکے اس کی زندگی کو تہس نہس کرسکتی ہیں، وہ ایسی زمین پر کھڑا ہوا ہے جو کسی بھی لمحہ زلزلہ کی صورت میں پھٹ سکتی ہے۔ وہ جس سماج میں رہتا ہے اس میں ہر وقت اتنی عداوتیں موجود رہتی ہیں کہ ایک چنگاری پورے سماج کو خاک و خون کے حوالے کرنے کے لئے کافی ہے۔

اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں عیب نکالتے ہیں تو ان سے الگ ہوجاؤ یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں۔ اور اگر کبھی شیطان تم کو بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ایسے بے انصاف لوگوں کے پاس نہ بیٹھو۔ اور جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں ان پر ان کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمہ داری نہیں۔ البتہ یاد دلانا ہے شاید کہ وہ بھی ڈریں۔ ان لوگوں کو چھوڑ دو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ اور قرآن کے ذریعہ نصیحت کرتے رہو تاکہ کوئی شخص اپنے کئے میں گرفتار نہ ہوجائے، اس حال میں کہ اللہ سے بچانے والا کوئی مددگار اور سفارشی اس کے لئے نہ ہو۔ اگر وہ دنیا بھر کا معاوضہ دے تب بھی قبول نہ کیا جائے۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے کئے میں گرفتار ہوگئے۔ ان کے لئے کھولتا پانی پینے کے لئے ہوگا اور دردناک سزا ہوگی اس لئے کہ وہ کفر کرتے تھے ۷۰ — ۶۸

عبداللہ بن عباس رض نے فرمایا کہ اللہ نے ہر امت کے لئے ایک عید کا دن مقرر کیا تاکہ اس دن وہ اللہ کی بڑائی کریں اور اس کی عبادت کریں اور اللہ کی یاد سے اس کو معمور کریں۔ مگر بعد کے لوگوں نے اپنی عید (مذہبی تیوہار) کو کھیل تماشا بنا لیا (تفسیر کبیر)

ہر دینی عمل کا ایک مقصد ہوتا ہے اور ایک اس کا ظاہری پہلو ہوتا ہے۔ عید کا مقصد اللہ کی بڑائی اور اس کی یاد کا اجتماعی مظاہرہ ہے۔ مگر عید کی ادائگی کے کچھ ظاہری پہلو بھی ہیں۔ مثلاً کپڑا پہننا یا اجتماع کا سامان کرنا وغیرہ۔ اب عید کو کھیل تماشا بنانا یہ ہے کہ اس کے اصل مقصد پر توجہ نہ دی جائے البتہ اس کے ظاہری اور مادی پہلوؤں کی خوب دھوم مچائی جائے۔ مثلاً کپڑوں اور سامانوں کی نمائش، خرید و فروخت کے ہنگامے، تفریحات کا اہتمام، اپنی حیثیت اور شان و شوکت کے مظاہرے، وغیرہ۔

امتوں کے بگاڑ کے زمانہ میں یہی معاملہ تمام دینی اعمال کے ساتھ پیش آتا ہے۔ لوگ دینی عمل کی اصل حقیقت کو الگ کرکے اس کے ظاہری پہلو کو لے لیتے ہیں۔ اب جو لوگ اس نوبت کو پہنچ جائیں کہ وہ دین کے مقصدی پہلو کو بھلا کر اس کو اپنے دنیوی تماشوں کا عنوان بنالیں وہ اپنے اس عمل سے ثابت کر رہے ہیں کہ وہ دین کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہیں اور جو لوگ کسی معاملہ میں سنجیدہ نہ ہوں ان کو اس معاملہ کی کوئی ایسی بات سمجھائی نہیں جاسکتی جو ان کے مزاج کے خلاف ہو۔ مزید یہ کہ مادی چیزوں کا مالک ہونا ان کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے کہ سچائی کے مالک بھی وہی ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ یہاں ان کی ضرورتیں بفراغت پوری ہورہی ہیں۔ ہر جگہ وہ رونق محفل بنے ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی میں کہیں کوئی رخنہ نہیں۔ اس لئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ آخرت میں بھی وہی کامیاب رہیں گے۔ ایسے لوگ عین اپنی نفسیات کی بنا پر آخرت کی باتوں کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہوتے۔ مگر وہ جان لیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ یوں ہی ختم ہوجانے والا نہیں۔ ان کا عمل ان کو گھیرے میں لے رہا ہے۔ عنقریب وہ اپنی سرکشی میں پھنس کر رہ جائیں گے اور کسی حال میں اس سے چھٹکارا نہ پاسکیں گے۔

کہو، کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ ہم کو نفع دے سکتے اور نہ ہم کو نقصان پہنچا سکتے۔ اور کیا ہم الٹے پاؤں پھر جائیں۔ بعد اس کے کہ اللہ ہم کو سیدھا راستہ دکھا چکا ہے اس شخص کی مانند جس کو شیطانوں نے بیابان میں بھٹکا دیا ہو اور وہ حیران پھر رہا ہو، اس کے ساتھی اس کو سیدھے راستہ کی طرف بلا رہے ہوں کہ ہمارے پاس آجاؤ۔ کہو کہ رہنمائی تو صرف اللہ کی رہنمائی ہے اور ہم کو حکم ملا ہے کہ ہم اپنے آپ کو عالم کے رب کے حوالے کر دیں۔ اور یہ کہ نماز قائم کرو اور اللہ سے ڈرو اور وہی ہے جس کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔ اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور جس دن وہ کہے گا کہ ہو جا تو وہ ہو جائے گا۔ اس کی بات حق ہے اور اسی کی حکومت ہوگی اس روز جب صور پھونکا جائے گا۔ وہ غائب و حاضر کا عالم اور حکیم و خبیر ہے ۷۳-۷۱

جو لوگ خدا کے سوا دوسرے سہاروں پر اپنی زندگی قائم کریں ان کی مثال اس مسافر کی سی ہوتی ہے جو بے نشان صحرا میں بھٹک رہا ہو۔ صحرا میں بھٹکنے والا مسافر فوراً جان لیتا ہے کہ اس نے اپنا راستہ کھو دیا ہے۔ راستہ دکھائی دیتے ہی وہ فوراً اس کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ مگر جو لوگ خدا کے بجائے دوسرے سہاروں پر جیتے ہیں ان کو اپنے بے راہ ہونے کی خبر نہیں ہوتی۔ ان کے آس پاس پکارنے والے پکارتے ہیں کہ اصل راستہ یہ ہے، ادھر آجاؤ مگر وہ اس قسم کی آوازوں پر دھیان نہیں دیتے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ پہلے معاملہ میں آدمی کی عقل کھلی ہوئی ہوتی ہے، صحیح راستہ کو دیکھنے میں اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ جب کہ دوسری صورت میں آدمی کی عقل شیطان کے زیر اثر آجاتی ہے۔ اس کی سوچ اپنے فطری ڈھنگ پر کام نہیں کرتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سن کر بھی نہیں سنتا اور دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا۔

خدا کے سوا دوسری چیزوں کا طالب بننا ایسی چیزوں کا طالب بننا ہے جو اس دنیا میں فائدہ و نقصان کی طاقت نہیں رکھتیں۔ زمین و آسمان اپنے پورے نظام کے ساتھ انکار کر رہے ہیں کہ یہاں ایک ہستی کے سوا کسی اور ہستی کو کوئی طاقت حاصل ہو۔ اسی طرح جن دنیوی رونقوں کو آدمی اپنا مقصود بناتا ہے اور ان کو پانے کی کوشش میں سچائی اور انصاف کے تمام تقاضوں کو روند ڈالتا ہے، وہ بھی سراسر باطل ہے۔ کیوں کہ انسانی زندگی اگر اسی ظالمانہ حالت پر تمام ہو جائے تو یہ دنیا بالکل بے معنی قرار پاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا خود غرض اور انانیت پسند لوگوں کی تماشاگاہ ہے۔ حالانکہ کائنات کا نظام جس باکمال خدا کی تجلیاں دکھا رہا ہے اس سے انتہائی بعید ہے کہ وہ اس طرح کی کوئی بے مقصد تماشاگاہ کھڑی کرے۔

دنیا کی موجودہ صورت حال بالکل عارضی ہے۔ خدا کسی بھی دن اپنا نیا حکم جاری کر کے اس نظام کو توڑ دے گا۔ اس کے بعد انسان کی موجودہ آزادی ختم ہو جائے گی اور خدا کا اقتدار انسانوں پر بھی اسی طرح قائم ہو جائے گا جس طرح آج وہ بقیہ کائنات پر قائم ہے۔ اس وقت کامیاب وہ ہوں گے جنھوں نے امتحان کے زمانہ میں اپنے کو خدا کے حوالے کیا تھا، جو کسی دباؤ کے بغیر اللہ سے ڈرنے والے اور اس کے آگے ہمہ تن جھک جانے والے تھے۔

اور جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ کیا تم بتوں کو خدا مانتے ہو۔ میں تم کو اور تمھاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتا ہوں۔ اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو دکھادی آسمانوں اور زمین کی حکومت، اور تاکہ اس کو یقین آجائے۔ پھر جب رات نے اس پر اندھیرا کرلیا اس نے ایک تارہ کو دیکھا۔ کہا یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا تو اس نے کہا میں ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ پھر جب اس نے چاند کو چمکتے ہوئے دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا تو اس نے کہا اگر میرا رب مجھ کو ہدایت نہ کرے تو میں گمراہ لوگوں میں سے ہوجاؤں۔ پھر جب سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا تو کہا کہ یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا تو اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اے لوگو، میں اس شرک سے بری ہوں جو تم کرتے ہو۔ میں نے اپنا رخ یکسو ہوکر اس کی طرف کرلیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرلیا ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں ٧٩-٧٤

حضرت ابراہیمؑ کی کہانی جو یہاں بیان ہوئی ہے وہ تلاش حق کی کہانی نہیں ہے بلکہ مشاہدۂ حق کی کہانی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ دو ہزار سال پہلے عراق میں ایسے ماحول میں پیدا ہوئے جہاں سورج، چاند، اور تاروں کی پرستش ہوتی تھی۔ تاہم فطرت کی رہنمائی اور اللہ کی خصوصی مدد نے آنجناب کو شرک سے محفوظ رکھا۔ آپ کی بیدار نگاہیں کائنات کے پھیلے ہوئے شواہد میں توحید کے کھلے ہوئے دلائل دیکھتیں۔ کائنات کے آئینہ میں ہر طرف آپ کو ایک خدا کا چہرہ نظر آتا تھا۔ آپ قوم کی حالت پر افسوس کرتے اور لوگوں کو بتاتے کہ کھلے ہوئے حقائق کے باوجود کیوں تم لوگ اندھے بنے ہوئے ہو۔

رات کا وقت ہے۔ حضرت ابراہیم آسمان میں خدائے واحد کی نشانیاں دیکھ رہے ہیں۔ اسی عالم میں سیارہ زہرہ چمکتا ہوا ان کے سامنے آتا ہے جس کو ان کی قوم معبود سمجھ کر پوجتی تھی۔ ان کے دل میں بطور سوال نہیں بلکہ بطور استعجاب یہ خیال آتا ہے کہ کیا یہی وہ چیز ہے جو میرا رب ہو، یہی وہ معبود ہے جس کی ہمیں پرستش کرنی چاہئے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کو اپنے سامنے ڈوبتا ہوا دیکھتے ہیں تو اس کا ڈوبنا ان کے لئے اپنے عقیدہ کے صحیح ہونے کی ایک مشاہداتی دلیل بن جاتی ہے۔ وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ جو چیز ایک لمحہ کے لئے چمکے اور پھر غائب ہوجائے وہ کیسے اس قابل ہوسکتی ہے کہ اس کو پوجا جائے۔ بالکل یہی تجربہ ان کو چاند اور سورج کے ساتھ بھی گزرتا ہے۔ ہر ایک چمک کر تھوڑی دیر کے لئے استعجاب پیدا کرتا ہے اور پھر ڈوب جاتا ہے۔ یہ فلکیاتی مشاہدات جو ان کے اپنے لئے توحید کی کھلی ہوئی تصدیق تھے۔ اسی کو وہ قوم کے سامنے اپنی تبلیغ میں بطور استدلال پیش کرتے ہیں اور انداز کلام وہ اختیار کرتے ہیں جس کو اصطلاح میں حجت الزامی کہا جاتا ہے، یعنی مخاطب کے الفاظ کو دہرا کر پھر اسے قائل کرنا۔ حجت الزامی کا یہ طریقہ قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی مذکور رہا ہے۔ مثلاً وانظر الی الٰھک الذی ظلت علیہ عاکفا (طٰہٰ ٩٧)

کائنات میں خدا کی جو تخلیقی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ کسی بندہ کے لئے اضافۂ ایمان کا ذریعہ بھی ہیں اور انھیں سے دعوت حق کے لئے مضبوط دلائل بھی حاصل ہوتے ہیں۔

اور اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی۔ اس نے کہا کیا تم اللہ کے معاملہ میں مجھ سے جھگڑتے ہو حالاں کہ اس نے مجھے راہ دکھا دی ہے۔ اور میں ان سے نہیں ڈرتا جن کو تم اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو مگر یہ کہ کوئی بات میرا رب ہی چاہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے، کیا تم نہیں سوچتے۔ اور میں کیوں کر ڈروں تمہارے شریکوں سے جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک ٹھہراتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لئے اس نے تم پر کوئی سند نہیں اتاری۔ اب دونوں فریقوں میں سے امن کا زیادہ مستحق کون ہے، اگر تم جانتے ہو۔ جو لوگ ایمان لائے اور نہیں ملایا انھوں نے اپنے ایمان میں کوئی نقصان، انھیں کے لئے امن ہے اور وہی سیدھی راہ پر ہیں۔ یہ ہے ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں دی۔ ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں۔ بے شک تمھارا رب حکیم و علیم ہے　۸۳ — ۸۰

جب کسی چیز یا کسی شخصیت کو معبود کا درجہ دے دیا جائے تو اس کے بعد فطری طور پر یہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ پراسرار عظمتوں کے تصورات وابستہ ہو جاتے ہیں۔ لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس ذات کو کائناتی نقشہ میں کوئی ایسا برتر مقام حاصل ہے جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہیں۔ اس کو خوش کرنے سے قسمتیں بنتی ہیں اور اس کو ناراض کرنے سے قسمتیں بگڑ جاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم نے جب اپنی قوم کے بتوں کے بارے میں کہا کہ یہ بے حقیقت ہیں، انھیں خدا کی اس دنیا میں کوئی زور حاصل نہیں تو لوگوں کو اندیشہ ہونے لگا کہ اس گستاخی کے نتیجہ میں کہیں کوئی وبال نہ آپڑے۔ وہ حضرت ابراہیم سے بحثیں کرنے لگے۔ انھوں نے آپ کو ڈرایا کہ تم ایسی باتیں نہ کرو ورنہ ان معبودوں کا غضب تمھارے اوپر نازل ہوگا۔ تم اندھے ہو جاؤ گے، تم پاگل ہو جاؤ گے۔ تم برباد ہو جاؤ گے۔ وغیرہ

اس دنیا میں صرف خدا کی ایک ذات ہے جس کی کبریائی دلیل و برہان کے اوپر قائم ہے۔ اس کے سوا بڑائی اور معبودیت کی جتنی قسمیں ہیں سب توہماتی عقائد کی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہیں۔ خدا کی خدائی اپنے آپ قائم ہے، جب کہ دوسری تمام خدائیاں صرف ان کے ماننے والوں کی بدولت ہیں۔ اگر ماننے والے نہ مانیں تو یہ خدائیاں بھی بے وجود ہو کر رہ جائیں۔

ظاہر حالات کو دیکھ کر ان معبودوں کے پرستار اکثر اس دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ وہ سچے خدا پرستوں کے مقابلہ میں زیادہ محفوظ مقام پر کھڑے ہوئے ہیں۔ مگر یہ بدترین غلط فہمی ہے۔ محفوظ حیثیت دراصل اس کی ہے جو دلیل اور برہان پر کھڑا ہوا ہے۔ دنیوی رواج سے مصالحت کر کے کوئی شخص اپنے لئے محفوظ دیوار حاصل کرلے تو آخری انجام کے اعتبار سے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

جھوٹے معبودوں کا غلبہ کبھی اس نوبت کو پہنچتا ہے کہ سچے خدا پرست بھی اس سے مرعوب ہو کر اس سے سازگاری کر لیتے ہیں۔ دنیوی مصلحتیں اور مادی مفادات ان سے اس درجہ وابستہ ہو جاتے ہیں کہ بظاہر ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ باعزت زندگی حاصل کرنے کی اس سے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ ان معبودوں کے تحت بنے ہوئے ڈھانچہ سے مصالحت کر لی جائے۔ مگر اس قسم کا رویہ اپنے ایمان میں ایسا نقصان شامل کر لینا ہے جو خود ایمان ہی کو خدا کی نظر میں مشتبہ بنا دے

اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب عطا کئے، ہر ایک کو ہم نے ہدایت دی اور نوح کو بھی ہم نے ہدایت دی اس سے پہلے۔ اور اس کی نسل میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو بھی۔ اور ہم نیکوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو بھی، ان میں سے ہر ایک صالح تھا۔ اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو بھی اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت عطا کی۔ اور ان کے باپ دادوں اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے بھی، اور ان کو ہم نے چن لیا اور ہم نے سیدھے راستہ کی طرف ان کی رہنمائی کی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے، وہ اس سے سرفراز کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے۔ اور اگر وہ شرک کرتے تو ضائع ہو جاتا جو کچھ انھوں نے کیا تھا۔ یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی۔ پس اگر یہ مکہ والے اس کا انکار کر دیں تو ہم نے اس کے لئے ایسے لوگ مقرر کر دئے ہیں جو اس کے منکر نہیں ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی، پس تم بھی ان کے طریقہ پر چلو۔ کہہ دو، میں اس پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ یہ تو بس ایک نصیحت ہے دنیا والوں کے لئے ۹۰ - ۸۴

"فضیلت" کسی کا نسلی یا قومی لقب نہیں، یہ اللہ کا ایک عطیہ ہے جس کا تحقق صرف ان افراد کے لئے ہوتا ہے جو خدا کی ہدایت کے مطابق اپنے کو صالح بنائیں، شرک کی تمام قسموں سے اپنے کو بچائیں اور "بلا معاوضہ نصیحت" کے دعوتی منصوبہ میں اپنے کو ہمہ تن شامل کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کی کتاب کو اپنا حقیقی رہنما بناتے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ اپنے وجود کو اتنا زیادہ شامل کر دیتے ہیں کہ ان پر اس راہ کے وہ بھید کھلنے لگتے ہیں جن کو حکمت کہا جاتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو خدا چن لیتا ہے اور ان میں سے جن کو چاہتا ہے اپنے دین کی پیغام رسانی کی توفیق دیتا ہے، دور نبوت میں اللہ کے خصوصی پیغمبر کی حیثیت سے اور ختم نبوت کے بعد اللہ کے عام داعی کی حیثیت سے۔ اللہ کا انعام خواہ وہ پیغمبروں کے لئے ہو یا عام انسانوں کے لئے، تمام تر نیک عملی (احسان) کی بنیاد پر ملتا ہے نہ کہ کسی اور بنیاد پر۔

دعوت حق کا کام صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو اس کی خاطر اتنا زیادہ یکسو اور بے نفس ہو چکے ہوں کہ وہ مدعو سے کسی قسم کی مادی توقع نہ رکھیں۔ جس شخص یا گروہ تک آپ آخرت کا پیغام پہنچا رہے ہوں اسی سے آپ اپنے دنیوی حقوق کے لئے احتجاج اور مطالبات کی مہم نہیں چلا سکتے۔ داعی کا ایسا کرنا صرف اس قیمت پر ہوگا کہ اس کی دعوت مدعو کی نظر میں مضحکہ خیز بن کر رہ جائے اور ماحول کے اندر کبھی اس کو سنجیدہ مہم کی حیثیت حاصل نہ ہو۔

مکہ میں کچھ لوگ آپ پر ایمان لائے۔ مگر "بحیثیت قوم" مکہ والوں نے آپ کا انکار کر دیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مدینہ والوں کے دل آپ کی دعوت کے حق میں نرم کر دئے اور وہ بحیثیت قوم آپ کے مومن بن گئے۔ حتیٰ کہ آپ کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ آپ مکہ سے مدینہ جا کر وہاں اسلام کا مرکز قائم کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ مدد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کامل درجہ میں حاصل ہوئی۔ تاہم آپ کی امت میں اٹھنے والے داعیوں کو بھی اللہ یہ مدد دے سکتا ہے اور اپنی مصلحت کے مطابق دیتا رہا ہے۔

اور انھوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب انھوں نے کہا کہ اللہ نے کسی انسان پر کوئی چیز نہیں اتاری۔ کہو کہ وہ کتاب کس نے اتاری تھی جس کو لے کر موسیٰ آئے تھے، وہ روشنی تھی اور رہنمائی تھی لوگوں کے واسطے، جس کو تم نے ورق ورق کر رکھا ہے۔ کچھ کو ظاہر کرتے ہو اور بہت کچھ چھپا جاتے ہو۔ اور تم کو وہ باتیں سکھائیں جن کو نہ جانتے تھے تم اور نہ تمھارے باپ دادا۔ کہو کہ اللہ نے اتاری۔ پھر ان کو چھوڑ دو کہ اپنی کج بحثیوں میں کھیلتے رہیں۔ اور یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے، برکت والی ہے، تصدیق کرنے والی ان کی جو اس سے پہلے ہیں۔ اور تاکہ تو ڈرائے مکہ والوں کو اور اس کے آس پاس والوں کو۔ اور جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں وہی اس پر ایمان لائیں گے۔ اور وہ اپنی نماز کی حفاظت کرنے والے ہیں ۹۲ - ۹۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت مکہ کے لوگوں کے سامنے آئی تو ان کے کچھ لوگوں نے بعض یہود سے پوچھا کہ تمھارا اس بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا محمد پر واقعی خدا کا کلام نازل ہوا ہے۔ یہود نے جواب دیا "خدا نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے"۔ بظاہر یہ بات بڑی عجیب ہے۔ کیونکہ یہود تو خود نبیوں کو ماننے والے تھے۔ اور اس طرح گویا وہ اقرار کر رہے تھے کہ بشر پر خدا کا کلام اترتا ہے۔ مگر جب آدمی مخالفت میں اندھا ہو جائے تو وہ مخالف کی تردید کے جوش میں کبھی یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ اپنی مانی ہوئی باتوں کی تردید کرنے لگے۔

یہود کے اندر یہ ڈھٹائی اس لئے پیدا ہوئی کہ انھوں نے خدا کی کتاب کو ورق ورق کر دیا تھا۔ وہ خدا کی تعلیمات کے کچھ حصے کو سامنے لاتے اور بقیہ کو کتاب میں بند رکھتے۔ مثلاً وہ انعام والی آیتوں کو خوب سنتے سناتے اور ان آیتوں کو چھوڑ دیتے جن میں وہ اعمال بتائے گئے ہیں جن کے کرنے سے کسی کو مذکورہ انعام ملتا ہے۔ وہ ایسی آیتوں کا خصوصی تذکرہ کرتے جن سے ان کی شور وغل کی سیاست کی تائید نکلتی ہو اور ان آیتوں کو نظر انداز کر دیتے جن میں خاموش اصلاح کے احکام دئے گئے ہوں۔ وہ ایسی آیتوں کے درس میں بڑا اہتمام کرتے جن میں ان کے لئے لفظی موشگافیوں کا کمال دکھانے کا موقع ہو مگر ان آیتوں سے سرسری گزر جاتے جن میں دین کے ابدی حقائق بیان کئے گئے ہیں۔ وہ ایسی آیتوں کا خوب چرچا کرتے جن سے اپنی فضیلت نکلتی ہو اور ان آیتوں سے بے توجہی برتتے ہیں جن سے ان کی ذمہ داریاں معلوم ہوتی ہیں۔ جو لوگ خدا کی کتاب کو اس طرح "ورق ورق" کریں ان کے اندر فطری طور پر ڈھٹائی آجاتی ہے۔ وہ غیر سنجیدہ بحثیں کرتے ہیں، متضاد بیانات دیتے ہیں۔ ان سے کسی حقیقی تعاون کی امید نہیں کی جاسکتی۔ جو لوگ خدا کی کتاب کے ساتھ انصاف نہ کریں وہ انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں کیسے انصاف کر سکتے ہیں۔

دین کی دعوت اصلاً لوگوں کو ہوشیار کرنے کی دعوت ہے۔ اس قسم کی دعوت خواہ کتنے ہی کامل انسان کی طرف سے پیش کی جائے وہ سننے والے کے دل میں اس وقت جگہ کرے گی جب کہ وہ اپنے سینہ میں ایک اندیشہ ناک دل رکھتا ہو اور آخرت کے معاملہ کو ایک سنجیدہ معاملہ سمجھتا ہو۔ سننے والے میں اگر یہ ابتدائی مادہ موجود نہ ہو تو سنانے والا اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

اسلام اور کفر

اسلام کا مطلب ہے ماننا اور کفر کا مطلب ہے انکار کرنا۔ انسان بظاہر دنیا میں آزاد ہے کہ جو چاہے بولے اور جو چاہے کرے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز خدا کی ہے۔ کسی کے پاس جو کچھ ہے سب اسی کا دیا ہوا ہے۔ یہاں خدا کے سوا کسی کو کوئی طاقت حاصل نہیں۔ خدا ہر وقت انسان کو پکڑنے اور اس کو سزا دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ اسلام یہ ہے کہ آدمی اس حقیقتِ واقعہ کو مان لے اور اپنی زندگی اس کے مطابق گزارے۔ اس کے مقابلہ میں کفر یہ ہے کہ آدمی اس حقیقتِ واقعہ کو نہ مانے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق بنانے کے لئے تیار نہ ہو۔

آگ جل رہی ہو تو آدمی یہ اختیار رکھتا ہے کہ اس کے اندر اپنا ہاتھ ڈال دے۔ مگر اختیار کے باوجود وہ آگ کے اندر اپنا ہاتھ نہیں ڈالتا۔ یہی حقیقتِ واقعہ کا اعتراف ہے۔ دنیا میں اگرچہ بظاہر آدمی کو پوری آزادی حاصل ہے۔ مگر یہ آزادی صرف جانچ کے لئے ہے۔ خدا انسان کو آزادی دے کر یہ جانچنا چاہتا ہے کہ وہ آزادی پاکر سرکشی کرتا ہے یا حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کر کے خدا کے آگے جھک جاتا ہے۔ جو شخص خدا کی خدائی کو تسلیم کر کے اپنی زندگی کو حقیقت کے مطابق بنائے، اس نے اسلام قبول کیا۔ ایسے شخص کے لئے خدا کے ابدی انعامات ہیں۔ اس کے برعکس جو شخص اس حقیقت کو نہ مانے اور خدا کو اپنا آقا اور اپنے آپ کو اس کا بندہ بنانے پر راضی نہ ہو اس نے کفر کیا۔ ایسے شخص کو خدا فیصلہ کے دن سخت سزا دے گا۔

جو شخص اسلام کا طریقہ اختیار کرے اس کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ اس کی سوچ صحیح ترین سوچ ہوتی ہے، کیونکہ وہ حقیقت واقعہ پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کا عمل صحیح ترین عمل ہوتا ہے کیونکہ وہ حقیقتِ واقعہ کے مطابق ہوتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ اس کا سلوک صحیح ترین سلوک ہوتا ہے کیونکہ وہ حقیقتِ واقعہ کو سامنے رکھ کر قائم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کافر ہر معاملہ میں حقیقتِ واقعہ کے خلاف چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا انجام کامل بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اسلامی زندگی

اسلام کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے ـــــــ اللہ کا ڈر اور بندوں کی خیر خواہی ۔
مسلمان وہ ہے جو اس حقیقت کو پالے کہ ساری طاقتیں صرف اللہ کے پاس ہیں اور انسان اس کے مقابلہ میں صرف ایک عاجز مخلوق ہے۔ دنیا میں بظاہر آدمی کو جو اختیار ملا ہوا ہے وہ صرف امتحان کے لئے ہے۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی خدا غیب کے پردے کو ہٹادے گا۔ اس وقت خدا کی خدائی اور اس کے مقابلہ میں انسان کی بے بسی اس طرح کھل جائے گی کہ آدمی بالکل ڈھ پڑے گا۔ اس دن وہ حقیقتوں کو اس طرح دیکھے گا کہ ان کو مانے بغیر اس کے لئے چارہ نہ ہوگا۔

مسلمان وہ ہے جو اس آنے والے دن کو اس کے آنے سے پہلے دیکھ لے۔ ایسا شخص دنیا میں اس طرح رہنے لگتا ہے جیسے وہ خدا کو اپنے اوپر نگرانی کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ وہ جب زبان کھولتا ہے تو اس کا ایمان اس کی زبان پکڑ لیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ بولو تو حق بات بولو ورنہ چپ رہو۔ وہ جب چلنا چاہتا ہے تو خدا کا خوف اس کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ چلو تو صحیح سمت میں چلو ورنہ اپنے قدموں کو چلنے سے روک لو۔ اس کا یہ احساس کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے اس کے اوپر نگراں بن کر چھا جاتا ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جس سے خدا راضی ہو۔ اور جس چیز سے خدا راضی نہ ہو اس کے کرنے کی اسے ہمت نہیں ہوتی ۔

ایسے آدمی کے دل میں بندوں کے لئے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ بندوں کو اسی مہربانی کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے جس نظر سے ان کا خدا انھیں دیکھ رہا ہے وہ بندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں اپنے آپ کو اسی بے لاگ انصاف کے ترازو پر کھڑا کر دیتا ہے جس بے لاگ انصاف کے ترازو پر کائنات کا خالق و مالک آخر کار سب کو کھڑا کرنے والا ہے

ساری تعریف اللہ کے لئے

ایک درخت ایک بے حد بامعنی واقعہ ہے مگر اس کو اپنی معنویت کا شعور نہیں۔ ایک پھول نفاست اور لطافت کا شاہکار ہے مگر کوئی پھول اپنی اس خصوصیت کو نہیں جانتا، ایک چڑیا بے حد حسین وجود ہے مگر کسی چڑیا کو اپنے حسن کا احساس نہیں۔ یہی حال دنیا کی تمام چیزوں کا ہے۔ دنیا کی ہر چیز حسین ترین آرٹ کا انتہائی کامل نمونہ ہے۔ مگر کسی چیز کو بھی اپنی اس حیثیت کا کوئی علم نہیں۔

پھر حسن ولطافت کی یہ نمائش گاہ کس کے لئے سجائی گئی ہے۔ یہ انسان کے لئے ہے۔ تمام معلوم کائنات میں انسان ہی واحد مخلوق ہے جو کسی چیز کے حسن کو دیکھتا ہے اور اس کی خوبیوں کو محسوس کر کے اس کی داد دے سکتا ہے۔ خدا نے دنیا کی صورت میں ایک حسین آرٹ بنایا اور انسان کو اس کی پرکھ دے کر اس کو زبان عطا کی تاکہ وہ خدا کی حسین تخلیق کو دیکھ کر جھوم اٹھے اور اپنی زبان سے اس کے خالق کو خراج تحسین پیش کرے۔ اسی کا نام حمد یا خدا کی تعریف ہے۔ حمد انسان کے اعلیٰ ترین جذبات کا وہ نذرانہ ہے جو خدا کے سامنے پیش ہونے کے لئے انسانی الفاظ میں ڈھل جاتے ہیں۔

حمد یہ ہے کہ ایک شخص دنیا میں خدا کی کاریگری کو دیکھے، وہ اس کے کمالات کو محسوس کر کے تڑپ اٹھے۔ اور پھر اس کی زبان سے بے تابانہ نکل پڑے کہ خدایا، ساری تعریف تیرے لئے ہے۔ تو پاک اور برتر ہے، خدایا تو مجھے اقرار کرنے والوں میں لکھ لے اور مجھ کو ان لوگوں میں نہ بنا جن کو تو اندھی حالت میں اٹھائے گا، کیونکہ انھوں نے تیرے حسن کو نہیں دیکھا، کیونکہ انھوں نے تیرے کمالات کا اعتراف نہیں کیا —— اللہ کو چلتے پھرتے اور اٹھتے بیٹھتے اس طرح یاد کرنے کا نام حمد ہے، خواہ کہنے والا اپنے کلمات کو عربی زبان میں کہے یا کسی دوسری زبان میں۔

پتھر کھسک گیا

بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے بیان کیا۔ سننے والوں میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان میں سے تین آدمی ایک سفر پر نکلے۔ چلتے چلتے رات ہو گئی تو رات گزارنے کے لئے وہ ایک غار میں داخل ہو گئے۔ پہاڑوں پر اکثر پتھر گرنے [Land Slide] کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ رات کے وقت اوپر سے ایک بڑا پتھر لڑھک کر گرا اور اس کی وجہ سے غار کا منھ بند ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ اس چٹان سے نجات کی ہمارے پاس اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں ہے کہ ہم اپنے نیک عمل کا واسطہ دے کر اللہ سے دعا کریں۔

اب ایک شخص دعا کرنے بیٹھا۔ اس نے کہا: خدایا، میرے باپ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ میرا معمول تھا کہ روزانہ شام کو جب میں اپنے جانور چرا کر لوٹتا تو جب تک میں ان دونوں کو دودھ نہ پلا لیتا نہ خود دودھ پیتا اور نہ کسی اور کو پلاتا۔ ایک دن میں چارہ کی تلاش میں دور نکل گیا۔ شام کو واپسی میں اتنی دیر ہوئی کہ میرے ماں باپ سو گئے۔ میں نے ان دونوں کے لئے دودھ نکال کر تیار کیا۔ جب ان کے پاس دودھ لے کر پہنچا تو دونوں کو سوتا ہوا پایا۔ مجھے یہ گوارا نہ ہوا کہ میں ان کو جگاؤں اور مجھ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ میں ان سے پہلے دودھ پیوں اور اپنے بچوں کو پلاؤں۔ میں ان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میرے ہاتھ میں پیالہ تھا اور میں اس انتظار میں تھا کہ جب وہ جاگیں تو میں ان کو دودھ پیش کروں۔ اسی حال میں صبح ہو گئی۔ بچے میرے پاؤں کے پاس بلبلاتے رہے۔ صبح کو وہ دونوں اٹھے اور انھوں نے دودھ پیا۔ اس کے بعد ہم سب لوگوں نے دودھ پیا۔ میرے اللہ یہ عمل اگر میں نے تیری رضا کے لئے کیا ہے تو اس چٹان کی مصیبت سے تو ہم کو نجات دے دے۔ چنانچہ چٹان تھوڑی سی کھسک گئی مگر اتنی زیادہ نہیں کہ وہ تینوں نکل سکیں۔

اب دوسرے آدمی نے دعا شروع کی۔ اس نے کہا: خدایا، میرے چچا کی ایک لڑکی تھی۔ وہ مجھ کو بہت محبوب تھی، اس سے مجھ کو اسی قسم کی شدید محبت تھی جو مردوں کو عورتوں سے ہوتی ہے۔ میں نے اس سے اپنے نفس کی خواہش پوری کرنی چاہی مگر وہ منع کرتی رہی۔ کچھ عرصہ بعد وہ قحط سالی کی مصیبت میں پریشان ہوئی۔ وہ مدد کے لئے میرے پاس آئی۔ میں نے اس کو ۱۲۰ دینار اس شرط پر دئے کہ وہ مجھ کو اپنے اوپر قابو دے دے۔ وہ اس کے لئے تیار ہو گئی۔ یہاں تک کہ جب میں اس کے اوپر پوری طرح قادر ہو گیا اور اس کے دونوں پیروں کے درمیان بیٹھ گیا تو اس نے کہا: خدا سے ڈر اور مہر کو اس کے حق کے بغیر نہ توڑ۔ میں اس سے باز آ گیا حالاں کہ وہ مجھ کو

لئے۔ خدایا، اگر میں نے یہ کام تیری رضا کے لئے کیا ہے تو اس مصیبت سے تو ہم کو نجات دے دے جس میں ہم اس وقت پھنسے ہوئے ہیں۔ چنانچہ چٹان تھوڑی سی ہٹ گئی مگر اتنی نہیں کہ وہ نکل سکیں۔

اب تیسرے آدمی نے دعا کی۔ اس نے کہا۔ خدایا، میں نے کچھ مزدور اجرت پر رکھے۔ کام کے بعد میں نے سب کو اجرت دے دی۔ مگر ایک مزدور اپنی اجرت چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے اس کی چھوڑی ہوئی رقم کو کاروبار میں لگا دیا۔ اس سے مجھ کو بہت زیادہ مالی فائدہ ہوا۔ کچھ عرصہ بعد وہ آدمی واپس آیا اور کہا: اے اللہ کے بندے، میری اجرت مجھ کو دے دے۔ میں نے اس سے کہا: یہ اونٹ، یہ گائیں، یہ بکریاں اور یہ غلام جو تم دیکھ رہے ہو یہ سب تمھاری مزدوری ہے۔ اس نے کہا: اے خدا کے بندے، مجھ سے مذاق نہ کر۔ میں نے کہا کہ میں تم سے مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ یہ سب تمھارا ہی ہے۔ اس کے بعد اس نے سب چیزیں لیں اور ان کو اس طرح ہنکا لے گیا کہ ان میں سے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ خدایا، اگر یہ میں نے تیری رضا کے لئے کیا ہے تو اس مصیبت سے تو ہم کو نجات دے دے۔ اس کے بعد چٹان ہٹ گئی اور وہ تینوں باہر نکل کر روانہ ہو گئے (بخاری ومسلم)

یہ روایت صحیحین میں آئی ہے اور اس کے واقعہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دعا ایسی چیز ہے جو پتھر کی چٹان کو بھی اپنی جگہ سے کھسکا دیتی ہے۔ مگر یہ وہ دعا نہیں ہے جو زبان سے بس الفاظ کی صورت میں نکلتی ہے اور آدمی کی حقیقی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مذکورہ مثال بتاتی ہے کہ دعا سے چٹان کھسکنے کا واقعہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے تابع کر دیں، جو اپنے اوپر خدا کو نگراں بنالیں۔ حتی کہ بھوک کی شدت اور بیوی بچوں کی محبت بھی ان کو خدا کی پسندیدہ راہ سے نہ ہٹا سکے۔ انتہائی نازک جذباتی مواقع پر بھی خدا کی یاد دلانا ان کو چونکا دینے کے لئے کافی ہو، ہیجان خیز لمحات میں بھی جب خدا کا نام لے لیا جائے تو ان کے چلتے ہوئے قدم رک جائیں، اور ان کے اٹھے ہوئے ہاتھ اپنی حرکت بند کر دیں۔ آخرت کے حساب کا اندیشہ ان پر اتنا زیادہ طاری ہو کہ ایک حق دار کا حق ادا کرنے کی خاطر اگر ان کو اپنا سارا اثاثہ دے دینا پڑے تو اس سے بھی وہ دریغ نہ کریں۔ ایک آدمی اگر اپنا مطالبہ لے کر ان کے سامنے کھڑا ہو جائے تو وہ فوراً اس کو مان لیں خواہ مطالبہ کرنے والا کتنا ہی بے زور ہو اور اس کے مقابلہ میں ان کو کتنی ہی زیادہ قوت حاصل ہو۔

خدا کے بندے وہ ہیں جو اپنے نفس کو کچلنے اور اپنے فائدوں کو ذبح کرنے کی قیمت پر خدا کو اختیار کرتے ہیں اور جو لوگ اس طرح خدا کو اپنا لیں وہ اگر کہیں کہ خدایا تو اس پتھر کی چٹان کو کھسکا دے تو خدا پتھر کی چٹان کو بھی ان کے لئے کھسکا دیتا ہے۔

صبر، صبر، صبر

انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ حد درجہ خود پسند واقع ہوا ہے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ اپنے کو عزت اور بڑائی کے مقام پر دیکھے، ہر آدمی چاہتا ہے کہ اس کی رائے سب سے اچھی رائے سمجھی جائے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے حق کے سفر کو موجودہ دنیا میں مشکل ترین سفر بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کروروں انسانوں میں ہر آدمی جب اپنے کو صحیح سمجھے تو کون کس کی بات سنے گا اور کون حق کو حق سمجھ کر قبول کرے گا۔

مگر یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ خدا کا محبوب بندہ وہ ہے جو "میں پرستوں" کے ہجوم میں اپنے کو "بے میں" بنالے۔ جو اپنی خود پسندی کو خدا پسندی میں تحلیل کر دے۔ جو اپنی بات کے مقابلہ میں حق کی بات کو اختیار کرلے۔ جو دنیا کی عزت کے مقابلہ میں آخرت کی عزت کو اہمیت دینے لگے۔ لوگوں کی طرف سے خواہ کتنی ہی تلخیاں پیش آئیں وہ اپنی طرف سے منفی رویہ کا اظہار نہ کرے۔ اسی کا نام صبر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بے حد مشکل راستہ ہے۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ یہی وہ راستہ ہے جو کسی آدمی کو جنت کی طرف لے جانے والا ہے۔ جنت صبر کرنے والوں کو ملتی ہے اور صبر کرنے والا وہ ہے جو اللہ کی خاطر اپنے آپ کو کچل ڈالے۔

حق کا سفر جنت کا سفر ہے۔ اور جنت کے متعلق حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ وہ ناخوش گواریوں سے ڈھانک دی گئی ہے (حجبت النار بالشہوات وحجبت الجنۃ بالمکارہ) اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اپنی دنیا کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ یہاں جنت کی طرف بڑھنے والے کے لئے ناخوش گوار حالات سے گزرے بغیر چارہ نہیں۔ جو شخص بھی جنت کا مسافر بننا چاہے اس کو پہلے ہی جان لینا چاہئے کہ وہ ایک ایسے راستہ پر چلنے کا ارادہ کر رہا ہے جس میں لوگوں کی طرف سے تلخ باتیں آئیں گی، جس میں طویل انتظار کی مشقت برداشت کرنی ہوگی جس میں مخالفین کی طرف سے طرح طرح کی دل آزاری کی باتیں پیش آئیں گی۔ حتیٰ کہ کبھی جارحانہ کارروائیوں کا سامنا ہوگا۔ ان مواقع پر حق کا مسافر اگر صبر کھو دے، اگر وہ بے برداشت ہو جائے تو وہ یا تو بددل ہو کر اپنا راستہ بدل لے گا یا درمیان کے کانٹوں سے الجھ کر رہ جائے گا اور آگے نہ بڑھ سکے گا۔

جنت کا سفر تمام کا تمام صبر کا سفر ہے۔ جنت میں وہی شخص پہنچے گا جو صبر کی تلخیوں کو سہنے کے لئے تیار ہو، جو جذبات کی پامالی پر بھی بے ہمت ہونا نہ جانے، جو نفس کی ہر چوٹ کو اپنے سینہ کی ویرانیوں میں چھپالے۔

نتیجہ پسند بنئے

ایک شخص زمین کی قوت کشش کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اس کے سامنے درخت کا معاملہ آتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ درخت کی جڑیں زمین میں نیچے کی طرف چلی جارہی ہیں۔ وہ فوراً رائے قائم کرلیتا ہے کہ جڑوں کا نیچے کی طرف جانا زمین کی کشش کی وجہ سے ہے۔ پھر اس کا ذہن دوسرے پہلو کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ درخت کا تنہ اور اس کی شاخیں اوپر کی طرف اٹھ رہی ہیں "درخت کی جڑیں اگر زمین کی کشش کی وجہ سے نیچے کی طرف جاتی ہیں تو اسی درخت کی شاخیں اوپر کی طرف کیوں اٹھتی ہیں" یہ سوال اس کے ذہن کو حیرانی میں ڈال دیتا ہے۔

ہر سائنس داں کو اپنی تحقیق کے دوران اس قسم کے سوالات سے سابقہ پیش آتا ہے جو اس کو سرگشتگی میں ڈالنے والا ہو۔ ایسے موقع پر سائنس داں کیا کرتا ہے۔ وہ یہ کرتا ہے کہ یا تو "شاخوں" کے اوپر کی طرف اٹھنے کے سوال کو اپنی تحقیق سے غیر متعلق سمجھ کر حذف کر دیتا ہے۔ یا وہ ایسا کرتا ہے کہ کوئی کام چلاؤ (Workable) مفروضہ قائم کرکے دیگر سوالات کو اس کے خانہ میں ڈال دیتا ہے اور اپنی تحقیق کے براہ راست کام کو جاری رکھتا ہے۔ اگر سائنس داں ایسا نہ کرے تو اس کی تحقیق کبھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی۔

موجودہ دنیا میں کسی مفید نتیجہ تک پہنچنے کا یہی واحد علمی طریقہ ہے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جو ہمارے تمام قیاس و گمان سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس کو جاننے کے لئے ہماری صلاحیتیں انتہائی محدود ہیں۔ ہم حقیقتوں کو صرف جزئی طور پر ہی جان سکتے ہیں۔ اس لئے ہر حقیقت پسند آدمی یہ کرتا ہے کہ وہ نتیجہ کو سامنے رکھتا ہے نہ کہ تفصیلات کو۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں تمام تفصیلات کو اس کی آخری حد تک متعین کرنا چاہوں تو ایسا ممکن نہ ہوگا اور میں کبھی کامیابی تک نہ پہنچ سکوں گا۔

دین کے معاملہ میں بھی صحیح طریقہ یہی ہے۔ جو لوگ دین کو علمی طریق پر سمجھنا چاہتے ہیں ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں بھی وہ اسی علمی طریقہ کو اختیار کرکے کامیاب ہو سکتے ہیں جو دوسرے علمی شعبوں میں اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی اپنی محدودیت کو تسلیم کرنا اور غیر ضروری بحثوں کو حذف کرتے ہوئے ایک نتیجہ پسند انسان کی طرح اپنی تلاش کو آگے لے جانا۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ وہ دین کو اس وقت مانیں گے جب کہ وہ تمام عقلی سوالات کا تشفی بخش جواب دیدے۔ وہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ اس قسم کا رویہ قطعاً غیر علمی ہے۔ دین کے علاوہ چیزوں میں کوئی بھی مکمل عقلی تشفی کی شرط نہیں لگاتا، پھر دین ہی کے معاملہ میں ایسی شرط کیوں ضروری ہو۔

دلیل کی بے تاثیری

میلووان جیلاس ([Miloan Djilas]) یوگوسلاویہ کی کمیونسٹ پارٹی کے صدر تھے۔ یوگوسلاویہ میں اشتراکی حکومت بنی تو ان کو حکومت میں ایک بڑا عہدہ ملا۔ مگر روس میں اشتراکیت کے تجربہ سے ان کو سخت مایوسی ہوئی۔ انھوں نے اشتراکی سماج کی صورت میں ایک ایسے سماج کا خواب دیکھا تھا جس میں طبقات ختم ہو گئے ہوں اور یکساں حالات میں ہر ایک کو زندگی گزارنے کا موقع ملے۔ مگر روس میں اشتراکی انقلاب آیا تو وہاں شدید تر انداز میں ایک نئی طبقاتی تقسیم قائم ہو گئی۔ ایک حکمراں طبقہ، دوسرا غیر حکمراں طبقہ۔ دونوں طبقات میں اس سے بھی زیادہ بڑا فرق تھا جو سرمایہ دارانہ نظام میں یا شہنشاہی دور میں پایا جاتا تھا۔ اشتراکی انقلاب صرف ایک نئے شدید تر طبقہ کی پیدائش کے ہم معنی بن کر رہ گیا۔ اب ان کے ضمیر نے احتجاج کیا اور انھوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا نیا طبقہ (نیو کلاس) ۱۹۵۶ میں یہ کتاب شائع ہوئی تو ساری دنیا میں ایک ہل چل مچ گئی۔ اس کے لاکھوں نسخے فروخت ہو گئے۔ ریڈرز ڈائجسٹ نے اس پر تعارفی مضمون شائع کیا تو اس کا عنوان اس نے ان لفظوں میں قائم کیا:

The Book That Is Shaking The Communist world

(وہ کتاب جس نے کمیونسٹ دنیا کو ہلا دیا ہے) مگر ہم جانتے ہیں کہ عملاً جو کچھ ہوا وہ یہ کہ میلووان جیلاس جیل میں پڑے پڑے مر گئے اور کمیونسٹ دنیا بدستور اپنی شان و شوکت کے ساتھ موجود ہے۔

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میلووان جیلاس ناحق پر تھے اور کمیونسٹ دنیا حق پر۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ میلووان جیلاس کے پاس لفظی استدلال کی طاقت تھی۔ جب کہ کمیونسٹ دنیا سیاسی اور اقتصادی قوتوں سے مسلح ہے۔ جب بھی دو فریقوں میں اس قسم کا فرق ہو تو خواہ صداقت تمام تر فریق اول کی طرف کیوں نہ ہو، وہ عملی دنیا میں بے وزن ہو جاتا ہے اور کامیابی اس کو ملتی ہے جس نے مادی طاقتوں کا زور اپنے پاس جمع کر لیا ہو۔

انسان کا ضمیر سب سے زیادہ جس چیز کو وزن دیتا ہے وہ دلیل ہے۔ انسان کی پوری اندرونی ہستی کا تقاضا ہے کہ جو بات دلیل سے ثابت ہو جائے وہ حق ٹھہرے اور جس بات کے پیچھے دلیل نہ ہو وہ ناحق قرار پائے اس کو دنیا میں کوئی جگہ نہ ملے۔ مگر موجودہ دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کے موجودہ نظام میں دلیل کے اندر کوئی ذاتی طاقت نہیں۔ یہاں یہ ممکن ہے کہ ایک شخص دلیل کے اعتبار سے بالکل خالی ہو کر خوبصورت الفاظ کا دریا بہا سکے۔ استدلالی جواز نہ رکھتے ہوئے بھی وہ زمین پر کھڑا ہونے کی کوئی بنیاد پائے۔ دلیل سے محروم ہونے کے باوجود وہ محض طاقت کے زور پر دنیا میں اپنی جگہ حاصل کر لے۔

انسان کے ضمیر اور واقعہ میں یہ تضاد بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا نامکمل ہے۔ انسانی عقل اور انسانی ضمیر کے مطابق مکمل دنیا وہ ہوگی جہاں دلیل ہی سب کچھ ہو۔ اور بے دلیل ہونا اور بے قیمت ہونا دونوں ہم معنی

الفاظ بن جائیں۔ "جو کچھ ہے" اور "جو کچھ ہونا چاہئے" کا یہ فرق خود ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ موجودہ دنیا میں کوئی بنیادی کمی ہے۔ ابھی یہاں ایک اور انقلاب درکار ہے جو اس کے ڈھانچہ میں ایسی تبدیلی کرے کہ جو کچھ ہے اور جو کچھ ہونا چاہئے کا فرق ختم ہو جائے۔ انسان کا ضمیر جو کچھ چاہتا ہے وہی عملاً بھی دنیا میں قائم ہو جائے۔

آخرت اسی قسم کی ایک دنیا کا نام ہے۔ آخرت وہ مقام ہے جہاں دلیل اور معقولیت ہی کا نام طاقت ہوگا اور بے دلیل اور غیر معقول ہونا بے طاقتی کے ہم معنی بن جائے گا۔ عزت اور سرفرازی صرف اس کو ملے گی جو حق کی زمین پر کھڑا ہو اور وہ شخص ذلیل اور حقیر بن جائے گا جو نامعقولیت کے سہارے اپنا کاروبار چلا رہا تھا۔

"کیا ہے" اور "کیا ہونا چاہئے" کا یہ تضاد صرف انسانی زندگی میں پایا جاتا ہے۔ بقیہ تمام کائنات اس قسم کے تضاد سے بالکل خالی ہے۔ زمین و آسمان کا پورا نظام ٹھیک اسی طرح چل رہا ہے جیسا کہ اسے چلنا چاہئے۔ سورج اس صحیح ترین مقدار میں روشنی اور حرارت پہنچاتا ہے جو انسان کو درکار ہے۔ پانی اور ہوا میں گیسوں کا تناسب عین ہماری ضرورت کے مطابق ہے۔ درخت ٹھیک اس فطرت پر اگتے اور بڑھتے ہیں جو ان کے لئے مقرر ہے۔ شہد کی مکھیاں فطرت کے عین نقشہ کے مطابق اپنا غذائی کارخانہ چلاتی ہیں۔ غرض کائنات کا ہر جزء انتہائی معیاری صورت میں اپنا کام انجام دے رہا ہے۔ یہ صرف انسان ہے جس کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔

انسان ایک مکمل طور پر معیاری دنیا میں ایک مکمل طور پر غیر معیاری طریقہ اپنائے ہوئے ہے۔ دوسری طرف یہ کہ موجودہ دنیا میں ہر چیز پابند ہے۔ یہ صرف انسان ہے جو یہاں خود مختار حیثیت رکھتا ہے۔ ان دونوں حقیقتوں کو سامنے رکھئے تو اس صورت حال کی سب سے زیادہ قابل فہم توجیہہ یہ بنتی ہے کہ جو رویہ بقیہ کائنات سے مجبورانہ طور پر مطلوب ہے اسی رویہ کا ثبوت انسان کو آزادانہ طور پر دینا ہے۔ بقیہ کائنات کی فلاح یہ ہے کہ وہ محکومیت کی بنا پر محکوم رہے اور انسان کی فلاح یہ ہے کہ وہ آزاد ہوتے ہوئے خود اپنے ارادہ سے اپنے کو خدا کا محکوم بنا لے۔

حق آدمی کے سامنے "دلیل" کی صورت میں آتا ہے۔ آدمی اس کو ٹھکرا دیتا ہے، بے معنی الفاظ بول کر وہ اسے رد کر دیتا ہے۔ اس کے باوجود آدمی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس کے معاملات اور کاروبار میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔ یہ صورت حال آدمی کو غلط فہمی میں ڈال دیتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ حق اور ناحق کا معاملہ کوئی سنجیدہ معاملہ نہیں ہے۔ زندگی میں اصل چیز مفادات اور مصالح ہیں اور مفاد اور مصلحت اگر محفوظ ہے تو کسی پریشانی میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

مگر یہ سب سے بڑا دھوکہ ہے جس میں کوئی انسان مبتلا ہوتا ہے۔ مفاد اور مصلحت تو وہ حالات ہیں جن میں کسی کا امتحان کیا جا رہا ہے نہ کہ وہ نتیجہ جو امتحان کی بنیاد پر کسی کو ملنے والا ہے۔ اس طالب علم سے زیادہ نادان کون ہوگا جو امتحان کے پرچہ کو اپنے "قبضہ" میں پا کر خوش ہو جائے اور یہ نہ سوچے کہ وہ اس پرچہ کے حل کے بارے میں کس قسم کی اہلیت کا ثبوت اپنے ممتحن کے سامنے پیش کر رہا ہے۔

تنظیم

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان میں بارہ نقیب مقرر کئے اور اللہ نے ان سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو اور میرے رسولوں کو مانو اور ان کی مدد کرو اور اللہ کو قرض حسن دو۔ اگر تم ایسا کرو تو یقیناً میں تمہاری برائیوں کو تم سے دور کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ پس اس کے بعد تم میں سے جس نے انکار کیا تو اس نے سواء السبیل کھو دی (مائدہ ۱۲)

ایک دانہ کے اندر خدا نے ایک سرسبز و شاداب پودا چھپا رکھا ہے اور ایک گٹھلی کے اندر ایک پورا درخت موجود ہے۔ مگر یہ امکانات صرف اس وقت بروئے کار آتے ہیں جب کہ دانہ یا گٹھلی کو مٹی میں ڈالا جائے۔ اگر ان کو شیشہ کی میز پر سجا کر رکھ دیا جائے تو نہ دانہ سے پودا نکلے گا اور نہ گٹھلی کبھی درخت کی صورت اختیار کرے گی۔ اسی طرح اللہ نے دنیا کی ہر چیز کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔ یہ قاعدہ ہمیشہ کے لئے اٹل ہے۔ ہر چیز اسی مقررہ قاعدہ پر قائم ہوتی ہے اور اسی کے مطابق بڑھتی ہے۔ اگر اس قاعدہ کی خلاف ورزی کی جائے تو کبھی مطلوبہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ جو قوم آسمانی کتاب کی حامل ہو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا مخصوص ضابطہ ہے۔ ایسی قوم کس طرح زمین میں جڑ پکڑتی ہے اور دنیا و آخرت میں فلاح حاصل کرتی ہے، اس کا ضابطہ مذکورہ آیت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس قرآنی ضابطہ کو یہاں سواء السبیل کہا گیا ہے۔

سواء السبیل (اللہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ) یہ ہے کہ آدمی دنیا میں ایک قسم کی پابند زندگی گزارے۔ وہ اس طرح رہے گویا کہ وہ خدا کے عہد کی رسی میں بندھا ہوا ہے۔ اس عہد کی زندگی کی پہلی شرط، ایمان کے بعد، یہ ہے کہ آدمی نماز قائم کرے یعنی اللہ کے آگے اپنے کو جھکا دے، وہ اللہ کی قربت تلاش کرنے والا بن جائے۔ پھر وہ زکوٰۃ ادا کرے یعنی وہ دوسرے بندوں کا اس حد تک خیر خواہ ہو کہ اپنی کمائی میں ان کا لازمی حق سمجھنے لگے۔ پھر یہ کہ اللہ کے دین کی دعوت کے معاملہ میں وہ غیر جانب دار نہ رہے، بلکہ اس میں اپنے آپ کو پوری طرح شامل کرے، وہ داعیان دین کی مدد کرے۔ اپنے بہترین اثاثہ کو اس کام کو مؤثر اور طاقت ور بنانے میں لگا دے۔ یہی وہ عہد کی زندگی ہے جو ہر فرد مسلم سے مطلوب ہے، اس زندگی کو اختیار کئے بغیر کوئی شخص خدا کی قربت و معیت حاصل نہیں کر سکتا اور نہ اس قابل قرار پا سکتا کہ خدا اس کی مدد کرے۔

اس خدا پرستانہ زندگی کو اس کی صحیح صورت میں باقی رکھنے کے لئے تنظیم کا حکم دیا گیا ہے۔ ہر مسلم معاشرہ کے اوپر خدا کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے درمیان سمع و طاعت کا نظام قائم کرے۔ یعنی وہ اپنے اندر سے کچھ لوگوں کو

اپنا سربراہ مقرر کرے اور جب ان کا تقرر ہو جائے تو پسند ناپسند کو نظر انداز کر کے ان کی اطاعت کرے۔ نماز کی باقاعدہ اقامت، زکوٰۃ کی اجتماعی وصولی اور تقسیم، دعوت دین کا عمومی نظام، سب اسی وقت بہتر طور پر ادا ہو سکتے ہیں جب کہ مسلمانوں کے درمیان اجتماعی نظم قائم ہو، ان میں کچھ ایسے لوگ مقرر ہوں جو اس کی نگرانی کریں اور تمام لوگ اس کو ایک دینی فریضہ سمجھ کر اپنے سربراہوں کی اطاعت کریں۔

اس تنظیم سے مراد حکومتی تنظیم نہیں ہے۔ بلکہ وہ تنظیم ہے جو ہر حال میں مسلمانوں کے اپنے بس میں ہے، خواہ ان کے پاس سیاسی اقتدار ہو یا نہ ہو۔ اسلامی تنظیم حقیقۃً ایک عبادت ہے اور عبادت وہی مطلوب اور نتیجہ خیز ہے جو اختیاری طور پر ہو نہ کہ کسی خارجی دباؤ کے تحت۔ اسلامی تنظیم دراصل اس بات کی ایک دنیوی علامت ہے کہ آدمی نے اپنے آپ کو خدا کے حکم کے حوالے کر دیا ہے۔ اسلامی تنظیم میں اپنے کو باندھنا گویا خدائی اطاعت کے امتحان میں پورا اترنا ہے اور اسلامی تنظیم میں بندھنے کے لئے تیار نہ ہونا گویا اس خدائی امتحان میں ناکام ہو جانا ہے۔

مزید یہ کہ سیاسی اقتدار بذات خود تنظیم کے وجود کا ضامن نہیں ہے۔ حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی رضؓ کے زمانہ میں حکومتی اقتدار موجود تھا، اس کے باوجود مسلمانوں کی تنظیم منتشر ہو گئی۔ اسی طرح بعد کے دور میں بھی اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تنظیم سے مراد ویسی ہی ایک اختیاری تنظیم ہے جیسی کہ مسجد میں امام کی سربراہی میں نماز کی جماعت بندی کے لئے ہر روز ہوتی ہے۔ یہ اللہ کی خاطر اپنی آزادی پر پابندی لگانا ہے۔ یہ تمام تر ایک اختیاری تنظیم ہے اور اس کا ثواب کسی آدمی کو صرف اس وقت ملے گا جب کہ اس نے اپنے آزاد ارادہ سے اس کی ماتحتی قبول کی ہو۔ جبر کے تحت قائم شدہ تنظیم بعض دنیوی فائدے دے سکتی ہے مگر وہ آدمی کو خدا کے یہاں ثواب کا مستحق نہیں بناتی، نہ اس سے وہ برکتیں ظاہر ہو سکتیں جو حقیقی اسلامی تنظیم کے لئے خدا نے مقدر کی ہیں۔

دور نبوت میں اس قسم کی تنظیم کی ایک مثال وہ ہے جو ابتدائی دور میں مدینہ میں اختیار کی گئی۔ ہجرت سے پہلے مدینہ کے ۷۳ آدمی مکہ پہنچے اور آپ سے بیعت ہوئے۔ اس وقت مدینہ میں اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ مگر آپ نے بیعت کے بعد ان سے کہا کہ تم لوگ بارہ آدمی منتخب کرو جن کو میں تمہارے اوپر نقیب (نگراں) بنا دوں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اندر سے بارہ آدمی چنے۔ آپ نے ان کو مدینہ کے مسلمانوں پر نگراں مقرر فرمایا اور کہا کہ تم اپنی قوم کی اجتماعی دیکھ بھال کے ذمہ دار ہو (انتم کفلاء علی قومکم) مسلمان عرب سے نکل کر جب مختلف ملکوں میں گئے تو اسی طرح وہ اپنی تنظیم بنا کر اس کی ماتحتی میں منظم زندگی گزارتے رہے۔ جب تک انھوں نے ایسا کیا ان کے اوپر خدا کا سایہ باقی رہا۔ جب انھوں نے تنظیمی پابندی قبول کرنے سے انکار کر دیا تو خدا کا سایہ بھی ان کے اوپر سے اٹھ گیا اور وہ دوسری قوموں کے حوالے کر دئے گئے۔

جو لوگ اپنے آزاد ارادہ سے اپنے کو ایک اسلامی تنظیم کا پابند کریں وہ اس بات کا ثبوت دیتے ہیں

کہ وہ بےنفس لوگ ہیں، انھوں نے اللہ کی خاطر اپنی انانیت کو ختم کر دیا ہے۔ اس طرح اپنے آپ کو بےنفس بنالینا موجودہ دنیا کی سب سے بڑی نیکی ہے۔ اللہ کی نظر میں جو لوگ اس معیار پر پورے اتریں ان کے لئے وہ اپنی ہر قسم کی نعمتیں انڈیل دیتا ہے، وہ دنیا میں بھی عزت اور غلبہ حاصل کرتے ہیں اور آخرت کی سرفرازی بھی ان کے لئے مقدر کر دی جاتی ہے۔ جو لوگ بےنفسی کی حد تک خدا کے فرماں بردار بن جائیں ان کے سامنے جب کوئی صحیح بات آتی ہے تو وہ فوراً اس کو مان لیتے ہیں۔ ان کا باہمی اتحاد کبھی نہیں ٹوٹتا۔ وہ انصاف کے راستہ کو کبھی نہیں چھوڑتے۔ ان کی بےنفسی ان کو ہر اس چیز کی طرف بڑھنے سے روک دیتی ہے جو دنیا و آخرت میں برباد کرنے والی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا و آخرت کی تمام بھلائیوں کا راز بےنفسی ہے۔ اور کوئی آدمی بےنفس بنا ہے یا نہیں، اس کا سب سے بڑا ثبوت تنظیم کے ذریعہ ملتا ہے۔ تنظیمی زندگی میں اپنے کو باندھنا اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ آدمی نفسانی محرکات سے اوپر اٹھ گیا ہو۔ وہ تنقید اور تعریف سے بلند ہو۔ وہ اختلاف اور اتفاق کی بنیاد پر کسی کے بارے میں رائے قائم نہ کرتا ہو۔ اس کا رویہ پسند ناپسند کی بنیاد پر نہ بنتا ہو۔ وہ اس سے بےنیاز ہو چکا ہو کہ اس کو کیا ملا اور کیا نہیں ملا۔ تنظیمی زندگی میں اس طرح کے مواقع بار بار آتے ہیں۔ اگر آدمی ان چیزوں سے اوپر اٹھا ہوا نہ ہو تو وہ اسی قسم کی باتوں میں الجھ کر رہ جائے گا اور تنظیم کی پابندی کو قبول کرنے میں ناکام رہے گا۔

اللہ کے مومن بندوں پر اللہ کی دو سب سے بڑی نعمتیں نازل ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خدا کی نصرت کے مستحق بن جاتے ہیں، وہ دنیا میں اپنے مخالفین کے مقابلہ میں خدا کی مدد سے غالب آتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ موت کے بعد وہ جہنم سے بچا کر جنت میں داخل کر دئے جاتے ہیں۔ اللہ کی یہ دونوں نعمتیں صرف ان لوگوں کے لئے ہیں جو اللہ کی خاطر اپنی انفرادیت کو ختم کر کے اجتماعیت کے بندھن میں بندھ جائیں اور اس کے تحت اپنی دینی اور اخلاقی زندگی کو منظم کریں۔

جو لوگ اپنے آپ کو اللہ میں اس طرح شامل کر لیں کہ اپنی انفرادیت کو وہ اس کے حوالے کر دیں، ان کی طاقت بےپناہ ہو جاتی ہے، کیوں کہ ان کے درمیان وہ تمام اسباب بالکل ختم ہو جاتے ہیں جو ایک کو دوسرے سے جدا کرنے والے ہیں۔ اجتماعیت کو توڑنے والی چیز انفرادیت پر اصرار ہے اور اپنی انفرادیت کو اللہ کے حوالے کر کے پہلے ہی وہ اس سے اوپر اٹھ چکے ہیں۔ ایسے لوگوں کا پورا گروہ ایک متحدہ طاقت میں ڈھل جاتا ہے۔ اور جہاں اتحاد ہو وہاں مغلوبیت کا گزر نہیں۔

جو لوگ انفرادی قربانی کی سطح پر دین کو اختیار کر لیں، ان کی زندگی خدا رخی زندگی بن جاتی ہے۔ وہ اس شاہ راہ پر چل پڑتے ہیں جو خدا کی قربت اور اس کی جنت کی طرف جانے والی ہے۔ ان کا سفر کبھی کھوٹا نہیں ہوتا، وہ کبھی راستہ کے دائیں بائیں نہیں مڑتے۔ وہ دین کے سیدھے راستے پر چلتے رہتے ہیں یہاں تک کہ خدا کی جنت میں پہنچ جاتے ہیں۔

محنت کی کمائی سب سے بہتر ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا ـــــــ اے خدا کے رسول، سب سے بہتر کمائی کون سی ہے ۔ آپ نے جواب دیا : ہاتھ کی کمائی (عمل الید)

کمانے والا اپنے کو افضل نہ سمجھے

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دو بھائی تھے۔ ایک بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کرتا تھا اور دوسرا بھائی گھر کے لئے کمائی کرتا تھا۔ کمائی کرنے والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے بھائی کی شکایت کی (کہ وہ کام نہیں کرتا، مجھ کو تنہا دونوں کے لئے کمانا پڑتا ہے) آپ نے فرمایا: شاید تم کو روزی اسی کے سبب سے ملتی ہو (لعلک ترزق بہ ، ریاض الصالحین صفحہ ۲۵)

کسی کی مدد کے لئے دوڑنا بہت بڑی عبادت ہے

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ مدینہ کی مسجد نبوی میں معتکف تھے۔ ایک شخص آکر آپ کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے چہرہ پر پریشانی کے آثار دیکھ کر آپ نے اس سے پریشانی کا سبب پوچھا۔ اس نے جواب دیا: فلاں آدمی کا قرض میرے اوپر ہے۔ اور اس قبر والے کی حرمت کی قسم، میں وہ قرض ادا کرنے پر قادر نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا، پھر کیا میں اس قرض خواہ سے بات کروں۔ آدمی نے کہا ضرور۔ آپ فوراً مسجد سے نکل کر چلنے لگے ۔ آدمی نے کہا، آپ تو اعتکاف میں ہیں، کیا آپ بھول گئے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا نہیں، میں بھولا نہیں ہوں۔ بلکہ میں نے اس قبر والے (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا ہے، اور یہ ابھی گویا کل کی بات ہے، یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، کہ جو شخص اپنے بھائی کی حاجت کے لئے چلے اور اس میں پوری کوشش کرے تو اس کا یہ عمل دس سال اعتکاف کرنے سے بہتر ہے (من مشی فی حاجۃ اخیہ وبلغ فیہا کان خیرا من اعتکاف عشر سنین، بیہقی)

اللہ پر بھروسہ سب سے بڑی طاقت ہے

اسلاف میں سے بعض بزرگوں نے فرمایا: جو یہ خوشی حاصل کرنا چاہے کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ قوی بن جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ اللہ پر بھروسہ کرے (من سرہ ان یکون اقوی الناس فلیتوکل علی اللہ)

ایمان داری کے ساتھ شرکت کرنے والوں کا ساتھی خدا ہوتا ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب دو آدمی مل کر کام کرتے ہیں تو میں ان دو کا تیسرا ہوتا ہوں جب تک ان میں سے کوئی خیانت نہ کرے۔ پھر جب ان میں سے کوئی خیانت کرے تو میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں اور اس کے بعد وہاں شیطان آجاتا ہے ۔

نیچے والوں کی ضرورت اوپر والوں تک پہنچاؤ

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے حاکم تک ایسے شخص کی

ضرورت پہنچا دی جو خود نہیں پہنچا سکتا تھا، اللہ تعالی پل صراط پر اس کو ثابت قدم رکھیں گے جب کہ لوگوں کے قدم ڈگمگا جائیں گے (من ابلغ ذا سلطان حاجة من لا يستطيع ابلاغه ثبت الله قدمه على الصراط يوم تزل الاقدام، رزين وبزار)

دینے والے کو دیا جاتا ہے

ایک حدیث قدسی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ اللہ تعالی نے فرمایا: اے ابن آدم، خرچ کرو تو تمھارے اوپر خرچ کیا جائے گا (انفق يا ابن آدم ينفق عليك، رواه البخاری ومسلم)

سب سے زیادہ ضرورت کے وقت سب سے زیادہ بے سہارا

حضرت عمر نے ایک روز کہا کہ رات میں نے ایک ایسی آیت پڑھی جس نے ساری رات مجھے سونے نہیں دیا:

ایود احدکم ان تکون لہ جنة من نخیل واعناب ..... بقرہ - ۲۶۶

آپ نے لوگوں سے پوچھا، اس کا مطلب کیا ہے، کسی کے لئے یہ محض کھجوروں اور انگوروں کی مثال تھی، کسی کے نزدیک یہ ایک پر اسرار آیت تھی جس کے لئے صرف اللہ اعلم کہنا کافی ہو۔ مجلس میں حضرت عبداللہ بن مسعود بھی تھے جو چپکے چپکے کچھ کہہ رہے تھے۔ حضرت عمر نے فرمایا اے میرے بھتیجے! کہہ اور اپنے کو حقیر نہ سمجھ۔ انھوں نے کہا اس سے عمل مراد لیا گیا ہے۔ حضرت عمر نے پوچھا کیسے۔ عبداللہ بن مسعود نے کہا: ایک چیز میرے دل میں القا کی گئی اور میں نے کہہ دیا (شیٔ القی فی روعی فقلته) حضرت عمر نے کہا، اے میرے بھتیجے تو نے سچ کہا:

عنى بها العمل، ابن آدم افقر ما يكون الى جنة اذا كبر سنه وكثرت عياله وابن آدم افقر ما يكون الى عمله يوم القيامة

اس آیت میں جو مثال دی گئی ہے، اس سے عمل مراد ہے۔ انسان اس وقت باغ کا زیادہ محتاج ہوتا ہے جب اس کی عمر بڑی ہو جائے اور اولاد زیادہ ہو جائے۔ اور انسان اپنے عمل کا زیادہ محتاج ہوگا قیامت کے دن'

سب سے بڑا صدقہ وہ ہے جو سب سے کمزور پر کیا جائے

حضرت سراقہ بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ سب سے بڑا صدقہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا ضرور بتائیے۔ آپ نے فرمایا: اپنی اس لڑکی کے ساتھ سلوک کرنا جو (بیوہ یا مطلقہ ہونے کی وجہ سے) تمھاری طرف لوٹا دی جائے اور جس کے لئے کمانے والا تمھارے سوا کوئی نہ ہو (ابنتك مردودة اليك ليس لها كاسب غيرك، ابن ماجہ)

دنیا کو بے حقیقت سمجھنا سب سے بڑی عقلندی ہے

امام شافعیؒ نے فرمایا: اگر کوئی شخص یہ وصیت کرے کہ مرنے کے بعد میرا مال سب سے زیادہ سمجھ دار آدمی (اعقل الناس) کو دیا جائے تو مرنے کے بعد اس کا مال اس شخص کو دینا چاہئے جو دنیا کے معاملہ میں سب سے زیادہ زاہد ہو (تنبیہ المغترین للشعرانی)

انفاق

قرآن میں انفاق پر زور دیتے ہوئے کہا گیا ہے: تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم اپنی وہ چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو، اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے (آل عمران ۹۲)
اور جن کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل کرتے ہیں، یہ خیال نہ کریں کہ یہ ان کے حق میں اچھا ہے، بلکہ یہ ان کے حق میں نہایت برا ہے۔ جس چیز میں وہ بخل کر رہے ہیں اس کا قیامت کے دن ان کو طوق پہنایا جائے گا۔
اور زمین و آسمان کی وراثت اللہ ہی کے لئے ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے (آل عمران ۱۸۰)

اے ایمان والو، جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرو، قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی کام آئے گی۔ اور جو انکار کرنے والے ہیں وہی دراصل ظالم ہیں (بقرہ ۲۵۴)
جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور اس کی ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے لئے وہ چاہتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے اور نہ دکھ دیتے ہیں، انھیں کے لئے اللہ کا ثواب ہے ان کے رب کے پاس۔ ان کے لئے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ نرم جواب دینا اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری لگی ہوئی ہو۔ اور اللہ بے پروا اور نہایت تحمل والا ہے۔ اے ایمان والو، احسان جتا کر اور دکھ دے کر اپنی خیرات کو اکارت نہ کرو، اس شخص کی طرح جو اپنا مال دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو، پھر جب اس پر زور کا مینھ برسا تو مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنی کمائی سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں گے، اور اللہ منکروں کو سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کی خوشی حاصل کرنے کے لئے اور اپنے دلوں کو ثابت کرکے خرچ کرتے ہیں اس باغ کی طرح ہے جو بلند زمین پر ہو، اس پر زور کی بارش ہوئی تو وہ دگنا پھل لایا اور اگر بارش نہ ہوئی تو پھوار ہی کافی ہے۔ اور اللہ خوب دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اس باغ میں اس کے لئے ہر قسم کے پھل ہوں، اور اس پر بڑھاپا آجائے اور اس کے بچے ضعیف ہوں، اس وقت باغ پر ایک بگولا آپڑے جس میں آگ ہو اور وہ باغ جل جائے۔ اللہ اس طرح اپنی باتیں تمھارے سامنے بیان کرتا ہے تاکہ غور کرو۔ اے ایمان والو، اپنے کمائے ہوئے ستھرے مال میں سے خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمھارے لئے زمین سے پیدا کی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لئے بری چیز چھانٹنے لگو، حالاں کہ وہی اگر تمھیں لینا ہو تو تم ہرگز اس کو لینا گوارا نہ کرو مگر یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ۔ اور جان لو کہ اللہ بے نیاز ہے خوبیوں والا

ہے۔ شیطان تم کو تنگ دستی سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کی راہ سجھاتا ہے اور اللہ تم کو وعدہ دیتا ہے اپنی بخشش کا اور فضل کا۔ اور اللہ بہت وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت ملی اس کو بہت بڑی خوبی مل گئی، اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (البقرہ ۲۶۹ ۔ ۲۶۱)

آخرت کی بہتر چیز دنیا کی بہتر چیز کی قیمت ہے۔ دنیا میں جب آدمی اپنی سب سے بہتر چیز کو اللہ کے لئے خرچ کرتا ہے، اس کے بعد ہی وہ اس قابل بنتا ہے کہ وہ آخرت کی سب سے بہتر چیز کو پانے کا حق دار بن سکے۔ دنیا میں آدمی کی سب سے زیادہ محبوب چیز مال ہے۔ جب تک ایسا نہ ہو کہ وہ خالص خدا کے لئے اپنے محبوب مال کو خرچ کرے، وہ خدا کی رحمتوں کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

جو آدمی اپنے کمائے ہوئے مال کو بچاتا ہے یا اس کو اپنی دنیا بنانے میں لگاتا ہے وہ بظاہر سمجھتا ہے کہ میں ہوشیاری کر رہا ہوں، میں اپنے مستقبل کو محفوظ کر رہا ہوں۔ حالانکہ اصل صورت حال اس کے برعکس ہے۔ آدمی اگر موت کے پردہ کو ہٹا دے اور پورے دائرہ حیات کے اعتبار سے اپنے معاملہ کو دیکھے تو اس کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں اپنا "گھر" بنا کر وہ آخرت کے طویل تر مرحلۂ حیات میں اپنے کو "بے گھر" کر رہا ہے۔ وہ اپنے کو اس خطرہ میں مبتلا کر رہا ہے کہ دنیا میں اس کی مال داری آخرت میں اس کے لئے بدترین مفلسی بن کر اس سے لپٹ جائے۔ کیوں کہ آخرت میں جو کچھ کام آئے گا وہ دیا ہوا مال ہے نہ کہ دنیا میں جمع کیا ہوا مال۔

دنیا میں اللہ نے ایسی مثالیں قائم کر دی ہیں جن سے آخرت کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ کسان کھیت میں دانہ ڈالتا ہے تو ایک دانہ ایسے پودے کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس میں سات سو دانے ہوں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کسی بندے کی محنت کا بدلہ دینے میں کتنا زیادہ فیاض ہے۔ یہی معاملہ وہ آخرت میں اپنے وفادار بندوں کے ساتھ کرے گا۔ اللہ کے لئے خرچ کرنا گویا آخرت کی زمین میں "دانہ" ڈالنا ہے۔ جب آدمی مر کر وہاں پہنچے گا تو وہ دیکھے گا کہ اس کا خرچ کیا ہوا مال کس طرح بے انتہا اضافہ کے ساتھ اس کی طرف لوٹایا جا رہا ہے۔

خرچ کرنے والوں کی بقیہ قسموں کی مثالیں بھی اسی دنیا میں موجود ہیں۔

جو لوگ اپنا مال "دکھاوے" کے لئے خرچ کرتے ہیں یعنی بظاہر ان کا خرچ دین کی کسی مد میں ہوتا ہے مگر اس دینی مد سے انھیں صرف اس لئے دلچسپی ہوتی ہے کہ اس میں نمائش کا پہلو ہے اور اس سے ان کی شہرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ دین کی خاموش مد جس میں خدا کی رضا کے سوا کوئی اور پہلو نہ ہو اس میں وہ خرچ نہیں کرتے۔ البتہ ایسی مد جس میں شہرت وعزت کی چاشنی ہو اس میں خرچ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ایسے نمائشی لوگوں کی مثال اس پتھر کی سی ہے جس کے اوپر اتفاقاً کچھ مٹی جمع ہو جائے اور اس کی وجہ سے وہاں اوپر اوپر کچھ گھاس اگ آئے۔ مگر جب تیز بارش آتی ہے تو وہ اس مٹی سبزہ کو لئے ہوئے بہہ جاتی ہے اور اس کے بعد پتھر کا پتھر باقی

ہے۔ اسی طرح جو لوگ نمائشی جذبہ کے تحت خرچ کرتے ہیں ان کا معاملہ موجودہ امتحانی دنیا میں چھپا رہ سکتا ہے۔ مگر آخرت میں جب حقیقت سے پردہ اٹھایا جائے گا تو ان کی نمائشی دین داری اچانک غائب ہو جائے گی اور وہ دھلے ہوئے پتھر کی طرح دین سے بالکل خالی نظر آنے لگیں گے۔

جو لوگ اپنی ساری کمائی صرف دنیا کی تعمیر میں لگاتے ہیں ان کے انجام کی مثال بھی اسی دنیا میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک شخص نے باغ لگایا۔ اس کے بڑھاپے کی عمر تک باغ خوب سرسبز ہو گیا۔ پھلوں کا موسم آیا تو سارا باغ پھلوں سے لد گیا۔ عین اس وقت شدید اولہ باری ہوئی یا صحرائی طوفان اٹھا اور سارا باغ جھلس کر رہ گیا۔ اپنی زندگی کی کمائی سے آدمی ٹھیک اس وقت محروم ہو گیا جب کہ اس کو سب سے زیادہ اس کی ضرورت تھی۔ اسی طرح جو لوگ اپنی ساری طاقت اپنی دنیا بنانے میں لگاتے رہے وہ مر کر جب آخرت میں پہنچیں گے تو اچانک وہ دیکھیں گے کہ وہ بالکل خالی ہاتھ ہیں۔ وہاں کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں۔

اللہ کی راہ میں دینے کی دو بڑی مدیں ہیں۔ ایک خدا کے کمزور بندوں کی مدد کے لئے دینا، خواہ وہ اپنے رشتہ دار ہوں یا غیر رشتہ دار۔ دوسرے، خدا کے دین کی ضرورتوں میں دینا۔

یہ دینا بظاہر اگرچہ ایک انسان کو دینا ہے۔ مگر نیت کے اعتبار سے اس کا مقصد اللہ کو خوش کرنا ہوتا ہے۔ جب ایک مسلمان اپنے کو "دینے والے" کی حیثیت میں پاتا ہے اور دوسرے کو "پانے والے" کی حیثیت میں تو اس کو وہ بھاری وقت یاد آجاتا ہے جب کہ وہ میدان حشر میں اس حالت میں کھڑا ہو گا کہ دینے کی سب چیزیں خدا کے اختیار میں ہوں گی اور وہ ہمہ تن محتاج بنا ہوا اس کے سامنے کھڑا ہو گا۔ یہ احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ جو کچھ وہ خدا سے اپنے لئے چاہتا ہے وہی وہ دوسرے کے لئے بنے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا مومن کے لئے ایک عملی دعا ہوتی ہے۔ یہ جذبہ اگر آدمی کے اندر صحیح طور پر موجود ہو تو وہ کسی کو دینے کے لئے بہتر چیز چھانٹے گا۔ کیونکہ اصل مسئلہ سامنے کھڑے ہوئے انسان کا نہیں بلکہ خدا کا ہے۔ دیتے ہوئے اس کا جذبہ یہ نہیں ہو گا کہ وہ کسی کے اوپر احسان کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ جو کچھ دے رہا ہے اللہ کے لئے دے رہا ہے، پھر اس کا احسان کس کے اوپر ہے۔ وہ جس کو دے گا اس کو اپنے سے کمتر نہیں سمجھے گا اور زبان سے اس کی دلآزاری کا کوئی کلمہ نہیں نکالے گا۔ سارے معاملہ کو خدا کا معاملہ سمجھنے کا ذہن اس کو ہر موقع پر متواضع بنائے رکھے گا حتی کہ جب کوئی سائل اس کے دروازہ پر کھڑا ہو گا تو اس کو ایسا محسوس ہو گا جیسے اس کو خدا نے اپنی طرف سے بھیجا ہو۔ یہ احساس اس کو کسی کو جھڑکنے سے روک دے گا۔ اگر وہ کسی کو دینے والا نہ ہو تو وہ اس کو نرمی کے ساتھ جواب دے گا نہ کہ وہ اس کو جھڑکنے لگے۔

اللہ کے لئے جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے اس کا نتیجہ فوراً دکھائی نہیں دیتا۔ اس لئے نفس بہکاتا ہے کہ یہ بے فائدہ خرچ ہے۔ دنیا کی راہ میں خرچ اس کو لوٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور خدا کی راہ میں خرچ ضائع ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر جن لوگوں کو صحیح سمجھ حاصل ہو جاتی ہے وہ نفس کے ان بہکاووں میں نہیں آتے۔ وہ صاف جان لیتے ہیں کہ سب سے بڑا نفع اور مدد وہی ہے جو خدا کی مد ہے۔

عربی مطبوعات

مولانا وحیدالدین خاں کی کتابوں کے بعض عربی ترجمے (مطبوعہ قاہرہ) برائے فروخت مکتبہ الرسالہ میں موجود ہیں:

کتاب	صفحات		قیمت	
۱۔ الإسلام يتحدى	۲۶۳	صفحات	قیمت ۲۰	روپے
۲۔ الدين في مواجهة العلم	۱۱۲	صفحات	" ۱۰	روپے
۳۔ حكمة الدين	۸۷	صفحات	" ۸	روپے
۴۔ الإسلام والعصر الحديث	۷۷	صفحات	" ۸	روپے
۵۔ مسئوليات الدعوة	۳۹	صفحات	" ۲	روپے
۶۔ نحو تدوين جديد للعلوم الإسلامية	۲۶	صفحات	" ۲	روپے
۷۔ إمكانات جديدة للدعوة	۳۴	صفحات	" ۲	روپے
۸۔ الشريعة الإسلامية وتحديات العصر	۳۲	صفحات	" ۲	روپے
۹۔ المسلمون بين الماضي والحال والمستقبل	۷۲	صفحات	" ۵	روپے
۱۰۔ نحو بعث إسلامي	۳۲	صفحات	" ۵۰	پیسے

فسادات کا مسئلہ

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۳۲ | قیمت دو روپے

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

مکتبہ الرسالہ۔ جمعیۃ بلڈنگ۔ قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

D. NO. D. (D) 532
D. R. N. NO. 28822/76

December 1980
Issue No. 49

AL-RISALA MONTHLY
JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231